اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

۳،۲، شمارہ ۱۰، جمادی الاول۔ جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ / فروری۔ مارچ ۱۹۸۶ء

مقاصد

كلمة التوحيد
و
توحيد الكلمة

- قرآن و سنت و سیرت پر نئے زاویوں سے بحث و علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر و صاحبان قلم سے
تعاون کی آرزو ہے۔

بدل اشتراک

ملک		فی جلد	
ایران		۱۵۰	ریال
پاکستان	———	۱۵	روپیہ
ہندوستان	———	۱۵	روپیہ
بنگلہ دیش	———	۱۵	ٹکے
متحدہ عرب امارات	———	۸	درہم
سعودی عرب	———	۸	ریال
قطر	———	۸	ریال
کویت	———	۷۵۰	فلس
افریقہ	———	۳	ڈالر
برطانیہ	———	۲	پونڈ
امریکہ	———	۴	ڈالر
کینیڈا	———	۴	ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

اکاؤنٹ نمبر ۹۰۰۲۵
سازمان تبلیغات اسلامی (مطبوعات خارجی)
بانک ملی ایران شعبہ خشایار ۵۴۳
خیابان طالقانی، نبش فرصت
تہران۔ جمہوری اسلامی ایران

ترتیب

اداریہ

قرآن

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس ۴۱

قم، جمہوری اسلامی ایران

فون: ۲۲۵۸۴

جمادی الاول ـ جمادی الثانی سنہ ۱۴۰۶ھ / فروری ـ مارچ سنہ ۱۹۸۶ء

حدیث

فکر و فلسفہ

قانون
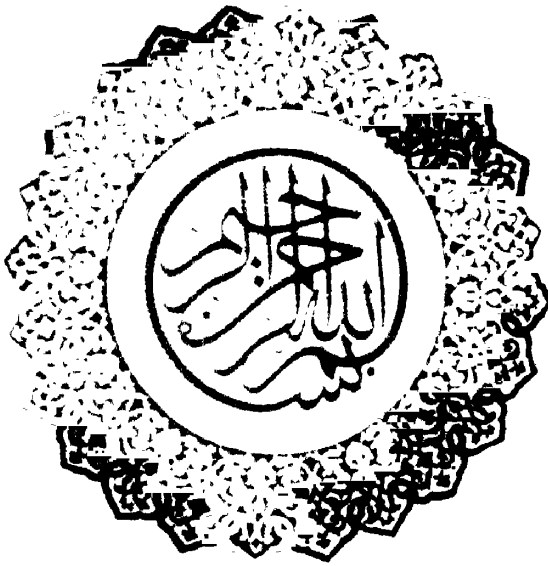
نوٹ:-
ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے
سے اتفاق ضروری نہیں۔

شذرہ

انقلاب ایران

عالم اسلام کے لئے نمونۂ عمل

جشن انقلاب کی آمد آمد ہے۔ اسلامی انقلاب اپنی آٹھویں بہار کا استقبال کر رہا ہے۔ رسم زمانہ بھی ہے اور ضرورت کا تقاضہ بھی کہ ان مبارک و مسعود گھڑیوں میں انقلاب کی کارکردگی پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اسلامی انقلاب چونکہ مکمل و ہمہ جہات انقلاب ہے، لہٰذا اس کے نتائج اور کارنامے بھی ہمہ گیر اور مختلف الجہات ہیں۔ اس انقلاب نے اگر ثقافتی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں تو معاشی میدان بھی اس سے محروم نہیں۔ ایک طرف اگر دنیا نے اس کی حکیمانہ سیاست کا لوہا مانا ہے اور ایک مدت سے ہونے والی شرق و غرب کی استحصالی سازشوں کا پردہ چاک کیا ہے تو دوسری طرف اپنی فوجی حکمت عملی سے دشمنان انقلاب کی ہر چال کو ناکام بنا دیا ہے اور آج دنیا اس کی عسکری طاقت سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں رکھتی لیکن چونکہ توحید کا تعلق ثقافت سے ہے لہٰذا ہم بطور اختصار انقلاب کے صرف چند ثقافتی کارناموں کے بیان ہی پر اکتفا کریں گے کیونکہ توحید کے صفحات اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہیں رکھتے۔

ماضی بعید کو جانے دیجئے، ابھی ماضی قریب میں اسلامی انقلاب کی ظفریابی سے پہلے جب کبھی دو درد مند دل، مسلمانوں کی حالت زار کا جائزہ لینے کے لئے بیٹھتے تھے، ان کی پریشانیوں، الجھنوں مصائب و آلام اور ان سے نجات پر غور و فکر کرتے تھے تو گھنٹوں کی ہمدردانہ بحث و گفتگو کے بعد کف افسوس ملتے ہوئے اسی نتیجہ پر پہنچتے تھے کہ موجودہ حالات سے نجات ناممکن ہے

اصلاح کی کوئی امید نہیں، ہم کمزور ہیں، ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں، ہم کوئی کامیاب تحریک چلانے کے قابل نہیں، تحریک وہی کامیاب ہو سکتی ہے جسے روس و امریکہ کی سرپرستی حاصل ہو، شرق و غرب کے سامراجی ذرائع ابلاغ نے اس منحرف طرز فکر کو ہمارے ذہنوں میں راسخ کرنے کے سلسلے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا گذشتہ تجربات بھی اس نظریے کو تقویت بخشتے تھے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ بہت سے افراد اور تحریکیں نجات مسلمین کی دعویدار بن کر میدان میں آئیں۔ استقلال و حریت کے بلند بانگ نعرے لگائے گئے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی پشت پر کہیں امریکہ کا ہاتھ نظر آنے لگا اور کہیں روس کا، چنانچہ نتیجہ کے طور پر کبھی امریکہ کی غلامی سے نکل کر روس کی بندگی میں داخل ہو جاتے اور کبھی روس کا جوا اتار کر امریکہ کا قلادہ پہن لیا جاتا ظلم بھی باقی رہتا اور ظالم بھی صرف نام میں تبدیلی آجاتی۔

(۲)

اسلامی انقلاب کی کامیابی سے پہلے یہ تصور بھی محال تھا کہ روس و امریکہ کی اجارہ داری سے آزاد رہ کر کوئی انقلاب کامیاب بھی ہو سکتا ہے، نہ صرف کامیاب بلکہ اپنے قومی اتحاد اور ایمان باللہ کے سہارے دونوں شیطانوں کو منہ توڑ جواب دے کر مظلومین عالم کو ایک نئی امنگ اور راہ بھی فراہم کر سکتا ہے، ایک ایسا کامیاب انقلاب جس کا بنیادی نعرہ ہی "نہ شرق نہ غرب فقط اسلام" ہو اور جس نے عملی طور پر دنیا کو اپنے اس نعرے کی صداقت سے آشنا بھی کر دیا ہو۔

آج اسلامی انقلاب اپنے عظیم نتائج کے ہمراہ افق عالم پر طلوع ہو چکا ہے اور دنیا پر حاکم فرعونوں کے جادوگروں کے سامراجی تفکر یا کی سانپوں کو عصائے موسیٰ کی طرح نگل لیا ہے۔ "نئی روشنی" کے تحت آنکھوں کو چکا چوندھ کر دینے والی ان کی تمام تصورات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔

سرزمین ایمان و ایثار پر مکتب وحی کے افق سے ابھرنے والا اسلامی انقلاب آفتاب عالمتاب بن کر سازشوں کے کالے بادلوں کا سینہ چاک کر کے سر بفلک بہا ڈوا

کو عبور کر کے چمگادڑ صفتوں کی شیطانی کوششوں کو اپنی شعاعوں سے ریزہ ریزہ کر کے دنیا کو اپنی ضو افشانیوں سے فیض یاب کر رہا ہے انڈونیشیا سے افریقہ تک مظلوموں کے دلوں میں نور ہدایت کی کرنیں پھوٹ چکی ہیں، ان کے یخ بستہ منجمد خون میں حرارت پیدا ہو چکی ہے، بے سہارا کاشانوں میں امید کے چراغ جل چکے ہیں، اسلامی انقلاب جغرافیائی حدوں کو سمیٹ کر تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ پسماندہ مگر باحوصلہ قومیں اسے نمونہ عمل بنا کر استکباری طاقتوں کے مدمقابل آکھڑی ہوئی ہیں۔ ملیشیا ہو یا انڈونیشیا، مصر ہو یا مراکش، جنوبی افریقہ ہو یا مغربی افریقہ، مشرق وسطیٰ ہو یا لاطینی امریکہ ہر جگہ انقلاب ہے اور تحریک اور ان سب کا روح رواں اسلام ہے اور صرف اسلام اب جنوبی افریقہ کی اپرتائیڈ، دشمن تحریک اسلامی رنگ اختیار کرتی جا رہی ہے چنانچہ سامراجی ذرائع ابلاغ ہراساں ہو کر چیخ رہے ہیں کہ جنوبی افریقہ اسلامی انقلاب کی لپیٹ میں آچکا ہے، امریکی مندوب اقوام متحدہ میں پوری دنیا کا مذاق اڑاتے ہوئے نسلی امتیاز پر مبنی حکومت کے خلاف ووٹ دینے سے اس لیے کتراتا ہے کہ اگر مظلوم سیاہ نژاد کامیاب ہو گئے تو جنوبی افریقہ دوسرا ایران بن جائے گا۔

کل کا فاسق و فاجر لبنان، "عیاشوں کی جنت" آج اسی انقلاب کی بدولت مسلمانوں کی آبرو بن چکا ہے، اس کے مجاہد سپوتوں نے اسلامی انقلاب کے نقش قدم پر چل کر امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔ غاصب اسرائیل کو اسلامی جہاد کے سہارے اپنے اسلامی وطن سے نکال کر عالم اسلام کو سرخرو کر دیا کیونکہ یہ پہلا موقع ہے کہ اسرائیل جس کے سلسلہ میں یہ تصور قائم کر لیا گیا تھا کہ اسے طاقت کے ذریعہ مقبوضہ علاقوں سے نکالنا ناممکن ہے۔ اسے کسی مقبوضہ علاقہ سے طاقت کے بل بوتے پر نکالا گیا ہے، جس لبنان کی عریانیت، بے حیائی اور فسق و فجور یورپ کو مات کر رہا تھا، جہاں دین و مذہب کے تذکرے نقار خانہ میں طوطی کی آواز کے مترادف سمجھے جاتے تھے آج وہیں اسلامی حکومت کی تشکیل کے چرچے ہیں اور وہ دن دور نہیں معلوم ہوتا جب انشاءاللہ سرزمین ابوذر غفاری، لبنان پر ابوذر پسند اسلامی حکومت کا قیام وجود میں آجائے، اور بار دیگر لیس للکافرین علی المومنین سبیلا

کی عملی تفسیر سے دنیا آشنا ہو سکے۔

(۳)

اس انقلاب کی ایک دوسری عظیم ثقافتی کامیابی یہ ہے کہ صدر اسلام کے بعد اپنی اصل شکل و صورت کھو دینے والے اسلامی اعمال و مناسک دوبارہ اپنے حقیقی رنگ و روپ میں نمایاں ہو گئے، اس کی دو اہم مثالیں نماز جمعہ اور حج ہے، نماز جمعہ جو بیداری مسلمین کا بہترین ذریعہ ہے آج ستمگروں کے خلاف ایک مضبوط مورچہ بن چکا ہے۔ کل اسے ستمگروں کی قصیدہ خوانی کا اسٹیج بنالیا گیا تھا۔ حج میں بہت سے منافع ہیں، یہ مسلمانوں کو متحد کرنے کا وسیلہ اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر ہونے کا ذریعہ ہے۔ عالم اسلام کے مسائل کے حل کے لیے منصوبہ بندی کا مرکز اور کفار و مشرکین سے اظہار برائت کا محور ہے۔ بین الاقوامی، اقتصادی و سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کا وقت، اصلاح و تعمیر نفس اور تہذیب اخلاق کے ذریعہ تقرب الی اللہ کی دعوت ہے لیکن مکار و عیار اسلام دشمنوں کی شیطانی سازشوں کے نتیجہ میں حج کا اصل مقصد فوت ہو چکا تھا، حج صرف ظاہری نمائش اور فضول خرچی کا نام بن چکا تھا۔ حاجی صاحبان خانہ کعبہ کی مقدس فضا میں اجتماعی اور روحانی بیماریوں کو دور کرنے کی بجائے انفرادی آسائش اور جسمانی عیش و طرب کی چیزوں کی فراہمی میں مشغول ہو جاتے تھے۔ سامراجی ممالک اور ان کے غلاموں کی طرف سے ہونے والے ظلم و ستم اور کفر و استبداد کے خلاف زبان ہلانے کا کسی میں یارا نہ تھا۔ امریکہ اور اس کے حواریوں کے مفادات کے تحفظ کی خاطر مناسک حج کی کماحقہ ادائیگی پر پابندی تھی لیکن یہ اسلامی انقلاب کا فیضان ہے کہ حج ایک مرتبہ پھر ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے کا گہوارا بن چکا ہے، جہاں کفر و استبداد کے خلاف زبان کھولنے پر بھی پابندی تھی آج وہیں لاکھوں کی تعداد میں حاجی کفر و استبداد کے خلاف اعلانیہ مظاہرہ کر کے اتباع پیغمبر اسلامؐ میں ان سے اعلان برائت کرتے ہیں۔ آج نماز جمعہ کی طرح حج بھی دوست اور دشمن دونوں کی توجہ کا مرکز بن چکا ہے، جس کو اسلامی انقلاب کی ایک بہت بڑی دین کہا جا سکتا ہے۔

- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیامِ زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

☜ مرتضیٰ حسین ☞

وَاِذَا سَاَلَكَ

عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ
فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ۝

ترجمہ:

اور جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں، تو میں قریب ہوں، دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارے، تو انھیں بھی میرا حکم ماننا چاہیے اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک راستے پر آجائیں (۱۸۶)

تفسیر:

روزہ و نماز و تقرب الی اللہ کی نیت سے عبادات کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ دور ہے وہ قریب ہوجائے گا، نہیں وہ قریب ہے پکار دیا اسے زیر لب یاد کرو۔ وہ بات سنتا اور دعا قبول کرتا ہے، بات یہ ہے کہ مجھے پکارنے والا اور مجھ سے کچھ مانگنے والا مجھ پر ایمان رکھتا اور میرا حکم مانتا ہے تو وہ نیک راستے اور صحیح سمت حاصل کرلے گا۔

سوال کرنے والا بظاہر ایسا شخص تھا جسے "عبادی" کہا گیا اور یہ خطاب بجائے خود عرفان کا سرچشمہ اور مقام عبودیت و شان ربوبیت کا ایک عجیب کیف آفرین مرکب ہے۔ پوچھا تھا کہ خدا کہاں؟ کہ اسے بلند آواز سے پکاریں یا آہستہ سے، جواب میں یہ نہیں ارشاد ہوا کہ میرے نبی! آپ کہدیں کہ میں قریب ہوں۔ فوراً "قریب ہوں" زمان و مکان کی پہنائیاں سمیٹ کر اپنے معجزہ ہونے کا قرآن نے ثبوت دے دیا۔ اور اس بندے کی آبرو بڑھ گئی جسے یہ جواب ملا۔

دعا، بندگی کا تقاضہ ہے، قبول ہونے نہ ہونے کا خیال کیے بغیر اللہ سے مانگنا، جواب ملے یا نہ ملے اسے پکارے جانا، بجائے خود فکر و نظر کی بلندی اور عقل و خرد کی آسودگی ہے۔ قرآن میں پیغمبروں

کی دعائیں، کتب حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحیفہ علویہ میں حضرت علیؑ اور صحیفہ کاملہ میں امام زین العابدینؑ کی دعائیں اہل علم و دانش پڑھ کر دیکھیں کہ دعا کی حقیقت و اہمیت کیا ہے۔ میں مؤخر الذکر کتابوں کی شرح میں یہ بحث لکھ چکا ہوں۔

ذات باری تعالیٰ کے بارے میں قرب و بُعد کے معنی یہ ہے کہ "قرب فشهد النجوی و بعد فلا یریٰ" قریب کہ زیرلب گفتگو اور ضمیر میں کھٹکنے والی بات اس کے سامنے ہے اور دور، کہ نظر کی گرفت میں نہیں آسکتا۔

اُحِلَّ

لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝

ترجمہ:

روزے کی رات تم پر جائز کر دیا گیا، اپنی عورتوں سے بے حجاب ہونا، وہ تمہاری پوشاک میں تم ان کی پوشاک ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنے نفوس سے خیانت کرتے

سے تھے، تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہاری خطا معاف کر دی، تو اب تم ان سے ہم بستری کرو اور جو اللہ نے تمہارے لیے (تقدیر میں) لکھ دیا ہے اس کی آرزو رکھو۔
اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ سفیدۂ سحر کا خط، سیاہ خط (شب) سے تمہارے لیے نمایاں ہو جائے۔
پھر رات تک روزہ پورا کرو۔
اور مباشرت نہ کرو بیویوں سے جب کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں۔
یہ ہیں اللہ کے (ممنوعہ) حدود تو ان (مناہی) کے قریب نہ جاؤ۔ اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے اس لیے کہ وہ بچتے رہیں (۱۸۷)

تفسیر:

روزے کا مفہوم قرآن و حدیث میں نفس کے خواہشات پر مکمل قابو رکھنا اور رمضان بھر ان سے بچنا، یہ تقوے کا ایک تربیتی کورس ہے کہ آدمی ہر نقل و حرکت پر پابندیٔ حکم خدا کا احساس بیدار رکھے۔ لیکن زیر شکم انسانی کمزوری اسے بہر حال بے قابو کر دیتی ہے، اس خواہش کو اسلام نے نظر انداز نہیں کیا، اسے معتدل اور پابند حدود کر دیا ہے کہ جانور و آدمی میں فرق رہے اور روزہ چونکہ تربیتی عمل ہے اس لیے روزے کی حالت میں جنسی عمل پر پابندی اور رات کو اجازت ہے۔
ھن لباس لکم — میں زن و شوہر کے تعلق کو انتہائی نزاکت و نفاست و ایجاز کے ساتھ منظور کیا گیا ہے وہ اتصال و اختلاط و لمس و چسپیدگی جو لباس و بدن میں ہے بعینہٖ وہی ربط میاں بیوی میں ہے۔ جو لوگ رمضان اور روزے کی حالت میں حکم آنے سے پہلے یہ عمل کرتے تھے انہیں معاف کر کے آئندہ روزے کے بعد اجازت ہے مگر یہ اجازت صرف لذت میں منحصر نہ کی جائے بہتر ہے کہ اللہ سے اولاد کی آرزو کے ساتھ ہو، قوم میں تعداد کی کثرت اور کثیر التعداد افراد میں صالح افراد کی فراوانی خاندان، معاشرے اور ملت کی سربلندی کا باعث ہے اور متقی اولاد بخشش والدین کا ذریعہ۔
کلوا واشربوا — تمام کو دن والی ایک پابندی نہ ہونے کا تذکرہ کرنے کے بعد دوسری

اجازت کھانے پینے کی دی گئی اس اجازت کی حد آخر صبح صادق ہے، صبح صادق ہوتے اور اس کی پہلی آن آتے ہی روزہ شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے حج میں میقات و احرام کے بعد سے کچھ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں، اسی طرح روزے میں ساعت و زمان معین کے اندر پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں اسے امساک یا صوم کہتے ہیں۔ اس کی ساعت آغاز صبح صادق اور ساعت آخر "الیل" ہے۔ جس طرح صبح صادق سے کچھ پہلے کھانا پینا چھوڑ دینا واجب ہے اسی طرح "الیل" کی آمد کے بعد، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت افطار وہ ہے جب مشرق کی سرخی ختم ہو کر سیاہی سروں تک آجائے (آلاء الرحمٰن دیکھیے)

ولا تباشروھن — اگر مسجد میں اعتکاف کی حالت میں ہو تو دن رات کسی وقت بھی زن و شوہر بوسہ و لمس و مجامعت نہیں کر سکتے — اعتکاف بھی ایک تربیتی کیمپ جس سے تقوے اور ضبط نفس کی قوتیں ابھرتی ہیں۔ یہ سب محدود احکام ہیں، ان حدوں کو پار کرنا ان کو روندنا ان معاملات میں اپنی سوچ اور قیاس سے بال برابر فرق ڈالنا حرام اور قابل سزا ہے۔

کذلک یبین اللہ آیاتہ — اللہ، ہدایت کے نشان و احکام کے دلائل انسانوں کو اس لیے واضح طور پر سمجھاتا ہے کہ وہ ضمیر کی گمراہی، نفس کی تباہی سے بچیں اور تقوے کا درجہ حاصل کریں۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَٰلَكُم

بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ وَتُدْلُوا۟ بِهَآ إِلَى ٱلْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا۟

فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَٰلِ ٱلنَّاسِ بِٱلْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ :

اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق، اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ناحق، اور تم کو معلوم ہے (۱۸۸)

تفسیر:

اسلام میں جان و مال دونوں کا احترام واجب ہے کسی کی کوئی ملکیت ایک شخص یا کئی آدمی مل کر غیر شرعی طریقے سے استعمال یا ہضم نہیں کر سکتے۔ یہ بھی اجازت نہیں کہ حکام غیر شرعی کے پاس مقدمہ لے جائیں، یا قاضی کو رشوت دیں یا جھوٹی گواہی یا جھوٹی قسم کھا کر، ناجائز و غلط فیصلے کرائیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے" واما السّشانی الحکم فھو الکفر باللہ العظیم فیصلے کے لیے حاکم کو کچھ دینا، کفر ہے" اسلام اس معاملے میں بہت سخت تنبیہات کرتا ہے۔ وہ رشوت دینے لینے والوں کو جہنمی قرار دیتا ہے دراصل اسلامی معاشرے میں رشوت کا وجود ہی نہ رہنا چاہیے۔ رشوت نظام عدل میں خلل ڈالتی ہے۔

يَسْـَٔلُونَكَ

عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ:

لوگ تم سے نئے چاندوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے یہ لوگوں کے لیے معین اوقات ہیں اور حج کے لیے۔ اور یہ اچھی بات نہیں کہ گھروں میں پچھواڑے سے آؤ۔ بلکہ نیکی اس کی ہے جو تقویٰ رکھے۔ اور گھروں میں آؤ تو دروازوں سے آؤ۔ اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح پاؤ (۱۸۹)

تفسیر:

قرآن مجید میں تقریباً پندرہ مقامات پر "بسئلونک" آیا ہے جن میں سے سات مرتبہ سورۂ بقرہ میں ہے اور یہاں ان میں سے پہلا مقام ہے۔

چاند کے نکلنے، بڑھنے، گھٹنے اور نظر نہ آنے پر مختلف زاویوں سے بحث کی گئی ہے۔ قرآن نے اسے صرف احکام و ضوابط اسلامی کے زاویے سے سمجھایا ہے کہ علم و تحقیق کے دروازے کھلے رہیں۔ اسلامی شریعت میں چاند سے اوقات روزہ و ایام ماہواری و عدہ طلاق و مدت حمل اور زمانۂ حج جیسے امور کی توقیت ہوتی ہے۔ چاند اسلامی سال کے مہینے بتاتا ہے اور اس ضابطے میں جاہلیت کے رسم و رواج کے مطابق تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔

ضابطہ یہ ہے کہ گھروں میں دروازے سے داخل ہونا چاہیے، ہر کام صحیح طریقے اور اس کی راہ و روش کے مطابق ہونا چاہیے، مثلاً مرض کا علاج طبیب اور فقہ کی بات فقیہ سے پوچھنا معقول ہے، حدیث "انا مدینۃ العلم و علی بابھا" کا مطلب بھی یہی ہے کہ علوم الٰہی و احکام ربانی و مسائل قرآنی کا علم آنحضرت کو ہے اور اس تک رسائی کے لیے حضرت علی علیہ السلام سے رجوع کرو۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے: "ہم ابواب اللہ ہیں ہم اللہ تک رسائی کی راہ اور جنت کے داعی ہیں۔ مطلب یہی ہے کہ احکام خدا ہم سے پوچھے جائیں

یہ نہیں کہ احرام باندھا تو گھروں میں عقبی دیوار توڑ کے آئیں جیسے جاہلیت کے لوگ کرتے تھے یا جنازہ اٹھانا ہے تو پچھواڑے سے دیوار گرا کر نکالیں جیسے بعض مقامات پر دستور تھا۔ فکر و نظر علم و عمل، اوامر و نواہی ہر حالت میں تقویٰ پیش نظر رہے اسی میں فلاح ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ

وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ

الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ
فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ●
فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ● وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ
فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا
عَلَى الظَّالِمِينَ ● الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ
قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ
مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ
الْمُتَّقِينَ ● وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ
إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ●

ترجمہ:

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں۔ اور کسی پر زیادتی
نہ کرو بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے (۱۹۰) اور ان کو جہاں
پاؤ قتل اور انھیں نکال دو۔ جہاں (مکہ) سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے
اور فتنہ (دین بھٹکانا) قتل سے زیادہ سخت ہے۔ اور ان لوگوں کو مسجد
حرام کے قریب نہ مارنا جب تک وہ تمھیں نہ ماریں، پھر اگر یہ لوگ تم سے وہاں
بھی جنگ کریں تو تم بھی ان کو مارو، کافروں کا یہی بدلہ ہے (۱۹۱) پھر اگر وہ
لوگ باز آجائیں تو بے شک اللہ بڑا بخشنے والا ہے (۱۹۲) اور ان سے جنگ کرو
یہاں تک کہ فتنہ (مٹ جائے اور باقی) نہ رہے اور صرف اللہ ہی کا دین ہو
اس کے بعد اگر وہ باز آجائیں تو پھر ظالموں کے علاوہ کسی پر ہاتھ نہ ڈالو (۱۹۳)

حرمت والا مہینہ بدلہ ہے حرمت والے مہینے کا اور سب حرمت والی چیزوں کا
قصاص (برابر کا بدلہ) ہے، جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس کی زیادتی کے (مانند)
مثل دست اندازی کرو۔ اور اللہ سے تقویٰ رکھو اور یقین رکھو کہ بلاشبہ اللہ متقی
لوگوں کے ساتھ ہے (۱۹۴) اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اور اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ہلاکت
میں نہ ڈالو۔ اور نیکی کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے (۱۹۵)

تفسیر:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ

اسلام جبر و ظلم کا سخت ترین مخالف ہے۔ رسول اسلامؐ پچاس برس تک اخلاق و قانون کی
پابندی کا درس دیتے اور دشمنوں کے ظلم و ستم سہتے رہے۔ ہمہ گیر نظام انسانیت کے تحفظ کے لیے قوت
کا جواب طاقت سے دینا ناگزیر ہوتا، اسلام خوں ریزی کے مقابلے میں منطق و استدلال پر بھروسہ کرتا ہے،
مگر جب حریف کچلنے کی مہم سے باز نہ آئے تو ایک حد تک صبر کے بعد دشمن کے صفایا کرنے کی بھی جرأت کرتا
ہے، یہ آیات ایسے ہی حالات سے متعلق ہیں، ان کا تعلق مشرکین مکہ کے رویے سے ہے۔ لیکن قانون کا
اطلاق عام ہے۔

بس امن کی حد تمام ہو چکی۔ اب اجازت ہے جنگ و قتل کا جواب قتل ہے۔ بس اتنا خیال رہے کہ
جنگ اخلاقی حدود سے باہر نہ جانے دینا "لا تعتدوا" بچوں، بیماروں، بوڑھوں، جلیفوں اور عورتوں کو
قتل نہ کرنا۔ اللہ انسانی حدود سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا۔

۱۹۱۔ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ

مشرک حملہ آور جہاں ملیں، حرم میں ہوں یا بیرونِ حرم، انہیں مارو، قتل کرو، مکے سے
انہوں نے تمہیں نکالا ہے تم بھی انہیں وہاں سے نکال دو۔ فتنہ و فساد، حج سے روکنا، دین سے لوگوں کو
منحرف کرنا، قتل و جنگ سے زیادہ سخت جرم ہے۔ شہر مکہ میں تم جنگ کی پہل نہ کرنا، لیکن اگر وہ قتل کا بازار
گرم کر دیں اور حملہ کر دیں تو انہیں معاف نہ کرنا حرم میں لڑنا کیونکہ کافروں کو سزا دینے کا طریقہ ہی یہ ہے

مسجد الحرام کی بے حرمتی کا حق کسی کو نہیں ہے، مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دشمنانِ اسلام اس اصول کو توڑنے کے بعد وہاں بتوں کو رکھیں اور توحید و نبوت کا مذاق اڑائیں، مسلمانوں کو بے دخل کردیں۔ چنانچہ فتح مکہ کے وقت سرورِ دو عالم ؐ نے تمام مشرکین کو حرم سے نکالا متعدد آدمیوں کا خون ہدر کیا۔

۱۹۲۔ فَاِنِ انْتَهَوْا

آخری حملہ اور سنگین ترین صورت حال کے بعد بھی اگر دشمن اپنی سرگرمیوں سے باز آجائے فتنہ و فساد چھوڑ دے تو امان دے دو۔ اللہ کا نظام حکومت بخشش و درگذر و رحم پر مبنی ہے۔

۱۹۳۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ

اسلام میں جنگ کا مقصد کینہ جوئی، توسیع مقبوضات، قوموں کو غلام بنانا نہیں ہے۔ اسلام فتنہ و فساد، شرک و بت پرستی، غلامی اور سازش و طاغوتیت کے خلاف ہے۔ بنیادی مقصد جنگ ہے یکون الدین للہ۔ اللہ کا دین اور اسلام کا قانون نافذ کرنا جس میں آدمی کی آدمی پر حکومت کے بجائے سب پر اللہ کی حکومت کا قیام ہے۔ جو لوگ یا جو قومیں اس راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں، اسلام ان کو نہیں چھیڑتا۔

۱۹۴۔ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ

دشمن اگر مکان محترم کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے اور خود اس کی بے حرمتی کرنے تو لے وہیں سزا دو، اسی طرح اگر زمانِ محترم کا اصول تم پر تھوپے اور خود محترم زمانے میں تم پر حملہ کرے تو پھر اسے مہلت نہ دو، ماہ حرام کا مقابلہ ماہ حرام ہے۔ کیونکہ۔ قصاص میں زندگی ہے اور حرمتوں کا قصاص ضروری ہے محترم فقط تمہارے ہی لیے نہیں ان کے لیے بھی ہیں۔ انہیں مہینوں میں سزا دو کہ مکان کی طرح زمان سے بھی ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جا سکے۔ جو بھی تمہارے ساتھ زیادتی کرے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دو۔ مگر تقویٰ جو اسلام کا فلسفہ ہے اسے نظر انداز نہ ہونے دو۔ کیونکہ سب کچھ اللہ کے لیے ہے اور اللہ غیر تقویٰ کو پسند نہیں کرتا اور اہل تقویٰ کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔

ان آیات میں جہاد کے حدود و مقاصد کا بیان درج ذیل نکات میں ہے:

"قاتلوا فی سبیل اللہ ــ الذین یقاتلونکم ــ لا تعتدوا ــ لا تقاتلوہم عند المسجد الحرام ــ قاتلوہم حتی لا تکون فتنۃ ــ الشہر الحرام بالشہر الحرام ــ حتی یکون الدین کلہ للہ" خلاصہ یہ ہے کہ جہاد تین طرح کے ہیں:

(۱) آزادی کے لیے جہاد ــ یعنی جب دین حق کی آواز روک دی جائے اور لوگوں کو اسلام کی صدا سننے سے محروم کر دیا جائے تو رسول، امام یا ولی شرعی کو حق ہے کہ محروم عوام کو آزادی سے نوازنے کے لیے جہاد اور مظاہرۂ قوت کے ذریعہ مناسب اقدامات کریں۔

(۲) دفاعی جہاد ــ فرد یا قوم کو حقِ حفاظت خود اختیاری حاصل ہے جب دشمن یہ حق چھین لے اور اس فرد یا قوم کو حملوں کا نشانہ بنا دے تو مظلوم کو "دفاع" کی اجازت ہے۔

(۳) شرک و بت پرستی کے خاتمہ کے لیے جہاد ــ اسلام چونکہ جامع نظام سیاست و ریاست ہے اس لیے وہ ہر قسم کے بتوں کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ وہ انسان کو انسان کی پوجا اور بندگی سے آزاد کرانے کے لیے پُرامن اقدامات کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ انتہائی ضرورت کے وقت با اصول و با اخلاق جنگ کی بھی اجازت دیتا ہے۔ یہ طے ہے کہ مسلمان سپاہی للّٰہیت و تقویٰ کا پابند ہوتا ہے۔

۱۹۵- وَاَنفِقُوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ

جہاد میں جس طرح افرادی قوت ضروری ہے اسی طرح سرمایے کی طاقت کا استعمال بھی ناگزیر ہے۔ تجربہ کار جرنیل، مخلص و دلیر و بامقصد سپاہی، ذہین و قابل انجینیر بغیر سرمایے کے کیا کر سکتے ہیں؟ مضبوط عقیدے اور گھر والوں کی معاشی خوش حالی کے بغیر سپاہی ذہنی و اعصابی تکلیفوں میں الجھ جاتا ہے، پیسہ ہو تو جدید اسلحہ فوج کے بازوؤں کی توانائی میں اضافہ کرتا ہے۔ سورۂ توبہ میں تہی دست مسلمانوں کی حسرت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے ــ وہ لوگ امیدوار سپاہیوں کی حالت میں گئے پلٹے تو آنسو رواں تھے کہ ان کے پاس اسلحے نہ تھے، ان کے پاس اتنی رقم نہ تھی گھوڑا، زرہ، تلوار خرید سکتے ــ

حقیقت یہ ہے کہ جنگ و جہاد میں مال و دولت کا صرف کرنا بھی اتنا ہی واجب ہے جتنا جان پر کھیلنا۔

ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ ـــ خود بھی ایک اصول ہے۔ بلا وجہ خود کشی، بلا مقصد شرعی جنگ اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ جان کا صدقہ مال ہے، اسلامی مقاصد کو نقصان پہنچ رہا ہو یا عزت مر رہے ہوں، اور کوئی شخص سرمائے پر سانپ بنا بیٹھا ہو تو عوام، حکومت اور دین سب کی نظر میں ایسا شخص یا گروہ مجرم ہے اور اسلام اسے قابل سزا قرار دیتا ہے ـــــ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے حصنوا اموالکم بالزکاۃ ؎ زکات دے کر مال کی حقیقی حفاظت کرو۔ یعنی ہمیشہ اپنے مال سے زکات دیتے رہو کہ اسلامی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔

احسان کرو، حسن کارکردگی دکھاؤ، بھلائی کرو، جنگ و جہاد کی بات ہو یا خرچ و صرف مال کا مسئلہ ذات کا قصہ ہو یا قوم و ملت کا ہر موقع پر عمل ایسا ہو جو خدا کی رضا کا سبب اور طریق کار اللہ کا پسندیدہ ہو۔ اللہ نیکو کار افراد کو پسند کرتا ہے، مرد ہوں یا عورت۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث کے مطابق "محسنین" کے معنی ہیں "مُقتَصِدِین" اس بنا پر آیت کا مطلب ہوگا کہ استعمال اور خرچ میانہ روی اور اقتصادی اصولوں کے مطابق کرو۔ نہ بخل نہ فضول خرچی، برمحل اور برموقع حسب ضرورت ـــ انفرادی ضرورت ہو یا اجتماعی، مال دبا کے نہ بیٹھو۔

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۖ
وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ فَمَنْ كَانَ
مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ
أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ ۚ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ
فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ
فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذَٰلِكَ

لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ
اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ :

اور پورا کرو حج و عمرہ صرف اللہ کے لیے۔ پھر اگر تم محصور ہو (روک دیے جاؤ۔ مرض یا دشمن کی وجہ سے احرام کے بعد مکہ میں داخل ہونا مشکل ہو) تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو) اور سر نہ منڈواو جب تک قربانی اپنی جگہ (نہ) پہنچ جائے (اور قربان گاہ میں ذبح نہ ہو جائے)، پھر جب تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو۔ تو اس کا فدیہ (بدلہ) روزے یا صدقہ یا قربانی ہے۔ پھر جب تمہاری خاطر جمع ہو۔ تو جو شخص حج تمتع کا عمرہ کر رہا ہو تو اس کو جو قربانی میسر آئے کرے، اور جو قربانی نہ کر سکے تو وہ تین روزے حج کے دنوں میں اور سات روزے رکھے جب تم سب (حج سے) پلٹو۔ یہ سب مل کر پورے دس ہوئے۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام (مکہ) کے پاس نہ رہتے ہوں۔ اور اللہ سے تقویٰ رکھو اور جان لو کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے (۱۹۶)

تفسیر :

حج کے بارے میں ایک اشارہ آیت ۱۵۸ میں گذر چکا، یہاں کچھ اور احکام بیان ہو رہے ہیں۔ سب سے پہلی یاد دہانی ہے کہ حج صرف اللہ کے لیے ہے اس میں شرک کا شائبہ نہ آنے دو۔ دوسرے یہ کہ ارکان حج پورے ادا کرو۔ یہ نہیں کہ احرام باندھا اور حج تمام کرنے سے پہلے مکے سے باہر چلے گئے۔ احرام کے بعد حج مکمل کرنا واجب ہے۔ کچھ آسانیاں اور مشکلات کے حل بھی ہیں ــ الف ــ احرام باندھ لیا اور بیمار ہو گئے آگے نہیں جا سکتے (احصار) یا دشمن حج نہ کرنے دے، اس صورت میں جہاں ہو وہیں جانور ذبح کر کے

احرام کھول دو۔ (ب) ۔ حج کا احرام باندھ کر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو جانور منیٰ بھیج کر ذبح کرائے وج، عمرہ کرنا تھا اور حرم نہ جاسکے تو مکے میں جانور بھیج کر ذبح کرائے جب جانور ذبح ہو جائے تو سر منڈا کر احرام کھول دے۔

۳، مرض ہو مگر وہ حج سے مانع نہ ہو، مثلاً سر میں کوئی تکلیف ہو اور علاوا ہو سر کا منڈوانا تو بال اتروا کر فدیہ ادا کرے، یعنی تین دن روزہ رکھے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا ایک بکری ذبح کرے

۴۔ فاذا امنتم۔ اگر کوئی شخص اطمینان و امان کی صورت میں "تمتع بالعمرۃ الی الحج" عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ تمام کرنے اور احرام کھولنے کے بعد حج کا احرام باندھنا چاہے تو اسے اجازت ہے مگر عمرہ کا احرام کھول کر جو اس نے خوشبو استعمال کی، سلے ہوئے کپڑے پہنے یا اور کلام کیے تو "فما استیسر من الھدی" اونٹ، گائے یا گوسفند جو بھی ذبح کر سکے وہ کرے اور اگر قربانی دینے کی گنجائش نہ رکھتا ہو تو، ساتویں آٹھویں اور نویں ذی الحجہ کو روزے رکھے اور سات روزے حج کے دن گذار کر رکھ لے یعنی پورے دس روزے قربانی کا بدل ہیں۔ اس آیت سے "حج تمتع" یا "متعۃ الحج" کا جواز معلوم ہوتا ہے (دیکھیے آلاء الرحمٰن)۔

"ذلک لمن لم یکن اھلہ حاضری المسجد الحرام" احرام عمرہ کھولنے کے بعد حج کی اجازت دور والوں کو ہے، جن لوگوں کا گھر حدود مسجد الحرام میں ہے۔ ان لوگوں پر حج قران یا حج افراد ہے۔

قران: وہ حج جس میں عمرہ و حج متصل ہو۔ افراد: وہ حج جس میں عمرہ نہیں ہے۔

حج تمتع: احرام عمرہ و احرام حج و قربانی جیسے تفاصیل کے ساتھ ان لوگوں پر واجب ہو مکے سے اڑتالیس میل یا اس سے زیادہ فاصلے پر رہتے ہوں۔

۔ "واتقوا اللہ" چونکہ حرم خدا میں ہو اس لیے تقوے کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھو، اللہ سے ڈرو کہ اس کا عذاب سخت ہے اور وہ خوفناک سزا دینے والا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ
فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ
وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ

الزَّادِ التَّقْوٰی وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ ●

ترجمہ:

حج کے مہینے معلوم ہیں، لہٰذا جس شخص نے ان مہینوں میں (اپنے اوپر) حج واجب کر لیا (احرام باندھ لیا) پھر نہ ہمبستری جائز ہے نہ گناہ نہ جھگڑا، اور جو نیکی کا کام کرتے ہو، اللہ اس کو جانتا ہے اور زاد راہ ساتھ لو۔ اور بہترین زاد راہ پرہیزگاری ہے۔ اور مجھ سے تقویٰ رکھو۔ اے صاحبانِ عقل!

تفسیر:

حج کے مہینے ہیں شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ۔ اس ضابطے میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ جو شخص قبل از ذی الحجہ، شوال یا ذی القعدہ میں مکے جائے احرام باندھ لے پھر اس پر تکمیل حج تک محرمات سے بچنا واجب ہے۔ جنسی عمل، بداخلاقی اور زبان کی آلودگی پر زور دینے کا مقصد تربیت کے بنیادی نکتے کو اجاگر کرنا اور مقصد حج "تقویٰ" کی منزل دکھانا ہے۔ انسان، تین ماہ تک سب سے اہم خواہش کو دبائے فسق و فجور، جھوٹ اور بدکرداری سے بچے، اور زبان پر قابو رکھے، تو صفاء قلب، پاکیزگیٔ ذہن اور کردار میں نکھار ضرور آئے گا۔ رمضان میں وہ ایک ماہ تک ریاضت کر چکا ہے۔ اب گھر، بار، اور وطن سے دور فوجی نما تربیتی کیمپ میں ہے۔ اسے "خیر" اور "تقویٰ" کے زادِ راہ سے مالا مال ہونا چاہیے، عقل کو استعمال کرے اور موقع سے فائدہ اٹھائے۔ بھلائی کا بدلہ اللہ دے گا، دنیا سے توقع نہ رکھے، خوفِ غیر خدا کو ضمیر سے نکال دے کہ انسانیت کا تقاضا اور مومن کا فریضہ یہی ہے۔
پوری فضا خلوص، تقویٰ اور عبادت و توجہ الی اللہ کی ہے اور یہی موقع زادِ راہ حاصل کرنے کا ہے۔

جو لوگ حج میں کھانے پینے، رہنے سہنے کا انتظام نہیں کرتے تھے، کہ ارے، ہم خدا کے مہمان

ہیں وہی دے گا، انھیں روکا اور سمجھایا گیا کہ سوال کرنے اور بھیک مانگنے سے پرہیز کرو، زادِ راہ و ضروریاتِ زندگی لیے بغیر گھر سے نہ نکلو، تجربہ کرو، سامان کتنا ساتھ ہو کہ نہ راستے میں زحمت ہو نہ منزل پر احتیاج، اس کے بعد سفرِ آخرت کے زاد کی فکر کرنا آسان ہو گی۔ دانا و بینا مرد ہو یا عورت اسے تقوے کا دھیان رکھنا چاہیے، یہی ایمان کا جوہر ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ۝ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

ترجمہ :

تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل (اپنی روزی) تلاش کرو۔ پھر جب عرفات کے لیے چلو، تو مزدلفہ کے پاس اللہ کا ذکر کرو۔ اور جس طرح اس نے تمھاری ہدایت کی ہے اسی طرح اس کو یاد کرو۔ اور بے شک تم اس سے پہلے ناواقفوں میں تھے (۱۹۸) اس کے بعد جہاں سے سب کوچ کریں دمنی کے لیے، تم بھی وہاں سے روانہ ہو جاؤ اور اللہ سے مغفرت چاہو بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔ (۱۹۹)

تفسیر:

پہلی آیت میں تھا کہ گھر سے زادراہ لے کر چلو، خالی ہاتھ نہ نکلو، اب ارشاد ہے کہ زمانۂ حج میں روزی کمانا کوئی بری بات نہیں۔ ترکِ دنیا و ترکِ کسب و کار کے بعد حج کیا تو تربیت کی ہمہ گیری پر اثر پڑے گا، کھاؤ پیو، محنت مزدوری کرو اور کاروبار کرنے کے باوجود جھوٹ سے پاک جھگڑے سے دور رہو تو ہے تربیت کا فائدہ!

جس طرح پہلی آیت میں "زاد" اسی طرح یہاں "فضل" دو حقیقتوں کو جمع کرتا ہے۔ دنیا کا زاد، دنیا کی دولت، آخرت کا توشہ، آخرت کی تجارت۔ سورۂ جمعہ میں یہی کلمہ تجارت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ حج میں مشرق و مغرب سے لوگ آتے ہیں ان سے جان پہچان اور کاروبار ہونا چاہیے۔ اقتصادی و سیاسی و سماجی نظام پر اسلامی قانون اور الٰہی احکام کے نفاذ کا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر مسلمان اپنے اپنے علاقوں میں محدود رہیں گے تو برباد ہو جائیں گے (الوسائل باب وجوب الحج)

۔ "فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ" مکے سے عرفات پہنچے وہاں زوال آفتاب سے غروب تک ٹھہرے۔ سورج ڈوبا اور لوگوں کی مزدلفہ کے لیے روانگی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ آج بھی سڑکیں، پل، کاریں اور آسانیوں کے باوجود آدمی یوں چلتے ہیں جیسے سمندر موجیں زیادہ، پانی کا سفر کم۔ "افاض۔ افیضو" کے معنوں میں وہ حالت مضمر ہے اور یہاں اس کلمے کا استعمال معجزہ ہے۔

عرفات، مکہ مکرمہ سے تقریباً ۱۲ میل دور ایک پہاڑ جس کے میدان میں ۹ ذی الحجہ کو وقت زوال سے قیام ہوتا ہے۔

مشعر الحرام: عرفات سے دوڈھائی میل دور مزدلفہ نامی پہاڑ جس کے میدان میں نصف شب سے قیام ہوتا ہے۔ یہاں سے صبح سورج نکلتے ہی "منیٰ" جانا ہوتا ہے۔ اس سفر و منزل میں تسبیح و تہلیل، حمد و استغفار ہی کرنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ نے گمراہی سے راہ راست اور گناہ سے توبہ کی توفیق بخشی ہے پھر کرم بالائے کرم کہ وہ گناہ بخشتا اور رحم فرماتا ہے۔ زمان و مکان، برکت و ہدایت کے ہیں ان سے فائدہ نہ اٹھانا اہل دانش و بینش کا کام نہیں ہے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ
اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا
فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ
رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا
عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ
الْحِسَابِ ۝

ترجمہ:

پھر جب تم اپنے مناسک (حج) ادا کر چکو تو اللہ کو اسی طرح یاد کرو جیسے تم اپنے آبا و اجداد کو یاد کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں میں سے بعض کہتے ہیں۔ ہمارے رب! ہمیں جو کچھ دینا ہے دنیا میں دے۔ اب آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں (۲۰۰) اور ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں۔ ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں نعمت دے اور آخرت میں ثواب عطا فرما اور ہمیں جہنم کی آگ سے بچا (۲۰۱) یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے ان کی کمائی کا حصہ (کیے کا پھل) ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے (۲۰۲)

تفسیر:

۲۰۰۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ

تنسک، (مصدر میمی و اسم زمان و مکان) عبادت اس کے عام معنی ہیں لیکن ارکان و واجبات حج کے لیے اس کا استعمال بکثرت ہے۔

ارکان و اعمال حج، رمی جمرہ، ذبح قربانی، سر منڈانے، طواف کعبہ و سعی صفا و مروہ سے فارغ ہوکر، تشریق کے دن منیٰ میں، یادِ خدا، ذکر و مناجات میں گذارنا چاہیے، ان دنوں نسلی برتری، قومی بڑائی اور گروہ بندی کی باتیں نہ کرو یہ مشرکوں کی رسمیں اب ختم ہوچکی ہیں۔ اسلام، باپ دادا اور قومی فضائل بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتا (حدیث امام محمد باقرؑ) شرف حاصل کرنا ہے تو شرف تقویٰ حاصل کرو۔

اس موقع پر دو قسم کے حاجی ہوتے ہیں، کچھ وہ نا سمجھ جو عقبیٰ چھوڑ دنیا کی بہتری، مال، اولاد، آرام راحت کاروبار ہی کی دعا کرتے ہیں ایسے لوگوں کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ انھیں دنیا ملے یا نہ ملے آخرت کا اجر بہر حال نہ ملے گا۔ ان کو حج کا مقصد یاد نہ رہا، حج تقرب خدا، طہارتِ ضمیر، اور خواہشات نفسانی پر قابو حاصل کرنے کے لیے تھا یہ دنیا کا قضیہ لیے بیٹھے ہیں۔ سفر و عبادت رائگاں کرکے انھیں کیا ملا؟

۲۰۱۔ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً ...

حسنہ کے معنی بہت عام ہیں۔ نعمت، علم، ثواب، جنت، رحمت اور ایک حدیث کے مطابق شکر گذار ضمیر، ذکر خدا کرنے والی زبان اور دنیا و آخرت کے معاملات میں مددگار مومن بیوی۔ امام صادقؑ نے فرمایا: آخرت میں رضائے خدا و جنت، دنیا میں خوش حالی و خلق حسن۔

دوسرا گروہ ان متقی لوگوں کا ہے جو اس مبارک موقع پر عذاب سے بچنے کی شرط پر دنیا و آخرت کی بھلائیاں اللہ سے طلب کرتے ہیں۔

۲۰۲۔ اولٰئك لهم نصيب مما كسبوا ....

کسب و کار کیے کا بدلہ سب کو ملے گا جیسی نیت ویسے فرشتے۔ نیز، دوسرے گروہ کی دعا پر آفرین بھی ہے۔ اور یاد دہانی بھی کہ اللہ حساب لے گا اور زمانے کے حساب کی گرفت سے بھی جلد۔ حساب واجر و سزا میں دیر نہ ہوگی۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ
فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ●

ترجمہ :

اللہ کو معین دنوں میں یاد کرو پھر جس نے جلدی کی، دو دن میں چلا گیا اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو رہ گیا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ۔ (یہ رعایت) اس کے لیے ہے جو پرہیزگار رہا ۔ اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو اور یقین رکھو کہ تم سب اس کے حضور جمع ہو گے (۲۰۳)

تفسیر :

ایام تشریق میں ذکر اللہ کیا جائے، یعنی ظہر روز قربانی سے تیرھویں تاریخ صبح تک اس تکبیر کا سلسلہ جاری ہے" اللہ اکبر، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ واللہ اکبر، اللہ اکبر، وللہ الحمد اللہ اکبر علی ما ھدانا، اللہ اکبر علی ما رزقنا من بہیمۃ الانعام (روایات ائمہ) تیسرا دن یوم النفر ہے۔ بروایت حلبی کسی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ نفر اول (بارہ تاریخ) میں زوال آفتاب سے پہلے کوئی شخص منیٰ سے جا سکتا ہے؟ امام نے فرمایا: نہیں، البتہ وہ اپنی سواری اور سامان باہر بھیج سکتا ہے۔ خود زوال کے بعد ہی جائے، بشرطیکہ اس شخص نے محرمات احرام پر عمل کیا ہو، مثلاً شکار نہ کیا ہو، فسوق وجدال نہ کی ہو، عمل جنسی بجا نہ لایا ہو (حدیث امام محمد باقر علیہ السلام)

آیت کے آخر میں حشر کا دن یاد دلایا ہے، کہ عرفات سے منیٰ کے قیام تک جو مناظر ہیں وہ حشر ونشر کی یاد دلانے والے ہیں۔ پھر تقویٰ کا حکم ہے، کہ یہی نتیجۂ عبادات وکمال انسانیت ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

ترجمہ:

اور لوگوں میں ایسا بھی ہے جس کی باتیں دنیاوی زندگی کے بارے میں تم کو اچھی لگتی ہیں اور وہ اپنے عقیدہ پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ حالانکہ وہ دشمنوں میں سب سے زیادہ سخت ہے (۲۰۴) اور جب وہ تمہارے سامنے سے ہٹا تو زمین پر فتنہ وفساد میں سرگرمی دکھائی، کھیتیاں اور (جانیں) جانور ضایع کردیے۔ اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا (۲۰۵) اور جب اس سے کہا گیا کہ اللہ سے ڈر تو اس کی خود سری گناہ پر آمادہ کرتی ہے، تو اس کے لیے دوزخ کافی ہے اور یقیناً وہ برا ٹھکانا ہے (۲۰۶)

تفسیر:

۲۰۴۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ

معاشرے کے ایسے افراد کی مذمت کی جارہی ہے جو اقتدار کی خاطر اسلام کو نعرہ بناتے ہیں، لوگ ایسے دارِ تقریر اور قول وقسم پر فریفتہ ہو کر اس کے حامی ہوجاتے ہیں لیکن ذرا سا اقتدار ملا اور تھوڑی سی ولایت ہاتھ آئی اور ان مدعیانِ ایمان واسلام نے ظلم وستم کے دروازے کھولے۔

فصلیں کٹوا دیں، انبار جلوا دیے، جانور اٹھوا لیے، بچے مروا دیے۔ ان منافقوں کا حال کار بہت بُرا ہوگا۔

یہ پیسے اور زمین والے، یہ کرسی اور اقتدار کے بھوکے پہلے بھی بالکل اسی قسم کے لوگ تھے اور ہمیشہ یہ مخالف دین و دیانت رہیں گے۔ مثلاً اس وقت اخنس بن شریق تھا، آنحضرتؐ کے پاس آتا اور مسلمانوں سے ملتا تو بڑی دل کش باتیں کرتا، دنیا کی مذمت اور دین کی خدمت پر بولتا، قسمیں کھا کر یقین دلاتا تھا۔ لیکن دراصل تھا وہ دین کا دشمن۔

۲۰۵۔ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ

۔جیسے ہی تھوڑی سی زمینداری ملی، چند آدمیوں پر حکومت ہاتھ آئی، اور اقتدار پر قبضہ ہوا، لگا حکم خدا کی مخالفت کرنے، دوسروں کی زمینیں اور کھیتیاں روند ڈالیں، نسل کی نسل قتل کروا دی۔

۲۰۶ وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ

کسی نے روکا ٹوکا، امر بمعروف و نہی عن المنکر کیا، اسلام کا حوالہ اور شریعت کا حکم یاد دلایا، تو فرعون صفت ظلم پر آمادہ ہو گیا۔ ایسے شخص یا اشخاص کا ٹھکانا دوزخ اور یہی لوگ غضب خدا کا نشانہ ہیں۔

تینوں آیتوں کا مجموعی درس یہ ہے کہ سیاست و ریاست میں فریب کار اور منافقوں کے کردار کو سامنے رکھو، گفتار پر نہ جاؤ، علم و کردار و تقویٰ کو حاکم و والی کے لیے شرط جانو۔

جناب شیخ جوادی آملی
ترجمہ: جناب سید حسین مرتضیٰ ایم۔ اے

آخری قسط

قرآن کی روشنی میں اسلام کا نظام عدلیہ

چوتھی فصل

فریقینِ مقدمہ کے آداب

یہ بات واضح ہو چکی کہ معیارِ قضاء میزان الٰہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور جھگڑے طے کرنے کے لیے اسی شخص کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے جو وحی کا عالم ہو اور اس پر ایمان بھی رکھتا ہو، نیز ان صفتوں سے متصف و آراستہ ہو جسے قضاء کے لیے معیار قرار دیا گیا ہے اس کے بعد اختلاف کے موقع پر ایک ہی شخص کی طرف رجوع معین ہو جائے گا اور اس کے بجائے کسی غیر کی طرف رجوع کرنا حق سے منہ موڑنے اور باطل کی طرف جھکنے میں شمار ہو گا اور یہ بہت بڑی گمراہی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالےٰ ہے :۔

"الم تر الی الذین یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ ویرید الشیطان ان یضلھم ضلالاً بعیداً" [۱]

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اس زعم میں ہیں کہ وہ جو آپ ؐ نازل ہوا اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہو چکا، (مگر) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کا حکم بنائیں طاغوت کو حالانکہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ اس (طاغوت) کا انکار کریں اور شیطان انھیں بہکا کر دور لے جائے۔

مومن کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ ایسے شخص سے فیصلہ طلب کرے جس شخص سے اسے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے جس طرح طاغوت کے لیے بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ خود ہی قضا کے منصب پر بیٹھ جائے اور انسان اس وقت تک ایمان کے درجات حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ رسول اللہ سے فیصلہ طلب نہ کرے اور ان کو اسی طرح حاکم نہ مانے جس طرح اللہ نے انھیں قاضی بنایا ہے اور باہمی اختلاف کے موقع پر انھیں کی طرف رجوع کرے اور رسول جو فیصلہ کریں تو اپنے دل میں کوئی گھٹن اور تنگی محسوس نہ کرے۔ خواہ وہ فیصلہ اس کے حق میں ہو یا خلاف، کیونکہ مومن وہی شخص ہوتا ہے جو اپنے معاملہ کو اللہ کے سامنے پیش کر دے۔

فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما [۲]

نہیں، اور تمھارے رب کی قسم لوگ اس وقت مومن نہ ہوں گے جب تک اپنے باہمی اختلاف میں تمھیں حاکم (فیصلہ کرنے والا) نہ مان لیں، پھر وہ اپنے دل میں تمھارے فیصلے پر تنگی نہ محسوس کریں اور خوشی خوشی اسے مان لیں...

آیت اختلاف کے موقع پر فریقین کی ذمہ داری بیان کرتی ہے کہ وہ اس لیے صرف رسول اللہ کی طرف رجوع کریں اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ فیصلے کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو حکم صادر کریں اس کے مقابلے میں سر تسلیم خم کر دیں۔ کیونکہ ایمان طمانیت نفس اور سکون قلب کا نام ہے اور یہ مرتبہ دل اور اعضاء و جوارح کے اعمال کو مکمل طور پر سپرد حکم رسول ؐ کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم کے مطابق جو شخص اللہ اور رسول کی طرف فیصلہ کے لئے رجوع نہیں کرتا

وہ ظالم ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ آنحضرتؐ کی طرف ضرور رجوع کرتا، بالکل اسی طرح جیسے اس شخص کو فلاح و بہبود کی بشارت ہے جو فیصلہ کے لیے اللہ اور رسول کی طرف سے ملنے والے بلاوے کو قبول کرے اور اس کی اطاعت پر تیار ہو جائے۔ ارشاد رب العزت ہے:

واذا دعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون وان یکن لھم الحق یاتوا الیہ مذعنین افی قلوبھم مرض ام ارتابوا ام یخافون ان یحیف اللہ علیھم و رسولہ بل اولئک ھم الظالمون"

اور جب انھیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک فریق روگرداں ہو جاتا ہے۔ اور اگر ان کے پاس حق ہوتا تو بڑے یقین کے ساتھ آتے۔ کیا ان کے دلوں میں کوئی بیماری ہے یا شک کرتے ہیں۔ یا اس سے ڈرتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کرے گا۔ در اصل یہی لوگ ظالم ہیں۔

آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکم رسول سے منہ موڑنے کا عمل ظلم کی زمین سے نشو و نما پاتا ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

"انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا و اطعنا و اولئک ھم المفلحون۔"

اہل ایمان کا قول تو یہ ہے کہ جب انھیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں۔ ہم نے سنا، ہم نے اطاعت کی اور یہی لوگ فلاح یافتہ ہیں۔

اس آیت سے استفادہ ہوتا ہے کہ فلاح حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی مکمل اطاعت کی جائے اس میں اصل راز یہ ہے کہ مومن اللہ اور رسول کی بیعت کرتا ہے اور بیعت کا تقاضا یہ ہوا کرتا ہے کہ بیعت کرنے والے نے اپنا نفس اور مال و اولاد یا ہر وہ چیز جس کا وہ مالک ہے اللہ اور رسول کو دیدیا اور اب نہ وہ اپنے نفس

سب کچھ اللہ اور رسول کے ہاتھ بیچ چکا، اب اس کو اختیار نہیں کہ وہ اپنی ذات یا ایسی چیز کے بارے میں جو اس کی طرف منسوب ہو سکے اللہ اور رسول کی خوشنودی کے علاوہ کسی قسم کا تصور کرے، قرآن مجید میں ہے :-

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم، ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبیناً

اور کسی مومن اور مومنہ کو حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی بات کا فیصلہ کردیں تو وہ اپنے معاملے میں خود مختاری دکھائیں اور جو شخص بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ کھلی اور بڑی گمراہی میں گمراہ ہوگیا۔

اللہ، اور رسولؐ کے سامنے فیصلے کے لیے رجوع، مومن کا فریضہ ہے اس کے علاوہ کسی کی طرف وہ رخ نہیں کرسکتا، اور جب ان دونوں کی طرف سے فیصلہ ہو چکا تو اسے چون وچرا کا بھی حق نہیں ہے کیونکہ یہ مومن ہے یہ سب کچھ سپرد خدا اور رسول کر چکا، اب سرتابی کا نتیجہ سرکشی وگمراہی کے سوا کیا ہوگا۔ پھر مستزاد یہ ہے کہ رسول کو "کتاب" کے ساتھ اس لیے بھیجا گیا کہ وہ لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلہ وحکومت کریں لہٰذا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک فریضہ متعین ہوگیا، جس کے بعد آپ کی طرف رجوع اور آپ کی قضاوت کا قبول کرنا لازم سے لازم تر قرار پایا۔ اس کے بغیر (اس آیت سے) لوگوں میں حق کا فیصلہ بھی لازم نہ ہوتا، جیسے رسول کو ثالث بنانے کے لیے لوگوں کا رجوع بھی ضروری نہ ہوتا کیونکہ لوگوں کے درمیان حکم کا تعین ثابت نہ ہوتا۔

توجہ طلب نکتے :

۱۔ طاغوت کی طرف توجہ عصیان دسرکشی، ہے ــــ اور اس کے فیصلہ پر مال کا لینا "حت

ہے، اگر مال بجائے خود حلال ہے۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب متنازع مال "اصل" (عین) ہو، رہا قرض، اب آیا اس کا حکم بھی "عین" (اصل) جیسا ہے، اس میں شک ہے۔ اس سلسلے میں علما کے درمیان اختلاف ہے اور اس کی تفصیل فقہ کی بڑی کتابوں میں ملے گی۔

۲۔ قضاء — فقط جھگڑے کو حل کرنے کے لیے ہے اور حقیقت کو متغیر نہیں کرتی حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔

اگر کوئی شخص دعویٰ کرے اور جھوٹے گواہوں یا جھوٹی قسم کے ذریعہ اپنے غلط دعوے کو قاضی کے سامنے صحیح ثابت کردے اور حقیقت پوشیدہ رہنے کے سبب قاضی خلافِ واقعہ فیصلہ دیدے تو جن لوگوں کو حقیقت کا علم ہو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس چیز سے بچیں مثلاً اگر زمین غصبی تھی تو اس پر نماز نہ پڑھیں اور اگر وہ شئی غصبی تھی تو اسے استعمال میں نہ لائیں کیونکہ وہ دوزخ کی آگ کا ٹکڑا ہے۔ مزید تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

پانچویں فصل

گواہ کے ضوابط

شاہد کے آداب :

قضا کے لیے ایک خاص سند ہے جس کے مطابق قاضی فیصلہ کرتا ہے اگر وہ سند خاص اور درست ہو تو فیصلہ بھی صحیح اور واقع کے مطابق ہوگا اور اگر درست نہ ہو تو فیصلہ بھی صحیح نہ ہوگا۔

جو کچھ قاضی کے بارے میں آداب ہیں اسی طرح گواہ کے لیے ضروری ہے کہ عالم اور عادل ہو۔

دونوں میں فرق یہ ہے کہ قاضی کے لیے ضروری ہے کہ وہ الہٰی قانون کا عالم ہو اور شاہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ـــ

"موضوع شاہد" ـــ یعنی جس چیز کی گواہی دینا ہے اس کے متعلقات کو اچھی طرح جانتا ہو یعنی درج ذیل باتوں پر توجہ رکھے :

۱۔ واقعے کے وقت موجود ہو تاکہ دیکھی ہوئی بات کی شہادت دے سکے قاضی کے سامنے شہادت دینے کے لیے حاضر ہو[۵] اور واقعے کی گواہی کسی فرق کے بغیر اور ہر قسم کے خوف اور رعایت سے آزاد ہو کر دے یعنی نہ تو وہ شہادت سے منہ موڑے اور نہ اسے چھپائے کیونکہ شہادت والے کا دل گناہ گار ہوتا ہے[۶]۔ اور وہ اسے بدل دیتا ہے اور اس کی ممانعت اس لیے ہے کہ اللہ ان کے عمل کو جانتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ و لو علی انفسکم اوالوالدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیراً فا للہ اولی بھما فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا و ان تلووا او تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیراً۔[۷]

ایمان لانے والو! مضبوطی کے ساتھ انصاف پر قائم رہنے والے بنو، اور گواہی اللہ کی خاطر دو، خواہ وہ تمہاری ذات یا والدین یا رشتے داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ مال دار ہو یا محتاج، اللہ ان دونوں پر تم سے زیادہ اولیٰ ہے خواہشات کی پیروی نہ کرو کہ حق سے پھر جاؤ۔ اور گھما پھرا کر گواہی دو یا انکار کر دو، کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

آیت کا ماحصل یہ ہے کہ شہادت پر نفسیاتی اور نفسانی قوتیں، اور اقتصادی عوامل اثر انداز نہ ہوں، یہاں تک کہ شہادت میں لوگ والدین اور عزیزوں کی محبت کا شائبہ بھی دخیل نہ ہونے دیں۔ ضروری ہے کہ شہادت کے ادا کرنے کی کیفیت یا شہادت سے پرہیز کرنے کے سلسلے میں غربت اور تونگری جیسے اقتصادی عوامل سے متاثر نہ ہو۔ اصل راز یہ ہے کہ خداوند متعال بندے کے تمام اعمال سے آگاہ ہے خواہ وہ کچھ بھی ہوں وہ ان پر گواہ ہے۔ جو شخص اس بات کا باور

کرے گا وہ اپنی ذات کو لغزش اور غلطی سے بچانے کی بھرپور کوشش ضرور کرے گا۔
آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ عزیزوں کے سلسلے میں عزیزوں کی شہادت خواہ وہ ان کی حمایت میں ہو یا ان کے خلاف رد نہیں کی جا سکتی خواہ بیٹے کی شہادت باپ کے سلسلے میں ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ آیت کی دلالت میں عموم ہے اور اس سے اس قسم کی شہادتوں کو رد کرنے کے متعلق جو استدلال کیا گیا ہے وہ ناقص ہے (اس کی تفصیل فقہی کتابوں سے معلوم کی جا سکتی ہے)

چھٹی فصل

اہل کتاب کے درمیان فیصلہ کرنے کے آداب

فریقین کبھی مسلمان ہوتے ہیں کبھی یہودی یا نصرانی اور کبھی اور دین دھرم کے لوگ۔ اگر فریقین مسلمان ہوں تو قاضی کو اسلام کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا اور جب وہ دونوں یہودی یا نصرانی ہوں تو قاضی کو اختیار ہوگا چاہے اسلام کے مطابق فیصلہ کرے، چاہے تو ان کو ایسی عدالتوں کے سپرد کر دے جو ان کے دین کے مطابق فیصلہ کرنے کی مجاز ہوں، قرآن میں صاف صاف ارشاد ہے:

"فان جاؤك فاحكم بينهم او اعرض عنهم وان تعرض عنهم فلن يضروك شيئا وان حكمت فاحكم بينهم بالقسط ان الله يحب المقسطين۔"

پھر اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں یا ان سے منہ پھیریں، اگر آپ ان سے بے رخی کریں تو آپ کو ذرہ برابر بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اور اگر فیصلہ کریں تو فیصلہ انصاف سے کریں، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

آیت میں مقدمہ کی سماعت کرنے یا سماعت نہ کرنے کا قاضی کو اختیار دیا جا رہا ہے اور یہ اختیار کا اس حکم سے کوئی تضاد نہیں، جس میں لوگوں کے درمیان تقاضائے اسلام کے مطابق حکم کی تعیین کی جا چکی ہے۔ بایں دلیل کہ پہلے تو "نص ظاہر پر مقدم ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ تخییر بھی تو اسلام ہی کا حکم ہے۔ اس خیال کی گنجائش نہیں کہ مذکورہ بالا آیت درج ذیل آیت سے منسوخ ہو گئی کہ؛

فاحکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھوآءھم........ [1]

فیصلہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ (کتاب) کے مطابق کریں ان کی خواہش کی پیروی نہ کریں۔

کیونکہ جو بات تخییر میں نص ہے اور جو بات تعیین میں ظاہر ہے ان کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے پھر یہ کہ تخییر بھی اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

اگر فریقین دو مختلف مذہبوں سے تعلق رکھتے ہوں تو ایسی صورت میں حکم کے کئی پہلو ہیں اور اس صورت میں مسلمان قاضی کے لیے فریقین کی شریعتوں کے مطابق فیصلہ کا جواز امیر المومنین علیہ السلام کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے۔

لو ثنیت لی الوسادۃ لحکمت بین اھل الانجیل بانجیلھم...

اگر میرے لیے مسند قضا بچھا دی جائے تو میں انجیل والوں میں انجیل سے تورات والوں میں تورات ...... سے فیصلے کروں۔

تفصیل کے لیے کتب فقہ ملاحظہ کریں۔

فقہائے امامیہ نے ایسے موقعوں پر فقہ اسلامی کے مطابق فیصلہ کرنے کو قوی قرار دیا ہے، کیونکہ اگر ہر ایک کو اس کے مذہب و دین کے قانون کی طرف پلٹایا جائے تو بدنظمی کا سبب ہوگا اور امام خمینی مدظلہ العالی نے ایسے موقع پر حد کے اجراء کے لیے احتیاطاً کا حکم دیا ہے جب ذمی نے کسی ذمیہ سے زنا کی ہو یا ذمی نے کسی ذمی سے لواط کیا ہو۔

خاتمہ

قضا کے بعض خاص ضابطے

۱۔ فقہ میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ قضا کے لیے ایک معیار (ترازو) ہے جس سے قاضی ادھر ادھر نہیں ہو سکتا اور وہ بیّنہ یا یمین ہے انھیں کے ذیل میں "ملاوٹ کے وقت قسامت"[۱۱] ہے۔ یا حاکم کا علم یا اقرار ہے۔ یہ اس موقع پر ہے جب قاضی کے لیے اس کے علاوہ اور کسی ذریعے سے اثباتی یا سلبی حکم دینا ممکن نہ ہو۔

ہاں فقط ایسے موقعوں پر جب حقوق بہت گڑبڑ اور مجتمع ہو جائیں تو قاضی قرعہ کا سہارا لے سکتا ہے، اور یہ حکم کی وضاحت یا کشف حکم کے لیے نہیں بلکہ حقوق کی تقسیم جیسے خارجی موضوعات کے لیے ہے جو آپس میں بالکل مل جل جائیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے فقہی کتابیں۔

کہا گیا ہے کہ قرعہ کی اصل قرآن کریم میں موجود ہے لہٰذا اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وما کنت لدیھم اذ یلقون اقلامھم ایھم یکفل مریم وما کنت لدیھم اذ یختصمون۔[۱۳]

اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے لیے) پھینک رہے تھے، کون کفیل بنتا ہے، مریم کا، اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

"فساھم فکان من المدحضین"[۱۴]

پھر قرعہ ڈالا تو یونسؑ نے زک اٹھائی۔

مدحضین کے معنی ہیں ۔ قرعہ کی وجہ سے مغلوب ولاجواب ہونے والے ۔ کیونکہ قرعہ کا تیسرا انہیں (یونس) کو سمندر میں ڈالنے اور مچھلیوں کا نوالہ بننے کو نکلا ۔

پھر اس بات کا قضاء سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے ، کیونکہ قرعہ اپنی جگہ ۔ اہم ہے ، البتہ کبھی کبھی قضاء سے کوئی ربط نکل آتا ہے لہٰذا اسی قدر اشارہ ضروری تھا ۔

۲ ۔ قوم کی دنبیوں والے فیصلے میں بظاہر حضرت داوٗد و سلیمان علیہما السلام کے درمیان اختلاف نظر آتا ہے ۔

اس لیے ان دونوں کے اختلاف کو ایک مرتبہ اجتہادی اختلاف کہہ دیا گیا اور دوسری مرتبہ حضرت سلیمان ؑ کے فیصلے کو ناسخ فیصلۂ داوٗد قرار دیا گیا ۔

اقول :

میرے نزدیک ۔ اجتہاد ، رائے اور تفکر حصولی کا نام ہے اور حکم الٰہی کی نسبت کے بعد کسی نبی کے لیے یہ ناممکن ہے ۔ مزید ارشاد باری تعالٰی تو یہ ہے کہ ۔ ففہمنا سلیمانؑ ہم نے سلیمانؑ کو سمجھایا ۔ آیت بتاتی ہے کہ سلیمانؑ نبی کا فیصلہ تفہیم الٰہی سے تھا جیسے داوٗد علیہ السلام کو اللہ کی جانب سے حکمت و فصل خطاب کی صفت دی گئی تھی کہ مدعی سے بیّنہ اور منکر سے حلف لیا کریں ۔

رہ گئی بات نسخ کی تو غالباً وہ ثابت نہیں ہے کیونکہ دونوں فیصلوں کے برحق ہونے کا احتمال موجود ہے اس لیے کہ سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ دونوں فریقوں کے لحاظ سے زیادہ فائدہ مند ہو ۔

حاشیہ :

۱ النساء / ۶۰
۲ النساء / ۶۵
۳ النور / ۴۸ و ۵۰
۴ النور / ۵۱
۵ الاحزاب / ۳۶
۶ البقرۃ / ۲۸۲
۷ البقرہ / ۲۸۳
۸ النساء / ۱۳۵
۹ و ۱۰ المائدہ / ۴۲ ۔ ۴۸
۱۱ الشوریٰ ، کنز العرفان ۲ / ۳۷۸
۱۲ تحریر الوسیلہ ۲ / ۴۶۴ و ۴۷۰ و ۵۰۶ و ۵۰۷
۱۳ آل عمران / ۴۴
۱۴ الصافات / ۱۴۱

توحید ۴۰

جناب شیخ محمود قانصوہ

تقابلی مطالعہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

فصلِ سوم

احکامِ روزہ

باب ہفتم

قبل از زوال چاند دیکھنے کی صورت میں افطار کیا جائے گا لیکن بعد از زوال نہیں

روایاتِ اہل بیت:

١ ـــ محمد بن يعقوب عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن حمادبن عثمان، عن أبي عبدالله (ع) قال: إذا رأوا الهلال قبل الزوال فهو لليلة الماضية، وإذا رأوه بعد الزوال فهو لليلة المستقبلة[٧٣]

أقول ويحتمل كونه حكاية محضة لمذهب الغير ولم يرتض الشيخ هذا الخبر

والخبر الآخر وحملها على محامل أخرى.

۱۔ حماد بن عثمان امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں: اگر قبل از زوال چاند نظر آجائے تو وہ گذشتہ شب کا مانا جائے گا لیکن اگر بعد از زوال نظر آئے تو وہ آئندہ شب کا ہوگا۔ . . .

۲ ــ وبإسناده ــ محمد بن الحسن ــ عن سعد، عن أبي جعفر، عن أبي طالب عبدالله بن الصلت، عن الحسن بن علي بن فضال، عن عبيد بن زرارة وعبدالله بن بكير، قالا: قال أبو عبدالله (ع) «إذا رؤي الهلال قبل الزوال فذلك اليوم من شوال، وإذا رؤي بعد الزوال فذلك اليوم من شهر رمضان[۷۴].

۲۔ . . . . عبداللہ بن بکیر و عبید بن زرارہ کہتے ہیں امام صادقؑ نے فرمایا: اگر زوال سے پہلے چاند نظر آجائے تو وہ دن شوال کی پہلی تاریخ ہوگی اور بعد از زوال دکھائی دے تو وہ رمضان کی آخری تاریخ ہوگی۔

روایات اہل سنت:

۱ ــ أخبرنا أبو محمد عبدالله بن يحيى بن عبدالجبار السكري ببغداد، أنبأنا اسماعيل بن محمد الصفار، حدثنا أحمد بن منصور، حدثنا عبدالرزاق، أنبأنا الثوري، عن مغيرة، عن شباك، عن ابراهيم، قال: كتب عمر الى عتبة بن فرقد: إذا رأيتم الهلال نهاراً قبل أنْ تزول الشمس لتمام ثلاثين فافطروا، وإذا رأيتموه بعد ما تزول الشمس فلا تفطروا حتى تصوموا[۷۵]. أقول ولم أجد في الباب حديثاً عن النبي (ص) من طرق أهل السنة.

۱۔ . . . . ابراہیم کہتے ہیں حضرت عمر نے عتبہ بن فرقد کو خط لکھا:

جب تم دن میں زوال سے پہلے چاند دیکھو تو روزہ توڑ دو لیکن اگر

زوال کے بعد چاند نظر آئے تو افطار نہ کرو روزہ کو باقی رکھو۔
اقول:
اس سلسلہ میں برادران اہل سنت کے یہاں پیغمبر اسلام سے روایت نہیں ملی۔

باب ہشتم

۲۸ دن کا روزہ موجب قضا ہے

روایات اہل بیتؑ:

۱ ـ محمدبن الحسن بإسناده، عن سعد، عن أحمد بن محمد، عن الحسين بن سعيد، عن حمادبن عيسى، عن عبدالله بن سنان، عن رجل نسي حمادبن عيسى اسمه، قال: صام علي (ع) بالكوفة ثمانية وعشرين يوماً شهر رمضان فرأوا الهلال فأمر منادياً ينادي: أقضوا يوماً فإنّ الشهر تسعة وعشرون يوماً[۷۶].

۱۔ .... عبداللہ بن سنان ایک شخص سے جس کا نام حماد بن عیسی کے ذہن سے اتر گیا، روایت کرتے ہیں: حضرت علیؑ نے ایک مرتبہ کوفہ میں ماہ رمضان کے ۲۸ روزے رکھے تھے کہ چاند نظر آگیا، حضرتؑ نے منادی کو اعلان کرنے کا حکم دیا: ایک دن کے روزے کی قضا کی جائے کیونکہ مہینہ (کم از کم) ۲۹ دن کا ہوتا ہے۔

روایات اہل سنت:

۱ ـ وأخبرنا أبوبكر محمدبن ابراهيم الفارسي، أنبأ ابراهيم بن عبداله الأصبهاني، أنبأ محمدبن سليمان بن فارس، حدثنا محمدبن اسماعيل البخاري، حدثنا أبونعيم، حدثنا حميد يعني إبن عبدالله الأصم

الكوفي سمع الوليد، قال: صمنا على عهد علي رضي الله عنه ثمانية وعشرين يوماً فأمرنا بقضاء يوم.[۷۷] ورواه عبدالرزاق، عن الثوري، عن حميد، عن الوليد بن عتبة[۷۸] أقول ولم أجد في الباب حديثاً عن النبي (ص) من طرق أهل السنة.

۱ــ .... ابن عبداللہ الاصم الکوفی کہتے ہیں ہم نے ولید سے سنا ہے کہ: ہم نے حضرت علیؑ کے عہد میں اٹھائیس دن روزہ رکھا چنانچہ حضرت نے ہمیں ایک دن قضا روزہ رکھنے کا حکم دیا........

اقول: برادران اہل سنت نے اس سلسلہ میں پیغمبر اسلامؐ سے روایت نہیں کی ہے۔

باب نہم

رات میں روزہ کی نیت ضروری نہیں

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن حماد بن عثمان، عن الحلبي، عن أبي عبدالله (ع) (في حديث) قال: قلت له: إنّ رجلاً أراد أن يصوم ارتفاع النهار. أيصوم؟ قال: نعم[۷۹].

۱ـ .... حلبی کہتے ہیں، میں نے امام صادقؑ سے عرض کیا: ایک شخص دن چڑھنے کے بعد روزہ رکھنا چاہتا ہے کیا اس کا روزہ صحیح ہے؟ حضرت نے فرمایا: ہاں۔

۲ ــ وبإسناده ــ محمد بن الحسن ــ عن أحمد بن محمد، عن البرقي، عن ابن أبي عمير، عن هشام بن سالم، عن أبي عبدالله (ع) قال:

كان أميرالمؤمنين يدخل الى أهله، فيقول: عندكم شيء وإلاّ صمت. فإنْ كان عندهم شيء أتوه به وإلاّ صام[۸۰].

۲۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہشام بن سالم امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں، حضرت علیؑ گھر آکر پوچھتے تھے کھانے کو کچھ ہے؟ یا روزہ رکھ لوں اگر کچھ ہوتا تو حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ورنہ آپ روزہ رکھ لیتے۔

روایات اہل سنّت :

۱ ــ أخبرنا أبوطاهر الفقيه، أنبأ أبوبكر محمدبن الحسين القطان، حدثنا سهل بن عمار، حدثنا روح بن عبادة البصري، حدثنا سفيان الثوري (ح وأخبرنا) أبوالحسن محمدبن يعقوب الفقيه بالطابران، قال: أخبرنا أبوالنضر الفقيه، حدثنا عثمان بن سعيد الدارمي، حدثنا محمدبن كثير، حدثنا سفيان، عن طلحة بن يحيى، عن عائشة بنت طلحة، عن عائشة أم المؤمنين رضي الله عنها، قالت: كان نبي الله صلى الله عليه وسلم يحب طعاماً فجاء يوماً فقال: هل عندكم من ذلك الطعام؟ فقلت: لا. فقال إني صائم لفظ حديث محمدبن كثير. وفي رواية روح، قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يأتينا، فيقول: هل عندكم من غداء؟ فأقول: لا. قال: اني صائم (ورواه) وكيع بن الجراح، عن طلحة بن يحيى فقال في الحديث قالت: دخل عليٌّ النبي صلى الله عليه وسلم ذات يوم، فقال: هل عندكم شيء؟ قلنا: لا. قال: فإني إذاً صائم[۸۱].

۱۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عائشہ بنت طلحہ حضرت عائشہ سے روایت کرتی ہیں: پیغمبر اسلامؐ کو ایک کھانا پسند تھا، آپ ایک دن تشریف لائے اور کہا کیا تمہارے پاس وہ کھانا ہے؟ میں نے کہا نہیں حضرتؐ نے فرمایا تو پھر میں روزے سے ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روحؔ کی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ حضورؐ ہمارے پاس آتے اور پوچھتے کہ تمہارے یہاں

کھانے کا انتظام ہے؟ میں جواب دیتی نہیں، تو حضرتؐ فرماتے تھے پھر روزے سے ہوں.....
طلحہ بن یحییٰ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن پیغمبرؐ اسلام میرے پاس آئے اور کہا تمہارے پاس کچھ (کھانے کو) ہے؟ میں نے کہا نہیں، حضرتؐ نے فرمایا تو پھر میں روزے سے ہوں۔

۲ ـ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، أخبرني أبوالنضر الفقيه، حدثنا أبوعبدالله محمدبن نصر الإمام، حدثنا أبوكامل الفضيل بن الحسين الجحدري، حدثنا عبدالواحد بن زياد، حدثنا طلحة بن يحيى بن عبيدالله، حدثتني عائشة بنت طلحة، عن عائشة أم المؤمنين رضي الله عنها قالت: قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات يوم: يا عائشة هل عندكم شيء؟ قالت: فقلت: يا رسول الله ما عندنا شيء. قال: فإني صائم[82] ورواه الترمذي، عن هناد، عن وكيع، عن طلحة مثله[83] وروى نحوه بسندين، عن عائشة بنت طلحة وعن عكرمة كلاهما عن عائشة أم المؤمنين[84].

۲۔ .... عائشہ بنت طلحہ حضرت عائشہ سے روایت کرتی ہیں:
ایک دن پیغمبرؐ نے مجھ سے کہا: عائشہ! تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ میں نے کہا: یارسول اللہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، حضورؐ نے فرمایا: تو پھر میں روزے سے ہوں.......

باب دہم

زوال کے بعد روزے کی ابتداء

روایات اہل بیتؑ

۱ ـ محمدبن يعقوب، عن عدة من أصحابنا، عن أحمدبن محمد، عن الحسين بن سعيد، عن فضالة بن أيوب، عن حسين بن عثمان، عن سماعة بن مهران، عن أبي بصير، قال: سألت أباعبدالله

(ع)، عن الصائم المتطوع تعرض له الحاجة؟ قال: هو بالخيار مابينه وبين العصر، وانْ مكث حتى العصر ثم بداله أنْ يصوم وانْ لم يكن نوى ذلك فله أنْ يصوم ذلك إنْ شاء[۸۵].

۱۔ .... ابو بصیر کہتے ہیں: میں نے امام صادقؑ سے مستحبی روزہ رکھنے والے شخص کے بارے میں سوال کیا جسے کوئی ضرورت پیش آجاتی ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا: اسے عصر تک روزہ رکھنے کا اختیار ہے اگر وہ عصر تک موجود رہا اور اس وقت روزہ رکھنے کا خیال آیا تو وہ روزہ رکھ سکتا ہے چاہے اس نے پہلے سے روزے کی نیت نہ بھی کی ہو۔

روایات اہل سنّت:

۱ ــ أخبرنا أبوطاهر الفقيه، أنبأ أبوطاهر المحمدآبادي، حدثنا أبوقلابة، حدثنا روح ابن عبادة، حدثنا سفيان (ح وأخبرنا) أبوسعيد بن أبي عمرو، حدثنا أبوالعباس محمدبن يعقوب، أنبأ الربيع قال: قال الشافعي حكاية، عن بشر بن السري وغيره، عن سفيان الثوري، عن الأعمش، عن طلحة بن مصرف، عن سعدبن عبيدة، عن ابي عبدالرحمن السلمي أن حذيفة رضي الله عنه بداله الصوم بعد مازالت الشمس فصام[۸۶]. أقول ولم أجد في الباب حديثاً عن النبي (ص) من طرق أهل السنة.

۱۔ .... ابو عبدالرحمن السلمی کہتے ہیں: حذیفہ کو زوال کے بعد روزہ رکھنے کا خیال آیا چنانچہ انھوں نے روزہ رکھ لیا۔

اقول: اس سلسلہ میں برادران اہل سنّت کے یہاں پیغمبر اسلام سے کوئی روایت نہیں ملی۔

باب یازدہم

مستحبی روزہ رکھنے والا روزہ توڑ سکتا ہے

روایات اہل بیتؑ :

۱۱

۱ ــ وبإسناده ــ محمدبن الحسن ــ عن سعد، عن حمزة بن يعلي، عن النوفلي (البرقي)، عن عبدالله بن الحسين، عن عبدالله بن سنان، عن أبي عبدالله (ع) قال: صوم النافلة لك أنْ تفطر مابينك وبين الليل متى ماشئت، وصوم قضاء الفريضة لك أنْ تفطر الى زوال الشمس. فإذا زالت الشمس فليس لك أنْ تفطر. ونحوه ما رواه في الإستبصار، عن أحمدبن عبدون، عن علي بن محمدبن الزبير، عن علي بن الحسن بن فضال، عن ابراهيم بن أبي بكربن أبي سماك، عن زكريا المؤمن، عن اسحاق بن عمار، عن أبي عبدالله (ع)[۸۷].

۱ـ .... عبداللہ بن سنان کہتے ہیں امام صادقؑ نے فرمایا، مستحبی روزے میں تمہیں اختیار ہے جب چاہو روزہ توڑ دو، لیکن واجب روزوں کی قضا میں صرف زوال تک روزہ توڑنے کی اجازت ہے زوال کے بعد روزہ توڑنا جائز نہیں ہے ......

۲ ــ وعنه ــ محمدبن الحسن ــ عن العباس بن معروف، عن محمدبن سنان، عن عماربن مروان، عن سماعة، عن أبي عبدالله (ع) في قوله: الصائم بالخيار الى زوال الشمس، قال: إنَّ ذلك في الفريضة فأما في النافلة فله أنْ يفطر أي وقت شاء الى غروب الشمس. محمدبن الحسن بإسناده عن علي بن الحسن بن فضال، عن ابراهيم بن أبي بكربن أبي سماك، عن زكريا المؤمن، عن اسحاق بن عمار، عن أبي

توحید ۴۸

عبدالله. ورواه في الكافي عن احمدبن محمد، عن العباس ابن معروف، عن صفوان بن يحيى، عن ابن سنان، عن عماربن مروان مثله[88].

۲۔ .... سماعہ، امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے اپنے اس قول "روزے دار کو صرف زوال تک روزہ توڑنے کی اجازت ہے" کے سلسلہ میں فرمایا: یہ واجب روزے کے بارے میں ہے، لیکن مستحبی روزے کو غروب آفتاب تک جب چاہو توڑ سکتے ہو۔.......

روایات اہل سنت:

١ ـ أخبرنا أبوذر محمد بن الحسين بن أبي القاسم المذكر، حدثنا يحيى بن منصور القاضي، حدثنا أبوعمرو أحمد بن المبارك المستملي، حدثنا محمد بن رافع، حدثنا يحيى بن أبي الحجاج، حدثنا حاتم بن أبي صغيرة، عن سماك بن حرب، عن أبي صالح، عن أم هانىء رضي الله عنها قالت: دخل عليَّ رسول الله (ص) فاستسق، فشرب، فناولني سؤرة وأنا صائمة، فشربت سؤر رسول الله (ص) فقلت: يا رسول الله فعلت شيئاً لا أدري أصبت أم أخطأت. ناولتني سؤرك وأنا صائمة فكرهت أن أردَّ سؤر رسول الله (ص)، قال: أمتطوعة أم قضاء من رمضان؟ قلت: متطوعة. قال: المتطوع بالخيار إنْ شاء صام وإنْ شاء أفطر. وروى الترمذي بأسانيد[89] وروى أبو داود نحوه، عن عثمان، عن جرير، عن يزيد، عن عبدالله بن الحارث، عن أم هانئ[90] وروى الدارقطني ذيله، عن القاضي المحاملي، عن محمدبن حسان الأزرق، عن يحيى مثله. وروى نحوه أيضاً بأسانيد متعددة فراجع[91].

۱۔ .... حضرت ام ہانی کہتی ہیں: رسول اللہ میرے پاس تشریف لائے اور مجھ سے پانی طلب میں نے حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا، آپ نے پانی پی کر بچا ہوا

پانی مجھے دے دیا درحالیکہ میں روزے سے تھی، میں رسول اللہ کا جھوٹا پانی پی گئی اس کے بعد میں نے کہا یا رسول اللہ: میں نے ایک ایسا کام کیا ہے جس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ وہ صحیح تھا یا غلط، آپ نے مجھے اپنا جھوٹا پانی دیا حالانکہ میں روزے سے تھی مگر میں نے رسول کے جھوٹے پانی کو واپس کرنا اچھا نہیں سمجھا، حضرت نے فرمایا: مستحبی روزہ تھا یا قضاء رمضان؟ میں نے کہا: مستحبی، حضرت نے فرمایا: مستحبی روزہ رکھنے والے کو اختیار ہے چاہے روزہ باقی رکھے یا توڑ دے ....

٢ ـ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، أخبرني أبوالنضر الفقيه، حدثنا أبوعبدالله محمدبن نصر الإمام، حدثنا أبوكامل، حدثنا عبدالواحد بن زياد (قال وأخبرني) أبوعمرو، حدثنا عبدالله، بن محمد، حدثنا بشربن معاذ العقدي، حدثنا عبدالواحد بن زياد، حدثنا طلحة بن يحيى بن طلحة بن عبيدالله، حدثتني عائشة بنت طلحة، عن عائشة أم المؤمنين، قالت: قال لي رسول الله (ص) ذات يوم: يا عائشة هل عندك شيء؟ قالت: قلت: لا والله ما عندنا شيء. قال: فإني صائم. قالت: فخرج رسول الله (ص) فاهديت لنا هدية أوجاءنا زور، فلما رجع رسول الله (ص) قلت: يا رسول الله أهديت لنا هدية أوجاءنا زور وقد خبّأت لك شيئاً، قال: ماهو؟ قلت: حيس. قال: هاتيه، فجئت به، فأكل، ثم قال: قد كنت أصبحت صائماً[٩٢] ورواه الترمذي باختلاف يسير في الألفاظ، عن محمودبن غيلان، عن بشربن السري، عن سفيان، عن طلحة[٩٣]. ورواه مسلم، عن فضيل بن حسين، عن عبدالواحد بن زياد مثله[٩٤]. وأخرجه عبدالرزاق باختلاف يسير، عن اسرائيل، عن سماك، عن بنت طلحة مثله[٩٥]. وأخرجه النسائي ونحوه بأسانيد عديدة، فراجع[٩٦].

٢- .... عائشہ بنت طلحہ حضرت عائشہ سے روایت کرتی ہیں: ایک دن رسول اللہ نے مجھ سے فرمایا: عائشہ! تمہارے پاس کھانے کی کوئی چیز ہے؟ میں نے

کہا، خدا کی قسم میرے پاس کچھ بھی نہیں، آپؑ نے فرمایا: تو پھر میں روزے سے ہوں۔ حفـ
عائشہ کہتی ہیں، رسول اللہ گھر سے چلے گئے۔ آپ کے جانے کے بعد ہمارے پاس کوئی تحفہ آیا یا مہ
آگیا، پھر جب رسول اللہ واپس تشریف لائے تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ میرے پا
تحفہ آیا تھا یا مہمان آگئے تھے میں نے اس میں سے آپ کے لیے کچھ بچا لیا ہے، حضرت نے
وہ کیا چیز ہے؟ میں نے عرض کیا، "حیس" (ایک قسم کا کھانا) حضرت نے فرمایا اسے لاؤ،
آپ کی خدمت میں پیش کر دیا، حضرت نے اسے کھا لیا اور فرمایا میں نے تو روزہ رکھ
تھا..........

باب دوازدہم

ماضی میں روزوں کی کیفیت

روایات اہل بیتؑ؛

۱ ـ محمد بن يعقوب، عن محمد بن اسماعيل، عن الفضل بن شاذان وعن أحمد بن ادريس، عن محمد بن عبدالجبار، جميعاً عن صفوان بن يحيى، عن ابن مسكان، عن أبي بصير يعني المرادي، عن أحدهما عليهما السلام في قول الله عزّوجلّ: «أحل لكم ليلة الصيام الرفث الى نسائكم» الآية، فقال: نزلت في خوات بن جبير الأنصاري وكان مع النبي (ص) في الخندق وهو صائم، فأمسى وهو على تلك الحال، وكانوا قبل أن تنزل هذه الآية إذا نام أحدهم حرم عليه الطعام والشراب، فجاء خوات الى أهله حين أمسى، فقال: هل عندكم طعام؟ فقالوا: لا تنم حتى نصلح لك طعاماً، فاتكأ، فنام، فقالوا له: قد غفلت، قال: نعم. فبات على تلك الحال. فأصبح، ثم غدا الى الخندق، فجعل يغشى عليه، فمرّ به رسول الله (ص) فلما رأى الذي به أخبره كيف كان أمره، فأنزل عزّوجلّ فيه الآية: «وكلوا واشربوا حتى يتبيّن لكم الخيط

الأبيض من الخيط الأسود من الفجر». ونقله في البحار، عن العياشي، عن سماعة، عن الصادق (ع)[٩٧]. ورواه الصدوق بسنده، عن أبي بصير[٩٨].

۱۔ .... ابو بصیر مرادی، آیہ شریفہ "احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم" کے سلسلہ میں امام محمد باقرؑ یا امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت "خوات بن جبیر انصاری" کے سلسلہ میں اس وقت نازل ہوئی جب وہ پیغمبرؐ کے ہمراہ خندق میں موجود تھے، خوات اس دن روزے سے تھے اور اس آیت کے نزول سے پہلے حکم یہ تھا کہ اگر کوئی روزے دار رات میں سو جاتا تھا تو اس پر کھانا پینا حرام ہو جاتا تھا۔ چنانچہ جب "خوات" شام کو گھر آئے، پوچھا، کھانا تیار ہے؟ جواب ملا: سونا نہیں ابھی تمہارے لیے کھانا تیار کر دیا جائے گا چنانچہ خوات ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور انہیں نیند آگئی، جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا تم غفلت کی نیند سو گئے تھے جواب دیا: ہاں، چنانچہ وہ بھوکے ہی سو رہے اور دوسرے دن اسی روزے کے عالم میں خندق روانہ ہو گئے وہاں بھوک سے ان پر غشی طاری ہونے لگی، اتنے میں رسول اللہؐ کا گذر ہوا جب آپ نے یہ حال دیکھ لیا تو اس وقت خدا وند عالم نے یہ آیت نازل فرمائی: "وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر" یعنی روزے دار صبح صادق کے نمودار ہونے تک کھا پی سکتا ہے۔۔

روایات اہل سنت:

١ ــ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، أنبأ الحسن بن حمشاذ، حدثنا ابراهيم بن عبدالرحيم بن عمار بن دنوقا (ح وأخبرنا) أبوعبدالله الحافظ، أخبرني أبوعبدالله محمدبن أحمد الجوهري ببغداد، حدثنا أبوجعفر أحمد بن موسى الشطوي، قالا: حدثنا محمدبن سابق، حدثنا اسرائيل، عن أبي اسحاق، عن البراء، قال: كان الرجل من أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم إذا كان صائماً فحضر الإفطار فنام قبل أن يفطر لم يأكل ليلته ولايومه حتى يمسي، وان قيس بن صرمة كان صائماً، فلما حضر

الإفطار أتى إمرأته؛ قال: هل عندك طعام؟ قالت: لا، ولكن انطلق فاطلب. وكان يومه يعمل فيه بأرضه، فغلبته عيناه، فجاءت إمرأته، فلما رأته قالت: خيبة لك فأصبح فلم ينتصف النهار حتى غشي عليه، فذكرت ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم، فنزلت هذه الآية «أحل لكم ليلة الصيام الرفث الى نسائكم هُنَّ لباس لكم وأنتم لباس لهُنَّ» ففرحوا بها فرحاً شديداً «وكلوا وآشربوا حتى يتبين لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر»[99] ورواه البخاري، عن عبيدالله بن موسى، عن اسرائيل مثله[100]. ورواه ابوداود، عن نصر بن علي بن نصر الجهضمي، عن أبي أحمد، عن اسرائيل[101]. وأخرجه الدارمي كالبخاري[102].

۱۔ .... براء سے روایت ہے: جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی صحابی روزہ رکھتا تھا اور افطار کرنے سے پہلے سو جاتا تھا تو پھر وہ پوری رات اور پورا دن کچھ نہیں کھاتا تھا یہاں تک کہ دوسری شب آجاتی تھی، چنانچہ قیس بن صرمہ روزے سے تھے وقت افطار اپنی اہلیہ سے کھانے کے متعلق دریافت کیا انھوں نے کہا کچھ ہے تو نہیں لیکن میں جا کر لے آتی ہوں۔ قیس اس روز دن بھر اپنے کھیت میں کام کرتے رہے تھے چنانچہ ان کی آنکھ لگ گئی، جب ان کی اہلیہ واپس آئیں تو دیکھا کہ قیس سو چکے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہا افسوس ہے تمہارے لیے! چنانچہ قیس کچھ کھائے پیئے بغیر دوسرے دن بھی روزہ رہے ابھی آدھا دن بھی نہ گذرا تھا کہ انھیں غش آگیا، اس واقعہ کی خبر پیغمبر اکرمؐ کو دی گئی اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: "احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم ھن لباس لکم وانتم لباس لھن" تو اس وقت لوگ بہت خوش ہوئے "وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود" ....

باب سیزدہم

آغاز روزہ کا وقت

روایاتِ اہلِ بیتؑ :

١ ـ محمد بن يعقوب، عن عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد، عن علي بن الحكم، عن عاصم بن حميد، عن أبي بصير قال: سألت أبا عبدالله (ع) فقلت: متى يحرم الطعام والشراب على الصائم وتحل الصلاة صلاة الفجر؟ فقال: إذا اعترض الفجر وكان كالقبطية البيضاء فثم يحرم الطعام ويحل الصيام وتحل الصلاة صلاة الفجر (الحديث)[١٠٣].

١. .... ابو بصیر کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا: روزے دار پر کھانا پینا کب حرام ہوتا ہے اور نماز صبح کا وقت کب سے شروع ہوتا ہے؟ حضرتؑ نے جواب دیا: جب فجر افقی شکل میں نمودار اور سفید قبطی عورت کی مانند (واضح و روشن) ہوجائے اس وقت کھانا پینا حرام، روزہ شروع اور نماز صبح کا وقت ہوجائے گا۔

٢ ـ وأرسل الصدوق (ره) في الفقيه قال: وسُئل الصادق (ع) عن الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر، فقال: بياض النهار من سواد الليل[١٠٤]. أقول ولعله إشارة الى مارواه محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه وعن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد، جميعاً عن ابن أبي عمير، عن حماد، عن الحلبي، قال: سألت أباعبدالله (ع) عن الخيط الأبيض من الخيط الأسود، فقال: بياض النهار من سواد الليل (الحديث)[١٠٥]. ونقله في البحار، عن العياشي، عن الحلبي مثله[١٠٦].

٢. .... امام صادقؑ سے سفید دھاگے کے کالے دھاگے سے جدا ہونے کے سلسلہ میں دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ دن کی سفیدی (روشنی) رات کی سیاہی (تاریکی) سے جدا ہوجائے ....

روایات اہل سنّت:

۱ ـ حدثنا أبوالقاسم بن منيع، حدثنا داود بن رشيد أبوالفضل الخوارزمي، حدثنا الوليدبن مسلم، عن الوليد بن سليمان، قال: سمعت ربيعة بن يزيد، قال: سمعت عبدالرحمن بن عائش صاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم، يقول: الفجر فجران، فأما المستطيل في السماء فلا يمنعن السحور ولا تحل فيه الصلاة، وإذا اعترض فقد حرم الطعام فصلّ صلاة الغداة[۱۰۷].

۱۔ .... ربیعہ بن یزید کہتے ہیں میں نے عبدالرحمن ابن عائش صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سنا ہے: فجر دو طرح کی ہوتی ہے ایک آسمان میں عمودی و مستطیل شکل کی ہوتی ہے اس وقت نہ سحر کا کھانا حرام ہوتا ہے اور نہ نماز صبح کا وقت ہوتا ہے لیکن جب افقی شکل میں فجر نمودار ہو جائے اس وقت کھانا پینا حرام اور نماز صبح کا وقت داخل ہو جاتا ہے۔

۲ ـ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ بنيسابور، وأبوالحسن محمدبن يعقوب بن أحمد الفقيه بالطابران، قالا: أنبأ أبوالنضر محمدبن محمدبن يوسف الفقيه، حدثنا عثمان بن سعيد الدارمي، حدثنا عمروبن عون الواسطي، حدثنا هشيم، عن حصين، عن الشعبي، عن عدي بن حاتم، قال: لما نزلت آية «كلوا واشربوا حتى يتبيّن لكم الخيط الأبيض من الخيط الأسود من الفجر» عمدت الى عقالين: عقال أبيض، وعقال أسود، فجعلتها تحت وسادتي، فجعلت أقوم من الليل فأنظر فلا يتبيّن لي، فلما أصبحت غدوت الى النبي (ص) فأخبرته، فضحك، فقال: إنْ كان وسادك لعريضاً إنما ذاك بياض النهار من سواد الليل[۱۰۸]. ورواه مسلم باختلاف يسير، عن ابن أبي شيبة، عن ابن ادريس، عن حصين، عن الشعبي مثله[۱۰۹]، وأخرجه البخاري، عن حجاج بن منهال، عن

هشیم مثله[110]. وأخرج النسائي، عن علي بن حجر، عن جرير، عن مطرف، عن الشعبي نحوه[111]. وأخرجه أبوداود، عن مسدد، عن حصين[112]. وأخرجه الدارمي، عن أبي الوليد، عن شريك، عن حصين[113].

۲۔ .... عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ جس وقت آیت "کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر" نازل ہوئی تو میں نے دو عقال، ایک سفید دوسری سیاہ لی اور اسے تکیے کے نیچے رکھ دیا، رات میں اٹھ اٹھ کر میں اسے دیکھتا تھا، سفید عقال کالی عقال سے جدا ہوئی یا نہیں، لیکن اس میں کوئی تبدیلی نہ آئی، صبح کو میں نے پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا بیان کیا، حضرتؐ نے ہنس کر فرمایا شاید تمہارا تکیہ بہت چوڑا تھا، اس (سفید دھاگے کے کالے دھاگے سے جدا ہونے) کا مطلب یہ ہے کہ دن کی روشنی رات کی تاریکی سے جدا ہو جائے ....

باب چہاردہم

وقتِ افطار

روایاتِ اہل بیتؑ:

۱ ـ محمدبن المفيد في (المقنعة) قال: حُدَّ دخول الليل مغيب قرص الشمس، وعلامة مغيب القرص عدم الحمرة من المشرق، فإذا عدمت الحمرة من المشرق سقط الخطر وحل الإفطار. وقد روي عن أبي عبدالله (ع) في حد دخول الليل ما ذكرناه بصفته ومعناه الذي قدمناه[114].

۱۔ محمد بن مفید کتاب "مقنعة" میں فرماتے ہیں: دخول شب کا مطلب سورج کی ٹکیہ کا غائب ہو جانا ہے اور سورج کی ٹکیہ کے غائب ہو جانے کی علامت یہ ہے کہ مشرق کی سرخی

معدوم ہوجائے چنانچہ جس وقت مشرق کی سرخی زائل ہوجائے کھانے پینے سے ممانعت ختم ہوجائے گی اور افطار کا وقت آجائے گا۔ دخول شب کی یہی تعریف امام صادق علیہ السلام نے بھی فرمائی ہے

٢ ــ قال الصدوق (ره) وقال الصادق (ع): إذا غابت الشمس، فقد حلّ الإفطار ووجبت الصلاة[115]. ونقله في البحار، عن الهداية مرسلاً عن الصادق (ع) مثله[116]. وروى الفقيه، عن عمرو بن شمر، عن جابر، عن أبي جعفر (ع) نحوه[117].

۲۔ صدوق کہتے ہیں، امام صادقؑ کا ارشاد ہے: جب سورج ڈوب جائے تو افطار جائز اور نماز واجب ہوجائے گی ....

روایات اہل سنت:

١ ــ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، حدثنا علي بن حمشاذ العدل، حدثنا بشر بن موسى، حدثنا الحميدي، حدثنا سفيان، حدثنا هشام بن عروة، أخبرني أبي، قال: سمعت عاصم بن عمر يحدث عن أبيه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا أقبل الليل من ههنا، وأدبر النهار من ههنا، وغربت الشمس، فقد أفطر الصائم[118]. ورواه الترمذي، عن هارون بن اسحاق الهمداني، عن عبده بن سليمان، عن هشام بن عروة مثله[119]. ورواه مسلم، عن ابن يحيى، عن أبي معاوية وان نمير، عن أبي وأبي كريب، عن أبي أسامة، جميعاً عن هشام مثله[120]. ورواه عبدالرزاق، عن ابن عيينه مثله[121]. ورواه البخاري، عن الحميدي مثله[122]. ورواه أبوداود، عن أحمد بن حنبل، عن وكيع، عن هشام (ح) وعن مسدد، عن عبدالله بن داوود، عن هشام مثله[123].

۱۔ .... عاصم بن عمر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا: جب شب یہاں سے نمودار ہو اور دن یہاں سے رخصت ہو اور آفتاب ڈوب جائے اس وقت روزے دار افطار کرے گا.......................

٢ ــ حدثنا أبومحمد عبدالله بن يوسف الأصبهاني، أنبأ أبوعبدالله محمدبن يعقوب الشيباني، حدثنا محمدبن عمرو الحرشي، حدثنا يحيى بن يحيى، أنبأ هشيم، عن أبي اسحاق الشيباني، عن عبدالله بن أبي أوفى، قال: كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في سفر في شهر رمضان، فلما غابت الشمس، قال: يا فلان أنزل فاجدح لنا. قال يا رسول الله: إن عليك نهاراً. قال: انزل فاجدح لنا. فنزل فجدح له، فأتاه به، فشربه النبي صلى الله عليه وسلم، ثم قال بيده: إذا غابت الشمس من ههنا وجاء الليل من ههنا فقد أفطر الصائم[١٢٤]. ورواه مسلم، عن يحيى بن يحيى مثله[١٢٥]. وروى البخاري نحوه، عن اسحاق الواسطي، عن خالد، عن الشيباني وأخرجه عن مسدد، عن عبدالواحد، عن الشيباني[١٢٦]. وأخرجه أبوداود، كالبخاري في الثاني[١٢٧]. ورواه الحميدي، عن سفيان، عن الشيباني[١٢٨].

٢- .... عبداللہ بن اوفی کہتے ہیں: ماہ رمضان میں ہم رسول اللہؐ کے ہمسفر تھے، جب آفتاب ڈوب گیا تو حضورؐ نے فرمایا: اے فلاں! اترو اور میرے لیے ستو گھول دو، اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! ابھی تو دن باقی ہے، حضورؐ نے فرمایا: اترو اور ستو گھولو۔ اس شخص نے اتر کر گھول دیا، ستو پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا حضرت نے ستو پینے کے بعد ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: جب یہاں سے سورج غائب ہو جائے اور یہاں سے شب نمودار ہو تو اس وقت روزے دار افطار کرے گا ....

باب پانزدہم

فجر کے بعد کھانے پینے والا

رمضان میں روزہ کامل کرے گا اور قضاء رمضان کے روزے کو توڑدے گا

روایات اہل بیتؑ:

۱ ـ عن محمد بن اسماعيل، عن الفضل بن شاذان، عن صفوان بن يحيى، عن اسحاق بن عمار قال: قلت لأبي ابراهيم (ع) يكون عليَّ اليوم واليومان من شهر رمضان فأتسحر مصبحاً؟ أفطر ذلك اليوم وأقضي مكان ذلك يوماً آخر أو أتم على صوم ذلك اليوم وأقضي يوماً آخر[۱۲۹].

۱۔ .... اسحاق بن عمار کہتے ہیں، میں نے ابو ابراہیمؑ سے عرض کیا مجھ پر ماہ رمضان کے ایک دو دن کے روزے باقی ہیں لیکن میں نے صبح کو سحر کھایا ہے، ایسی صورت میں اپنے روزے کو توڑ دوں اور کسی اور دن قضا رکھوں یا اس روزہ کو مکمل کروں اور اس کے بدلے میں قضا بھی رکھوں؟ حضرتؑ نے جواب دیا، نہیں بلکہ تم اپنے روزہ کو توڑ دو کیونکہ تم نے صبح ہونے کے بعد کھایا ہے اور کسی اور دن قضا رکھو۔

۲ ـ محمد بن يعقوب، عن عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد، عن الحسين بن سعيد، عن القاسم بن محمد، عن علي بن أبي حمزة، عن أبي ابراهيم (ع) قال: سألته، عن رجل شرب بعد ما طلع الفجر وهو لا يعلم في شهر رمضان؟ قال: يصوم يومه ذلك و يقضي يوماً آخر، وإنْ كان قضاء لرمضان في شوال أو غيره فشرب بعد الفجر فليفطر يومه ذلك و يقضي[۱۳۰].

۲۔ .... ابو حمزہ کہتے ہیں میں نے ابو ابراہیمؑ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے طلوع فجر کے بعد پانی پیا تھا اور اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ماہ رمضان میں ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا اس دن روزہ پورا کرے گا اور اس کے بدلے ایک قضا، روزہ بھی رکھے گا، لیکن اگر وہ روزہ شوال وغیرہ میں قضاء رمضان کا ہو تو بعد از فجر پانی پینے کی صورت میں روزہ توڑ دے گا۔ اور بعد میں اس کی قضا کرے گا۔

روایات اہل سنت:

١ ـ وحدثنا سعيد، حدثنا عمر بن عبدالواحد، من أهل دمشق، عن النعمان بن المنذر الغساني، عن مكحول، قال: سُئل أبوسعيد الخدري عن رجل تسحّر وهو يرى أن عليه ليلاً وقد طلع الفجر؟ قال: إنْ كان شهر رمضان صامه وقضى يوماً مكانه، وإنْ كان من غير شهر رمضان فليأكل من آخره فقد أكل من أوله[131].

١۔ .... مکول سے روایت ہے کہ ابوسعید خدری سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جس نے یہ سمجھ کر سحر کھائی کہ ابھی شب باقی ہے حالانکہ فجر طلوع ہو چکی تھی ؟ انھوں نے جواب دیا اگر ماہ رمضان ہو تو روزہ کو پورا کرے گا اور بعد میں کسی دن اس کی قضا بجالائے گا، لیکن اگر غیر ماہ رمضان ہو تو روزہ توڑ دے گا۔

٢ ـ أخبرنا أبونصر بن قتادة، أنبأ أبومنصور العباس بن الفضل النضروي، حدثنا أحمد بن نجدة، حدثنا سعيد بن منصور، حدثنا هشيم، قال: حدثنا خالد ومنصور، عن ابن سيرين، عن يحيى بن الجزار، قال: سُئل إبن مسعود عن رجل تسحّر وهو يرى أن عليه ليلاً وقد طلع الفجر؟ فقال: من أكل من أول النهار فليأكل من آخره[132]. أقول ولم أجد في الباب حديثاً عن النبي (ص) من طرق أهل السنة.

٢۔ .... یحییٰ بن جزار کہتے ہیں، ابن مسعود سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جس نے طلوع فجر کے بعد رات سمجھتے ہوئے سحری کھائی تھی ؟ انھوں نے کہا جس شخص نے دن کے ابتدائی حصہ میں کھالیا وہ آخری حصہ میں بھی کھا سکتا ہے (یعنی روزہ توڑ دے گا)

اقول : مجھے اس باب میں برادران اہل سنت کے یہاں پیغمبر اسلام سے کوئی روایت نہیں ملی۔

باب شانزدہم
صبح ہونے تک کھانا پینا جائز ہے۔

روایاتِ اہل بیتؑ:

۱ ـ محمدبن الحسن بإسناده عن محمدبن علي بن محبوب، عن أحمد البرقي، عن جعفربن المثنى، عن اسحاق بن عمار، قال: قلت لأبي عبدالله (ع) آكل في شهر رمضان بالليل حتى أشك، قال: كل حتى لا تشك[۱۳۳].

۱۔ . . . . اسحاق بن عمار سے روایت ہے کہ انھوں نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں ماہ رمضان میں شب میں کھاتا ہوں یہاں تک کہ مجھے (طلوع فجر کا) شک ہونے لگتا ہے، حضرتؑ نے فرمایا: کھاؤ، یہاں تک کہ (طلوع فجر کا) یقین ہو جائے۔

روایاتِ اہل سنّت:

۱ ـ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ وأبوسعيد بن أبي عمر، قالا: حدثنا أبوالعباس محمدبن يعقوب، حدثنا اسيد بن عاصم، حدثنا الحسين بن حفص، عن سفيان، حدثني الأعمش والحسن بن عبيدالله، عن أبي الضحى أن رجلاً قال لإبن عباس: متى أدع السحور؟ فقال رجل: إذا شككت. فقال ابن عباس: كل ما شككت حتى يتبيّن لك. ونحوه بسند آخر عن ابن عباس. وقال البيهقي: إنه روي في هذا الباب عن أبي بكر وعمر وابن عمر[۱۳۴]. وأخرج عبدالرزاق في هذا المعنى، عن معمر، عن أنس، عن أبي بكر وعن وهب بن نافع، عن عكرمة، عن ابن عباس، عن ابن عيينة، عن الحسن بن عبيدالله، عن مسلم بن صبيح[۱۳۵]. أقول ولم أجد في الباب حديثاً عن النبي (ص) من طرق أهل السنة.

۱۔ . . . . ابوالضحیٰ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ابن عباس سے کہا: سحر کھانا کب چھوڑ دوں؟ کسی شخص نے جواب دیا جب تمھیں (طلوع فجر کا) شک ہو جائے، ابن عباس نے: جب تک شک رہے کھا سکتے ہو یہاں تک کہ (طلوع فجر کا) یقین

ہو جائے ....

باب ہفدہم

ماہ رمضان میں عمداً افطار کرنے والے کا کفارہ

روایات اہل بیتؑ:

١ ـ محمد بن يعقوب، عن عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد بن عيسى، عن الحسن بن محبوب، عن عبدالله بن سنان، عن أبي عبدالله (ع) في رجل أفطر في شهر رمضان متعمداً يوماً واحداً من غير عذر، قال: يعتق نسمة، أو يصوم شهرين متتابعين، أو يطعم ستين مسكيناً، فإنْ لم يقدر تصدَّق بما يطيق. ورواه الصدوق بإسناده عن الحسن بن محبوب. ورواه الشيخ بإسناده عن محمد بن علي بن محبوب، عن العباس، عن أبي المغيرة (أبي المعزى)، عن عبدالله بن سنان مثله[١٣٦].

١. .... عبداللہ بن سنان اس شخص کے بارے میں جس نے ایک دن ماہ رمضان میں بلا عذر جان بوجھ کر عمداً روزہ افطار کر لیا تھا، امام صادقؑ کا یہ قول نقل کرتے ہیں: ایک غلام آزاد کرے گا، یا دو ماہ پے درپے روزہ رکھے گا یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے گا اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو حسب استطاعت صدقہ کرے گا.........

روایات اہل سنّت:

١ ـ حدثنا الحسين بن اسماعيل، حدثنا عبدالله بن شبيب، حدثنا ابن أبي أويس، حدثني أبي، عن أبي بكر بن اسماعيل بن

محمدبن سعد (ح) وحدثنا أبوبكر النيسابوري وعلي بن محمدبن عبيد، قالا: حدثنا محمدبن اسحاق، حدثنا محمدبن عمر، حدثنا أبوبكر بن اسماعيل، عن أبيه، عن عامر بن سعد، عن أبيه أنه قال: جاء رجل الى النبي (ص)، فقال أفطرت يوماً من شهر رمضان متعمداً، فقال (ص): اعتق رقبة أوصم شهرين متتابعين أو أطعم ستين مسكيناً[١٣٧]. أقول ومرّ في الفصل الرابع باب عدم جواز المواقعة للصائم ماينفع في هذا الباب بكلا طريقيه●

۱- .... عامر بن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں: ایک شخص نے پیغمبر کی خدمت آکر کہا: میں نے ایک دن ماہ رمضان میں عمداً افطار کیا ہے۔ حضرت نے فرمایا: ایک غلام آزاد کردیا دو ماہ پے درپے روزے رکھو یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ...........

حواشی

٧٣ ـ الوسائل ج ٧، ص ٢٠٢، ـ الكافي ج ٤، ص ٧٨.
٧٤ ـ الوسائل ج ٧، ص ٢٠٢ ـ والإستبصار ج ٢، ص ٧٤.
٧٥ ـ البيهقي ج ٤، ص ٢١٣.
٧٦ ـ الوسائل ج ٧، ص ٢١٤.
٧٧ ـ البيهقي ج ٤، ص ٢٥١.
٧٨ ـ مصنف عبدالرزاق ج ٤، ص ١٥٧. وفيه: صمنا مع علي.
٧٩ ـ الوسائل ج ٤، ص ٤.
٨٠ ـ الوسائل ج ٧، ص ٦.
٨١ ـ البيهقي ج ٤، ص ٢٠٣.

٨٢ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٠٣.
٨٣ ــ الترمذي ج ٣، ص ١١١.
٨٤ ــ الدارقطني ج ٢، ص ١٧٥.
٨٥ ــ الوسائل ج ٤، ص ٧.
٨٦ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٠٤.
٨٧ ــ الوسائل ج ٧، ص ١٠ ــ والإستبصار ج ٢، ص ١٢٠ و ١٢٢.
٨٨ ــ الوسائل ج ٧، ص ١٠ ــ والكافي ج ٤، ص ١٢٢.
٨٩ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٧٦. وقد روى البيهقي هذا الحديث مع اختلاف في بعض ألفاظه وزيادات بأربعة أسانيد ج ٤، ص ٢٧٦ و ٢٧٧ وبإسنادين آخرين ص ٢٧٨ و ٢٧٩ مع اختلاف في المعنى، حيث فيها تخيير بين قضاء الصوم التطوعي وعدم قضائه. والترمذي ج ٣، ص ١٠٩.
٩٠ ــ ابوداوود ج ٢، ص ٣٢٩.
٩١ ــ الدارقطني ج ٢، ص ١٧٥ و ١٧٤.
٩٢ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٧٤. ورواه مع اختلاف في المعنى بأسانيد متعددة ص ٢٧٥.
٩٣ ــ الترمذي ج ٣، ص ١١١.
٩٤ ــ مسلم ج ٣، ١٥٩.
٩٥ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤، ص ٢٧٧.
٩٦ ــ النسائي ج ٤، ص ١٩٣ و ١٩٤ و ١٩٥.
٩٧ ــ الوسائل ج ٧، ص ٧٩ ــ الكافي ج ٤، ص ٩٨ ــ والبحار ج ٩٣، ط ح، ص ٢٦٩.
٩٨ ــ الفقيه ج ٢، ص ٨١.
٩٩ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٠١.
١٠٠ ــ البخاري ج ٣، ص ٣٤.
١٠١ ــ سنن أبي داوود ج ٢، ص ٢٩٥.
١٠٢ ــ الدارمي ج ٢، ص ٥.
١٠٣ ــ الوسائل ج ٧، ص ٧٩ ــ الكافي ج ٤، ص ٩٩.
١٠٤ ــ من لايحضره الفقيه ج ٢، ص ٨٢ ــ الوسائل ج ٧، ص ٨٠ ــ والبحار ج ٩٣، ط ح، ص ٢٧١.
١٠٥ ــ الوسائل ج ٧، ص ٧٨ ــ الكافي ج ٤، ص ٩٨.

١٠٦ ــ من لايحضره الفقيه ج ٢، ص ٨٢ ــ الوسائل ج ٧، ص ٨٠ ــ والبحار ٩٣، ط. حـ، ص ٢٧١.
١٠٧ ــ الدارقطني ج ٢، ص ١٦٥.
١٠٨ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢١٥.
١٠٩ ــ مسلم ج ٣، ص ١٢٨.
١١٠ ــ البخاري ج ٣، ص ٣٥.
١١١ ــ النسائي ج ٤، ص ١٤٨. وليس فيه سوى أن محدياً سأل النبي (ص) عن الآية فأجابه: سواد الليل وبياض النهار.
١١٢ ــ أبوداوود ج ٢، ص ٣٠٤.
١١٣ ــ الدارمي ج ٢، ص ٥.
١١٤ ــ الوسائل ج ٧، ص ٩٠.
١١٥ ــ الوسائل ج ٧، ص ٩٠ ــ والبحار ٩٣، ط ح، ص ٣١١.
١١٦ ــ نفس المصدر السابق.
١١٧ ــ الفقيه ج ٢، ص ٨١ وفيه (إذا غاب القرص أفطر الصائم ودخل وقت الصلاة).
١١٨ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢١٦.
١١٩ ــ الترمذي ج ٣، ص ٨١.
١٢٠ ــ مسلم ج ٣، ص ١٣٢ وليس في لفظ الحديث (من هينا).
١٢١ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤، ص ٢٢٧، وليس في لفظ الحديث (من هينا).
١٢٢ ــ البخاري ج ٣، ص ٤٤.
١٢٣ ــ أبوداوود ج ٢، ص ٣٠٤. وفيه أن الشطر الأخير (وغربت... الخ) زيادة مسدد. وبدل (أقبل وأدبر) (جاء).
١٢٤ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢١٦.
١٢٥ ــ مسلم ج ٣، ص ١٣٢.
١٢٦ ــ البخاري ج ٣، ص ٤٤ و ٤٥ وليس في الثاني (إذا غابت الشمس).
١٢٧ ــ أبوداوود ج ٢، ص ٣٠٥ وفيه (يا بلال) بدل (يا فلان) وفيه تكرار الأمر ثلاث مرات لأنّ بلال أجابه في المرة الأولى: لو أمسيت، وفي الثانية كما هو الموجود. وليس فيه (إذا غابت الشمس).
١٢٨ ــ مسند الحميدي ج ٢، ص ٣١٢ وليس فيه ذكر الشمس.

١٢٩ ــ الوسائل ج ٧، ص ٨٣ ــ الكافي ج ٤، ص ٩٧، ولكن سند الحديث عنده يبتدئ بـ «صفوان بن يحيى».
١٣٠ ــ الوسائل ج ٧، ص ٨٢ و٨٣ ــ الكافي ج ٤، ص ٩٧.
١٣١ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢١٦.
١٣٢ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢١٦.
١٣٣ ــ الوسائل ج ٧، ص ٨٦.
١٣٤ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٢١.
١٣٥ ــ عبدالرزاق ج ٤، ص ١٧٢.
١٣٦ ــ الوسائل ج ٧، ص ٢٨ ــ والكافي ج ٤، ص ١٠١ ــ والفقيه ج ٢، ص ٧٢ ــ والإستبصار ج ٢، ص ٩٦.
١٣٧ ــ الدارقطني ج ٢، ص ٢٠٨.

علامہ طباطبائی طاب ثراہ
ترجمہ: جناب محمد حسن معروفی

جب سے اس کرۂ ارض پر نوع انسانی کا وجود ہوا اور اس نے اجتماعی زندگی بسر کرنا شروع کی اسی وقت سے وہ اپنی پیدائش اور اجتماعی نظام زندگی کے قیام اور بقا کے لیے عورت کا محتاج رہا ہے۔ مرد اپنی بقا اور حیات میں عورت سے ہرگز مستغنی نہیں رہا ہے۔

چونکہ انسانی معاشرہ چاہے متمدن انسانوں کا ہو یا جنگلی افراد کا۔ اپنی اجتماعی زندگی میں ہمیشہ کچھ اصول مثلاً عادات و رسومات یا درست و نادرست، عادلانہ یا جابرانہ قوانین کا پابند رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں سے مخصوص قوانین بھی ہر قبیلہ اور جماعت اور ہر قوم و ملت میں وضع ہوتے رہے ہیں۔

جیسا کہ کسی بھی انسانی معاشرہ میں رائج رسوم و قوانین، قدرتی حالات و اسباب مثلاً آب و ہوا، علاقائی رسم و رواج، طرز حیات نیز تجربات زندگی کا نتیجہ ہوتے ہیں طبیعت کے تغیر اور ارتقا میں جو قانون کار فرما ہے معاشرہ بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوتا رہتا ہے، اس لیے کہ معاشرہ بھی ایک طرح اسی طبیعت کی پیداوار ہے۔ عورتوں کے سلسلے میں جاری ہونے والے قوانین بھی اس کلی حکم سے الگ نہیں ہیں۔ لہٰذا عورت نے بھی انسانی

زندگی میں رونما ہونے والے تغیرات اور ارتقاء میں کمال کی طرف قدم بڑھایا ہے دولوا نتہائی سستی کے ساتھ)۔

سماج میں عورت کی حیثیت اور اس کے تحول ارتقاء کے بارے میں انشاء اللہ آئندہ روشنی ڈالی جائے گی

پہلا مرحلہ :-

غیر متمدن ابتدائی سماج میں عورت کو انسانی سماج و معاشرہ کا جز بھی تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کو کوئی معاشرتی مقام حاصل نہ تھا۔ عورت کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جاتا تھا جو ایک بے زبان جانور کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک وحشی جانور جو اپنی مخصوص زندگی میں مست و آزاد اپنے فطری مقاصد کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ یہ انسان اسے اپنے فوائد و آرام نیز ضروریات واحتیاجات کے پیش نظر اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے اور اپنے انسانی منافع کی خاطر اپنی ملکیت بنا کر اس کے گوشت و پوست، ہڈی، بال، دودھ، خون نیز اس کی قدرت و توانائی حتی کہ اس کے فضلہ سے بھی فائدہ حاصل کرتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ باوجود اس کے کہ اس جانور کو اپنے سماج سے وابستہ کر کے اس کی پرورش اور دیکھ بھال کرتا ہے پھر بھی اس کے لیے کسی قسم کے حق کا قائل نہیں ہے اور اگر کوئی انسان اپنے پالتو جانوروں کے کھانے پینے یا انکی نسلی افزائش کے اسباب و ذرائع مہیا کرتا ہے اور ان کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہے تو وہ یہ سب کچھ اسی منافع کے حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے جس کی ان سے توقع اور امید ہوتی ہے کوئی بھی انسان یہ سارے کام اس عقیدہ و خیال سے نہیں کرتا ہے کہ جانور بھی انسانوں کی طرح ایک ذی شعور صاحب حق و ارادہ مخلوق ہے۔

کسی شخص کی ملکیت یا قبضہ میں رہنے والے جانور پر اگر کسی قسم کا ظلم ہو یا اسے کوئی صدمہ واذیت پہونچے اور نتیجہ میں ظالم کو سزا دی جائے تو یہ اس لئے نہ ہوگی کہ اس نے ایک بے زبان جانور کو اذیت پہونچائی ہے۔ بلکہ سزا اس لئے ملے گی کہ اس نے اس جانور کے مالک کے حق کو ضائع کر کے ایک جرم کا ارتکاب کیا ہے نہ اس لئے کہ انسانی معاشرہ میں جانور کو تکلیف

پہنچانے والے کے خلاف خود جانور کو کوئی حق دیا گیا ہے، ورنہ یہی انسان اپنے آرام و آسائش اور اپنی فلاح و بہبود کے لیے روزانہ کیمیکل دواؤں کے ذریعہ کروڑوں ضرر رساں جراثیم اور زمین و ہوا میں زندگی بسر کرنے والے کیڑے مکوڑوں کو ختم کر ڈالتا ہے اور اپنی غذا نیز دوسری ساری ضرورتوں کے لیے لاکھوں چرند و پرند کو مار ڈالتا ہے اور ایک معمولی سے جرم کا احساس بھی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔

قدیم ابتدائی انسانی معاشرہ میں عورت کا بھی یہی حال تھا جیسا کہ تاریخ کے گوشہ و کنار اور غیر مہذب اقوام کے باقیماندہ آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ قافلہ انسانیت کے ایک طویل (شاید لاکھوں برس کی) راہ طے کر چکنے کے بعد بھی عورت اس انسانی سماج میں بس ایک طفیلی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کو معاشرہ میں کسی طرح کا کوئی مقام حاصل نہ تھا، بلکہ اس کا وجود فقط کچھ سماجی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تھا نہ کہ سماجی حقوق سے بہرہ مند ہونے کے لیے۔ سردیوں اور گرمیوں میں ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف کوچ کرتے وقت قافلہ کے ساز و سامان کے حمل و نقل اور باربرداری کے علاوہ ایندھن کے لئے لکڑیوں کا مہیا کرنا، کھانے کے لئے مچھلیوں کا شکار کرنا، مردوں اور بچوں کی خدمت اور دیکھ بھال کرنا اور مریضوں کی دیکھ ریکھ کرنا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ ایک عورت جب تک اپنے باپ یا اپنے کسی سرپرست کے گھر ہوتی تھی خالص مرد کی ملکیت ہوتی تھی اور خود وہ کسی چیز کی مالک نہیں ہوتی تھی حتیٰ کہ اس کا اپنا زر و زیور اور لباس بھی گھر کے سربراہ سے متعلق ہوتا تھا اور ہر طرح کی تنبیہ و سزا حتیٰ کہ معمولی سے جرم میں اس کا قتل بھی روا تھا، ایک عورت، انعام، قرض، سود اور تحفہ کے طور پر بھی دوسروں کے حوالہ کر دی جاتی تھی اور خرید و فروخت کے ذریعہ (جیسا کہ آج بھی اس رسم کا ایک نمونہ شیر بہا (دودھ پلائی) کے عنوان سے بعض جگہوں پر باقی ہے) شوہر کے گھر منتقل ہونے کے بعد اس کو ان سارے کاموں کے ساتھ ساتھ جو وہ اپنے باپ کے گھر کرتی تھی، مردوں کی شہوت رانی کا مرکز بھی بننا پڑتا تھا۔ مرد اس کو فقط اپنی جنسی بھوک مٹانے کا ذریعہ سمجھتے تھے (اب بھی آج کے ترقی یافتہ و متمدن سماج کے بارے میں یہ سننے میں آتا ہے کہ بعض ترقی یافتہ شہروں میں رفع حاجت کے لیے جس طرح عمومی بیت الخلاء کی تعمیر ضروری ہے

ویسے ہی جنسی بھوک مٹانے کے لیے فاحشہ خانے ضروری ہیں تاکہ وہ لوگ جو شادی نہیں کر سکتے یا غربت یا دوسرے اسباب کی وجہ سے وقتی محرومیت کے شکار ہیں وہ وہاں جا کر اپنی جنسی بھوک مٹا سکیں — یہ بھی قدیم تہذیب کے افکار میں سے ایک فکر ہے جو اب بھی باقی رہ گئی ہے۔

ابتدائی سماج میں مرد کے لیے بیویوں کی تعداد کے سلسلہ میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی جبکہ عورت صرف ایک شادی کر سکتی تھی، طلاق کا اختیار صرف مرد کو حاصل تھا۔ عورت ہمیشہ کے لیے مرد کی ملکیت رہتی تھی اور بے چون و چرا عورت کو مرد کے میلانات و خواہشات پر قربان ہونا پڑتا تھا۔ حتی کہ خشک سالی کے دور میں یا خصوصی دعوتوں میں عورت کا گوشت غذا کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور رنگ برنگ کے کھانے تیار کر کے مہمانوں کے آگے سجایا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ ابتدائی انسانی معاشرہ میں عورت شکل کے اعتبار سے تو انسان تھی مگر رہن سہن کے لحاظ سے ایک "پالتو جانور" کے مثل تھی۔

دوسرا مرحلہ :

عورت کی معاشرتی زندگی کا یہ وہ دور ہے جس میں متمدن قوموں کے درمیان اس کے سلسلہ میں کچھ اصول و قوانین وضع ہو چکے تھے، جیسے بابل میں حمورابی" اصول" قدیم روم و یونان کے قوانین یا اسی طرح مصر و چین یا قدیم ایران کے اصول جن کو شہری قوانین سے مشابہ کہنا غلط نہ ہوگا — یہ قوانین و اصول و شریعت اگرچہ ایک دوسرے سے باہم بہت مختلف تھے، پھر بھی ان میں ایک بات قدر مشترک کے طور پر تصور کی جا سکتی ہے کہ —— انسانی سماج میں عورت کے حقوق تو تسلیم کئے گئے ہیں لیکن وہ ایک ایسے کمزور انسان کی حیثیت سے دیکھی جاتی ہے جو اپنی زندگی کے چلانے پر خود قادر نہیں ہے، ان کی نظر میں عورت کو ہمیشہ مرد کے تحفظ و ملکیت میں زندگی بسر کرنی چاہیے اور ہر حال میں ان کا مطیع و فرمانبردار ہونا چاہیئے۔ وہ خود اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتی، نہ ہی وہ اپنے ارادہ کی مالک ہے کہ آزاد ہو کر اپنی زندگی کے لیے کوئی راہ انتخاب کر سکے یا کسی شے پر آزادانہ تصرف کر سکے۔ اور نہ ہی عملی میدان میں کوئی مستقل حیثیت رکھتی ہے کہ اپنی محنت کے نتیجہ میں حاصل شدہ کسی شی کو اپنی ذات سے مخصوص کر کے کسی منفعت

کی مالک ہوجائے یا کسی اجرت کی مستحق قرار پائے یا کسی عدالت میں مدعی یا گواہ بن سکے یا کسی مسئلہ میں امر و نہی کر سکے ۔ اس سماج میں عورت جب تک باپ کے گھر میں رہتی تھی باپ کی اطاعت اور سرپرستی میں رہتی تھی باپ کا ہر اقدام اس کے سلسلہ میں روا تھا، وہ جس کے ساتھ چاہے اس کی شادی کر دے یا جس کسی کو چاہے اس کے حوالے کر دے یا جس قسم کی چاہے سزا وغیرہ دے ۔

اس سماج میں عام طور پر عورت کسی بھی دوسرے مرد یا عورت کی رشتہ دار سمجھی جاتی تھی اور نہ ہی کسی کی وارث ہو سکتی تھی اور نہ اس کو دوسرے گھریلو حقوق سے بہرہ مند ہونے کا حق حاصل تھا، صرف فطری رشتہ کے تحت بعض حالات میں وہ اپنے باپ یا لڑکے یا بھائی سے شادی نہیں کر سکتی تھی ۔ قدیم ایران میں محرم رشتوں میں بھی شادیاں ہوتی تھیں ۔ چین اور ہمالیہ کے اطراف میں قدرتی قرابت کا مرکز صرف عورت ہوتی تھی اور نسب کا دارومدار عورت ہی پر تھا نتیجہ میں ایک عورت کے ایک سے زائد شوہر ہو سکتے تھے اور اب بھی یہ رسم بعض جگہوں پر رائج ہے ۔ وہاں لڑکے کا تعارف باپ اور دادا کے بجائے ماں اور نانی کے ذریعہ کیا جاتا ہے اور ماؤں کو ہی بنیاد بناتے ہیں ۔

ان قوموں کے درمیان عورت کسی قسم کے مال و دولت کی مالک نہیں ہوتی تھی مگر یہ کہ ولی و سرپرست نے کوئی کام کرنے کی اجازت دے دی ہو یا شادی کا مہر خود ولی نے تصرف میں نہ لیا ہو، عورت اپنے ولی کی کفالت اور اسی کے تحفظ و نگرانی میں پوری زندگی بسر کرتی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ باپ یا شوہر کو اس کے سلسلہ میں ہر طرح کی سزا اور تنبیہ (حتیٰ کہ وقت مصلحت قتل تک کر دینے) کا حق حاصل تھا ۔

عورت کے لیے سب سے زیادہ سخت اور مصیبت کا وقت وہ ہوتا تھا جب وہ کسی غیر اور اجنبی شخص سے ناجائز اور ناپسندیدہ روابط پیدا کر لیتی تھی یا عادت کے دنوں میں ہوتی تھی (ایام ماہواری میں عورت سے اس طرح پرہیز کیا جاتا تھا جیسے کسی گندی اور گھناونی شئی سے بچا جاتا ہے) ۔ ولادت کے ایام عورت کے لیے مصیبت بن جاتے تھے خصوصاً اس وقت جب کہ لڑکی پیدا ہوتی تھی ۔ اگر کوئی عورت اچھا اور قابل تعریف کام کرتی تھی تو

تعریف و فوائد کا مستحق اس کا ولی قرار پاتا تھا اور اس کا معاوضہ بھی وہی وصول کرتا تھا۔ لیکن اگر کوئی ناشائستہ کام کرتی تھی تو اس کی ذمہ داری خود اسی کے سر عائد کی جاتی تھی اور وہ اپنے کئے کی سزا پاتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی استثنائی طور پر کسی عورت کو اپنے باپ کی پدرانہ محبت کے نتیجہ میں یا شوہر کی مہر و محبت کی وجہ سے یا اسی کے مثل کسی دوسرے عنوان سے کچھ مال وغیرہ دیدیا جاتا تھا یا بعض رعایتیں اس کے حق میں تسلیم کر لیتے تھے مگر کسی بھی صورت میں عورت کو اپنے ارادہ و عمل میں استقلال و آزادی حاصل نہیں تھی۔

ان اقوام و ملل کے درمیان عورت کی مثال اس چھوٹے بچے جیسی تھی جس میں زندگی بسر کرنے کی قدرت و طاقت نہیں ہوتی اور وہ اپنے سرپرستوں کے تحفظ و نگرانی میں زندگی گذارتا ہے جبکہ ایک انسان کا بچہ بھی تو انسان ہی ہوتا ہے، پھر بھی اس کے یہاں قوت عقل کی کمی اور ارادہ میں نا استواری پائی جاتی ہے۔ اگر اس بچہ کو اس کے عمل و ارادہ میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو نظم و نسق درہم برہم اور سماج مفلوج ہو کر رہ جائے گا۔ لہذا بچہ کو اپنے سرپرست کے زیر سایہ اور اس کی نگرانی میں رہ کر بزرگوں کے حکم کے تحت زندگی گذارنی چاہئے تاکہ آہستہ آہستہ اسمیں ایک معاشرہ کا رکن بننے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ یا پھر اس معاشرہ میں عورت کے وجود کو اس قیدی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو غلامی کی حالت میں زندگی بسر کرے اور ارادہ و عمل میں استقلال و آزادی کی نعمت سے محروم ہو، ایک غلام کسی جنگ میں فاتح دشمن کے ہاتھ لگ جائے تو گرچہ غلام بھی انسان ہی ہے اور اسمیں بھی انسان کے سارے خصوصیات موجود ہیں پھر بھی چونکہ دشمن سماج فاتح ہے اور اس سماج کی نظر میں غلام کے عمل و ارادہ کی آزادی سماج کے بنیاد کی بربادی اور اس کے اجزاء کی تباہی نیز فساد انسانیت کا سبب ہے لہذا اس کے عمل و ارادہ کی آزادی سلب ہونی ہی چاہیے اور اس کو ماتحت رہنا ہی ہوگا تاکہ فاتح سماج طبعی اور فطری طور پر اپنے امور کو انجام دے سکے۔ اسی طرح ایک عورت بھی شعور کی کمی جسمانی نزاکت اور ہوسناک جذبات و احساسات کو بیدار کرنے والے خد و خال کی وجہ سے سماج کی دشمن تصور کی جاتی تھی اس کا کسی سماج میں ارادہ و عمل کی آزادی کے ساتھ آنا سماج کو مفلوج کر سکتا تھا ـــــ ایک عورت کا معیار اور اس کی حیثیت ان اقوام و ملل

کے درمیان بس اتنی ہی تھی جس کا ذکر کیا گیا ۔ یہود و نصاریٰ کے نزدیک ان کی موجودہ آسمانی کتابوں توریت و انجیل کے بموجب سماج میں عورت کا تقریباً وہی معیار ہے جو ذکر شدہ متمدن قوموں میں رائج تھا ۔ اس لئے کہ توریت و انجیل نے اگرچہ عورت کے ساتھ نرمی اور اچھے برتاؤ کا ذکر کیا ہے پھر بھی ان مقدس کتابوں کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کبھی بھی مرد کے برابر نہیں ہو سکتی اور عورت کو سماجی و مذہبی طور پر وہ حیثیت نہیں دی جا سکتی جو مرد کو دی گئی ہے اسی طرح دوسرے تمام غیر آسمانی ادیان میں بھی عورت کو دینی اعمال کی حیثیت سے مردوں کے مقابلہ میں پست یا بالکل ناقابل اعتنا سمجھا گیا ہے ۔

تیسرا مرحلہ :

اس مرحلہ میں ہم اسلام کی نظر میں عورت کا کیا مقام ہے پیش کریں گے اور اس مقالہ کا اصل مقصد بھی اسی مسئلہ کی وضاحت کرنا ہے ۔ اسلام نے عورت کو نوع انسانی کی ایک فرد سمجھتے ہوئے پوری معنویت کے ساتھ انسانی سماج کا ایک اہم جز تسلیم کیا ہے اور وہ مقام و حیثیت جو ایک انسان اپنے ارادہ و عمل کے ذریعہ بشری سماج میں پیدا کر سکتا ہے عورت کو بھی حاصل ہے ـــــ عورت کے سلسلہ میں اسلامی نظریات کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آج ہم جس عہد اور ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس کو پیش نظر رکھیں کہ آج سیاسی باد مخالف اور متضاد و مختلف الفکر نظریات کی تبلیغ و تشہیر نے ذہنوں کو اتنا مرعوب اور مسخر کر لیا ہے کہ صحیح طرز فکر کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے اپنے افکار کے مستقل اور فطرت کے مطابق ہونے کا پروپگنڈہ کر کے ہماری فطری اور خداداد صلاحیت و منطق کو اندھی تقلید میں بدل دیا ہے ـــــ دوسری طرف قرون وسطیٰ میں گرجا گھروں کے آمرانہ طور طریقوں، بے سر و پا اصولوں نیز غیر منطقی تعلیمات نے جس کا سلسلہ کئی قرن تک جاری رہا صحیح افکار کو زندہ درگور کر دیا تھا لاکھوں بے گناہ انسانوں کو پھانسیاں دلوائیں اور اپنے بے بنیاد کمزور موقف کی حفاظت کے لیے اسلام پر ہر طرح کی تہمت باندھنے سے گریز نہ کیا

کیونکہ وہ اسلام کو اپنا سخت ترین مقابل و حریف سمجھتے تھے، انھوں نے اپنے پیروؤں میں اسلام کا تعارف نہایت ہی ناشائستہ انداز سے کیا نیز اسلام کے حقائق اور اس کی خوبیوں کو بدترین عنوان سے پیش کیا اپنی مبالغہ آرائی میں گرجا گھر اس انتہا کو پہونچ گئے کہ جب آخری صدی میں اہل یورپ کے یہاں صنعتی انقلاب کے ہمراہ فکری استقلال پیدا ہوا تو انھوں نے گرجا گھروں کی عالمی قدرت و طاقت کو ایک جگہ سمیٹ کر کے رومی گرجا گھر (کلیسا) کی چار دیواری تک محصور کر دیا اور کئی صدیوں کی مسلسل بکواس اور ہرزہ سرائیوں نیز کلیسائی عقاید کو زبردستی مسلط کرنے کی کوشش نے اہل یورپ کو ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ وہ لوگ سرے سے دینی حقائق کو عہد پارینہ کی یادگار اور خرافات کا مجموعہ سمجھنے لگے۔ دین کو اندھی تقلید کے مترادف و ہم معنی قرار دیدیا گیا۔ ظاہر ہے جب وہ خود اپنے مقدس آئین کو ایسا جانتے ہوں تو پھر دوسرے آئین خصوصاً اسلام کے بارے میں ان کا کیا خیال ہو گا جس کے خلاف ایک مدت سے پوری عیسائی پروپیگنڈہ مشنری لگی ہوئی ہو۔

دوسری طرف یورپی اقوام نے علمی و صنعتی ترقی کے ذریعہ جو حیرت انگیز طاقت حاصل کی اس کو بروئے کار لا کر دنیا کے دوسرے حصوں کو تسخیر کر کے اپنے زیر اثر لینے نیز سیاسی اثرات مرتب کرنے کے علاوہ وہاں اقتصادی برتری حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اپنایا اور آخر کار پوری چابک دستی کے ساتھ اپنی کامیابیوں کے سہارے دوسرے لوگوں سے اپنی علمی و عملی برتری کا لوہا منوالیا اور انھیں یہ یقین دلا دیا کہ یورپی طریقہ زندگی کے علاوہ دیگر طرز حیات کوئی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ جاہل اسلاف کی پیروی اور خرافاتی تقلید کے سوا کچھ نہیں؛ تمام ذی شعور!! انسانوں کو اپنی خداداد عقل اور اپنی فطری منطق و صلاحیت کو چھوڑ کر یورپی زندگی کو بے چون و چرا تسلیم کر لینا چاہیے ــــ مغربی پروپیگنڈوں نے اس کامیابی کے ساتھ ہمارے ذہنوں کو تسخیر کر لیا اور یہ خیال پیدا کر دیا کہ جسے دنیا کہا جا سکتا ہے وہ فقط یورپ ہے اور جسے انسان کہا جا سکتا ہے وہ فقط اہل یورپ ہیں، نیز زندگی کی تمام سعادتیں جس کی مرہون منت ہیں وہ مغربی طرز زندگی ہے۔ ہمارے ان روشن فکروں!! کی منطق یہ ہے کہ تمام قدیم شرعی احکام اور قوانین اجتماعی آج کی دنیا سے مطابقت نہیں رکھتے

ہمارے لئے دنیا پسند قوانین ضروری ہیں آج کی متمدن دنیا فلاں منزل تک پہونچ چکی ہے۔ (اس جملہ میں دنیا سے مغربی دنیا مراد ہے) اور اسی طرح کی بہت سی باتیں ہیں جو یورپ کی برتری ثابت کرنے کے لیے کہی جاتی ہیں۔ دوسری طرف ہمیں اس تلخ حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہم اپنے داخلی تنازعات صدیوں کے اختلافات اور حکمرانوں کی ہوس رانی اور خود خواہی کے نتیجہ میں فکری استقلال سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور خدا داد آزاد اور فطری طرز فکر کو قومی تعصبات کی بھینٹ چڑھا کر جمود اور بے حسی میں مبتلا ہو گئے ہیں نتیجہ میں ان تمام چیزوں نے جمع ہو کر ہم کو اس مقام پر لا چھوڑا ہے کہ ہم آزادی فکر اور اندھی تقلید کی قید سے رہائی کے نام پر اپنی خداداد صلاحیتوں کو بالائے طاق رکھ کر خالص یورپی معاشرہ اور افراد کی تقلید کرنے لگے اور ان کی رفتار و گفتار کی پیروی کے سوا کوئی راہ اختیار نہ کی ـــــ یہی نہیں بلکہ ہم نے خود اپنے علوم و معارف کی شرح و تفسیر اور حقائق کی توضیحات ان سے سمجھنے کی کوشش کی، خود اپنے بارے میں معلومات کا ذریعہ ان کو بنایا جبکہ اہل مغرب کی معلومات کا سرچشمہ وہ اسلام ہے جو ان کے قرون وسطی کی بدترین یادوں سے وابستہ ہے یا انکی معلومات کا ماخذ ان مستشرقین کی وہ عجیب و غریب تحقیقات ہیں جس کا مطالعہ کرنے والے دانشوروں کو چاہیے کہ صلیبی جنگوں کے دور کے مصنفین اور عیسائی پادریوں کے لئے سینکڑوں رحمت کی دعا کریں، جنھوں نے لکھا ہے کہ محمدؐ نے سات سال کی عمر میں خدیجہ سے شادی کی" ـــ " عمر کے بعد علیؑ مسند خلافت پر بیٹھے ـــ شہر کاظمین میں شیعوں کے گیارھویں امام دفن ہیں۔" وغیرہ وغیرہ ....

اسی انداز فکر اور ان ہی معلومات کی بنیاد پر انھوں نے اسلام میں عورت کی اجتماعی حیثیت کا بھی تعارف کرایا ہے کہ " اسلام میں عورت ایک قیدی کی حیثیت سے ہے، اجتماعی اور معاشرتی حقوق سے محروم رہ کر زندگی بسر کرتی ہے، اسے ارادہ عمل میں آزادی حاصل نہیں ہے، میراث اور گواہی کے سلسلہ میں اسکو ایک مرد کے نصف کی حیثیت دی گئی ہے (وہ بھی صرف رسماً نہ کہ عملاً) عورت کو ہمیشہ گھر میں مقید رہ کر زندگی گزارنا پڑتی ہے، لکھنے پڑھنے کی نعمت سے وہ یکسر محروم رہتی ہے اور اگر اتفاقاً کسی ضرورت کے پیش نظر

گھر سے باہر نکلنا پڑے تو ایک کالی چادر میں اپنے کو لپیٹ لینا ضروری ہوتا ہے تاکہ پہچانی نہ جا سکے ـــ !!!

اہل مغرب کی ان بے سر و پا خرافات اور ان کے مفسد نتائج کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے موجودہ مسئلہ یا کسی بھی دوسرے بنیادی دینی مسئلہ کی توضیح و تشریح کے سلسلہ میں ادھر ادھر دوڑنے یا ان کی ان سننے کے بجائے آزاد فکری کے ساتھ اپنی فطری اور خداداد صلاحیت کو کام میں لاکر دینی بیانات کے مدارک اور متن کی طرف رجوع کریں، ان حقوق کے روابط کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر ان کے بنیادی نکات کو جس حد تک بھی ممکن ہو سمجھنے کی کوشش کریں ـــ

اسلامی قوانین کی عام بنیادیں :

شک نہیں ہے کہ وہ خاصیت جو انسان کو حیوانات سے ممتاز اور جدا کرتی ہے اس کا نام تعقل و تفکر ہے۔ قوت تعقل ہی اپنے حواس کی فراہم کردہ معلومات کو عمومیت عطا کرتی ہے اور پھر ان ہی کلی معلومات سے ایک مخصوص تنظیم و ترتیب کے ذریعہ کلی نتائج حاصل کرتی ہے اور معلومات سے مجہولات کو کشف کر لیتی ہے ـــ

باوجودیکہ انسان میں داخلی احساسات و جذبات بہت زیادہ پائے جاتے ہیں جن سے وہ زندگی کی راہ میں فائدہ بھی حاصل کرتا ہے لیکن ایک زندہ انسان کی زندہ خاصیت کے پیش نظر انھیں عقل کا پابند ہونا چاہئے ورنہ دوسرے حیوانات میں بھی یہ سارے احساسات موجود ہوتے ہیں بلکہ بعض احساسات حیوانوں میں مراتب کے لحاظ سے قوی بھی ہوتے ہیں ۔ قرآن کریم نے بہت سی جگہوں پر قوت عقل عطا کئے جانے پر احسان جتایا ہے اور قرآن انسان کو اپنے احساسات و عقل کا ذمہ دار بتاتا ہے ۔

ھو الذی انشاکم وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ

(سورہ ملک / ۲۳)

ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا (سورہ اسریٰ / ۳۶)

اسی بنا پر انسانی سماج جس کو خاص فکر انسانی نے جنم دیا ہے اور اسی انسانی تناور درخت کا خالص ثمرہ ہے اسے تعقل کی خاصیت سے وابستہ فرض کیا ہے اور اس کے اجتماعی قوانین وضوابط کو عقل سلیم کی تشخیص سے مربوط جانا ہے نہ کہ خواہشات واحساسات سے وابستہ تصور کیا ہو۔

نتیجہ نکلا کہ قرآن ان ہی قوانین واحکام کو سماج میں لازم الاجرا جانتا ہے جنھیں عقل حق جانتی ہو، چاہے وہ سماج کے اکثر افراد کی خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اس لئے کہ انسان کو اپنی سعادت کے لئے ایک ایسا مقصد معین کرنا چاہئے جسے اس کی عقل وخرد نقطہ سعادت سمجھے ایسی چیز کو ہدف نہ بنانا چاہئے جسے فقط اس کے حیوانی احساسات پسند کریں۔

یھدی الی الحق والی طریق مستقیم (سورہ احقاف /۳۰)

قرآن حق اور راہ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

ولو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السموات والارض

(سورہ مومنون /۷۱)

اگر حق ان کی ہوس آمیز خواہشوں کا اتباع کرلے تو زمین وآسمان درہم وبرہم ہوجائیں

اسلام کی نظر میں انسانیت کی ایک ممتاز نوعیت ہے اور مرد وزن دونوں ہی انسان ہیں اگرچہ مرد وعورت ہونے کی حیثیت سے دونوں میں فرق ہے، پھر بھی بحیثیت انسان کے دونوں میں کوئی فرق نہیں کیونکہ ہر انسان کو چاہے مرد ہو یا عورت دو (مونث ومذکر) افراد، تناسل کے ذریعہ وجود میں لاتے ہیں۔

مطالبہ انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی بعضکم من بعض

(آل عمران /۱۹۵)

میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے مرد وعورت کے عمل کو ضائع نہیں کرتا، تم میں سے بعض دوسروں کے بعض ہیں (یعنی تم سب کی حقیقت ایک ہی ہے)

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثیٰ وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (حجرات/آیت ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم سب کو مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے پھر تم کو گروہوں اور قبیلوں قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ باہم پہچانے جا سکو، ——— بس ہماری نظر میں مکرم ترین وہ ہے جو تم لوگوں میں زیادہ متقی ہے۔

اسی بنا پر اسلام عورت کو بھی مرد ہی کی طرح سماج کا کامل جزء جانتا ہے اور دونوں کو مساوی طور پر ایک دوسرے کا شریک تصور کرتا ہے۔ مرد ہی کی طرح عورت کو بھی عمل و ارادہ میں آزادی دی ہے لیکن اگر کوئی فرد کسی سماج کا جزو کامل ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ ہر وہ حق جو سماج کے کسی شخص کو حاصل ہے یا ہر وہ خصوصیت جس کی حامل کوئی فرد ہے تو دوسری فرد بھی اسی خصوصیت کی حامل ہو کیونکہ سماج کا جزء فرض کر لینے کے بعد اجتماعی وزن وحیثیت اور استعداد و صلاحیت میں افراد کا اختلاف ان کے اجتماعی حقوق میں بھی فرق کا سبب ہوگا اور ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخی شہادتیں موجود ہیں نیز مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ ہر دور انسانیت میں ایک سماج تھا اور لوگ اس سماج کے اجزا تھے لیکن اس کے باوجود کبھی عالم و جاہل کو ایک حیثیت نہیں دی گئی اور نہ ایک تجربہ کار فرد کی ذمہ داری کسی ناتجربہ کار کے ذمہ کی گئی اور نہ کسی جابر و ظالم کو کسی عادل کی جگہ دی گئی ——— یہ صحیح ہے کہ سماج کے سارے افراد کو قانون کے مقابلے میں مساوی ہونا چاہئے لیکن یہ برابری نفاذ قانون کی حیثیت سے ہوتی ہے (یعنی انصاف کی نظر میں سب برابر ہوتے ہیں) نہ کہ یہ مساوات ان کی معاشرتی اہمیت میں ہوگی۔ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک سماج میں حاکم و رعایا خورد و بزرگ، عالم و جاہل، عقلمند و نادان، عادل و ظالم سبھی سماجی خصوصیات و امتیازات میں برابر ہو جائیں اور پھر بھی سماج آگے بڑھتا رہے اور تباہ و برباد نہ ہو لہٰذا معلوم ہوا کہ انسانی سماج کا جزء ہونا ایک الگ امر ہے اور جزء ہونے کی کیفیت اور صلاحیت ایک الگ شئی ہے ایک کو دوسرے سے مخلوط نہ کرنا چاہئے ——— کسی بھی

انسانی معاشرہ کی مکمل رعایت کا لازمہ یہ ہے کہ اس معاشرہ کے ہر فرد کے ساتھ عدالت
اجتماعی کی رعایت ہو اور ہر شخص اپنے استحقاق کے مطابق حقوق سے بہرہ مند ہو سکے

اسلامی معاشرہ میں عورت کی حیثیت؟

جیسا کہ میں اشارہ کر چکا ہوں کہ جب خورشید اسلام دنیا کے نیلگوں افق پر طلوع ہوا
اور اس نے اپنی تابندہ کرنوں سے دنیا کو روشن و منور کیا۔ اس وقت دنیا دو واضح گروہوں
میں منقسم تھی۔

متمدن گروہ :۔

مثلاً روم کی عظیم سلطنت ایرانی شہنشاہیت اور اسی طرح دوسری اقوام و ملل
جنمیں مصر و حبشہ و ہندوستان و چین وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان اقوام و ملل میں
عورت ایک قیدی کا حکم رکھتی تھی یعنی اس انسان کے مانند تھی جو عمل و ارادہ میں آزاد
نہ رکھتا ہو وہ معاشرہ کے تمام فوائد و امتیازات سے محروم تھی اسے میراث نہیں ملتی تھی
اس کے عمل کا کوئی احترام نہ تھا۔ کھانے پینے، اوڑھنے پہننے، رہنے، سہنے، شادی بیاہ،
طرز معاشرت، اموال میں تصرف نیز اسی طرح کے دوسرے امور میں اسے قطعی آزادی
حاصل نہ تھی اس کی ہر ہر سانس اور ہر ہر قدم مرد کی اجازت پر موقوف تھا اگر وہ کسی طرح
کے ظلم و زیادتی کا شکار ہوتی تو فریاد اور شکایت کا حق مردوں کی مرضی پر منحصر تھا، دعویٰ
یا گواہی میں عورت کی بات کوئی حیثیت و اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

غیر مہذب گروہ!

دوسرا گروہ پسماندہ اقوام و ملل کا تھا جن میں افریقی باشندے اور گوشہ
کنار میں پھیلی ہوئی دوسری آبادیاں آتی ہیں۔ ان کے درمیان عورت کو اصلاً انسان ہی
نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ عورت کو سماج میں ایک طفیلی کی حیثیت حاصل تھی اور اس کے ساتھ

حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا ۔ عورت بوجھ ڈھوتی تھی، شکار کرتی تھی، مردوں کی خدمت،
بچوں کی تربیت اور مریضوں کی دیکھ بھال کرتی تھی، اپنے شوہر اور دوسرے مردوں کی خواہش
پران کی آتش شہوت خاموش کرتی تھی اور کبھی کبھی قحط اور خشک سالی کے زمانہ میں یا خصوصی مہمان
نوازی میں عورت کا گوشت بھی غذا کے طور پر استعمال ہوتا تھا، یہ تھے ظہور اسلام کے وقت
دنیا کے حالات! اور جہاں اسلام ظاہر ہوا یعنی جزیرۃ العرب کے حالات یہ تھے کہ یہاں کے
رہنے والے اکثر بادیہ نشین تھے، پھر بھی یہ لوگ خارجی طور پر اس وقت کی بڑی قوم
یعنی روم و ایران و مصر و حبشہ کے درمیان محصور تھے اور داخلی طور سے یثرب اور اس کے
اطراف کے یہود نیز یمن و عراق کے نصاریٰ کے درمیان گھرے ہوئے تھے بادیہ نشینوں
میں سے اکثر بت پرست تھے ان کی طرز زندگی ان ہی اقوام و ملل کے عادات و رسومات
کا معجون تھی اور ان ہی رسومات کے کسر و انکسار کے نتیجہ میں ایک ایسا طریقۂ زندگی وجود
میں آگیا تھا جس میں ہر طریقۂ زندگی کا نمونہ دیکھنے کو مل جاتا تھا ـــ یہی وجہ ہے کہ بادیہ
نشینوں کے یہاں بھی روم و ایران اور دوسرے اقوام کی طرح عورت عام حقوق سے محروم
تھی مطلق العنان مردوں کے رحم و کرم پر رہتی تھی وہ عورت کے لیے معاشرتی احترام کے
قائل نہ تھے ـــ اس کے علاوہ بدوؤں کی اخلاقی کے نتیجہ میں عورت کو بنیادی طور پر اپنے لئے
ننگ و عار سمجھتے تھے لڑکی سے نفرت کرتے تھے حتی کہ قبیلہ بنی تمیم لڑکیوں کو زندہ درگور کردیتا
تھا جیسا کہ قرآن کریم نے خاص طور پر ان دو چیزوں کو مورد اعتراض قرار دیا ہے۔

واذا بشر أحدهم بالانثى ظل وجهه مسوداً وهو كظيم ○ يتوارى
من القوم من سوء ما بشر به أيمسكه على هون ام يدسه فى التراب الا ساء ما يحكمون

جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کا مژدہ سنایا جاتا ہے تو (غصہ سے) لعاب دہن
نگلنے لگتا ہے اور چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور (مجرمین کی طرح) لوگوں سے اپنے کو چھپاتے
پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا وہ لڑکی کو ذلت و رسوائی کے ساتھ زندہ رکھے
یا زندہ دفن کردے ۔ کیسی ذلیل حرکت ہے جس کا وہ اظہار کرتے ہیں۔

واذاالموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت (سورۃ تکویر/۹)

روز قیامت ان لڑکیوں کے بارے میں جن کو زندہ درگور کر دیا گیا ہے، سوال کیا جائے گا تم نے ان کو کس جرم میں قتل کیا تھا۔

ایسے دور میں اسلام نے عورت کو انسانی سماج کا کامل جز قرار دیا اور قید و بند سے آزاد کیا، عمل وارادہ میں آزادی دی۔ عورت کو بھی مرد کی طرح اسلاف کے ترکہ کا وارث قرار دیا، اسلام میں عورت کو باپ، بھائی، چچا، ماموں اور دوسرے تمام رشتہ داروں نیز شوہر سے میراث ملتی ہے، اس کو ہر جائز اور خوشحال زندگی اختیار کرنے میں مکمل آزادی حاصل ہے، اس کے عمل کو معاشرہ میں احترام واہمیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ عورت اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتی ہے، عدالت میں اپنا مسئلہ پیش کر سکتی ہے ظلم و زیادتی کے خلاف دعویٰ کر سکتی ہے، گواہی دے سکتی ہے اور ان تمام مراحل میں جن سے عورت کی مجموعی زندگی وابستہ ہوتی ہے عورت کو مرد کے تسلط اور محکومیت سے مکمل طور پر آزادی دی گئی ہے۔

لاجناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن بالمعروف (سورہ بقرہ/۲۳۴)

حدود شرع میں رہ کر اپنے تمام امور کی انجام دہی میں عورت کو آزادی حاصل ہے اس کا تم کو جواب دہ نہیں بنایا گیا ہے۔

وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منہ او کثر (سورہ نساء/۷)

عورتیں اپنے ماں باپ اور دیگر قرابت داروں کے ترکہ میں مردوں کی شریک ہیں خواہ ترکہ (مقدار میں) کم ہو یا زیادہ

اور سیرت پیغمبر تو ایسی تمام جزئی باتوں سے پر ہے مگر اس مقالہ میں ان تفصیلات کے ذکر کی گنجائش نہیں ہے۔

عورت اور مرد کے حقوق میں توازن:

اسلام نے میراث کی تقسیم میں عورت کو مرد کے حصہ کے آدھے کا حقدار قرار دیا ہے

للذکر مثل حظ الانثیین (نساء/۱۱)
ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر میراث ملے گی۔
اس سلسلہ میں اگرچہ عورت کا حصہ مرد سے کم ہے لیکن یہ کمی دوسری طرف سے پوری کردی گئی ہے مثلاً عورت کا تمام خرچ نفقہ کے عنوان سے مرد کے ذمہ کیا گیا ہے۔
اس قانون کے سلسلہ میں اسلام کے بنیادی نظریئے کو دوسری جہت سے پرکھنا چاہئے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ عورت میں نرم و نازک جذبات و احساسات تعقل پر غالب رہتے ہیں اور عورت کے تمام افعال و احوال مختلف قسم کے لطیف احساسات وجذبات کی جلوہ گاہ ہیں۔ مرد فطرتاً اس کے برعکس واقع ہوا ہے۔ اور جیسا کہ آغاز گفتگو ہی میں بتایا جا چکا ہے کہ اسلام انسانی سماج کے امور کی تنظیم میں تعقل و غور وفکر کو احساسات وجذبات پر فوقیت دیتا ہے۔
جب ہم انسانی سماج و معاشرہ پر کلی طور پر نظر ڈالیں گے تو یہ دیکھنے میں آئے گا کہ ہر دور میں دنیا کی تمام دولت و ثروت اسی دور کے افراد کے پاس رہی ہے لوگ اپنی حیات میں اس ثروت سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد اپنی آنے والی نسلوں کے لئے ترکہ میں چھوڑ جاتے ہیں موجود طبقہ کے لوگوں کے جاتے ہی بعد والا طبقہ جو عام طور پر نصف نصف مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہوتا ہے ان کی جگہ لیتا ہے (اسلامی تقسیم کے تحت) ترکہ کا دو تہائی حصہ مردوں کو ملتا ہے اور ایک تہائی حصہ عورتوں کے حق میں آتا ہے اب چونکہ عورت کا خرچ مرد کے ذمہ ہے اس لئے عورت کا مال تو مرد کے تصرف سے الگ رہے گا لیکن مرد کا (دو تہائی) مال مرد اور عورت میں برابر برابر خرچ ہوگا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بظاہر دنیا کا دو تہائی مال مردوں کے حصہ میں اور ایک تہائی مال عورتوں کے حصہ میں آیا لیکن خرچ کے اعتبار سے دو تہائی مال عورتوں کے اوپر خرچ ہوا اور ایک تہائی مال مردوں پر خرچ ہوا گویا تقسیم کے بالکل برعکس!
ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (سورہ بقرہ/۲۲۸)
اس تقسیم کی رو سے ملکیت اور تسلط کے اعتبار سے دنیا کی ثروت کے ایک بڑے

حصہ کا مالک مرد کو قرار دیا گیا ہے اور اس کی باگ ڈور مرد کے ہاتھ میں دی گئی ہے لیکن تصرف اور استفادہ کے اعتبار سے عورت اس ثروت کے خاصے حصے سے بہرہ مند ہوتی ہے اور ایک سماج میں عدل و انصاف کا یہی تقاضا ہے کہ دولت کی حفاظت و نگرانی دست تعقل میں رہے اور اس پر تصرف فی استفادہ احساسات و جذبات سے معمور ہاتھوں میں رہے ۔
جہاں تک ان کی سعی و عمل کے احترام یا ملکیت اور آمدنی پر حق تصرف کا سوال ہے اسلام نے عورت کو مکمل آزادی اور خود مختاری دی ہے ۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی رکاوٹ یا مردوں کی اجارہ داری نہیں رکھی گئی ہے بلکہ عورت اپنے ارادہ و عمل میں بالکل آزاد ہے ۔

تعلیم و تعلم اور شرعی حدود میں رہ کر سماجی و معاشرتی روابط کے سلسلہ میں بھی عورت و مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے بشرطیکہ یہ عمل اظہار زینت خودنمائی و عشوہ گری کے لئے نہ ہو اور مردوں کی قوت شہوانیہ کو ہوا دینے کا باعث نہ بنے ۔ اس صورت میں عورت ہر طرح کی معاشرت میں آزاد ہے ۔

لا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھن بالمعروف (سورہ بقرہ/۲۳۴)

احکام دین و شریعت اور اعمال صالحہ میں امتیاز پیدا کرنے اور مقام و منزلت عزت و کرامت احترام و وقار حاصل کرنے کا سبب اسلام کی نظر میں بس ایک ہی ہے اور اس سبب میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے ۔

انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثیٰ بعضکم من بعض
آل عمران/۱۹۵

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ۔ حجرات/۱۳

جہاں اسلام نے کسی طرح کا کوئی طبقاتی امتیاز نہیں رکھا ہے صرف تقویٰ اور دینی خدمات کا اعتبار کیا گیا ہے وہاں مرد اور عورت کے مابین کوئی فرق نہیں ہے، ایک پرہیزگار عورت ہزار غیر متقی مردوں سے زیادہ محترم و باعزت ہے ۔

نکاح اور شادی کے سلسلہ میں بھی عورت کو مکمل آزادی حاصل ہے جس سے چاہے

شادی کرسکتی ہے لیکن چونکہ میراث نیز ازدواجی مسائل نسب کی بنیاد پر قائم ہیں لہٰذا عورت ایک وقت میں ایک سے زیادہ شادی نہیں کرسکتی ہے لیکن مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرسکتا ہے بشرطیکہ تمام بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کا برتاؤ کرسکے۔ اس حکم کی صحت ومعقولیت بشری سماج کی ماہیت یا ناگہانی حادثات پر نظر کرنے سے واضح اور روشن ہوجاتی ہے اس لئے کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ انسانی معاشرے میں مرد وزن کی تعداد برابر ہے اور ایک معین سال کو ابتداء قرار دیکر اس سال میں اور اس کے چند برسوں بعد پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکیوں کو الگ الگ کرکے دیکھیں تو پہلے والے سال میں پیدا ہونے والے جتنے لڑکے فطری یا قانونی بلوغ کی حد کو پہونچے ہوں گے تعداد میں ان سے کئی گنا زیادہ لڑکیاں ہوں گی جو شادی کے لائق ہوں گی۔ اس کے علاوہ چند کو چھوڑکر اکثر عورتیں پچاس سال کے بعد یائسہ ہوجاتی ہیں جبکہ سوائے چند اکثر مردوں میں آخری عمر تک قوت تولید باقی رہتی ہے۔ اگر سماج میں مردوزن کی تعداد برابر فرض کرلی جائے اور مرد کو ایک سے زیادہ شادی کی اجازت نہ ہو تو بہت سی صلاحیتیں بیکار چلی جائیں گی۔

اس کے علاوہ کبھی کبھی ناگہانی حادثات مثلاً تباہ کن جنگیں اور خطرات سے پر دشوار گزار کام بے شمار مردوں کو موت کی آغوش میں دیتے ہیں جو لا تعداد قابل ازدواج لڑکیوں اور بیواؤں کو جیتا چھوڑ جاتے ہیں ایسی صورت میں اگر تعدد ازدواج جائز نہ ہو تو پھر دامن عفت وعصمت کے چاک چاک ہوجانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہے گا جیسا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے حالات نے اس حقیقت کو ثابت کردیا اور آخر ش بات یہاں تک پہونچ گئی کہ غیر شادی شدہ یا بیوہ عورتوں کی ایک جماعت نے جرمن حکومت سے مطالبہ کیا کہ قانون اسلام کے مطابق تعدد ازدواج کی اجازت دی جائے اور اس قانون کو نافذ کیا جائے تاکہ بیوہ عورتوں کی پریشانیاں دور ہوں مگران عورتوں کی آواز کلیسا کی مخالفت کی وجہ سے دبادی گئی۔ جو عورتیں تعدد ازدواج کی مخالف ہیں ان کے لئے یہ واقعہ دلیل ہے کہ وہ فقط عادت کے تحت اعتراض کرتی ہیں ورنہ فطرت کا حکم یہی ہے۔

نیز یہ واقعہ اس اعتراض کا بھی جواب ہے جو اس اسلامی حکم کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے: تعدد ازدواج کا قانون ایک ایسا قانون ہے جس سے سماج کی عورتوں کے جذبات و احساسات کو ٹھیس لگتی ہے اور اس سے ان کے انتقامی جذبہ کو قوت ملتی ہے نیز اس کے نتیجہ میں ناگوار و ناپسندیدہ واقعات رونما ہوتے ہیں۔

یہ واقعہ اعتراض کا جواب اس لیے ہے کہ یہ اور خود اس جیسے دوسرے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ جب بھی ضرورت ہوئی اور شوہر کی کمی کا احساس ہوا اس وقت تمام مخالف افکار موافقت میں بدل گئے۔

اس کے علاوہ تعدد ازدواج کا رواج اسلام سے پہلے کسی تعداد کی تعیین کے بغیر اور اسلام میں ایک معین تعداد میں مدت مدید تک جاری رہا ہے۔ مگر نہ کہیں سماجی نظام میں خلل پڑا اور نہ ہی کوئی فتنہ و فساد رونما ہوا۔ اور جو عورتیں دوسری یا چوتھی بیوی کے عنوان سے آتی تھیں وہ نہ زمین سے اُگی تھیں اور نہ آسمان سے اتری تھیں بلکہ وہ بھی انہی عورتوں میں تھیں جن کے بارے میں معترض کا کہنا یہ ہے کہ عورتیں فطرتاً تعدد ازدواج کی مخالف ہیں۔

نیز اسلام تعدد ازدواج کو واجب نہیں جانتا بلکہ جائز بتایا ہے کہ اگر مرد نابرابری سے خائف نہ ہو اور سب کے ساتھ عدل و انصاف اور برابری کا برتاؤ کر سکے گا تو ایسا کر سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ فقہ اسلامی میں ایسے طریقے موجود ہیں جن سے عورت مرد کو دوسری شادی سے روک سکتی ہے یا اس صورت میں مرد کو طلاق پر مجبور کر سکتی ہے اور یہی صورت حال طلاق میں بھی ہے جبکہ طلاق دینے کا دار و مدار مرد پر ہے، مگر عورت کے لیے بعض ایسی راہیں ہیں جن کے ذریعہ وہ مرد سے طلاق لے سکتی ہے یا پہلے سے کچھ شرائط رکھ کر اس حق کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے دل کو خوش رکھ کر بے فکر زندگی گزار سکتی ہے۔ ازدواجی دنیا میں طلاق کا حکم اور طلاق کا حق مرد کے ہاتھوں میں دینا (اگرچہ غیر مستقیم طور پر عورت مخصوص طریقے سے اس حق کو اپنے ہاتھوں میں لے سکتی ہے) دین اسلام کا خصوصی امتیاز ہے۔ دنیا کی حکومتیں اور متمدن اقوام و ملل نے طلاق کے سلسلہ میں ایک مدت تک کشمکش سے دوچار ہونے کے بعد مجبور ہو کر طلاق کو قانونی حیثیت دیدی۔ مگر چونکہ طلاق کا

حق مرد اور عورت دونوں کو دیا ہے اس لئے سالانہ طلاق کے اعداد و شمار (خصوصاً وہ طلاق جو عورتوں کے مطالبہ پر ہوتے ہیں) نے حکومتوں کو ہراساں کردیا ہے اور اب وہ کبھی کبھی اس کی چارہ جوئی اور حل کے لئے سوچتی ہیں —

خاص طور پر عورتیں جو دلائل طلاق لینے کے سلسلہ میں پیش کرتی ہیں اور وہ اخباروں اور ذرائع ابلاغ میں شائع ہوتے ہیں ان سے اسلامی نظریئے کی حقانیت روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے۔

اسلام میں عورت کی محدودیت:

جیسا کہ گذشتہ بیانات سے معلوم ہوا کہ اسلام میں عورت زندگی کے مختلف شعبوں میں اور اجتماعی و معاشرتی حقوق میں مردوں سے پیچھے نہیں ہے نیز وہ اپنے عمل و ارادہ میں آزادی سے بہرہ نہیں ہے اور نہ اس پر مرد حاکم و مسلط ہے۔ اس سلسلہ میں مسلم بات صرف اتنی ہے کہ عورت کو ہمبستری کے سلسلہ میں شوہر کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ مہر و محبت، احساس و عطوفت کی پیکر عورت کو اسلام نے صرف تین تعقلی مقام پر محدود کیا ہے اور ان کی باگ ڈور اسلام نے دست تعقل و تفکر میں دے کر انہیں احساسات و جذبات سے الگ رکھا ہے اور وہ تین موضوعات حکومت، قضاوت اور جہاد میں۔ دینی بیانات اور سیرت پیغمبرؐ سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ عورت اسلامی معاشرے میں حاکم و حکمراں نہیں ہوسکتی اور نہ ہی مسند قضاوت پر بیٹھ سکتی ہے اور نہ براہ راست جہاد میں شریک ہو کر جنگ کرسکتی ہے۔

او من ینشؤ فی الحلیۃ وھو فی الخصام (زخرف / ۱۸)

ان تینوں شعبوں کے ذمہ دار مرد ہیں الرجال قوامون علی النساء (نساء / ۳۴)

مذکورہ تینوں موضوعات کا تعقل و تفکر سے وابستہ ہونا اور جذبات و احساسات کی مداخلت سے ان کا تباہی سے دوچار ہوجانا اتنا واضح اور روشن ہے کہ کسی بحث اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے — چند صدیوں سے دنیا کی متمدن قوموں نے مرد و زن کو تقریباً ایک صف میں لاکھڑا کیا ہے اور مرد و زن کو ایک طرح کی تعلیم و تربیت دینے میں پوری قوت صرف کردی ہے اور ہزاروں لاکھوں دانشور و فنکار عورتوں کو پیدا کیا مگر ابھی بھی حکومتوں کے سربراہوں عدالتوں کے ججوں، فوجوں کے کمانڈروں میں عورتوں کی تعداد مردوں کے برابر تو بعد کی بات ہے، مردوں سے قابل موازنہ بھی نہیں۔

میں وہ وقت فراموش نہیں کرسکتا جب جنگ عظیم کا آخری زمانہ تھا اور جنگ فرانس کی سرزمین تک پہونچ چکی تھی دگرگ ادھر اس کے ارد گرد شدید جنگ ہو رہی تھی جب آسمان سے آگ برس رہی تھی اور زمین سے خون ابل رہا تھا اس وقت ایک فرانسیسی عورت نے جو فوجی ہائی کمان کی رکن تھی (جیسا کہ اخباروں میں شائع ہوا تھا) اس نے ایک خوبصورت زنانہ کیپ ایجاد کی جس پر لگے ہوئے [illegible]

آخری قسط

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

ذات و صفات پروردگار

اس فصل میں الٰہیات، یعنی ذات و صفات حق سے مربوط مسائل کے بارے میں نہج البلاغہ کی بحثوں کے کچھ نمونے پیش کئے جائیں گے، اس کے بعد بطور اختصار دوسرے مکاتب فکر سے اس کا موازنہ کیا جائے گا، اور اسی بیان پر نہج البلاغہ کے اس حصے سے متعلق بحث کا خاتمہ ہو جائے گا۔

آغاز بحث سے پہلے محترم قارئین سے معذرت ضروری ہے کیونکہ ان تین فصلوں، خاص کر اس فصل میں ہماری گفتگو نے فنی و فلسفی رنگ اختیار کر لیا ہے اور قدرتی طور پر ایسے مسائل بیان ہوئے ہیں جو اس قسم کی بحثوں سے ناآشنا ذہنوں کے لیے گراں ہوں گے۔ لیکن کیا کیا جائے؟ نہج البلاغہ جیسی کتاب کے بارے میں بحث و گفتگو کے دوران نشیب و فراز ناگزیر ہے، اسی لیے ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف چند نمونوں کے بیان پر قناعت کریں گے، اور اگر لفظ بہ لفظ تفصیل کے ساتھ نہج البلاغہ کی شرح کرنا چاہیں تو "مثنوی ہفتاد من کاغذ شود" اس کے لیے دفتر کے دفتر کاغذ درکار ہوں گے۔

ذات حق

ذاتِ حق کیا ہے؟ اس کی تعریف کن الفاظ میں کی جا سکتی ہے؟ نہج البلاغہ میں اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی ہے یا نہیں؟ جی ہاں بحث ہوئی ہے اور اچھی خاصی بحث ہوئی ہے، لیکن تمام بحثوں کا محور ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ ذات حق "وجودِ بے حد ونہایت" اور "ہستی مطلق" ہے، اس کی کوئی "ماہیت" نہیں، وہ ذاتی ہے کسی حد سے محدود نہیں، اس کے یہاں اس ماہیت کا گذر نہیں جو آسے کسی خاص "نوع" میں محدود کر دے یا ایک محدود وجود کو اس سے مخصوص کر دے، کوئی بھی زاویہ وجود اس سے خالی نہیں، اس کے یہاں کسی "فقدان" کا تصور نہیں، صرف ایک ہی فقدان اس کے یہاں پایا جاتا ہے اور وہ "فقدانِ فقدان" ہے۔ اگر کسی سلب کا اس پر صدق آتا ہے تو وہ سلب کا سلب ہے، اگر کسی نفی و عدم کو اس کی صفت قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ مخلوقیت و معلولیت، محدودیت و کثرت یا تجزی و محتاجی جیسے نقص و عدم کی نفی ہے اور وہ واحد سرحد جس میں وہ قدم نہیں رکھتا سرحدِ عدم ہے، وہ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن کسی چیز میں نہیں اور کوئی چیز بھی اس کے ہمراہ نہیں، کسی چیز کے اندر نہیں لیکن کسی چیز سے باہر بھی نہیں، وہ ہر قسم کی کیفیت اور ہر طرح کی تشبیہ و تمثیل سے مبرّا و منزہ ہے، کیونکہ یہ سب اس موجود کے اوصاف ہیں جو محدود و متعین و صاحب ماہیت ہو۔

مع کل شیءٍ لا بمقارنۃٍ وغیر کل شیءٍ لا بمزایلۃٍ [1]

وہ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن جسمانی اتصال کی طرح مقارن نہیں کہ نتیجتاً وہ چیز بھی اس کے قرین و ہم دوش ہو، وہ ہر چیز سے مغایر و علیحدہ ہے۔ وہ عین اشیاء نہیں ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ اشیاء سے دور ہو اور وجودات اشیاء اس کی ذات کی حد سمجھی جائے۔

لیس فی الأشیاء بوالج ولا عنہا بخارج [2]

وہ چیزوں کے اندر نہیں، اس نے اشیاء میں حلول نہیں کیا ہے، کیونکہ حلول کا لازمہ حلول کرنے والی شئے کی محدودیت اور اس کا تحیز ہے اور اسی حالت میں وہ کسی چیز سے باہر بھی نہیں، کیونکہ باہر ہونے کا لازمہ بھی ایک قسم کی محدودیت ہے۔

بان من الأشیاء بالقھر لھا والقدرۃ علیھا وبانت الأشیاء منہ بالخضوع

توحید ۸۸

وہ سب چیزوں سے اس لئے جدا ہے کہ وہ ان پر چھایا ہوا ہے، اور ان پر قدرت رکھتا ہے، اور واضح ہے کہ کبھی قاہر مین مقہور اور تقادر مین مقدور و مسلط مین مسخر نہیں ہوتا۔ اور تمام چیزیں اس لیے اس سے جدا ہیں کہ وہ اس کے سامنے جھکی ہوئی ہیں اس کی بارگاہ میں مسخر ہیں اور جو چیز اپنی ذات میں خاضع و مسخر (مین خضوع و اطاعت) ہو وہ اس کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتی جو اپنی ذات میں بے نیاز ہے۔ اشیاء سے حق کی جدائی و مغایرت اس طرح نہیں ہے کہ کسی حد و فصل نے انھیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو، بلکہ اس کا تعلق ربوبیت و مربوبیت، کمال و نقص، قوت و ضعف سے ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں اس قسم کی گفتگو کثرت سے مل سکتی ہے، وہ مسائل، جن کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔ سب اسی اصل پر استوار ہیں کہ ذات حق وجود مطلق و لامتناہی ہے اور کسی قسم کی حدبندی اور ماہیت و کیفیت اس کے بارے میں صادق نہیں آتی۔

وحدتِ حق، وحدت عددی نہیں

نہج البلاغہ کا ایک دوسرا توحیدی مسئلہ یہ ہے کہ وحدت ذات اقدس احدیت، وحدت عددی نہیں بلکہ ایک دوسرے قسم کی وحدت ہے۔ وحدت عددی سے مراد ایسی چیز کی وحدت ہے جس میں فرض تعدد و تکرر وجود ممکن ہو۔ جب بھی کسی ایسی ماہیت یا طبیعت کو نظر میں لائیں جس نے لباس وجود پہنا ہو اس کے بارے میں عقلاً یہ فرض کر لینا ممکن ہے کہ وہ ماہیت ایک دوسری فرد میں بھی متحقق اور دوبارہ وجود میں آسکتی ہے۔ ایسے مقامات پر اس ماہیت کے افراد کی وحدت، وحدت عددی ہوگی، یہ وحدت، اثنینیت و کثرت کے مقابلہ میں ہے، ایک ہے یعنی دو نہیں اور قدرتی طور پر اس قسم کی وحدت صفت قلت سے بھی متصف ہوگی، یعنی وہ ایک فرد اپنے مد مقابل دو یا اس سے زیادہ افراد سے کم ہے، لیکن اگر کسی چیز کا وجود ایسا ہو کہ اس میں فرض تعدد و تکرر کی گنجائش ہی نہ ہو (ہم یہ نہیں کہتے کہ دوسرے فرد کا وجود محال ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس فرد کے علاوہ کسی دوسرے فرد کے تکرر و تعدد کو فرض کرنا بھی محال ہو) کیونکہ وہ بے حد و لامتناہی ہے، جس چیز کو اس کا مثل و ثانی فرض کریں تو مثل و ثانی خود اس کی ذات ہی ہوگی۔ ورنہ وہ اس کا مثل و ثانی نہیں،

ایسے مقامات پر وحدت عددی نہیں ہوتی یعنی یہ وحدت اثنینیت وکثرت کے مقابلہ میں نہیں ہے، اس کے ایک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دو نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کا ثانی فرض کرنا بھی محال ہے۔

اس مطلب کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا جاسکتا ہے: آپ جانتے ہیں ابعاد وجہات عالم کے متناہی ولامتناہی ہونے کے سلسلہ میں دنیا کے دانشوروں میں اختلاف ہے، کچھ دانشوروں کا دعویٰ ہے کہ ابعاد عالم لامتناہی ہیں وہ کہتے ہیں عالم اجسام کی کوئی حد وانتہا نہیں، مگر بعض دانشوروں کا نظریہ ہے کہ ابعاد عالم محدود ہیں جس طرف بھی آگے بڑھیں آخر کار ایک ایسی جگہ پہنچ جائیں گے جس کے بعد کچھ بھی نہیں۔ ایک دوسرا مسئلہ بھی محل بحث ہے اور وہ یہ کہ عالم اجسام اسی دنیا میں محدود ومنحصر ہے جس میں ہم زندگی گذار رہے ہیں، یا اس کے سوا کچھ جہاں اور بھی ہیں؟

بدیہی ہے کہ ہمارے اس عالم اجسام کے علاوہ ایک دوسرے عالم اجسام کا فرض اسی وقت متصور ہوسکتا ہے، جب یہ مان لیا جائے کہ ہمارا یہ عالم اجسام محدود ومتناہی ہے.... یہ صرف اسی صورت میں فرض کیا جاسکتا ہے جب مثلاً دو عالم جسمانی ہوں اور ہر عالم کچھ خاص ابعاد وجہات میں محدود ہو، لیکن اگر یہ فرض کرلیں کہ ہمارا یہ عالم اجسام لامحدود ہے تو پھر دوسرے عالم جسمانی کا فرض ناممکن ہوگا، کیونکہ ہم جس دوسری دنیا کو فرض کریں گے وہ ہماری یہی دنیا یا اسی دنیا کا ایک حصہ ہوگی۔

اس نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ذات حق وجود محض وآنیت صرف وواقعیت مطلقہ ہے، وجود ذات احدیت کے مانند کسی دوسرے وجود کا فرض ویسا ہی ہے جیسے عالم جسمانی کو لامتناہی مانتے ہوئے کسی دوسرے عالم جسمانی کا فرض، یہ ایسا فرض ہے جس کا کوئی امکان نہیں۔

نہج البلاغہ میں اس سلسلہ میں متعدد مقامات پر بحث ہوئی ہے کہ وحدت ذات حق وحدت عددی نہیں، اسے وحدت عددی سے موصوف نہیں کیا جاسکتا، دائرہ عدد میں ذات حق کے آجانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ذات کو محدود بنا دیا جائے۔

الاحد بلا تأویل عدد[عہ]

وہ ایک ہے لیکن نہ ایسا جو شمار میں آئے۔ اس کا ایک ہونا عددی یا شماری نہیں۔

لا یشمل بحد ولا یحسب بعد[عہ]

وہ کسی حد میں محدود نہیں اور نہ کوئی گنتی اسے شمار کر سکتی ہے۔

وَمن اشار الیه فقد حدّہ ومن حدّہ فقد عدّہ[۵]

جس نے اس کی جانب اشارہ کیا اس نے اس کی حد بندی کردی اور جس نے اسے محدود سمجھا اس نے اسے قابل شمار اشیاء کی قطار میں کھڑا کردیا۔

من وصفه فقد حدّہ ومن حدّہ فقد عدّہ ومن عدّہ فقد ابطل ازله[۶]

جس نے (ذات سے الگ) اس کے لیے صفات تجویز کیے اس نے اس کی حد بندی کردی، اور جس نے اسے محدود کیا وہ اسے شمار میں آنے والی چیزوں کی قطار میں لے آیا، اور جس نے اسے شمار کے قابل سمجھ لیا اس نے اس کی قدامت وازلیت ہی سے انکار کردیا۔

کلّ مسمّی بالوحدۃ غیرہ قلیل"[۷]

اللہ کے علاوہ جسے بھی ایک کہا جائے گا اس کی قلت وکمی ثابت ہوگی، مگر خدا باوجودیکہ ایک ہے، قلت وکمی سے ماوراء ہے۔

یہ جملہ کتنا دلکش، عمیق اور معنی خیز ہے، یہ جملہ کہتا ہے ذات حق کے سوا جو چیز ایک ہوگی کم بھی ہوگی، یعنی وہ ایسی چیز ہے جس کے مثل دوسری فرد کا فرض ممکن ہے، پس خود اس کا وجود محدود ہوگا اور دوسری فرد کے اضافہ کی صورت میں زیادہ ہوجائے گا۔ لیکن ذات حق، ایک ہونے کے باوجود کمی وقلت سے موصوف نہ ہوگی، کیونکہ اس کی وحدت، وجود کی اسی عظمت وشدت ولامتناہیت اور اس کے لیے مانند ومثل وثانی کا متصور نہ ہونا ہے۔

وحدت حق کا وحدت عددی نہ ہونا، بالکل نئی، اچھوتی، عظیم اور خاص اسلامی فکر ہے جس کا موجد خود اسلام ہے، اس سے پہلے کسی بھی مکتب فکر میں اس کی مثال نہیں ملتی، خود اسلامی فلاسفہ نے بھی اصل اسلامی متون ومآخذ خاص کر حضرت علی علیہ السلام کے ارشاد میں غور وفکر وتدبر کی برکت سے تدریجاً اس عمیق فکر سے آگاہی حاصل کی اور پھر باقاعدہ طور پر اسے فلسفہ الٰہی شامل کرلیا چنانچہ فارابی وبوعلی سینا جیسے قدیم اسلامی حکماء کے یہاں اس لطیف فکر کے آثار نظر نہیں آتے لیکن بعد کے حکماء جنھوں نے اس فکر کو اپنے فلسفہ میں شامل کیا ہے، اپنی اصطلاح میں اس قسم کی وحدت کو "وحدت حقہ حقیقیہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں

حق کا اوّل و آخر اور ظاہر و باطن ہونا۔

نہج البلاغہ کی بحثوں میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ خداوند عالم اوّل ہے اور آخر بھی، ظاہر ہے اور باطن بھی، البتہ دوسری بحثوں کی طرح یہ بحث بھی قرآن مجید ہی کا اقتباس ہے، لیکن فی الحال ہم اس مقام پر قرآن مجید سے بحث نہیں کر رہے ہیں، خداوند عالم اوّل ہے لیکن اس کی اوّلیت، اوّلیت زمانی نہیں کہ اس کی آخریت سے مغایر ہو وہ ظاہر ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حواس ظاہری سے اس کو محسوس کیا جا سکے کہ اس کے باطن ہونے کے منافی ہو، اس کی اولیت عین آخریت ہے، اور ظاہریت عین باطنیت ہے۔

الحمد للّٰه الذی لم تسبق له حال حالا فیکون اوّلاً قبل ان یکون اخراً ویکون ظاهراً قبل ان یکون باطنا ... وکلّ ظاهرٍ غیره غیر باطنٍ وکل باطنٍ غیره غیر ظاهرٍ۔

تمام حمد اس اللہ کے لیے ہے جس کی ایک صفت سے دوسری صفت کو تقدم نہیں کہ وہ آخر ہونے سے پہلے اوّل اور ظاہر ہونے سے پہلے باطن رہا ہو.... اس کے سوا ہر ظاہر صرف ظاہر ہے، باطن نہیں ہو سکتا اور ہر باطن صرف باطن ہے ظاہر نہیں ہو سکتا، یہ صرف اس کی ذات ہے کہ عین ظاہر ہونے کی صورت میں باطن بھی ہے اور عین باطن ہونے کی شکل میں ظاہر بھی ہے۔

لا تصحبه الاوقات ولا ترفده الادوات، سبق الاوقات کونه والعدم وجوده والابتداء ازله۔

نہ زمانہ اس کا ہم رکاب ہے (اس کے مرتبہ ذات میں زمانہ کا وجود نہیں) اور نہ آلات و وسائل اس کے معاون و مددگار ہیں، اس کی ہستی زمانہ سے پیشتر اس کا وجود عدم سے سابق اور اس کی ازلیت نقطہ آغاز سے بھی پہلے ہے۔

ذات حق کا ہر قید زمان ہر عدم و نیستی اور ہر آغاز و ابتدا پر مقدم ہونا فلسفہ الٰہی کی لطیف ترین فکر ہے، ازلیت حق کا مطلب صرف یہی نہیں کہ وہ ہمیشہ سے ہے اس میں

شک نہیں کہ وہ ہمیشہ رہا ہے، لیکن ہمیشہ ہونے کا مطلب تو یہی ہے کہ کوئی ایسا زمانہ نہیں جس میں وہ نہ رہا ہو، حالانکہ ازلیت حق کا مفہوم "ہمیشہ ہونے" کے مافوق ہے، کیونکہ "ہمیشہ ہونے" کا لازمہ فرض زمان ہے اور ذات حق تمام زمانوں کے ہمراہ ہونے کے علاوہ ہر چیز یہاں تک کہ قید زمان سے بھی مقدم ہے، اور یہی اس کی ازلیت کا مطلب ہے، یہیں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تقدم، تقدم زمانی کے علاوہ ایک دوسرے قسم کا تقدم ہے۔

الحمد لله الدال على وجوده بخلقه وبمحدث خلقه على ازليته و باشتباههم على ان لا شبه له لا تستلمه المشاعر ولا تحجبه السواتر

تمام تعریف اس اللہ کے لیے جو تخلیق سے اپنے وجود کا اور پیدا شدہ مخلوقات کے حدوث سے اپنے قدیم و ازلی ہونے کا اور ان کی باہمی شباہت و مماثلت سے اپنے بے نظیر ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے، حواس اسے چھو نہیں سکتے، پھر بھی وہ ظاہر و عیاں ہے اور دنیا کے تمام پردے اسے چھپانے سے عاجز و ناتواں ہیں۔

یعنی وہ ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی، وہ اپنی ذات میں عیاں ہے لیکن انسانی حواس سے نہاں ہے، حواسِ انسانی سے اس کے نہاں ہونے کی وجہ حواس کی محدودیت ہے ورنہ اس کی ذات عیاں و آشکار ہے۔

اپنے مقام پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وجود، مساویِ ظہور ہے، وجود جتنا زیادہ قوی و کامل ہوگا، اتنا ہی زیادہ ظاہر ہوگا اور اس کے برعکس جتنا کمزور اور عدم سے مخلوط ہوگا اتنا ہی زیادہ اپنے اور پرائے سے پنہاں ہوگا۔

ہر چیز کے لیے دو قسم کا وجود ہوتا ہے: "وجود فی نفسہ" اور "وجود لغیرہ" "وجود لغیرہ" ہماری ادراکی طاقتوں اور صلاحیتوں نیز خاص ضروری حالات سے وابستہ ہے، اسی لیے ظہور کی بھی دو قسمیں ہیں "ظہور فی نفسہ" و "ظہور لغیرہ"۔

چونکہ ہمارے حواس کا دائرہ محدود ہے لہٰذا وہ صرف محدود و مقید اور مثل و ضد رکھنے والے موجودات کا ادراک کر سکتی ہے، ہمارے حواس رنگ، صورت اور آواز کا اس لیے ادراک کر لیتے ہیں کہ یہ چیزیں زمان و مکان میں محدود ہوتی ہیں، ایک جگہ ہوتی ہیں دوسری جگہ

نہیں ہوتیں، ایک زمانہ میں پائی جاتی ہیں دوسرے زمانے میں نہیں پائی جاتیں، مثلاً اگر روشنی ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی طرح کی ہوتی تو اس کا احساس ممکن نہ ہوتا، اگر ایک آواز ہمیشہ ایک ہی لب ولہجہ اور انداز میں سنائی دیتی رہے تو وہ ہرگز سنی نہیں جا سکتی۔

ذات حق "صرف الوجود" و "فعلیت محض" ہے کسی زمان و مکان میں محدود نہیں اسی لیے ہمارے حواس کی نسبت باطن ہے لیکن وہ خود اپنی ذات میں عین ظہور ہے اور ہمارے حواس سے اس کے پنہاں ہونے کا سبب اس کا یہی کمال ظہور ہے جو اس کے کمالِ وجود سے پیدا ہوتا ہے، اس کی ذات میں ظاہر و باطن جہتیں یکساں ہیں، اس کے پنہاں ہونے کا سبب اس کا شدتِ ظہور ہے، وہ شدتِ ظہور کی بنا پر پردے میں ہے۔

یا من هو اختفی لفرط نوره

الظاهر الباطن فی ظهوره

حجاب روی تو ہم روی تو است در ہمہ حال

نہان ز چشم جہانی ز بس کہ پیدائی

چھپا رکھا ہے سر احسن تیرے جلوؤں نے — ترے وجود پہ پردہ ترے وجود کا ہے

موازنہ اور فیصلہ۔

نہج البلاغہ کی توحیدی بحثوں کی اصل قدر و قیمت اسی وقت معلوم ہو گی جب اسے دوسرے مکاتب فکر سے بطور اختصار سہی موازنہ کیا جائے۔ گذشتہ فصل میں جو کچھ بطور نمونہ پیش کیا گیا وہ نہج البلاغہ کی توحیدی بحثوں کا ایک بہت ہی مختصر سا حصہ تھا جو نمونہ کے طور پر بھی کافی نہ تھا لیکن فی الحال ہم اتنے ہی پر قناعت کرتے ہوئے دوسرے مکاتب فکر سے اس کا موازنہ کرتے ہیں۔

ذات و صفات حق کے بارے میں نہج البلاغہ سے پہلے اور اس کے بعد، شرق و غرب اور قدیم و جدید دور میں فلاسفہ، عرفا اور متکلمین نے بے شمار بحثیں کی ہیں، لیکن ان کے منہاج اور طریقہ ہائے کار جدا تھے، نہج البلاغہ نے جس منہاج کو اپنایا وہ بالکل نیا، اچھوتا اور ایجابی ہے، اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی، نہج البلاغہ کا واحد مأخذ صرف اور صرف قرآن مجید

ہے، قرآن مجید کے سوا کوئی ایسا مصدر نہ ملے گا جس کا اثر نہج البلاغہ نے قبول کیا ہو۔

گذشتہ صفحات میں اشارہ ہو چکا ہے کہ بعض دانشوروں نے ان مباحث کے لیے پہلے سے ہموار زمین فرض کرنے کی غرض سے اس کے کلام علی علیہ السلام ہونے میں شک و شبہ کا اظہار کیا ہے، انھوں نے یہ فرض کیا ہے کہ یہ مباحث عصر حضرت علیؑ کے مدتوں بعد افکارِ معتزلہ اور یونانی فلسفہ کے وجود میں آنے کے بعد ظاہر ہوئے ہیں، وہ اس نکتہ سے غافل ہیں کہ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" معتزلی و یونانی افکار کہاں، اور نہج البلاغہ کے لطیف افکار کہاں۔

نہج البلاغہ اور علم کلام

نہج البلاغہ میں خداوند عالم کو اوصاف کمالیہ سے موصوف جاننے کے باوجود ہر قسم کے اوصاف "مقارن" و "زائد بر ذات" کی نفی کی گئی ہے جبکہ اشاعرہ "صفات زائد بر ذات" کے قائل ہیں اور معتزلہ ہر قسم کی صفت کی نفی کرتے ہیں

الاشعری باز دیادِ قائلۃٍ وقال بالنیابۃِ المعتزلۃ

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ نہج البلاغہ میں بیان ہوا ہے وہ معتزلی افکار سے متاثر اور عصر اخیر کی ایجاد ہے، حالانکہ فکر شناس انسان آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ نہج البلاغہ میں (ذات واجب الوجود کے لیے) جس صفت کی نفی ہوئی ہے وہ صفتِ محدود ہے اور لا محدود صفت لا محدود ذات کے لیے مستلزم عینیت ذات با صفات ہے نہ کہ انکار صفات جیسا کہ معتزلہ نے گمان کیا ہے، اگر معتزلہ اس فکر تک پہنچ سکے ہوتے تو ہرگز صفات کی نفی نہ کرتے اور "نیابت ذات از صفات" کے قائل نہ ہوتے۔

اسی طرح حدوث کلام پروردگار کے سلسلہ میں خطبہ ۱۸۴ میں جو کچھ بیان ہوا ہے ممکن ہے یہ گمان ہو کہ اس خطبہ کا تعلق بحثِ حدوث و قدمِ قرآن سے ہے جو مدتوں تک اسلامی متکلمین کا موضوع سخن بنا رہا ہے اور اسے اسی عصر میں یا اس کے بعد کے ادوار میں نہج البلاغہ میں شامل کر دیا گیا ہے، لیکن ذرا سا تدبر واضح کر دیتا ہے کہ نہج البلاغہ کی بحث کا تعلق "حدوث و قدمِ قرآن" جیسی مہمل بحث سے نہیں ہے بلکہ وہ "امر تکوینی" و "ارادہ انشائی پروردگار" سے گفتگو

کرتی ہے، حضرت علیؑ فرماتے ہیں، امر پروردگار و ارادۂ انشائی پروردگار، فعل خدا ہے اسی لیئے وہ ذات الٰہی سے متاخر اور حادث ہے اور اگر یہ تو بہ ذات میں قدیم ہو تو اس سے ذات کے لیے ثانی و شریک لازم آتا ہے۔

يقول لمن اراد كونه كن فيكون، لا بصوت يقرع ولا بنداء يسمع وانما كلامه سبحانه فعل منه انشاه ومثله لم يكن من قبل ذالك كائنا ولو كان قديما لكان الها ثانيا۔

جسے پیدا کرنا چاہتا ہے اسے کہتا ہے "ہوجا" وہ ہوجاتی ہے، بغیر کسی ایسی آواز کے جو کانوں کے پردے سے ٹکرائے اور بغیر کسی صدا کے جو سنی جاسکے بلکہ اللہ سبحانہ کا کلام بس اس کا ایجاد کردہ فعل ہے، اور چونکہ اس کا فعل ہے لہٰذا حادث ہے اس کا پہلے سے وجود نہیں ہوسکتا اور اگر وہ قدیم ہوتا تو دوسرا خدا ہوتا۔

اس کے علاوہ اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کی بے شمار احادیث جس کا صرف کچھ حصہ نہج البلاغہ میں آیا ہے جو سند ہیں یعنی جن کا سلسلہ حضرتؑ کے زمانہ تک پہنچتا ہے، ایسی صورت میں شک و شبہ کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے؟ اور اگر کلام حضرت علی علیہ السلام و بیانات معتزلہ میں کسی قسم کی شباہت و مماثلت پائی جاتی ہے تو صرف یہ احتمال دیا جاسکتا ہے کہ معتزلہ نے حضرت سے اقتباس کیا ہے۔

اسلامی متکلمین نے (چاہے وہ شیعہ ہوں یا سنی، اشعری ہوں یا معتزلی) عام طور پر اپنی بحث کا محور، دار و مدار "حسن و قبح عقلی"، کو قرار دیا ہے، یہ اصول جو اجتماعی عملی اصول کے سوا کچھ بھی نہیں، متکلمین کی نظر میں عالم الوہیت میں بھی جاری ہے اور تکوینی سنتوں پر بھی حاکم ہے۔ لیکن پورے نہج البلاغہ میں اس اصول کی جانب ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ اسی طرح قرآن نے بھی اس اصول کی جانب اشارہ نہیں کیا ہے، اور اگر متکلمین کے افکار و نظریات نہج البلاغہ میں شامل ہوئے ہوتے تو سب سے پہلے بنیادی طور پر یہ اصول اسمیں شامل کیا جاتا۔

نہج البلاغہ اور فلسفی افکار

نہج البلاغہ میں وجود و عدم، حدوث و قدم جیسی اصطلاحات دیکھ کر کچھ لوگوں نے یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ اسلامی دنیا

میں یونانی فلسفہ کے رائج ہونے کے بعد عمداً یا سہواً ان اصطلاحات کو حضرت علیؑ کے کلام میں شامل کر دیا گیا ہے۔

ان مفروضات کا افسانہ گڑھنے والے حضرات نے بھی اگر الفاظ کو عبور کر کے معانی تک رسائی حاصل کی ہوتی تو اس قسم کا مفروضہ قائم نہ کرتے۔ سید رضیؒ سے پہلے، ان کے ہم عصروں حتیٰ کہ ان کے صدیوں بعد کے فلاسفہ کی زبان اور منہاج، نہج البلاغہ کی منہاج سے سو فیصد مختلف ہے۔

فی الحال ہم فلسفۂ یونان و اسکندریہ کے الٰہیات کے بارے میں گفتگو نہیں کریں گے کہ وہ کس سطح کی تھی، بلکہ ہم اپنی بحث کو اس الٰہیات سے مخصوص کرتے ہیں جسے فارابی، ابن سینا، اور خواجہ نصیر الدین طوسی نے بیان کیا ہے۔ البتہ شک نہیں ہے کہ ان اسلامی فلاسفہ نے اسلامی تعلیمات سے متأثر ہو کر بعض مسائل کو فلسفہ میں شامل کر لیا ہے، جن کا اس سے پہلے وجود نہ تھا، اس کے علاوہ انھوں نے بیان و توجیہہ و استدلال میں کچھ نئے مسائل ایجاد بھی کیے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ چیزیں نہج البلاغہ سے مستفاد ہونے والے افکار سے مختلف ہیں۔

حضرت استاد علامہ طباطبائی روحی فداہ (اعلی اللہ مقامہ)، نشریہ "مکتب تشیع" شمارہ ۵ میں مقدمۂ بحث "روایات معارف اسلامی" میں فرماتے ہیں:۔

"فلسفۂ الٰہی سے متعلق یہ روایات کچھ ایسے مسائل اور مطالب کو حل کرتی ہیں اور کچھ ایسی گتھیوں کو سلجھاتی ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ مسلمین ناواقف اور عرب ناآشنا تھے بلکہ ماقبل اسلام کے فلاسفہ جن کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئی ہیں ان کے بیانات میں بھی اس قسم کی باتیں نظر نہیں آتیں، عرب و عجم کے اسلامی فلاسفہ جن کے آثار آج بھی موجود ہیں، ان میں بھی اس قسم کے عناوین نہیں پائے جاتے۔ یہ مسائل اسی طرح مبہم باقی رہے تھے اور شارح و مفسر اپنے اپنے گمان کے مطابق ان کی تاویل و تفسیر کیا کرتا تھا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان کے خط و خال نمایاں ہوتے گئے اور گیارہویں صدی ہجری میں یہ مسائل حل ہو گئے، جیسے واجب الوجود کے لیے "مسئلۂ وحدت حقہ" (وحدت غیر عددی) اور یہ کہ ثبوتِ وجودِ واجب، اس کی وحدانیت کا بھی ثبوت ہے، (وجودِ واجب چونکہ وجودِ مطلق ہے لہٰذا مساوی وحدت ہے) یا یہ مسئلہ کہ "واجب معلوم بالذات" ہے اور واجب کسی واسطہ کے بغیر خود بخود پہچانا جاتا ہے اور ہر چیز واجب کے توسط سے

پہچانی جاتی ہے لیکن اس کا عکس غلط ہے ...."[۱۲]

ذات وصفات وشئون حق سے تعلق رکھنے والی، وحدت وبساطت، عنائے ذاتی وعلم اور قدرت ومشیت جیسی بحثوں میں فارابی، ابن سینا اور خواجہ نصیرالدین طوسی جیسے متقدم اسلامی فلاسفہ کے استدلال کا مرکز ومحور "وجوب وجود" رہا ہے۔ یعنی وہ ہر چیز کو "وجوب وجود" کے پرتو سے اخذ کرتے ہیں اور خود وجوب وجود ایک غیر مستقیم راستہ سے ثابت ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ فرض واجب الوجود کے بغیر، وجود ممکنات کی توجیہ ناممکن ہے۔ اس سلسلہ میں پیش کی جانے والی دلیل اگرچہ برہان خلف کی قسم سے نہیں ہے لیکن "بالواسطہ" ہونے اور الزامی خاصیت کی حامل ہونے کے لحاظ سے برہان خلف سے مماثلت ضرور رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ذہن کبھی بھی ملاک واصل "واجب الوجود" تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا اور لِمّ ہاتھ نہیں آتی۔ کتاب "اشارات" میں ابن سینا کا ایک خاص بیان ہے جہاں انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ اس بیان سے لِمّ سمجھ میں آجاتی ہے۔ اسی لئے انھوں نے اپنی معروف ومشہور برہان کو "برہان صدیقین" سے تعبیر کیا ہے، لیکن ان کے بعد کے فلاسفہ نے اس بیان کو انکشافِ لِمّ کے لیے کافی نہیں سمجھا۔

نہج البلاغہ میں کہیں بھی وجوب وجود کو وجود ممکنات کی توجیہ کرنے والے اصول کے طور پر معرض بحث قرار نہیں دیا گیا ہے، اس کتاب میں جس چیز کی تاکید کی گئی ہے وہ وہی ہے جو وجوب وجود کے واقعی ملاک کو بیان کرتی ہے، یعنی ذات حق کا "وجود صرف" و "واقعیت محض" ہونا۔

حضرت استاد علامہ طباطبائی اپنے اسی مقالہ میں توحید صدوق[رح] میں حضرت علیؑ سے مروی ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اس گفتگو کی بنیاد اس اصل پر استوار ہے کہ وجود حق سبحانہٗ ایک ایسی واقعیت ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا، کیونکہ وہ واقعیت محض ہے اور ہر دوسری چیز جس میں واقعیت پائی جاتی ہے اپنے حدود وخصوصیات وجودی میں اسی کی محتاج ہے اور اپنے خاص وجود کو اسی سے حاصل کرتی ہے[۱۳]۔"

بہر حال یہ واضح ہے ذاتِ حق کے بارے میں نہج البلاغہ کی بحثوں اور گفتگوؤں کی بنیاد

واساس یہ ہے کہ "وہ" ہستی مطلق اور لامحدود ہے، اس کے یہاں قید وحد کا گزر نہیں کوئی زمان یا مکان اور کوئی شئی اس سے خالی نہیں، وہ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن کوئی چیز اس کے ہمراہ نہیں اور چونکہ وہ مطلق و بے حد ہے لہٰذا ہر چیز حتیٰ کہ زمان و عدد وحد و اندازہ و ماہیت وغیرہ پر تقدم رکھتا ہے، یعنی زمان و مکان و عدد وحد و مقدار خود اس کے افعال کی حیثیت رکھتے ہیں اسی کے وضع و ایجاد کردہ ہیں، ہر چیز اس کی خلق کی ہوئی ہے اور ان تمام چیزوں کو اسی کی جانب لوٹنا ہے وہ اوّل الاولین ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آخرالآخرین بھی ہے۔

یہ ہیں نہج البلاغہ کی بحثوں کی بنیادیں جن کی مثال فارابی، ابن سینا، ابن رشد، غزالی اور خواجہ نصیرالدین طوسی کے یہاں دیکھنے کو بھی نہیں مل سکتی۔

جیسا کہ استاد علامہ فرما چکے ہیں "الٰہیات بالمعنی الاخص" سے متعلق یہ بحثیں، کچھ دوسرے مسائل پر موقوف ہیں جو امور عامۂ فلسفہ میں ثابت ہو چکی ہیں اور ہم یہاں پر آن مسائل اور ان مسائل پر ان بحثوں کے مبتنی ہونے کے وجوہات کو بیان نہیں کر سکتے۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اولاً نہج البلاغہ میں ایسے مسائل پائے جاتے ہیں جو جامع نہج البلاغہ سید رضیؒ کے عصر میں فلاسفہ عالم کے درمیان رائج نہ تھے، مثلاً وحدت ذات واجب، وحدت عددی نہیں ہے، مرتبہ عدد اس کی ذات سے متاخر ہے، اس کا وجود اس کی وحدانیت کے مساوی ہے، ذات حق کا بسیط الحقیقت اور تمام چیزوں کے ہمراہ ہونا یا اس کے علاوہ اور بہت سے دوسرے مسائل وغیرہ۔ ثانیاً ہم دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں جس چیز کو اساس و بنیاد بنایا گیا ہے وہ آج تک کی دنیا میں رائج فلسفی بحثوں کی بنیاد سے یکسر مختلف ہے، پھر کیسے اور کیوں کر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ بحثیں اس دور کے فلسفیانہ مفاہیم کے واقف کاروں کی ایجاد و اختراع ہے ؟!

نہج البلاغہ اور مغربی فلسفہ

تاریخ فلسفہ شرق میں نہج البلاغہ کا بہت بڑا حصہ ہے صدر المتألہین جنھوں نے حکمت الٰہی میں تبدیلیاں پیدا کیں کلام حضرت علی علیہ السلام سے بہت زیادہ متاثر تھے، توحیدی

مسائل میں ان کا طریقۂ کار، ذات سے ذات اور پھر ذات سے صفات و افعال پر استدلال کی بنیاد پر استوار ہے، اور ان سب کی اساس واجب کے صرف الوجود ہونے پر ہے، اور یہ خود کچھ ایسے کلی اصولوں پر مبتنی ہے جن سے فلسفۂ عامہ میں بحث و گفتگو کی جاتی ہے[15]

اسلامی معارف کی برکت سے حکمتِ الٰہی شرق کا دامن مالامال ہوگیا اور اسے استحکام مل گیا، اور خلل ناپذیر اصول و مبادی کی بنیادوں پر استوار ہوگئی لیکن حکمتِ الٰہی غرب ان امتیازات سے محروم رہ گئی، مغرب میں مادی فلسفہ کی جانب رجحان اور اس سے لگاؤ کے بہت سے اسباب ہیں جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں، لیکن میرا نظریہ ہے کہ اس کا اصل سبب مغربی حکمتِ الٰہی کے مفاہیم کا نقص اور اس کی عاجزی ہے، اگر کوئی ان دو تین فصلوں میں بیان ہونے والی بحثوں کے سلسلہ میں موازنہ کرنا چاہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ "برھان وجودی" کے سلسلہ میں۔

"آنسلم مقدس" سے ڈکارٹ، اسپینوزا، لائب نیس اور کانٹ وغیرہ تک کے مغربی فلاسفہ کی بحث و گفتگو کا مطالعہ کرے اور پھر اسے صدرالمتألہین کی برھان صدیقین سے موازنہ کرے جو اسلامی افکار اور خاص کر کلام حضرت علیؑ کی دین ہے، اس وقت معلوم ہوگا کہ ان دونوں افکار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

حواشی

[1] خطبہ ۱ [2] خطبہ ۱۸۴ [3] خطبہ ۱۵۰ [4] خطبہ ۱۸۴ [5] خطبہ ۱ [6] خطبہ ۱۵۰

[7] خطبہ ۶۳ [8] خطبہ ۶۳ [9] خطبہ ۱۸۴ [10] خطبہ ۱۵۰

[11] خطبہ اول میں اس جملہ "وکمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ" سے پہلے ارشاد ہوتا ہے والذی لیس لصفتہ حدٌ محدودٌ ولا نعتٌ موجود،

[12] مکتب تشیع، شمارہ ۲ ص ۱۲۰ [13] سابق مصدر ص ۱۲۶ [14] سابق مصدر ص ۱۵۷

[15] کتاب "علل گرایش بہ مادی گری" باب "نارسائیہای مفاہیم فلسفی"

جناب سید احمد فہری
ترجمہ : جناب سید حسین مہدی حسینی

امام خمینی اور شہید ثانی کی نظر میں

اسلام کے عظیم الشان فقیہ جناب شہید ثانی کا ارشاد ہے :

علم کے فضل و شرف کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ پروردگار عالم نے جب انسان کی خلقت یعنی عدم کے سناٹے سے وجود کی چہل پہل میں لائے جانے کا تذکرہ فرمایا تو سب سے پہلی چیز جسے بعنوان احسان بیان فرمایا وہ علم تھا۔ خاتم النبیینؐ پر سب سے پہلی جو آیت نازل فرمائی اسمیں حضرت احدیت کا ارشاد ہے :

"اِقراء باسم ربّك الّذی خلق خلق الانسان من علق اِقراء وربّك الاکرمُ الّذی عَلّمَ بالقلم علّم الانسان مالم یعلم" [۱]

اے رسولؐ ! اپنے رب کا نام لے کر پڑھیے جس نے کائنات کو پیدا کیا، اسی نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیے آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی، اور انسان کو ان باتوں سے آگاہ کیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

آیۂ کریمہ کی توجیہ و تفسیر میں کہا جاتا ہے کہ خالق نے خون بستہ "علق" جیسی بے قدر و قیمت شئے سے انسان کے تذکرہ کا آغاز کیا اور علم جیسی اعلیٰ و ارفع شئے پر اس کے ذکر کا خاتمہ فرمایا۔ گویا خالق اکبر کہہ رہا تھا۔
اے انسان! یہ یاد رہے تیرا آغاز یہ ہے اور انجام یہ۔

آیۂ کریمہ کے سلسلہ میں ادبی نکتہ :۔

علم "اصول فقہ" کا مسلمہ اصول ہے۔ جب صفت کے بعد کسی حکم کا تذکرہ کیا جائے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صفت و حکم آپس میں رشتہ بیت رکھتے ہیں۔ مثلاً۔ اگر یہ کہا جائے
"مہمان کا اکرام کرو"
اس جملہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لفظ مہمان کا صادق آنا ہی اس کے احترام و اعزاز کے لیے کافی ہے۔ مہمان کی شخصیت کو "حکم اکرام و احترام" میں موضوع قرار نہیں دیا جاسکتا۔
یا مثلاً یہ کہا جائے۔
"فقیر کی مدد کرو اور ظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہو۔"
اس جملہ سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ فقیر کی مدد کا سبب غربت ہے اور ظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا راز اس کا ظلم ہے اور بس۔
اس قاعدہ کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ پروردگار عالم آیۂ کریمہ میں ارشاد فرماتا ہے:
"اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھئے، آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی اسی نے انسان کو وہ باتیں بتائیں جسے وہ نہیں جانتا تھا۔"
آیت کے اس انداز سے استفادہ ہوتا ہے کہ پروردگار عالم کے لیے صفت اکرمیت کا اختصاص و انتساب اس لیے ہوا کہ اس نے انسانوں کو دانش و بینش تعلیم فرمائی۔ اگر نعمات الٰہیہ کے درمیان جس سے اس نے انسان کو از راہ کرم نوازا ہے، علم سے بہتر کوئی نعمت ہوتی تو بہتر تھا کہ علم کے بجائے اس نعمت سے

نوازے جانے کے بعد خدا کے کرم کا تذکرہ ہوتا۔ لیکن قرآن کریم نے کسی نعمت کے نوازے جانے کے بعد خداوند عالم کو لفظ "اکرم" سے نہیں پہچنوایا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لفظ اکرمیت کا تعلق صرف اور صرف علم و دانش سے ہے۔

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں :

کفیٰ بالعلم شرفاً أن یدّعیه مَن لا یحسنه و یفرح إذ انتسب الیه

مَن لیس من اهله وکفیٰ بالجهل خمولاً انّه یتبرّأ منه من هو فیه و

یغضب إذا انسب الیه[۲]

علم کے فضل و شرف کے لیے بس یہی کافی ہے کہ علم و دانش نہ رکھنے والے بھی علم کا دعویٰ کرتے ہیں اور جب انھیں "پڑھا لکھا" کہہ دیا جاتا ہے تو پھولے نہیں سماتے۔ اور جہالت کی گمنامی و پستی کے لیے بھی بس یہی کافی ہے کہ جاہل اپنی جہالت کے باوجود اپنے کو جاہل سننے پر تیار نہیں، جبکہ حق یہی ہے کہ وہ جاہل ہے۔[۳]

علم کے فضل و شرف میں جس قدر آیات و روایات اس رسالہ میں پیش کی گئی ہیں اس سے کہیں زیادہ مفصل کتابوں میں موجود ہیں میں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کروں گا۔

معلم و متعلم کی عظمت و منزلت :۔

"خرج رسول الله صلی الله علیه وآله فاذا فی المسجد مجلسات:

مجلس یتفقهون و مجلس یدعون الله تعالیٰ و یسئلونه فقال :

کلا المجلسین الی خیر أمّا هؤلاء فیدعون الله و أمّا هؤلاء فیتعلمون

و یفقهون الجاهل هؤلاء افضل، بالتعلیم أرسلت ثم قعد معهم"

حضرت مرسل اعظمؐ اپنے بیت الشرف سے مسجد میں تشریف لائے۔ دیکھا کچھ لوگ فقہ پڑھ رہے اور کچھ مصروف طاعت و بندگی ہیں۔ حضور نے جب یہ دیکھا تو فرمایا: دونوں ہی جماعت راہ حق و ثواب پر رواں دواں ہے لیکن ان میں وہ افضل ہیں جو دوسروں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ میں فروغ علم کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ یہ کہتے

ہوئے ان لوگوں کے درمیان بیٹھ گئے جو تحصیل علم میں مشغول تھے۔
امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام فرماتے ہیں:

"فقیہ واحد ینقذ یتیماً من ایتامنا المنقطعین عن مشاھدتنا والتعلّم من علومنا اشدّ علی ابلیس من الف عابد لأن العابد ھمّہ ذات نفسہ فقط وھٰذا ھمّہ مع ذات نفسہ عباد اللہ و إمائہ لینقذھم من ید ابلیس ومردتہ وکذالک ھو افضل عند اللہ من الف عابد"

کسی فقیہ کا ہمارے یتیموں میں سے کسی یتیم کو علم وادب کی تعلیم دینا اور اس کی سرپرستی کرنا ابلیس کے لیے ہزار عابد کی عبادت سے زیادہ ناگوار ہے کیونکہ عابد کی تمام تر توجہ اپنی نجات کے لیے ہوا کرتی ہے لیکن عالم اپنی نجات کے ساتھ ساتھ بندگان خدا کی نجات کے لیے بھی کوشاں رہتا ہے۔ تاکہ انہیں ابلیس کے دست اغوا سے بچا سکے یہی وجہ ہے کہ فقیہ اللہ کے نزدیک ہزار عابد سے زیادہ محترم ہے۔
شاید سعدی شیرازی نے اسی حدیث کے مفہوم کو نظم کیا ہے ؎

صاحبدلی بہ مدرسہ آمد زخانقاہ — بشکست عہد صحبت اہل طریق را
گفتم میان عابد و عالم چہ فرق است — تا اختیار کردی از آن این فریق را
گفت این گلیم خویش بہ دری برد زموج — وین جہد می کند کہ بگیرد غریق را

ایک دن ایک دیندار خانقاہ کے ماحول کو ترک کر کے مدرسہ پہنچا۔ میں نے پوچھا عالم و عابد میں کیا فرق ہے جو تم نے ان لوگوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کا ساتھ اختیار کیا۔ تو اس نے جواب دیا۔ عابد پر تلاطم موجوں سے صرف خود کو نجات دیتا ہے۔ لیکن عالم ڈوبتے ہوئے دوسرے انسانوں کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

حقیقی یتیم پرور کون؟

یتیم نوازی کے سلسلہ میں حضرات ائمہ ھدیٰ علیہم السلام سے جو روایات وارد ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یتیم نوازی سماج و معاشرہ کا اہم موضوع ہے۔ مرسل اعظمؐ نے تو یہاں تک

فرمایا:۔

"من کفل یتیماً وکفل نفقته کنت أنا وھو فی الجنة کھاتین وقرن

بین اصبعیه المسبحة والوسطی"

جس کسی نے یتیم کی کفالت اور اس کی سرپرستی کی وہ میرے ساتھ جنت میں اس طرح قریب ہوگا جس طرح ہاتھوں کی انگلیاں ملی ہوتی ہیں۔ حضرتؐ نے اس حدیث کے ارشاد فرماتے وقت انگشت شہادت اور اس کے بعد والی انگشت کو ملاتے ہوئے ــ قرب کی وضاحت فرمائی۔

لیکن فریضہ یہ ہے کہ پہچانا جائے نگاہ ائمہؑ میں یتیم کون ہیں؟ ان کی کفالت کن لوگوں کا حق ہے۔ ارشاد قدرت ہے:۔

واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لاتعبدون الا اللہ وبالوالدین

احساناً وذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین۔ (بقرہ-۸۳)

جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد وپیمان لیا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ ماں باپ اور قرابتداروں، یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔

آیۂ بالا کے ذیل میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جد بزرگوار حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا کہ ــــ خدا نے یتیم کی دلجوئی کا حکم اس لیے دیا ہے کہ وہ شفقت پدری سے محروم ہوچکا ہے، ایسے حالات میں جن لوگوں نے ان یتیموں کی کفالت کی خدا ان کا سرپرست ہوگا اور جس نے ان یتیموں کا احترام واعزاز کیا وہ خدا کے نزدیک معزز و محترم ہے۔ اور جس نے مہر ومحبت سے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا خدا اس کے صلہ میں ان بالوں کے عدد کے اعتبار سے جنت میں قصر مرحمت فرمائیگا جو اس کے ہاتھ سے مس ہو کر گذرے ہیں۔

وہ قصر ایسے ہوں گے جس کی وسعت وزیبائی کا مقابلہ دنیا کی وسعت وزیبائی نہیں کرسکتی۔ جنت میں ہر وہ چیز موجود ہے جس کی انسان خواہش کرے گا اور ہر وہ منظر فراہم ہے جس سے نظر کو فرحت حاصل ہو۔ وہاں کا عیش ابدی اور لذتیں دائمی ہیں۔

امام حسن عسکریؑ نے اپنے جد بزرگوار کی حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرمایا:

واشد من یتیم ھذا الیتیم یتیم انقطع عن امامہ لا یقدر علی الوصول الیہ ولا یدری کیف حکمہ فیما یبتلی بہ من شرائع دینہ الا فمن کان من شیعتنا عالما بعلومنا فھدی الجاھل بشریعتنا المنقطع عن مشاھدتنا کان کمن اخذ یتیما فی حجرہ الا فمن ھداہ وارشدہ وعلمہ شریعتنا کان معنا فی الرفیق الاعلیٰ۔

اس یتیم سے زیادہ قابل رحم وہ یتیم ہے جو اپنے امام کی خدمت میں حاضری سے محروم ہو۔ نہ ان تک پہنچنا ممکن ہو اور نہ روزمرہ کے مسائل کے دریافت کرنے کا امکان ہو۔

یاد رکھو ــــ ان حالات میں وہ لوگ جو ہمارے علوم سے آشنا ہیں۔ ان لوگوں کی جو ہمارے احکام دینیہ سے بے خبر، ہم تک پہنچنے سے مجبور ہیں، راہنمائی کرتے ہیں گویا یہ افراد انہی لوگوں کی طرح ہیں جنھوں نے یتیم کی کفالت کی یاد رکھو! جس کسی نے ہمارے احکام سے بے خبر انسان کی راہنمائی کی وہ بہشت بریں میں ہمارے ہمراہ ہے۔

پھر حضرت نے فرمایا، یہ وہ حدیث ہے جسے میں نے اپنے والد ماجد اور انہوں نے اپنے پدر بزرگوار اور ان کے آباء طاہرین نے مرسل اعظم سے نقل فرمایا ہے۔ مرسل اعظم کی لخت جگر جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے کسی عورت کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک حدیث کے ذیل میں فرمایا:

سمعت ابی (ص) یقول ان علماء شیعتنا یحشرون فیخلع علیھم من خلع الکرامات علی قدر علومھم وجدھم فی ارشاد عباد اللہ حتی یخلع علی الواحد منھم الف الف خلعۃ من نور ثم ینادی منادی ربنا عزوجل ایھا الکافلون لایتام آل محمد الناعشون لھم عند انقطاعھم عن آبائھم الذین ھم ائمتھم ھولاء تلامذتکم

والایتام الذین کفلتموھم ونعشتموھم فأخلعوا علیھم خلع العلوم فی الدنیا فیخلعون علی کل واحد من اولئک الایتام علی قدر علمہ ما اخذ عنھم من العلوم حتی أنّ فیھم یعنی فی الایتام لمن یخلع علیہ مأۃ الف حلۃ وکذٰلک یخلع ھؤلاء الایتام علی من تعلّم منھم ثمّ إن اللہ تعالی یقول اعیدوا علی ھؤلاء العلماء الکافلین ۔ للایتام حتی تتمّوا لھم خلعھم وتصعفوا فیتم لھم ما کان لھم قبل ان یخلعوا علیھم ویضاعف لھم وکذٰلک مرتبتھم ممن خلع علیھم علی مرتبتھم ۔

میں نے بابا کو کہتے ہوئے سنا:۔

ہمارے علماء شیعہ جب روز قیامت محشر میں لائے جائیں گے تو انہیں ان کے علم اور جس حد تک عوام کی راہنمائی وہدایت کی ہے اس کے صلہ میں خداوند عالم خلعت شرف وکرامت عطا فرمائیگا معبود ۔۔۔ علماء کی فرد فرد کو نور کی صد ہا ہزار خلعت سے نوازے گا ۔

پھر منادی ندا کرے گا ۔۔ کہاں ہیں وہ افراد جنھوں نے یتیمان آل محمدؐ کی اس وقت راہنمائی وکفالت کی جب وہ اپنے امام کی خدمت میں باریابی سے محروم تھے ۔

دیکھو ۔۔۔ یہ تمہارے وہی شاگرد ہیں جن کو تم نے علم وادب کی تعلیم دی تھی اور یہ وہ ایتام ہیں جن کی تم نے کفالت کی تھی ۔ تو جس طرح تم لوگوں نے کل دنیا میں انھیں علم وادب سے آراستہ کیا آج بھی انہیں ان کی استعداد کے بقدر لباہائے بہشتی سے آراستہ وپیراستہ کرو ۔ اس وقت علماء میدان محشر سے نکلیں گے اور اپنے اپنے شاگردوں کو ہزاروں وہزار بہشتی جوڑے عطا کریں گے ۔ اور پھر اسی طرح یہ شاگرد اپنے شاگردوں کو بہشتی جوڑوں سے سرفراز کر رہے ہوں گے ۔

ان علماء کو جنھوں نے یتیموں کی سرپرستی کی ہے انھیں ان کے ہدایا کئی گنا بڑھا کر دیئے جائیں ۔ یہاں تک کہ حد کمال تک پہنچ جائیں ۔ حکم خدا کی تعمیل کرنے والے ان علماء کے انعام، واقبال اور ان طلبہ کے تحفہ وہدایا کو کئی گنا بڑھا کر پیش کر رہے ہوں گے۔

جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا حدیث کے خاتمہ پر فرماتی ہیں:۔
اے خدا کی کنیز لباس جنت کے ایک تار کی چمک دمک دنیا کی ہر اس شیء سے جس پر آفتاب کی چھوٹ پڑ رہی ہے ہزار گنا زیادہ ہے۔ بھلا اس چمک دمک کا سورج کی روشنی سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سورج اپنی تمام تر ضیا پاشیوں کے باوجود مجموعۂ نقص و کدورت ہے۔
سرکار سید الشہداء علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

من كفل لنا يتيماً قطعته عنا محنتنا باستتارنا فواساه من علومنا التي سقطت إليه حتى ارشده وهداه قال الله عز وجل يا ايها العبد الكريم المواسي اني اولى بالكرم. اجعلوا له يا ملائكتي في الجنان بعدد كل حرف علمه ألف ألف قصر وضموا اليها ما يليق بها من سائر النعم۔

اگر کوئی اس وقت ہمارے یتیم کو جب وہ ہماری غیبت یا ناساعد حالات کی وجہ سے ہم سے بچھڑ چکا ہو۔ ہمارے احکام سے آشنا کرے اس کو تعلیم و تربیت دے تو خدا اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:۔
اے بندہ کریم تم نے لوگوں کے ساتھ ہمدردیاں کیں درآنحالیکہ میں کرم کا زیادہ اہل ہوں۔ پھر معبود فرشتوں سے کہے گا۔ اے میرے ملائکہ میرے اس بندہ کو ہر ہر حرف کے عوض میں جو اس نے تعلیم دیئے ہیں ہزار ہزار قصر بہشتی عطا کئے جائیں اور اس کے ساتھ ہر اس چیز سے اس قصر کو آراستہ کرو جو اس کے شایان شان ہے۔
امام ہشتم علی بن موسیٰ الرضا علیہم السلام فرماتے ہیں:۔

يقال للعابد يوم القيامة نعم الرجل كنت همتك ذات نفسك وكفيت الناس مؤونتك فادخل الجنة .... ويقال للفقيه ايها الكافل لايتام آل محمد الهادي لضعفاء محبيه ومواليه قف حتى تشفع لكل من اخذ عنك او تعلم منك فيقف فيدخل الجنة فئام وفئام حتى قال عشر وهم الذين اخذوا عنه علومه واخذ

عمّن اخذ عنه الیٰ یوم القیامة فانظروا کم فرقٌ مابین المنزلتین"

قیامت کے دن عابد سے کہا جائے گا کیا مرد خوب ہو۔ دنیا میں خود اپنی سعی و کوشش پر بھروسہ کیا۔ اپنا بوجھ کسی دوسرے پر نہ ڈالا۔ پس جنت میں داخل ہو جا۔

دوسری طرف فقیہ سے خطاب ہوگا:

اے آل محمدؐ کے یتیموں کی کفالت اور ان کے چاہنے والوں کی ہدایت ورہنمائی کرنے والو! ٹھہرو، آج تمہیں ان سب کی شفاعت کا حق ہے جسے تم نے کچھ تعلیم دیا یا تم سے کسی نے کچھ حاصل کیا۔ اس آواز کے سنتے ہی علماء ٹھہر جائیں گے۔ اس طرح یہ علماء گروہ در گروہ، گروہ در گروہ (حضرت اس طرح دس بار فرماتے رہے) کی شفاعت کر رہے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے خود ان علماء یا ان کے شاگردوں یا ان کے شاگردوں کے شاگردوں سے استفادہ کیا ہوگا۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی روایتیں اس موضوع کی شہید نے منیۃ المرید میں ذکر فرمائی ہیں۔ اہل ذوق اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

علماء کی قسمیں:

کسی محقق نے علماء کی تین طریقہ سے تقسیم کی ہے۔ میں ان کے مفہوم کو مزید وضاحت کے ساتھ اپنے الفاظ میں ذکر کر رہا ہوں۔

(۱)۔ بعض علماء وہ ہیں جنھیں خدا کے وجود، اس کے صفات جمال وجلال کا علم تو ہوتا ہے لیکن اس کے اوامر و احکام سے آگاہی و اطلاع نہیں ہوتی۔ یہ وہ افراد ہیں جن کے قلوب خدا کی معرفت سے منور ہیں یہ دل کے آئینہ میں اس کے جلال وجمال اور اس کی عظمت و کبریائی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان کے پاس اس کا وقت نہیں کہ احکام اسلام سے واقفیت کے لیے وقت صرف کریں، وہ صرف اپنے لیے ضروری مسائل سے جزوی آگاہی پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اس گروہ کا نام ـــــ عالم باللہ و غیر عالم بامر اللہ ـــــ ہے۔

(۲)۔ دوسرے گروہ سے مراد وہ افراد ہیں جنھوں نے خدا کے احکام اس کے اوامر و نواہی کو

اچھی طرح سمجھا اور معلوم کیا شریعت کے حلال و حرام سے پورے طور پر آگاہی و اطلاع حاصل کی لیکن یہ لوگ صفات جلالیہ کے اسرار اور اسماء الہیہ کے صفات و تجلیات سے بے خبر ہیں۔ اس گروہ کا نام ـــــ عالم بامر اللہ و غیر عالم باللہ ـــــ ہے۔

(۳)۔ تیسری قسم ان علماء کی ہے جنھیں خدا کی معرفت بھی ہے اور اس کے احکام و اوامر سے آگاہی بھی۔ یہ افراد وہ ہیں جو دنیائے محسوس اور عالم معقول کی مشترک سرحدوں پر جلوہ افروز ہیں یعنی ان کا رشتہ خدا سے بھی ہے اور مخلوق خدا سے بھی۔ جب کبھی خدا کی یاد کروٹیں لیتی ہے تو سر جھکا کر آئینہ دل میں معبود کے جلال و جمال کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور جب کبھی عالم محسوس (دنیا) کی طرف متوجہ ہوئے تو جذبہ مہر و محبت کے ساتھ خدا کے بندوں کو عالم بالا کے احکامات و پیغامات سنا دیتے ہیں۔ جس وقت خدا کی یاد سے اپنے خیالات کو بندے کی طرف موڑتے ہیں، تو بندوں میں ایسا گھل مل جاتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کا ربط خدا سے بھی تھا۔ لیکن جس وقت یاد خدا میں ڈوب جاتے ہیں تو پھر انھیں دنیا و مافیہا کی خبر نہیں ہوتی یہی وہ جادہ ہے جس پر صادقین و مرسلین کے کارواں گذرے۔

مرسل اعظمؐ سے بھی جو روایت نقل ہوئی ہے۔ اس میں بھی تین قسم کے علماء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"سائل العلماء و خالط الحکماء و جالس الکبراء"

روایت کے پہلے فقرہ میں "علماء" سے مراد وہ افراد ہیں جو اسلام کے حلال و حرام سے واقف ہیں لیکن معرفت خدا سے خالی ہیں ان جیسے افراد سے وقت ضرورت مسائل دینیہ معلوم کئے جا سکتے ہیں اور ان کے وجود سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے فقرہ میں "حکماء" سے مراد وہ لوگ ہیں جو وجود باری تعالیٰ کے عارف و عالم تو ہیں لیکن اس کے اوامر و احکام کی کنہ و باریکی سے ناآشنا ہیں ان سے باہمی میل جول کا حکم دیا گیا ہے۔

ارشاد معصوم کے آخری فقرہ یعنی "کبراء" سے مراد وہی علماء ہیں جو ایک طرف وجود باری تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ ساتھ اس کے اوامر و احکام سے بھی باخبر ہیں۔ ان علماء کی خدمت میں حاضری کو ضروری قرار دیا گیا ہے تاکہ "کمال ہم نشین در من اثر کرد" ـــــ کا مصداق بنکر فلاح دین و دنیا سے

ہم کنار ہو سکیں۔

محقق مذکور اپنی تحریر کو مزید بڑھاتے ہوئے یوں لکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر قسم کے علماء کی کچھ علامتیں اور نشانیاں ہیں جن کے ذریعہ سے انہیں پہچانا جا سکتا ہے۔

عالم بامر اللہ:۔ افسوس یہ وہ افراد ہیں جنکی زبانیں تو ذکر خدا سے مترنم رہتی ہیں لیکن دل یاد خدا سے غافل ہیں۔ یہ لوگ بندوں سے ڈرتے ہیں مگر خدا کے خوف سے ان کے قلوب خالی ہیں عوام سے شرم وحیا کرتے ہیں لیکن گوشۂ تنہائی میں خدا سے نہیں۔

عالم باللہ:۔ ان کی زبانوں پر ذکر خدا ہوتا ہے۔ جب تک زبان متحرک ہے دل بھی زبان کے ساتھ مصروف ذکر خدا ہے۔ انہیں اس کا خوف نہیں کہ نفس کہیں گناہوں میں نہ ملوث ہو جائے بلکہ خوف اس کا ہے کہیں امیدیں ناامیدیوں میں نہ بدل جائیں۔ یہ خدا سے شرم وحیا کرتے ہیں لیکن اپنے ظاہری اعمال کے سلسلہ میں نہیں بلکہ قلبی وسوسوں کے بارے میں۔

عالم باللہ وبامر اللہ۔ ان علماء کی چھ نشانیاں ہیں۔ تین تو وہی ہیں جو "عالم باللہ" کے لیے ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی ذاکر، خائف اور خدا سے حیا کرنے والا۔ لیکن تین وہ علامتیں ہیں جو صرف اسی گروہ سے مخصوص ہیں۔

۱۔ اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں سے دنیا کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور آخرت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کے معلم ہوتے ہیں۔

۳۔ پہلے اور دوسرے طبقہ کے علماء ان کے محتاج ہوتے ہیں لیکن یہ ہر دو سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ گویا یہ مثل آفتاب دوسروں کو منور کیا کرتے ہیں۔ جس طرح آفتاب خود اپنے میں کمی وزیادتی نہیں رکھتا، اسی طرح یہ حضرات بھی اپنے اندر نقص وکمی نہیں رکھتے۔

عارف شیراز نے کیا خوب کہا ہے ؎

بندہ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است | ورنہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست وگاہ نیست

لیکن عالم باللہ کی مثال اس چراغ کی سی ہے جو خود تو جلتا ہے لیکن دوسرے اس کی روشنی سے مستفید ہوتے ہیں۔

حواشی

۱۔ سورۂ علق/ ۶-۱

۲۔ یاقوت حموی نے معجم الادباء ج۱ میں جناب شہید کی روایت کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

کفیٰ بالعلم شرفاً ان یدعیہ من لا یحسنہ ویفرح اذا نسب الیہ وکفیٰ بالجھل ذمّاً ان یبرأ منہ من ھو فیہ۔

۳۔ مناسب ہے اس بات کا تذکرہ بھی کرتا چلوں کہ اس رسالہ میں ذکر کی جانے والی روایات کے حوالہ اس لیے ذکر نہیں کئے گئے ہیں کہ وہ شہید کی "منیۃ المرید" سے لی گئی ہیں جو خود معتبر و مستند ماخذ و مدرک ہے۔ بقول فاضل معاصر جب انسان کو اگر چہ غلط ہی سہی "پڑھا لکھا" کہہ دیا جاتا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی اگر حقیقتاً تھوڑا بھی "پڑھا لکھا" ہوتا تو کس قدر کیف محسوس کرتا اسی لئے کسی طالب علم کے سے مشہور ہے کہ جب کسی مسئلہ کا حل معلوم کر لیتا تھا تو فرط مسرت میں کہتا تھا:

ایْن ابناء الملوکِ من ھٰذہٖ اللذۃ

شہزادوں کو یہ لذت کہاں نصیب

جناب خواجہ نصیر طوسی کہتے ہیں ؎

لذات دنیوی ہمہ ہیچ است پیش من | در خاطر از تغیر آن، ہیچ ترس نیست
روز تنعم و شب عیش و طرب مرا | غیر از شب مطالعہ و روز درس نیست

شاید تذکرہ بے جا نہ ہو ـــــ اہل تاریخ لکھتے ہیں صقلیہ (سیسل) کے بادشاہ "حیرون" نے ماہر زرگر کو تھوڑا سونا تاج بنانے کے لیے دیا۔ زرگر نے تاج بنا کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کو خیال ہوا کہیں ایسا نہ ہو زرگر نے کچھ سونا چرا لیا ہو اور اس کی جگہ کوئی اور دھات ملا دی ہو۔ بادشاہ نے اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے معروف زمانہ حساب دان "ارشمیدس" کو ذریعہ بنایا۔

ارشمیدس ایک مدت تک بادشاہ کے جواب کا حل تلاش کرتا رہا لیکن اس کا جواب آسے

اس وقت ملا جب وہ ایک دن حمام کے حوض میں نہانے کے لیے اترا۔ حکیم جس وقت پانی میں اترنے لگا۔ حوض کے کناروں سے تھوڑا پانی چھلک کر بہہ گیا، اور جب حکیم پانی میں اتر گیا تو اسے اپنا جسم سبک و ہلکا محسوس ہوا۔ فوراً اس کے ذہن سے ایک نکتہ ٹکرایا جس کی مدتوں سے اس کو تلاش تھی اور وہ کھوئی ہوئی چیز جسے وہ فکر کے شش جہت میں تلاش کر رہا تھا مل گئی۔ حکیم ارشمیدس بے انتہا خوشی کے سبب یہ بھول گیا کہ وہ حوض میں برہنہ ہے۔ اسی عالم میں حوض سے باہر نکلا اور شہر سراکوز (سراقوسہ) کے کوچہ و بازار میں "اوریقا اوریقا" پالیا پالیا" کا شور کرتا ہوا دوڑتا پھر رہا تھا۔ فاضل مذکور نے اس نکتہ کو جسے حکیم نے حوض میں اترنے کے بعد معلوم کیا، اس طرح تحریر کیا ہے۔

حکیم جس وقت پانی میں اترا تو اس نے حوض کے اندر اپنے جسم کو سبک سا محسوس کیا اس طرح حکیم پر یہ عقدہ کھلا کہ پانی میں پہنچنے کے بعد جسم کا اصلی وزن گھٹ جاتا ہے اور جس قدر پانی جسم پہنچنے کے بعد چھلک کر بہہ جاتا ہے اسی بہہ جانے والے پانی کے بقدر جسم کا وزن کم ہوتا ہے، اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے۔

اگر ایک گرام خالص سونا پانی میں ڈالا جائے تو پانی میں پہنچ کر ۵۲/ گرام اس کا وزن گھٹ جاتا ہے اور اگر ایک گرام خالص چاندی کو پانی میں ڈالا جائے تو تقریباً ۹۰ فیصد وزن گھٹ جاتا ہے۔ کیونکہ چاندی وزن کے اعتبار سے ہلکی اور حجم کے اعتبار سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی وقت سے ٹھوس چیزوں کے تولنے کے لیے پانی کا ترازو ایجاد ہوا۔ اور آج تک حکیم ارشمیدس کے نام سے موسوم و مشہور ہے۔

ارباب تاریخ لکھتے ہیں۔ بادشاہ کے تاج کا وزن ۷ کیلو ۴۶۵ گرام سونا تھا پانی میں ڈالنے کے بعد ۴۶۷ گرام وزن گھٹ گیا جبکہ گذشتہ قانون کی رو سے ۳۸۸/۱۸ گرام وزن کم ہونا چاہئے تھا۔ اس فرق سے حکیم نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ زرگر نے کسی خفیف دھات کی آمیزش کی ہے اور ایک کیلو ۸۳۳ گرام سونا چوری کیا ہے۔

فاضل موصوف لکھتے ہیں کہ میں نے اس واقعہ کو اس لئے کہا تاکہ اندازہ ہو سکے کہ لذت علم وہ شی ہے جو حکیم فرزانہ کو بھی از خود رفتہ بنا دیتی ہے۔

خوش خبری :-

مجلۂ توحید کے سلسلہ میں قارئین کرام کی دلچسپی اور مقبولیت کے پیش نظر ہماری عرصہ سے خواہش تھی کہ اس سہ ماہی رسالہ کو ماہانہ نہ صحیح تو کم سے کم دوماہی ضرور کردیا جائے ۔ الحمدللہ ہماری یہ دیرینہ خواہش پایۂ تکمیل کو پہونچی اور اب آپ کا یہ رسالہ ہر دوسرے ماہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا جاتا رہے گا۔ اگرچہ کسی کام کا اقدام آسان ہوتا ہے مگر اس کے معیار کو برقرار رکھنا کارے دارد، پھر بھی ہم نے اس امید پر یہ عظیم بیڑا اٹھالیا ہے کہ ہمارے تمام معاونین خصوصًا مقالہ نگار حضرات اپنی خصوصی توجہ سے فراموش نہیں کریں گے ۔

= ادارہ =

جناب محمد علی تسخیری

ترجمہ: جناب خادم حسین ام۔اے علیگ

صلح اور جنگ

اسلامی نقطۂ نظر سے

انقلاب کیوں ہوا ؟ :

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایران کے مسلمان عوام نے ظلم کو خاتمہ بخشنے، عدل وانصاف قائم کرنے اور اسلام کے دامن میں واپس آنے کی غرض سے دو ہزار پانچ سو سال پرانی ظالم وجابر شاہی حکومت کے خلاف صف آرائی اختیار کی۔

اگرچہ یہ لوگ نہتے تھے، لیکن خدا پر ایمان کامل تھا، تبھی اس آیہ مبارکہ (کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله) کا مصداق قرار پائے۔ ایک ایسی عظیم طاقت جس کی حمایت مشرق ومغرب دونوں کر رہے تھے، اس پر غلبہ حاصل کیا اور مستحکم قلعوں کو توڑ کر اسلامی نظام حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ نتیجتاً ایران میں صحیح اسلامی خطوط، اسلام کی عظمت رفتہ حاصل کرنے میں اسلامی تحریکوں کو تقویت ملی، اسلامی تعلیمات زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت کرنے لگیں، یہاں تک کہ پوری دنیا میں اس انقلاب کا طوطی بولنے لگا۔

اگر ایران کے مسلمان عوام کا رجحان اس تحریک کے بانی وسربراہ امام خمینی (جنھوں نے تن من دھن سے اسلامی اغراض ومقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی لمحہ فروگذاشت نہیں کیا) کی طرف نہ ہوتا تو اس الٰہی نعمت سے ہرگز فیضیاب نہ ہو پاتے۔

کامیابی کے بعد بڑی طاقتوں کا موقف :-

جب خداوند کریم کی مہربانی ایرانی مسلمانوں کے شامل حال ہوئی، اسلامی انقلاب کامیاب ہوا اور اسلامی حکومت کے قیام نے طاغوت کی تمام نشانیوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا، تو بڑی طاقتوں پر اس کاری ضرب کے نتیجہ میں ایک عرصہ تک خوف و ہراس طاری رہا لیکن جب حواس قابو میں آئے، جال پھیلانے شروع کر دئے، پہلے مرحلے میں اس عظیم کامیابی کا دائرہ تنگ کرنا شروع کر دیا تاکہ دوسرے مرحلے میں اس کے نتائج پھیلنے سے روکے جا سکیں کیونکہ انھیں ایران کے اس اعلان سے مزید تشویش ہوئی : "یہ انقلاب ایران یا ایرانی مسلمان عوام تک محدود نہیں بلکہ پوری دنیا میں اس طرح کے مزید اسلامی انقلابات کا پیش خیمہ ہے۔ اس کا نصب العین اسلامی ملکوں نیز پوری دنیا سے طاغوت اور اس کے اثرات کو مٹانا، اسلام کی عظمت رفتہ کو بحال کرنا اور دنیا کے تمام معاشروں تک بشارت اسلام پہنچانا ہے، غرض یہ کہ اولاً تمام اسلامی ملکوں اور پھر دنیا بھر میں اسلامی انقلاب کی روح و فکر سے لوگوں کو آشنا کرنا اس انقلاب کا بنیادی مقصد ہے۔" دراصل اسی بات نے سامراجی ملکوں کو خوفزدہ کر دیا، نتیجتاً اسلامی انقلاب کی پیشقدمی روکنے کیلیے تمام سامراجی ملکوں نے ایک ہو کر اپنی صفیں اس کے مقابلے کے لیے آراستہ کر لیں۔

اسلامی انقلاب کے خلاف سازشوں کا سلسلہ :-

سامراجی سازشوں کے دو بنیادی محور ہیں :

(۱)۔ مسلمانوں کے سامنے اسلامی انقلاب کا مسخ شدہ چہرہ پیش کر کے انقلاب اور اس کے عظیم رہنما کی نسبت ان کے دلوں میں نفرت پیدا کرنا۔

(۲)۔ زرخرید غلاموں کے ذریعہ حکومت و قیادت کے کاموں میں رخنہ ڈالنا۔

مذکورہ پہلے محور کے سلسلے میں تمام سامراجی اور زرخرید ذرایع ابلاغ خواہ وہ اسلامی ملکوں میں ہوں یا دوسرے ملکوں میں خدمت پر کمر بستہ ہو گئے۔ اخبارات نے جھوٹ

گڑھنا شروع کردیا، مسخ شدہ تصویریں پیش کی جانے لگیں، چوری کرکے سینہ زوری پر اتر آئے، شیعہ، سنی اختلافات کے پرانے نغمے الاپنے لگے، شیعوں کو اہل سنت سے اور انہیں شیعوں سے ڈرایا جانے لگا، غرض کہ ہر طرح سے اسلامی انقلاب کو بدنام کرنے اور اس کا ایک مکروہ نقشہ پیش کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔

جہاں تک انقلاب کو داخلی طور پر نقصان پہونچانے کی بات ہے، اس کے لیے درج ذیل طریقے اختیار کئے گئے۔

- حکومت کے اہم شعبوں میں سامراجی زرخرید غلاموں کا کسی نہ کسی طرح سے نفوذ حاصل کرلینا۔
- اقلیتوں کو ہتھیار سپلائی کرکے انقلاب کے خلاف اکسانا۔
- فوجی بغاوت کے منصوبے بنانا۔
- سیاسی، تبلیغی، اقتصادی اور فوجی پابندیاں عائد کرنا۔
- ناکام واقعۂ طبس کی طرح فوجی مداخلت کرنا، وغیرہ۔

اور جب ان تمام کوششوں کے باوجود اسلامی انقلاب نے جڑیں پکڑ لیں، اسلامی تعلیمات زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کرنے لگیں، عوام میں بیداری کی جھلک دکھائی دینے لگی، اسلامی اخلاق و کردار سے لوگ آراستہ ہونے لگے، دنیا میں مسلمانوں پر اسلام کی حقیقت آشکار ہوتے لگی اور دنیا کے مسلمان ظالم و جابر قوتوں کے خلاف کھڑے ہونے لگے تو سامراجی طاقتیں مایوسی اور بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئیں

اس صورت حال کے پیش نظر سامراج نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا، عراقی حکومت، جو برسوں سے مکر و فریب کا نقاب ڈالے ہوئے سامراج مخالف ہونے کی دعویدار تھی، اس کے نام نہاد صدر "صدام" کو آلۂ کار بنایا گیا، آقاؤں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے صدام نے بارہ ڈویژن فوج تیار کی، نئے سے نئے ہتھیار فراہم کئے اور ٹھیک اس وقت جب اسلامی جمہوریہ ایران فوج اور حکومتی اداروں کی تطہیر میں مصروف تھی، داخلی خلفشار اپنے عروج پر تھے، غیر ملکی اور سامراجی غلاموں سے ملنے والی خفیہ اطلاعات اور فوجی راز کے سہارے یہ سوچ کر حملہ کردیا کہ ایسے موقعہ پر وہ بآسانی پورے طور پر اسلامی حکومت کا خاتمہ کرسکتا ہے، نہیں تو کم سے کم ایران کے ایک بہت بڑے حصے کو

کاٹ کر مخالف حکومت کی تشکیل کر کے ایران کو بہ جبر واکراہ اپنی بات منوانے اور اسلامی قدریں ترک کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ حالانکہ الجزائر معاہدے میں یہ بات واضح طور پر نمایاں کی گئی تھی کہ دونوں ملک باہمی اختلافات کو مذاکرات اور پر امن طریقے سے حل کرنے کے پابند رہیں گے۔ لیکن صدام نے دستاویز پھاڑ کر جنگ کا آغاز کیا، سامراج کے اکسانے پر تباہ کن حملہ ہوا بہت سے شہر، سینکڑوں دیہات و قصبے ویران ہوئے، بڑے بڑے کارخانے اور اہم حیاتی مراکز برباد ہوئے، ہزاروں بے گناہ افراد کی جانیں گئیں، لوگوں کی عزت و آبرو لٹ گئی، ہزاروں غیر فوجی نہتے افراد اسیر طور پر گرفتار کئے گئے، غرض کہ جارحیت و بربریت کا وہ مظاہرہ کیا گیا جو ہلاکو، چنگیز اور ہٹلر جیسے سفاکوں نے بھی نہیں کیا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہمارے ملک کے نقشے سے اکثر و بیشتر شہروں کے نام مٹ گئے یا اس نوبت تک پہنچا دیئے گئے تھے۔

ایک طرف یہ تھا تو دوسری طرف سامراج اور علاقے کی رجعت پسند حکومتیں عراق کو تھپکیاں دیکر نہ صرف مدد پہنچا رہی تھیں بلکہ عراق کی پیشقدمی پر خوشی اور جشن بھی منائے جا رہے تھے جبکہ ایران کو چند گنی چنی حکومتوں اور دنیا کے محروم و مستضعف افراد کے سوا کسی کی حمایت حاصل نہ تھی۔ کچھ لمحے ایسے بھی آئے کہ ذرا سی پیشقدمی پر صدام پھولنے لگا، کامیابی کے خواب دیکھتا، شرطیں ٹھونپتا، آگے بڑھنے کی دھمکیاں دیتا اور ایرانی علاقوں پر قبضے کے نتیجہ میں عراقی فوج کی قصیدہ خوانی شروع کر دیتا۔

حالانکہ ایمان کس طرح کی دفاعی طاقت پیدا کرتا ہے اسے اندازہ نہ تھا، نہ یہی معلوم تھا کہ اسلامی انقلاب کا اصلی جوہر "عوام کی حمایت" کیا چیز ہے۔ جیسے ہی حالات بدلے اور اپنے مصیبت میں گرفتار ہونے کی حقیقت واضح ہوئی جنگ بندی کا مطالبہ اور صلح کی پیشکش کرنا شروع کر دی، جسے ہماری حکمانہ قیادت اور عوام نے مسترد کر دیا۔ جیسے جیسے صدام کے وحشیانہ حملوں میں اضافہ ہوتا جاتا شدت انکار صلح ہمارے عوام میں بڑھتی جاتی تھی۔ جب خود پیدا کردہ درد بڑھتا گیا اور دوا نے کام نہ کیا، تو آخر کار صدام نے ان بین الاقوامی اداروں، ملکوں اور نام نہاد اسلامی تنظیموں سے مدد چاہی جو شروع میں اکسا رہے تھے اور تماشہ بین کی حیثیت سے اس کے وحشیانہ جرائم پر خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے۔ عراقی حکومت کو ہلاکت سے بچانے کی غرض سے بیچ بچاؤ کرنے

والے گروہوں نے یہ سوچ کر تہران کے چکر لگانا شروع کئے کہ ہم بھی سامراج کے مکر و فریب کا شکار ہوکر فلسطینیوں کی طرح دھوکا کھائیں گے۔ جس طرح سے اسرائیل پہلے فلسطینیوں پر وحشیانہ حملہ کرتا تھا لیکن جب فلسطینی عوام کو جوابی مقابلے پر آمادہ دیکھتا تو فوراً پہلے پیچھے ہٹ کر کسی ملک کو واسطہ قرار دیتا پھر نئے سرے سے دوسرے اور تیسرے حملے کی تیاری شروع کر دیتا۔ اسرائیل کی جانب سے پیچھے ہٹنے کا عمل اس قدر منظم طور پر انجام پایا ہے کہ فلسطینی قائد اسرائیل کے حقیقی پشت پناہ امریکہ کے قدموں میں گر پڑے ہیں۔ لیکن مذاکرات تو کیا وقتِ ملاقات طے کرنے کے لیے بھی امریکہ ان کے سامنے شرطیں لگاتا ہے۔

غرض کہ ہمیں دھوکا دینے کے لیے صدام اور اس کے آقاؤں کو مکر و فریب کے ان طریقوں سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ ہمارے عوام کاری سے کاری ضرب لگاتے آئے ہیں۔ خاص طور پر جب سے ملک کے اندر منحرف افکار و خیالات کا ازالہ ہوا، پست افکار کے حامل افراد کا خاتمہ ہوا، عوام میں بیداری آئی اور ملک کے تمام افراد نے مل کر جنگ میں حصہ لیا، تب سے عظیم کامیابیاں قدم چومنے لگیں، خرم شہر جیسا دلیر پرور شہر بعثیوں کے چنگل سے آزاد ہوگیا، عراقی اسیروں کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی، عراقی حکومت کے نقصانات میں اضافہ ہوا، عراقی جارحیت کا راز فاش ہوا اور صدامی حکومت کا تختہ ڈگمگانے لگا۔ دشمن ایسی حالت میں بھی اپنی چالوں سے باز نہیں آیا، اسلام کا جھنڈا اٹھا کر مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا، جبکہ حقیقت سب پر ظاہر ہو چکی تھی افراد کو دھوکا دینا چاہا جو نہ دے سکا، ہاں کچھ زر خرید ضمیر فروش علماء کو ضرور اکٹھا کر لیا کہ وہ بغداد میں منعقد ہونے والے اجلاس میں شریک ہوں اور اسلامی جمہوریہ ایران کو زبردست حملے روکنے پر مجبور کر سکیں تاکہ اس علاقے میں عراق کا وجود کینسر کی طرح باقی رہے۔

پہلی کانفرنس کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، دوسری کانفرنس منعقد کی اس میں حالانکہ بین الاقوامی سطح کی تیاری تھی، بے حد پیسہ صرف کیا تھا لیکن ناکامی کی حد پہلی کانفرنس سے کہیں زیادہ تھی۔

دوسرے ملکوں میں رجعت پسند اور سامراج کی زرخرید حکومتوں کی جانب سے علماء و مفکرین پر دباؤ روز بروز بڑھتا گیا، موصولہ مراسلوں کے بموجب اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ صاحب وجدان و با ضمیر علماء دین نے اس دباؤ کے نتیجہ میں استعفا دینے کی دھمکیاں دیں، کچھ نے مقررہ مدت کے مطابق اپنے اپنے ملک چھوڑ دینا پسند کیا اور کچھ ایسے علماء دین بھی ہیں جنھوں نے اپنے اپنے ملکوں میں رہتے ہوئے حکومت کے دباؤ کی پرواہ کیے بغیر ان سے مقابلہ کرنے کے فیصلے کئے۔

۲۵، اپریل ۱۹۸۵ء کو دوسری کانفرنس ہوئی، پہلی کانفرنس میں شریک ہونے والوں کے علاوہ وہ بھی شریک تھے جنہوں نے اپنی اپنی حکومتوں کے دباؤ کا اثر قبول کیا۔ اگر اس (اسلامی!؟) کانفرنس میں شریک ہونے والے افراد کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو درج ذیل نمونے سامنے آتے ہیں۔

(۱)۔ وہ معروف و مشہور شخصیتیں جن کا تعلق براہ راست بین الاقوامی عیسائی اور یہودی تنظیموں یا مغرب نواز اسلامی جماعتوں سے رہا ہے، جیسے انعام اللہ خان اور دوالیبی۔

(۲)۔ بعثیوں کے زرخرید غلام جیسے علی کاشف الغطاء (عراق میں تشکیل پانے والی حکومت کا پٹھو)، موسیٰ موسوی اور اسلامی تحریک سے منحرف عدنان البکاء وغیرہ

(۳)۔ مصر کے بعض ممبران پارلیمنٹ جنہوں نے مسلمان ہوتے ہوئے کیمپ ڈیوڈ جیسے معاہدے پر دستخط کئے تھے۔

(۴)۔ اسلامی وحدت و اتحاد بین المسلمین کے مشہور مخالفین اور شیعہ حضرات کو کافر قرار دینے والے اشخاص، جیسے احسان الٰہی ظہیر وغیرہ۔

(۵)۔ کچھ پسماندہ افراد جو ہمیشہ مال و دولت کے درپے رہتے ہیں۔

(۶)۔ ایسے افراد جن کی غیر حاضری پھانسی کا سبب بن سکتی تھی۔

(۷)۔ رجعت پسند حکومتوں کے ادارۂ اوقاف سے وابستہ پٹھو اور بے اختیار افراد، جن کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی۔

مذکورہ عناصر (مسلمان!) صدر صدام تکریتی (جس کا کافر ہونا اگر تمام دوسری چیزوں سے واضح و نمایاں نہیں تو ہم وضاحت کریں گے) کی بیہودہ تقریر سننے کے لئے جمع ہوئے تھے جس میں اس نے بہت سی جھوٹی باتیں بیان کی تھیں، جیسے:

- عراق اپنی چار دیواری میں استقلال و آزادی کے ساتھ رہنے کے سوا کسی دوسری چیز کا خواہاں نہیں۔
- ہمارے کسی ذمہ دار فرد کی باتوں سے یہ نتیجہ نکالا نہیں جاسکتا کہ ایران یا اس کے داخلی امور میں دخالت کرنا ہمارا مقصد ہے!!
- جہاد آزادی فلسطین کے سلسلے میں (خمینی کا) کوئی خاص موقف ہے نہ قابل ذکر

کارنامہ۔

اور بھی اس طرح کی جھوٹی باتیں جن میں جھوٹ کا عنصر نمایاں تھا اور سبھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ کیا یہ بات سچ ہے کہ عراق دوسروں کی زمینوں پر نظر رکھے بغیر اپنی چار دیواری میں امن وامان کے ساتھ رہنا چاہتا ہے؟ اگر سچ ہے تو جنگ کیوں شروع کی؟ ہمارے دسیوں شہروں پر قبضہ کیوں کیا؟ ایرانی سرزمینوں کو اپنے علاقے میں شامل کرنے کے لیے لاکھوں نقشے کیوں چھپوائے؟ اس کے علاوہ آزادی فلسطین جیسے اسلامی مسئلہ کے لئے آیا امام خمینی کی طرح کسی دوسرے نے جہاد یا کوشش کی ہے؟ صدام نے فلسطینی عوام کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے نفرت وکینہ اور نفاق بو کر صیہونیت سے مصالحت کرنے کی سعی کی ہے۔

تمام ظاہری کوششوں کے بعد اس اجلاس میں شریک ہونے والوں نے سازش سے بھرپور ایک قرارداد منظور کی جسے کوئی بھی سلیم الطبع انسان اگر دیکھے تو اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ قرارداد محض بعثی ذہنیت کی ایجاد ہے، اور اسلام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں اگرچہ اس میں بعض مقامات پر کمزور استدلال کرتے ہوئے قرآنی آیتیں بھی درج کی گئی ہیں۔

مذکورہ کانفرنس میں سورۂ حجرات کی درج ذیل قرآنی آیتوں پر زیادہ زور دیا گیا تھا:

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدٰھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتی تفیٔ الی امر اللہ (سورۂ حجرات/۱۰)

اور اگر مومنین میں سے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں میں صلح کرا دو پھر اگر ان میں سے ایک (فریق) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو فرقہ زیادتی کرے، تم (بھی) اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے۔

کانفرنس میں شرکت کرنے والوں نے اپنے تئیں یہ سوچ کر ایک صلح کمیٹی قائم کی کہ وہ صلح کرا سکتی ہے، شرط یہ رکھی گئی کہ اگر دونوں ملکوں میں سے کسی ایک نے مخالفت کی تو وہ ملک باغی قرار پائے گا۔

جب یہ مضحکہ خیز کمیٹی اپنی ذمہ داری نبھانے میں ناکام ہوئی تو اسلامی جمہوریہ ایران کو باغی قرار دیتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا، کہ ایران نے قرآن کی بات (یا دوسرے معنوں میں ان کی کھلی ہوئی سازش کو) ماننے سے انکار کیا ہے۔ غرض کہ اسلامی انقلاب کے خلاف قرارداد میں منظور

ہوئیں، فساد، ظلم اور بغاوت کی وہی تہمتیں لگائی گئیں جو اسلام اور اسلامی انقلاب مخالفین لگایا کرتے ہیں.

اس مقدمہ کے اختتام پر ہم اپنے قارئین کو آگے آنے والی سطریں مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ ان کو اس قرارداد کے استدلالات کی کمزوری یا دوسرے معنوں میں کانفرنس میں شریک افراد کی غلامانہ ذہنیت کا اندازہ ہو سکے

اصلاح بین المسلمین کی آیت :

سورۂ حجرات کی دسویں اور گیارہویں آیتوں میں بیان ہوا ہے :

"وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما، فان بغت احداهما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفیٓء الی امر الله،
فان فاءت فاصلحوا بینهما بالعدل واقسطوا ان الله یحب المقسطین
انما المؤمنون اخوة فاصلحوا بین اخویکم واتقوا الله لعلکم ترحمون ."

اور اگر مؤمنین میں سے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان دونوں میں صلح کرا دو، پھر بھی اگر ان میں سے ایک (فریق) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو فرقہ زیادتی کرے (تم بھی) اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے، پھر جب رجوع کرے تو فریقین میں انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور عدل و انصاف سے کام لو بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے. مؤمنین تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، تو اپنے دو بھائیوں میں میل جول کرا دیا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے.

مذکورہ دو آیتوں کا مفہوم بیان کرنے سے پہلے اسباب نزول اور علماء و مفسرین کی رائے جان لینا مناسب ہوگا.

اسباب نزول :

صاحب درِ منثور نے ذکر کیا ہے کہ احمد، بخاری، مسلم، ابن جریر، ابن المنذر، ابن مردویہ

اور بیہقی نے اپنی سنن میں انس سے روایت کی ہے:

قیل للنبیؐ : لو أتیت عبد الله بن أبی. فانطلق فرکب حماراً، وانطلق المسلمون یمشون وھی ارض سبخة فلما انطلق الیھم قال: الیک عنی فوالله لقد آذانی ریح حمارک. فقال رجل من الانصار: والله لحمار رسول الله اطیب ریحا منک. فغضب لعبد الله رجال من قومه، فغضب لکل منھما اصحابه فکان بینھم ضرب بالجرید والأیدی والنعال فانزل فیھم "وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما"

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپؐ عبداللہ بن ابی (منافقوں کا سرغنہ) کے پاس تشریف لے جاتے، رسول اللہؐ فوراً ہی گدھے پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے مسلمین بھی آپ کے ساتھ ہو لیے جس راستہ کو طے کرنا تھا وہ سخت اور شورہ زار زمین تھی، جیسے ہی پیغمبر عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے پاس پہنچے۔ عبداللہ نے کہا میرے پاس سے ہٹ جاؤ خدا کی قسم تمہارے گدھے کی بدبو سے مجھے اذیت ہو رہی ہے، یہ سن کر انصار میں سے ایک شخص نے کہا: خدا کی قسم پیغمبر خداؐ کا گدھا تجھ سے زیادہ خوشبودار ہے۔ چنانچہ عبداللہ کے ساتھی اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور حضورؐ کے صحابہ آپ کی حمایت کرنے لگے، اس طرح دونوں گروہ بھڑک اٹھے، نوبت ہاتھا پائی تک آ پہنچی اور ایک دوسرے کو چوب خرما اور جوتے چپل سے مارنے لگے اس وقت یہ آیت "وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما" نازل ہوئی۔

کچھ روایتوں جیسے تفسیر مجمع البیان میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جس شخص نے عبداللہ بن ابی بن سلول سے مذکورہ بات کہی تھی وہ عبداللہ بن رو‌حہ تھے اور مار پیٹ اوس اور خزرج (جو عبداللہ بن ابی کے طرفدار تھے) قبیلوں کے درمیان ہوئی تھی۔

بعض مفسرین مثلاً صاحب تفسیر المیزان کا خیال ہے کہ مذکورہ آیت کا اس واقعہ پر انطباق مبہم نظر آتا ہے۔

بعض علماء و مفسرین کے خیالات:

صاحب تفسیر المیزان علامہ طباطبائی کا کہنا ہے:

"دو فریقوں میں سے اگر کوئی ایک دوسرے پر ناحق حملہ کرے تو حملہ کرنے والے سے جنگ کرنا فرض ہے۔ یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف رجوع کرے، جب باز آجائے اور حکم خدا کی طرف رجوع کرے تو عدل و انصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے دونوں کے درمیان صلح کرا دینا چاہیئے، لیکن صلح صرف جنگ بندی کی ہی حد تک نہ ہونی چاہیئے بلکہ اصلاح منصفانہ اصلاح ہونی چاہیئے، یعنی مظلوم کو اس کا حق ملنا چاہیئے، حملہ کرنے والے نے جس طرح کی زیادتی کی ہو، خواہ جان لی ہو، عزت لوٹی ہو یا مال و دولت تلف کیا ہو، اس کی سزا الٰہی احکام کے مطابق ملنا چاہیئے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین" (المیزان۔ ج ۱۸۔ ص ۳۱۴)

اور عدل و انصاف قائم رکھو کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔
اقساط اور قسط سے مراد وہ جائز حق ہے جو انصاف کی بنا پر مستحق کو دیا جائے۔

اس سلسلے میں فخر رازی کا کہنا ہے:

"اگر ایسا اتفاق ہو.... اور مؤمنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو فتنے کی آگ دبا کر دونوں کے درمیان صلح کرا دو، اگر اس کے باوجود دونوں میں سے کوئی ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو زیادتی کرنے والے سے تم بھی لڑو۔ یعنی ظالم کو دفع کرنے میں مظلوم کی حمایت و مدد کرنا چاہیے۔" (تفسیر کبیر۔ ج ۲۸۔ ص ۱۳۶)

مذکورہ آیۂ کریمہ کی تفسیر میں سید قطب بیان کرتے ہیں:

"اصولی طور پر پوری دنیا میں امۃ مسلمہ کو ایک امامت کے تحت ہونا چاہیے، ایسی صورت

میں اگر ایک امام کی بیعت کر لی جائے اور دوسرا امام اور اس کے ساتھی بغاوت پر آمادہ ہو جائیں تو امام و مومنین پر اس کا اور اس کے ساتھیوں کا قتل واجب ہے؛ واقعۂ جمل اور صفین میں حضرت علی علیہ السلام نے اسی اصول کے مطابق عمل کیا اور اصحاب کرام (رضوان اللہ علیہم) نے ان جنگوں میں ان کا ساتھ بھی دیا.....

اب جب یہ اصول طے پا گیا تو نص قرآن مجید کو تمام حالات میں بروئے کار لایا جاسکتا ہے (سوائے استثنائی حالات کے جبکہ دو یا دو سے زائد امام مسلمان ممالک کے متفرق اور دور دراز علاقوں میں قیام کریں. یہ حالت ضرورت ہے اور قاعدہ اور اصل سے مستثنیٰ ہے۔) مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ایک امام کے ساتھ ہو کر باغی گروہ سے لڑیں، یا اس امام کی امامت میں جو گروہ ہے اس پر کوئی گروہ خروج کرے تو ولو یہ خروج براہ راست امام کے خلاف نہ کیا ہو پھر بھی باغیوں سے جنگ کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح استثنائی حالات میں تعدد اماموں میں سے کسی ایک کے خلاف باغی سر اٹھائیں تو تمام مسلمان اپنی پوری جمعیت کے ساتھ باغی گروہ سے لڑیں یہاں تک کہ وہ باغی گروہ الٰہی احکام کی طرف پلٹ آئے۔

مذکورہ آیتوں کا مفہوم:

دونوں آیتوں کے عام سیاق و سباق، اسباب نزول اور مفسرین کے بیانات پر غور کرنے سے درج ذیل معانی و مفاہیم حاصل ہوتے ہیں۔

دونوں آیتیں مومنین کے ان دو گروہوں میں تصادم کا ذکر کرتی ہیں، جو اسلامی نظام کے زیر سایہ رہتے ہیں۔ اور ان کی بنیاد تقویٰ، اسلامی اخوت، اور سورہ حجرات میں پیش کئے گئے اخلاقی اصولوں پر استوار ہے۔ ایسے دو گروہوں کے درمیان منصفانہ طور پر مسلمان صلح کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر دونوں میں سے کوئی ایک گروہ صلح سے گریز کرتا ہے تو اس سے جنگ کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ احکام الٰہی کی طرف رجوع کرے۔ اس طرح سے اسلامی معاشرہ منحرف کا پیچھا کرتا ہے اور تمام نقائص دور کرکے عدل و انصاف برقرار کرتا ہے۔

دونوں آیتیں درج ذیل مرحلوں کا ذکر کرتی ہیں؛

- مومنین کے دو گروہوں کے مابین تصادم۔
- اس کے بعد دونوں کے درمیان اصلاح۔
- ان میں سے ایک کا بغاوت پر آمادہ ہونا۔
- باغی گروہ سے مسلمانوں کا لڑنا۔
- باغی گروہ کا احکام الٰہی کی طرف رجوع کرنا۔
- اور آخری مرحلے میں انصاف کے مطابق عمل کر کے احکام الٰہی نافذ کرنا۔

لیکن احکام الٰہی (جس کی طرف باغی گروہ رجوع کرے گا) سے کیا مراد ہے؟ بقولِ فخر رازی اس سلسلے میں درج ذیل احتمالات کا امکان ہے۔

الٰہی احکام کی طرف رجوع کرنے کا ایک مطلب ولی امر کی اطاعت ہے،
(اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم)

- یا تقویٰ اور صلح کا پابند ہونا۔

حالانکہ آیت سے اسلامی نظام اور احکام الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بات صاف نظر آتی ہے۔

"ثم جعلناک علی شریعۃ من الامر فاتبعھا"

ہم نے تمہیں شریعت کا راستہ دکھا دیا ہے اسی پر چلو۔

لہٰذا، اسلام اور اسلامی شریعت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے باغی گروہ سے اس وقت تک جنگ کرنی چاہیئے جب تک وہ اسلامی تقاضوں اور شریعت اسلامیہ کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اسلام دشمنی سے باز نہ آجائے۔

یہ بات بھی آیت سے صاف سمجھ میں آتی ہے:

- مذکورہ آیت ایک مؤمن اور دوسرے غیر مؤمن گروہ کے مابین تصادم کے سلسلے میں نازل نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں فتنہ اور فساد کی جڑیں ختم کرنے تک جنگ جاری رکھنا چاہیے (وقاتلوھم حتیٰ لاتکون فتنہ)۔ آجکل عراق میں جو کچھ ہو رہا ہے،

اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ عین فتنہ و فساد ہے، اس لیے کہ عراقی حکومت عوام کو مختلف طریقوں اور بہانوں سے اسلام سے دور کر رہی ہے۔

● — اسی طرح یہ آیت اسلامی معاشرے میں موجود اس باغی گروہ کے شامل حال نہیں جو دوسروں کے اشارے پر ناچتا ہو اور اسلامی نظام کے بجائے کفر و الحاد کی بنیاد پر حکومت کا خواہاں ہو۔

● — یہ آیت اس محارب گروہ کے شامل حال بھی نہیں جو شہروں پر حملے کرتا، راستے کاٹتا، عزتیں لوٹتا اور انتشار پھیلاتا ہے، ایسے گروہ پر مفسد فی الارض کا اطلاق ہوتا ہے اور اس سے وابستہ افراد کو سزا کے طور پر پھانسی دینا چاہئے یا ہاتھ کاٹ دینا چاہیے، غرض کہ دنیا کو ان کے وجود سے پاک کر دینا چاہیئے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"انما جزاء الذین یحاربون اللہ و رسولہ ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض، ذلک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الآخرۃ عذاب عظیم۔" (سورۃ المائدہ / آیت ۳۳)

جو لوگ خدا اور اس کے رسول ؐ سے لڑتے بھڑتے ہیں (اور ساحکم کو نہیں مانتے) اور فساد پھیلانے کی غرض سے ملکوں (ملکوں) دوڑتے پھرتے ہیں، ان کی سزا بس یہی ہے کہ چن چن کر یا تو مار ڈالے جائیں یا انھیں سولی دے دی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں ہیر پھیر کے (ایک طرف کا ہاتھ دوسری طرف کا پاؤں) کاٹ ڈالے جائیں یا انھیں اپنے وطن سے شہر بدر کر دیا جائے۔ یہ رسوائی تو ان کی دنیا میں ہوئی اور پھر آخرت میں تو ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

بعثی کفر کے مظاہر:

آج کل اسلامی ملک عراق پر مسلط بعثی حکومت کے شرک و کفر سے ہر ذی شعور انسان

زیادہ تگ و دو کئے بغیر آگاہ ہو سکتا ہے۔ بعثی انحرافات کے مختلف پہلو ہیں اس مختصر مقالے میں تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنا ممکن نہیں، لہٰذا ہم تفصیل بیان کرنے کے بجائے محض اشاروں پر اکتفا کرتے ہیں۔

کفر کے مظاہر کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا: بعث پارٹی قائم کرنے والے سربراہوں کے حالات۔

دوسرا: پارٹی پر حاکم افکار و خیالات۔

تیسرا: پارٹی کا عملی سلوک (کارکردگی)

سربراہوں کے حالات:

عام طور پر اس پارٹی کے تمام سربراہ میشل عفلق سے لے کر شبلی عیسمی اور صدام تک سبھی اسلام کے منکر رہے ہیں۔ (صدام تکریتی کو صاحب فکر و بصیرت یوں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سوائے طوطے کی طرح باتیں دہرانے کے اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا) جہاں تک ظاہری طور پر دین و مذہب سے تعلق کی بات ہے تو یہ سب کے سب کسی نہ کسی دین سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ جیسے میشل عفلق کا تعلق شام کے دشمن اسلام عیسائی مذہب سے، طارق میخائیل یوحنا عزیز، الیاس فرح اور شبلی شمیل عیسمی کا تعلق متعصب نصرانی مذہب سے اور صدام کا تعلق اگرچہ دین اسلام سے رہا ہے اور بظاہر قومیت اور پیدائش کے لحاظ سے مسلمان ہے اور مسلمانوں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے لیکن دراصل ان تمام افراد کا تعلق عیسائی گرجہ گھروں، مغربی تنظیموں اور مادہ پرست کیمونسٹوں سے رہا ہے (جیسا کہ میشل عفلق بذات خود شروع میں کیمونسٹوں کے ساتھ تھا، پھر کہیں سامراج نے دوسرے نئے کارناموں کے لیے تیار کیا) اس حقیقت کو ان میں سے ہر ایک کی شخصیت، کارکردگی اور افکار و خیالات میں پا سکتے ہیں، لہٰذا ایک واضح حقیقت کے بارے میں مزید بیان کرنا بے سود ہے۔

ہم ذمہ دار صاحب قلم کو چیلنج کر سکتے ہیں کہ وہ بعث پارٹی کے ایک سربراہ کا نام نہیں بتا سکتا جو انحراف سے دور ہو۔

بعث پارٹی پر حاکم افکار و نظریات:

یہ افکار و نظریات مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئے ہیں، درج ذیل چند نمونوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) اسلام اور وحی کی نسبت شکوک:

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مسئلہ بعثی افکار و نظریات کے حملوں کا نشانہ بنا رہا ہے اور اس سلسلے میں متعدد تحریریں قلمبند ہوئی ہیں۔

* ۔ عفلق کہتا ہے: رسول(ص) نے اپنے عقیدے کے تحت الٰہی تصوّر کے میدان میں ایک چھلانگ لگا کر خالق کے مفہوم کو آفاقیت بخشی۔

اس اعتبار سے اسلامی عقیدہ رسول(ص) کی ایجاد ہے وہ چاہیں تو مفہوم خالق کو آفاقیت و شمولیت بخشدیں!!

اسی طرح کہتا ہے: اسلام عربی مزاج کی حقیقی تصویر ہے۔ لہٰذا اسلام الٰہی وحی کے ذریعہ ہر قوم و ملت کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ عرب قوم کے مزاج و طبیعت کا نتیجہ ہے۔

ایک اور جگہ کہتا ہے:

"اسلام عرب قوم میں ایک بیدار تحریک کی نشاندہی کرتا ہے۔ نتیجۃً عربوں کی ہر فرد دوسرا محمد(ص) بن گئی ہے ......"

لہٰذا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام بذات خود بھی عرب قومیت کا ماحصل ہے۔

* ۔ ایک اور مقام پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے عفلق تنقید کرتا ہے۔ یورپ نے چونکہ اپنی ذات و تہذیب سے ہٹ کر ایک نامانوس دین کو قبول کیا، اسی لئے اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ وہ یورپ کو اپنی ذات کی طرف رجوع کرنے کی نصیحت کے ساتھ ساتھ اس اجنبی دین سے دوری اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے، جو اس کی ذات کے ماسوا ہے۔

اس اعتبار سے صحیح دین وہی ہے جو عوامی جذبہ کا نتیجہ ہو۔ بعثی افراد اپنی تحریروں میں مندرجہ ذیل عبارت پر زور دیتے ہیں:۔

محمدؐ عربوں کے رسول ہیں، اور اسلام عربی تہذیب و ثقافت کا مظہر ہے۔
یہ عبارت وہی مضمون ادا کرتی ہے۔
صدام تکریتی کا کہنا ہے:

"زندگی اور عمل کے میدان میں ہمارا نظریہ اسلام اور اس کی روح پر قائم ہے، اور وہی عرب قومیت کا صحیح ترجمان ہے۔"

"اس اعتبار سے اسلام کا پیغام عربی قومیت کے سوا اور کسی چیز کی نشاندہی نہیں کرتا۔"

بعث پارٹی سے منسلک افراد اس بات پر تاکید کرتے ہیں کہ اسلام عرب تہذیب یا محض اس سے ملتی ہوئی چیز کو شکل دیتا ہے۔

صدام ایک تقریر کرتے ہوئے (دین اور تہذیب پر ایک نظر) کے ذیل میں کہتا ہے:

"ہمارے معاشرے میں جن امور کو مرکزیت حاصل ہے اور جو ہمارے اخلاق، مزاج اور تہذیب پر اثر رکھتے ہیں، ان میں ہمارا ماضی اور اس سے وابستہ قوانین، رسم و رواج اور اسباب زندگی ہیں، اس کے علاوہ دین بھی ہے۔"

مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

"جب ہمارا عقیدہ قائم ہوا، اس کی بناوٹ اس طرح تھی کہ اس سے نہ صرف ہمارے معاشرے کی حقیقت ظاہر ہوتی تھی بلکہ معاشرہ کو اولویت حاصل تھی۔"

اس طرح سے دین محض عرب قومیت و شخصیت کا جزء قرار پاتا ہے... تہذیب کے دوسرے پہلوؤں کے مثل قرار پاتا ہے، لیکن جب بعض عقائد سے ہمکنار ہوتا ہے تو اس کے لیے خدمت انجام دیتا ہے کیونکہ بعض عقائد و افکار کو اس پر اور عرب قومیت کی حقیقت کے تمام اجزاء پر اولیت حاصل ہے۔

المستقبل رسالے (۱۹۷۹/۱۰/۱۳) کو انٹرویو دیتے ہوئے صدام کہتا ہے:

"یہ بات واضح رہے کہ ہمارے ذہن میں ان سیاستوں کو نافذ کرنے کی گنجائش قطعی نہیں جو غیر عرب قوموں کے اسلام سے مأخوذ ہوں۔"

اس اعتبار سے اسلامی سیاست عرب قومیت کی خالص تجلی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بعثی یاوہ گوئی اپنی حد کو پہنچ جاتی ہے، جب صدام "فکر، تکرار عمل اور زندہ مثالوں کے ذریعہ ایمان پختہ ہوتا ہے" کے عنوان سے ایک کتابچہ میں کہتا ہے:

"اسلام ایک آسمانی دین اور پیغام کے طور پر جب سے ظاہر ہوا، عرب قوم نے ہی اسے تمام انسانیت تک پہنچایا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ قرآن بذات خود ان کے عقائد پر مشتمل تھا۔"

اس تضاد کو کس طرح حل کیا جائے؟ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

ایک طرف سے تو قرآن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے دوسری طرف عربوں کے عقائد اور ان کے ذہنی نتائج کے سوا اور کچھ بھی نہیں رکھتا (یہ بات سمجھ میں نہیں آتی) مگر عربی ذہنیت بذات خود اللہ کے سوا اور کوئی دوسری چیز نہ ہو۔

② تحریف قرآن:

منحرف ومنافق لوگوں کا ہمیشہ سے یہ طریقہ کار رہا ہے کہ اپنے تعیین شدہ موقف کو صحیح ثابت کرنے کی غرض سے قرآن کا سہارا لیتے ہیں، اور جب کبھی کسی آیت کو حسب حال نہیں پاتے یہ اعلان کرتے ہیں کہ آیت قابل تطبیق نہیں گویا حق سے اپنی رائے کو مطابق کرنے کے بجائے حق کو اپنی رائے کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔

"دین وتہذیب" نامی کتاب کے ص ۴۱ پر صدام اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے:

"جب ہم اپنی عربی اسلامی جاوید ودرخشاں تاریخ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خاص مواقع اور حالات میں قرآنی آیتوں پر عمل کرنے سے چشم پوشی کی گئی ہے، جیسا کہ خلفاء راشدین کے دور میں نظر آتا ہے۔ لہٰذا کیا یہ کافی دلیل نہیں کہ ہم انسانی مسئلہ کو جوہر قرار دیں، اور اسی کو عادلانہ موقف تصور کرتے ہوئے آسمانی شریعت کا نفاذ کریں۔"

ظاہر کو چھوڑ کر اسلام کے جوہر کے سلسلے میں بعثی افراد جو تاکید اپنے کلام یا تحریروں میں کرتے ہیں اس میں ضرور کوئی راز ہے، اور یہ دو حالتوں سے خارج نہیں ہو سکتا، یا تو یہ لوگ اسی پر عمل کرتے ہیں جو کچھ مجتہدین نے جوہر کے بارے میں سمجھا ہے، اور یہ ممکن نہیں، کیونکہ کلام خدا میں بنیادی محور کو سمجھ لینا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک عبارت کے ایک نہیں بلکہ ہزاروں مطلب بیان کئے جاسکتے ہیں اور تمام مطالب کا علم صرف اسی کو حاصل ہے، اس لئے کہ وہ لطیف و خبیر ہے (یا وہ لوگ جانتے ہیں جس کو اس نے علم دیا ہے) ۔ یا پھر یہ لوگ قرآنی ظواہر کو چھوڑ کر جوہر کا بہانہ اس لئے کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ تنگ انسانی افکار و خیالات کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنا آسان و ممکن ہے اور اس طرح سے قرآن و کفر کے درمیان ایک طرح کی ہماہنگی و یکسانیت پیدا کر سکتے ہیں اور یہ کام صرف بعثی ہی نہیں بلکہ باطل کے تمام مکاتب فکر ادارے انجام دے رہے ہیں۔

غرض یہ کہ جوہر اسلام کے بارے میں بعثیوں کی تاکید ایک خطرناک علامت ہی نہیں بلکہ ایک نئی سازش ہے۔

صدام نے اس سلسلے میں کیا بیان کیا ہے، ملاحظہ کیا جائے "جب انسان عدل و انصاف کو پہلے سے بڑھ کر روئے زمین پر قائم کرنا چاہے، اسے آسمانی روح و جوہر کا لحاظ و احترام رکھنا ہوگا یہ دیکھنا ہوگا کہ آسمان انسانوں کے آپسی تعلق کو کس طرح کا چاہتا ہے اور زندگی میں انسان عام طور پر کس طرح کے کردار کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں آسمانی احکام کیا چاہتے ہیں، یہی کہ عدل و انصاف، مساوات و برابری انسانوں کے درمیان قائم ہو جائے، انسانی کوششیں ارتقائے زندگی کا باعث بنیں، اسی بات کو تو ہماری پارٹی مانتی اور کہتی ہے، دین کی دقیانوسی باتوں اور افراط و تفریط سے پرہیز کرتے ہوئے اسی کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی ہے، ورنہ دین کے پرانے طریقے اختلاف آراء کے باعث بن جائیں۔"

تو اس طرح سے بعثی افراد اپنے اجتہاد کے مطابق روح و جوہر کو اہمیت دیتے ہیں، اپنے انقلابی تجربوں کے مطابق اس پر عمل کرتے ہیں، اسی لئے قرآن اور اس کے ظواہر کو سمجھنے میں فقہی طریقوں کی مدد نہیں لیتے، اور نہ ہی خدا کی طرف سے نازل شدہ اسلامی احکام و

شریعت پر عمل کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون"

جو لوگ خدا کی طرف سے نازل شدہ حکم کی تعمیل نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

ٹھیک اسی نقطے سے بعثیوں نے بعث پارٹی کے مارکسی، صلیبی، اور رجعت پسند قومی افکار و خیالات کو اسلام کے ساتھ مدغم کرنے کی کوشش یہ سوچکر شروع کی کہ ظاہراً ایک نہ سہی جوہر تو دونوں کا ایک ہی ہے۔

ان کا ایک ترجمان (الجمہوریہ اخبار، ۶. فروری ۱۹۸۰ء) لکھتا ہے:۔

"اسلام اور بعث پارٹی کے افکار و خیالات کے درمیان نقطہ ھای اشتراک متعدد ہیں، اگر اسلام ظلم کے خلاف ایک انقلاب ہے تو بعث پارٹی بھی ظلم کے خلاف انقلاب ہے، اگر اسلام عربوں کا دین ہے تو بعث پارٹی بھی عرب قوم سے مخصوص ہے۔" وغیرہ۔

اور صدام کہتا ہے:

"بعثی عقیدہ کوئی ایک یا متعدد دینی نسخوں پر مشتمل عقیدہ نہیں، وہ عربوں کا عقیدہ ہے اور اسلام میں عرب قومیت کی نشاندہی کرتا ہے۔"

صدام اس بات کو ایک بار نہیں کئی بار کہہ چکا ہے۔

جبکہ یہی صدام ۱۱/۸/۷۷ ۱۹ء کی تقریر میں کہتا ہے:

"ہمارا بعثی عقیدہ کسی طرز فکر یا مذہبی تجزیہ و تحلیل کے مطابق نہیں۔"

لیکن اچانک اسلام اور بعث پارٹی کے افکار و خیالات پوری طرح ایک دوسرے کے مطابق نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر جب صدام (فکر، تکرار عمل اور زندہ مثالوں کے ذریعے ایمان پختہ ہوتا ہے) کے عنوان سے ایک کتابچہ تحریر کرتا ہے تو اس میں کہتا ہے:

"ہمیں پورے معاشرے کو مسلم یا دوسرے معنوں میں بعثی معاشرے میں تبدیل کر کے اپنی تنظیم یعنی بعث سوشلسٹ عربی تنظیم کی حفاظت کرنا چاہیئے۔"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی ظواہر، خصوصیات اور تفصیلات کو چھوڑ کر محض جوہر

کی تاکید کرنا صدام کا شعار ہے۔
گویا یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سوشلسٹ بعث پارٹی کا عقیدہ صحیح معنوں میں اسلام کی ترجمانی کرتا ہے۔
نجف اشرف میں تقریر کرتے ہوئے صدام کہتا ہے:

"عرب سوشلسٹ بعث پارٹی کے اصول کے مطابق آسمانی قدروں کو نئے سرے سے زندہ کرنا، عرب قوم سے متعلق ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔"

بات یہیں تک باقی نہیں رہتی بلکہ بڑھ کر اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ بعث پارٹی کا عقیدہ گذشتہ دوسرے عقائد کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس سلسلے میں عفلق کہتا ہے:

"بے شک موجودہ عقیدے کو گذشتہ عقائد سے مزید گہرا اور وسیع ہونا چاہئے۔"

اس فقرہ سے کفر باللہ، اسلام کی آفاقی قدروں سے انکار یا عفلق کی بیہودہ گوئی کے سوا اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

(۳) دین کو زندگی سے علیحدہ کرنے کی سازش:

سامراج نے اس عیسائی مغربی طرز فکر کو ہم تک محض اس لئے پہنچایا کہ اسلام کو زندگی کے ہر شعبے سے محروم کر کے مسجد تک محدود کر دے تاکہ اس کے حرکت پیدا کرنے والے پہلوؤں کو ختم کر سکے۔ اسلام بذات خود ایک مکمل نظام حیات ہے اور نہایت واضح ہے کہ اسلام کی یہ صفت ضروریات دین میں شمار ہوتی ہے اور ضروریات دین کا منکر یقیناً کافر ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ اسلام دین حیات ہے، سماجی، اقتصادی، تربیتی اور جزاء و سزا جیسے امور میں اسے دخل حاصل ہے، کیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اسلام وہ دین ہے جس کا حیات سے کوئی تعلق نہیں؟

بہر حال یہ دیکھا جائے کہ بعثی کفار کس طرح سے دین اسلام کو محض ایک تاریخی تہذیب و تمدن تصور کر کے صرف جوہر پر عمل کرتے ہیں اور کن تقاضوں کی بنا پر دین و حیات کو ایک دوسرے سے علیحدہ تصور کرتے ہیں، وہ بھی بعثیوں کے اجتہاد کے مطابق۔
اس ذیل میں عفلق کہتا ہے:

"اسلام جاوداں اور آفاقی نظام ضرور ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک ہی وقت میں کئی معنوں اور پہلوؤں کا حامل بھی ہو سکتا ہے، زمان و مکان کے اعتبار سے محدود نسبی ہے، لیکن فعل و معنی کے لحاظ سے مطلق اور خاص زمان و مکان کے دائرے میں محدود ہے۔"

ملاحظہ فرمائیں اس فکر میں کتنا تضاد پایا جاتا ہے، ایک طرف تو اسلام جاوداں اور آفاقی ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہ خاص زمان و مکان کے دائرے میں محدود ہے!!

مزید کہتا ہے:

"اس اعتبار سے کہ ہم ایک امت ہیں، یہ ظاہر نہ ہونا چاہئے کہ اسلامی اخلاق سے آراستہ ہیں کیونکہ اس سے رجعت پسند مذہبی منطق کو قوت ملتی ہے۔ یعنی ہماری پارٹی کو ایک مذہبی پارٹی ہونا پڑے گا جو نہیں ہے، لیکن ترقی اور نئی زندگی کی راہ عرب سوشلسٹ بعث پارٹی ہے..... وہی قوم و ملت کی روح رواں اور انسانیت کی علمبردار ہے۔"

"اگر پارٹی سے منسلک بعض افراد نے عرب سوشلسٹ بعث پارٹی کے اصول کے بجائے مذہبی اصول و سرگرمیاں اپنالی ہیں، اور انہیں یہ بھی یقین ہوگیا ہے کہ انہیں کے ذریعہ زندگی کے بنیادی مسائل حل کئے جا سکتے ہیں تو وہ پہلے بعث پارٹی میں شامل کیوں ہوئے؟ اب جبکہ ایک مدت پارٹی میں شامل رہ کر گذار لی، کیوں ان باتوں کو پارٹی پر عائد کرنا چاہتے ہیں جو پارٹی کے بنیادی اصولوں کے منافی ہیں؟"

بعث پارٹی کے نویں اجلاس میں شرکت کرتے والوں نے مذہبی مسائل کی نسبت اپنے موقف کا اعلان مختصر طور پر یوں کیا ہے:

"مذہبی سرگرمیوں یا مذہبی سیاست سے نپٹنے کا واحد طریقہ وہی ہے جو صدر صدام حسین نے "دین و تہذیب پر ایک نظر" کتابچہ میں بیان کیا ہے، جیسا کہ وہ کہتا ہے: "ہم سب کو مذہبی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دیتے ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ ہماری پارٹی کی سیاست کے منافی نہ ہوں، معاشرے

کی بنیاد بعث پارٹی کے مزاج کے مطابق ہوگی اور کسی کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ مذہبی لبادہ اوڑھکر ہماری سیاست میں مداخلت کرے انقلاب' اس کے نتائج اور دین کے مابین تصادم نہ ہونا چاہیے۔"

"مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھنا ہمارا فرض ہے، خواہ وہ حکومت میں ہو یا معاشرے میں۔ اسی طرح سیاست سے عاری مذہب کا احترام ہم سب پر واجب ہے۔"

سارا مقصد یہی ہے کہ حیات' دین سے عاری ہو جائے، اور لوگ اس کا لحاظ و احترام رکھیں مگر اسے زندگی کو منظم بنانے کا ذریعہ قرار نہ دیں۔

(۴) انسانوں کے وضع کردہ قوانین پر مکمل بھروسہ:

ظاہر ہے کہ جب دین کو حیات و زندگی سے علیحدہ کر دیا جائیگا تو انسانوں کے وضع کردہ قوانین نفاذ کی گنجائش خود بخود نکل آئے گی، نتیجتہً انسان خدا کے برابر قرار پائے گا اور زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے قوانین وضع کر سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ صدام بعد میں اپنی کتاب "دین و تہذیب" ص ۶۳ پر رقم طراز ہے:

"عوام کے درمیان فقہی امور پر تبادلۂ خیال کا رجحان زمین پر عدل و مساوات قائم کرنے والی صحیح راہ کو ضائع کر دے گا (بعثیوں نے اسی کو اسلام کا جوہر قرار دیا ہے) اور آسمانی احکام و قوانین کی خدمت نہ ہو پائے گی... اس لئے کہ عوام انسانوں کے وضع کردہ ان قوانین کے پابند ہیں جو انسانوں کے لئے عدل و مساوات کا قیام اور انہیں کی ترقی و فلاح و بہبود کا ساز و سامان فراہم کرتے ہیں۔"

اس فکر کو رائج کرنے کی غرض سے صدام یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ قرآن مجید کے ہوتے ہوئے اپنی ذاتی رائے کا استعمال کیا کرتے تھے، اس سلسلے میں کہتا ہے:

"اجتہاد یا مذہبی طریقے کے تحت میں کوئی مبہم بات نہیں کہہ رہا ہوں یہ بات

واضح ہے کہ سنت نبوی جو رسول اللہؐ کی سنت ہے قرآن کی آخری آیت نازل ہونے کے بعد سے شروع نہیں ہوئی بلکہ پہلی آیت نازل ہونے کے ساتھ ساتھ ہی چلتی رہی۔ حضرت محمدؐ بن عبد اللہ تو وحی سے ادنیٰ تھے پھر کیوں اپنی ذاتی رائے استعمال کرتے رہے، کیا یہ زمین پر انسان کی عظمت کی بنیادی دلیل نہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آسمانی احکام کے نفاذ کی رعایت اور اس کی حفاظت بھی ہونا چاہیئے۔"

اسی طرح "انسان صالح" کا کردار ہے جو قانون سازی کے نتیجہ میں عوام و ملت کی خدمت کرتا ہے۔ اور یہی "انسان صالح" دو بنیادی تقاضوں کو پورا کرتا ہے:

پہلا: آسمانی احکام کے تقاضے (صرف جوہر تفصیلات نہیں)۔

دوسرا: انقلابی تحریکوں کے تقاضے۔

مزید اضافہ کرتا ہے:

جس مقدار میں انسان کا رول زمین پر انسان کے لیے سعادت اور خوشیاں فراہم کرتا ہے اسی مقدار میں آسمانی احکام کی تعمیل ہوتی ہے، اس کے علاوہ زندگی کے صحیح اصول و قوانین بھی مورد قبول واقع ہوتے ہیں۔"

اسی طرح کہتا ہے:

"اس لئے بھی کہ آسمانی احکام کا بنیادی عنصر دو اساسی اصولوں پر قائم ہے، انسان اور آسمان کے مابین تعلق میں توحید اور اس کے تقاضے، دوسرے زمین پر ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلقات اور عدل و انصاف قائم کرنے کا کام۔"

یہ بات یاد رہے کہ اس طرح کا انصاف قائم کرنا توحید کے مدمقابل ہے، اور اس کا مصدر فکر انسانی ہے۔

ایک اہم سوال پیش کرتے ہوئے صدام مذکورہ خیال کو ذہن نشین کرانے کی غرض سے

ایک نئے خیال کا اظہار کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب آپ قرآن و سنت پیغمبر کو اتنی اہمیت دیتے ہیں تو کیوں نہ ہم پورے طور پر دونوں کے احکام پر عمل کریں؟ اس کا جواب واضح ہے... ہمارے خیال میں یہ تصور بھی تاریخی دین ہے۔ اس لئے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے محض ایک ہی دین پر اکتفا نہیں کی.... کیا متعدد ادیان ہونے کے سلسلے میں الٰہی حکمت پر خدانخواستہ زوال آگیا یا مسئلہ ہی کچھ ایسا ہے کہ ایک دین کے بعد دوسرا دین ہو اور پہلے سے بہتر یا مسئلہ کہیں اس تصور سے زیادہ گہرا اور عمیق تو نہیں؟ اس اعتبار سے انسان کا کردار اہم قرار پاتا ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کے وسیع اجتہاد کو آسمانی ادیان رد نہیں کرسکتے...."

اس طرح سے صدام ایک نئے دین کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔

"لہٰذا عرب سوشلسٹ بعث پارٹی میں ہم صرف آسمانی قدروں کے بنیادی جوہر پر عمل کرتے ہیں (!!) ویسے مذہبی سرگرمیاں جاری رکھنے میں قوم کو اختیار حاصل ہے۔"

البتہ عوام صرف ان مذہبی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکتے ہیں جن سے خدا اور بندوں کے مابین تعلق ہوتا ہے اور جسے وہ توحید کے نام سے مانتے ہیں ورنہ باقی اختیارات بعث پارٹی کو حاصل ہیں کہ جو جی میں آئے وہ کرے، ان بعثیوں کا خیال یہ ہے کہ بعث پارٹی ہی کے دم سے عدل و مساوات قائم ہے، یہاں تک کہ مذہبی فرائض بھی ان کی نظر میں کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں، انہیں چھوڑ دینا واجب سمجھتے ہیں۔

صدام کہتا ہے:

"جہاں ہم الحاد کو رد کرتے ہیں وہاں ہمیں یہ کوشش بھی کرنا چاہئے کہ ہم یا ہماری حکومت محض مذہبی سرگرمیوں میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔"

(دین و تہذیب/ ص۱۷)

دوسری جگہ پر کہتا ہے:

"مذہبی مسائل جو درحقیقت رجعت پسند اور ہماری پارٹی کے دشمنوں کے وسائل ہیں، کیا مناسب ہوگا کہ ہم اپنی پارٹی سے وابستہ افراد کو استعمال کرنے کی اس حد تک چھوٹ دیں کہ رفتہ رفتہ ہم بھی دینی رجعت پسند ہو کر فرقہ وارانہ اختلافات کے طرفدار وحامی بن جائیں۔ . . . یا بنیادی یا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مذہبی مسئلہ کے لیے واضح موقف اختیار کیا جائے اور عوام کو خواہ وہ پارٹی سے منسلک اور وابستہ ہوں یا نہ ہوں مذہبی سرگرمیاں جاری رکھنے کی چھوٹ دیدی جائے۔"؟

لیکن مذہبی طریقوں سے ہم اپنی مشکلیں کیوں حل نہیں کرسکتے! اس سلسلے میں صدام کا جواب ہے:

"موجودہ زمانے میں دنیاوی اور زندگی سے متعلق مشکلوں کو مذہبی طریقوں کے ذریعہ حل کرنا ناممکن ہے، نئی نسل اور نئے معاشرے کی مشکلوں کو بنیادی طور پر ان طریقوں سے ہٹ کر حل کرنا چاہئے جو صدر اسلام میں کارآمد سمجھے جاتے تھے۔"

مزید اضافہ کرتا ہے:

"ہم اپنے عقیدے اور فکری وسیاسی تجزیہ وتحلیل کو مذہبی رنگ دینا نہیں چاہتے، حالانکہ مذہبی شواہد اور اس سے متعلق تجزیہ وتحلیل کی سیاستوں پر بھروسہ رکھتے ہیں، لیکن ارتقائے زندگی اور اس کے شرائط کی رعایت کتنی اہم ہے یہ بیان کرنا مراد تھا۔ اس اعتبار سے ہمارا بعثی عقیدہ کوئی مذہبی تجزیہ وتحلیل کا نسخہ نہیں۔ وہ عربوں کے لیے زندگی کا عقیدہ ہے، انہیں عدل وانصاف، نیکی، بخشش اور ترقی وقربانی کی دعوت دیتا ہے، یہی اسلامی دعوت کا تقاضا ہے لیکن نئے طریقوں کے ساتھ۔"

اس طرح سے ان افکار کو تقویت بخشی گئی ہے جو انسان کے وضع کردہ نظام کی راہ ہموار کر کے دین کو محض عبادات کے دائرے میں محدود کرتی ہیں اور پارٹی سے منسلک افراد کو حتی المقدور دین ومذہب سے دور کرتی ہیں۔

ایک نئے خیال کا اظہار کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

"کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب آپ قرآن و سنت پیغمبرؐ کو اتنی اہمیت دیتے ہیں تو کیوں نہ ہم پورے طور پر دونوں کے احکام پر عمل کریں؟ اس کا جواب واضح ہے۔۔۔۔ ہمارے خیال میں یہ تصور بھی تاریخ کی دین ہے۔ اس لئے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے محض ایک ہی دین پر اکتفا نہیں کی۔۔۔۔ کیا متعدد ادیان ہونے کے سلسلے میں الٰہی حکمت پر خدانخواستہ زوال آگیا یا مسئلہ ہی کچھ ایسا ہے کہ ایک دین کے بعد دوسرا دین ہو اور پہلے سے بہتر یا مسئلہ کہیں اس تصور سے زیادہ گہرا اور عمیق تو نہیں؟ اس اعتبار سے انسان کا کردار اہم قرار پاتا ہے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کے وسیع اجتہاد کو آسمانی ادیان رد نہیں کر سکتے۔۔۔۔"

اس طرح سے صدام ایک نئے دین کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔

"لہٰذا عرب سوشلسٹ بعث پارٹی میں ہم صرف آسمانی قدروں کے بنیادی جوہر پر عمل کرتے ہیں (!!) ویسے مذہبی سرگرمیاں جاری رکھنے میں لوگوں کو اختیار حاصل ہے۔"

البتہ عوام صرف اُن مذہبی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکتے ہیں جن سے خدا اور بندوں کے مابین تعلق ہوتا ہے اور جسے وہ توحید کے نام سے مانتے ہیں ورنہ باقی اختیارات بعث پارٹی کو حاصل ہیں کہ جو جی میں آئے وہ کرے، ان بعثیوں کا خیال یہ ہے کہ بعث پارٹی ہی کے دم سے عدل و مساوات قائم ہے، یہاں تک کہ مذہبی فرائض بھی ان کی نظر میں کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں، انہیں چھوڑ دینا واجب سمجھتے ہیں۔

صدام کہتا ہے:

"جہاں ہم الحاد کو رد کرتے ہیں وہاں ہمیں یہ کوشش بھی کرنا چاہئے کہ ہم یا ہماری حکومت محض مذہبی سرگرمیوں میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔"

(دین و تہذیب / ص ۱۷)

دوسری جگہ پر کہتا ہے:

"مذہبی مسائل جو درحقیقت رجعت پسند اور ہماری پارٹی کے دشمنوں کے وسائل ہیں، کیا مناسب ہوگا کہ ہم اپنی پارٹی سے وابستہ افراد کو استعمال کرنے کی اس حد تک چھوٹ دیں کہ رفتہ رفتہ ہم بھی دینی رجعت پسند ہو کر فرقہ وارانہ اختلافات کے طرفدار وحامی بن جائیں . . . یا بنیادی یا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مذہبی مسئلہ کے لیے واضح موقف اختیار کیا جائے اور عوام کو خواہ وہ پارٹی سے منسلک اور وابستہ ہوں یا نہ ہوں مذہبی سرگرمیاں جاری رکھنے کی چھوٹ دیدی جائے۔"؟

لیکن مذہبی طریقوں سے ہم اپنی مشکلیں کیوں حل نہیں کر سکتے؟ اس سلسلے میں صدام کا جواب ہے:

"موجودہ زمانے میں دنیاوی اور زندگی سے متعلق مشکلوں کو مذہبی طریقوں کے ذریعہ حل کرنا ناممکن ہے، نئی نسل اور نئے معاشرے کی مشکلوں کو بنیادی طور پر ان طریقوں سے ہٹ کر حل کرنا چاہئے جو صدر اسلام میں کارآمد سمجھے جاتے تھے۔"

مزید اضافہ کرتا ہے:

"ہم اپنے عقیدے اور فکری وسیاسی تجزیہ وتحلیل کو مذہبی رنگ دینا نہیں چاہتے، حالانکہ مذہبی شواہد اور اس سے متعلق تجزیہ وتحلیل کی سیاستوں پر بھروسہ رکھتے ہیں، لیکن ارتقائے زندگی اور اس کے شرائط کی رعایت کتنی اہم ہے یہ بیان کرنا مراد تھا۔ اس اعتبار سے ہمارا بعثی عقیدہ کوئی مذہبی تجزیہ وتحلیل کا نسخہ نہیں۔ وہ عربوں کے لیے زندگی کا عقیدہ ہے، انہیں عدل وانصاف، نیکی، بخشش اور ترقی وقربانی کی دعوت دیتا ہے، یہی اسلامی دعوت کا تقاضا ہے لیکن نئے طریقوں کے ساتھ۔"

اس طرح سے ان افکار کو تقویت بخشی گئی ہے جو انسان کے وضع کردہ نظام کی راہ ہموار کر کے دین کو محض عبادات کے دائرے میں محدود کرتی ہیں اور پارٹی سے منسلک افراد کو حتی المقدور دین ومذہب سے دور کرتی ہیں۔

⑤ جاہلیت کو فروغ دیکر عوام کو اس سے وابستہ کرنا :

زمانۂ جاہلیت کے تمام خرافات، انحرافات اور افسانوں سے عراقی عوام کو وابستہ کرنے کے لیے بعث پارٹی کے پاس وہی جہنمی منصوبے ہیں جو بین الاقوامی یہودی سازش کے نتیجہ میں تمام اسلامی ملکوں میں پائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعہ ان ملکوں کے عوام کو جاہلیت کا پیرو کار بنا کر اپنے پلید ارادوں کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ ان کے بعض اہم مقاصد اس طرح بیان کئے جا سکتے ہیں :-

۱۔ امت اسلامیہ کی تاریخ کو پارہ پارہ کرنا، کیوں کہ صرف اسلامی تاریخ ہی کے ذریعہ امت اسلامیہ کا اتحاد باقی رہ سکتا ہے۔

۲۔ اسلامی روح و فکر اور جاہلیت کے پست افکار کے مابین جذباتی فاصلوں کو کم کر کے اسلامی و جاہلی فکر کے درمیان ہماہنگی و یکسانیت پیدا کرنا۔

۳۔ عقیدے کی جگہ عوام کے دل میں علاقائی، تاریخی اور طفیلی جذبات ابھار کر انہیں عصر جاہلیت کی طرح آبا و اجداد سے وابستہ کرنا وغیرہ۔

غرض کہ بعثی سازشوں کے کئی پہلو ہیں جن کا تذکرہ یوں کیا جا سکتا ہے۔

الف ۔ جاہلیت کو فروغ دینا ـــــ صدام کہتا ہے :

"یہ سوچنا کہ ہماری تاریخ اسلام سے پہلے خالی یا شرم آور تھی بالکل غلط ہے۔"

جاہلیت، شرک و کفر، نفاق اور غارت گری سے بھرپور معاشرے کے بارے میں جو کچھ قرآن نے بیان کیا ہے اس کی واضح مخالفت کرتے ہوئے یہ بات کہی گئی ہے۔

ب ۔ عراق اور عربوں کی تاریخ کو دو ہزار پانچ سو سال پرانے واقعات سے جوڑنا جس طرح شاہ ایران نے ایرانی عوام کی تاریخ کو دو ہزار پانچ سو سال پرانی کوروش کی حکومت سے جوڑ رکھا تھا :

" آج عرب قوم مذہبی قومیت و شناخت کی قائل نہیں، اس لئے کہ دین کا کردار ثانوی دوسرا ہے، وہ ایک ہی قوم و مذہب کے ماننے والے افراد کے درمیان اتحاد کی جگہ تفرقہ ایجاد کرتا ہے، خواہ مختلف ادیان میں بنیادی اختلافات ہوں یا نہ ہوں، ان کی بنیاد تعصب

اور حقیقت سے عاری باتوں پر ہوتی ہے ...... بہر حال آج عرب قوم ایک وسیع ذہنی تہذیب کی مالک ہے جو مصری، آشوری، بابلی اور فینیقی جیسی تہذیبوں سے مل کر تیار ہوئی ہے اس اعتبار سے ہمارا فرض بن جاتا ہے کہ ہم فرعونیوں کی تہذیب کو نہ بھلائیں نہ اس سے دوری اختیار کریں ۔" (عرب قومیت اور اس کا نظریہ)

(القومیۃ العربیۃ والنظریۃ القومیہ ... المنهاج الثقافی المرکزی، الکتاب الاول، ص۲۲)

اسی طرح (تہذیب ص۲۸) پر صدام کہتا ہے:

"اس اعتبار سے کہ ہم ایک امت ہیں، یہ ظاہر نہ ہونا چاہیے کہ اسلامی اخلاق سے آراستہ ہیں، کیونکہ اس سے رجعت پسند مذہبی منطق کو قوت ملتی ہے، یعنی ہماری پارٹی کو ایک مذہبی پارٹی ہونا پڑے گا جو نہیں ہے، لہٰذا اپنی قدیم تاریخ کی مدد سے اپنے نظریہ کو اس تاکید کے ساتھ مستحکم کرنا چاہئے کہ عرب قوم کی تاریخ بہت پرانی ہے، اور جتنی تہذیبیں عرب ملکوں میں نمودار ہوئیں سب کی سب عرب قومیت کی نشاندہی کرتی رہی ہیں، اس لئے کہ عرب قوم کا سرچشمہ ایک ہے ۔"

اور ۳ جولائی ۱۹۷۹ء میں، نوخیز طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اس طرح آج تاریخ خود کو دہراتی ہے، کہ ایک بار پھر سے وہ روح تازہ ہوئی ہے جس نے عظیم سے عظیم انسانی قوانین کو اپنے وقت اور تمہارے دادا حمورابی کے دور میں وضع کیا تھا، حرکت و عمل کے میدان میں آج ہم میں بنوخذ نصر کی روح پھر سے سماگئی ہے ۔"

اگر وہ لوگ جو اسلام کے نام پر بغداد میں جمع ہوئے ذرہ برابر اپنے مومن قائد و رہبر کے اس قول پر غور کر کے دیکھیں کہ جس کے خیال میں روح عربیت ہی تمام عظیم انسانی قوانین کا سرچشمہ ہے، اس نے ملت اسلامیہ کے حق میں کون کون سے جرائم انجام دیئے ہیں، تو انہیں اندازہ ہوگا کہ ہم جو کہتے چلے آرہے ہیں وہ صحیح ہے اور جو کچھ عراق میں ہوا وہ عین

فتنہ وفساد ہے اور مسلمان عوام کو صحیح اسلامی تصور سے دور رکھنے کی سازش کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ بعثیوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ عراقی وایرانی مسلمان عوام کے درمیان وہی خلفشار اور تضاد قائم رہے جو سومریوں کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ اس سلسلے میں ہانی وہیب "قادسیہ صدام دروع النفر [صدام کی قادسیہ اور کامیابی کا عنصر] نام کی کتاب میں کہتا ہے : "فارس اور عربوں کے درمیان تضاد وتصادم اتنا ہی پرانا ہے جتنی قدیم ہماری تاریخ ہے، اگر ہم تاریخی قیاس سے نقطۂ آغاز کا جائزہ لینا چاہیں تو یہ کہنا ہوگا کہ یہ تضاد سومریوں کے زمانے سے شروع ہوا اور بارہا ایرانیوں نے سرجون اکدی کی قائم کردہ متحد عراقی حکومت سے مقابلہ کرنا چاہا۔"

ج۔ شہروں کے نام بدلنے کی سیاست پر عمل درآمد، جیسا کہ حلہ کو (بابل)، موصل کو (نینوی) اور ناصریہ کو (ذی قار) وغیرہ۔

د۔ مذکورہ جہالت کو فروغ دینے کی غرض سے درسی کتابوں اور دیگر نشریات کے سلسلے میں علم سیاست پر عمل درآمد، اس کے علاوہ بابل اور سومر کے نام سے محفلیں منعقد کرنا۔

بغداد سے شائع ہونے والا ایک اخبار لکھتا ہے : "آشور وبابل کے حسن کی ملکاؤں کو ۱۹۸۰ء میں پہلا شو کویت میں برگذار کرنا تھا، جو ملٹن ہوٹل میں برگذار ہوا اور اس میں عراقی حسن کی ملکاؤں نے موسیقی نغموں کے سہارے وہ عمدہ شو پیش کیا کہ کویتی ناظرین مبہوت رہ گئے اور انہوں نے اس کی مدت میں اضافہ کا مطالبہ کیا۔" یہی نہیں ان قدیم علاقوں کو بھی آباد کیا جن میں آثار قدیمہ کے کھنڈرات باقی تھے جیسے بابل جس کے بارے میں عراقی اخبار "الجمہوریہ" نے ایک خبر کے تحت لکھا تھا : "عظیم قلعوں کے شہر میں حمورابی کامیابی وکامرانی کے ساتھ واپس آ رہا ہے" وغیرہ۔

(٦) اسلام مخالف افکار وخیالات رائج کرنا :۔

اس سلسلے میں عراق کی بعثی حکومت کا موقف واضح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جبکہ وہ خود علانیہ طور پر اعلان کر چکی ہے کہ اس کا سارا اعتماد اور بھروسہ کمیونسٹی اور قومی افکار وخیالات وغیرہ پر ہے۔ لہٰذا اتنے واضح اعلان کے بعد بھی تفصیلات بیان کرنا فضول ہے۔

جناب شیخ محمد توری
ترجمہ: جناب خادم حسین ایم۔اے

اسلامی حکومت ـ صفات اور خصوصیات

(۱) جوازِ حکومت کے بنیادی اصول:

اسلامی حکومت میں اعلیٰ اقتدار کی بنیاد "قرآن وسنّت نبوی" پر استوار ہے، اور یہ دونوں چیزیں (قرآن وسنت) احکام الٰہی کا سرچشمہ ہیں، انھیں کے ماتحت ملت مسلمہ اپنے نمائندوں کے ذریعے خدا کی طرف سے دی ہوئی حیثیت وشخصیت بروئے کار لاتی ہے، اور (امرھم شوریٰ بینھم) کی روسے، قوانین ومقررات وضع کرنے، حکومت کے امور منظم کرنے، احکام کے نفاذ، عوام کے مفادات کا خیال رکھنے اور لوگوں کے درمیان عدل وانصاف قائم کرنے کے لیے حسب ترتیب مقننہ، مجریہ اور قضائیہ ادارے قائم کرتی ہے۔ شوریٰ کی بنیاد، نص (قرآن)، حدیث، سنّت اور امت مسلمہ کے اجماع[1] پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حقوق، فرائض اور تعاون کے اعتبار سے تمام رعایا کے درمیان مساوات قائم کرنا چاہیے۔ کسی ایک کو دوسرے پر حسب نسب رنگ اور جنس کی روسے برتری وفضیلت حاصل نہیں۔ صرف تقویٰ اور عمل صالح کی بنیاد پر درجہ بندی ہوگی۔ تمام خلائق عیال اللہ ہے، اللہ نے سب کو پیدا کیا، وہی سب کا مالک ہے۔ وہی سب کے حقوق دینے والا اور فرائض مقرر کرنے والا ہے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے کو اللہ کی دی ہوئی نعمت سے محروم کرے یا وہ فرائض جو اللہ نے عائد نہیں کیے ان کو زبردستی کسی پر تھوپے۔ معاشرتی انصاف کسی خاص طبقے سے مخصوص نہ ہونا چاہیے۔ مزدور ہوں یا دوست ہوں یا دشمن

[1] اجماع سے مراد وہ اتفاق فقہاء امت یا ارباب حل وعقد جو کاشف سنت ہو۔ دیکھیے فرائد الاصول، شیخ مرتضیٰ۔

انصاف کے معاملے میں سب کو برابر سمجھنا:

"انّ اللّٰہ یأمر بالعدل والاحسان"

اللہ تعالیٰ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

حدیث ہے:-

بالعدل قامت السمٰوات والارض

زمین و آسمان انصاف و عدل کی بنا پر قائم ہوئے۔

ابن خلدون نے لکھا ہے:

"إنّ عدل الحاکم اوولی الامر فیما یتعلق بما للناس من حقوق فی اموالھم او حقوق مترتبۃ علی اعمالھم ھو الذی یؤدی الی أن یشعر الرعیۃ باطمئنان ویحفزھم علی الاقبال علی العمل والجد، لینتج من ذلک العمران واتساعہ وتکثر الاموال والخیرات والمال والعمل یؤدیان الی تقویۃ الدولۃ وبقاء الحکم و استمرارہ وبالعکس تکون عواقب الاعتداء علی اموال الناس و حقوقھم أو غمطھم۔"

حاکم یا ولی امر کا انصاف عوام کے حق میں۔ خواہ وہ ثروت و دولت کے سلسلے میں ہو یا ان کے کاروبار کے بارے میں، دونوں صورتوں میں رعایا کے اطمینان کا باعث ہوتا ہے، انھیں سعی و عمل کی طرف راغب کرتا ہے، نتیجتاً عمران (ترقیاتی منصوبوں) میں وسعت اور ثروت میں کثرت و برکت پیدا ہوتی ہے۔ ثروت اور کاروبار مل کر حکومت کے استحکام، بقا اور دوام کا باعث ہوتے ہیں، اس کے برخلاف عوام کا مال، ان کے حقوق ہڑپنے اور ان کے ساتھ ناانصافی پر مشتمل سلوک کرنے کے نتائج برے ہوتے ہیں۔

دوسری بحث میں علامہ نے لکھا ہے:-

اعظم من ذالک فی الظلم وافساد العمران فی الدولۃ، التسلط علی

اموال الناس بشراء ما فی ایدیھم بأبخس الاثمان، ثم فرض البضائع بأرفع الاثمان۔"

حکومت کی جانب سے عوام کی ثروت پر قبضہ (وہ بھی اس طریقے سے کہ انہیں سے سستا مال خرید کر مہنگے داموں ان پر تھوپا جائے) ظلم اور ترقیاتی منصوبوں میں بے توجہی سے بدتر ہے۔

اور ماوردی کا کہنا ہے:

"من القواعد التی تصلح الدنیا حتی تصیر منتظمۃ وامورھا ملتئمۃ فھی عدل شامل یدعوا الی الالفۃ ویبعث علی الطاعۃ وتعمر بہ البلاد وتنمو بہ الاموال ویکثر معہ النسل ویأمن بہ السلطان"

دنیوی امور میں انتظام اور نظم ونسق جاری رکھنے کے لیے اگر کوئی مناسب قاعدہ قانون ہو سکتا ہے تو صرف عدل (انصاف) ہے۔ جو الفت، محبت، اور اطاعت کی دعوت دیتا ہے، تاہم ملک میں ترقی، ثروت میں اضافے، نسل میں بڑھاو اور فرمانروا کے اطمینان وسکون کا باعث ہوتا ہے۔

ابن خلدون نے کہا ہے:۔

إنّ السخرۃ من انواع الظلم ومن اشد الظلمات وأعظمھا فی فساد العمران تکلیف الاعمال وتسخیر الرعایا بغیر حق۔

بے گار، ایک طرح کا ظلم ہے، اور ترقی کی راہ میں بیگار اور رعایا سے زبردستی کام لینا اس سے بڑھ کر ہے۔

سماجی فلاح محض اسلامی اخوت وبرادری کی ضرورت ہی نہیں بلکہ خداوند تعالیٰ نے اس کے فقدان کو روز جزا کے جھٹلانے کے برابر قرار دیا ہے ــ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"أرأیت الذی یکذب بالدین فذلک الذی یدع الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین۔" (الماعون/۱-۳)

کیا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہ تو وہی (کم بخت) ہے

جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور محتاجوں کو کھلانے کے لیے (لوگوں کو) آمادہ نہیں کرتا۔
آیۂ مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان میں کم سے کم اتنا شعور تو ہونا چاہئے کہ وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی اور اس کی زندگی کا خود کو ذمہ دار محسوس کرے۔ مؤمن ایک دوسرے سے یوں وابستہ رہتے ہیں جیسے ایک عمارت کے مختلف حصے، یعنی ایک دوسرے کی خوشی و غم میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ محبت، الفت اور ایک دوسرے سے لگاؤ کے لحاظ سے مؤمنین کی مثال اس جسم کی ہے، جس کے تمام اعضاء ایک دوسرے کے غم میں شریک اور دوسرے کے درد کو اپنا درد سمجھ کر اثر قبول کرتے ہیں۔

"ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ" (الحشر/۹)
اور اگرچہ اپنے اوپر تنگی ہی (کیوں نہ) ہو دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دیتے ہیں۔

"وفی اموالھم حق للسائل والمحروم" (الذاریات/۱۹)
اور ان کے مال میں سائل و محروم دونوں کا حق ہے۔

اور خاتم الرسلؐ کا قول ہے :-
"من بات شبعانا واخوہ جائع وھو یعلم فلیس منا"
جو شخص یہ جانتے ہوئے کہ اس کا بھائی بھوکا ہے، کھا پی کر سو جائے وہ ہم میں سے نہیں۔

سماجی فلاح و بہبود کی طرح لوگوں کے بارے میں حسن ظن رکھنا بھی ضروری ہے۔
"لولا اذ سمعتموہ ظن المؤمنون والمؤمنات بانفسھم خیرا" (النور/۱۲)
اور جب تم لوگوں نے اس کو سنا تو اسی وقت ایمان دار مرد اور عورتوں نے اپنے لوگوں پر بھلائی کا گمان کیوں نہ کیا۔

جھوٹ اور بری باتوں کو رائج کرنے سے پرہیز :
ولولا اذ سمعتموہ قلتم ما یکون لنا ان نتکلم بھذا سبحانک ھذا بھتان عظیم (النور/۱٦)

اور جب تم نے ایسی بات سنی تھی تو تم نے لوگوں سے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات منہ سے نکالنا مناسب نہیں۔

اور امن و امان قائم کرنے کے لیے ہمیشہ کوشش کرنا چاہیے :-

" الا لن تدخلوا الجنة حتی تؤمنوا ولن تؤمنوا حتی تحابوا الا أدلکم علی شئی اذ افعلتموہ تحاببتم، افشوا السلام بینکم۔"

(۱۲) اسلامی حکومت کے تعلقات یا خارجہ پالیسی

مسلمان فرد عام حالات کے سوا خاص طور پر جب کلمۂ " لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھ کر اسلام قبول کرتا ہے اور اسی کلمۂ شہادت کو روزانہ کئی بار، وضو، اذان اور اقامت و نماز کے دوران دہراتا ہے تو اس کا مطلب محض یہی نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کے ایک اور آنحضرت ﷺ کے رسول ہونے کی گواہی دیتا ہے بلکہ وہ اس بات کا بھی اقرار کرتا ہے کہ اسلام وہ مکمل نظام حیات ہے جس نے تمام دوسرے نظام ہائے زندگی کو باطل قرار دیکر اللہ کی حاکمیت کے سوا ہر طرح کی حاکمیت کو مسترد کیا ہے۔

مسلمان خواہ افراد ہوں یا جماعتوں کی شکل میں اس سے پہلے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ انھیں محمد ﷺ کے توحیدی پیغام کی تبلیغ کا حکم دے وہ خود، ذاتی لگن کی بنا پر آمادہ تھے :-

"لا اکراہ فی الدین" (البقرہ/ ۲۵۶)

دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں۔

اور انہوں نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ سے عہد کیا ہے کہ وہ زندگی کے ہر لمحے میں اسے عملی جامہ پہنائیں گے۔

"واوفوا بعھد اللہ اذا عاھدتم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدھا وقد جعلتم اللہ علیکم کفیلا" (النحل/ ۹۱)

اور جب تم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ قول و قرار کر لیا کرو تو خدا کے عہد و پیمان کو پورا کرو اور قسموں کو ان کے پکا ہو جانے کے بعد نہ توڑا کرو،

حالانکہ تم تو خدا کو اپنا ضامن بنا چکے ہو۔
اسلامی حکومت قبول کرنے والے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی نمایندہ حکومت کو ایسا ماحول مہیا کریں جس میں وہ امت مسلمہ کے بارے میں کیئے ہوئے عہد پورا کرسکے، یعنی پیام توحید کو عام کرکے اللہ اور بندوں، خالق ومخلوق میں ایسی ہم آہنگی اور کامیابی وسعادت عام کردے جس کا نتیجہ اطمینانِ قلب وطمانینتِ خاطر ہے:

"الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" (الرعد/۲۸)

یاد رکھو کہ خدا ہی کی یاد سے دلوں کو تسلی ہوا کرتی ہے۔
لہٰذا اسلامی حکومت کو اپنی خارجہ پالیسی میں جس طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینا چاہیئے، وہ اسلام اور اس کے اصولوں کی تبلیغ اور نشر واشاعت ہے، جیسا کہ آنحضرتؐ نے معاصر امراء وسلاطین کو اپنے خطوط کے ذریعہ ہدایت دی تھی، مذکورہ ہدایت کے مطابق اسلامی حکومت کو امن وامان قائم کرنے اور مظلوم وپسماندہ لوگوں کی حمایت کرنے کے بہتر سے بہتر طریقوں پر عمل کرنا چاہیئے۔

"وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھٰذہ القریۃ الظالم اھلھا...." (النساء/۷۵)

تم کو کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی راہ میں ان کمزور، بےبس مردوں اور عورتوں اور بچوں (کو کفار کے پنجے سے چھڑانے) کے واسطے جہاد نہیں کرتے، جو (حالتِ مجبوری میں) خدا سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی (مکہ) سے جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں، ہمیں نکال.....
اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ مسلم اقلیتوں کے مسائل کی طرف خاص توجہ مبذول کرے خواہ وہ کہیں بھی ہوں، اور اپنے فرائض کو خلوصِ نیت وعمل کے ساتھ انجام دے۔
اسلامی اصول کی رو سے اس کے تعلقات تمام ملکوں اور قوموں کے ساتھ ہموار ہوں

اسی طرح اسلامی حکومت کو عزت و آبرو کے ساتھ غیر محارب اور امن پسند حکومتوں کے ساتھ مصلحت کے مطابق سیاسی ، اقتصادی ، فنی اور فوجی میدانوں میں معاہدے کرنا چاہیے ۔ استاد عاطف الزین کا خیال ہے کہ اسلامی حکومت کو سیاسی یا فوجی معاہدہ نہیں کرنا چاہیئے جبکہ قرآن مجید میں ہے :۔

"لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا الیھم" (الممتحنہ/ ۸)

جو لوگ تم سے (تمہارے) دین کے بارے میں نہیں لڑے بھڑے اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے اور ان کے ساتھ انصاف سے پیش آنے سے خدا تمہیں منع نہیں کرتا....

"وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (المائدہ/ ۲)

تمہارا تو فرض یہ ہے کہ ، نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور زیادتی میں باہم کسی کی مدد نہ کرو ۔

اسلامی حکومت کو چاہیے کہ وہ غیر محارب افراد ، جماعتوں اور اقتصادی تنظیموں کو اسلامی ملک میں داخل ہونے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دے کہ اس کی حرمت ، عزت و سیادت کو داخلی و بیرونی اعتبار سے ٹھیس نہ پہنچنے پائے ۔

لیکن جہاں تک اسلامی حکومت ، مسلمان عوام یا کسی بھی اسلامی اقلیت کے خلاف اور محارب ملک یا سامراجی ممالک جو ظلم کی بنیاد پر اپنے اثر و نفوذ کو پھیلا اور انسانی قدروں کو پامال کر رہے ہیں ۔ ان سے تعلقات کی بات ہے تو خواہ حکومت ہو یا اس کے عوام یا اس سے وابستہ کوئی بھی تنظیم ان سب کے ساتھ جنگ میں دشمن جیسا سلوک اختیار کرنا چاہیئے ۔

"وأعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم وآخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ

یعلمھم" (الانفال/ ٦٠)
اور (مسلمانو!) ان کفار کے (مقابلے کے) واسطے جہاں تک تم سے ہو سکے اپنے زور بازو اور بندھے ہوئے (تن ومند) گھوڑوں سے (لڑائی کا) سامان مہیا کرو۔ اس سے خدا کے دشمن اور اپنے دشمن اور اس کے سوا دوسرے لوگوں پر بھی اپنی دھاک بٹھا لوگے جنھیں تم نہیں جانتے ہو۔ مگر خدا تو انھیں جانتا ہے۔

وہ اسلامی علاقہ جس کے ممالک اور حکومتیں اسلامی اصول و شریعت کے پابند ہوں ان کے ساتھ بے شک بھائی چارگی کا برتاؤ ہونا چاہیے اس لیے کہ مسلمان خواہ وہ کسی بھی خطے یا ملک میں کیوں نہ ہو دوسرے مسلمانوں کی طرح مکمل حقوق سے بہرہ ور ہے اور اس کا شمار امت مسلمہ میں ہوتا ہے۔

"انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم" (الحجرات/ ١٠)
مؤمنین تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ تو اپنے دو بھائیوں میں میل جول کرا دیا کرو۔

"والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض" (التوبہ/ ٧١)
اور ایماندار مرد اور ایمان دار عورتیں ان میں سے بعض کے بعض رفیق ہیں۔

لہٰذا اسلامی حکومت کو مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش انجام دینا چاہیے۔ اسلامی حکومت کو کسی حالت میں ایسے معاہدے کا حق حاصل نہیں، جس سے اسلامی حکومت یا اسلامی ملک اور تنظیم کی عزت خطرے سے دوچار ہو۔ خواہ وہ معاہدہ کسی تنظیم سے ہو یا کمپنی سے، خاص طور پر اسلامی ملکوں میں موجود ان کمپنیوں سے اس کا معاہدہ نہیں ہونا چاہیے جو مختلف قومیتوں پر مبنی ہوتی ہیں، اس لئے کہ یہ کمپنیاں مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈال کے ان پر حکومت کرتی اور ان کے دین کی حرمت کا پاس و لحاظ نہیں رکھتیں۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:۔

"کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل"
جس شرط کا ذکر قرآن مجید میں نہ ہو، وہ شرط باطل ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے :

"ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا" (النساء/۱۴۱)

اور خدا ہرگز کافروں کو مومنوں پر غلبہ نہیں دے گا۔

"یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفروا بما جاءکم من الحق" (الممتحنہ/۱)

اے ایمان والو! اگر تم جہاد کرنے میری راہ میں اور میری خوشنودی کی تمنا میں گھر سے نکلے ہو۔ تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم تو ان کے پاس دوستی کا پیغام بھیجتے ہو۔ اور جو (دین) حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے وہ لوگ انکار کرتے ہیں۔

مذکورہ آیتوں کی بنا پر ہر وہ معاہدہ جو اسلامی شریعت کے مخالف ہو وہ باطل ہے اور اس کی مخالفت ہر ممکن ذریعے سے کرنا چاہیے۔

"من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ، وذلک اضعف الایمان۔"

جس شخص نے کوئی بری بات ہوتے دیکھی ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنی قوت بازو سے اس کی اصلاح کرے، اگر ہاتھ سے نہ کر سکے تو زبان سے اسے روکے اگر وہ بھی نہ کر سکے تو کم سے کم دل ہی میں اس کی اصلاح کا خیال رکھے۔ جو ایمان کا کمترین درجہ ہے۔

جہاں تک ان معاہدوں کی بات ہے جن میں اسلامی اصول کا لحاظ رکھا گیا ہو تو ان پر عمل درآمد اور اپنے وعدے پر قائم رہنا فرض ہے۔ ارشاد رب العزت ہے :۔

"واوفوا بعھد اللہ اذا عاھدتم ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدھا" (النحل/۹۱)

اور جب تم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ قول و قرار کر لیا کرو، تو خدا کے عہد و پیمان کو پورا کرو اور قسموں کو ان کے پکا ہو جانے کے بعد نہ توڑا کرو۔

لیکن اگر معاہدے کے فریق ثانی نے خلاف ورزی یا عہد شکنی کی یا کسی قسم کی خیانت آمیز کاروائی انجام دی تو اس کی ذمہ داری حکومت پر عائد نہیں ہوگی بلکہ اسے جواب بہ مثل کا حق ہوگا۔

وإما تخافن من قوم خيانة فانبذ إليهم على سواء إن الله لا يحب الخائنين (الانفال/٥٨)

اور اگر تمہیں کسی قوم کی خیانت (عہد شکنی) کا خوف ہو، تو تم بھی برابر ان کا عہد ان کی طرف پھینک مارو (عہد شکن کے ساتھ عہد شکنی کرو) خدا ہرگز دغابازوں کو دوست نہیں رکھتا۔

اسی طرح ہر وہ حکومت جو اسلامی اصول و قوانین کی پابند نہ ہو اس کے ساتھ وہی سلوک اختیار کرنا چاہیئے جو منافقوں کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے یا اسلامی حکومت اور امت مسلمہ کے حق میں جس قدر خیانت کی ہو یا دشمنوں سے رابطہ رکھا ہو، اسی کے مطابق محارب ملک جیسا سلوک کرنا چاہیے۔

دین اسلام کی بنیاد انصاف اور امن و امان پر استوار ہے اور اسلام دنیا کے ہر گوشے میں امن و انصاف قائم کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے۔

وإن جنحوا للسلم فاجنح لها ...." (الانفال/٦١)

اور اگر یہ کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو۔

لیکن ساتھ ساتھ اسلامی حکومت کو ہر طرح کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔

"وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم" (الانفال/٦٠)

اور (مسلمانو!) ان کفار کے (مقابلے کے) واسطے جہاں تک تم سے ہو سکے (اپنے بازو کے) زور سے اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے (لڑائی کا) سامان مہیا کرو۔ اس سے خدا کے دشمن اور اپنے دشمن اس کے سوا دوسرے لوگوں پر بھی اپنی دھاک بٹھا لوگے جنھیں تم نہیں جانتے ہو۔ مگر خدا تو انھیں

جاتا ہے۔
اس طرح اگر کسی اسلامی ملک یا اس کے عوام پر جنگ تھوپی جائے تو خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

اُذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر (الحج/۳۹)
جن (مسلمانوں) سے (کفار) لڑا کرتے تھے چونکہ وہ (بہت) ستائے گئے اس وجہ سے انھیں بھی (جہاد کی) اجازت دیدی گئی۔ اور خدا تو ان لوگوں کی مدد پر یقیناً قادر (وتوانا) ہے۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ...۔" (البقرہ/۱۹۰)
اور جو لوگ تم سے لڑیں، تم بھی خدا کی راہ میں اُن سے لڑو اور زیادتی نہ کرو....

جنگ سے متعلق اسلامی اصول و قوانین کا لحاظ رکھنا چاہیے، خواہ وہ اسیروں سے متعلق ہوں یا صلح و نا جنگ معاہدے سے۔ یہ اصول موجودہ زمانے میں جنیوا معاہدے سے بہت زیادہ ممتاز ہیں۔ اگر دو ملکوں یا مؤمنوں کے دو گروہوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے:۔

"وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینہما فان بغت احدٰہما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتی تفیٔ الی امر اللہ، فان فاءت فاصلحوا بینہما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین"
اور اگر مؤمنین میں سے دو گروہ آپس میں لڑنے لگیں تو ان دونوں میں (الحجرات/۹) صلح کرا دو۔ پھر اگر ان میں سے ایک (فریق) دوسرے پر زیادتی کرے، تو جو فریق زیادتی کرے، تم (بھی) اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ پھر جب رجوع کرے تو دونوں میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس ضابطے کی بنیاد پر اصلاح، قیام امن، ظلم کا توڑ کیا جا سکتا ہے۔ نسلی امتیاز اور جغرافیائی حدود اور منافقت امن کا علاج نہیں کر سکتی:۔

یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بہما فلا تتبعوا الھویٰ" (النساء/۱۳۵)

اے ایمان والو مضبوطی کے ساتھ انصاف پر قائم رہو اور خدا لگتی گواہی دو اگرچہ یہ گواہی خود تمہارے یا تمہارے ماں باپ یا قرابت داروں کے لئے مضر ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ مالدار ہو یا محتاج (کیونکہ) خدا تو (تمہاری بہ نسبت) ان پر زیادہ مہربان ہے، تم تو (حق سے) کترانے میں خواہش نفسانی کی پیروی نہ کرو۔

"قل الحق ولو کان مُرًّا۔ ولو کان علی نفسک" حقیقت بیان کرو خواہ وہ تلخ اور تمہارے لیے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو۔

مذکورہ حقائق پر نظر ڈالنے کے بعد کیا یہ بات کہنے کی گنجائش رہتی ہے کہ اسی طرح کی حکومت صدر اسلام سے لے کر آج تک ان لوگوں کا انتظار کر رہی ہے جو اسے دوبارہ بحال کر کے اس کی حفاظت کریں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اسلامی جمہوریہ ایران کا تجربہ سامنے نہ ہوتا تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ پوری دنیا میں کوئی بھی ایسی حکومت نہیں جسے اسلامی حکومت کا نام دیا جائے موجودہ دور میں اسلامی جمہوریہ ایران مسلمانان عالم کی امیدوں کا سہارا بنی ہوئی ہے لہٰذا ہر مسلمان خدا اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات ماننے والے کا فریضہ ہے کہ وہ اسلامی جمہوریہ ایران کی نصرت وحمایت کرے۔ قرآن، سنت اور اجماع کی بنیاد پر جو اصول، ضوابط، شروط اور صفات مختصراً بیان کیے گیے مجموعی اعتبار سے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا ہے۔ جو شخص دل میں خدا کا خوف اور حرمت اسلام کا پاس رکھتا ہو وہ موجودہ نظام ہائے حکومت کو ہرگز اسلام کا نام نہیں دے سکتا خواہ وہ نظام جمہوری ہو یا بادشاہی یا امارت کے نام سے یاد کیا جاتا ہو۔ جہاں تک اسلام کی بات ہے خاص طور پر حکومت کے سلسلے میں وہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کے ایک حصے پر عمل کیا جائے اور دوسرے کو چھوڑ دیا جائے عمل ہو تو پورے پر ورنہ عمل نہ کیا جائے۔

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا خزیٌ فی الحیاۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب (البقرہ/۸۵)

تو پھر کیا تم (کتاب خدا کی) بعض باتوں پر ایمان رکھتے ہو اور بعض سے انکار کرتے ہو پس تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ زندگی بھر کی رسوائی ہو، اور (آخر کار) قیامت کے دن بڑے سخت عذاب کی طرف لوٹا دیے جائیں۔

جناب ڈاکٹر سید جلال الدین مدنی
ترجمہ جناب سید مہدی سرباز

اسلامی جمہوریہ ایران میں بنیادی حقوق

ڈاکٹر سید جلال الدین مدنی بین الاقوامی شہرت کے حامل قانون داں ہیں۔ آپ نے مختلف ممالک و اقوام کے قوانین کا بڑی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ آج جبکہ حقوق انسانی کے نام نہاد علم بردار اقوام متحدہ میں بیٹھ کر ایران میں حقوق انسانی کی پامالی پر مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں۔ اس بات کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران میں بنیادی حقوق کا کس قدر احترام پیش نظر رکھا گیا ہے اس کا ایک مطالعہ پیش کر دیا جائے۔ ہم نے اسی ضرورت کے پیش نظر یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔

حقوق کی تعریف اور اس کی قسمیں:۔

جمہوری اسلامی ایران کے بنیادی حقوق (قوانین) کا اصلی سرچشمہ قانون اساسی ہے۔ لہٰذا اگر ہم قانون اساسی کی تشریح و تفسیر کریں تو گویا ہم نے بنیادی حقوق پر دسترس حاصل

کرلی ہے۔ قانون اساسی اور اس کے اجزاء کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لیے اس کے مقدمات و حواشی سے آگاہی ضروری ہے۔ چنانچہ ہم سب سے پہلے حقوق کی بعض تعریفوں کو بیان کر دینا اور پھر اس کی درجہ بندیوں پر توجہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

حقوق کے مختلف مفاہیم:

حقوق سے کیا مراد ہے؟ فارسی زبان میں حقوق کا لفظ مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کبھی تو یہ لفظ اپنے کلمہ مفرد یعنی حق کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حق اس امتیاز کا نام ہے جو ایک فرد کو اپنے معاشرے میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ امتیاز جو ہر فرد کو اپنے معاشرے کے دوسرے افراد کے مقابلے میں حاصل ہے۔ دوسروں کو ان حقوق کے تسلیم کرنے نیز ان کی رعایت رکھنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ مجموعی طور پر معاشرے کا نظم و نسق محفوظ رہے۔ معاشرے کے افراد صرف ایک ہی امتیاز کے حامل نہیں ہوتے بلکہ بہت سے امتیازات کے مالک ہوتے ہیں لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اسے بہت سارے "حقوق" حاصل ہوتے ہیں۔ ان حقوق میں سب سے اہم حق زندگی ہے اس کے علاوہ حق آزادی حق مالکیت، اور حق زوجیت وغیرہ ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حقوق بعض حالات میں خطرے سے دوچار ہو جائیں۔ اور کسی شخص یا اشخاص سے یہ چھین لئے جائیں ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے، کہ فلاں شخص کی آزادی کے حق پر ضرب لگائی گئی ہے یا فلاں شخص کے حق زندگی کی رعایت نہیں برتی گئی یا فلاں کے حق مالکیت پر حملہ ہوا ہے یہ حق اور حقوق کا ایک مفہوم ہے لیکن زیر بحث مقالہ میں حقوق سے یہ مفہوم مراد نہیں ہے۔ اگرچہ قانون اساسی میں افراد جامعہ کے حقوق اور امتیازات سے متعلق بنیادی طور پر تفصیلی بحث موجود ہے۔ پھر بھی کل کے کل حقوق اساسی شخصی حقوق اور شخصی امتیازات پر منطبق نہیں ہوتے قانون اساسی کا صرف ایک حصہ افراد کی آزادی اور ان حقوق سے متعلق ہے۔ لہٰذا حقوق کے دوسرے معانی و مفاہیم کو بھی بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے معنوں میں "حقوق" کا اطلاق ان جمیع قوانین پر ہوتا ہے جو ایک معاشرے میں نافذ ہوتے ہیں یہاں لفظ "حق" کے مفرد معنی پر انحصار نہیں کیا جاتا بلکہ "حقوق" اپنی ہیئت اصلی کے ساتھ جمع ہی کی صورت میں مورد نظر قرار دیا گیا ہے چونکہ مملکت یعنی ایک جامع اور منظم سیاسی ڈھانچہ اور اس کے

معاشرے کی بقا و تقویت کچھ مخصوص قواعد وضوابط کی محتاج ہوتی ہے، لہٰذا ان ہی ضوابط کے مجموعے کا نام "حقوق" یا "قانون" رکھا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی بھی ملک کے نظام و قوانین کو اس ملک کے حقوق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان معنوں میں حقوق ایران سے ایران کے تمام تمام قوانین و مقررات مراد ہیں اور اسی طرح حقوق فرانس سے مراد حکومت فرانس کے تمام قوانین وضوابط ہیں۔

مثلاً جب کبھی پوچھا جاتا ہے کہ حقوق ترکیہ میں وزیر اعظم کے لیے کیا شرائط ہیں۔ تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ترکیہ کے قانون میں وزارت عظمیٰ کے عہدے کے لیے کیا شرائط و خصوصیات رکھی گئی ہیں۔ اس طرح اگر سوال کیا جائے کہ اٹلی کے حقوق میں طلاق کا حق تسلیم کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا اٹلی کے قانون میں طلاق کی کیا حیثیت ہے آیا طلاق دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ پس کسی بھی ملک کے قوانین وضوابط کے مطالعے کے لیے اس ملک کے "حقوق" (قانون) کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ [۴]

علم حقوق اگرچہ علوم انسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن یہ اجتماعی مسائل پر بھی محیط ہے۔ [۵] کیونکہ یہ معاشرے میں انسانی تعلقات کو منظم رکھتا ہے اور ان تعلقات کو ایک دوسرے کی احتیاجات سے ہم آہنگ کرتا ہے۔

حقوق کی مختلف شکلیں:

آج کی اجتماعی زندگی میں افراد کے تعلقات کی پیچیدگیوں اور پھر ایک معاشرہ کے دوسرے معاشرہ کے ساتھ باہمی ارتباط کے پیش نظر مجموعی طور پر حقوق کا دائرہ اس حد تک وسیع ہوگیا ہے کہ کسی ایک شخص کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ تمام حقوق میں مہارت اور تحقیق حاصل کر لے اسی لیے ہر ملک کے قوانین میں درجہ بندی کر کے ان کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

قانون کی تقسیم کے لیے دو چیزوں کو بنیاد قرار دیا جائے: افراد اور وہ ادارے جن سے متعلق قوانین و مقررات وضع ہوئے ہیں۔ چنانچہ جو قواعد وضوابط افراد کے مابین تعلقات کو منظم کرتے ہیں لیکن حکومت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ حقوق خصوصی

یا خصوصی قانون کہلاتے ہیں۔ جیسے شہری حقوق وغیرہ۔ اور وہ قوانین جو حکومت اور سرکاری اداروں کے باہمی ارتباط کی وضاحت کرتے ہیں یا خود ارکان حکومت کے درمیان تعلقات کی تشریح کرتے ہیں اور ان میں سے بعض حکومت اور عوام سے متعلق بھی ہوتے ہیں "حقوق عمومی" کہے جاتے ہیں۔ جیسے حقوق اداری وغیرہ۔

حقوق عمومی و خصوصی ہر دو اپنے دائرہ عمل کے لحاظ سے داخلی حقوق اور بین الاقوامی حقوق میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

داخلی حقوق ایسے ضوابط کے مجموعے کا نام ہے جو کسی حکومت کے حدود مملکت میں رائج ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مجلس شورای اسلامی ایران کی تشکیل کا قانون جس کا تعلق فقط ایران سے ہے۔ جیسے پاکستان کے قوانین کا تعلق فقط پاکستان سے ہے۔

یہ حقوق داخلی عمومی اور خصوصی دونوں نوعیت کے ہوتے ہیں چنانچہ بنیادی حقوق و قوانین، ادارہ جات سے متعلق حقوق و قوانین، دیوانی اور فوجداری کے قوانین شہری، مزدوری اور دادرسی کے قوانین وغیرہ کسی ملک کے داخلی و عمومی قوانین کے زمرہ میں آتے ہیں جبکہ حقوق شہری اور حقوق تجارت ملک کے داخلی اعتبار و خصوصی قوانین میں شمار ہوتے ہیں۔

خارجی یا بین الاقوامی حقوق ملکی حدود سے نکل کر تمام ممالک کو اپنے احاطہ میں لے لیتے ہیں یہ قوانین و ضوابط ایک غیر قومی عامل یا تنظیم کے تحت ہوتے ہیں۔ یہ بین الاقوامی قوانین بھی خصوصی اور عمومی دونوں نوعیت کے ہوتے ہیں۔

جہاں تک بین الاقوامی عمومی قوانین کا تعلق ہے تو یہ قوانین مختلف ملکوں اور بین الاقوامی اداروں کے درمیان نظم و ضبط پیدا کرتے ہیں۔ حکومتوں کے درمیان طے پانے والے معاہدے بھی بین الاقوامی عمومی قوانین میں شامل کئے جاتے ہیں لیکن بین الاقوامی اداروں کی تشکیل و ترتیب اور ان کی کارکردگی بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔

بین الاقوامی خصوصی قانون، بین الاقوامی سطح پر عوام کے تعلقات کو منظم کرتا ہے۔ چنانچہ شہریت حاصل کرنے کا قانون۔ غیر ملکیوں سے متعلق قوانین نیز قوانین کا تعارض وغیرہ اس کے اہم ابواب ہیں۔

"حقوق" کی مذکورہ بالا شعبوں میں تقسیم سے بالکل الگ تھلگ ایک خاص شعبہ اور بھی ہے، جو سب سے مختلف ہے بلکہ اسے مطالعہ کا ایک طریقہ سمجھنا چاہیے۔ یہ شعبہ قانون کی تطبیق کا ہے جس کے تحت مختلف ممالک کے قوانین کا تجزیہ و موازنہ کیا جاتا ہے۔

چنانچہ مختلف ممالک میں قوہ مجریہ کا جائزہ لینے کے لیے حقوق تطبیقی سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے یا انتخابات کے لیے ایک اچھا قانون مرتب کرنے کے لیے کئی ممالک کے قوانین کا تقابلی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں "حقوق تقابلی" سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

بنیادی حقوق اور تقابلی مطالعہ:

مقدمے کے طور پر مجموعی اعتبار سے حقوق کی تعریف اور اس کی مختلف شکلیں پیش کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر بنیادی حقوق کی طرف رخ کرتے ہیں۔ چونکہ ان حقوق کا تعلق ارکان حکومت سے ہے۔ اس لحاظ سے عمومی قانون کے زمرے میں آتے ہیں۔ اور کسی ایک ملک کی سرحدوں کے اندر نافذ العمل ہونے کی وجہ سے داخلی قانون کی حیثیت کے حامل ہیں۔ اس وقت بنیادی حقوق کے تحت ہماری اصل موضوع بحث ماخذ اسلامی جمہوری ایران کا آئین اساسی ہے۔ ہم یہاں قانونی بحث کے دوران بنیادی قانون کے ذیل میں فقط ایران کے دستور اساسی اور اس کے حواشی پر انحصار نہیں کریں گے، اگرچہ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم ایران کے دستور اساسی کے ظاہر و باطن کا مختلف زاویوں سے مطالعہ کریں لیکن اس سلسلہ میں ہم تقابلی مطالعے سے بھی غفلت نہیں برتیں گے۔ حقوق تقابلی قوانین کا ایک اہم شعبہ ہے جس کے تحت مختلف ممالک کے قوانین کو مورد نظر رکھ کر ان کا موازنہ کیا جاتا ہے۔

جہاں تک تقابلی مطالعہ کا تعلق ہے تو صرف ہمارے زمانے سے مخصوص نہیں۔ بلکہ یہ طریقہ قدیم زمانے سے رائج اور متداول ہے۔ ارسطو سیاست سے متعلق اپنی دوسری کتاب میں جہاں معاشرے کے لیے بہترین سیاسی تشکیلات کا تعارف کرانا چاہتا ہے یوں بیان کرتا ہے:

"جو حکومتیں تدبر و سیاست میں شہرت یافتہ ہیں ان کے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے

نیز ان کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا جانا چاہیے۔"

تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں اس سے بھی آگے بڑھ کر ارسطو یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ فلسفیوں نے حکومتوں کی جو شکلیں پیش کی ہیں "جو اگرچہ ظاہراً وجود میں آئی ہوں" انھیں بھی تقابلی مطالعہ میں شامل کرنا چاہیئے، اور خود اس نے عملی طور پر ایتھنز، اسپارٹ، کارتاژ، نیز کریٹ کی سیاسی تنظیموں کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہوئے تقابلی جائزہ لیا ہے۔ اس زمانہ میں مذکورہ سرزمینوں میں اکثر ان کا حدود اربعہ ایک شہر کے اتنا تھا، االگ الگ دستور اساسی نافذ تھا۔

ارسطو پہلا شخص ہے، جس نے اپنے زمانے کی مختلف النوع حکومتوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اس نے درجہ بندی کے اعتبار سے تین قسم کی حکومتوں، بادشاہت، اشراف کی حکومت اور جمہوریت کا نام لیا ہے۔ قدیم روم میں بھی دستور اساسی کے موازنہ کی فکر نظر آتی ہے۔ ارسطو کے بعد جن دانشوروں نے مختلف طرز حکومت پر تقابلی مطالعے سے کام لیا ہے، انھیں پولیبوس (POLYBIUS) اور سسرو (CICERO) کا نام اہل مغرب خاص طور پر لیتے ہیں پولیبوس نے بادشاہت، اشراف کی حکومت اور جمہوریت سے مخلوط حکومت کی تشکیل کو مورد نظر قرار دیا ہے۔ مختلف النوع بنیادی آئین و قوانین سے متعلق تقابلی مطالعے کی تاریخ میلاد مسیح سے قبل کی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں ظہور اسلام کے نتیجے میں حکومتوں کے طرز میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ اور قرآن مجید اسلامی معاشرے میں ہمیشہ کے لیے ایک بنیادی اور حقیقی محور قرار پایا اور ہر قانون کا اس آسمانی آئین سے ہم آہنگ ہونا ضروری قرار پایا۔ چنانچہ اسلام کا ظہور اور اس کی ترقی یورپ میں قرون وسطیٰ کے خاتمے کا باعث بن گئی۔ اسلامی افکار کے ردعمل کے طور پر مغرب بھی فکری انقلاب سے روشناس ہوا۔ (اس دور کو نشاۃ ثانیہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور قوانین اساسی کا تقابلی جائزہ ایک نئی شکل میں شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایک مستقل ملک کی حیثیت سے استقلال حاصل کرنے والے سیاسی یونٹوں میں تیزی سے اضافہ ہوا چنانچہ اس وقت ذیل کے نقشے میں ۱۵۶ ممالک موجود ہیں جنھیں سے ہر ایک کا اپنا اپنا دستور اساسی ہے۔

البتہ اتنی تعداد میں آئین کے وجود کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ دستور اساسی کا نظام جدا ہے اور دنیا میں ۱۵۶ نظام موجود ہیں۔ اس لیے کہ بعض ممالک کا آئین صرف دوسروں کی تقلید کے سوا کچھ نہیں۔ یا معمولی رد و بدل کے ساتھ کسی دوسرے قانون کا اقتباس کہا جا سکتا ہے مثال کے طور پر افریقی ممالک کو لے لیجیے جو اس وقت فرانسیسی استعماریت کے زیر تسلط تھے بعد میں فرانس ہی کے اشارے پر ظاہری اختیار سے آزاد ریاستوں میں تبدیل ہو گئے جبکہ اب بھی فرانس کی پیروی کرتے ہیں اور فرانس کے ہی آئین کو بہت معمولی تبدیلی کے ساتھ اپنائے ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ قوانین ان کی زندگی کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ اسی طرح دولت مشترکہ کے ممبر ممالک کے بنیادی آئین میں بھی کافی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے۔ روس اور اس کا آئین، روسی بلاک کے ممالک یا ان ممالک کے لیے جہاں کمیونسٹ انقلاب آچکا ہے، نمونہ اور لائق تقلید ہے۔ اس طرح تین ممالک روس، برطانیہ اور فرانس قانون اساسی کے لحاظ سے تین نمونے قرار پاتے ہیں، جو بہت سے ممالک پر احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ چوتھے نمبر پر ہم ان ممالک کو شمار کرتے ہیں۔ جہاں ملے جلے قانون اساسی پائے جاتے ہیں۔ یعنی بعض معاملوں میں فرانسیسی سسٹم کو اپنا لیا ہے۔ بعض مسائل میں انگریزوں کی تقلید کرتے ہیں۔ جبکہ بعض قوانین کے سلسلہ میں تخلیق سے بھی کام لیا گیا ہے۔

ان تمام نظاموں اور قوانین میں خامیاں اور اچھائیاں دونوں موجود ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کوئی قانون ایک ملک میں کافی پسند کیا جائے لیکن دوسرے ملک میں اسی قانون کو شدید نفرت اور بیزاری کی نظر سے دیکھا جائے اور وہ اس ملک کے لئے سرے سے ہی سازگار نہ ہو۔ اسی لئے آئین اور قوانین سے متعلق اچھائیاں اور خامیاں مطلق نہیں ہوتیں۔ جو چیز ایک جگہ قانون کی خامی میں گنی جائے عین ممکن ہے دوسری جگہ وہی چیز قانون کا حسن شمار کیا جائے اور اس میں افادیت مضمر ہو۔

بنیادی قوانین کی تعلیم کیوں ضروری ہے؟

کسی بھی ملک کے تمام باشندوں کو اپنے ملک کے قانون کی اطاعت کرنی چاہیے،

اور یہ بھی کوشش ہونی چاہیئے کہ قانون کی بالادستی قائم رہے ۔ روزمرہ کے مسائل میں قانون کی اطاعت اس کا احترام اور اس سے استفادہ کے لئے قانون سے واقفیت اور اس کا ادراک ضروری ہے، نیز ثقافتی انقلاب کا پہلا قدم ہی یہ ہونا چاہئے کہ ملک کے باشندوں کو زیادہ سے زیادہ ملکی قوانین سے متعلق معلومات فراہم کی جائیں تاکہ افراد اپنی زندگی کو قانون کے مطابق ڈھال لیں ۔ اور اپنے حقوق کو پہچاننے کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں پر عمل کریں ۔ عوام کے درمیان قانون کی خلاف ورزیوں کا ایک بڑا سبب قانون سے عدم واقفیت ہے ۔ وہ اس چیز کو اپنا حق سمجھ بیٹھتے ہیں جو دراصل ان کا حق نہیں ہوتا ۔ دوسروں سے ایسی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں ، جو غیر قانونی اور غیر مشروع ہوتی ہیں جب معاشرے میں رونما ہونے والے جرائم کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو اکثر یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جرائم کا ارتکاب کرنے والا قانون سے عدم واقفیت کی وجہ سے جرم کر بیٹھا ہے ۔ یعنی مجرم کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کوئی جرم کر رہا ہے اور اس کا عمل اسکو سزا کا مستحق قرار دے سکتا ہے یا اگر اس بارے میں کوئی بات سنی بھی ہوگی تو وہ ایسی نہ ہوگی جو اس کو ارتکاب جرم سے باز رکھتی ۔

اگرچہ قانون معاشرے میں تمام افراد کے لیے آرام و آسائش اور سہولتیں فراہم کرتا ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ قانون کے مختلف شعبوں اور زاویوں کا علم افراد کو معاشرے میں زیادہ فعال بھی بناتا ہے ۔ جس کے نتیجے میں معاشرے کے اندر اس کی افادیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے جس معاشرے کے افراد زیادہ پڑھے لکھے اور قانون سے زیادہ واقف ہوتے ہیں ۔ اس معاشرہ میں زیادہ تحرک اور بیداری پائی جاتی ہے ۔ ایک ایسا انقلابی معاشرہ جو ظلم و ستم کے قیود سے نیا نیا آزاد ہوا ہو ظاہر ہے اسے اصلاحات کی بہت زیادہ ضرورت ہوگی ۔ لہٰذا انقلابی اداروں سے متعلق افراد کو قانون کی باریکیوں سے زیادہ سے واقفیت ہونا چاہیئے اور تیزی کے ساتھ ان قوانین کو بروئے عمل لانا چاہئے ۔ اگر قانون کی معرفت حاصل نہ ہو اور اس پر عمل نہ کیا جائے تو دوبارہ بہت زیادہ محنت درکار ہوگی اگر ایک گروہ کوئی کام انجام دیتا ہے اور دوسرا گروہ اسے بگاڑ دیتا ہے تو اس سے بہت زیادہ انسانی طاقت ضائع ہوتی ہے اور اکثر اختلافات اور غلط فہمیوں کا

موجب بھی بنتا ہے، جس کے نتیجے میں دشمنیاں بڑھ جاتی ہیں اور ایک انقلابی معاشرہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو کھو بیٹھتا ہے۔ اس کے برعکس قانون سے آگاہی معاشرے میں ہر سطح پر نظم و ضبط برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ افراد کے فرائض اور ذمہ داریوں کے حدود معین کرتی ہے۔ جب قانون کا صحیح طور پر علم ہو جاتا ہے، تو کمیوں اور کمزوریوں کا بھی پتہ چل جاتا ہے، خوب و بد میں تمیز ہو جاتی ہے۔ افراد اپنی صلاحیت اور ذوق و مہارت کے مطابق جگہوں کو سنبھال لیتے ہیں۔

اسلامی جمہوریہ ایران کا دستور اساسی جن خصوصیات کا حامل ہے خصوصی طور پر جن حالات اور انقلابی ماحول میں اسلامی بنیادوں پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے پیش نظر اس قابل ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کی جائے اور اس کو عمل میں لایا جائے۔ آج جب کہ مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد میدان سیاست میں حاضر ہیں اور بہت سے اہم مسائل انہی لوگوں کی رائے اور ارادوں سے انجام پاتے ہیں۔ نیز یہ کہ رائے دہندگان کی عمر ۱۵ سال تک کردی گئی ہے اور خانہ دار عورتیں جنہیں کبھی سیاسی مسائل اور انتخابات سے سروکار نہ تھا۔ فقط دینی و مذہبی عقائد کی روشنی میں ذمہ داری کی ادائگی کے لئے سیاسی اجتماعات میں حصہ لے رہی ہیں۔ اور اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔ بنیادی قانون کی تعلیم و تربیت کو تمام دوسرے پروگراموں پر فوقیت حاصل ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ قانون اساسی ہر طرح کی فعالیت کی راہیں معین کرتا ہے۔ لہٰذا ہر سطح پر تعلیمات میں اس کو شامل کر لینا چاہیئے حتّٰی کہ ابتدائی درجات میں بھی اس کے بنیادی پہلوؤں کی تعلیم ضروری ہے۔ یہ تعلیم بہت سے مسائل کو خود بخود حل کردے گی اور معاشرہ کی ترقی کے لیے بڑا اہم کردار ادا کرے گی۔

جمہوری اسلامی ایران کا قانون اساسی الٰہی قوانین کا پیرو ہے۔

اسلامی جمہوریہ کا قانون ایک ایسی ملت کے مقاصد، افکار، ارمانوں اور آرزوؤں

کا ماحصل ہے جو دین اسلام کی پیروکار ہے۔ اگرچہ آج اسلام کے علاوہ دوسرے مکاتب فکر بھی دنیا میں موجود ہیں۔ لیکن اسلام ایک مستقل الٰہی مکتب ہے جس کی بنیاد وحی ہے۔ اس کے اصول و قوانین احکام و شریعت، معیار اور قدریں بلکہ مجموعی طور پر دنیا کے بارے میں اس کے تصورات دوسرے مکاتب فکر سے قطعی ممتاز ہیں چونکہ ہر مکتب فکر اپنا ایک مقصد اور آئیڈیل رکھتا ہے جس کی طرف اپنے معاشرے کو لیجانے کی کوشش کرتا ہے۔

مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام ایک ایسا دبستان ہے جو مادی فلاح، آسائش، دولت کی جمع آوری نیز مکمل اقتصادی آزادی کو اپنا اصول قرار دیتا ہے۔ لیکن دوسری قدروں سے چشم پوشی کرتا ہے۔ اس نظام میں انسان کی معنوی بلندی کا کوئی تصور نہیں، ان کا مقصد صرف استحصال ہے اور کر رہے ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام چند درندہ صفت سرمایہ داروں اور اجارہ دار استثماری افراد کو غریب اور محروم اکثریت پر مسلط کرتا ہے یہ سرمایہ، گاڑیاں اور پیسہ انسانی ہمدردیوں کے لیے کوئی جگہ یا گنجائش باقی نہیں چھوڑتا۔ سیاست اقتصادیات کی خدمت میں ایک جھوٹے اور دھوکہ باز کارندہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تاکہ پیداوار کے جتنے ذرایع ہیں ان پر اپنے خونی پنجوں کی گرفت مضبوط کرلے بخصوصیت کے ساتھ بڑے بڑے قدرتی ذخائر کسی بھی طریقے سے قبضہ میں لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ ان مقاصد اور طریقۂ فکر پر مبنی معاشرے بظاہر آسودہ ہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ برائیوں میں غرق ہیں۔

کیمونزم ایک دوسرا مکتب فکر ہے جو اپنے آپ کو سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف اور حریف کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ اور ایک غیر طبقاتی معاشرہ کا نعرہ لگاتا ہے، اس کا سب سے پہلا شکار فردی آزادی کو سلب کر لیتا ہے۔ اور انسانیت کو ایک طرح کی غلامی میں جکڑ دیتا ہے۔

جہاں تک دین اسلام کے مقاصد کا تعلق ہے تو یہ دوسرے دنیا پرست مکاتب کے مقاصد سے بالکل جدا اور مختلف ہے۔ اس کا مقصد ایک الٰہی معاشرے کی تشکیل ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں ایک ایسی کامل قوم تشکیل پائے جسکی ہر فرد اعلیٰ انسانی جوہر کی مالک ہو

خدا سے لو لگائے ہوئے ہر قسم کی قید و بند سے آزاد ہو۔ مادہ پرست معاشرے میں جن مقاصد کو برتر و اعلیٰ تصور کرتے ہیں وہ اسلامی معاشرے میں پست اور مضحکہ خیز شمار کئے جاتے ہیں۔ اور اس کی توجیہ صرف اس کے حقیقی مقاصد کے پرتو میں ممکن ہے۔

ہمارے دستور اساسی میں ہر چیز اسلام کے تابع ہے۔ تمام اصول و قواعد کی بازگشت احکام اسلامی کی طرف ہے اکثر مقامات پر قرآن مجید کی آیتیں تدوین شدہ اصولوں کی بنیاد و اساس ہیں۔ چنانچہ قانون اساسی سے بحث کے دوران ہم ان اصولوں کا آیات و روایات سے ارتباط اسناد کے ساتھ کے ساتھ پیش کریں گے۔ اس وقت اندازہ ہوگا کہ کس طرح سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی میدانوں میں تمام تر احکام کو اسلام سے ماخوذ کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ نیز ضرورت اور مجبوری کے موقعوں پر ثانوی احکامات سے استفادہ کرتے ہوئے زمانے کے پیچیدہ اور ناقابل حل مسائل کا جواب دیا گیا ہے۔ اس طرح ہمارا دستور اساسی دوسرے ممالک کے آئین و قوانین کی بہت سی اصطلاحات و تعبیرات کی موجودگی کے باوجود مطالب کے اعتبار سے خالص اسلامی ہے۔ دوسرے ملکوں کے دستور اساسی کی طرح ہمارے قانون میں بھی قوہ مقننہ (LEGISLATIVE POWER)، قوہ مجریہ (EXECUTIVE POWER) قوہ قضائیہ (JUDICIAL POWER)، جمہوریہ (REPUBLIC)، صدر اور وزیر اعظم جیسی اصطلاحات موجود ہیں۔ لیکن ان کو بھی اسلامی معاشرے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مثال کے طور پر لفظ "جمہوری" جو "جمہوری اسلامی ایران" کے نام کا پہلا جزو ہے۔ اس کا ظاہری و باطنی اعتبار سے جو مفہوم عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ قطعی طور پر یہاں منطبق نہیں ہوتا۔ کیونکہ جمہوریت ایک ایسی حکومت کو کہتے ہیں جو مکمل طور پر عوامی ہو۔ یعنی اس کی تشکیل و نظم و ضبط انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن سے اس حکومت کا تعلق ہو (اگرچہ عصر حاضر کی بہت سی جمہوری حکومتوں میں عوام کا نام صرف شدید ترین ڈکٹیٹر شپ پر پردہ ڈالنے کے لیئے استعمال ہو رہا ہے۔ اور کبھی عوامی فکر و رجحانات پارٹیوں کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس طرح چند افراد پورے ملک کے عوام کی قسمتوں کے

مالک بن جاتے ہیں) مگر اسلامی جمہوریہ ایران کے بنیادی دستور اساسی میں صراحت کی گئی ہے کہ " دنیا اور اس میں بسنے والے تمام انسانوں پر صرف خداوند عالم کی مطلق حاکمیت ہے اور اسی نے انسان کو اپنے مقدرات کا حاکم بنایا ہے ، اور انسان سے یہ خداداد حق چھین لینے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے ۔ اور نہ ہی اس کو کسی فرد یا خاص جماعت کی اجارہ داری میں دیا جاسکتا ہے ، اور ہماری ملت اس خداداد حق سے ... استفادہ کرے گی ۔"

ملت اس حق سے اس طور پر استفادہ کرے گی کہ کسی بھی زمانے میں کچھ مخصوص افراد ، گروہ ، قبیلہ یا کوئی خاص خاندان حکومت پر اپنا تسلط نہ جمانے پائے ۔ بلکہ شرائط و ضوابط کی روشنی میں حکومت کے ذمہ داروں کا تعین ہوگا اور شرائط و ضوابط پر پورا اترنے والوں میں اولویت کی تشخیص عوام کی اکثریت کرے گی ۔ اگر کچھ ماہرین کو کسی کام کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے تو ایسی صورت میں بھی ان ماہرین کا انتخاب صرف عوام کی رائے اور اعتماد سے ہوتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ میں تمام افراد امور حکومت کی انجام دہی کے ذمہ دار ہیں ۔ کیونکہ " کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ " کے پیش نظر سب کے سب حکومت کے امور میں شریک اور مددگار ہیں ۔ عوام کو یہ حق حاصل ہے اور انہیں جاننا چاہئے کہ مملکت میں کیا ہو رہا ہے انہیں تمام مسائل سے باخبر ہونا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ کون سا کام کیوں ؟ اور کس بنیاد پر ہو رہا ہے ۔ اگر کوئی عیب دکھائی دے تو اس کی اصلاح کی کوشش کریں ، بازپرس کریں اور یاددہانی کرائیں ، نیز تنقید کے ذریعے بہتر طریقے کی نشاندہی کریں انہیں بہر حال تعمیر کنندہ ہونا چاہیئے ۔

اسلامی جمہوریہ کے نظام میں حکومت کے ذمہ داروں اور عہدہ داروں کو عوامی سطح سے الگ تھلگ رکھنے کا کوئی تصور نہیں ۔ بلکہ ہر ممکن طریقے سے عوام کے ساتھ باہمی تبادل نظر ، اور مشورت کے آسان اور بہتر طریقوں کو فراہم کرنا ہے ۔ اس لئے کہ اسلام عوام کے منافع کا خیال رکھتا ہے ۔

اور امامت و رہبری کا مسئلہ ہمارے دستور اساسی میں اسلام کے ایک بنیادی اور اساسی اصول کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے ۔ جس کو (مقننہ ، مجریہ اور عدلیہ) تینوں طاقتوں

پر نظارت و نگرانی کا حق حاصل ہے۔ رہبریت کی جو ذمہ داریاں اسلام میں معین ہیں ایران کے دستور اساسی میں بھی بیان ہوئی ہیں۔ اس کے تحت رہبری کسی شخص یا خاندان سے مخصوص نہیں بلکہ ملت کے تمام افراد ان شرائط کے حصول کے سلسلہ میں آزاد ہیں، ساتھ ہی ساتھ کسی طرح کی مخفی سازش، مکاری یا عیاری کا اس مسئلہ میں کوئی دخل ممکن نہیں ہے، جیسا کہ بہت سے دوسرے ممالک میں معمول بن چکا ہے۔

یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے لیکن فی الحال یہاں صرف ایک بات کی یاد دھانی کرنا مقصود ہے کہ اسلام میں رہبریت کے لیے علمی اعتبار سے کامل ہونے کے علاوہ سالہا سال کے تجربے اور تقوے کی بھی ضرورت ہے۔ اور جیسا اسلام چاہتا ہے صحیح معنوں میں اپنے تمام اعلیٰ اور وسیع مفاہیم کے ساتھ صاحب تقویٰ ہونا کوئی آسان کام نہیں۔

ہم نے اس ابتدائی اور تمہیدی بحث میں دستور اساسی پر اجمالی طور سے ایک سرسری نظر ڈالی ہے تاکہ مطالعہ و تحقیق کا دائرہ معین ہو سکے۔ ہمیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ اہمیت کے لحاظ سے یہ دستور اساسی دوسرے تمام قوانین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ آگے چل کر کسی بھی حصے کی توضیح کی صورت میں ہمیں مجبوراً کسی نہ کسی حد تک دوسرے معمولی قوانین پر بھی نظر ڈالنی ہوگی۔ مثال کے طور پر جب ہم دستور اساسی میں اقتصاد کے حدود کی بحث شروع کریں گے، تو اس کے ساتھ ہی ساتھ مالکیت اس کے حدود اور غیر قانونی سرمایے کی بھی تشریح کریں گے اور کسی حد تک سزا کے قانون کو بھی بیان کریں گے۔ اسی طرح دوسرے تمام مسائل میں جہاں کہیں ضروری ہوگا، دستور اساسی کے اصول کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے اس کے خارجی مصادیق بھی بیان کریں گے اور ان اصول کو نافذ کرنے والے قوانین کی ممکن حد تک تشریح کریں گے۔

حواشی

۱؎ DROIT CONSTITIONNEL

۲؎ حق دار کو موضوع حق " SUJET " کہا جاتا ہے۔ یہاں حقوق سے مراد شخصی حقوق ہیں۔
"DROIT SUBJECTIF"

۳ یہاں حقوق سے مراد حقوق موضوعی ہے جبکہ بعض کے نزدیک اس کو حقوق نوعی کہتے ہیں۔ "DRIOT OBJECTIF"

۴ قانون کا علم بہت سے انسانی اور اجتماعی علوم سے نزدیک ہے مگر جامعہ شناسی جو انسانی معاشرے کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا قانون کے ساتھ اشتراک زیادہ پایا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مجموعی طور پر قانون، علم جامعہ شناسی کا ہی ایک حصہ ہے، کہا جاتا ہے کہ علم اخلاق (LAMORALE) ایسے قواعد کو بیان کرتا ہے جس کو ایک معاشرے کی اکثریت ایک مخصوص وقت میں اس کی رعایت کرنا ضروری تسلیم کرتی ہے، چاہے ان قواعد کے عمل میں آنے کی کوئی ضمانت نہ ہو، پس وہ حصہ جس کے اجراء کی ضمانت حاصل ہے، علم قانون کے ساتھ مشترک ہے۔

۵ یہی قانون کے مباحث معمولی تبدیلیوں کے ساتھ علم فقہ کے مباحث میں شمار ہیں۔

۶ DROIT RIVE

۷ DROIT CIVIL

۸ DROIT PUBLIC

۹ DROIT ADMINISTRATIF

۱۰ "اسلامی جمہوریہ ایران کے نمبر ۵۶ ویں آئین کا متن"

وقل اعملوا فسيرى الله عملكم ورسوله
والمؤمنون

امام خمینیؒ نے فرمایا

"استعماریوں نے ہمیں یہ سمجھا دیا کہ اسلام میں حکومت نہیں، حکومتی تنظیم نہیں، اگر بالفرض کچھ احکام و قوانین ہیں بھی تو انھیں نافذ کرنے والا کوئی نہیں مختصر یہ کہ اسلام کا کام صرف قانون بنانا ہے۔ شک نہیں کہ یہ پروپیگنڈے مسلمانوں کو سیاست و حکومت سے دور رکھنے کے لئے استعماریوں کے منصوبے کا ایک حصہ ہیں، ہم ولایت پر ایمان رکھتے ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے لئے خلیفہ معین کرنا ضروری ہے اور آپؐ نے معین بھی فرمایا ہے، کیا خلیفہ کا تعین صرف بیان احکام کے لئے ہے؟.... تمام احکام کو ایک کتاب میں لکھ کر عوام کے ہاتھوں میں دیا جا سکتا تھا کہ وہ خود عمل کرلیں۔ اگر پیغمبر اسلام کے لئے خلیفہ معین کرنا ضروری ہے، تو وہ حکومت کے لیے ہے۔

ہمیں خلیفہ کی ضرورت نفاذ قانون کے لئے ہے، قانون کے لئے مجری ضروری ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں ایسا ہی ہے کہ صرف قانون کا بنا دینا ہی مفید نہیں ہے۔ صرف وضع قانون انسان کو خیر و سعادت سے ہمکنار نہیں کر سکتا۔ وضع قانون کے بعد قوۂ مجریہ کا وجود میں آنا ضروری ہے.... ہمیں نفاذ احکام اور ادارۂ امور کے لئے مجریہ وجود میں لانے کی کوشش کرنی چاہیئے، تشکیل حکومت اسلامی کے لئے جہاد، ولایت پر ایمان کا لازمہ ہے۔"

(کتاب ولایت فقیہ ص ۲۸)

توحید
آداب تعلیم و تعلّم ۔
یخ کی قرآنی تعبیر ۔
اسلام کا تصور کائنات ۔
صلح و جنگ اسلام کی نظر میں ۔
اخلاق امام صادقؑ کی نگاہوں میں ۔

وَقَاتِلُوهُمْ

حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ

جلد ۳، شمارہ ۲، رجب - شعبان سنہ ۱۴۰۶ھ / اپریل - مئی سنہ ۱۹۸۶ء

مقاصد

کلمۃ التوحید
و
توحید الکلمہ

- قرآن و سنت و سیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی، فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر و صاحبان قلم سے
تعاون کی آرزو ہے۔

بدل اشتراک

ملک	فی جلد
ایران	۱۵۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم
سعودی عرب	۸ ریال
قطر	۸ ریال
کویت	۶۵۰ فلس
افریقہ	۴ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر
کینیڈا	۴½ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

اکاونٹ نمبر ۹۰۰۲۵
سازمان تبلیغات اسلامی (مطبوعات خارجی)
بانک ملی ایران شعبہ خشایار ۵۴۴
خیابان طالقانی، نبش فرصت
تہران - جمہوری اسلامی ایران

توحید

اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

جلد ۳، شمارہ ۲،

ترتیب

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس ۵۹۷

قم، جمہوری اسلامی ایران

فون : ۲۴۵۸۴

رجب ـ شعبان ۱۴۰۶ھ / اپریل ـ مئی ۱۹۸۶ء

فکر و فلسفہ

قانون

نوٹ :-

ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے
سے اتفاق ضروری نہیں۔

شذرہ

اسلامی حکومت

انسان موجود اجتماعی ہے، فطری تقاضے اور حیاتی ضرورتیں اسے معاشرتی زندگی گذارنے پر مجبور کرتی ہیں۔ معاشرتی زندگی کے لیے ایک دستور حیات اور حکومت ضروری ہے، سماج، حکومت کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا، انسان تو انسان، حتیٰ کہ وہ جانور جو اجتماعی طور پر زندگی بسر کرتے ہیں جیسے شہد کی مکھی، چیونٹی اور دیمک وغیرہ ان کے یہاں بھی ایک قسم کی حکومت قائم ہے، حکومت ہر معاشرہ کے لیے ضروری ہے چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، حتیٰ کہ میاں بیوی اور بچوں سے تشکیل پانے والے کنبہ میں بھی حکومت کا تصوّر موجود ہے یہ تو صرف کمیونسٹوں کا نظریہ ہے کہ حکومت، فردی مالکیت کی دین ہے اگر روئے زمین سے مالکیت کا تصور ختم ہو جائے تو پھر حکومت کی ضرورت نہ ہوگی وہ حکومت کو سرمایہ داری کا لازمہ تصوّر کرتے ہیں ان کی نگاہ میں حکومت، نظام سرمایہ داری کے سایہ کی حیثیت رکھتی ہے، نظام سرمایہ داری کے نابود ہو جانے کی صورت میں اس کا سایہ خود بخود مٹ جائے گا لیکن ارباب فکر و نظر سے پوشیدہ نہیں کہ کمیونسٹوں کا یہ نظریہ غیر موزوں شاعری کے سوا کچھ بھی نہیں، حقیقت و واقعیت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

(۲)

اسلام، حکومت کا طرفدار اور حامی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں حکومت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

لا بد للناس من امیر بر او فاجر

حکومت کے سایہ میں مومن خدا کے لیے اور کافر اپنے دنیوی منافع کی خاطر سعی و کوشش کرتا ہے، حکومت ہی کے ذریعہ ٹیکس وصول کیے جاتے ہیں، دشمن کو دنداں شکن جواب دیا جاتا ہے۔ چوروں اچکوں اور ڈاکوؤں سے راستے محفوظ ہوتے ہیں، طاقتور سے کمزور کا حق لیا جاتا ہے، یہاں تک کہ نیک سرشت بدخصلتوں کے شر سے امان پا جاتے ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ کی نگاہ میں حکومت اتنی ضروری ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر تین افراد ہم سفر ہوں تو ایک شخص کو اپنا امیر و سربراہ مقرر کر لیں۔ اسی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں حکومت

کتنی اہمیت کی حامل ہے لیکن اسلام ہر حکومت کو پسند نہیں کرتا بلکہ اس کی پسندیدہ حکومت وہ ہے جو اس کے معاشرتی نظام سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو۔

افحکم الجاھلیۃ یبغون ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون

قرآن کی نظر میں حکومتیں دو قسم کی ہیں الٰہی اور جاہلی، ہر غیر اسلامی نظام حکومت، جاہلی ہے۔ خدا کی پسندیدہ حکومت صرف الٰہی حکومت ہے، جاہلی حکومت مسلمانوں کے لیے ننگ و عار ہے۔ الٰہی حکومت سے روگردانی کرنے والوں کو قرآن "کافر"، "ظالم" اور "فاسق" کے نام سے یاد کرتا ہے ہر وہ حکومت جاہلی حکومت ہے جس میں الٰہی قوانین کی بالادستی تسلیم نہ کی گئی ہو چاہے وہ شخصی حکومت ہو یا اجتماعی، استبدادی ہو یا جمہوری، شاہی ہو یا پارلیمانی۔

(۳)

اسلامی تعلیمات اور قرآنی احکام ابدی و آفاقی ہیں، ان کا نفاذ ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے مفید و ضروری ہے، حتی الامکان الٰہی قوانین کے نفاذ میں تعطل جائز نہیں، اسی لئے آج بھی فقہائے اسلام کا فریضہ ہے کہ تمکن و اقتدار کی صورت میں اسلامی حکومت تشکیل دیں، اگرچہ اس کے لیے استطاعت شرط ہے لیکن یہ استطاعت، حج کی استطاعت کے مانند نہیں ہے بلکہ اس کے حصول کے لیے کوشش کرنا بھی واجب ہے، اسلامی حکومت کے قیام کے لیے تمکن و اقتدار حاصل کرنا شرعی ذمہ داری ہے۔ تمام مسلمانوں خصوصاً اسلامی رہنماؤں کا فریضہ ہے کہ حکومت اسلامی کی تشکیل کے لیے میدان ہموار کریں اور امکانات کی فراہمی کے لیے جد و جہد کریں۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ امکانات دو قسم کے ہوتے ہیں، مادّی اور معنوی، مادّی امکانات سے مراد افراد و اسلحہ، لشکر و سپاہ نیز دیگر اسباب و وسائل ہیں۔ معنوی امکانات سے مقصود مسلمانوں کے اعتقادات کی اصلاح، ان کے درمیان اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت اور دینی فرائض کی پابندی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے اپنے دور رسالت میں مادّی امکانات بھی فراہم کئے اور معنوی حالات بھی فوج و لشکر بھی تیار کیا اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے آراستہ بھی کیا، اگر مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا تو دوسرے ہاتھ میں تلوار بھی تھی، اگر محراب عبادت میں خوف خدا سے بید کی طرح لرزتے تھے

تو میدان جنگ میں شیر ژیان کی طرح بڑھ بڑھ کر حملے بھی کرتے تھے اور سیسہ پلائی دیوار کے مانند جم کر دشمن کے حملوں کا منہ توڑ جواب دیتے تھے۔

حضرت علی علیہ السلام کے سوا دیگر ائمہ معصومین علیہم السلام کو مادی امکانات فراہم کرنے کا موقعہ نہ مل سکا لیکن معنوی امکانات کامیابی کے ساتھ فراہم کرتے رہے، غیبت کبریٰ کے دور میں بھی فقہائے اسلام مادی امکانات فراہم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن معنوی میدان میں درخشاں کامیابیاں حاصل ہوئیں، آج خوشی کا مقام ہے کہ اسلامی انقلاب کی ظفر مندیوں نے مسلمانوں کو مادی و معنوی دونوں امکانات سے مالا مال کر دیا ہے۔

(۴)

اہم نکتہ یہ ہے کہ مادی امکانات کے فقدان کو بہانہ بنا کر ائمہ ہدیٰ اور ان کے پیرو فقہاء خاموش بیٹھے نہ رہے بلکہ مومنین کے عقیدے کو مستحکم اور معنوی امکانات فراہم کر کے حکام جور کا مقابلہ کرتے رہے، ائمہ طاہرین علیہم السلام مومنین کو حکام جور کی جانب رجوع کرنے سے منع کرتے تھے۔ حکومت وقت کے قاضیوں اور امیروں پر اعتماد کرنے سے روکتے تھے، ائمہ نے ہر دور میں اپنی جانب سے قاضی و حاکم معین کیے جو مومنین کے مسائل کی نگرانی ان کی مشکلوں کا تدارک اور ان کے اختلافات کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔

ابو خدیجہ، امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا :-

ایاکم ان یحاکم بعضکم بعضاً الی اھل الجور ولکن انظروا الی رجل منکم یعلم شیئاً من قضائنا فاجعلوہ بینکم فانی قد جعلتہ قاضیا فتحاکموا الیہ۔ (وسائل الشیعہ ج ۱۸، ص ۴)

امام صادق علیہ السلام اس حدیث میں واضح الفاظ میں حکام جور کی اطاعت سے منع فرماتے ہوئے حکومت جور کے مقابلہ میں مومنین کو ایک دوسری حکومت کی دعوت دیتے ہیں۔

آپ ہی سے ایک اور روایت ہے:

.... من تحاکم الیھم فی حق اوباطل فانما تحاکم الی الطاغوت .... من کان منکم قد روی حدیثنا ونظر فی حلالنا وحرامنا وعرف احکامنا فلیرضوا بہ حکما فانی قد جعلتہ علیہ

حکما۔ (وسائل الشیعہ ج۱۸، ص۹۹)

ان احادیث سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ائمہ ہدیٰ ان اضطراری حالات میں بھی حکومت جور کے مقابلہ میں ایک غیر مرئی حکومت تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے تھے، یہ حدیثیں ہمیں سبق دیتی ہیں کہ مادی امکانات کے فقدان کو بہانہ بنا کر خاموش بیٹھ رہنا مسلمانوں کے شایان شان نہیں بلکہ اس صورت میں معنویات کے ذریعہ مادی امکانات کی فراہمی کے لیے کوشش ضروری ہے۔

(۵)

البتہ کسی بھی تحریک یا حکومت کی تشکیل کے لیے دو چیزیں بہت ضروری ہوتی ہیں، نظریہ اور نمونۂ عمل مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے پاس یہ دونوں چیزیں موجود ہیں قرآن و سنت کی شکل میں ایک جامع نظریہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، رہا نمونۂ عمل تو خدا کا لاکھ شکر ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں بٹ جانے کے باوجود ان کے پاس حکومت کے کچھ ایسے نمونۂ عمل موجود ہیں جن پر تمام مسلمانان عالم کا اتفاق ہے اور ایک متحدہ الٰہی حکومت کی تشکیل کے لیے بہترین نمونۂ عمل اور مشعل راہ بن سکتے ہیں، خود پیغمبر اسلامؐ اور پھر حضرت علیؑ کے طرز حکومت سے کس مسلمان کو اختلاف ہو سکتا ہے؟ سرکار دو عالمؐ اور علیؑ ابن ابی طالبؑ کی حکومتیں بہترین شاہد ہیں کہ اسلام میں وسیع پیمانے پر حکومت چلانے کی صلاحیت موجود ہے۔

مسلمانو! تمہارے پاس نظریہ بھی ہے اور نمونۂ عمل بھی، پھر یہ جمود کیا معنی رکھتا ہے؟ غیر اللہ کی غلامی کیوں؟ شرق و غرب کی کاسہ لیسی کا کیا سبب ہے؟ اسلامی حکومت کی تشکیل کی راہ میں پائی جانے والی رکاوٹوں کو دور کیوں نہیں کرتے؟

یہ ایسے سوالات ہیں جن کا حل تلاش کرنے کے لیے اسلامی انقلاب کی ساتویں سالگرہ کے موقعہ پر سازمان تبلیغات اسلامی نے فکر اسلامی کی چوتھی کانفرنس کا انعقاد کیا، دانشوران امت علماء اسلام دور دراز کا سفر کر کے اس کانفرنس میں شریک ہوئے، شیعہ سنی، سیاہ سفید عرب عجم ایک جگہ پر جمع ہوئے، اپنے نظریات سے دوسروں کو نوازا، دوسروں کے افکار سے خود استفادہ کیا، مل جل کر ایک لائحۂ عمل تیار کیا، انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب روئے زمین پر طاغوتی حکومتوں کے بجائے الٰہی حکومتیں قائم ہوں گی۔ الیس الصبح بقریب۔
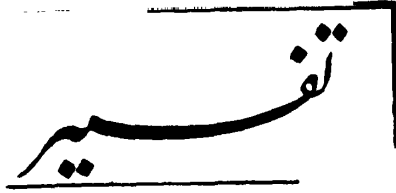
- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ:

لوگوں میں ایک شخص ایسا بھی ہے جو اپنا نفس اللہ کی رضا کے عوض بیچتا ہے، اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے۔ (۲۰۷)

تفسیر:

حج کے دوران دو قسم کے مسلمانوں کے نفسیات عیاں ہوئے (الف) دنیا طلب (ب) دین و دنیا دونوں میں حسنہ چاہنے والے۔ اسی ضمن میں دو آدمی عام معاشرے میں پہچنوائے جا رہے ہیں۔ (الف) اسلام کے نام پر اقتدار چاہتے اور اقتدار کے بعد ظلم ڈھانے والے (ب) اسلام و رسول اسلام پر جان نثار کرنے والا اور صلے میں فقط اللہ کی رضا چاہنے والا۔

قریش مکہ نے آخری منصوبہ بنایا اور پیغمبر سے مکمل سوشل بائیکاٹ کر دیا۔ حضرت ابوطالب و خدیجہ سلام اللہ علیہما نے جان کی بازی لگائی اور پیغمبر کی حفاظت کی، شعب ابوطالب کا محاصرہ معجزانہ طور پر ٹوٹا، دیمک نے حلف نامہ چاٹ لیا۔ مگر ضدی قوم چین سے نہ بیٹھی، ابوطالب کا ڈر تھا وہ راہی ملک بقا ہوئے، ام المومنین خدیجہ بھی رحلت فرما گئیں، دشمنوں نے گھر میں گھس کر قتل کا فیصلہ کیا، سب قبیلے متفق ہو گئے، ایک ایک نمائندہ ہر قوم کا شمشیر بکف گھر گھیر کے کھڑا ہو گیا، رات ہو گی تو اندر گھس کر قتل کر دیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ نے حضرت علیؑ سے فرمایا۔ تم میرے بستر پر سو رہو، میں جا رہا ہوں، جب موقع ملے تو خواتین کو لے کر مدینے آجانا۔

دشمن، دیکھتے رہے کہ محمدؐ کا بستر ہے محمدؐ کا فرش و چادر ہے، محمدؐ سو رہے ہیں۔ اچھا رات گذر رہے، یہ جائیں گے کہاں؟ قتل کر لیں گے، صبح جو ہوئی تو بستر سے کروٹ لے کر علیؑ اٹھے۔ سب ہکا بکا رہ گئے۔ پوچھا ــ محمدؐ کہاں ہیں؟ علیؑ نے جواب دیا تو سب کے منہ بند اور رنگ اڑ گئے۔

...ات کو دشمنوں سے علیؑ کو بچانا، خدا کا کام تھا، علیؑ کا بستر پر جانا ایثار کی معراج تھی۔ غزالی نے
...حیاء العلوم میں اس پر بحث کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں سوچ رہے ہو گے
...جبرئیل نے پیغام دیا اور بھائی کی سلامتی و جاں نثاری کی مدح کی حضرت علیؑ کو صاحب مرضات الہی
...بنا کر ولی امر بنا دیا۔ للہیت کے اس مرتبے پر وہ لوگ کہاں پہنچ سکتے ہیں جن کی جان فروشی کا
مقصد جنت ہو۔ ؟ یہاں تجارت کا معاملہ ہے، اللہ جیسا غنی خریدار اور علیؑ جیسا بندہ، بایع،
قیمت ملی "رضا" اس کی حد یا خدا جانے یا علیؑ یا علیؑ کے ولی، رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ۔

یہاں مقصد آیت ہدایت ہے کہ علیؑ کے ہوتے ہوئے نبی کے بعد پریشان ہونے کی بات نہیں
...تکمیل دین کا انتظام ہو چکا ہے۔

یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝

ترجمہ:

ایمان لانے والو! سب مل کر صلح و سلامتی میں داخل ہو جاؤ، اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو، بے شک و شبہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے (۲۰۸) اور اگر ان روشن آیات (و بیانات) کے بعد بھی تم لڑکھڑائے تو یقین رکھو کہ یقیناً اللہ قوت و حکمت کا مالک ہے (۲۰۹) کیا وہ انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ بادلوں کے سایے میں ان کے پاس

آئے اور فرشتے آئیں اور معاملہ تمام ہوجائے۔ حالانکہ سب چیزوں کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے (۲۱۰)

تفسیر:

۲۰۸۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً ....

آیت نمبر دو سو سات میں جس شخص کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ اسی کے لیے یہاں ہدایت ہے، کہ سب اہل اسلام اس کی ولایت مانیں۔ امن و سلامتی اسی میں ہے۔ یہی صراط مستقیم ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے شیطان کی راہوں پر چلنے کا جواز کوئی نہیں۔

۲۰۹۔ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْکُمُ الْبَیِّنٰتُ ....

اللہ کے روشن دلائل آجانے کے بعد، اس کی حجت تمام ہوچکی اب اگر کسی کے قدم ڈگمگائے تو پھر اللہ کی گرفت سے نہیں نکل سکتے۔

۲۱۰۔ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ ....

قرآن مجید کی اتنی مفصل ہدایتوں اور رسول اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ کی اس قدر مستحکم تبلیغ کے بعد شک، تو وہی بات ہے جو بنی اسرائیل کے ہٹ دھرم کیا کرتے تھے۔ یہ مطالبہ کہ "اللہ خود آجائے، ملائکہ کو خود دیکھیں۔ اچھا، بات ختم ہوچکی اب تو روز حساب و کتاب کی تیاری کرو یقین رکھنا چاہئے کہ نہ تو اب کوئی نبی و رسول آئے گا نہ کوئی دین و شریعت بھیجی جائے گی۔

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ

مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۞ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

ترجمہ:

بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے ان کو کتنی روشن نشانیاں دیں، اور جو بھی اللہ کی نعمت کو، اپنے پاس آنے کے بعد بدلتا ہے۔ (وہ یاد رکھے) یقیناً اللہ سخت عقاب والا ہے (۲۱۱) کافروں کے لیے زندگانی دنیا حسین بنائی گئی ہے۔ اور (وہ دنیادار) اہل ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں، حالانکہ اہل تقویٰ قیامت کے دن ان (دنیاداروں) سے بلند مرتبہ ہوں گے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے (۲۱۲)

تفسیر:

۲۱۱- سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ....

گذشتہ تاریخ سے سبق یہودیوں کے ماضی سے عبرت لینا چاہئے، کیسے کیسے نبی انھیں دیے گئے، کیسی کیسی نعمتوں سے انھیں نوازا گیا مگر ان لوگوں نے دلیلوں کو ٹھکرایا، نعمتوں کو ضایع کیا، آخرکار ذلت و عذاب سے دوچار ہوئے۔ مسلمان کے لیے اتنی یاد دہانی بدکرداریوں سے بچنے کے لیے بہت ہے۔

۲۱۲- زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ....

عقل انسانی کی آزمائش کے لیے دنیا دلکش بنائی گئی ہے۔ امتحان کے نتیجے میں اہل ایمان فریفتۂ حسنِ عالم نہیں ہوتے وہ کانٹوں سے بچ کے نکل جاتے ہیں، کافر، دنیا کو آغوش میں لے کر دین سے رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ اور اپنی غلطی چھپانے کے لیے اہل ایمان پر حملے کرتے ہیں، ان کا مذاق اڑاتے ہیں، ان کی غربت پر ہنستے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ معاشی خوشحالی و بدحالی معیار بلندی انسان نہیں، بنیادی بات ہے تقویٰ، اسی معیار پر خدا کے حضور میں اعزاز ملے گا۔ آیت میں ایمان کو تقویٰ سے بدل کر یہ سمجھایا گیا ہے کہ عقیدہ بلا عمل فائدہ مند نہیں ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

ترجمہ:

سب انسان ایک امت تھے (پھر آپس میں پھوٹ پڑی) تو اللہ نے پیغمبر بھیجے، خوش خبری دینے والے اور عذاب سے ڈرانے والے، اور ان کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تاکہ جن باتوں میں وہ اختلاف کریں وہ حق کا فیصلہ کرے۔ پھر اس میں اختلاف ان ہی لوگوں نے ڈالا جن کو وہ کتاب دی گئی تھی۔ یہ اس کے بعد ہوا کہ ان لوگوں کے پاس توضیحات آچکے تھے۔ باہمی سرکشی کی بنا پر۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے کرم سے اہل ایمان کو راہ حق دکھادی جس میں لوگوں نے اختلاف پیدا کردیا تھا اور اللہ جس کو چاہے اسے صراط مستقیم کی ہدایت فرماتا ہے (۲۱۳)

تفسیر:

امت: یہ کلمہ بطور مفرد کم از کم باون آیتوں میں آیا ہے۔ اور اس کے معنی ہیں: قوم۔ ملت۔ وہ گروہ جسے زمان و مکان و زبان و فکر میں ہم آہنگی ہو۔ متحد العقیدہ لوگ۔ ایک دبستانِ فکر کے ماننے والے۔

آدم علیہ السلام کی اولاد زمین پر کچھ عرصے تک سادہ زندگی کے ساتھ اکائی میں رہی، سب ہم خیال و ہم قدم تھے، ایک نہ ایک الٰہی رہنما انھیں نشیب و فراز سے باخبر کرتا رہا۔ افراد بڑھے تو

عمرانی و معاشرتی تقاضے بدلے، سماج ابھرا تو افراد کے خواہشات و جذبات میں تلاطم و تصادم کی کیفیت پیدا ہوئی، اختلافات پیدا ہوئے تو قانون کی ضرورت سامنے آئی۔ علیم و حکیم خالق نے قانون بنا کر اسے نافذ کرنے والے بھیجنا شروع کر دیے۔ اور حضرت نوحؑ پہلے اولوالعزم پیغمبر ہوئے۔ اگر اللہ قانون نہ بناتا اور یہ کام افراد انجام دیتے تو فرد ہو یا جماعت کوئی بھی مفادات اور وقتی رجحانات سے ضرور متأثر ہوتی، نتیجتاً انسانی قانون عادلانہ ہونے کے بجائے استحصالی ہوتا جس کا تجربہ حکومتیں اور عوام کرتے رہتے ہیں۔ اللہ کا قانون سب کے لیے یکساں اور عادلانہ ہے اس قانون کو لانے والے معصوم نبی و رسول و امام، خواہشات سے پاک اور حق و انصاف کے علم بردار رہے۔ انھوں نے ہمہ گیر نظام۔ دین اسلام کو عملی بنایا مگر خود غرض لوگوں نے دین کا لبادہ اوڑھ کر طمع ریاست کی خاطر آسمانی قانون میں دیدہ دلیری دکھائی، دوسروں کو دبانے اور اپنی بڑائی جتانے کے لیے کتاب خدا میں تحریف کر کے دین میں خلل ڈالنے کی سعی بے جا کی۔ اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ ظلم سہتا، حق کی آواز اٹھاتا، انبیا کی راہ چلتا رہا۔

آیت میں انسانوں کی فطری اکائی اور دین کی ضرورت و حقیقت بیان ہوئی ہے۔ قانون بنانے کا حقدار اللہ کو بتا کر یہ نکتہ پھر روشن کیا ہے کہ قانون و حکومت اللہ کی ہے۔ انسانی و معاشرتی نشو و نما کے ساتھ دین ہی سماجی انصاف کا ضامن ہے۔

نہج البلاغہ میں ہے: فبعث فیھم رسلہ و واتر الیھم انبیاءہ، اللہ نے انسانوں میں اپنے رسول بھیجے، یکے بعد دیگرے نبی آئے، لیستادوھم میثاق فطرتہ و یذکروھم منسیّ نعمتہ۔ تاکہ یہ حضرات انسانوں سے فطرت کے پیمان پورے کرائیں اور بھولی نعمتیں انھیں یاد دلائیں۔ و یحتجّوا علیھم بالتبلیغ۔ حکم خدا پہنچا کر، ہر بات پر عمل کر کے حجت تمام کر دیں۔ و یثیروا لھم دفائن العقول.... اس کوشش کے ذریعہ وہ عقل سلیم کی دبی ہوئی قوت کو ابھارنے آئے تھے.... بشارت و نذرات کا مطلب یہ تھا کہ صراط مستقیم پر چل کر نوع بشر ایک راہ اور ایک منزل اور نصب العین اور ایک معبود کی پرستار بنی رہے۔ جہاں بھٹکے وہاں اہل ذکر سے رجوع کرلے۔ وہی لوگ قافلے کے قائد ہیں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ

اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝

ترجمہ:

کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں (ضرور) جاؤ گے، حالانکہ تم پر ویسی نہیں پڑی جیسی تم سے پہلی (امتوں) پر پڑی، ان کو غربت (بدحالیوں) اور مرض و زخم (بیماریوں) نے ستایا، اور (اس قدر) جھنجوڑے گئے کہ رسولؐ اور ان ایمان لانے والے ساتھیوں نے کہا۔ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ سنو! اللہ کی مدد قریب ہے (۲۱۴)

تفسیر:

ایمان کے دعوے پر جنت ملنے کا یقین بے اساس بات ہے، دعوے کے بعد امتحان سے گذرنا ضروری ہے، کس قسم کی آزمائش؟ اس کے لیے اہل ایمان کی تاریخ، اور انبیاء و مرسلین کے سوانح دیکھو کہ کیسے ان پر فقر و فاقہ، جنگ اور کافرانہ حملوں، جسمانی اور ذہنی دکھوں کی یلغار ہوئی کہ ان کا وجود کانپ کانپ گیا، اور انھوں نے عاجزانہ لہجے میں کہا: اللہ! تیری مدد کب آئے گی۔ پھر ان کے ایمان اور اللہ نے یقین دلایا کہ مدد آنے ہی والی ہے۔

آیت کا نزول بعض مفسرین کے نزدیک جنگ احزاب میں ہوا ہے جب محاصرہ دیکھ کر لوگ گھبرا کر بھاگ گئے تھے بعض کے نزدیک جنگ احد کے نازک مرحلے میں اللہ نے ہمت افزائی کی اور آیت آئی۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ

اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ وَالۡيَتٰمٰى وَ
الۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ‌ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ
اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ﴿۲۱۵﴾

ترجمہ:

(اے رسول) آپ سے پوچھتے ہیں کیا چیز (کہاں اور کتنی) خرچ کریں؟ آپ ان سے کہیے، تم جو مال بھی خرچ کرو، تو والدین کے لیے، رشتہ داروں کے لیے، اور یتیموں کے لیے اور محتاجوں کے لیے، اور مسافروں (پردیسیوں) کے لیے۔ اور جو نیکی بھی کرو گے اس کا علم خدا کو یقیناً ہے۔ (۲۱۵)

تفسیر:

کہتے ہیں یہ سوال "عمرو بن جموح" نے کیا تھا۔ مگر آیت میں جو پھیلاؤ اور ارشاد باری میں جو رہنمائی ہے وہ زمان و مکان سے محدود نہیں ہے۔ جب بھی دل میں کسی سے بھلائی کرنے کا خیال آئے اور خالص اللہ کی خاطر خیر خیرات کرنے کی خواہش ہو کوئی سرمایہ، کوئی فائدہ رسانی مقصود ہو تو، صلۂ رحم کا لحاظ رہے، ماں باپ، دادا، دادی، نانا نانی سب سے مقدم ہیں۔ اس کے بعد دوسرے رشتے دار کہ ان کی خوشی و خوشحالی سے قریبی ماحول خوشگوار ہوتا ہے۔ یتیم بھی فراموش نہ ہوں، معاشرے میں ان کی عزت و حیثیت کی ذمہ داری کار خیر کرنے والوں پر ہے۔ غریب و تنگدست افراد بھی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں وہ معاشرہ بد ترین معاشرہ ہے جہاں ایک خاندان پیٹ بھر کے سوئے اور سو بھوکے رات تڑپ تڑپ کر بسر کریں۔ راستے میں تہی دست مسافر اور اجنبی بستی میں پھنسے ہوئے راہی بھی قابل امداد ہیں۔ یہ سب افراد معاشرے کے اہم اور قابل توجہ لوگ ہیں۔ خدا کی رضا اور بندے کی محبت اس کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جو خیر اور بھلائی کی جاتی ہے اللہ عز اسمہٗ اس کی نوعیت و نیت سے باخبر ہے وہ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا۔

كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ وَهُوَ كُرۡهٌ لَّكُمۡ‌ۚ

وَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا شَيْـًٔا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰٓ أَن تُحِبُّوا شَيْـًٔا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ:

(مسلمانو!) راہِ خدا میں جہاد تم پر فرض کیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں شاق ہے۔ اور ہوسکتا ہے کوئی چیز تمھیں بری لگے اور وہ تمھارے حق میں اچھی ہو۔ اور ہوسکتا ہے ایک چیز تم کو اچھی لگے اور وہ تمھارے حق میں بری ہو۔ اور (اصل میں تو) اللہ جانتا ہے اور تم (حقائق سے) ناواقف ہو (۲۱۶)

تفسیر:

مال محبوب چیز ہے اللہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی رضا کے مطابق خرچ ہو۔ جان اس سے زیادہ پیاری ہے، اللہ امتحان لیتا ہے کہ اس کے حکم پر سر دینے والا کون ہے۔ لہٰذا جہاد فرض کیا ہے۔ مسلم و مومن و متقی کے لیے تو ہر حکم برابر ہے مگر بر خود غلط افراد اگر اس ادھیڑبن میں پڑیں کہ جان کا معاملہ ہے، بدامنی اور تباہی کوئی اچھی چیز نہیں؟ اول تو خلاقِ علیم و حکیم کا فیصلہ بشریت کے لیے ہمیشہ فائدے پر مبنی ہوتا ہے، انسان کوتاہ نظر حقائق کو سمجھنے اور بات کی تہہ تک پہنچنے کی قابلیت کہاں رکھتا ہے، اور اگر سمجھتا ہے تو یوں سمجھو کہ آج کی خون ریزی کل بہار لائے گی، اور آج کی جنگ کل اسلام کو حیاتِ جاوداں بخشے گی۔ جہاد جان و مال کا مسئلہ نہیں، اللہ کی حاکمیت اور اسلام کی بقا کا ضامن ہے جہاں صرف جان و مال کی بات ہے وہاں دفاع ہے۔ جہاد، روزہ و حج کی طرح بندگی اور گردن نہادن بہ طاعت کی بات ہے۔

تمھاری ناپسند بات، تمھارے ہی لیے مضر اور تمھاری ناپسند چیز تمھارے ہی لیے مفید ہوسکتی ہے۔ ایک منطقی کلیہ ہے۔ اور دوسرا کلیہ ہے کہ "اللہ سب کچھ جانتا ہے اور ہم کچھ نہیں جانتے"۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو غلط اندیش اپنی پسند کو اللہ کی رضا پر ترجیح دیتا ہے وہ دو غلطیاں کرتا ہے پہلے تو وہ اپنی حد و حقیقت سے آگے بڑھتا ہے۔ دوسرے وہ اپنے معبود کی

بات نہیں مانتا۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ
قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ
مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ
عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ
عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ
إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ
أُولٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۲۱۸)

ترجمہ:

یہ لوگ آپ سے حرمت والے مہینے میں جہاد کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیں،
جنگ اس میں سنگین بات ہے۔ اور (یاد رہے) اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا،
اور اللہ سے انکار کرنا، اور مسجد الحرام سے روکنا، وہاں والوں کو اس سے نکالنا۔ اللہ کے نزدیک جنگ سے
بھی بڑھ کر گناہ ہے اور وہ (کفار) تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے۔ یہاں تک
کہ یہ لوگ تم کو تمہارے دین سے واپس لوٹا دیں۔ اور (خبردار) تم میں جو بھی
اپنے دین سے پھرا اور کافر ہو کر مرا۔ ایسوں کے دنیا و آخرت میں اعمال حبط ہوں گے۔
اور ایسے لوگ جہنمی ہیں، وہ اسی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۱۷) بے شک جو ایمان

لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا، وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے (۲۱۸)

تفسیر:

۲۱۷- يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ......

آنحضرت ؐ نے اپنے پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن جحش کو جنگ بدر سے دو مہینے پہلے طائف اور مکے کی شاہراہ پر قریش کے حمل و نقل کی نگرانی کے لیے بھیجا، ان کے ساتھ آٹھ جوان تھے، قریش کا قافلہ رسد لے کر پلٹا تو مسلمانوں نے چک کرنا چاہا وہ نہ مانے تو جھڑپ ہوگئی، عمرو خضرمی مارا گیا، کچھ لوگ گرفتار ہوئے اور مسلمان کچھ سامان لے کر مدینے واپس آئے۔ آنحضرت ؐ نے قیدی اور مال واپس کردیا۔ مگر قریش اور ان کے ہمدردوں نے یہ سوال اٹھایا کہ حرمت والے مہینے میں جنگ جائز ہے یا نہیں، کیونکہ حملے کے بعد والی شام کو رجب کا چاند دیکھا جا چکا تھا۔

وحی نے اس کے جواب میں چند اصولی باتیں بتائیں ۔ "شہر حرام" کا پروپیگنڈا کرنے والے جانتے ہیں کہ ہم بھی ایسے مہینوں میں جنگ کو اچھا نہیں سمجھے، مگر "فتنہ و فساد" کو اس سے بدتر جانتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جب سے دعوت اسلام کا آغاز ہوا ہے قدم قدم پر اسے روکا جا رہا ہے پوری شدت سے اسے جھٹلایا جا رہا ہے۔ مسجد الحرام (جس کی حرمت سب تسلیم کرتے ہیں) بے حرمتی کا نشانہ ہے۔ نبی مکرم ؐ گیارہ سال تک اس شہر امن میں ہر قسم کے ظلم کا نشانہ بنتے رہے ان کے اصحاب و اہل بیت ان کا خاندان اور ان کی اہلیہ پر کیا کیا ستم نہ ڈھائے گئے، مسلمانوں کا رہنا دوبھر ہوا تو وہ حبشہ ہجرت کرگئے۔ آخر کار رسول ؐ کو اللہ کا شہر چھوڑنا پڑا۔ اتنے بڑے بڑے جرائم کے بعد اب تم مدینے میں گھس کر مسلمانوں کو تباہ کرنا چاہتے ہو اس پر بھی مسلمان کوئی حفاظتی اقدام نہ کریں؟ تو پھر سن لو "فتنہ و فساد" کو برداشت نہیں کیا جائے گا (دیکھیے آیت ۱۹۱) ۔ اگر اخلاق اور دلائل سے نہ مانو گے تو حفاظتی اور سخت جوابی اقدامات کیے جائیں گے۔

آخر میں مسلمانوں کو استقلال اور دشمن سے نہ ڈرنے کی تلقین اور دین سے منحرف ہونے پر تنبیہ و سرزنش ہے۔ اور یہ کہ مرتد کا سارا عمل رائیگاں جائے گا اسے جہنم میں ہمیشہ

رہنے کی سزا ملے گی۔

۲۱۸۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا ....

ثابت قدم مومن اور ایثار پیشہ مہاجر اگر بھولے سے کوئی غلطی کر گذریں تو اللہ کی رحمت ان کا ساتھ دے گی وہ اپنے اعتقاد و جاں فروشی کے بدلے بخشے جائیں گے اور انعام پائیں گے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾

ترجمہ:

لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے۔ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کو فائدے بھی ہیں۔ اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔ اور وہ پوچھتے ہیں۔ کیا خرچ کریں ؟ آپ کہہ دیجئے (معتدل) ضرورت بھر۔ اللہ، اسی طرح تمھارے لیے احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم غور (و فکر) کرو ﴿۲۱۹﴾

تفسیر:

جوے اور شراب کا حکم پوچھا گیا اور بظاہر اس کے فوائد کا بیان بھی سوال کا جزو تھا۔ آج بھی سوال فوائد کا ضمیمہ بناکر پیش کیا جاتا ہے۔ جواب ملا کہ شراب حرام ہے جوا حرام ہے۔ رہے فائدے تو

لے حدیث نبوی ہے: ہر نشہ آور حرام ہے اور ہر نشہ آور خمر ہے۔ امام جعفر صادقؑ و امام موسی کاظمؑ و امام رضاؑ

ان کی سماجی، اقتصادی اور عقلی تباہ کاری دیکھو اور اپنے وہمی فائدوں کا ان سے مقابلہ کرو۔ دنیا کے وہ حصے جہاں ان کی چھوٹ ہے، وہ قومیں جو ان کی عادی ہیں، ان کی بے حیائی، بد اخلاقی اور معاشرتی گراوٹوں نے خود ان کی حکومتوں اور خاندانوں کو یا تو جنگلی بنا دیا ہے یا پھر وہ سخت ترین پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ جیلوں، تھانوں اور اسپتالوں میں دیکھ لیجئے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو نشے باز اور جواری ہوں گے۔

دوسرا سوال، کیا خرچ کریں؟ آیت ۲۱۵ میں یہ سوال اور جواب گذر چکا، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سائل کا مقصد محل استعمالِ مال نہیں، بلکہ کیفیت استعمال ہے، بخل کی مذمت ہے۔ اسراف بُرا ہے پھر آدمی کیونکر خرچ کرے؟ جواب ملا: عفو۔ معتدل۔ جہاں جتنی ضرورت وہاں دین و دنیا دونوں کو سامنے رکھ کر خرچ کرو۔

اور مسلمانوں کے لیے قرآن میں جو احکام بیان ہوئے ہیں ان کے جو اثر زندگی پر مرتب ہوتے ہیں، اس کے جو فوائد دین و دنیا میں حاصل ہوں گے ان پر غور کرو، فکر کے دروازے بند نہ کرو۔ سوچو گے تو عقل روشن اور بندگی کامل ہوگی۔

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ
الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ

ے روایت ہے کہ جو کی شراب "فقاع" خمر ہے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی حدیث ہے "میسر" جوے کو کہتے ہیں۔ مائدہ آیت ۹۰ تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر آلاء الرحمن۔

العفو: حدیث صادق میں "وسط، یعنی بخل و اسراف میں متوسط خرچ۔ دوسری روایت کے مطابق اس کے معنی ہیں کفاف، ۔ بقدر کفاف۔ بعض لوگوں نے زائد از خرچ، بچت کے معنی لکھے ہیں۔ بعض نے عفو کو افضلِ اقسام مال کہا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَأَعْنَتَكُمْ ۚ

إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۲۰﴾

ترجمہ:

اور آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے (ان کے لیے اصلاح احوال) ان کے حالات سنوارنا، بہتر ہے۔ اور اگر (زندگی اور) خرچ مل جل کر کرو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ اور اللہ، فسادی کو خیر خواہ سے جدا جانتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم پر (زحمت و) مشقت ڈالتا۔ بے شک اللہ بااقتدار ہے حکمت والا ہے۔ (۲۲۰)

تفسیر:

یتیم بچے خاندان یا معاشرے کے لیے بڑے کارآمد سمجھے جاتے تھے، غلاموں کی طرح خدمت، مزدوروں کی طرح بلا اجرت کام لیتے تھے، اور اگر باحیثیت یتیم نظر آیا تو اس کا مال اڑا لیتے تھے۔ آج بھی بہت سے معاشروں میں یہ عمل جاری ہے۔ قرآن مجید نے بڑی سختی سے اسے روکا، ان کا مال کھانا اور انگارے نگلنا برابر قرار دیا (النساء- ۱۰) خیر خواہی کے جذبے سے خالی ہو کر ان کے مال کو قریب سے دیکھنا ممنوع کیا (اسرا / ۲۴) مسلمانوں نے حضور سے ہدایت چاہی کہ سرکار یتیموں کے بارے میں طریق کار کیا ہونا چاہیے؟ اللہ نے فرمایا۔ یتیموں سے تمھارا سلوک خیر خواہانہ رہے۔ باپ سے محرومی کی بنا پر وہ ناکام زندگی سے دوچار نہ ہونے پائیں، مل جل کر رہو، اپنا اور ان کا پیسہ ملا کر خرچ کر سکتے ہو، مگر برابری کی سطح پر، خاندان اور دین کے رشتے سے بھائی سمجھ کر، اپنے تئیں آقا انھیں غلام سمجھ کر نہیں، جو اپنے لیے پسند کرو۔ وہی ان کے لیے پسند کرو۔ اس سلسلے میں اصلاح احوال اور محبت و خیر خواہی بہرحال پیش نظر رہے۔ چونکہ اللہ عزیز و حکیم ہے اس لیے وہ فسادی و خیر خواہ، ہمدرد اور موقع پرست کو خوب جانتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو سخت سے سخت حکم جاری کرتا۔ مگر وہ اپنے احکام کے سلسلے میں مکمل طور پر سر تسلیم خم دیکھنا چاہتا ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ
وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا
الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ
وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ
وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

ترجمہ:

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور یقیناً مسلمان کنیز مشرک (آزاد) عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں اچھی (کیوں نہ) لگے۔ اور مشرک مردوں سے شادی نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور بہرحال مسلمان غلام مشرک سے اچھا ہے چاہے وہ (مشرک) تمہیں پسند ہی ہو ــ وہ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی عنایت سے بہشت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور اپنے احکام لوگوں کو بتاتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۲۱﴾

تفسیر:

شریک حیات، خاندان کی بنیاد ہے، نئی نسل کی فکری، عملی و اخلاقی نشو نما اس کے ہاتھوں انجام پاتی ہے۔ معاشرا اور دبستان کی بات ابھرتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے زن و مرد کے عقائد اگر متضاد ہوں تو ماحول میں توازن نہ رہے گا، اللہ نے مسلم و مشرک کی شادی حرام قرار دی۔ دوسری طرف "لونڈی" اور "غلام" کو عقیدہ کی بنیاد پر شرف بخشا، دولت و حسن کو معیار ہمسری ماننے سے انکار کرکے کالے گورے کا فرق مٹایا۔ اور فرمایا "اولئک یدعون الی النار" مشرک کی منزل دوزخ اور اہل توحید کی آرام گاہ بہشت، دونوں ایک ساتھ کیسے رہ سکتے ایک راستہ کہاں چل سکتے ہیں۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي

الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ
حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ
نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا
لِأَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ وَبَشِّرِ
الْمُؤْمِنِينَ ۝

ترجمہ:

اور آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ ان سے کہیے: وہ ایک تکلیف (نجاست) ہے۔ لہٰذا زمانۂ حیض میں (ہمبستری نہ کرو) الگ رہا کرو۔ جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے پاس نہ جاؤ۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو جدھر سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے ان کے پاس آؤ۔ بے شک اللہ، توبہ کرنے والوں اور طہارت کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (۲۲۲) تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتی ہیں، تو اپنی کھیتی میں جب بھی چاہو آؤ۔ اور اپنے لیے آگے (آخرت) کی تدبیر کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور یہ جان لو کہ تمہیں اس کے حضور میں ضرور حاضر ہونا ہے۔ اور مومنوں کو خوشخبری سناتے رہیے (۲۲۳)

تفسیر:

۲۲۲۔ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ.......

عورتوں کی ماہواری، تین دن سے دس دن تک آتی ہے۔ اس زمانے میں عورت کے بارے میں دو رویے ہیں، کچھ قومیں اسے اچھوت سمجھ کر زندگی سے دور کر دیتی ہیں، کچھ قومیں عورت کی اس حالت کو دوسری حالت سے جدا نہیں سمجھتیں، اسلام نے کہا حیض ایک

طبعی عمل اور نسوانی تکلیف ہے۔
ایام حیض میں اس سے جنسی عمل نہ کرو۔ ان دنوں اس کے لیے مثلاً نماز و روزہ نہیں ہے کچھ اور فرائض و محرمات ہیں (جنھیں خواتین فقہ کی کتابوں میں ضرور دیکھیں) جب زوجہ پاک ہو جائے تو اس سے مقررہ شرعی قواعد کے مطابق ہمبستری کی اجازت ہے۔ غلطی کی صورت میں توبہ کے دروازے کھلے ہیں اور پاک مومن مرد و عورت کے لیے اللہ کی رحمت (پسند اور محبت) عام ہے۔

۲۲۳- نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ....
اسلام نے جنسی جذبات کو معتدل رکھنے کے لیے سب سے پہلے تو مرد و زن کے تعلقات کو نکاح کا پابند کیا، پھر نکاح کی غرض معین کی اور کہا کہ زن و مرد کا بندھن صرف شہوت پرستی کے لیے غلط ہے۔ بلکہ نئے رشتے کا مقصد اچھے انسان اور پختہ مسلمان نسل پیدا کرنا ہے۔
مرد کسان ہے، عورت زمین جیسی پاک اور امین کھیتی، اچھی تخم ریزی جس طرح سے ہو کرو پھر صحیح دیکھ بھال سے جو گود بھرے گی اور پھل ملیں گے ان سے دنیا میں حسن اور آخرت میں اجر ملے گا۔ آخر تم سب کو اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور وہاں کے لیے بشارتیں اور ثواب کی نعمتیں ہیں۔ رسول اللہ ؐ نے بشارت دی ہے:

اذا مات الانسان انقطع عمله الا عن ثلاث: صدقة جارية وعلم ينتفع به وولد صالح يدعو له

انسان مرتا ہے تو اس کا سلسلۂ عمل جس پر جزا و سزا کا استحقاق ہوتا ہے رک جاتا ہے۔ البتہ تین چیزیں فائدہ پہنچاتی رہتی ہیں۔ فلاح و بہبود انسان و مسلمان کے لیے خیرات وقف کر جانا۔ علمی آثار چھوڑنا جس سے مسلمانوں کو عملی و عقلی فائدے پہنچیں، اور صالح اولاد جو دعائے خیر میں یاد رکھے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ لَا يُؤَاخِذُكُمُ

اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیٓ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۲۲۵﴾

ترجمہ:

اور "اللہ" کو اپنی قسموں کے ذریعے روک نہ بناؤ کہ تم نیکی کرنے، پرہیزگاری برتنے، اور لوگوں میں باہم صلح کرانے سے باز رہو۔ اور اللہ سب کچھ سننے جاننے والا ہے ﴿۲۲۴﴾ تمہاری فضول قسم کی قسموں پر اللہ گرفت نہیں کرے گا۔ لیکن وہ ان قسموں پر گرفت کرے گا جو تم قصداً دل سے کھاؤ گے اور اللہ بخشنے والا، بردبار ہے ﴿۲۲۵﴾

تفسیر:

۲۲۴۔ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَةً ....

شریعت میں "حلف" اور "قسم" کی بڑی اہمیت ہے، اسلامی معاشرہ قول و قسم کا پابند ہوتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کو "قسم" کے بارے میں احتیاط برتنا چاہیے۔ نیکی اور تقویٰ اصلاحِ احوال یا متحارب لوگوں میں صلح کرانا اچھے کام ہیں۔ ان کاموں سے دور رہنے کی قسم کھانا اور قسم کو بھلائی کے لیے رکاوٹ بنانا ہرگز جائز نہیں ایسی قسم کا کفارہ واجب ہے، اور مطلوبہ امور انجام دینا ضروری ہیں۔

"اللہ" اسم جلالہ ہے، قسم میں ہر وقت اس کا استعمال "اللہ کی قسم" میں یہ نیکی اور تقوے یا اصلاح کا کام کروں گا۔ اچھا نہیں، اسم عظیم کی حرمت کا تقاضہ ہے کہ ایسی قسمیں نہ کھائی جائیں۔ ایسی قسمیں کھانے والے عذاب کے مستحق ہوں گے۔

۲۲۵- لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ ....

بلا وجہ تکیہ کلام یا بلا ارادہ و نیت کھائی جانے والی قسم مؤثر نہیں ہوگی اور غفور و حلیم اللہ اسے معاف بھی کرتا ہے لیکن اگر نیت صحیح سے اللہ کی قسم کھائی ہے تو اس کی گرفت ہے۔

آیت اللہ شہید باقر الصدر
نگارش: جناب سید حسین مرتضیٰ ایم۔ اے

تاریخ کی قرآنی تعبیر

قرآن حکیم کی بے شمار آیتوں میں فلسفۂ تاریخ یا سنتِ تاریخ کی فکر مختلف شکلوں اور گوناگوں انداز سے نمایاں نظر آتی ہے۔ نیز ان میں سے بعض آیتوں میں مختلف طرح کی جو سنتیں بیان ہوئی ہیں وہ ہمیں ایسے کلیات فراہم کرتی ہیں جن سے مجموعی طور پر ایک فلسفۂ تاریخ حاصل ہوتا ہے۔ پھر بعض آیتیں ایسے واقعات و مسائل بیان کرتی ہیں جو اپنی نوعیت کے حوادث و واقعات اور مصادیق پر منطبق ہونے کی استعداد رکھتے ہیں (گویا یہ واقعات و مسائل ایسے کلیات ہیں جن کی روشنی میں ہمیں ماضی کے حالات اور حال کے واقعات و حوادث کو سمجھنے اور ان کی حقیقی قدر و قیمت کے تعین میں مدد ملتی ہے)

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سلسلہ کی بعض آیتوں میں اس بات پر بے پناہ زور دیا گیا ہے کہ تاریخ کی سنت اور اس کی حقیقی روش کو سمجھنے نیز اس کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تاریخی شواہد کا گہرا اور استقرائی مطالعہ کیا جائے۔

نیز اس سلسلہ کی کچھ آیتوں میں اس فکر و فلسفہ کو مختلف پیرایوں اور سلیقوں سے بیان کیا گیا ہے۔

یہاں ہم ان میں سے بعض آیتوں کا مطالعہ کریں گے۔ چنانچہ ہم نے جن آیتوں کو اس وقت کی گفتگو کے لیے چنا ہے ان میں سے کچھ تو واضح طور پر اپنا مقصود بیان کر رہی ہیں لیکن کچھ مختلف طریقوں سے اس بات پر دلالت کرتی ہیں اور کچھ ایسی بھی ہیں جو بنیادی طور پر اس قرآنی فکر کی عمومی روح کی تائید و توثیق کرتی ہیں۔

اُمتوں کی اجل :

یعنی قرآن حکیم کی نظر میں تاریخ کی سنت و قانون یا فلسفۂ تاریخ ـــــ یا بالفاظ دیگر ـــــ تاریخ کی قرآنی تعبیر ـــــ :

الف : لکل امۃ اجل اذا جاء اجلھم فلا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون[1]

ہر قوم کے لیے ایک معین مدت اور اجل ہے کہ جب اس کی وہ مدت و اجل آجاتی ہے تو وہ نہ ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکتی ہے اور نہ آگے بڑھ سکتی ہے۔

ب : ولکل امۃ اجل فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔[2]

اور ہر قوم کے لیے ایک معین مدت اور اجل ہے چنانچہ جب اس کی وہ مدت و اجل آجاتی ہے تو وہ نہ ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکتی ہے اور نہ آگے بڑھ سکتی ہے۔

ان دونوں آیتوں میں اجل اور میعاد کو ذاتی طور پر کسی ایک فرد کے بجائے لوگوں کے مجموعی وجود یعنی "امت" سے منسوب کیا گیا ہے۔

گویا یہ آیتیں بتا رہی ہیں کہ جس طرح ہر انسان کے لیے انفرادی طور پر ایک معین اور محدود مدت اور اجل موجود ہے اسی طرح ان افراد کے اجتماعی وجود یعنی امت کے لیے بھی ایک اجل مدت اور میقات موجود ہے، جو اپنی صفت کے اعتبار سے ایسا اجتماع اور گروہ ہے جس کے افراد کے درمیان موجود تعلقات و روابط ان افکار و مبادی کی بنیاد پر ہوتے ہیں جو اس قوم کی مجموعی قوتوں اور استعداد سے ابھرتے ہیں۔

اس اجتماع، معاشرہ یا گروہ کے لیے جسے قرآن کریم "امت" کے لقب سے یاد کرتا ہے قرآن حکیم کی نظر میں :

ایک اجل ـــــ ایک موت ـــــ ایک زندگی ـــــ اور ـــــ ایک حرکت و تحرکت چنانچہ جس طرح ایک فرد جب تک متحرک رہتا ہے، زندہ رہتا ہے۔ پھر مر جاتا ہے۔ اسی طرح ـــــ امت بھی زندہ رہتی ہے پھر مر جاتی ہے۔

اور ـــ جس طرح فرد کی موت ـــ ایک اجل ـــ ایک قانون ـــ اور ـــ ایک ناموس ـــ کی تابع ہے۔

اسی طرح ـــ امتوں کے لیے بھی ـــ "اجل" ـــ اور ـــ ایسے "نوامیس" ـــ موجود ہیں جو ان کے لیے اس اجل کی حدبندی کرتے ہیں۔

یوں، یہ آتیں ہم کو ایک واضح اور شفاف کلی فکر دیتی ہیں کہ:

تاریخ میں ایسی سنتیں اور قوانین موجود ہیں جو اس پر حاکم ہیں ـــ نیز ـــ تاریخ پر حکومت کرنے والی یہ سنتیں اور قوانین ان سنتوں اور قوانین سے ماوراء ہیں جو افراد پر ان کی شخصی حیثیتوں میں حاکم ہیں۔

قرآن حکیم کی کچھ اور آیتوں میں اسی فکر کو ایک دوسرے اسلوب میں بیان کر رہی ہیں:

الف: وما اھلکنا من قریۃ الا ولھا کتاب معلوم ما تسبق من امۃ اجلھا وما یستاخرون۔[۳]

اور ہم نے جس آبادی کو بھی نیست و نابود کیا ہے، اس کے لیے تحریری طور پر معین و معلوم مدت موجود تھی اور کوئی بھی امت نہ تو اپنی اجل اور معین مدت سے سبقت لے سکتی ہے نہ ہی اس سے پیچھے رہ گئی ہے۔

ب: اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوات والارض وما خلق اللہ من شئ وان عسیٰ ان یکون قد اقترب اجلھم فبای حدیث بعدہ یومنون۔[۴]

تو کیا وہ ان چیزوں میں غور نہیں کرتے جو ملکوتِ سمٰوات و ارض میں ہیں اور جن چیزوں کو اللہ نے خلق کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان کی اجل قریب آ چکی ہو، تو یہ لوگ اس کے بعد اب کس بات پر ایمان لائیں گے۔!

ان آیتوں کے ظاہری معانی واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ اجل جس کے قریب ہونے کی امید ہے یا جس کی تہدید کی جا رہی ہے وہ فردی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔

کیونکہ، عام طور سے کسی بھی قوم کے سب کے سب افراد اکٹھا اور آن واحد میں نہیں مرتے بلکہ یہ
یا جماعت ہوتی ہے جو اپنے معنوی اور کلی وجود کے اعتبار سے اکٹھا اور آن واحد میں فنا ہو جاتی
اور ___ یہاں وہی جماعت، گروہ یا امت مراد ہو سکتی ہے جس کی اجل قریب آ چکی
یہاں ___ گروہی اجل سے مراد ___ اس حالت کا ختم ہو جانا ہے جو کسی معاشرہ یا قوم سے وا
ہے ___ یعنی ___ قوم و امت کی موت ___ اس حالت کا ختم ہو جانا نہیں ہے ___ جو ___
سے۔ انفرادی طور پر وابستہ ہوتی ہے۔

کیونکہ، جب ہم افراد پر ان کے انفرادی حالات کے لحاظ سے غور کرتے ہیں تو ہم دیکھ
کہ ان کی موتیں مختلف اوقات و حالات میں واقع ہوتی ہیں۔

لیکن ___ جب ہم ان پر اجتماعی لحاظ سے نگاہ کرتے ہیں ___ اور ___ ان کو ایک
مجموعہ کے حساب سے دیکھتے ہیں ___ جس کے افراد، ظلم و عدل ___ اور ___ امید
کے حالات میں ایک دوسرے کے ساتھ! ___ عمل اور ردعمل ___ انجام دیتے
تو ___ ایسی صورت میں ___ ان سب کی موت ایک ہی ہوتی ہے ___ اور ___ یہی
گروہی موت ہے جس کی طرف ان آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے ___ اور جسے ___
"امت کی اجل" ۔ کہا گیا ہے۔

اس گفتگو کے پس منظر میں چند اور آیتوں پر ایک سرسری نظر ڈالیے۔ آپ ان آ
ایک اچٹتی ہی سی نظر ڈال لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بھی اسی مفہوم کی ا
کر رہی ہیں۔

ارشاد رب العزت ہے:

الف: وربك الغفور ذو الرحمة لو يؤاخذهم بما كسـ
لعجل لهم العذاب بل لهم موعد لن يجد
من دونه موئلا وتلك القرى اهلكناهم لـ
ظلموا وجعلنا لمهلكهم موعدا ۔ ؁

تمہارا رب بہت زیادہ بخشنے والا اور رحیم ہے ۔ اگر وہ لوگوں کے اعما

گرفت کرتا تو یقیناً ان پر عذاب نازل کرنے میں جلدی کرتا — مگر — ان کے لیے مجموعی طور پر ایک ایسا وقت معین ہے جس سے کوئی بھی فرار نہیں کر سکتا — اور — یہ بستیاں (جنھیں تم آج ویران دیکھ رہے ہو) ان (کے رہنے والوں) کو ہم نے ان کے ظلم و ستم کے سبب ہلاک کر ڈالا، لیکن — ان کی اس ہلاکت کے لیے بھی ہم نے پہلے سے ایک معین وقت اور قانون طے کر رکھا تھا۔

ب: ولو یؤاخذ اللہ الناس بظلمھم ما ترک علیھا دابۃ ولکن یؤخرھم الی اجل مسمیٰ فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔

اگر اللہ — لوگوں کے ظلم پر ان کا مواخذہ کرتا، تو زمین پر ایک بھی متحرک باقی نہ رہتا — لیکن — وہ انھیں اجل مسمیٰ (معین مدت) تک مہلت دیتا ہے۔
تو جب — ان کی اجل آجاتی ہے — تو پھر!
نہ تو وہ ایک لمحہ کے لیے پیچھے ہٹ سکتے ہیں — اور — نہ ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔

ج: ولو یؤاخذ اللہ الناس بما کسبوا ما ترک علیٰ ظھرھا من دابۃ ولکن یؤخرھم الی اجل مسمیٰ فاذا جاء اجلھم فان اللہ کان بعبادہ بصیرا۔

اگر اللہ — لوگوں کے اعمال پر ان کا محاسبہ کرتا، تو روئے زمین پر ایک متحرک بھی باقی نہ رہتا۔
لیکن — وہ انہیں اجل مسمیٰ (معین مدت) تک مہلت دیتا ہے — تو جب — ان کی اجل آجاتی ہے تو یقیناً اللہ — خود اپنے بندوں کے انجام کی سب سے زیادہ خبر رکھتا ہے۔

امتوں کی گرفت:

— یعنی، امتوں کی گرفت اور ان پر عذاب آنے کے سلسلہ میں تاریخ کی سنت اور اللہ کا قانون آخری دو آیتوں میں قرآن حکیم اس جانب بھی اشارہ کر رہا ہے؛

"اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ لوگوں کے مظالم اور ان کی بداعمالیوں پر گرفت کرتا تو،
زمین پر ایک بھی فردِ متنفس باقی نہ رہتا اور سب کے سب ہلاک ہوجاتے۔"

یہاں ــــ اس قرآنی تصور کے سمجھنے اور سمجھانے کے دوران ایک مشکل پیش آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ــــ عموماً سب کے سب تو ظالم نہیں ہیں ــــ کیونکہ ــــ ان ہی جاندار اور متحرک مخلوقات میں انبیاء اور ائمہؑ بھی تو ہیں ــــ تو کیا ــــ یہ ہلاکت ــــ انبیاء ــــ اور ــــ مومنین میں سے عادل ائمہ ــــ پر بھی محیط ہے ؟ ــــ یہ مشکل ــــ اتنی ٹیڑھی ہے کہ ــــ بعض لوگ تو اس میں اتنے زیادہ الجھ گئے کہ ــــ انہوں نے ــــ اس قسم کی آیتوں کو عصمتِ انبیاء سے انکار کی بنیاد بنالیا ــــ حالانکہ ــــ حقیقت یہ ہے کہ ــــ یہ دونوں آیتیں اخروی عذاب سے نہیں ــــ بلکہ ــــ دنیوی سزا سے گفتگو کر رہی ہیں ــــ گویا یہ آیتیں ــــ اس طبیعی اور فطری نتیجہ سے گفتگو کر رہی ہیں ــــ جو ــــ کوئی امت اپنے ظلم و طغیان کے سبب حاصل کرتی ہے ــــ اور ــــ یہ طبیعی نتیجہ ــــ جب بھی رونما ہوتا ہے تو معاشرہ یا ملت کے افراد میں سے فقط ظالم افراد ــــ سے مختص نہیں ہوتا ــــ بلکہ ــــ یہ ــــ قوم و ملت کے تمام افراد کو ــــ ان کے فکری، عملی، جسمانی اور روحانی ــــ غرض ہر قسم کے اختلافات کے باوجود ــــ اجتماعی طور پر گھیر لیتا ہے ــــ اس لیے ــــ جب ــــ بنی اسرائیل کو ــــ ان کے ظلم، سرکشی اور بے غیرتی کے سبب، خانہ بدوشی اور جنگل جنگل مارے مارے پھرنے کی سزا ملی ــــ تو ــــ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ان کے ساتھ تھے۔

حالانکہ ــــ نہ صرف یہ کہ ــــ وہ معاشرہ کی سب سے پاکیزہ اور سب سے ذہین شخصیت تھے ــــ بلکہ ــــ وہ ظالموں اور طاغوتوں سے مقابلہ کے میدان میں بھی سب سے بہادر اور شجاع انسان تھے۔

پھر ــــ ایسا کیوں ہوا ؟

اس لیے کہ ــــ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسی امت کی ایک فرد اور ایک جزو تھے ــــ چنانچہ ــــ وہ بھی اس مجازات میں شامل کر دیئے گیے ــــ اور جب بنی اسرائیل

کے ظلم وستم کے نتیجہ میں یہ طے پایا کہ وہ قوم چالیس برس تک جنگلوں کی خاک چھانے تو حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السلام کو بھی اس کے ساتھ ساتھ رہنے کا حکم ہوا۔

اسی طرح — جب مسلمانوں کی گمراہی اور انحراف کے نتیجہ میں ان کو بلاء وسزا میں گرفتار کیا گیا، تو ان پر یزید بن معاویہ جیسے شخص کو حاکم بنا دیا گیا۔ جو ان کے مال، جان، عزت و آبرو اور ان کے عقائد و نظریات پر مسلط ہو گیا۔

تو جب — مسلمانوں پر یہ بلاء نازل ہوئی — تو یہ — فقط اسلامی معاشرہ کے ظالموں کے لیے خاص نہیں رہی۔

بلکہ — اس نے — امام حسین علیہ السلام — کو بھی اپنے گھیرے میں لے لیا — جو — اس وقت نہ صرف ملت اسلامیہ میں بلکہ پورے انسانی معاشرہ میں سب سے زیادہ پاکیزہ، نکی، طیب و طاہر اور عادل انسان تھے۔

اور سب جانتے ہیں کہ — اس بلا نے — معصوم امام کو بھی نہیں چھوڑا ....!!

چنانچہ — وہ خود — ان کے چنے ہوئے اصحاب — اور — ان کے طیب و طاہر اہلبیت — علیہم السلام — یزید — کے ہاتھوں انتہائی بے دردی سے شہید ہو گئے۔

یہ سب —

سنت تاریخ —

کی منطق ہے —!

یوں — (ان آیات اور تاریخی شواہد کے مطالعہ سے) —

ہمیں اس تاریخی سنت کا علم حاصل ہوا کہ:

"جب بھی الٰہی قانون اور تاریخی سنت کے مطابق کسی — ملت — قوم — معاشرہ — یا — گروہ — کو کوئی سزا ملتی ہے — تو — وہ — اسی گروہ کے افراد میں سے — فقط — ظالموں — کے لیے خاص نہیں ہوتی۔"

یہی سبب ہے کہ قرآن حکیم ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے کہ:

واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ واعلموا

ان اللہ شدید العقاب ۵۸

ایسے فتنہ سے بچو، — جو تم لوگوں میں سے خاص طور سے فقط ان لوگوں
تک نہیں پہنچے گا — جو — ظالم ہیں — اور جان لو کہ بے شک اللہ سخت
سزا دینے والا ہے —

حالانکہ قانون قدرت تو یہ ہے کہ:

لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ ۵۹

"کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"

گفتگو کے ان دونوں پہلوؤں اور قرآن حکیم کے بتائے ہوئے ان دونوں قانونوں پر غور
کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ،

اخروی عذاب — ہمیشہ — براہ راست عمل کرنے والے پر آتا ہے (اور اس میں کوئی
کسی دوسرے کے عمل کا نتیجہ نہیں بھگت سکتا)

جبکہ،

دنیوی سزا — کا دائرہ بہت وسیع ہے — اس طرح — معلوم ہوا کہ —
یہ آیتیں — اخروی معنوں میں عقاب (یعنی عذاب الٰہی) اور قیامت کے پیمانے پر ملنے
والے عذاب سے نہیں،

بلکہ،

تاریخی سنتوں — فلسفۂ تاریخ کے اصول و ضوابط — یا — قوانین تاریخ —
اور — ان نتائج — سے گفتگو کر رہی ہیں جو — امتوں — کے اعمال —
کمائی — اور — کد و کاوش — کے صلہ میں حاصل ہوئے ہیں۔

نبی کو شہر بدر کرنے والوں کے لیے تاریخ کی سنّت:

ذرا اس آیت پر غور کیجیے، ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

و ان کادوا لیستفزونک من الارض لیخرجوک منھا و اذا

لایلبثون خلافک اِلّا قلیلا سنۃ من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا۔[۲۱]

یہ لوگ تو تمھیں سرزمین مکہ میں اذیتیں پہنچا کر دل برداشتہ کرنے ہی لگے تھے، تاکہ تم کو وہاں سے (شام کی طرف) نکال دیں۔ تو اگر یہ لوگ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے تو پھر یہ لوگ چند ہی دنوں کے مہمان تھے۔

کیونکہ ــــ ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھیجے ان سب کے سلسلہ میں ہمارا قانون و دستور و روش و سنت یہی رہی ہے ــــ اور تم ــ کبھی بھی ہمارے بنائے ہوئے قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

یہ آیت کریمہ بھی دوسری آیتوں کی طرح ایک عمومی اور کلی مفہوم پر زور دیتی ہے اور کہتی ہے کہ،

ولا تجد لسنتنا تحویلا ــــ[۲۲]

تم،

کبھی بھی ــــ

ہمارے بنائے ہوئے قوانین اور سنتوں میں ــــ کوئی ردوبدل نہیں پاؤ گے ــــ ــــ کیونکہ ــــ یہی وہ سنت ہے ــــ جسے ہم نے ان لوگوں کے سلسلہ میں اختیار کیا تھا جنھوں نے تم سے پہلے آنے والے انبیاء کے ساتھ اس کا سلوک روا رکھا تھا ــــ چنانچہ ــ یہ سنت ــــ اور ــــ قانون ــ اسی طرح جاری رہے گا ــ اور ــــ اس میں ــــ کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہوگا۔

مکہ کے رہنے والے، اس بات پر قدرت نہیں رکھتے تھے کہ آنحضرتؐ، آپؐ کی تبلیغ اور آپؐ کی دعوت کے خلاف کوئی منطقی اور صحیح بات کر سکیں۔ اس لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ آپؐ کو مکہ سے نکال دیں۔ چنانچہ وہ اسی بات پر سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؐ کو مکہ سے نکال دیں۔

اس پس منظر کے ذیل میں یہ آیت تاریخ کی ایک سنت کی طرف اشارہ کرتی ہے،

جس کی تفصیل بعد میں بیان کریں گے ـــ وہ سنّت، نبیؐ کو شہر بدر کرنے والے گروہ سے متعلق ہے اور یہ ہے کہ :

"جب نبیؐ سے مقابلہ اس حد تک پہنچ جائے کہ : ـــ منکرین ـــ ! اپنے تمام ـــ وسائل ـــ اور ـــ ٹیکنیک ـــ استعمال کرنے کے بعد ـــ عاجز آ جائیں ـــ اور ـــ وہ ـــ نبیؐ ـــ کو ـــ اس کے شہر ـــ سے نکال دیں ـــ تو ـــ اس کے بعد ـــ وہ ـــ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

البتہ،

لَا یَلْبَثُونَ اِلَّا قَلِیلًا[12]

پھر،

یہ لوگ چند ہی دنوں کے مہمان ہیں ـــ

کا مطلب ـــ یہ نہیں ہے کہ ـــ ان پر جلد ہی ـــ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ـــ کی جانب سے عذاب ـــ نازل ہو جائے گا ـــ کیونکہ ـــ

اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد ـــ مکہ والوں نے ـــ آنحضرتؐ ـــ کو تکلیفیں دیں اور آپ کو ڈرانے، دھمکانے اور آزار دینے کے طریقے استعمال کیے ـــ جس کے نتیجے میں جب ـــ آنحضرتؐ ـــ کو مکہ میں کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی تو، آپ، وہاں سے ـــ ہجرت ـــ کر کے مدینہ چلے گئے ـــ لیکن ـــ اس کے باوجود ـــ کفار مکہ پر کوئی آسمانی عذاب نازل نہیں ہوا ـــ !! چنانچہ ـــ اس آیۂ وافی ہدایہ پر بھرپور غور و خوض کے بعد ـــ جو مفہوم واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آیت بتا رہی ہے کہ ـــ مکہ ـــ کے رہنے والے ـــ زیادہ دیر تک ـــ مضبوط ـــ اور ـــ ثابت قدم ـــ انقلابی و مبارزگروہ ـــ کی حیثیت سے باقی نہیں رہ پائیں گے ـ اور یہ ـــ ایک ایسے گروہ کی شکل نہیں اختیار کر سکیں گے، جو بامقصد ـــ انقلابی اور ـــ باشخصیت ـــ افراد پر مشتمل ہوتا ہے ـ چنانچہ ـــ یہ

اپنی اس موقعیت کے سبب، جلد ہی اپنے اعمال کے لازمی نتیجہ سے دوچار ہوکر ــــ اپنی حیثیت، کھو بیٹھیں گے ــــ اور ــــ تتر بتر ہو جائیں گے ــــ کیونکہ ــــ یہ ــــ نبوت ــــ! جس نے اپنے ابتدائی مرحلہ ہی میں ــــ اس معاشرہ کو ــــ مباحثہ ــــ اور ــــ علمی میدان ــــ میں ــــ شکست دے دی ہے ــــ وہ ــــ یقینی طور پر، بعد کے مرحلوں میں ــــ: جنگ وجدال ــــ اور ــــ عملی مقابلہ کے میدانوں ــــ میں بھی ــــ اس معاشرہ کو ــــ ذلت آمیز شکست، سے دوچار کردے گی ــــ اور ــــ درحقیقت ــــ ایسا ہی ہوا ــــ!!! چنانچہ ــــ آنحضرتؐ ــــ کے، مکہ سے ہجرت کرجانے کے بعد، یہ لوگ اپنے آپ کو زیادہ دیر تک نہیں سنبھال سکے۔ ان کی قوت مقابلہ ختم ہوگئی اور مکہ ــــ شجاعت ومبارزہ میں اپنی حیثیت کھو بیٹھا۔

چنانچہ ــــ ابھی چند ہی برس ہوئے تھے کہ ــــ مکہ ــــ سقوط کرگیا ــــ اور ــــ دارالاسلام ــــ کا ــــ جزء ــــ بن گیا۔

چنانچہ ــــ یہ آیت تاریخ کی سنتوں اور قوانین کو بیان کررہی اور اپنے موقف کو بہت تاکید کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہہ رہی ہے کہ:

لن تجد لسنتنا تحویلا ــــ[۱۲]

الٰہی ــــ سنتیں اور قوانین،
کبھی بھی ــــ بدلا نہیں کرتے۔

تنبیہ:

یاد رکھو کہ:

قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین۔[۱۳]

تم سے پہلے بھی ایسی ــــ سنتیں اور قوانین ــــ موجود تھے ــــ (تو اگر تم ــــ کو یقین نہ آئے) ــــ تو ــــ تم ــــ دنیا کی سیر وسیاحت کرو،

اور غور کرو، ــــ جھٹلانے والوں کا انجام کیا رہا ہے ــــ !!
یہ آیت ــــ تاریخی سنتوں کو بیان کرتے ہوئے ــــ حق کی پیروی ــــ ان سنتوں کی تلاش ــــ نیز ــــ ان سے ــــ عبرت اور سبق ــــ حاصل کرنے کے لیے تاریخی واقعات کی ــــ تحقیق و جستجو ــــ پر تاکید کر رہی ہے۔

نصر:

نصر اللہ ــــ یعنی اللہ سبحانہٗ کی طرف سے آنے والی مدد کا ضابطہ یا اس سلسلۂ تاریخ کی سنّت: ــ ارشادِ رب العزت ہے:

ولقد کذبت رسل من قبلک فصبروا علیٰ ما کذبوا واوذوا حتیٰ اتاھم نصرنا ولا مبدل لکلمات اللہ ولقد جاءک من نباء المرسلین۔[14]

لوگوں نے،
تم سے پہلے آنے والے نبیوں کو بھی جھٹلایا تھا۔
اور ــــ ان نبیوں نے، ــــ لوگوں کی طرف سے جھٹلائے جانے ــــ اور ــــ اذیت دیئے جانے ــــ پر ــــ صبر و شکیبائی سے کام لیا۔ یہاں تک کہ،
ہماری مدد ــــ آپہنچی۔
اور ــــ کوئی طاقت اللہ کے کلمات کو نہیں بدل سکتی، نیز ہم نے آپ کے لیے پیغمبروں کے حالات بیان کر دیئے ہیں۔

یہ آیت کریمہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کو مضبوط کرتی ہے۔ انہیں اسلاف کے تجربوں سے آگاہ کرتی ہے۔ نیز ان کو اسلاف کے تجربوں کے قانون سے مربوط کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ اس سلسلہ میں ــــ ایک ایسی سنّت اور قانون ہے ــــ جو ــــ آپؐ کے نیز ــــ آپؐ سے پہلے آنے والے انبیاء علیہم السلام ــــ کے لیے ــ ایک ہی طرح جاری چلا آرہا ہے ــــ اور ــــ وہ یہ ہے کہ ــــ !

" نصر ـــ یعنی ـــ ، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مدد ـــ ضرور آئے گی۔
مگر ،
اس نصر کے لیے ـــ کچھ ایسی ـــ شرطیں ـــ ہیں ـــ جن ـــ کے بغیر ـــ
" یہ نصر" ـــ نہیں آسکتی ۔"

اور ،
وہ ـــ صبر و ثبات اور دوسری شرطوں کی تکمیل ہے ۔ یہی وہ منفرد طریقہ ہے ،
جس کے ذریعہ ـــ نصر ـــ کا حصول ممکن ہے ۔
اسی لیے ارشاد ہوا :

فصبروا علی ما کذبوا واوذوا حتّٰی اتٰہم نصرنا ولا مبدّل لکلماتِ اللہ ۔[۵]

ان نبیوں نے ـــ لوگوں کی طرف سے جھٹلائے جانے ـــ اور ـــ اذیت دیئے جانے پر ـــ صبر و شکیبائی سے کام لیا ، یہاں تک کہ ـــ ہماری مدد ـــ آپہنچی !!
اور ـــ کوئی طاقت اللہ کے کلمات کو نہیں بدل سکتی ـــ چنانچہ ـــ معلوم ہوا کہ :
اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ـــ
کا ـــ کلمہ ـــ مرورِ تاریخ کے ساتھ بدلا نہیں کرتا ـــ ! اور یہ ـــ کلمہ ـــ نصر ـــ اور ـــ اس کی ان ـــ " شرطوں " ـــ " تقضیوں " ـــ " حالات " اور ـــ " صفات " ـــ کے درمیان موجود ـــ مضبوط رابطہ ـــ ہے ـــ جو مختلف آیتوں میں بیان ہوئی ہیں ـــ اور ـــ جن کو ـــ اجمالی طور پر ـــ اس آیت میں ، بیان کردیا گیا ہے ـــ اور ـــ یہ رابطہ : ـــ تاریخ کی سنت ہے ـــ !!

چنانچہ ،
اسی سلسلہ میں ایک اور پیرایہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

فلما جاءھم نذیرٌ ما زادھم الا نفورًا استکبارًا فی الارض

ومکر السیّء ولا یحیق المکر السیّء الّا باھلہ فھل ینظرون الّا سنّۃ الاوّلین فلن تجد لسنّۃ اللہ تحویلا [1]

پھر جب،
ان کے پاس ڈرانے والا آپہنچا —— تو زمین میں ان کے تکبر اور (میکیا ولی کی سیاست) بدترین منفی سیاست، کے سبب —— ان کے درمیان —— نفرت بڑھتی ہی چلی گئی۔
کیونکہ —— منفی سیاست، صرف اسی شخص کو نقصان پہنچاتی ہے —— جو یہ سیاست کھیلتا ہے۔
تو کیا یہ لوگ! —— اپنے اسلاف کی سنتوں (ان پر آنے والے عذابوں) کا انتظار کر رہے ہیں!!
چنانچہ تم کو —— نہ تو —— اللہ کی سنتوں میں کبھی کوئی تغیر و تبدل نظر آئے گا، اور نہ ہی،
اللہ کی سنتوں میں کوئی تحول و انقلاب دکھائی دے گا۔

ولو قاتلکم الّذین کفروا لولّوا الادبار ثمّ لا یجدون ولیّا ولا نصیرا سنّۃ اللہ الّتی قد خلت من قبل ولن تجد لسنّۃ اللہ تبدیلا [2]

اور اگر —— کافر —— آپؐ —— سے لڑتے —— تو انہیں بہرقیمت پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہی بن پڑتی ——
پھر —— نہ تو ان کو ڈھونڈے سے —— کوئی سرپرست ہی ملتا —— اور نہ ہی کوئی مددگار ——!
یہ اللہ کی وہ سنّت اور قانون ہے، —— جو تم سے پہلے والوں پر بھی جاری رہا ہے۔
اور،
تمہیں —— اللہ کی سنّت و قانون میں کبھی بھی کوئی تغیر و تبدل نظر نہیں آئے گا۔

توحید ۲م

انقلاب کی اساس ـــ

جہاد بالنفس ـــ!

قرآن مجید تاریخ کی اس سنت و قانون کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے :

ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم

اللّٰہ،

نے کبھی بھی ـــ کسی قوم کی حالت ـــ اس وقت تک ـــ نہیں بدلی، جب تک

کہ ـــ خود اس قوم نے ـــ اپنے ـــ باطن ـــ نفس ـــ کو ـــ نہ بدل ڈالا ہو،

گویا ـــ !

انسان کا ،

"باطن" ـــ اس کا ـــ "نفس" ـــ نیز ـــ اس کی ـــ "روح" ـــ بنیاد ـــ ہے۔

اور ـــ

اس کے ـــ اجتماعی و معاشرتی حالات ـــ بلند و بالا عمارت ـــ ہے۔

اور،

یہ عمارت ـــ اپنی بنیاد میں ـــ آنے والی تبدیلیوں کے مطابق ہی، بدل

سکتی ہے ـــ جس کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے۔

یوں،

یہ آیت ـــ اس ـــ "معین تعلق" ـــ سے گفتگو کر رہی ہے،

جو،

بنیاد ـــ اور ـــ بلند و بالا عمارت ـــ یا ـــ انسان کی ـــ

نفسیاتی ـــ روحانی ـــ و فکری، حالت۔

اور،

اس کی ـــ اجتماعی حالت ـــ یا ـــ انسان کے ـــ ظاہر ـــ و ـــ باطن ـــ

کے درمیان ہے۔

چنانچہ،
انسان کے ظاہر کو — اس کا باطن ہی بناتا ہے اور وہ اسی — باطن — سے مربوط ہوتا ہے،
تو،
جب — قوم کی — نفسیات —
بدل جائے — تو، اس کی — اجتماعی حالت اور — اس کے وہ — تعلقات و روابط — بھی بدل جاتے ہیں — جو — اس کے افراد کو، ایک دوسرے سے، مربوط کرتے ہیں۔
چنانچہ تاریخ کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ بھی ہے — کہ —
"بنیاد اپنی عمارت سے مربوط ہوتی ہے۔"
یا — دوسری لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ،
"قوموں کی زندگی میں انقلاب — کی اساس جہاد بالنفس ہے۔"
چنانچہ ارشاد ہے کہ:
ذٰلك بانّ الله لم يك مغيرا نعمة انعمها على قوم حتّٰى يغيّروا مابانفسهم[19]
یہ سب اس لیے ہے کہ — یقینی طور پر — "اللہ جل جلالہ" — کسی بھی قوم کو دی ہوئی نعمت کو — اس وقت تک نہیں بدلتا — جب تک کہ وہ — خود — اپنی — قلبی حالت — اور — اپنے نفوس — تبدیلی نہ لے آئیں۔

جناب شیخ محمود قانصوہ

تقابلی مطالعہ

شیعہ سنّی کتب میں مشترک روایات

فصل چہارم

ان چیزوں کے بارے میں جن سے اجتناب واجب ہے اور جن سے اجتناب واجب نہیں ہے

اس میں بارہ باب ہیں:

ا۔ روزے دار کے لیے مضمضہ و استنشاق جائز ہے۔

ب۔ روزے دار کے لیے حجامت جائز ہے۔

ج۔ روزے دار کے لیے سرمہ لگانا جائز ہے۔

د۔ روزے دار کے لیے مسواک کرنا جائز ہے۔

ہ۔ روزے دار کے لیے جماع حرام ہے اور اس کا کفارہ

و۔ روزے دار کے لیے بیوی کو چھونا جائز ہے بشرطیکہ انزال نہ ہو۔

ز۔ روزے دار کے لیے بیوی کی زبان چوسنا جائز ہے۔

ح۔ روزے دار کے لیے عمداً قے کرنا جائز نہیں لیکن اگر قے پر قابو پالے تو روزہ باطل نہ ہوگا۔

ط۔ بھولے سے کھانے پینے سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔

ی۔ روزے دار کے لیے سر پر پانی ڈالنا جائز ہے۔

ک۔ روزے دار کے لیے ہانڈی چکھنا جائز ہے۔

ل۔ احتلام سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔

روزے دار کے لیے مضمضہ اور استنشاق جائز ہے

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ وبالإسناد ــ محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن إبن أبي عمير ــ عن حماد، عمن ذكره، عن أبي عبدالله (ع) في الصائم يتمضمض ويستنشق، قال: نعم، ولكن لايبالغ[1].

۱...... امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ روزے دار مضمضہ و استنشاق کر سکتا ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ پانی حلق تک پہنچ جائے۔

۲ ــ وعنه ــ محمد بن الحسن ــ عن أحمد بن الحسن، عن عمرو بن سعيد، عن مصدق بن صدقة، عن عمار الساباطي، قال: سألت أبا عبدالله(ع) عن الرجل يتمضمض، فيدخل في حلقه الماء وهو صائم، قال: ليس عليه شيء إذا لم يتعمد ذلك .... (الحديث)[2].

۲...... عمار ساباطی کہتے ہیں، میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے حالت روزہ میں استنشاق کیا یہاں تک کہ پانی اس کے حلق میں پہنچ گیا، حضرتؑ نے فرمایا: اگر اس نے عمداً ایسا نہ کیا ہو تو کوئی حرج نہیں.......

روایات اہل سنّت:

۱ ــ أخبرنا أبوالحسين علي بن محمد بن عبدالله بن بشران العدل ببغداد، أنبأ أبوالحسن علي بن محمد البصري، حدثنا عبدالله بن محمد بن أبي مريم، حدثنا محمد بن يوسف، حدثنا سفيان، عن اسماعيل بن كثير، عن عاصم بن لقيط بن صبرة، عن أبيه قال: قال لي رسول

الله (ص): خلل أصابعك وآسبغ الوضوء، وإذا آستنشقت فبالغ إلاّ أن تكون صائماً[3]. ورواه الترمذي، عن عبدالوهاب بن عبدالحكم البغدادي وأبوعمار، جميعاً عن يحيى بن سليم، عن اسماعيل بن كثير مثله.[4] ورواه أبوداود، عن قتيبة، عن يحيى، كالترمذي.[5]

۱........ لقیط بن صبرہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے ان سے کہا: اپنی انگلیوں سے دانتوں کو صاف اور کامل وضو کرو اور جب استنشاق کرو تو اسے حلق تک پہنچاؤ مگر یہ کہ روزے سے ہو..........

۲ ــ أخبرنا أبوالحسن علي بن أحمد بن عبدان، أنبأ أحمد بن عبيد، حدثنا أحمدبن ابراهيم بن ملحان، حدثنا يحيى بن بكير، حدثنا الليث، عن بكير، عن عبدالملك بن سعيد الأنصاري، عن جابربن عبدالله، عن عمربن الخطاب(رض) عنه، قال: هششت يوماً فقبلت وأنا صائم فأتيت رسول الله(ص) فقلت، صنعتُ اليوم أمراً عظيماً، قبّلت وأنا صائم، فقال رسول الله(ص): أرأيت لوتمضمضت بالماء وأنت صائم، فقلت: لابأس بذلك، فقال رسول الله(ص): ففيم.[6] ورواه الحاكم عن أبي عبدالرحمن، عن أبي حاتم وابراهيم بن نصر، عن أبي الوليد الطيالسي، عن اليث مثله.[7] ورواه أبوداود، عن أحمدبن يونس وعيسى بن حماد، عن الليث مثله.[8] ورواه الدارمي، عن أبي الوليد الطيالسي، عن الليث.[9]

۲۔ . ... عمر ابن خطاب کا بیان ہے کہ ایک دن میں نے عالم نشاط میں بوسہ لے لیا حالانکہ میں روزے سے تھا، چنانچہ میں نے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا آج مجھ سے امر عظیم سرزد ہوا ہے، میں نے حالت روزہ میں بوسہ لے لیا ہے۔ حضرت ص نے فرمایا، تمہارا کیا خیال ہے اگر کوئی شخص حالت روزہ میں پانی سے مضمضہ کرے، میں نے کہا: اس میں کوئی قباحت نہیں، حضرت نے فرمایا تو پھر اس میں کیا قباحت ہے.......................

؟ ....

روزے دار کے لئے حجامت (فصد کھلوانا) جائز ہے۔

...ایات اہل بیتؑ:

أ – ماورد من طريق أهل البيت(ع):

١ – محمد بن يعقوب، عن محمدبن يحيى، عن أحمدبن محمد وعن علي بن ابراهيم، عن أبيه، جميعاً عن ابن أبي عمير، عن حماد، عن الحلبي، عن أبي عبدالله(ع)، قال: سألته عن الصائم: أيحتجم؟ فقال: إني أتخوف عليه أما يتخوف (به) على نفسه. قلت: ماذا يتخوف عليه؟ قال: الغشيان (الغشي به) أو (أنْ) تثوربه مرة. قلت: أرأيت إنْ قويَ على ذلك، ولم يخش شيئاً؟ قال: نعم إن شاء. ونقله في الإستبصار عن الكافي.[10] ورواه الصدوق بسنده، عن الحلبي مثله[11].

١...... حلبی امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت سے روزے دار کے سلسلے ...دریافت کیا کہ کیا اس کے لیے فصد کھلوانا جائز ہے؟ حضرت نے فرمایا: مجھے اس کے سلسلہ میں خوف ہے ...وہ خود اپنے سلسلہ میں نہیں ڈرتا؟ میں نے دریافت کیا خوف کس چیز کا؟ آپ نے فرمایا بے ہوشی یا صفر ...غلبہ کا خوف، میں نے کہا اگر اس میں برداشت کی قوت موجود ہو اور کسی چیز کا ڈر نہ ہو تو اس صورت میں ...کا کیا حکم ہے؟ حضرت نے فرمایا ایسی صورت میں اگر وہ چاہے تو کوئی حرج نہیں.........

٢ – عن جعفربن نعيم بن شاذان، عن عمه محمدبن شاذان، عن الفضل بن شاذان، عن الرضا(ع)، عن أبيه(ع)، عن آبائه(ع)، عن علي(ع): إنّ رسول الله(ص) إحتجم وهو صائم محرم.[12]

٢...... فضل بن شاذان کا بیان ہے کہ امام رضاؑ اپنے آباء و اجداد کے واسطے سے حضرت ...سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ نے فصد کھلوایا جبکہ آپ حالت احرام میں اور روزے سے تھے

٣ – وعنه – محمدبن الحسن – عن حمادبن عيسى، عن عبدالله بن ميمون، عن أبي عبدالله، عن أبيه(ع) قال: ثلاثة لا يُفطِرْنَ

الصائم: القيء والإحتلام والحجامة، وقد آحتجم النبي(ص) وهو صائم، وكان لايرى بأساً بالكحل للصائم[۱۳]. أقول: وذيل هذا الحديث ينفع في الباب الآتي.

۳۔ .... امام صادقؑ نے امام باقرؑ سے روایت فرمایا ہے کہ تین چیزیں روزے کو باطل نہیں کرتیں: قے، احتلام اور فصد۔ خود پیغمبر اسلام نے حالت روزہ میں فصد کھلوایا، آپ روزے دار کے لئے سرمہ لگانے میں بھی قباحت نہیں جانتے تھے.....

٤ ــ وفي معاني الأخبار عن أحمد بن الحسن القطان، عن أحمد بن يحيى بن زكريا، عن بكر بن عبدالله بن حبيب، عن تميم بن بهلول، عن أبي معاوية، عن سليمان بن مهران، عن عباية بن ربعي (في حديث) قال: سألت ابن عباس عن معنى قول النبي(ص) حين رأي من يحتجم في شهر رمضان: أفطر الحاجم والمحجوم؟ فقال: إنما أفطرا لأنهما تسابا وكذبا في سبهما على النبي(ص) لاللحجامة. ونقله في البحار عن معاني الأخبار بالسند المتقدم ذكره.[۱۴]

۴۔ .... عبایہ بن ربعی ایک حدیث میں کہتے ہیں: میں نے ابن عباس سے پیغمبرؐ کے اس قول کا مطلب دریافت کیا جسے آپ نے ایک شخص کو حالت روزہ میں فصد کھلواتے دیکھ کر فرمایا تھا "فصد کھولنے والے اور فصد کھلوانے والے دونوں کا روزہ باطل ہوگیا"؟ ابن عباس نے کہا ان کے روزے کے باطل ہونے کا سبب فصد نہیں تھا بلکہ سبب یہ تھا کہ وہ پیغمبر پر سب کررہے تھے اور آپ کی جانب جھوٹی نسبتیں دے رہے تھے...............

روایات اہل سنت:

۱ ــ أخبرنا أبو محمد جناح بن نذير بن جناح القاضي بالكوفة، أنبأ أبو جعفر محمد بن علي بن دحيم، حدثنا أحمد بن حازم بن أبي سعيد، قال: قال رسول الله (ص): لايفطر من قاء ولا من آحتجم، ولا من احتلم.[۱۵] ورواه الترمذي، عن محمد بن عبيد المحاربي، عن عبدالرحمن بن زيد مثله (مع اختلاف في الألفاظ).[۱۶] ورواه عبدالرزاق، عن معمر والثوري، عن زيد بن أسلم، عن رجل من

أصحابه، عن صحابي ذكره معمر، عن النبي (ص).[17] ورواه أبو داود، عن محمد بن كثير، عن سفيان مثل عبدالرزاق.[18] ورواه الدارقطني، عن أحمد بن محمد، عن محمد بن ماهان، عن شعيب بن حرب، عن هشام بن سعد، عن زيد، وفيه لفظ: ثلاثة لايفطرن الصائم، وذكرها.[19] وبهذا اللفظ أخرج البزار، عن عبدالرحمن بن عيسى بن ساسان، عن محمد بن عبدالعزيز، عن هشام، عن عروة، عن عطاء بن يسار، عن ابن عباس.[20]

۱۔ .... ابوسعید سے روایت ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: قے کرنے والے، فصد کھلوانے والے اور محتلم کا روزہ باطل نہ ہوگا.............

٢ ــ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ، حدثنا أبوالعباس محمد بن يعقوب، حدثنا الحسن بن علي بن عفان، حدثنا أبو داود الحفري، عن سفيان، عن عبدالرحمن بن عابس، عن عبدالرحمن بن أبي ليلى، عن رجل من أصحاب محمد (ص) قال: نهى رسول الله(ص) عن المواصلة والحجامة للصائم، إبقاءً على أصحابه، ولم يحرمها... (الحديث).[21] ورواه عبدالرزاق، عن سفيان الثوري مثله.[22]

۲۔ .... عبدالرحمٰن بن ابی لیلی پیغمبرؐ کے ایک ساتھی سے نقل کرتے ہیں کہ: پیغمبرؐ اسلام نے اپنے اصحاب کی سلامتی کی خاطر مواصلت (روزہ بلا افطار) اور فصد سے منع کیا ہے لیکن اسے حرام نہیں کیا ہے۔

٣ ــ أخبرنا أبوالحسن علي بن محمد بن عبدالله بن بشران، أنبأ أبوالحسن علي بن محمد المصري، حدثنا ابن أبي مريم، حدثنا الفريابي، حدثنا سفيان، عن يزيد (يعني إبن أبي زياد)، عن مقسم، عن ابن عباس، قال: إحتجم رسول الله(ص) بين مكة والمدينة وهو صائمٌ محرم.[23] وروى الترمذي نحوه، عن بشر بن هلال، عن عبدالوارث بن سعيد، عن أيوب، عن عكرمة، عن ابن عباس. وروى متن الحديث،

عن أحمد بن منيع، عن عبدالله بن ادريس، عن يزيد مثله... [۲۴] ورواه عبدالرزاق، عن سفيان مثله، وروى نحوه بعدة طرق. [۲۵] وأخرجه ابن ماجة عن علي بن محمد، عن محمد بن فضيل، عن يزيد مثله. [۲۶] وروى أبو داود نحوه، عن أبي معمر، عن عبدالوارث، عن أيوب مثل الترمذي، وعن حفص، عن شعبة، عن يزيد نحوه.

۳۔ .... ابن عباس کہتے ہیں، رسول اللہ ص نے مکہ و مدینہ کے درمیان فصد کھلوائی حالانکہ آپ حالت احرام میں اور روزے سے تھے ....

٤ ــ أخبرنا أبوعبدالله اسحاق بن محمد بن يوسف السوسي، حدثنا أبوالعباس محمد بن يعقوب، حدثنا محمد بن عوف، حدثنا أبوالمغيرة، أنبأ الأوزاعي (ح وأخبرنا) أبو عبدالله الحافظ وأبو عبدالله السوسي، حدثنا أبوالعباس، أنبأ العباس بن الوليد بن مزيد، أنبأ أبو سمعة الأوزاعي، حدثني يحيى بن أبي كثير، حدثني أبو قلابة الجرمي، حدثني أبو أسماء الرحبي، حدثني ثوبان مولى رسول الله(ص)، قال: خرجت مع رسول الله(ص) في ثماني عشرة ليلة خلت من رمضان، فإذا رجل يحتجم بالبقيع، فقال رسول الله(ص): افطر الحاجم والمحجوم. [۲۷] ورواه الترمذي مستقلاً عن محمد بن يحيى ومحمد بن رافع ومحمود بن غيلان ويحيى بن موسى، جميعاً عن عبدالرزاق، عن معمر، عن يحيى بن أبي كثير، عن ابراهيم بن عبدالله، عن السائب، عن ابن خديج، عن النبي(ص). [۲۸] وأخرج عبدالرزاق، حديث: «أفطر الحاجم والمحجوم» عن كثير من الطرق، عن شداد بن أوس، وعن ثوبان، وعن رافع بن خديج، وعن علي (مقطوعاً) وعن أبي هريرة. [۲۹] وأخرجه ابن ماجة، عن أحمد بن يوسف، عن عبيدالله، عن شيبان، عن يحيى مثله. ورواه بإسناده عن أبي قلابة، عن شداد مثله وبسند آخر، عن أبي هريرة مثله. [۳۰] وأخرجه الحاكم، عن محمد بن يعقوب، عن العباس بن الوليد

مثله. وأخرج نحوه بإسناده، عن أحمدبن حنبل، عن أبي، عن ابن شيبان، وأيضاً نحوه بأسانيد متعددة، عن عبدالرزاق وأخرى عن شدادبن أوس وابن عباس وثوبان وأبي موسى.[31] وأخرج أبوداود ذيل الحديث، عن أحمدبن حنبل، عن حسن بن موسى، عن شيبان، عن يحيى، عن أبي قلابة، عن شدادبن أوس، وأيضاً بهذا السند، عن أبي قلابة، عن أبي أسماء، عن ثوبان وعن مسدد، عن يحيى، عن هشام، عن أبي قلابة مثله، وبأسانيد أخرى أيضاً.[32] وأخرج أبو داود الطيالسي ذيل الحديث، عن هشام، عن يحيى (كأبي داود في الثاني) وأيضاً روى الحديث باختلاف يسير، عن شعبة، عن عاصم، عن أبي قلابة، عن أبي الأعمش، عن شداد.[33] وأخرج الدارمي نحوه، عن وهب بن جرير، عن هشام كالطيالسي، وعن يزيدبن هارون، عن عاصم، عن عبدالله بن يزيد، عن أبي الأشعث الصنعاني، عن أبي أسماء، عن شداد.[34] وأخرج البزار ذيل الحديث بأسانيد متعددة.[35]

۴۔ .... ثوبان کا بیان ہے: میں ماہ رمضان میں رسول اللہؐ کے ساتھ باہر نکلا، بقیع میں ایک شخص فصد کھلوا رہا تھا چنانچہ رسول اللہؐ نے فرمایا حاجم ومحجوم دونوں کا روزہ باطل ہوگیا.........

روزے دار کے لئے سرمہ لگانا جائز ہے۔

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ محمدبن يعقوب، عن عدة من أصحابنا، عن أحمدبن محمد، عن علي بن الحكم، عن سليم ــ سليمان ــ الفراء، عن محمدبن مسلم، عن أبي جعفر(ع) في الصائم يكتحل، قال: لابأس به ليس بطعام ولاشراب. ورواه في الاستبصار عن أحمدبن محمد، عن علي بن الحكم مثله، ونحوه ماوراه أيضاً في الإستبصار، عن الحسين بن سعيد،

عن صفوان بن يحيى، عن الحسين بن أبي غندور، عن أبي يعفور، عن الصادق(ع). [۳۶]

۱۔ .... محمد بن مسلم امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ روزے دار کے لیے سرمہ لگانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ نہ کھانا ہے نہ مشروب.........

۲ ـ محمد بن الحسن بإسناده عن الحسين بن سعيد، عن حماد بن عيسى، عن عبدالله بن ميمون، عن أبي عبدالله، عن أبيه(ع) (في حديث) إنه لايرى بأساً بالكحل للصائم. ونقل في البحار، عن قرب الإسناد، عن ابن ظريف، عن ابن علوان، عن الصادق(ع) نحوه. [۳۷]

ب ـ ماورد من طريق أهل السنة:

۲۔ .... امام صادقؑ نے امام باقرؑ سے روایت فرمائی ہے کہ روزے دار کے لیے سرمہ لگانے میں کوئی قباحت نہیں.............

روایات اہل سنت:

۱ ـ أخبرناه أبو سعد المالبني، أنبأ أبو أحمد بن عدي الحافظ، حدثنا الفضل بن عبدالله الأنطاكي، حدثنا لوين، حدثنا حبان بن علي، عن محمد بن عبيدالله بن أبي رافع، وكذلك رواه معمر، عن محمد، عن أبيه بمعناه، ورواه سعيد بن أبي سعيد الزبيدي صاحب بقيه، عن هشام بن عروة، عن أبيه، عن عائشة، قالت: ربما آكتحل النبي (ص) وهو صائم. وقد روي عن محمد بن عبيدالله بن أبي رافع وليس بالقوي، عن أبيه، عن جده: انَّ النبي (ص) كان يكتحل بالأثمد وهو صائم. [۳۸]

وروى ابن ماجة، عن أبي التقي، عن بقيه، عن الزبيدي مثله. [۳۹]

۱۔ .... حضرت عائشہ کہتی ہیں: رسول اللہؐ کبھی کبھی حالت روزہ میں سرمہ لگاتے تھے......... محمد بن عبید اللہ بن ابی رافع اپنے آباء و اجداد سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ حالت روزہ میں "اثمد" کا سرمہ لگایا کرتے تھے..........

روزے دار کے لئے مسواک کرنا جائز ہے۔

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ وبهذا الإسناد ــ عبدالله بن جعفر في (قرب الإسناد)، عن الحسن بن ظريف، عن الحسين بن علوان، عن جعفر بن محمد، عن أبيه(ع) ــ قال: قال علي(ع): لابأس بأنْ يستاك الصائم بالسواك الرطب في أول النهار وآخره فقيل لعلي(ع) في رطوبة السواك ، فقال: المضمضة بالماء أرطب منه. فقال علي(ع): فإن قال قائل؛ لابُدَّ من المضمضة لسنة الوضوء قيل له: فإنه لابُدَّ من السواك للسنة التي جاء بها جبريل. ونحوه ماروا‌ه في الإستبصار، عن الصفار، عن ابراهيم بن هاشم، عن موسى بن أبي الحسن الرازي، عن الرضا(ع)، ونقله في البحار، عن قرب الإسناد بالسند المتقدم ذكره.[40]

١۔ .... امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد بزرگوار امام باقرؑ سے روایت فرمایا ہے کہ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: کوئی حرج نہیں کہ روزے دار مرطوب مسواک سے مسواک کرے دن کا ابتدائی حصہ ہو یا آخری حصہ، حضرت علیؑ کو مسواک کی رطوبت و تری کی جانب متوجہ کیا گیا۔ آپ نے فرمایا پانی سے مضمضہ میں کہیں زیادہ تری ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا اگر کوئی یہ کہے کہ مضمضہ اس لیے جائز ہے کہ وہ وضوء کے لیے سنّت ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مسواک بھی ایک ایسی سنّت ہے جس کا حکم جبرئیل لائے ہیں ....

٢ ــ محمد بن يعقوب، عن عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد، عن علي بن الحكم، عن الحسين بن أبي العلاء، قال: سألت أبا عبدالله(ع) عن السواك للصائم، فقال: نعم؛ يستاك أي النهار شاء.[41] ونقل في الوسائل في الباب روايات عديدة، منها: ما عن محمد بن الحسن بإسناده، عن الحسين بن سعيد، عن حماد، عن عبدالله بن المغيرة، عن

ابن سنان (يعني عبدالله)، عن أبي عبدالله. ومنها: عن القاسم بن محمد، عن علي، عن أبي بصير، وعن ابن أبي عمير، عن حماد، عن الحلبي، جميعاً، عن أبي عبدالله. ومنها: عن الحسن، عن صفوان، عن ابن مسكان، عن الحلبي، ومنها: عن علي، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن حماد، عن الحلبي، عن أبي عبدالله، وغيرها كثير. [۴۲] ونحو هذا الحديث دون ذكر السؤال ماروه في الإستبصار، عن علي بن الحسن بن فضال، عن علي بن اسباط، عن العلاء، عن محمد بن مسلم، عن الصادق(ع). [۴۳]

۲. .... حسین بن ابو العلاء کہتے ہیں: میں نے امام صادقؑ سے روزہ دار کے مسواک کرنے کے سلسلہ میں سوال کیا حضرت نے فرمایا وہ دن کے جس حصہ میں چاہے مسواک کر سکتا ہے ....

روایات اہل سنت:

۱ ـــ أخبرناه أبوزكريابن أبي اسحاق المزكي وأبوبكر بن الحسن القاضي، قالا: حدثنا أبوالعباس محمد بن يعقوب، حدثنا بحر بن نصر، قال: قرئ على عبدالله بن وهب أخبرك سفيان الثوري أن عاصم بن عبيدالله بن عمر بن الخطاب حدثه، عن عبدالله بن عامر بن ربيعة العدوي، عن أبيه، قال: ما أحصي و لاأعد مارأيت رسول الله(ص) يتسوك وهوصائم. [۴۴] ورواه الترمذي، عن محمد بن بشار، عن عبدالرحمن بن مهدي، عن سفيان مثله. [۴۵] وأخرجه عبدالرزاق، عن الثوري مثله. [۴۶] وأرسله البخاري، عن عامر بن ربيعة مثله (مع اختلاف في اللفظ فقط). [۴۷] ورواه أبوداود، عن محمد بن الصباح، عن شريك، عن مسدد، عن يحيى، عن سفيان. [۴۸] وأخرجه أبوداود الطيالسي، عن سفيان مثله.

۱۔ .... عامر بن ربیعۃ العدوی اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے پیغمبر اسلام کو لاتعداد و بے شمار مرتبہ حالت روزہ میں مسواک کرتے ہوئے دیکھا....

۲ ــ أخبرنا أبو سعد الماليني، أنبأ أبو أحمد بن عدي، حدثنا محمد بن أحمد بن مزدك البخاري، حدثنا عبيدالله بن واصل، حدثنا محمد بن سلام، أنبأ ابراهيم بن عبدالرحمن، قال: سألت عاصماً الأحول عن السواك للصائم، فقال: لابأس به، فقلت: برطب السواك و يابسه، فقال: أتراه أشد رطوبة من الماء قلت: عمَّن؟ قال: عن أنس بن مالك، عن النبي(ص).[۲۹]

۲. . . . . ابراہیم بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں: میں نے عاصم احول سے روزے دار کے مسواک کرنے کے سلسلہ میں دریافت کیا انھوں نے کہا کہ کوئی حرج نہیں، میں نے کہا مسواک چاہیے خشک ہو یا تر؟ انھوں نے کہا کیا تمہارے خیال میں پانی سے بھی زیادہ تر کوئی چیز ہے؟ میں نے کہا آپ کس سے روایت کر رہے ہیں انہوں نے کہا انس بن مالک سے اور وہ پیغمبر[۲] اسلام سے۔

روزہ میں جماع جائز نہیں، اور اس کا کفارہ۔

روایات اہل بیت[۴]:

۱ ــ محمد بن علي بن الحسين باسناده، عن عبدالمؤمن بن الهيثم (القاسم) الأنصاري، عن أبي جعفر(ع): إنَّ رجلا أتى النبي(ص) فقال: هلكت، وأهلكت، فقال: وما أهلكك ؟ قال: أتيت امرأتي في شهر رمضان وأنا صائم، فقال له النبي(ص): اعتق رقبة، قال: لاأجد، قال: فصم شهرين متتابعين، قال: لاأطيق، قال: تصدَّق على ستين مسكيناً، قال: لاأجد. فأتى النبي (ص) بعذق في مكتل فيه خمسة عشر صاعاً من تمر، فقال له النبي (ص): خذ هذا فتصدق به، فقال: والذي بعثك بالحق نبيا مابين لابتيها أهل بيت أحوج اليه منا، فقال:

خذه وكله أنت وأهلك فانه كفارة لك.[٥٠] ونقله في البحار عن معاني الأخبار عن أبي، عن سعد، عن موسى بن الحسن، عن محمد بن عبدالحميد، عن ابن عميرة، عن ابن حازم مثله.[٥١] وبسنده المتقدم، عن سيف بن عميرة، عن عمرو بن شمر، عن جابر الجعفي، عن الباقر(ع) مثله.[٥٢]

۱۔ .... عبدالمومن بن ہیثم انصاری امام باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ، ایک شخص پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: میں نے دوسرے کو ہلاکت میں ڈالدیا اور خود بھی ہلاک ہوا حضرتؐ نے استفسار فرمایا تجھے کس چیز نے ہلاک کیا؟ اس نے کہا: میں نے ماہ رمضان میں حالت روزہ میں اپنی بیوی سے نزدیکی کی ہے، حضرتؐ نے فرمایا ایک غلام آزاد کرو، اس نے کہا میرے پاس نہیں ہے، آپ نے فرمایا دو ماہ پے درپے روزہ رکھو، اس نے کہا مجھ میں طاقت نہیں، آپ نے فرمایا: ساٹھ مسکینوں کو صدقہ دو، اس نے کہا میرے پاس پیسہ نہیں، چنانچہ پیغمبرؐ ایک ٹوکرے میں کھجور کا خوشہ لے کر آئے جس میں پندرہ صاع کھجور تھی اور فرمایا: لو اسی کو صدقہ کر دو، اس شخص نے کہا: قسم اس ذات کی جس نے آپؐ کو نبی برحق بنا کر بھیجا زمین و آسمان کے درمیان کوئی ایسا نہیں جو میرے اہل خانہ سے زیادہ محتاج ہو، حضرتؐ نے فرمایا: اسے لو، خود کھاؤ اور اپنے بال بچوں کو کھلاؤ، یہی تمہارا کفارہ ہے ....

٢ ـ محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه وعن محمد بن اسماعيل، عن الفضل بن شاذان، جميعاً عن ابن أبي عمير، عن جميل بن دراج، عن أبي عبدالله(ع) أنه سُئِلَ عن رجل أفطر يوماً من شهر رمضان، متعمدا، فقال: إنَّ رجلاً أتى النبي(ص)، فقال: هلكت يا رسول الله، فقال: ومالك؟ قال: النار يا رسول الله، قال: ومالك؟ قال: وقعت على أهلي، قال: تصدَّق وآستغفر (ربك)، فقال الرجل، فوالذي عظم حقك ماتركت في البيت شيئاً لاقليلاً ولا كثيراً، قال: فدخل رجل من الناس بمكتل من تمرفيه عشرون صاعاً يكون عشرة أصرع بصاعنا، فقال له رسول الله(ص): خذ هذا التمر فتصدق به، فقال: يا رسول الله

على من أتصدق به وقد أخبرتك أنه ليس في بيتي قليل ولا كثير؟ قال: فخذه واطعمه عيالك واستغفر الله، قال: فلما خرجنا (رجعنا) قال أصحابنا انه بدأ بالعتق، فقال: أعتق أوصم أوتصدق.[٥٣] ورواه في الإستبصار بسند الكافي.[٥٤] ونقله في البحار عن (ين) (أي كتابي الحسين بن سعيد أو نوادره) عن جميل مثله.[٥٥]

۲۔ .... جمیل بن درّاج سے روایت ہے کہ امام صادقؑ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس نے ماہ رمضان میں عمداً افطار کر لیا تھا، امام نے فرمایا: ایک شخص پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا: یا رسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا، حضرت نے فرمایا: کیا ہوا! اس نے کہا: آگ، آگ یا رسول اللہ! حضرت نے فرمایا: آخر ہوا کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے اپنی بیوی سے نزدیکی کی ہے۔ حضرت نے فرمایا: صدقہ دو اور اپنے پروردگار سے استغفار کرو، اس نے کہا: قسم اس ذات کی جس نے آپ کے حق کو عظیم کیا میرے گھر میں کچھ بھی نہیں، نہ کم نہ زیادہ۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں: اتنے میں ایک شخص ٹوکرا لئے حاضر ہوا جس میں بیس صاع کھجور تھی جو ہمارے صاع سے دس صاع ہو گی، چنانچہ پیغمبرؐ نے اس شخص سے فرمایا: لو اسی کھجور کو صدقہ دے دو، اس نے کہا: یا رسول اللہ میں کسے صدقہ دوں، آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں کہ میرے گھر میں کچھ بھی نہیں نہ کم نہ زیادہ؟ حضرت نے فرمایا: پھر اسے اپنے گھر لے جا کر اپنے بال بچوں کو کھلاؤ اور اپنے پروردگار سے استغفار کرو۔ ابو درّاج کہتے ہیں جب ہم باہر نکلے تو ہمارے ساتھیوں نے کہا امام نے آزادی غلام سے شروع کیا تھا حضرت نے فرمایا تھا: غلام آزاد کرو یا روزہ رکھو یا صدقہ دو۔

٣ ــ علي بن جعفر في كتابه، عن أخيه موسى بن جعفر(ع)، قال: سألته عن رجل نكح امرأته وهو صائم في رمضان، ما عليه؟ قال: عليه القضاء وعتق رقبة، فإنْ لم يجد فصيام شهرين متتابعين، فإنْ لم يجد فإطعام ستين مسكيناً، فإنْ لم يجد فليستغفر الله.[٥٦]

۳۔ علی بن جعفر کہتے ہیں: میں نے امام موسیٰ کاظمؑ سے اس شخص کے کفارہ کے بارے میں سوال کیا جس نے رمضان میں حالت روزہ میں اپنی بیوی سے ہم بستری کی ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا: روزہ کی قضا

اور ایک غلام آزاد کرے گا اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پے در پے دو ماہ روزے رکھے گا اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے گا اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر خدا سے استغفار کرے۔

روایات اہل سنت:

١ ــ أخبرناه علي بن أحمد بن عبدان، أنبأ أحمد بن عبيد الصفار، حدثنا ابن ملحان، حدثنا يحيى بن بكير، حدثنا الليث (ح وأخبرنا) أبو عبدالله الحافظ، حدثنا أبوالوليد الفقيه (إملاء من أصل كتابه)، حدثنا أبوعمران موسى بن سهل الجويني (وفي نسخة. الجوني)، حدثنا محمد بن الرمح، أنبأ الليث، عن يحيى بن سعيد، عن عبدالرحمن بن القاسم، عن محمد بن جعفر بن الزبير، عن عباد بن عبدالله بن الزبير، عن عائشة ــ رضي الله عنها ــ أنها قالت: جاء رجل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: احترقت، قال رسول الله صلى عليه وسلم: لِمَ؟ قال: وطئت امرأتي في رمضان نهاراً. قال: تصدَّق، تصدَّق. قال: ماعندي شيء. فأمره أن يجلس فجاءه عرقان فيها طعام فأمره أن يتصدَّق به.[٥٧] وأقول: وهذا الحديث بألفاظ مشتتة له أسانيد كثيرة ذكرها في البيهقي ورواه مسلم، عن محمد بن الرمح بن المهاجر مثله، وعن ابن المثنى، عن عبدالوهاب الثقفي، عن يحيى بن سعيد مثله.[٥٨] وروى عبدالرزاق نحوه عن معمر، عن عطاء عن ابن المسيب وعن ابن جريج، عن عطاء، عن ابن المسيب.[٥٩] وأخرجه البخاري، عن عبدالله بن منير، عن يزيد بن هارون، عن يحيى بن سعيد مثله.[٦٠] ورواه أبوداود، عن سليمان بن داود، عن ابن وهب، عن عمرو بن الحرث، عن عبدالرحمن وعن محمد بن عوف، عن سعيد بن أبي مريم، عن ابن أبي الزناد، عن عبدالرحمن.[٦١] ورواه الدارمي، عن يزيد كالبخاري.[٦٢]

١۔ .... حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ ایک شخص پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا: میں جل گیا، حضرت نے استفسار فرمایا: کیسے؟ اس نے کہا میں نے ماہ رمضان میں دن میں اپنی بیوی سے نزدیکی کی ہے، حضرت نے فرمایا: صدقہ دو صدقہ، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ!

میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، حضرت نے فرمایا: یہیں بیٹھ جاؤ، چنانچہ اسی اثنا میں ایک شخص دو ٹوکروں میں کھانا لئے حاضر ہوا حضرت نے حکم دیا اسی کھانے کو صدقہ کردو............

....

٢ ـ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ، حدثنا أبو عبدالله محمد بن يعقوب الحافظ، حدثنا جعفر بن محمد بن الحسين بن عبدالله، حدثنا يحيى بن يحيى، أنبأ سفيان بن عيينة، عن الزهري، عن حميد بن عبدالرحمن، عن أبي هريرة، قال: جاء رجل الى النبي (ص) فقال: هلكت يا رسول الله. قال: وما أهلكك ؟ قال: وقعت على آمرأتي في رمضان. قال: فهل تجد ماتعتق رقبة؟ قال: لا. قال: فهل تستطيع أن تصوم شهرين متتابعين؟ قال: لا. قال: فهل تجد ماتطعم ستين مسكيناً؟ قال: لا. قال: ثم جلس فأتى النبي (ص) بعرق فيه تمر فقال: تصدق بهذا. فقال: أهل بيت أفقر منا فما بين لابتيها بيت أحوج اليه منا. فضحك النبي (ص) حتى بدت أنيابه، ثم قال له: إذهب، فأطعمه أهلك. ورواه الترمذي، عن نصر بن علي الجهضمي وأبي عمار، عن سفيان مثله. [٦٣] وأخرجه مسلم، عن يحيى بن يحيى وآبن أبي شيبة وزهير بن حرب وآبن نمير، جميعاً عن سفيان بن عيينة مثله. ورواه ونحوه بأسانيد متعددة... فراجع. [٦٤] ورواه عبدالرزاق، عن معمر، عن الزهري مثله. [٦٥] ورواه البخاري، عن أبي اليمان، عن شعيب، عن الزهري مثله، وكذا عن عثمان بن أبي شيبة، عن جرير، عن منصور، عن الزهري مثله. [٦٦] وأخرجه الحميدي، عن سفيان مثله. [٦٩] ورواه الدارقطني، عن أبي بكر النيسابوري، عن عيسى بن أبي عمران البزاز، عن الوليد بن مسلم، عن الأوزاعي، عن الزهري. [٧٠] وأخرجه الدارمي، عن سليمان بن داود، عن ابراهيم بن سعد، عن الزهري وعن ابن عبدالمجيد، عن مالك، عن ابن شهاب، عن حميد. [٧١]

۲۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابوہریرہ کہتے ہیں ایک شخص پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا، یارسول اللہؐ! میں ہلاک ہوگیا، حضرتؐ نے استفسار فرمایا: کس چیز نے تمہیں ہلاک کردیا؟ اس نے کہا: میں نے ماہ رمضان میں اپنی بیوی سے نزدیکی کی ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا: تمہارے پاس غلام ہے جسے آزاد کرسکو؟ اس نے کہا نہیں، حضرت نے فرمایا: کیا تم دو ماہ پے درپے روزہ رکھ سکتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں، حضرت نے فرمایا: ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ اس نے جواب دیا، نہیں، ابوہریرہ کہتے ہیں وہ شخص وہیں بیٹھ گیا۔ چنانچہ پیغمبر ایک ٹوکرے میں خرمے لے کر آئے اور اس سے کہا اس کو صدقہ دیدو اس نے کہا زمین و آسمان کے درمیان میرے اہل بیت سے زیادہ کوئی محتاج نہیں، یہ سن کر پیغمبرؐ کھلکھلا کر ہنس پڑے اس کے بعد آپ نے فرمایا: جاؤ اپنے بال بچوں کو کھلادو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حواشی:

١ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٤٩) والكافي (ج ٤، ص ١٠٧).
٢ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٥٠).
٣ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٦١).
٤ ــ الترمذي (ج ٣، ص ١٥٥).
٥ ــ أبو داود (ج ٢، ص ٣٠٨) وفيه نقيصة التخليل والإسباغ.
٦ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٦١).
٧ ــ المستدرك (ج ١، ص ٤٣١).
٨ ــ سُنن أبي داود (ج٢، ص٣١١).
٩ ــ الدارمي (ج ٢، ص ١٣).
١٠ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٥٤) والإستبصار (ج ٢، ص ٩١) والكافي (ج ٤، ص ١٠٩).
١١ ــ الفقيه (ج ٢، ص ٦٨).
١٢ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٥٥) ونحوه في ضمن حديث آخر من الوسائل (ج ٥، ص ٥٦).
١٣ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٥٦) والإستبصار (ج ٢، ص ٩٠).
١٤ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٥٥) والبحار (ج ٩٣، ط ح، ص ٢٧٣).

١٥ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٦٤). ورواه أيضاً بأسانيد مختلفة.
١٦ ــ والترمذي (ج ٣، ص ٩٧).
١٧ ــ مصنَّف عبدالرزاق (ج ٤ ص ٢١٣).
١٨ ــ أبوداود (ج ٢، ص ٣١٠).
١٩ ــ الدارقطني (ج ٢، ص ١٨٣).
٢٠ ــ كشف الأستار (ج ١، ص ٤٧٨) ورواه بسند آخر.
٢١ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٦٣).
٢٢ ــ مصنَّف عبدالرزاق (ج٤، ص ٢١٢).
٢٣ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٦٣) وروى البيهقي أيضاً نحوه بسنده عن عكرمة، عن ابن عباس.
٢٤ ــ الترمذي (ج ٣، ص ١٤٦ و١٤٧).
٢٥ ــ مصنَّف عبدالرزاق (ج ٤، ص ٢١٢ و٢١٣).
٢٦ ــ إبن ماجة (ج ١، ص ٥٣٧) وليس فيه: (بين مكة والمدينة).
٢٧ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٦٥) وهذا الحديث رواه البيهقي بأسانيد مختلفة كثيرة، وقد نقل البيهقي بسنده عن أحمدبن حنبل أنه سُئِلَ عن أصح الأسانيد لهذا الحديث، فأجاب بأنه الحديث بالسند الذي نقلناه. وعن علي بن عبدالله أن الأصح هو حديث رافع بن خديج. وعلى كل حال فقد حاول البعض تصحيح هذا الحديث بالنسخ، كما نقل عن الشافعي، ولكن في الحديث المروي عن إبن عباس بطرقنا وجه التصحيح... فراجع.
٢٨ ــ الترمذي (ج ٣، ص ١٤٤) وراجع الدارقطني (ج٢، ص ١٨٢ و١٨٣).
٢٩ ــ مصنَّف عبدالرزاق (ج ٤، ص ٢٠٩ و ٢١٠ و ٢١١).
٣٠ ــ إبن ماجة (ج ١، ص ٥٣٧) وليس فيه القصة في الأول، والثاني فيه القصة، لكنها مع شداد، والثالث كالأول.
٣١ ــ المستدرك (ج١، ص ٤٢٧ و٤٢٨ و٤٢٩).
٣٢ ــ أبوداود (ج ٢، ص ٣٠٨).
٣٣ ــ منحة المعبود (ج ١، ص ١٨٧).
٣٤ ــ الدارمي (ج ٢، ص ١٤).
٣٥ ــ كشف الأستار (ج ١، ص ٤٧١، ٤٧٢، ٤٧٣، ٤٧٤، ٤٧٥، ٤٧٦).

۳۶ ــ الوسائل (ج ۷، ص ۵۱). ونحوه عن إبن أبي يعفور (ص ۵۲) والكافي (ج ٤، ص ۱۱۱). ورواه أيضاً عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن سليمان الفراء، عن غير واحد، عن أبي جعفر(ع). والإستبصار (ج ۲، ص ۸۹).

۳۷ ــ الوسائل (ج ۷، ص ۵۲)، والبحار (ج ۹۳، ط.ح، ص ۲۷۲)، وقرب الاسناد (ص ٤۲).

۳۸ ــ البيهقي (ج ٤، ص ۲٦۲).

۳۹ ــ إبن ماجة (ج ۱، ص ۵۳٦)، إلاّ أن فيه (إكتحل) دون (ربما) وليس فيه (بالأثمد).

٤۰ ــ الوسائل (ج ۷، ص ۱٦۰) وفي الإستبصار (ج ۲، ص ۹۲) والبحار (ج ۹۳، ط.ح، ص ۲۷۲) وقرب الاسناد (ص ٤۳).

٤۱ ــ الوسائل (ج ۷، ص ۵۹) والكافي (ج ٤، ص ۱۱۱) والإستبصار (ج ۲، ص ۹۱) ونحوه في قرب الاسناد (ص ٤۳).

٤۲ ــ الوسائل (ج ۷، ص ۵۷ و۵۸ و۵۹ و ٦۰).

٤۳ ــ الوسائل (ج ۷، ص ۵۹) والكافي (ج ٤، ص ۱۱۱) والإستبصار (ج ۲، ص ۹۱) ونحوه في قرب الاسناد (ص ٤۳).

٤٤ ــ البيهقي (ج ٤، ص ۲۷۲).

٤۵ ــ الترمذي (ج ۳، ص ۱۰٤).

٤٦ ــ مصنَّف عبدالرزاق (ج ٤، ص ۱۹۹) فيه آختلاف يسير في اللفظ فقط.

٤۷ ــ البخاري (ج ۳، ص ۳۸).

٤۸ ــ أبو داود (ج ۲، ص ۳۷) وفيه أن مالاأعد ولا أحصي زيادة مسدد.

٤۹ ــ البيهقي (ج ٤، ص ۲۷۲). وروى البيهقي بسند آخر عن أبي اسحاق الخوارزمي قاضي خوارزم، عن عاصم الأحول، ولكن فيه: قلت أول النهار و آخره؟ قال: نعم.

۵۰ ــ الوسائل (ج ۷، ص ۳۰) وقال في الوسائل عند ذكره الرواية: انَّ هذا الحديث مروي في معاني الأخبار بإسناده، وفي المقنع مرسلاً، والفقيه (ج ۲، ص ۷۲).

۵۱ ــ نفس المصدر السابق.

٥٢ ــ البحار (ج ٩٣، ط.ح، ص ٢٧٩ و ٢٨٠).
٥٣ و ٥٤ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٢٩) والكافي (ج ٤، ص ١٠٢) والإستبصار (ج ٢، ص ٨٠).
٥٥ ــ البحار (ج ٩٣، ط.ح، ص ٢٨١).
٥٦ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٣١).
٥٧ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٢٤) مع وجود اختلاف في لفظ رواية يحيى بن بكير، إذ قال (فجاءه عرق من طعام).
٥٨ ــ مسلم (ج ٣، ص ١٣٩ و ١٤٠) وليس في رواية بن المثنى (تصدَّق تصدَّق) في أوله ولاقوله (نهاراً).
٥٩ ــ مصنَّف عبدالرزاق (ج ٤، ص ١٩٥).
٦٠ ــ البخاري (ج ٣، ص ٣٩) وفيه آختلاف في بيان المعنى، وليس فيه (تصدَّق تصدَّق).
٦١ ــ أبو داود (ج ٢، ص ٣١٤) وفيها آختلاف في كيفية بيان المعنى الواحد.
٦٢ ــ الدارمي (ج ٢، ص ١١).
٦٣ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٢١) والترمذي (ج ٣، ص ١٠٢) وروى مالك نحوه في موطئه (ج ١، ص ٢٧٧ و ٢٧٨).
٦٤ ــ مسلم (ج ٣، ص ١٣٨).
٦٥ ــ مصنَّف عبدالرزاق (ج ٤، ص ١٩٤) فيه اختلاف يسير باللفظ لايضر.
٦٦ ــ البخاري (ج ٣، ص ٣٩) وفيها آختلاف في بيان المعنى الواحد.
٦٧ ــ إبن ماجة (ج ١، ص ٢٣٤) وفيه آختلاف في بيان المعنى.
٦٨ ــ أبو داود (ج ٢، ص ٣١٣) بالمعنى.
٦٩ ــ مسند الحميدي (ج ٢، ص ٤٤١).
٧٠ ــ الدارقطني (ج ٢، ص ١٩٠ و ٢٠٨ و ٢٠٩ و ٢١٠ و ٢١١) وذكر بأسانيد متعددة نحوه.
٧١ ــ الدارمي (ج ٢، ص ١١).

جناب سید احمد فہری

ترجمہ، جناب سید حسین مہدی حسینی

علم و تعلیم امام خمینی اور شہید ثانی کی نظر میں

آداب تعلیم و تعلّم

پڑھنے پڑھانے سے متعلق علماء اخلاق نے جن آداب کا تذکرہ فرمایا ہے، وہ تین قسموں پر مشتمل ہے:

(۱) وہ اصول و آداب جن کی رعایت متعلم و معلم دونوں پر ضروری ہے۔

(۲) وہ اصول و عادات جن کا لحاظ صرف معلم پر لازم ہے۔

(۳) وہ اصول و اطوار جن کی رعایت صرف متعلم پر ضروری ہے۔

اگرچہ بزرگوں نے ان تینوں قسموں پر سیر حاصل بحث کی ہے لیکن میں اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے صرف ان ہی کا تذکرہ کروں گا جن کی رعایت بے حد واجب و ضروری ہے۔

وہ اصول و آداب جس میں استاد و شاگرد دونوں شریک ہیں، اس میں سب سے اہم مسئلہ "خلوص نیت" کا ہے، اس خلوص نیت کی رعایت زندگی کے سبھی افعال و اعمال میں ضروری ہے، اعمال سے اس کا وہی رشتہ و ربط ہے جو جسم کو روح سے ہے۔ اعمال کی قبولیت و عدم قبولیت کا سارا دار و مدار اسی نیت پر ہے۔ اسی لیے معصوم کا ارشاد ہے:

انما الاعمال بالنیات

اعمال کی کسوٹی نیت ہوا کرتی ہے۔

اسی اہمیت کے پیش نظر فقیہ عالیقدر جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب "منیۃ المرید" میں سب سے پہلے اسی "خلوص نیت" کا تذکرہ فرمایا ہے اور معلم اخلاق حضرت امام خمینی دام ظلہ نے بھی اپنی عرفانی تقریروں اور تحریروں میں اس موضوع پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

میں امام بزرگوار کے روح پرور بیانات کی بعض فصلوں کو جو مختلف کتابوں اور جریدوں میں شائع ہو چکی ہیں انشاء اللہ تعالیٰ اس رسالہ میں ذکر کروں گا۔

۱۔ خلوصِ نیّت:

جناب شہید ثانیؒ فرماتے ہیں:

مرحلہ تدریس میں استاد اور مرحلہ تحصیل میں شاگرد پر واجب ہے کہ اپنے عمل کو صرف اور صرف خدا کی خوشنودی کے لیے انجام دے کیونکہ اسی نیت کی بنیاد پر عمل کبھی دُرِ بے بہا بن جاتا ہے اور کبھی سنگریزوں سے زیادہ ناقابلِ ذکر و بیان ـــــ بلکہ کبھی تو اسی "عدمِ خلوص" کی بنیاد پر عمل خود اسی کے لیے گلے کا پھندہ بن جاتا ہے اگرچہ فریضہ واجب کی شکل ہی میں کیوں نہ انجام دیا گیا ہو۔ (مثلاً نماز فریضہ اگر کسی کو دکھانے کے لیے انجام دی گئی ہو)

لہٰذا ایسی صورت میں دونوں کا فریضہ ہے کہ درس و تدریس کے وقت صرف خدا کی خوشنودی اس کے حکم کا امتثال، اپنے نفس کی اصلاح، اور اس کے بندوں کو راہ حق و صواب کی نشاندہی کا جذبہ کارفرما ہو۔ اگر خدانخواستہ درس و تدریس کا مقصد مال و منصب کا حصول، شہرت و عزت کی خواہش، عوام میں اپنی برتری، دوستوں اور بھائیوں پر اپنا تشخص، ہو تو یہ مقاصد نگاہ معبود میں دونوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں اور اس کے خشم و غضب کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اور ایسے افراد اس منزلِ آخرت سے محروم ہو جاتے ہیں جسے خداوند کریم نے اچھے عمل کی جزاء میں قرار دیا ہے بلکہ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو عمل کے اعتبار سے گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔ ان ہی جیسوں کی طرف اشارۂ قرآن کریم ہے:

> یہ وہ لوگ ہیں جو دنیاوی زندگی میں گمراہ ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ اچھے کام انجام دیتے ہیں۔ (سورہ کہف/۱۰۵)

اخلاص کی جامع تعریف ان الفاظ میں کی جا سکتی ہے:

> انسان وقتِ عبادت اپنے نہاں خانۂ دل سے غیر از خدا ہر تصور کو نکال پھینکے ـــــ کیونکہ اس کا حکم ہے:

فاعبد اللہ مخلصاً لہ الدین الا للہ الدین الخالص (سورہ زمر/ ۲،۳)

خدا کی ایسی حالت میں عبادت کرو جب دین کو اس کے لیے خالص کر چکے ہو یہ یاد رکھو عبادت تو صرف خدا ہی کے لیے زیبا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء (سورہ بینہ/ ۵)

انہیں تو بس یہ حکم دیا گیا تھا کہ نرا کھرا اسی کا اعتقاد رکھ کر خدا کی عبادت کیا کریں ..... اور یہ ہے سچا دین۔"

مزید ارشاد ہے:

فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملاً صالحاً ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً (سورہ کہف/ ۱۱۰)

جو شخص خدا سے امید ملاقات رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ اچھے کام کرے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے لیے نازل ہوئی ہے جو اچھے کام اس لیے انجام دیتے ہیں کہ لوگ اس کی وجہ سے ان کی توصیف و تعریف کریں۔

خدا کا ارشاد ہے:

من کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منھا وما لہ فی الآخرۃ من نصیب (سورہ شوریٰ/ ۲۰)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا اسی دنیا میں طالب ہو تو ہم اسے اسی جگہ دے دیں گے لیکن پھر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا لہ جھنم یصلٰھا مذموماً مدحوراً۔ (سورہ بنی اسرائیل/ ۱۸)

جو شخص اپنے عمل کا بدلہ اسی دنیا میں چاہتا ہو تو ہم جسے چاہتے اور جو چاہتے ہیں اسی دنیا میں

عطا کرتے ہیں مگر اس کے بعد تو ہم نے جہنم کو اسی کا آخری ٹھکانا قرار دیا ہے جس میں وہ بری حالت میں راندا ہوا داخل ہوگا۔

مرسل اعظم کا ارشاد ہے:

انما الاعمال بالنیات وانما لکل امری ما نوی فمن کان ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرئۃ ینکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ

بے شک عمل کا دار و مدار نیت پر ہے بلاشبہ ہر شخص کو اس کی نیت کے اعتبار سے عطا کیا جائے گا۔ لہذا اگر کسی شخص نے خدا و رسول کی طرف ہجرت کی تو یقیناً اس کی ہجرت خدا و رسول کی طرف ہوگی۔ اور اگر کسی شخص نے منفعت دنیا یا حصول زن کی غرض سے ہجرت کی تو درحقیقت اس کی ہجرت کا مقصد یہی چیزیں قرار پائیں گی۔

یہ حدیث اسلام کی اساس و بنیاد کے طور پر قرار دی گئی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ حدیث ایک تہائی علوم کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ بعض افاضل نے اس کی توجیہ اس طرح کی ہے:

انسان جب کسی عمل کو انجام دیتا ہے تو یا "دل" کے ذریعہ انجام دیتا ہے یا ہاتھوں کی مدد، اور زبان کے اظہار سے پورا کرتا ہے۔ لہذا اس صورت میں "انسانی عمل" میں ایک تہائی دخالت نیت کی ہے، اور یہی نیت بذات خود عبادت ہے کیونکہ ہاتھوں کے تعاون اور زبان کے اظہار کے بغیر بھی نیت عبادت ہے لیکن نیت کے بغیر نہ تو زبان کا اظہار عبادت ہو سکتا ہے اور نہ ہاتھوں کی سعی و کوشش۔

بزرگوں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کا ہمیشہ شعار رہا ہے کہ اپنی تصنیف و تالیف کے آغاز میں اس حدیث کو لکھ دیا کرتے تھے تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو "خلوص نیت" کی طرف متوجہ کر سکیں اور اس کی اہمیت سے باخبر کرتے رہیں۔

اسی لئے مرسل اعظم کا ارشاد ہے:-

نیۃ المومن خیر من عملہ و فی لفظ آخر ابلغ من عملہ

مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے اور دوسری حدیث میں ہے کہ رسا تر ہے۔

دوسری جگہ آنحضرت کا ارشاد ہے۔

توحید ۶۸

انما یبعث الناس علی نیاتھم

بلاشبہ انسان اپنی نیتوں کے اعتبار سے مبعوث کیے جائیں گے۔

مرسل اعظم فرماتے ہیں مجھ سے جبرئیل اور جبرئیل سے حضرت احدیت نے فرمایا:

الاخلاص سر من اسراری استودعتہ قلب من احببت من عبادی

"خلوص نیت" میرے رازوں میں سے ایک راز ہے، میں اسے اپنے محبوب کو ودیعت کرتا ہوں۔

آنحضرت کا مزید ارشاد ہے:۔

ما ازداد عبد علماً فازداد فی الدنیا رغبۃ الا ازداد من اللہ بعداً

کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جس میں علم میں اضافہ کے ساتھ ساتھ حب دنیا میں بھی اضافہ ہوتا جائے مگر یہ کہ وہ اتنا ہی خدا سے بھی دور ہوتا جائے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا:۔

مثل الذین یعلم الناس الخیر وینسی نفسہ مثل الفتیل تضیئ الناس وتحرق نفسہ وفی روایۃ کمثل السراج۔

جو لوگ دوسروں کی تعلیم و تربیت کرتے ہیں اور خود عمل نہیں کرتے ان کی مثال اس چراغ کی ہے جس سے دوسرے تو کسب نور کرتے ہیں لیکن وہ خود جلتا رہتا ہے۔

کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا:۔

من طلب العلم لیباھی بہ العلماء او یماری بہ السفہاء او یصرف وجوہ الناس الیہ فلتبوأ متعدہ من النار ان الریاسۃ لاتصلح الا لاھلھا۔

اگر کوئی اس لیے علم حاصل کرے کہ اس کے ذریعہ اہل علم پر فخر و مباہات کرے، یا عوام کو بحث ومباحثہ، تو تو، میں میں، میں شکست دے، یا اپنے علم کے ذریعہ لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرائے، تو ایسے شخص کا انجام جہنم ہے کیونکہ منصب ریاست اس کے اہل ہی کے لیے زیبا ہے۔

صاحب اصول کافی امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ، آنحضرت نے فرمایا:

من اراد الحدیث لمنفعة الدنیا لم یکن لہ فی الآخرة نصیب و من اراد بہ خیر الآخرة اعطاہ اللہ خیر الدنیا و الآخرة

جو حدیث کو دنیاوی فائدے کے لئے حاصل کرے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ لیکن جو اس کے ذریعہ اپنی آخرت سنوارنا چاہتا ہو، خداوند عالم اسے دنیا و آخرت کی سعادتوں سے مالا مال کر دے گا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا مزید ارشاد ہے:

متعلمین تین قسم کے ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جن کا مقصد جنگ وجدال ہوتا ہے۔ اور کچھ وہ ہوتے ہیں جن کی غرض لوگوں کو فریب دینا اور اپنے کو نمایاں کرنا ہے ــــ اور کچھ کا تحصیل علم سے مقصد اپنے نفس کی اصلاح اور کمال انسانی کا حاصل کرنا ہوتا ہے۔

جو جنگ وجدال کے لئے پڑھتے ہیں۔ ان کی ذات سے ہمیشہ آزار و تکلیف پہنچتی رہتی ہے۔ یہ لوگ علمی بزموں میں اپنے کو حلیم و بردبار، خاموش طبع، پڑھا لکھا ظاہر کرتے ہیں لیکن درحقیقت تقویٰ و پرہیزگاری سے خالی ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ ایسے ہیں لہٰذا خدا انہیں ذلیل و خوار کرے گا۔

اور جس کا مقصد تحصیل علم سے مکر و فریب ہوا کرتا ہے ایسے افراد کا مشغلہ چاپلوسی و بازی گری جا کرتا ہے۔ اپنوں سے تو اکڑ کر ملتے ہیں لیکن صاحبان ثروت کے سامنے خاکسار ہو جاتے ہیں اور دولت و ثروت کی حلاوت کی خاطر اپنے دین کا سودا کرتے رہتے ہیں۔ خدا ان جیسوں کو کور دل بنا دیتا ہے اور اہل دانش و بینش کے درمیان سے ان کے نام و نشان کو مٹا دیتا ہے۔

مگر تحصیل علم سے جن کا مقصد "فقہ و عمل" ہوا کرتا ہے وہ ہمیشہ شکستہ دل، رنجیدۂ خاطر، اور سحر خیز رہا کرتے ہیں۔ تاریکی شب میں عمامے کے گوشوں کو سینوں پر لٹکائے ہوئے (تحت الحنک) اپنے معبود سے مصروف راز و نیاز ہوتے ہیں۔ ان کے دل خوف خدا سے مضطرب اور ان کی زبانیں ذکر الٰہی میں متحرک ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں اپنے زمانے کے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ اپنے قریبی اعزا سے بھی ڈرتے ہیں۔ خدا انہیں ان کے عمل کی جزا میں لغزشوں سے محفوظ رکھتا ہے اور روز قیامت اس دن کی سختیوں سے نجات دے گا۔

یہ انہیں چالیس روایتوں میں سے ایک ہے جسے معلم اخلاق حضرت امام خمینی دام ظلہ نے اپنی کتاب "اربعین" میں شرح و بسط کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔

امام خمینی دام ظلہ روایت کے اس جملہ کے متعلق جس میں معصومؑ نے فرمایا ہے — کہ بعض طالب علم وہ ہوتے ہیں جن کا مقصد تحصیل علم سے جہالت و نادانی ہوا کرتا ہے — تعجب و تأسف سے لکھتے ہیں کہ — طالب علم بھی ہو اور پھر بھی جہالت کی تاریکی سے نہ نکل سکے۔ پھر اس کے بعد امام امت دام ظلہ نے ان مفاسد پر روشنی ڈالتے ہوئے جو باہمی اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا اثر طالب علم کی زندگی پر مرتب ہوتا ہے۔ (چونکہ یہ بحث میرے موضوع کا جزو نہیں لہٰذا چھوڑ رہا ہوں) فرماتے ہیں:

ان روایات و بیانات سے واضح ہوا کہ "عدم خلوص" ایک ایسی مذموم صفت ہے جو ہر قسم کی بدبختی و محرومی کا سرچشمہ ہے۔ انسان کا فریضہ ہے کہ زندگی کے ہر عمل میں خواہ کسی شعبۂ حیات سے متعلق کیوں نہ ہو اپنے کو اس رذیل صفت ایمان دشمن خصلت سے محفوظ رکھے۔ ہر عمل سے پہلے اپنے قلب کو خلوص نیت سے مملو اور اپنے باطن کو صدق و صفا سے مزین کرے۔

کسی عمل میں خلوص نیت کا نہ ہونا عظیم خسارہ کا سبب بنتا ہے اسی لیے امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

فدق اللہ من ھذا خیشومہ وقطع منہ حیزومہ

خدا ایسوں کو ناکام و نامراد بنا دیتا ہے۔

نہیں معلوم یہ عبارت خبر ہے یا دعا بہرحال پوری ہو کر رہے گی۔ کیونکہ اگر خبر ہے تو صادق و مصدق کے دہن سے نکلی ہے اور اگر دعا ہے تو بھی پوری ہو گی کیونکہ خاصان خدا کی دعائیں رد نہیں ہوتیں — حضرت کا ارشاد خود کنایہ ہے کہ جو افراد "خلوص نیت" سے کام نہیں لیتے "دنیا و آخرت میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے۔

جو لوگ خود نمائی و اظہار فضیلت کے ذریعہ اس دنیا میں عزت و شہرت کے حریص ہوتے ہیں ان کی عزت و شہرت میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ اور کمی آتی ہے۔ اور آخرت میں حضرات انبیاء و مرسلین، خاصان خدا اور ملائکہ مقربین کے سامنے ذلیل و رسوا ہوتے ہیں۔

افسوس ہے خود ہم لوگوں کے حالات پر کہ ہم لوگ بحث و مباحثہ کے خوگر خواہشات نفسانیہ

ما اسیر، اس بے رحم و خبیث نفس کے اغواء سے نہیں بچتے جو ہمیں چار دانگ عالم میں رسوا کئے ہوئے ہے۔
ی وقت بھی اپنے نفس کی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہوتے غفلت و بے حسی کی لوریوں میں پڑے سوئے ہیں۔

کریم! تو اپنے بندوں کا مصلح اور انہیں توفیق مرحمت فرمانے والا ہے۔ موجودات عالم ترے اقتید
قتدار کے سامنے خاضع ہیں، انسانوں کے ارادے تیری مشیت کے تابع ہیں۔

کریم! ہم خود اپنے نفع و ضرر پر قادر نہیں تو ہی ہماری موت و حیات کا مالک ہے۔ تو ہی ہمارے تاریک
وں اور ہمارے ملکہ مغلوب کو اپنے فیض و کرم کی تجلی سے منور فرما، اور ہم مجبوروں کی دستگیری کر۔

امام امت دام ظلہ نے اس تنبیہ کے بعد جو درحقیقت ان افراد کے لیے موعظہ حسنہ ہے جو اپنے نفسوں
ی اصلاح میں مشغول و مصروف ہیں ـــ ایک مفصل بحث پیش فرمائی ہے جس میں تکبر و نخوت کے درجات
ور ظاہری افعال پر اس کے اثرات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ میں قارئین محترم کے استفادہ کے لیے اسے یہاں
یش کر رہا ہوں۔

نیز بارگاہ حضرت احدیت میں اس نعمت الٰہیہ پر جو اس نے ہمیں ایک رہبر آگاہ و دین دار
امام خمینی) کی شکل میں مرحمت فرمائی ہے، شکرگذار ہوں۔ کریم توفیق سعادت و خوش بختی مرحمت فرمائے۔
علم عرفان و اخلاق حضرت امام خمینی فرماتے ہیں:

جن لوگوں میں تکبر و نخوت، جاہ طلبی، اور خود نمائی و عوام فریبی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے ان کی کچھ
اص علامتیں اور پہچان بھی ہیں کہ کچھ کا تذکرہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے ارشادات میں ملتا ہے۔

ان علامتوں میں سے ایک علامت تو یہ ہے کہ ایسے افراد خود کو عوام کا ہمدرد و بہی خواہ معرفی
رتے ہیں جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں بلکہ ان کی حیثیت آدم خور بھیڑیوں کی سی ہے جو انسانی لباس میں
شیطانی مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں۔ خدا کے بندوں میں یہ لوگ سب سے زیادہ بدتر اور انسانوں کے دین
مذہب کے لیے مخالفین سے زیادہ نقصان دہ ہیں۔

ان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ یہ لوگ کمال خاکساری تواضع کا مظاہرہ کر کے اپنے معتقدین کو
پا گرویدہ بنائے رہتے ہیں۔ دنیاوی احترام اور تصنع آمیز لفظوں کے ذریعہ سادہ لوح انسانوں کی دنیا
سے اپنے دین کا سودا کرتے رہتے ہیں۔ یہ وہی افراد ہیں جن کے لیے معصوم فرماتے ہیں ـــ کہ جس وقت
ل بہشت انہیں دیکھیں گے تو سوال کریں گے یہ کیا ہوا کہ ہم تو تمہاری تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ جنت

تک پہنچ گئے اور تم خود جہنمی رہ گئے یہ جواب دیں گے ــــ ہمارے قول و فعل میں ہم آہنگی نہیں تھی۔
ان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اپنے ہم مشرب و ہم خیال جن سے دنیاوی منفعت کی کوئی توقع نہیں ہوتی۔ انھیں خاطر میں نہیں لاتے بلکہ اپنی راہ کا کانٹا تصور کرتے ہوئے ہمیشہ ان کی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے۔ انہیں خوف رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو ان لوگوں کے وجود سے ان کے وقار کو ٹھیس پہنچے۔
یہ حقیقت ہے کہ لباس اہل علم پہن لینے کے بعد سب سے زیادہ سخت و دشوار چیز دینداری ہے، اس راہ میں زہد، تقویٰ و پرہیزگاری کا لحاظ اوروں سے زیادہ رکھنا پڑتا ہے کیونکہ اگر کسی نے اس وادی میں قدم رکھنے کے بعد پہلے اپنی اصلاح کی پھر دوسروں کی اصلاح کے لئے متوجہ ہوا خلوص کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا تو ایسا ہی شخص اتباع آل محمدؐ (شیعہ) کی تعلیم و تربیت کے صلہ میں مقرب بارگاہ حضرت احدیت قرار پاتا ہے۔ اسی لئے امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے والد ماجد کے مخصوص چار حلقہ بگوش کے لیے یوں فرمایا ہے: (وسائل بحوالہ رجال کشی بہ سند ابوعبیدہ حذاء)

زرارہ، محمد بن مسلم، ابو بصیر، اور برید ان لوگوں میں سے ہیں جن کے لیے خدا نے ــــ السابقون السابقون اولئك المقربون ــــ فرمایا ہے۔

اس ضمن میں بے شمار حدیثیں کتابوں میں ملتی ہیں ــــ اہل علم کی فضیلت اس سے کہیں زیادہ ہے جو بیان کی جائے۔ ان کی فضیلت میں مرسل اعظمؐ کی ایک حدیث پر اکتفا کرتا ہوں۔

من جاءه الموت وهو يطلب العلم ليحيي به الاسلام كان بينه وبين الانبياء درجة واحدة في الجنة؛

اگر کسی کو ایسی حالت میں موت آجائے کہ وہ فروغ اسلام کی خاطر تحصیل علم دین میں مصروف ہو تو ایسے مرنے والے قیامت میں حضرات انبیاء علیہم السلام سے بہت تھوڑے فاصلہ پر ہوں گے۔

اگر طالب علم دین خدانخواستہ اخلاص کے جادہ سے بھٹک کر راہ باطل کو اختیار کرے تو ان لوگوں کے زمرہ میں شمار ہوتا ہے جنھیں علماء سوء کہا گیا ہے جن کی مذمت میں شدید حدیثیں وارد ہوئی ہیں ــــ لہٰذا ہر عالم و متعلم کا فریضہ ہے کہ اس راہ پُر خطر سے عبور کرتے وقت سب سے پہلے اپنی اصلاح کا جذبہ مقدم رکھے۔ بلکہ چاہئے تو یہ کہ اس جذبہ کو تمام جذبوں پر فوقیت دیتا رہے۔

زیادہ دشوار تر ہے۔
کیونکہ اصلاح نفس تمام عقلی و شرعی فرائض و واجبات میں سب سے زیادہ دشوار تر ہے۔
ہاں — اے علوم و معارف کے آرزو مندو! خواب غفلت سے چونکو — خدا کی حجت تم پر تمام ہو چکی ہے۔ خدا کے حضور میں تم سے سخت باز پرس کی جائے گی، تمہارا انداز حساب و کتاب دوسروں سے جدا ہوگا، تمہیں جس پل صراط سے گذرنا ہوگا، بہت زیادہ باریک ہوگا، تمہارے نامہ اعمال میں زیادہ ردّ و قدح کی جائیگی۔
افسوس ہے اس عالم پر کہ عالم و دانش اس کے قلب و شعور کو مکدر و تاریک بنائے۔ اسے ہم خود بھی محسوس کرتے ہیں کہ جب کسی ناقص مفہوم یا بے مقصد اصطلاحوں سے آشنا ہوتے ہیں تو شیطان ہم پر مسلط ہو جاتا ہے اور ہمیں جادہ حق و اعتدال سے منحرف کر دیتا ہے۔ یہی بے سروپا مفہوم ہیں جو ہماری بے راہ روی کا سبب ہوئے ہیں۔ ایسی بے چارگی میں خدا کے علاوہ کوئی بچانے والا نہیں۔
کریم — ! ہمیں اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کا اقرار ہے — نہ یک گام تری رضا میں چلا اور نہ کوئی طاعت و بندگی جذبۂ خلوص سے انجام دی — تو اپنے لطف عمومی اور رحمت بے پایاں کے ذریعہ ہمیں درگذر فرما، جس طرح اس دنیا میں میرے عیوب پر پردے ڈالے، عالم آخرت میں بھی مورد عفو قرار دے کیونکہ ہم وہاں زیادہ تیرے عفو و کرم کے محتاج ہیں۔
اس جگہ ضروری ہے کہ حدیث کے اس پہلے فقرہ کو دوبارہ ذکر کر دوں جس میں حضرت نے فرمایا ہے کہ:

فاعمی اللہ علی ھذا خبرہ وقطع من آثار العلماء اثرہ

خدا اس کی بصارت و بصیرت کو چھین لے گا اور آثار علماء سے اس کا نام محو کر دے گا۔
بہرحال خواہ یہ حدیث ہو یا دعا پوری ہو کر رہے گی، انسان کا فریضہ ہے کہ ڈرتا رہے کہیں "عدم خلوص" کی وجہ سے کور باطن نہ ہو جائے کیونکہ عدم بصیرت ہی ہر قسم کی شقاوت و بدبختی کا سرچشمہ ہے۔ اور ہمیشہ متوجہ رہے کہیں آثار علماء سے اس کا نام محو نہ ہو جائے۔ کیونکہ اس میں محرومی و ناکامی کے ساتھ بارگاہ حضرت احدیت میں خاصان خدا کے سامنے ذلت و رسوائی کا سبب ہے۔

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
ترجمہ: جناب سید مہدی سرباز

اسلام کا تصور کائنات

تصور کائنات یا جہاں بینی دنیا اور اس کے آغاز و انجام کے بارہ میں کسی مکتب فکر کے تصورات و نظریات کا نام ہے۔ اس کے ذیل میں تخلیق کائنات، اس کے نظام و روابط اور دائرہ کار کی تفسیر و توجیہ سے مجموعی طور پر بحث کی جاتی ہے۔ چونکہ انسان کائنات کا ایک اہم ترین جزء ہے۔ اس لیے تصور کائنات کا ایک اہم ترین حصہ انسان کی وقعت و اہمیت، اس کی تخلیق کا مقصد اور کائنات کو طے کرنے کے مراحل سے مربوط ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ایسی تفسیر و توجیہ پر کسی معاشرہ کے اجتماعی نظام اور افراد کے اخلاقی، فکری اور تربیتی اصول کی بنیادیں مرتب ہوتی ہیں۔ چنانچہ تمام مذاہب یا اجتماعی و فلسفی مکاتیب فکر کائنات کے بارے میں لازمی طور پر کسی نہ کسی خاص نظریات کے حامل ہیں۔ جو ان مکاتیب فکر کے عقائد و اصول میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہم یہاں تصور کائنات کی اہمیت واضح کرنے اور معاشرے نیز افراد کے عمل سے اس کے رابطہ پر روشنی ڈالنے کی غرض سے دو مثالوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

۱۔ دنیوی زندگی کے بارے میں ایک مکتب فکر یا مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے برخلاف دوسرا مکتب دنیا ہی کو سب کچھ اور اس کے علاوہ ہر چیز کو ہیچ تصور کرتا ہے۔ لیکن اسلام اس کو ایک ایسی بنیادی حقیقت قرار دیتا ہے جس پر آئندہ ایک وسیع ترین حیات انسان کا دارو مدار ہے۔ پہلے نظریہ کے مطابق تمام تر کوششیں اور تدبیریں اس زندگی کے سلسلہ میں بے کار و بے معنی ہیں اس نظریہ کا تربیتی اثر یہ ہے کہ انسان گوشہ نشینی اختیار کرکے زندگی کے ہر موڑ پر پسماندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر دوسرے نظریہ کو قبول کر لیا جائے تو تمام تر قوت و صلاحیت صرف

اس چند روزہ زندگی کی آرائش و راحت پر صرف کیجائے گی اور انسان کی کارکردگی کا دامن تنگ اور محدود ہوجائیگا لیکن تیسرے مکتب فکر (اسلام) میں دنیا میں زندگی گذارنے اور ترقی کی منازل طے کرنے کے ساتھ ساتھ کمال انسانی تک پہونچنے اور آخرت کی سعادت و کامرانی حاصل کرنے کا تصور بھی کارفرما ہے۔

۲۔ مقصد حیات سے متعلق ایک نظریہ حصول عیش و لذت کا ہے تو دوسرا نظریہ محض روح کے ارتقاء و کمال کا ہے۔ جبکہ اسلام جسم و جان دونوں کی بہتری کا تصور فراہم کرتا ہے۔ پہلی صورت میں تمام کوششیں مادی اور جسمانی لذتوں کے حصول تک محدود ہیں جبکہ دوسری صورت میں اس کے برعکس جسم جتنا زیادہ زیادہ محرومیت برداشت کرے گا روحانی کمال میں اضافہ ہوتا جائیگا۔ ان کے مقابلے میں اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ جسمانی ضرورتیں بھی عادلانہ اور معقول طریقے سے پوری ہونی چاہئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خواہش نفسانی خود پرستی اور دیگر اخلاقی برائیوں کے خلاف جدوجہد کرنا نیز علم و روحانیت اور جذبہ خدمت کے ذریعہ روحانی کمال بھی حاصل کرنا چاہئے۔

اب ہم کائنات کے بارے میں اسلامی نظریات پر بتدریج گفتگو کریں گے۔ اس کے ذیل میں ضمناً ان نظریات کے ذریعہ مرتب ہونے والے ان اثرات کا بھی جائزہ لیں گے جن کا مسلمانوں کے رجحانات، رفتار اور تربیت میں خیال رکھنا ضروری ہے۔

یکتا پرستی:

اسلام کہتا ہے کہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور کوئی شئی بھی اس کی خلقت و قدرت کے دائرے سے باہر نہیں۔ نیز ساری کائنات کا ایک ہی خالق ہے۔ جو کوئی شریک، ساتھی اور اولاد نہیں رکھتا اور کائنات اسی کے حسن تدبیر کا نتیجہ ہے یعنی کائنات کا وہی خالق بھی ہے اور منتظم بھی۔ اس کا حکم پوری کائنات میں جاری و ساری ہے اس کا وجود ازلی و ابدی ہے۔ یعنی وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہنے والا وہ ہر چیز سے آگاہ اور ہر چیز پر قادر ہے۔ جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے وہ اس سے باخبر ہے ماضی و مستقبل اور ظاہر و باطن سب کا علم رکھتا ہے۔ خدا ہر شئی پر مکمل اختیار رکھتا ہے اور دنیا کے تمام امور اسی کی حسن تدبیر سے انجام پاتے ہیں۔ حاکمیت مطلقہ اسی کی ہے وہ ہر چیز اور ہر شخص کا مالک ہے خدا سب سے بے نیاز ہے مگر سب اس کے محتاج ہیں۔ اس کی رحمت سب پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کا فیض

ہے اور فضل و احسان بلا استثنا ساری موجودات پر سایہ فگن ہے۔ خدا اپنے بندوں سے نزدیک ہے سب کے حالات سے باخبر اور مشکلوں کا حل کرنے والا ہے۔ سب کا مددگار اور سرپرست ہے۔ وہ ایسا انصاف کرنے والا ہے جو سرکشوں اور جابروں سے انتقام لینے والا اور نیک کردار بندوں پر شفیق و مہربان ہے۔ ذات خداوندی کا کمال مطلق و لامحدود ہے۔

خداوند عالم کے بارے میں اسلام کے ان نظریات سے ہمیں یہ درس ملتا ہے کہ:-

۱۔ کائنات اتفاقی یا اپنے آپ پیدا نہیں ہوئی بلکہ خداوند عالم اس کا خالق ہے۔

۲۔ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ یہاں تک کہ کائنات کا نظم و ضبط اور ایک دوسرے رابطہ نیز ہواؤں کے چلنے کے اسباب و علل بھی اسی کی جانب سے ہیں۔ اس لحاظ سے حادثات رونما ہونے کی صورت میں یہ ضروری نہیں کہ ہم اس کے فطری اسباب و علل کے منکر ہو جائیں بلکہ ہر شئی اپنے وجود کی علت اپنے اندر رکھتی ہے البتہ یہ تمام اسباب و روابط جن کو ہم قوانین علمی سے تعبیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہی خلق کردہ ہیں چنانچہ ہم علم کے منکر نہیں ہیں بلکہ ان سب چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادۂ الٰہی کا پابند قرار دیتے ہیں۔

۳۔ کسی بھی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک اور مددگار نہیں۔ اسی لئے ہر طرح کے شرک یا دوئی کے تصور، تثلیث کے عقیدے بتوں، مجسموں، تصویروں، روحوں، انسانوں یا عناصر فطرت کے سامنے سر جھکانے اور تعظیم بجالانے کی مذمت کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ خود اپنی طرف سے اذن خدا کے بغیر کسی گناہ بخشنے والے، جنت بھیجنے والے یا حاجت پوری کرنے والے شفیع اور واسطہ کا تصور اسلام میں وجود نہیں رکھتا ہے خدا کے علاوہ ہر ایک جو بھی ہو جیسا بھی ہو اسی کی مخلوق میں شمار ہوتا ہے۔

۴۔ خداوند عالم مدبر کائنات ہے۔ جو لوگ ذات احدیت کو دنیا کے امور کی انجام دہی سے غیر متعلق تصور کرتے ہیں۔ ان کے برخلاف اسلامی نظریہ خدا کو کائنات کے تمام امور کا مالک و مختار قرار دیتی ہے۔ لہذا تمام کائنات میں خدا مختار ہے من جملہ وہ انسانی زندگی میں بھی دخیل ہے ان کے لئے بھی احکام و قوانین رکھتا ہے اس نے انسان کو اپنے حال پر نہیں چھوڑ دیا ہے اور یہیں سے ضرورت دین و وحی ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ انسان کے لئے راہ حیات روشن ہوتی ہے۔

کائنات کے بارے میں اسلامی طرز فکر اجتماع اور معاشرہ میں جو اثرات مرتب کرتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

توحید ۷۷

الف اقوام عالم کے درمیان اتحاد و ہمبستگی ۔

چونکہ "توحید اسلامی" کے ذیل میں ہم یہ سمجھ چکے ہیں کہ تمام انسانوں بلکہ تمام موجودات کا خدا ایک ہی ہے ۔ جو سب کا خالق اور روزی رساں ہے ۔ وہی ہر ایک کی پرورش کرتا ہے ۔ اس کی رحمت عام اور سب پر سایا فگن ہے ۔ اسی لیے تمام لوگوں کو صرف اس کی پرستش کرنی چاہئیے اور اسی کی رحمت پر بھروسہ کرنا چاہئیے ۔ اس طرح سب کی پیدائش و خلقت ایک ہی نقطہ سے ہے اور سب کی کوشش اور جدوجہد کا مقصد بھی اسی سے وابستہ ہونا چاہئیے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (بقرہ/۱۵۶)

جب تمام انسانوں کا نقطۂ آغاز، مقصد حیات، جستجو اور فعالیت کا محور ایک ہے تو ہر ایک کو ایک ہی خالق کا بندہ سمجھنا چاہئیے اور اسی کی طرف قدم بڑھانا چاہئیے اس طرح ان کے درمیان اختلاف و جدائی کا وجود نہیں رہ سکتا ۔

والٰھکم الٰہ واحد (کہف/۱۱۰)

تمہارا خدا ایک ہے ۔

لا الٰہ الا انا فاعبدون (انبیاء/۲۵)

میرے سوا کوئی خدا نہیں تم سب صرف میری عبادت کیا کرو ۔

ب ۔ نظریہ توحید کا دوسرا اثر مساوات و عدالت کا قیام ہے ۔ چونکہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے قدرت مطلقہ ذات خداوندی میں متمرکز ہے ۔ خدا ہر شئے سے باخبر ہے ۔ اسی لئے بلا شریک حکومت خلاق عالم ہی کی ذات کے لیے شایان شان ہے ۔ ہر شئی اس کی اطاعت میں ہے ۔ اسی کے احکام اس وسیع کائنات میں نافذ ہیں قرآن مجید کی وہ تعبیریں جو اس مطلب کو واضح کرتی ہیں بہت کافی ہیں :۔

ھو الحی القیوم (بقرہ/۲۵۵)

بیدہ الملک (ملک/۱)

لہ الحکم (انعام/۶۲)

للہ الامر من قبل ومن بعد (روم/۴)

وھو علی کل شئی قدیر (ہود/۴)

ہر شئی کی کامل مالکیت بھی دست الٰہی میں ہے ۔ تمام فطری اور قدرتی وسائل نیز مال و دولت

اسی نے خلق کئے ہیں۔ اور خداوند عالم کو ان سب چیزوں پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ اور یہ سب نعمتیں تمام لوگوں کے لیے خلق ہوئی ہیں۔

خلق لکم مافی الارض جمیعًا (بقرہ/ ۲۹)

جو کچھ بھی زمین میں ہے تم لوگوں کے لیے خلق کیا گیا ہے۔

معلوم ہوا کہ حقیقی اختیار و ملکیت تو خدا کے ہاتھ میں ہے اور باقی تمام اس کی مخلوق ہیں جن کو اللہ تعالٰی کی نعمتوں سے استفادہ کرنے کا حق حاصل ہے اب کسی چیز پر کسی خاص فرد کی ملکیت اور تصرف کے لیے خاص قوانین وضع کئے گئے ہیں تاکہ دوسروں کے حقوق کا خیال رکھا جا سکے یہ قوانین برابری اور عدالت پر مبنی ہیں۔ چنانچہ دوسروں کے اختیارات، ارادے اور طاقت و قدرت و حکومت اللہ تعالٰی کی قدرت کاملہ کے تحت ہیں۔ اسی لئے کبھی بھی اس قوت و قدرت سے کام لیکر خود سری و خود پسندی کی راہ اختیار نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ ان کا مصرف قوانین الٰہی کی حدود میں رہتے ہوئے منافع عامہ نیز خلق اللہ کی مدد کی خاطر ہونا چاہئے اس نظریے کی روشنی میں کسی گروہ یا افراد میں قوت و طاقت کے بے تحاشا تمرکز کی وجہ سے پیدا ہونے والے طبقاتی اختلافات کی گنجائش نہیں۔ اس طرح سرمایے کے تمرکز اور مشترکہ یا عمومی اموال پر قبضہ جما لینے کے نتیجے میں جو اختلافات پیدا ہوتے ہیں خود بخود ختم ہو جائیں گے اور اقتصادی و اجتماعی عدالت کی بنیاد مستحکم ہو جائے گی۔

کائنات بے مقصد نہیں:

جب یہ بات طے پا گئی کہ کائنات کا ایک خالق ہے اور اسی کے احکام کے تحت اس کے تمام امور انجام پاتے ہیں۔ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ فکر میں کائنات کی حیثیت کیا ہے؟ اس کی اہمیت و حقیقت اور مقصد کیا ہے؟

یہ مسئلہ عرصہ دراز سے فلسفیوں اور دانشوروں کے افکار کا مرکز رہا ہے بعض تو اس مسئلہ میں اس قدر آگے بڑھ گئے تھے کہ کائنات کے لیے کسی واقعیت و حقیقت کو قبول ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ایسے تمام حقائق کو خیالی اور تصورات انسانی کی کارستانی قرار دیتے تھے۔ اور اگر کسی حقیقت کو تسلیم بھی کر لیتے تو اس کی اہمیت و واقعیت کو فقط نسبتی اور کبھی محض انسان کے طرز کا تابع تصور کرتے ہیں۔

اسی طرح فلسفیوں نے اس مسئلہ پر بھی بحث کی ہے کہ آیا کائنات کی اشیاء میں کوئی نظم و اتحاد پایا جاتا ہے یا یہ اشیاء غیر مربوط اور پراگندہ ہیں ؟ اور اگر ان میں نظم و ترتیب موجود ہے تو کیا کسی خاص مقصد کی طرف رواں دواں اور پھر یہ حرکت کمال کی جانب ہے یا تباہی و بربادی کی طرف ؟

بہرحال کائنات کے بارے میں فلسفیوں کے رجحانات و نظریات جو انہوں نے کائنات کی ماہیت وحقیقت کے بارے میں اپنے تصورات کی بنیاد پر یا عقل کی روشنی میں پیش کئے ہیں ۔ ان ہی سے ریالزم آئیڈیا لیزم ، ریشنلزم وغیرہ جیسے فلسفے وجود میں آئے ہیں ۔ اسی قسم کے افکار و نظریات طرح طرح کی شکلوں میں ظاہر ہوتے رہے ۔ یہاں تک کہ آج جدت پسند فلسفوں میں سے ایک مشہور ترین فلسفہ کائنات کو بے مقصد اور فضول بنا کر پیش کرتا ہے ۔ اس نظریہ کے تحت انسان کے سوا پوری کائنات مبہم و تاریک اور پراگندگی وافراتفری میں ڈوبی ہوئی ہے جس کا نہ کوئی مقصد اور نہ کوئی قانون ہے ۔ یہ انسان ہی ہے جو کائنات کو شکل و صورت اور قدر و قیمت عطا کرتا ہے ۔ (انسان کے بارے میں بعد میں بحث ہوگی ۔)

اس طرح کائنات کے بے مقصد اور بے ربط ہونے کے بارے میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں ۔

لیکن اسلام :

قرآن مجید میں ارشاد قدرت ہے : ہم نے آسمانوں ، زمینوں اور ان میں موجود اشیاء کو بے مقصد و بے کار خلق نہیں کیا ہے ۔ بلکہ ان کو برحق خلق کیا ہے لیکن اکثر انسانوں کو اس کے بارے میں علم نہیں ۔

(سورہ دخان / ۳۷ ۔ ۳۸)

سورۂ انبیاء میں بھی اسی مضمون کی آیتیں موجود ہیں ۔ (انبیا / ۱۶ ۔ ۱۷)

کائنات کے ایک مستقل حقیقت و اصلیت اور ایک اصول و مقصد کے تابع ہونے کو قرآن نے اس کے "حق پر پیدا ہونے" سے تعبیر کیا ہے نیز جیسا کہ قرآن کی بہت سی آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تمام مخلوقات عالم ایک مقصد و نظام کے ماتحت ہیں ۔ مثال کے طور پر سورہ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے :-

" آیا منکرین حق کو یہ نظر نہیں آتا کہ آسمان و زمین جو آپس میں گتھے ہوئے تھے ہم نے ان کو ایک دوسرے سے الگ اور مرتب کیا ۔ ہم نے تمام جانداروں کو پانی سے پیدا کیا ، کیا وہ اس پر ایمان نہیں رکھتے ؟ ہم نے ہی تو زمین پر پہاڑ نصب کئے ہیں تاکہ زمین میں اضطراب اور انحراف نہ پیدا ہو ۔ نیز ہم نے

پہاڑوں میں دروں اور راستوں کو پیدا کیا ہے تاکہ لوگوں کے لیے راستے مہیا ہوں۔ ہم نے ہی آسمان کو تمہارے سر چھپانے کے لیے محفوظ پناہ گاہ قرار دی۔ لیکن یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے منہ موڑ چکے ہیں۔ خداوند عالم نے ہی آفتاب و ماہتاب اور روز و شب کو خلق فرمایا ہے۔ جنہیں سے ہر ایک اپنے معینہ راستے پر رواں دواں ہے۔" (آیت ۳۰-۳۳)

اسی طرح کی سینکڑوں دوسری آیتیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ کائنات میں تمام اشیاء مرتب و منظم ہیں۔ یہاں تک کہ انسانوں کی جسمانی اور روحانی ساخت میں بھی ایک خاص مقصد کے تحت اختلاف و تفاوت پایا جاتا ہے۔ سورۂ انعام میں ارشاد الٰہی ہے: "کہ یہ ذات خداوندی ہے جس نے تم لوگوں کو زمین میں اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے اور تم میں سے بعض کو بعض پر فوقیت دی تاکہ تم لوگوں کا، دی ہوئی برتری کے ذریعہ امتحان لیا جائے۔" یہ فرق بھی اس لیے رکھا گیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ جو لوگ زیادہ وسائل و ذرائع کے مالک ہیں وہ اپنے ذرائع سے دوسروں کو استفادہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں کہ نہیں۔ یا جو لوگ محرومیوں میں مبتلا ہیں، کب وہ اس بات پر آمادہ ہیں کہ اپنی محرومی کے خاتمے کے لیے جد و جہد کریں۔ غرض یہ ذرائع و وسائل کا فرق کوشش و جد و جہد کے سلسلے میں آزمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔

جہاں تک کائنات کے عمومی مقاصد کا سوال ہے بطور اختصار یہ کہا جا سکتا ہے کہ کائنات اسلامی زاویہ نگاہ سے رو بہ کمال ہے "ہر ایک کو پلٹ کر ہمارے پاس آنا ہے۔" ہر شئی ذات احدیت کو نقص و عیب سے منزّہ مانتی ہے، جب پوری کائنات خدا کی طرف حرکت کر رہی ہے اور خدا کی ذات کمال مطلق ہے تو طے ہو گیا کہ کائنات کی گردش کا مقصد ذات کامل الٰہی ہے۔ اس کے علاوہ ہر شئی اپنی ذات میں خدا کی تسبیح کرتی رہتی ہے یعنی ہر شئی اپنے کمالِ نظم کے ذریعہ خود کمال مطلق الٰہیہ کا مظہر ہے۔ گویا کائنات اپنے وجود سے ذات خداوندی کے بے عیب اور کامل ہونے کی نشان دہی کرتی ہے۔ بعض آیتوں میں اسی مفہوم کو پیش کیا گیا ہے: "خداوند عالم باطل کو مٹا ڈالتا ہے اور حق کو اپنے کمالات کا مظہر بنا کر استحکام بخشتا ہے" اسی طرح کی بہت سی قرآنی آیتیں جو حق کی کامیابیوں کی خوشخبری دیتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔

اسلام کی نظر میں تمام اجتماعی حوادث کے درمیان بھی ایک نظم و ضبط موجود ہے نیز یہ ایک بلند انجام و مقصد بھی رکھتے ہیں:

ارشاد قدرت ہے: ہم نے نزول قرآن سے بہت پہلے زبور میں (کتاب حضرت داؤد) یہ اعلان کر دیا ہے کہ ہم اپنے نیک بندوں کو زمین کا وارث قرار دیں گے۔ (انبیاء/ ۱۰۵) خداوند عالم انسان کے حالات اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ لائے (رعد) اللہ تعالیٰ نے صاحبان ایمان اور تم میں سے اچھے لوگوں سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کو زمین کا حاکم و فرماں روا قرار دے گا (نور۔ ۵۵) ہم اپنے نبیوں اور ایمان لانے والوں کی دنیا میں بھی اور روز آخرت میں بھی جب (اعمال کی) گواہی لی جائے گی، مدد کریں گے۔ (مومن/۵۱)۔ اسلام نے اجتماعی قوانین کے علاوہ انسان کے ذاتی اعمال میں بھی ایک نظم و ضبط برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "ہم قیامت میں میزان و معیار عدالت برپا کریں گے۔ اور کسی پر رتی برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔ چاہے کسی کا عمل دانۂ خردل کے وزن کا کیوں نہ ہو، ہم اس کو بھی شمار میں لائیں گے اور ہم خود حساب لیں گے۔ (انبیاء ۴۷)

مذکورہ بحث سے یہ نتیجہ ہاتھ آتا ہے کہ کائنات کی ایک حقیقت ہے۔ یہ کائنات منظم اور اصولوں کی تابع ہے، کمال کی جانب رواں دواں ہے چنانچہ معاشرہ و افراد بھی اس حکم سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ یعنی ان کے اقدامات اور اعمال کے لیے بھی ایک طریقہ متعین کر دیا گیا ہے۔ چونکہ ہم مسلمانوں کی نظر میں پوری کائنات برحق ہے اور کمال کی جانب رواں دواں ہے لہذا ہم اس اجتماعی راہ سے انحراف و روگردانی نہیں کر سکتے، یعنی ہمیں بھی اپنے افکار و اعمال کے لیے ایک اصول و نظم و ضبط کو قبول کرنا چاہئے اور ایک منصوبہ کے تحت حق کے مطیع بن کر دنیا کے عادلانہ نظام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذوق و شوق کے ساتھ جد و جہد کرتے رہیں اور خاموش و بے حرکت ہو کر نہ بیٹھیں۔ بے نظمی، فساد، بے مقصدیت اور خودسری و آوارہ گردی سے گریز کریں۔ اس لئے کہ ہم ایک منظم اور باوقعت دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں بیکاری اور فضول وقت گزاری سے دور رہیں ورنہ اس دنیا کی ترقی میں پیچھے نہ جائیں گے اور ہلاکت و تباہی اور تنزلی کا شکار ہو جائیں گے۔ البتہ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ راہ کمال کو طے کرتے رہیں نہ کہ رذالت و بدبختی کا راستہ اپنا لیں۔

توجہ کا مقام ہے کہ قرآن مجید بار بار لوگوں کو ان حضرات سے آگاہ کرتا ہے کہ یہ تم لوگ ہو

جن کے لیے ممکن ہے کہ دنیا کے ان حقائق کے خلاف ہوئی میں مبتلا ہو سکتے ہو۔

ارشاد الٰہی ہے کہ

جو لوگ حق کے منکر ہیں ان کے اعمال سراب کے مانند ہیں ایک ایسا ہموار ریگزار جسے دیکھ کر پیاسا پانی کا گمان کرتا ہے لیکن جب وہ اس کے نزدیک پہونچتا ہے تو کچھ بھی نہیں پاتا۔ خدا کو اس کے نزدیک پاتا ہے۔ خداوند عالم اس کی مدد کو پہونچتا ہے اور بہت جلدی لوگوں کے سوالات کو پورا کرتا ہے۔ (نور / ۳۹)

لوگوں کا حساب قریب آ گیا۔ لیکن وہ لوگ غفلت میں مبتلا اس کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ (اب) ان کے لیے کوئی نئی تنبیہ نہیں آئے گی سوائے اس کے کہ جو کچھ وہ سن رہے ہیں انہی کو سنیں اس حال میں کہ وہ لوگ لہو و لعب میں مبتلا ہیں۔ ان کے دل کھیلوں کے عادی ہو گئے ہیں اور ہم ان کو ان کے انجام دئے ہوئے برے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہیں اور وہ ان کو گرد کی مانند اڑا دیتے ہیں۔

اس بحث کی روشنی میں انسان آزاد، صاحب ارادہ اور با شعور ہے۔ جو اپنے اختیارات کے غلط استعمال سے کبھی کبھی اپنی زندگی اور اس کے اعمال کو بے مقصدیت و خودسری کی نذر کر دیتا اور اس طرح خود کو ذلت و حقارت کے دریا میں غرق کر دیتا ہے اور جب انسان اپنی حقیقی قدر و قیمت اور تدبر و بصیرت کو تاریکی و بیہودگی کے حوالے کر دیتا ہے۔ تو وہ ان لوگوں کے مانند ہوتا ہے جن کے پاس دل تو ہوتے ہیں مگر ان کے ذریعے سوچتے نہیں۔ آنکھیں تو ہوتی ہیں مگر ان سے کام نہیں لیتے۔ کان ہوتے ہیں مگر ان سے استفادہ نہیں کرتے۔ وہ لوگ چوپایوں کے مانند ہوتے ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے اور راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

جناب محمد علی تسخیری

ترجمہ: جناب خادم حسین۔ ایم اے جگ

صلح و جنگ اسلام کی نظر میں

(آخری قسط)

مذہبی امور کے خلاف عملی اقدامات:

عراق میں مذہبی سرگرمیوں کو روکنے کی غرض سے بعثی حکومت نے جن جن سازشوں اور ہتھکنڈوں کو استعمال کیا ہے۔ وہ روز روشن کی طرح عیاں ہیں، نوبت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ آج عراق میں ہر وہ دینی تنظیم جو بعث پارٹی کے احکام نافذ کرنے سے کتراتی ہے اسے ہمیشہ کے لیے کچل دیا جاتا ہے۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے عراقی حکومت نے کچھ ایسے زرخرید مولوی بھی پال رکھے ہیں جو حکومت کی ہر بات پر صاد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس کے نتائج بغداد کانفرنس میں یوں رونما ہوئے کہ جن لوگوں نے مذکورہ کانفرنس میں شرکت سے پرہیز کیا تھا انھیں بے دھڑک پھانسی دیدی گئی۔ سب سے پہلے جنہوں نے خلاف ورزی کی ان میں سے چھ افراد کو پھانسی دی گئی، جن میں بیشتر علماء و اساتذہ تھے اور ان کا تعلق خاندان آیت اللہ حکیمؒ سے تھا، بعد میں اسی گھرانے کے دس اور افراد کو بے دردی سے پھانسی دے دی گئی۔ سازشوں کے مختلف پہلو ہیں، جن میں سے ہم یہاں صرف بعض کا تذکرہ کریں گے یاد رہے کہ ان سازشوں سے بعث پارٹی کا اصل مقصد مذہبی سرگرمیوں کو روکنا تھا۔

الف: ان اسلامی مفکرین، علماء اور مبلغین کا خاتمہ جو اسلامی افکار و خیالات کے رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیکڑوں علماء دین پھانسی کے تختے پر چڑھائے گئے جن میں امت مسلمہ کے شہید و مفکر سید محمد باقر صدر طاب ثراہ کا نام سرفہرست ہے۔ ہزاروں علماء دین شہر بدر کئے گئے، بعض دوسرے ملکوں میں جلاوطن رہ کر سرگرم عمل ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو بعثی حکومت کے قیدخانوں میں

بتھیوں کے شکنجے کا شکار ہیں، بہت سے ایسے علماء دین بھی پائے جاتے ہیں جنھیں مذہبی لباس اتار کر دینی سرگرمیاں چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن اس مختصر مقالے میں تمام باتوں کی گنجائش نہیں۔

ب: علماء دین کے لباس میں بعثی جاسوسوں کا ایک ایسا گروہ تیار کرنا جو .....

- عوام کے اعتماد کو اسلام اور علماء دین کی نسبت کمزور کر سکے۔
- مذہبی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھ سکے۔
- اسلام کی ظاہری نقاب لگا کر موجودہ حکومت کا تحفظ کر سکے۔

ج: کربلا، نجف اور دوسرے شہروں میں ان قدیمی مذہبی درسگاہوں کا خاتمہ کرنا جہاں سے ہزاروں عالم و مجتہد بن کر نکلے ہیں۔

د: مذہبی مجالس اور جلوسوں سے اصل روح چھین کر صرف ظاہری صورت باقی رکھنا۔

ھ: درسی کتابوں میں الحادی نظریات، قومی تعصب اور بعثی افکار و خیالات بھر کے ایسی نسل تیار کرنا جو دین و مذہب سے بیگانہ ہو۔

"ڈیموکریسی نظام۔ فرد اور معاشرے کا مصدر قوت" نامی کتاب میں صدام کہتا ہے:

چونکہ ہر گھر میں والدین کا حکم چلتا ہے لہٰذا ہمیں بچے کی شخصیت ابھارنا چاہئے اس لیے کہ بہت سے والدین ہمارے ہاتھ سے نکل چکے ہیں جبکہ بچے ابھی بھی ہمارے قبضے میں ہیں، مختلف طریقوں سے اساتذہ کو چاہئے کہ وہ طالب علموں کو اپنے والدین پر اعتراض کرنا سکھائیں تاکہ بچوں کے ذریعہ والدین کو گھیرا جا سکے۔

و: ذرائع ابلاغ عامہ کے ذریعہ الحادی ثقافت پھیلانا۔ جو لوگ عراقی اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرتے ہیں وہ اسلام مخالف حملے کی نوعیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مارکسی، قومی اور الحادی کتابوں کی نشر و اشاعت کی راہ ہموار کر دی گئی ہے تاکہ لوگوں کا عقیدہ فاسد کرنے کے ساتھ ساتھ بیداری کی حامل اسلامی نشریات کا سدّ باب کیا جا سکے۔

ز: بڑے پیمانے پر اخلاقی فساد اور فحشاء پھیلانا، رقص و سرود کی محفلیں سرکاری سطح پر منعقد ہوتی ہیں اور صرف عراق تک ہی محدود نہیں، سینما اور ٹیلیویژن کے پروگراموں میں بیکسی

جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی عریاں فلمیں عام ہو چکی ہیں، ریڈیو پروگرام میں فحش گانوں کے سوا اگر کچھ ہوتا ہے تو صرف صدام کی مدح میں قصیدہ خوانی ہوتی ہے یا پردے کے خلاف عریانیت کی حمایت میں پروپیگنڈہ نشر کیا جاتا ہے۔

اپنے کتابچہ "ڈیموکریسی" کے "صفحہ ۲۲" پر صدام لکھتا ہے:

"پہلی عراقی خاتون جس نے پردے کی مخالفت میں آواز بلند کی، اس نے درحقیقت خواتین کے حق میں قربانی دی ہے۔"

بعثی افراد اخلاقی قدروں کو پامال کرنے کی غرض سے یہ مفروضہ پیش کرتے ہیں کہ:

"اخلاق نسبی و اضافی ہے"، ان کی نظروں میں گویا اخلاق کا کوئی مطلق معیار نہیں۔ دراصل اس سازش کے ذریعے اخلاقی مسائل ختم کرنا اور مجرموں کو ارتکاب جرم کی چھوٹ دینا چاہتے ہیں۔

کتاب "تہذیب ...." میں صدام کہتا ہے:

"شرف، شہامت، رسم و رواج اور دوسری سماجی قدریں سب کی سب ترقی یافتہ اور وضع شدہ قدریں ہیں، اور یہی قدریں جب مطلق ہوتی ہیں تو ترقی کے مختلف مراحل طے کرنے کے باوجود زندگی کے وسیع معنوں میں اضافی قرار پاتی ہیں۔"

ط: اسلامی جمہوریہ ایران پر وحشیانہ حملہ اور اسلامی انقلاب کا گہوارے میں ہی گلا گھونٹنے کی مذموم کوشش بذات خود بعثیوں کے کفر اور سامراجی قوتوں کے آلۂ کار ہونے کی واضح دلیل ہے۔

درحقیقت اس سلسلے میں بعثیوں کی سازشیں کافی ہیں اور سب کی سب اصلاح بین المومنین کی دعوت دینے والی قرآنی آیات پر عمل نہ کرنے کی واضح دلیلیں ہیں۔ لہٰذا ذرہ برابر علم کا شائبہ اور دین سے رغبت رکھنے والوں کو چاہیئے کہ وہ مذکورہ آیت کو اس سلسلے میں بھولے سے بھی شمار نہ کریں۔

اس بات کے آخر میں صدام پر کفر کے ان فتووں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو علماء دین نے دیئے ہیں۔ جن علماء دین نے صدام کو کافر قرار دیا ہے، ان میں شہید عبدالعزیز بدری بغداد کے سنی عالم دین، مرحوم آیت اللہ حکیم، شہید محمد باقر صدر اور آخر میں امام امت آیۃ اللہ خمینی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ بے شک ان سب کے فتوے صدام کے کفر کی بہترین دلیلیں ہیں۔

صدامی جرائم کی فہرست پیش کرنے سے پہلے ہم ایک بار پھر انصاف پسندوں کی توجہ مرکزی

رب سوشلسٹ بعث پارٹی کی نویں سالانہ کانفرنس (جون ۱۹۸۲ء) کی رپورٹ کی طرف مبذول کرنا چاہیں گے
اکہ آپ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ان بعثیوں نے اپنی دینی اور قیادتی مسئولیت کو کس طرح پورا
کیاہے اور یہ بعثی اپنے چہرے کے پیچھے کون سا مکروہ چہرہ چھپائے ہوئے ہیں۔ آیئے! اس رپورٹ کے
اصل متن کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔

"پارٹی میں شامل بعض افراد کھلم کھلا مذہبی امور اور دینی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں، نتیجتًہ بنیادی مسائل کے حل و فصل میں مذہبی افکار و خیالات پارٹی کے اصولوں پر برتری حاصل کر رہے ہیں، اور اس طرح مکمل انقلابی تبدیلی لانے میں بھی ہر طرح سے پارٹی پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔"

"رفتہ رفتہ دین و مذہب سے رغبت لوگوں میں تیزی کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے اور اعلیٰ افسروں سے متاثر ہو کر پارٹی میں شامل دوسرے افراد بھی ان کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ مذہبی رجحان پارٹی کے بعض عملی اراکین کی خواہش اور ان کی اطاعت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، اگرچہ ایک خاص حد تک پارٹی کے مختلف حلقوں میں پہلے بھی نمایاں ہوتا رہا ہے۔"

"بات یہیں تک محدود نہیں، پارٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو پارٹی کے اصولوں کو پرکھنے کے لئے مذہب اور اس کے اصولوں کو کسوٹی قرار دیتے ہیں۔"

"اس صورت حال نے ملک کی سیاسی۔ مذہبی حالت پر بہت برے اثرات مرتب کئے ہیں۔ اس طرح کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے نتیجے میں پارٹی کی صفوں میں ہلچل مچ گئی ہے، پارٹی میں شامل افراد ایک دوسرے سے بحث کرنے پر اتر آئے ہیں، یہاں تک کہ کچھ لوگ حیران و پریشان ہو کر یہ سوال کرنے لگے ہیں: کیا اچھے قسم کا بعثی بننے کے لئے مذہبی سرگرمیوں میں حصہ لینا ضروری ہے؟ یا اس طرح کی کوئی شرط نہیں؟ وغیرہ بعض افراد موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مذہبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں تاکہ آقاؤں کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ پارٹی اور حکومت میں انہیں اعلیٰ رتبوں پر فائز کر دیا جائے۔"

"مذکورہ صورت حال نے پارٹی کو ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا ہے کہ وہ سیاسی۔ مذہبی حالت کی ارتقا کو پرکھ سکتی ہے اور نہ ہی اس تضاد کا اندازہ لگا سکتی ہے جو دونوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔"

"اس طرح پارٹی میں شامل افراد کے ذریعہ مذہبی سرگرمیوں کا جاری رہنا خواہ وہ فطری طور پر ہو یا کسی سیاسی انحراف کے ہمراہ، دونوں صورتوں میں پارٹی اصولوں کے خلاف ہے اور انقلاب کے لیے نقصان دہ ہے۔ پارٹی کی جانب سے غفلت کے نتیجہ میں ہی اس مذہبی، سیاسی حالت کو ابھرنے کا موقعہ ملا ہے۔"

"اسی طرح بعض پارٹی ممبروں کی طرف سے مذہبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے رواج اور مذکورہ صورت حال کا اس حد تک پہنچ جانا (کہ معادن اور پیرو پیدا ہو جائیں) جس کے نتیجہ میں بعض پارٹی اور سیاسی، مذہبی پارٹیوں کی بنیاد و اساس میں اس طرح کا باہمی ربط و دخل پیدا ہو گیا ہے کہ اِس پارٹی اور اُس پارٹی کے افراد بیک وقت ایک ہی زمان و مکان میں مذہبی فرائض انجام دینے لگے ہیں، نتیجۃً فکری، سماجی اور نفسیاتی مسائل کی رو سے دونوں کے افکار و خیالات ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسی صورت حال نے ملک میں مخالف سیاسی مذہبی رجحان اور اس کی ترقی کی نسبت پارٹی کی بیداری کمزور کرنے میں مدد دی ہے، خاص طور پر اس لیے بھی کہ انقلاب مخالف تحریکوں پر نظر رکھنا پارٹی کی ذمہ داری ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر مذہب میں مذہبی سرگرمیوں کا طریقہ دوسرے مذاہب سے مختلف ہوتا ہے اور ہر مذہب کے ماننے والوں کا دینی مرکز علیحدہ ہوتا ہے، لیکن یہی مذہبی سرگرمیاں جب شدت اور زور پکڑ لیتی ہیں تو خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا عام تصور نہ صرف باقی نہیں رہتا بلکہ فرقہ وارانہ تعصب اس کی جگہ لے لیتا ہے۔"

"یہ طریقہ جاری رہا تو رفتہ رفتہ پارٹی ممبروں کے درمیان فرقہ وارانہ تعصب و ذہنیت پیدا کر دے گا جبکہ پارٹی نے اس میں شامل تمام افراد کو بلا تفریق مذہب و ملت ایک پرچم تلے جمع کیا ہے۔ یہ پارٹی اور اس کے اصل مقصد کے لئے نہ صرف خطرناک ثابت

ہو سکتی ہے بلکہ پارٹی میں بے جا انتشار بھی پیدا کر سکتی ہے۔"

"اس کے علاوہ عوام جب پارٹی ممبروں کو اس سمت پر چلتے ہوئے دیکھیں گے تو جاگ اٹھیں گے، دوسرے گروہوں میں شمولیت اختیار کریں گے، مذہبی اختلافات اور فرقہ وارانہ فسادات بڑھیں گے، نتیجۃً پارٹی کی وہ کوشش ناکام ہو جائے گی کہ عوام قومیت اور جذبۂ وطن پرستی کے تحت ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔"

"انقلاب ایران اور سیاسی۔ مذہبی حالت کے خطرناک رخ اختیار کر لینے سے کئی سال پہلے بارہا کامریڈ صدام حسین نے پارٹی ممبروں کو مذہبی مسائل اور سیاسی، مذہبی حالت کے خطرے سے آگاہ کیا تھا، اور مذکورہ مسائل کی نسبت ممبروں کی ان غلطیوں کی نشاندہی کی تھی جن کا مذکورہ اقتباسات میں ذکر کیا گیا ہے۔ تاہم خبردار کرتے ہوئے کامریڈ صدام نے یہ بھی کہا تھا: اگر یہ طریقہ جاری رہا تو اس حالت کو مزید تقویت ملے گی۔ عوام میں مذہبی اختلافات بڑھیں گے، نتیجۃً پارٹی اور انقلاب کمزور پڑ جائیں گے۔"

"حالانکہ کامریڈ صدام حسین نے اس سلسلے میں باربار مختلف مواقع پر خبردار کیا۔ انقلابی کونسل اور پارٹی ممبروں کے اجلاس میں بھی بارہا اس کی وضاحت کی، یہاں تک کہ (دین و تہذیب) نام کی کتاب اسی سلسلے میں شائع کی گئی، لیکن قیادت کے اظہار افسوس کو بیان کرنا ضروری یوں محسوس ہوتا ہے کہ پارٹی ممبروں نے بات کو بات نہ سمجھا اور وہ اپنے رویہ پر باقی رہے یہاں تک کہ قیادت کی طرف سے غلط اقدامات سے نپٹنے کے لئے سختی کی گئی جس کے نتیجہ میں نسبتاً کمی آئی۔" اس کا مفروضہ یہ ہے کہ تعلیمی تفریق تو تنگ نظری کا حل کرنا چاہئے جس کے ذریعہ پارٹی اصول کو یکساں نظر آئے۔

"لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ سوال کرنا چاہئے: اگر بعض پارٹی ممبروں کی نظر میں عرب سوشلسٹ بعث پارٹی کے بجائے مذہبی افکار و خیالات اور ان پر عمل درآمد اخلاقی و اعتقادی نعم البدل اور زندگی کے اہم مسائل حل کرنے کا ذریعہ قرار پاتے ہیں تو انہوں نے عرب سوشلسٹ بعث پارٹی کو پہلے کیوں انتخاب کیا؟"

"مذہب اور سیاسی۔ مذہبی تحریکوں کا وجود پہلے بھی تھا، یہ کوئی نئی ایجاد تو نہیں، پھر انہوں نے اپنی زندگی سنوارنے اور اس کی اغراض و مقاصد پورے کرنے کے لیے پہلے

اسے کیوں نہیں اختیار کیا ؟"

" اور اب ایک طویل مدت تک پارٹی میں شامل رہنے کے بعد کیوں اسے پارٹی پر تھوپنا چاہتے ہیں اور کیوں اسے پھیلانا چاہتے ہیں جبکہ پارٹی اصولوں کی بنیاد، عقائد اور رسوم میں شامل نہیں، نہ کسی پارٹی سربراہ نے یا پارٹی سے متعلق کانفرنس میں کسی نے یہ بات کہی ہے؟"

"صرف اسی صورت حال سے نپٹنے کے لیے ہی نہیں بلکہ ہمیں پارٹی کے لیے ایک ایسا نصب العین تیار کرنا چاہئے جس کے ذریعہ آئندہ ہر فرد خواہ وہ انقلابی کونسل کا ممبر ہو یا اعلیٰ افسر یا پارٹی کا رکن کسی کو بھی قطعی طور پر اجازت نہ ہو کہ وہ اُن افکار و خیالات اور اصولوں کو پارٹی پر تھوپ کر کسوٹی و معیار قرار دے جو پارٹی اصولوں میں شامل نہ ہوں، نہ قیادت کے ذریعہ صادر ہوئے ہوں اور نہ جن پر جمہوری طریقوں سے بحث و مباحثہ کیا گیا ہو۔"

"مذہب اور سیاسی - مذہبی صورت حال سے نپٹنے کا صحیح طریقہ کار وہی ہے جو کامریڈ صدام حسین نے اپنی کتاب "دین و تہذیب" میں پیش کیا ہے:

> "جب ہم دین اور تہذیب کے بارے میں دلچسپی سے اظہار خیال کرتے ہیں اس وقت ہمیں یہ بھی جان لینا چاہئے کہ ہمارا فلسفہ نہ دین ہے اور نہ ہی تہذیب بلکہ ہمارا فلسفہ وہ ہے جو ہماری فکر اور اس سے وابستہ سیاست کو ظاہر کرے ہمارے معاشرے، اخلاق، تہذیب اور آداب و رسوم میں مرکزی حیثیت ماضی اور اس سے وابستہ قوانین، اسباب زندگی، آداب و رسوم اور دین کو حاصل رہی ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے نظریات ماضی اور دین کے مرہون منت ہیں، بلکہ یہ زندگی کے ترقی یافتہ افکار، زندگی کے مسائل اور گھٹن کا حل اور انقلابی طریقے سے اس کی ترقی کا ذریعہ ہیں۔"

عراقی مسلمانوں کے حق میں صدام اور بعث پارٹی کے جرائم کی مختصر فہرست:

(۱) لاکھوں عرب و کرد باشندوں کو شہر بدر کرنا، ان کے شناختی کارڈ اور مال و ثروت کو ضبط کرنا،

یہاں تک کہ عراقیوں کو اپنی بیویاں چھوڑنے پر مجبور کرنا اور وہ بھی محض اس جرم میں کہ ان کے آباؤ اجداد کبھی ایرانی قومیت کے حامل رہے تھے۔

اس سلسلے میں عراق کی انقلابی کونسل نے مورخہ ۲۲/۴/۱۹۸۱ء کو ایک بیان (نمبر ۳۱/۱۲/۴۷۹) صادر کیا جس میں کہا گیا ہے کہ ایرانی بیوی کو چھوڑنے کے بدلے میں ہر فوجی کو چار ہزار دینار اور غیر فوجی کو ڈھائی ہزار دینار دے کر اس کی بیوی کو ملک بدر کر دیا جائے گا۔

﴿۲﴾ عراقی فرد اور معاشرے کے حق میں طرح طرح کے جرائم کا ارتکاب، جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:-

① پولیس کے ذریعہ رعب و دہشت کا ماحول اس طرح پیدا کرنا کہ کسی کو حکومت کے خلاف ایک لفظ بولنے کی جرأت نہ ہو۔

② بازپرسی اور جواب طلب کرنے کے لیے شکنجے کے نئے نئے طریقوں کا سہارا لینا، جو لوگ ایک بار قید یا کم سے کم عراق میں رہ چکے ہیں وہ اچھی طرح اس سے واقف ہیں۔

③ لوگوں پر ایسی بے بنیاد تہمتیں لگانا جن کو ضمیر تک گوارا نہ کرے۔

④ مجلس فاتحہ خوانی برپا کرنے کی عوام کو ممانعت یہاں تک کہ جنگ میں مارے گئے افراد کے لیے بھی فاتحہ خوانی ممنوع ہے۔

⑤ بھوکا مارنے اور روزی روٹی بند کرنے والی سیاست پر عمل درآمد۔

⑥ ماہرین جہاں کہیں ہوں ان کا پیچھا کرکے انھیں سرکوب کرنا۔

(مذکورہ تمام جرائم کی سندیں موجود ہیں لیکن اس مختصر مقالے میں شائع کرنے کی گنجائش نہیں)

﴿۳﴾ طرح طرح سے علماء دین کو ستانا اور ان کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنا، عراق کی بعثی حکومت نے سیکڑوں شیعہ اور سنی علماء دین کو پھانسی دی ہے جن میں شہید محمد باقر صدر کا نام سرفہرست ہے ہزاروں ایسے علماء دین ہیں جو ملک بدر کر دیئے گئے یا بعثی قید خانوں میں زندگی گذار رہے ہیں۔

﴿۴﴾ منظم اسلامی تحریکوں کا پیچھا کرکے انہیں پورے طور پر ختم کرنا، اس سلسلے میں ہزاروں متدین نوجوانوں کو پھانسی دی گئی محض اس لئے کہ وہ کلمہ لاالہ الا اللہ پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اسلام کے نفاذ کے لئے کوشش کرتے ہیں۔

(۵) اسکولوں، تربیت گاہوں اور نشریاتی مراکز سے دین کے خلاف ثقافتی جنگ جاری کرنا۔
(۶) نوجوانوں کے درمیان فحشاء و فساد پھیلانا۔
(۷) قومیت کا نعرہ لگا کر نسلی امتیاز پیدا کرنا۔
(۸) ان کیمپوں پر بمباری کر کے انسانی قدروں کا پامال کرنا اور دسیوں بے گناہ افراد کو قتل کرنا جن میں عراق کے مہاجر کردی افراد بستے تھے۔

اسلامی جمہوریہ ایران کے حق میں صدام کے جرائم :

(۱) عراق کی بعثی حکومت نے مختلف طریقوں سے اسلامی جمہوریہ ایران کا تختہ الٹنے کی کوششیں کیں۔
(۲) خوزستان پر قبضہ کر کے اسے اسلامی جمہوریہ ایران سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی اور دہشت گرد تخریب کار عناصر کو تباہ کاری کے لیے مالی امداد فراہم کی۔
(۳) سامراجی سازشوں کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے خلیج فارس میں واقع تین ایرانی جزیروں کے متعلق خاصہ پروپیگنڈہ پھیلایا۔
(۴) الجزائر معاہدے کو منسوخ قرار دینا جس میں طے ہوا تھا کہ تمام اختلافات مسالمت آمیز طریقے سے حل کئے جائیں گے۔
(۵) اسلامی جمہوریہ ایران کے خلاف جنگ چھیڑنا، شہروں کو تباہ و برباد کرنا، شہری باشندوں کو بے گھر کرنا اور شہریوں کو بطور اسیر گرفتار کرنا۔
(۶) سپاہ پاسداران انقلاب سے تعلق رکھنے والے ایرانی اسیروں کو قتل کرنا۔
(۷) دور مار کرنے والے میزائیلوں سے شہروں کو تباہ کرنا جس میں صرف شہر دزفول پر دو سو میزائیل مارے گئے، شہری آبادی اور نماز جمعہ میں شرکت کرنے والوں پر بمباری کرنا۔
(۸) میدان جنگ میں ایران کے خلاف کیمیاوی ہتھیار استعمال کرنا جس کے گواہ تمام بین الاقوامی ادارے ہیں، جبکہ بین الاقوامی قوانین اور اسلام کی رو سے اس کا استعمال جائز نہیں ہے اور عراق خود ان ملکوں میں سے ایک ہے جنھوں نے کیمیاوی اسلحہ استعمال نہ کرنے والی قرارداد پر دستخط کئے ہیں۔
(۹) شہری اور غیر ملکی پروازوں میں خلل ڈالنے کی دھمکی دینا، جو بین الاقوامی قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

(۱۰) تخریب کار عناصر کو غیر قانونی طور پر ایران روانہ کرنا. تاکہ آباد علاقوں میں بم رکھ کر تباہی پھیلائیں۔

(۱۱) پر امن مقاصد کے لئے بنائے جانے والے بوشہر ایٹمی ری ایکٹر پر بمباری۔

داخلی اور خارجی سطح پر بعثی حکومت کے جرائم:

(۱) عراقی حکومت نے مسئلہ فلسطین کو مدنظر رکھتے ہوئے صیہونی دشمن کے خلاف نہ صرف کسی بھی طرح کی جنگ میں حصہ نہیں لیا بلکہ صرف دھمکیوں اور زبانی خرچ سے کام لینے کے نتیجہ میں مقابلہ کرنے والے محاذ کو کمزور بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ کیمپ ڈیوڈ معاہدے کو عربی رنگ دینے، اسرائیل سے اچھے تعلقات قائم کرنے، اسرائیل سے صلح و آشتی کرنے والوں کے لیے راہیں ہموار کرنے، اردن کے شاہ حسین، حسنی مبارک اور اسرائیل نواز فلسطینیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے پر امریکہ سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں پہلے عرب علاقوں میں اسرائیل کی موجودگی و بقا کو تسلیم کر لیا ہے۔ عراق اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں امریکی رخنہ اندازی کے لیے نئے دروازے کھولے ہیں۔ عراق نے جنگ تھوپ کر ان مخلص عراقی و ایرانی فوجوں کو تباہ و برباد کیا ہے جنھوں نے اسرائیل مخالف قوتوں کی طاقت و توانائی میں اضافہ کیا تھا، عراق کا یہ جرم فلسطینی مسئلہ کے حق میں سب سے عظیم جرم شمار ہوتا ہے۔

(۲) جہاں تک اسلام کا مسئلہ ہے، سامراج کی آلۂ کار عراقی حکومت کو ایران کے اسلامی انقلاب کا تختہ پلٹنے کی ہی ذمہ داری سونپی گئی تھی تاکہ اس انقلاب کے نور کو جو پوری دنیا میں پھیل رہا تھا اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں کو اپنی ضیاء پاشی کے ذریعہ منوّر کر رہا تھا خاموش کر دیا جائے۔ اس حکومت نے اسلام کے خلاف قومیت و رجعت پسند افکار و خیالات پھیلا کر، عراق میں اسلامی تحریکوں کو کچل کر اور فلسطینی مسئلہ کو اسلامی رنگ کے دائرے سے نکال کر امت مسلمہ کے حق میں کافی زیادتی کی ہے۔

(۳) عراق نے پڑوسی علاقوں میں وہ ماحول پیدا کر دیا ہے کہ ہر ملک اپنے پڑوسی ملک کا حریف قرار بن گیا ہے، ایک کے ذریعہ دھمکی دلوائی جاتی ہے تو دوسرے کو مقابلہ پر اکسایا جاتا ہے کہ اس طرح سے ان کے اپنے آقاؤں کے تسلط کی راہیں ہموار رکھ سکے، چھوٹے ملکوں پر بڑی طاقتوں کا رعب باقی رہے، پناہ کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے اور خوف و ہراس کے نتیجہ میں ان ہی کی گود میں جا پڑیں۔

۔بندی سے انکار کی وجہ کیا؟

ہم اس سے پہلے بھی وضاحت کر چکے ہیں کہ جنگ بندی کا مسئلہ عظیم اسلامی مصلحت پر مرتب ہونے والے
ثرات کے پیش نظر حل ہونا چاہیئے اور اس کے سوا کوئی دوسری کوشش خواہ وہ صلح پر دلالت کرنے
یات کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو بے سود، دھوکا اور فریب یا مذکورہ منفی اثرات کو چھپانے کے سوا کچھ
ہیں۔ یہ مبارک آیتیں مؤمنوں کے دو گروہ کے درمیان تصادم کا تذکرہ کرتی ہیں جبکہ ہماری جنگ بین الاقوامی
ور اس کی آلۂ کار عراق پر حاکم بعثی حکومت سے ہے۔

مؤمنین کا بھروسہ قرآن پر ہے اور قرآن اُن کے لیے ذلت و خواری یا کفر کے دامن میں جا گرنا برداشت
نہیں کر سکتا۔

فلسطین کی تاریخ نے مختصر مدت میں ہم کو یہ سکھا دیا ہے کہ جب کبھی دشمن سے مقابلہ ہتھیار و طاقت کے
ذریعہ ہوا ہے، کامیابی نے قدم چومے ہیں اور جب کبھی دشمن کے صلح پر مبنی پر فریب نعروں یا بڑی طاقتوں کی میٹھی
باتوں پر بھروسہ کیا گیا ہے، اس نے پیچھے ہٹنے کے ساتھ ساتھ دشمن کو آگے آنے کا موقع بھی فراہم کیا ہے، اس سلسلے میں تاریخ
فلسطین بہترین گواہ ہے۔

غدار بعثی دشمن سے جنگ بندی پر سمجھوتہ کر لینا اسلام سے غداری اور اُن منفی اثرات کو قبول کرنے کے
مترادف ہے جو درج ذیل نکات پر غور کرنے سے واضح ہوتے ہیں۔

کافر نظام حکومت کو نئے سرے سے ہتھیار و فوج جمع کرنے، قبضہ مستحکم کرنے اور اسلامی جمہوریہ ایران کا تختہ
الٹنے کے سلئے نئی تدابیر کام میں لانے کی مہلت فراہم کرنا۔ ظاہر ہے کہ مشرقی و مغربی قوتوں کی آلۂ کار بعثی حکومت
کے لیے فوجی ذخائر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور دونوں طاقتیں ہر طرح کا دفاعی ساز و سامان نئے سے
نئے ٹینکوں سے لے کر جنگی طیاروں تک دشمن کو فراہم کرنے پر تیار ہیں، کیونکہ عراق خود ان کے لیے ایک ڈھال
اور اسلامی جمہوریۂ ایران پر حملہ کرنے کا اہم اڈہ شمار ہوتا ہے۔

) بے شک جنگ بندی کے باوجود سرد جنگ اور کشیدگی دونوں ملکوں کے درمیان جاری رہے گی
اور دونوں ملک ہتھیار جمع کرنے اور نئے سر سے حملہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے، خاص طور پر دونوں
ملکوں میں سے اگر کسی ایک کو برتری کا احساس ہو جائے گا اس وقت سرد جنگ گرما گرمی میں بدل جائے
گی اور مجبوراً دونوں ہتھیاروں کے بازار کا رخ کریں گے، نتیجۃً بڑی طاقتوں کے سیاسی، اقتصادی

اور قومی پابندیوں کے شکار ہو جائیں گے، وہ وقت وہ ہوگا جس میں المیۂ فلسطین ہو بہو دہرایا جائے گا۔
اگر عراق کی مجرم حکومت کو غلطی سے بھی جنگ جیتنے کا گمان ہو جائے تو وہ نئے سرے سے حملہ کرنے میں عار محسوس نہ کرے گی جس طرح سے امیر کویت پر قاتلانہ حملے کا الزام ایرانیوں پر لگا کر شہری آبادیوں پر بمباری جاری رکھنے کی کوشش کی جا چکی ہے۔

(۳) عراق کی بعثی حکومت نے عملی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی بھی طرح بین الاقوامی قوانین کا لحاظ و احترام نہیں رکھتی، اس سلسلے میں ایک لمبی فہرست پیش کی جا سکتی ہے، لیکن خلاصہ کے طور پر خلاف ورزیوں کے چند نمونے پیش کر رہے ہیں۔

- الجزائر سمجھوتے کو لغو قرار دے دیا گیا، جبکہ مذاکرات کے ذریعہ مسائل حل کرنے کے امکانات موجود تھے۔
- ماحول کی سلامتی سے متعلق بین الاقوامی سمجھوتے کو خلیج فارس میں تیل کے کنودں پر بمباری کر کے پامال کیا۔
- جنگ میں کیمیاوی ہتھیار استعمال کر کے بین الاقوامی قوانین و مقررات کی خلاف ورزی کی، جس کے گواہ تمام بین الاقوامی ادارے ہیں۔
- غیر فوجی افراد کو اسیر کے طور پر گرفتار کیا، اور انہیں اپنے ٹھکانے چھوڑنے پر مجبور کیا۔
- شہری ٹھکانوں پر بمباری کی۔ خاص طور سے ان علاقوں پر جن پر اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری کی جانب سے بمباری منع قرار دی گئی تھی۔
- اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری کی رپورٹ کے مطابق، ایرانی اسیروں کو شکنجے میں رکھا۔
- شہری یا ملکی پروازوں میں خلل ڈالنے کی دھمکی دی جبکہ بین الاقوامی قوانین کی رو سے یہ بر خلاف قانون ہے۔
- پر امن مقاصد کے لیے قائم ہونے والے بوشہر ایٹمی رایکٹر پر بمباری کی۔ غرض کہ بعثی حکومت ان تمام جرائم کی مرتکب ہوئی جن سے پتہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی شرعی یا بین الاقوامی قوانین و اصول کی پابند نہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایسی غدار حکومت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) بین الاقوامی سطح پر جس نے بھی اسلامی انقلاب کے خلاف کی جانے والی سازش کا مطالعہ کیا ہے

وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہے کہ اسلامی انقلاب پر اچانک حملہ سامراجی قوتوں کی سازش کی ایک کڑی تھی، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عراق پر حاکم حکومت سامراج کی آلہ کار ہے، وہ اپنے ذاتی ارادے کی مالک نہیں، جب بھی اپنے آقاؤں کے مفاد کو خطرے میں پڑتے دیکھتی ہے۔ اس وقت انہیں کی انگلیوں پر ناچتی ہے، لہٰذا ایسی حکومت کے ساتھ متفق ہونا کیوں کر ممکن ہے۔

(۵) سامراجی طاقتوں کو پورے طور پر یقین ہے کہ وہ تھوپی ہوئی صلح کے ذریعہ ایرانی مسلمان عوام کے ابھرتے ہوئے جذبات کو دبا سکتے ہیں، اور صلح بھی کس قسم کی جس میں ذلت و خواری، سامراجی قوتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے، صدام کے خلاف عدالتی کارروائی نہ ہونے اور جنگی نقصانات کا تاوان نہ ملنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ جب ایرانی مسلمان عوام کے جذبات ہی نرم پڑ گئے تو عراق کے دوبارہ حملہ کرنے کی صورت میں امیدیں پست ہو جائیں گی اور وہ اپنا دفاع بھی نہ کر پائیں گے۔

خدانخواستہ اگر وہ اغراض و مقاصد جنہیں جامۂ عمل پہنانے کے لئے عظیم سے عظیم قربانیاں دی گئی ہیں، بروئے عمل آنے سے قاصر رہے تو نہ جانے کتنی امیدوں کے گلے گھٹ جائیں گے اور نہ جانے اسلامی تحریک و مستضعف مسلمانوں کے دلوں پر کیا کچھ نہ بیتے گی۔

اسی طرح نہ جانے طاغوتی غدار قوتوں کی جرأتیں کس حد تک بڑھ جائیں گی، اگر عراقی حکومت کو جارحانہ حملوں کی سزا نہ ملی تو نہ معلوم بین الاقوامی جرائم کی کتنی راہیں ہموار ہو جائیں گی۔

(۶) سب سے بڑھ کر جب امام امت، قائد ملت اسلامیہ اپنا عظیم اسلامی فرض سمجھتے ہوئے عراق میں ان مظالم کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جو ہمارے مسلمان بھائیوں پر ڈھائے جا رہے ہیں اور جن کے نتیجہ میں ہمارے مسلمان بھائی جیلوں یا دوسرے ملکوں میں جسمانی و نفسیاتی شکنجوں کے زیر اثر عذاب و زحمت کی زندگی گذار رہے ہیں، ایسی صورت میں ہر مسلمان اور خاص طور پر اسلامی انقلاب کی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ان مظلوم افراد کی حمایت کرے جن کے مذہبی شعائر و مقدسات کی توہین کی جا رہی ہے۔

جی ہاں، ہزاروں مستضعف و معذور مؤمن افراد کو پھانسی کے تختے پر لٹکتے اور لاکھوں کو (محض اس لئے کہ ظلم و استبداد برداشت نہیں کر سکتے) گھر سے بے گھر ہوتے دیکھ کر ہم کیوں کر چپ رہ سکتے ہیں؟

خیال خام :

شاید بعض لوگ یہ کہیں کہ بین الاقوامی سطح پر زیادتی روکنے، پرامن طریقہ اختیار کرنے اور حقوق کی حفاظت کے لیے امکانات موجود ہیں۔ جبکہ اس دعوے کا کمزور و بے بنیاد ہونا سب پر واضح آشکار ہے۔

کون ضامن ہے ؟

آیا اقوام متحدہ ؟ جس کی بے بسی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

بڑی طاقتیں ؟ جو خود اس جنگ کی باعث ہیں۔

اسلامی حکومتیں ؟ جن میں سے اکثر حکومتیں ایسی ہیں جو عراق کو مال، ہتھیار، یہاں تک کہ فوجی امداد طور پر افراد بھی فراہم کر رہی ہیں۔

یا ناوابستہ تحریک ؟ جس میں نفاذ کی صلاحیت ہی نہیں۔

لہٰذا زیادتی روکنے کا ضامن کون ہے اور کون اب تک بنا ہے ؟

کیا یہ نصیحت کرنے والے ہم سے یہی چاہتے ہیں کہ ہم نئے سرے سے اپنے شہر تباہ کروائیں، اربوں ڈالر خرچ کریں اور لاکھوں جانیں گنوائیں۔

مذکورہ نکات پر اسلامی جمہوریہ ایران کی وضع کردہ منصفانہ شرطوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر ذرہ برابر بھی غور کیا جائے تو موقف کی صحت و سلامتی کا اندازہ ہو جائے گا، تاہم آپ خود کو مطلوبہ نتائج و اسلام و حق کی کامیابی کے لیے جد و جہد میں مصروف پائیں گے۔

باغی کون ہے ؟

عراق پر حاکم بعثی حکومت کے جرائم و کفر کا جائزہ لینے کے بعد اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ بغداد کے بے شعور حکمرانوں نے صلح کی موید آیتوں سے استدلال کر کے اپنی خام خیالی اور نادانی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

بالفرض اگر ہم اپنی کہی ہوئی باتوں سے چشم پوشی بھی کرلیں اور یہ مان لیں کہ اسلامی جمہوریہ ایران پر غاصبانہ حملے کے سلسلے میں مذکورہ آیت صادق آتی ہے، تو سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

اس دور میں زندگی گذار رہے تھے جب الجزائر سمجھوتہ ایک ہی جیسے حکمرانوں (صدام وشاہ) کے درمیان ہوا تھا جس میں یہ تاکید کی گئی تھی کہ اختلافات جنگ کے بجائے مسالمت آمیز طریقوں سے حل کئے جائیں گے۔

لہٰذا بیان کی گئی باتوں کو سمجھنے اور جنگ سے پہلے اپنی حالت کا جائزہ لینے کی غرض سے مناسب ہے کہ ہم الجزائر سمجھوتہ کے چھٹے مادّے کی طرف رجوع کریں۔

الجزائر سمجھوتہ کا متن :

۶ مارچ ۱۹۷۵ء ۔ الجزائر

چھٹا مادہ :

(۱) اختلافات ہونے کی صورت میں اس سمجھوتہ کے مفاد اور تین پروٹوکولوں کے ملحقات کے مطابق اختلافات ایرانی، عراقی سرحدی لائینوں کی رعایت اور عراقی۔ ایرانی سرحدوں پر سلامتی قائم رکھنے کے ساتھ حل کئے جائیں گے جیسا کہ مادہ نمبر (۱)، (۲)، اور (۳) میں بیان ہوا ہے۔

(۲) اختلافات شروع میں دو ماہ کے اندر (یعنی دونوں میں سے کسی ایک کی درخواست کی تاریخ سے) دوجانبہ مذاکرات کے ذریعہ حل کئے جائیں گے۔

(۳) اور عدم اتفاق کی صورت میں تین ماہ کے اندر دونوں کو کسی تیسرے دوست ملک کی وساطت طلب کرنا ہوگی۔

(۴) دونوں میں سے کسی ایک کی جانب سے وساطت قبول نہ کرنے یا وساطت ناکام ہونے یا اس کے مقررات ناقابل قبول ہونے کی صورت میں طرفین عدم منظوری یا ناکام ہونے کی تاریخ سے ایک ماہ کی مدّت کے اندر ہی اختلافات حکمیت کے ذریعہ (کسی کو حَکَم بنا کر) حل کریں گے۔

(۵) طرفین کے حکمیت کے احکام پر اتفاق نہ کرنے کی صورت میں، دونوں میں سے ایک کو پندرہ دن کی مدت کے اندر عدالتی کمیٹی کی طرف رجوع کرنے کا حق ہے۔ عدالتی کمیٹی کے قیام کے لیے طرفین میں سے ہر ایک اپنا ایک حَکَم معیّن کرے گا، پھر دونوں حَکَم مل کر ایک اعلیٰ

حاکم انتخاب کریں گے۔ عدالتی کمیٹی کے قیام سے متعلق کسی ایک کی تاریخ درخواست سے لے کر ایک ماہ کی مدت کے اندر طرفین اگر اپنا حکم نہیں معین کرتے یا دونوں حکم اسی تاریخ کے اندر اعلیٰ حاکم انتخاب نہیں کر پاتے تو صاحب درخواست کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ بین الاقوامی عدالت سے عدالتی کمیٹی کے قیام کے لیے حکم یا اعلیٰ حاکم مقرر کرنے کا مطالبہ کرے۔

(۶) عدالتی کمیٹی کے مقررات طرفین کے لیے قابل قبول و نفاذ ہوں گے۔

(۷) حکمیت کا خرچہ طرفین آدھا آدھا برداشت کریں گے۔

سمجھوتہ کا لُبِ لباب یہ ہے کہ اختلافات جنگ کے ذریعہ حل نہ ہوں۔

آخر میں ہم صلح کرانے والے دعویداروں سے ایک سوال کرنا چاہیں گے، جب صلح ہو چکی تھی تو پھر بغاوت کس نے کی؟

کیا عراق کے حملہ آور ہونے پر اب بھی کسی کو شک ہے، جبکہ اس کے صدر جمہوریہ نے ٹیلویژن پر الجزائر سمجھوتہ کو پھاڑ کر دکھایا نئے سے نئے ہتھیاروں سے لیس بارہ ڈویژن فوج کے ذریعہ اسلامی جمہوریہ ایران کی سرزمینوں پر حملہ کیا، پانچ صوبوں پر قبضہ کر کے دسیوں شہر اور قصبوں کو تباہ و ویران کیا، سینکڑوں کو قتل کیا اور ہزاروں کو اسیر کر کے بدترین جرائم کا مرتکب ہوا۔

اے بغداد کانفرنس میں شرکت کرنے والو! بتاؤ باغی کون ہے؟

مسلمانوں کو کس کے خلاف اس حد تک جنگ کرنا چاہئے یہاں تک کہ وہ احکام خدا کی طرف رجوع کرے اور احکام اسلام پر عمل کرے؟

کیا بعض کٹھ ملاؤں کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ چونکہ صدام کے خلاف بغاوت کی گئی ہے لھٰذا اسلامی انقلاب کو گھیر کر ختم کرنا واجب ہے؟

اس سلسلے میں جوابات کو بیدار، مخلص اور پاک ضمیر رکھنے والے افراد کے ذہنوں پر اس اطمینان کے ساتھ چھوڑتے ہیں کہ وہ اس قسم کے دھوکے بازوں کے پھندوں میں نہ پھنسے ہیں اور نہ پھنسیں گے۔

جناب محمدی ری شہری
ترجمہ: جناب سید علی الحسن رضوی۔ ایم۔ اے علیگ

شہادت نہج البلاغہ کے آئینہ میں

مولائے کائنات علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی پرشکوہ زندگی کا ایک نمایاں ترین پہلو جو نہایت ہی حساس ودلکش بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ آپ کا وہ شوق شہادت ہے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً زندگی کے مختلف مراحل میں آپ کی جانب سے ہوا ہے۔

"تاریخ کی اہم شخصیتوں نے "شہادت" یا "ایک اچھی موت" کے سلسلے میں بہت کچھ اظہار خیال کیا ہے۔ خصوصی طور پر مسلمانوں میں ایسے حق پرست افراد کثرت سے پائے جاتے ہیں جو شہادت کے آرزو مند رہے ہیں۔ جنکی اپنے پالنے والے سے یہی خواہش تھی کہ کاش اس مسرت بخش وسرور انگیز شربت کو نوش کرتے ہوئے ان کا دفتر زندگی بند ہو نیز تاریخ اسلام میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں ہے جنھوں نے وقت آنے پر ایک مشتاق عاشق کی طرح وارفتہ طور پر عروس "شہادت" کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔ پھر تاریخ بشریت میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس کو ابوطالب کے لعل حضرت علیؑ کی طرح شہادت سے عشق رہا ہو جو زندگی کے ہر ہر مرحلہ پر شہادت کا بے تابانہ انتظار کیا کرتا تھا بلکہ جو امید شہادت میں ہی زندگی کی گھڑیاں پوری کرتا رہا جس کی نظر میں تصور شہادت کے بغیر زندگی ادھوری، بے کیف اور بے مقصد تھی۔

۱) منزل مژدہ و شکر!

جنگ احد سر کرنے کے بعد شاید امامؑ کی زندگی کا وہ پہلا موقع تھا جب آپ "شہادت" سے محرومی کی بنا پر سخت افسردہ و متأسف نظر آتے ہیں اس موقع پر آپ نے اس شربت دل پذیر کے نوش فرمانے

کے سلسلہ میں بڑی بے تابی اور بے چینی کا مظاہرہ فرمایا ہے۔

جنگ احد ۳ھ میں واقع ہوئی امام علیہ السلام اس وقت ۲۶ سال کے تھے[1]۔ اس جنگ میں احساس شکست سے دوچار ہو کر سوائے چند جانبازوں کے تمام مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کو میدان میں چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر لی تھی ایسے نازک لمحات میں مولائے کائنات نے اپنی اولوالعزمی اور فداکاری کے غیر معمولی جوہر دکھائے آسمان سے تحسین و آفرین کی آواز بلند ہوئی ایک ایسی آواز جو سارے عالم میں پھیل گئی اور آپ کی بہادری کا قصیدہ ان الفاظ میں پڑھا جانے لگا۔

لاسیف الاذو الفقار ولا فتی الا علی[2]

پیغمبر اسلامؐ حضرت علیؑ اور چند گنے چنے بہادر جاں نثاروں کی پامردی کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست فاش سے گلو خلاصی حاصل ہوئی فتح و ظفر نے اسلام کے قدم چومے جنگ ختم ہوئی امام علیہ السلام سخت مجروح تھے جسم اطہر پر تقریباً ساٹھ زخم لگے تھے[3]۔ پھر بھی خاک و خون میں غلطاں جناب حمزہؓ مصعب بن عمیر نیز دیگر شہدائے راہ حق جنہوں نے اس جنگ میں اپنی فداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے شربت شہادت نوش فرمایا تھا اور جوش و خروش مارتے ہوئے خون سے رنگین سرخ لباس میں ملبوس سکون و اطمینان کے ساتھ سینۂ احد پر نقش جاوداں کی صورت اختیار کر چکے تھے ان کی لاشوں کو دیکھ کر امیر المومنینؑ کے دل میں بھی جوش تمنا انگڑائیاں لینے لگا اور آپ کی اضطرابی کیفیت اس منزل کو پہونچ گئی کہ یا تو آپ نے خود پیغمبر اسلامؐ کے سامنے اپنی تمنا کا اظہار کر دیا یا خود پیغمبر اسلامؐ نے آپ کے انداز سے دل کے امڈتے ہوئے سیلاب پر بند باندھنے کے لئے آپ کو ان الفاظ میں شہادت کی خوش خبری سنائی:

ابشر فان الشهادة من ورائك

میں بشارت دیتا ہوں شہادت تمہارے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔

رسول اسلامؐ کے ان فقرات نے علیؑ کے اضطراب کو دور کر دیا۔ اس کے بعد بڑی شدت کے ساتھ اس مبارک و مسعود انجام کے انتظار میں علی ابن ابی طالبؑ زندگی کے مراحل طے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سورۂ عنکبوت کی ابتدائی (پہلی و دوسری) آیتیں نازل ہوئیں جن سے امیر المومنینؑ سمجھ گئے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد مسلمانوں کی وضعیت خطرناک مراحل سے دوچار ہوگی اور ان حالات میں آپ زندہ رہیں گے آپ کو پیغمبر اسلامؐ کا احد میں کیا ہوا وعدہ یاد آیا اور بے چین ہو کر وضاحت کے

خدمت پیغمبرؐ میں حاضر ہوئے۔ بہتر ہوگا اگر خود امامؑ کی زبان سے اس واقعہ کی تفصیل سنیں، امامؑ فرماتے ہیں:
اس وقت جبکہ خداوند عالم نے یہ آیتیں نازل فرمائیں الٓمّٓ ○ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون — میں سمجھ گیا کہ جب تک پیغمبرؐ ہمارے درمیان ہیں، فتنہ و آزمائش کا سوال پیدا نہیں ہوتا اس لیے میں نے پیغمبرؐ سے دریافت کیا یا رسول خدا! یہ آزمائش جس کی خداوند عالم نے آپ کو اس یقین کے ساتھ خبر دی ہے، کیا ہے؟ نبیؐ نے فرمایا: اے علیؑ! میرے بعد میری امت سخت آزمائش میں مبتلا ہوگی۔

قلت یا رسول اللّٰہ او لیس قد قلت لی یوم احد حیث استشہد من استشہد من المسلمین و حیزت عنی الشہادۃ، فشق ذالک علیّ فقلت لی: ابشر فان الشہادۃ ورائک؟! فقال لی انّ ذالک لکذلک فکیف صبرک اذاً؟!! فقلت یا رسول اللّٰہ لیس ھٰذا من مواطن الصبر و لکن من مواطن البشریٰ والشکر۔"

میں نے عرض کیا اے خدا کے رسولؐ! کیا اس وقت جب کہ جنگ احد میں مسلمانوں کا ایک گروہ شہادت پر فائز ہو چکا تھا اور میں اس عظیم درجہ پر فائز نہ ہونے کی وجہ سے سخت مضطرب و غمگین تھا آپ نے مجھ سے نہیں فرمایا تھا کہ "میں تم کو بشارت دیتا ہوں شہادت تمہارے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔"؟! پیغمبرؐ نے جواب میں فرمایا کہ جو کچھ میں کہہ چکا ہوں وہ یقینی ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اس وقت کس طرح صبر و برداشت کروگے اور اس سرخ موت پر کس طرح تحمل کروگے۔
میں نے عرض کیا یا رسول اللّٰہ یہ صبر و شکیب کا مقام نہیں ہے بلکہ یہ تو مژدہ و تشکر کی منزل ہے! اس لیے کہ صبر وہاں کیا جاتا ہے جہاں تلخی و ناگواری کا مرحلہ درپیش ہو اور شہادت مجھے نہ صرف گوارا بلکہ میری دیرینہ تمنا ہے۔
ابن ابی الحدید اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:
حقیقتاً یہ وہ کلمات ہیں جو یقین محکم اور عرفان کامل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو امامؑ نے ابن ملجم کی ضربت کے بعد زبان پر جاری فرمائی تھی: فزت و رب الکعبہ (کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔)[۱۴]

② میں سرخ موت سے خوب مانوس ہوں!

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد جب حضرت ابوبکر برسر اقتدار آگئے تو ابوسفیان نے جو اسلام کا سخت ترین دشمن تھا اور فتح مکہ کے بعد اسلام کی کامیابی سے مرعوب ہو کر مقابلہ کی طاقت نہ ہونے کی بنا پر بظاہر چہرۂ نفاق پر اسلام کی چادر ڈال لی تھی وقت کو غنیمت جانا کہ داخلی انتشار پیدا کر کے مرکزی حکومت کو کمزور و ناتواں بنا دیا جائے۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ حضرت علیؑ اور ان کے مخلصین کو موجودہ حکومت کے خلاف ورغلا کر ایک ایسا طوفان برپا کیا جا سکتا ہے جو اسلام کی تازہ تازہ بنکھڑیوں کو مسلمانوں کے آپسی اختلاف کی بادسموم سے پژمردہ کر دے گا۔ لہٰذا پیغمبر اسلامؐ کے چچا جناب عباس ابن عبدالمطلب کے ہمراہ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور امام کے ہاتھوں پر بیعت کرنے کی خواہش ظاہر کی حضرتؑ اس کے ارادوں سے خوب واقف تھے لیکن ابوسفیان کی پیش کش نے امام علیہ السلام کو دو عظیم الزامات کے درمیان لا کھڑا کیا اگر بیعت لینے سے انکار کرتے ہیں تو لوگ اس کو بزدلی اور خوف پر محمول کریں گے کہ علیؑ حکومت وقت کے ہاتھوں قتل ہونے سے ڈر گئے، اسی طرح اگر ابوسفیان کی پیش کش کو قبول کر لیتے ہیں تو لوگ حکومت و سلطنت کا لالچی تصور کریں گے لہٰذا امامؑ نے اس پیش کش کو رد کرتے وقت اپنے موقف کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھا اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ میں نہ صرف یہ کہ سرخ موت سے نہیں ڈرتا بلکہ شہادت کا دل و جان سے مشتاق ہوں اور اگر حکومت کے خلاف کسی اقدام سے پرہیز کر رہا ہوں تو یہ کسی ذاتی غرض سے نہیں ہے بلکہ مصلحت اسلام کا یہی تقاضہ ہے۔ امامؑ نے کتنے خوبصورت اور دلنشیں انداز میں "شوق شہادت" اور "سرخ موت" کے تئیں اپنے دلی جذبات کا اظہار فرمایا ہے:

فان اقل یقولوا حرص علی الملک وان اسکت یقولوا جزع من الموت، هیهات! بعد اللتیا والتی!! واللّٰه لابن ابی طالب انس بالموت من الطفل بثدی امه۔

(مجھے حالات نے اس منزل پر لا کھڑا کر دیا ہے) کہ اگر کچھ کہتا ہوں (کہ حکومت اسلامی کا میں سزاوار ہوں دوسرا اس کے حقدار نہیں ہیں) تو لوگ کہیں گے کہ حکومت کی لالچ میں میں ایسا کہہ رہا ہوں اور اگر (اسلامی مصالح کی بنا پر) خاموش رہتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ علیؑ قتل ہونے سے ڈرتے ہیں اور جان کے خوف سے سکوت اختیار کر لیا ہے۔ افسوس!

کتنے غلط خیال میں !! باوجود اس کے کہ میری تمام ترفدا کاریاں اور قربانیاں (جو میں نے اسلام کے لیے دی ہیں) لوگوں کے سامنے ہیں ؟![۴]

خدا کی قسم ابوطالبؑ کا فرزند "شہادت" سے اس سے بھی زیادہ مانوس ہے جتنا کہ ایک شیر خوار ماں کے پستان سے انسیت رکھتا ہے۔[۵]

۔ دوسرے مقام پر جہاد میں سستی دکھانے کی وجہ سے اپنے اصحاب کی توبیخ کرتے ہوئے امام ارشاد فرماتے ہیں:-

اِنَّ اَحَبَّ مَا اَنَا لَاقٍ اِلَی الْمَوتُ

میرے نزدیک محبوب ترین چیز جس سے میں ملاقات کرنے والا ہوں "موت" ہے۔[۶]

۲) میں شہادت کو دوست رکھتا ہوں۔

جب معاویہ کی فوج نے مصر پر قبضہ کر لیا اور انہیں وہاں کے حالات پر قابو حاصل ہو گیا امامؑ کے نمائندہ، حاکم مصر، محمد بن ابی بکر کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا تو امامؑ نے ایک بہت مفصل خطبہ ارشاد فرمایا، آپ نے اس خطبہ میں تاریخ اسلام کا بہت ہی عمیق جائزہ پیش کیا ہے اور پیغمبر کی رحلت کے بعد جو حادثات رونما ہوئے، ان کا ذکر کرتے ہوئے حکومت اسلامی اپنے اصلی خطوط سے انحراف کی نشاندہی کی ہے نیز اس بات کی وضاحت کی ہے کہ معاویہ سے جنگ کرنے کی وجوہات کیا ہیں، معاویہ اور اس کے ساتھیوں کا قلع قمع کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ آخر کلام میں آپ نے اپنے ساتھیوں کی سست روی اور کمزوریوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

فیکم العلماء والفقهاء والنجباء والحکماء وحملة الکتاب والمتهجدون بالاسحار، وعمّاد المساجد بتلاوة القرآن، افلا تسخطون وتهتمون ان ینازعکم الولایة علیکم سفهاؤکم والاشرار الاراذل منکم۔

تمہارے درمیان علماء و فقہا، پاک طینت، صاحبان حکمت، حافظین قرآن اور بندگان سحر خیز موجود ہیں جو تلاوت قرآن کے ذریعہ مسجدوں کو آباد رکھتے ہیں پھر بھی کیا یہ دیکھ کر تمہارا جوش و خروش اور جذبۂ ایمانی مشتعل نہیں ہوتا کہ بے وقوف و جاہل شریر

خصلت اور پست طینت افراد تمہارے ہاتھوں سے زمام حکومت چھین لینا چاہتے ہیں:

انّی واللّٰہ لو لقیتہم فرداً وھم ملاء الارض ما بالیت ولا استوحشتُ

خدا کی قسم اگر میرا تن تنہا ان سب سے چاہے پورا خطۂ ارض ہی کیوں نہ ان کی فوجوں سے بھرا ہوا ہو مقابلہ ہو تو کسی طرح کا ایک ذرا سا بھی خوف و ہراس یا وحشت میرے قریب آئے۔

اس مقام پر امام نے اپنی مافوق تصور دلیری و جواں مردی کے فلسفہ کو دو نکتوں میں سمیٹ کر پیش کر دیا ہے:۔ ایک تو یہ کہ آپ اپنی راہ کے درست ہونے پر یقین و اطمینان رکھتے ہیں دوسرے یہ کہ خدا کی ملاقات کے مشتاق ہیں، فرماتے ہیں:۔

وانی من ضلالتہم التی ھم فیہا والھدیٰ الذی نحن علیہ لعلیٰ ثقۃ وبینۃ ویقین وبصیرۃ وانی الیٰ لقاء ربی لمشتاق ولحسن ثوابہ لمنتظر۔"

میں ان کی گمراہی پر جس میں (معاویہ اور اس کے ساتھی) مبتلا ہیں اور وہ ہدایت جس کی بنیاد پر ہم ان سے جنگ کر رہے ہیں اطمینان رکھتا ہوں (یہ حقیقتیں مجھ پر واضح اور روشن ہیں) میں اپنے پروردگار کی ملاقات کا مشتاق ہوں اور بہترین جزا کا منتظر ہوں۔

"..... فو اللّٰہ انی لعلیٰ الحق وانی للشہادۃ لمحبٌ

خدا کی قسم میں حق پر ہوں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں شہادت کو دوست رکھتا ہوں (یعنی حق کے لیے شہید ہو جانا پسند کرتا ہوں)[۱]

(۴) میں جب جوانی کے دنوں میں "جنگ اور موت" سے نہیں ڈرا تو کیا اب بڑھاپے میں ڈر جاؤں گا؟!

ابن ابی الحدید نقل کرتے ہیں:۔

جس وقت جنگ صفین میں لشکر امیر المومنینؑ نے ایک معرکہ سر کر کے اس نہر پر قبضہ حاصل کر لیا جس سے لشکر پانی حاصل کرتا تھا اور امامؑ نے (لشکر معاویہ کی روش کے خلاف) اہل شام کو متوجہ کرنے نیز اپنی جواں مردی، عدالت اور حسن سلوک کا ثبوت پیش کرنے

کے لیے حکم دیا کہ لشکر معاویہ کو نہر سے استفادہ کرنے سے نہ روکا جائے اور اس ذلیل طریقہ کار کو نہ دہرائیں جو معاویہ والوں نے اپنی طاقت کے زعم میں لشکر حق کے خلاف اپنایا تھا۔
کافی مدت تک امامؑ نے جنگ کے لیے پیش قدمی کا اعلان نہیں کیا نہ ہی امامؑ اور معاویہ کے درمیان نمایندوں کے ذریعہ کوئی گفت و شنید ہوئی۔

امام کے لشکر میں اس وقتی خاموشی کی وجہ سے بددلی اور بے اطمینانی کی کیفیت پھیلنی شروع ہوگئی۔ افواہوں کا بازار گرم ہوگیا۔ اہل عراق امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس خاموشی کے خلاف بطور احتجاج کہنے لگے؛

اے امیر المومنین! کیا ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو کوفہ میں چھوڑ کر یہاں اس لئے آئے ہیں کہ شام کے مضافات میں وطن اختیار کرلیں؟ اجازت دیجئے کہ جنگ شروع ہو اس لئے کہ لوگ طرح طرح کی باتیں کررہے ہیں۔

امامؑ: لوگ کیا کہتے ہیں؟

ایک سپاہی: لوگوں کا خیال ہے کہ آپ قتل کے ڈر سے اصلاً اس جنگ سے خوش نہیں ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسئلہ کو صلح کے ذریعہ حل کرلیں۔ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ معاویہ سے جنگ کرنا درست ہے یا نہیں آپ کو اس میں بھی تردد ہے۔

امامؑ: متی کنت کارھا للحرب قطّ؟! انّ من العجب حبّی لھا غلاماً و یفعاً و کراھتی لھا شیخاً بعد نفاد العمر و قرب الوقت!"

کیا مجھے جنگ سے کبھی بھاگتے ہوئے دیکھا ہے؟! یہ کتنی دلچسپ حقیقت ہے کہ اس وقت جبکہ میں نوعمر و نوخیز جوانِ رعنا تھا (زندگی لذت بخش اور جینے کی امید زیادہ تھی) تب تو جہاد اور شہادت کا دلدادہ بنا رہا اور اب جب کہ بوڑھا ہونے کو آیا ہوں عمر تمام ہو رہی ہے موت سر پر منڈلا رہی ہے بھلا موت کے ڈر سے جنگ سے بیزار اور خوف زدہ ہوسکتا ہوں؟!!
اور جہاں تک اس کا سوال ہے کہ مجھے اہل شام سے جنگ کرنے میں تردد ہے! اگر مجھے ان سے جنگ میں تردد ہوتا تو اہل بصرہ سے بھی جنگ نہ کرتا۔ (جبکہ خود پیغمبرؐ کی ایک زوجہ اور اسلام کی دو نمایاں اور جانی پہچانی شخصیتیں اس جنگ کی رہبری کررہی تھیں)

خدا کی قسم میں معاویہ سے جنگ کرنے کے مسئلہ پر کافی غور و خوض کر چکا ہوں ہر رخ سے جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ یا تو معاویہ سے جنگ کروں یا خدا و رسولؐ کی نافرمانی کروں (یعنی معاویہ سے جنگ نہ کرنا میری نظر میں خدا و رسولؐ کی نافرمانی کے مترادف ہے) لیکن یہ جو تم دیکھ رہے ہو میں نے ان کو تھوڑی مہلت دی ہے اس امید پر کہ شاید وہ اپنے لیے راہ سعادت حاصل کر لیں یا کہ سب کو نہ سہی تو ان میں سے چند ہی کو سہی راہ ہدایت مل جائے۔ اس لئے کہ پیغمبر صلعم نے جنگ خیبر میں مجھ سے فرمایا تھا:

لان یھدی اللہ بک رجلاً واحداً خیر لک مما طلعت علیہ الشمس

اگر ایک شخص تمہاری وجہ سے راہ ہدایت حاصل کر لیتا ہے تو تمہارے لئے بہتر ہے اس چیز سے جس پر سورج چمکتا رہے۔[۱۲]

⑤ میں تمنائے شہادت میں تمہارے ساتھ ہوں!

جناب محمد ابن ابی بکر کی شہادت کے بعد امامؑ نے کوفہ کے گورنر جناب عبداللہ ابن عباس کو ایک خط تحریر فرمایا جس میں طرفداران معاویہ کے ہاتھوں محمد بن ابی بکر کی شہادت نیز ان کی مدد کے سلسلہ میں اہل مصر کی کوتاہیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ میں ان سست اور ناکارہ عوام سے اس قدر تنگ آچکا ہوں کہ اب بس شہادت کی امید دل کے سکون کا ذریعہ رہ گئی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو مجھے ان کو خود سے دور کرنے پر روکتی ہے۔ پوری توجہ کے ساتھ امامؑ کے خط کا متن ملاحظہ فرمائیں:۔

بندۂ خدا علی امیر المومنین کی جانب سے عبداللہ ابن عباس کے نام: مصر پر دشمن افواج کا قبضہ ہو گیا۔ محمد بن ابی بکر شہید کر دئے گئے۔ اس مصیبت کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ (اور خدا ہی سے اس کا بدلہ چاہتا ہوں) میں نے اہل مصر کو ابتدا ہی میں لکھ کر متنبہ کر دیا تھا اور اس حادثہ کے رونما ہونے سے قبل ہی ان کو حکم دے دیا تھا کہ محمد ابن ابی بکر کی مدد کریں، ظاہر بظاہر بھی اور در پردہ بھی مکرر طور پر انھیں ان کی مدد پر مامور کرتا رہا لیکن ان تمام تاکیدوں کے باوجود ایک گروہ با دل ناخواستہ مدد کے لیے آیا اور ایک گروہ جھوٹے بہانے تراشتا رہا اور ایک گروہ نے علانیہ مدد سے انکار

کردیا۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میرے حق میں ان کی طرف سے بہبودی ظاہر ہو اور مجھکو جلد از جلد ان کی طرف سے راحت نصیب ہو۔"

فو اللہ لولا طمعی عند لقاء عدوی فی الشہادۃ و توطینی نفسی عند ذالک لا حببت الا ابقی مع ھؤلاء یوما واحداً۔"

خدا کی قسم اگر دشمنوں سے مقابلہ میں شہادت حاصل ہونے کی امید نہ ہوتی اور شہادت کے لئے اپنے کو آمادہ نہ کر چکا ہوتا تو ایسوں کے درمیان ایک روز زندگی کرنا پسند نہ کرتا۔[۱۳]

اسی قسم کا جملہ ایک دوسرے موقع پر جنگ صفین و نہروان کے بعد جب معاویہ کے کچھ جلاد صفت فوجیوں نے عراق کے قرب و جوار میں یلغار کر کے بربریت و غارت گری کا مظاہرہ کیا اور امام نے اپنے ہم نشینوں کو ان سے جہاد کرنے کی دعوت دی لیکن آپ کی آواز پر کسی نے لبیک نہ کہی تو آپ نے ان کی توبیخ و سرزنش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

واللہ لولا رجائی الشہادۃ عند لقائی العدو ولو قد حم لی لقاؤہ، لقربت رکابی ثم شخصت عنکم فلا اطلبکم، ما اختلف جنوب و شمال۔

واللہ اگر دشمنوں سے تصادم میں مجھے امید شہادت نہ ہوتی، جب کہ دشمنوں سے مقابلہ میرا مقدر ہو چکا ہے، تو اپنی سواری قریب کر لیتا اور تمہیں چھوڑ چھاڑ کر نکل جاتا اور جب تک ہوائے جنوب و شمال چلتی رہتی (یعنی دنیا باقی رہتی) تم کو طلب نہ کرتا۔[۱۴]

(۶) ربّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوں:۔

مسجد کوفہ کی محراب لرز رہی تھی، حضرت علیؑ اپنے خون میں غلطاں تھے، جوش و خروش مارتے ہوئے خون نے چہرہ کو مزید پر شکوہ بنا دیا تھا۔ فرشتے عالم اضطراب میں فریاد کر رہے تھے کہ "ستون ہدایت منہدم ہو گیا۔" آنکھیں گریہ کناں تھیں کہ پیکر عدالت کو شہادت نصیب ہوئی۔ مظلوموں محروموں اور ستم زدہ افراد کی پناہ گاہ اجڑ گئی۔

تاریخ ابن ملجمؒ کی ضربت کا ردعمل دیکھنے کے لیے بے چین ہے کہ اپنے دور کی بزرگ ترین ہستی، اس حساس ترین منزل پہ جو ہر نفس کا کیونکر مظاہرہ کرتی ہے، کیا کہتی ہے اور کیا کرتی، وہ جواب تک شہادت کے اسی شیریں جام کے انتظار میں زندگی کے ایام پورے کر رہا تھا اب جبکہ اس کو اپنا مقصود حاصل ہو چکا ہے۔ اس کا کیا حال ہے؟!

ناگاہ علیؑ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی

کیا کہا ؟

ضرور درد سے کراہ نکلی ہوگی ؟ جی نہیں!

پھر ضرور دشمن کا گلہ کیا ہوگا ؟ نہیں یہ بھی نہیں !!

اچھا تو دوا اور طبیب کو طلب کیا ہوگا ؟ یہ بھی نہیں !!!

پھر کیا کہا ؟

وہ کلمہ کہا جس کا تاریخ میں کسی بھی انسان کی زندگی میں نام و نشان تک نہیں ملتا۔

فرماتے ہیں :۔

"فزت ورب الکعبہ" !!

رب کعبہ کی قسم میں کامیاب و کامران ہو گیا۔[۱۵]

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند ۔ و اندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی ۔ ان شب قدر کہ این تازہ براتم دادند

"جیسے پیاس کے مارے کو یکایک پانی مل جائے یا کافی تگ و دو کے بعد کوئی اپنی گم شدہ شے پا لے میں نے شہادت کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔"

وہ شخصیت جس نے اپنی پر افتخار زندگی کا ایک ایک لمحہ پورے جوش و ولولے کے ساتھ طاغوتی طاقتوں، ظالم و جابر خود سروں اور بد نہاد منافقوں سے جنگ و سرکوبی میں صرف کیا، جس کو سوائے شعائر اسلامی کو تحقق و استحکام عطا کرنے کے کوئی دوسری فکر نہ رہی آج اپنے رنجور و ناتواں جسم لیکن ہمیشہ سے زیادہ قوی اور مستحکم ارادوں کے ساتھ شہادت کے "سرخ بستر" پر آرام کر رہا ہے۔

حکومت اسلامی کا فرمانروا ایک چھوٹے سے کچے مکان میں اپنی نہایت ہی سادہ اور فقیرانہ (جو قوم کے کسی بھی ادنیٰ ترین شخص سے بہتر نہیں کہی جاسکتی) زندگی کے آخری لمحات نہایت ہی پرشکوہ انداز میں طے کر رہا ہے۔

چاہنے والے ایسے غمناک و مضطرب چہروں کے ساتھ جن پر غم و اندوہ نے سایہ کر رکھا ہے، گروہ در گروہ امامؑ کی عیادت کے لیے بیت الشرف پر حاضر ہو رہے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ آپ کی زیارت میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

زمین و آسمان میں ایک انقلاب برپا ہے پھر بھی حضرتؑ پرسکون انداز میں پوری متانت و سنجیدگی اور اطمینان قلب کے ساتھ زندگی کی باقی ماندہ گھڑیاں قوم و ملت کی فلاح و بہبودی اور ان کی سعادت ابدی کی فکر میں صرف کر رہے ہیں۔

کبھی فرماتے ہیں:۔

انا بالامس صاحبکم والیوم عبرۃ لکم وغداً مفارقکم۔

میں کل تمہارا مصاحب تھا آج تمہارے لیے عبرت بنا ہوا ہوں اور پھر کل تم سے جدائی اختیار کر لوں گا۔[16]

کبھی ارشاد ہوتا ہے:۔

لاتترکوا الامر بالمعروف والنھی عن المنکر فیولّی علیکم اشرارکم ثم تدعون فلا یستجاب لکم

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کرنا، اور اگر تم نے ایسا کیا تو بدکردار تم پر مسلط ہو جائیں گے اور اس وقت تم اس سے نجات کی دعا کروگے لیکن تمہاری دعا قبول نہ ہوگی۔[17]

اسی طرح کی نصیحتیں فرماتے رہے جن میں سب سے زیادہ دلکش و خوبصورت نیز قابل نصیحت وہ جملہ ہے جو آپ نے اپنی شہادت سے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔ ایک ایسا جملہ جو بتاتا ہے کہ آپ کو اپنے انجام یعنی شہادت سے کتنا گہرا عشق اور لگاؤ تھا۔ اس طرح کا جملہ جس کی کلام بشریت میں کوئی مثل و نظیر نہیں ملتی۔

زندگی کے آخری لمحات میں خون سے رنگین بستر شہادت پر ان سوگ وار افراد سے جو غم و

اندوہ کے آنسوؤں میں غرق یہ سوچ رہے تھے کہ شاید علی ابن ابی طالبؑ کی بھی یہ خواہش نہ رہی ہو گی کہ ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے گا۔ آپ فرماتے ہیں:۔

واللہ ما فجأنی من الموت وارد کرہتہ ولا طالع انکرتہ وما کنت الا کقاربٍ ورد وطالب وجد۔

ایسا خیال نہ کرنا کہ مجھے اپنے اس انجام کا کوئی افسوس ہے! اس گمان میں نہ رہنا کہ ابن ملجمؒ کی تلوار نے مجھ کو غم و غصہ میں مبتلا کیا ہے!

ہرگز نہ سوچنا کہ شہادت کی موت مجھے پسند نہیں تھی! نہیں قطعی نہیں!

خدا کی قسم شہادت کی موت نے میرے لیے کوئی مکروہ یا خلاف توقع کوئی تازہ بات پیدا نہیں کی ہے۔ نہ ہی کوئی ناپسندیدہ صورت حال رونما ہوئی ہے ۔۔ نہ صرف یہ کہ شہادت مجھے ناگوار نہیں ہے بلکہ میں تو اس سے اتنا گہرا عشق و الفت رکھتا ہوں اور اس عظیم درجہ پر فائز ہو کر مجھے تو اتنی زیادہ فرحت و خوشی حاصل ہوئی ہے کہ جیسے کوئی شخص رات کی تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے خشک صحرا میں پانی کی تلاش میں بھٹک رہا ہو اور اسے ناگاہ کہیں کنواں یا چشمۂ آب نظر آجائے۔ یا وہ شخص جس کی کوئی پسندیدہ شے غائب ہو گئی ہو اور وہ اس کی تلاش میں ایک مدت سے لگا ہوا ہو اور یکایک وہ شئے ہاتھ آجائے شہادت کو میں ہمیشہ دوست رکھتا ہوں اور اس کا تصور میرے لئے ہر گھڑی سرور انگیز رہا ہے۔[۹]

جس وقت امامؑ جنگ صفین کے لیے شام کی طرف بڑھ رہے تھے درمیان راہ ایک مقام پر جس کو "بلیخ" کہتے تھے قیام فرمایا ناگہاں ایک راہب اپنی عبادت گاہ سے باہر نکلا اور امام کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ میرے پاس ایک نوشتہ ہے جو مجھے اپنے آباؤ اجداد سے وراثت میں ملا ہے۔ یہ نوشتہ عیسیٰ ابن مریمؑ کے صحابیوں میں سے کسی کا لکھا ہوا ہے۔ کیا آپ پسند فرمائیں گے کہ میں وہ تحریر آپ کے سامنے پڑھوں؟

امام نے اثبات میں جواب دیا۔

راہب نے پڑھنا شروع کیا۔ اس میں پیغمبر اسلامؐ کے ظہور نیز خود امام کے بارہ میں بعض خصوصیات کا ذکر کیا گیا تھا جس میں سے ایک چیز یہ بھی تھی کہ :۔

الدنیا اھون علیہ من الرماد فی یوم عصفت بہ الریح ،
والموت اھونّ علیہ من شرب الماء علی الظمآن

ہوس ہائے دنیا اسکی نظروں میں اس خاکستر سے زیادہ پست ہوگی جو طوفانی جھکڑوں کے سبب اڑتی ہیں۔ اور موت اس کی نگاہ میں اس سے زیادہ عزیز ہوگی جتنی کسی پیاسے کو پانی کی چاہ ہوتی ہے۔

اور اس نوشتہ کے آخر میں تحریر تھا کہ جو شخص اس مرد صالح کی زیارت کرے اس پر لازم ہے کہ وہ اسی کی مدد کے لیے دوڑ پڑے کیونکہ اس کی معیت میں قتل ہونا "شہادت" ہے۔

نوشتہ ختم کرتے ہوئے راہب نے امامؑ سے عرض کیا کہ اب میں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ سے ہرگز جدا نہ ہوں گا۔ یہاں تک کہ جو کچھ آپ پر گذرنے والی ہے مجھ پر گذر جائے۔ اس کے بعد وہ شخص امامؑ کا ہم رکاب رہا یہاں تک کہ جنگ صفین میں ہی شہید ہوگیا۔ جب لوگوں نے اپنے کشتوں کو دفن کرنا شروع کیا امامؑ نے فرمایا اس راہب کی میت تلاش کرو۔ جب لاش مل گئی تو امامؑ نے اس پر نماز پڑھی اور دفن کرتے ہوئے فرمایا :-

"ھٰذا منّا اھل البیت"[۲۰]

یہ ہم اہلبیتؑ سے ہے، اور پھر بارہا آپ نے اس کے لئے طلب مغفرت کی۔

(باقی آئندہ)

حواشی

---

[۱] احد مدینہ سے قریب ایک پہاڑی ہے جس کے دامن میں پیغمبر اسلام اور مشرکین مکہ کے درمیان جنگ ہوئی تھی جس میں تقریباً ستر مسلمان شہید ہوئے (دائرۃ المعارف وجدی)

[۲] میری اس وقت تک کی معلومات کے مطابق۔

[۳] اس قول کے مطابق جس کو کلینی علیہ الرحمہ نے اصول کافی جلد اول ص۴۵۲ پر نیز بعض دیگر حضرات نے بھی نقل کیا ہے کہ امام نے ۱۱ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں شہادت پائی۔ [۴] سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص۱۰۶

۵ ۔ مجمع البیان اور تفسیر علی ابن ابراہیم کے قول کے مطابق ورنہ تفسیر قمی کے تحت ساٹھ سے بھی زائد زخم تھے۔ دیکھئے بحار جلد ۴۱ ص۳ ۶ ۔ شرح ابن الحدید جلد ۹ ص۲۰۵ ۷ ۔ پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد اسلامی معاشرہ کو داخلی اور خارجی دونوں رخ سے عظیم خطرات درپیش تھے ایک طرف روم کی سلطنت تھی جو حیات نبوی میں سرزمین فلسطین پر مسلمانوں سے جنگ آزمائی کر چکے تھے اور مسلمانوں کو کافی جانی قربانیاں پیش کر کے پیچھے لوٹ آنا پڑا تھا پھر دوسری دفعہ عسکری نمائش کی غرض سے ایک عظیم لشکر سے کر پیغمبرؐ نے ان کی طرف پیش قدمی کی تھی، مگر بغیر مقابلہ لشکر واپس ہوگیا تھا۔ وفات کے وقت بھی اسامہ بن زید کی سرکردگی میں پیغمبرؐ نے مسلمانوں کو ان سے جنگ کے لیے جانے پر مامور کیا تھا۔ دوسری جانب ایران سے بھی خطرہ تھا جو اس وقت روم کے بعد دوسری عظیم طاقت شمار ہوتی تھی۔ داخلی طور پر بھی کافی مشکلات تھیں۔ اکثر مسلمان تازہ اسلام لائے تھے اور اسلامی تعلیمات سے بھرپور واقف نہ تھے اس کے علاوہ ایک بڑی تعداد منافقین کی اسلام کی چولی پہن کر مسلمانوں میں شامل ہوگئی تھی جو سب سے زیادہ خطرناک تھے اور حالات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ ان حالات میں اگر مسلمانوں کے درمیان تفرقہ آرائی پیدا ہوتی تو ابتداء ہی میں اسلام اختلافات کا شکار ہو کر نابود ہو جاتا اور دور جہالت کی طرف معاشرہ لوٹ جاتا۔ اسی بنا پر باوجود اس کے کہ ابوسفیان نے علیؑ کو ابوبکر کی حکومت کے خلاف ورغلانے کی کوشش کی مگر امامؑ نے سختی کے ساتھ اس کی دعوت کو رد کر دیا کیونکہ وحدت کلمہ کی حفاظت مقصود تھی۔ امامؑ اپنی حکومت کے ابتدائی مراحل میں ایک تقریر کے دوران فرماتے ہیں: "خدا کی قسم اگر مجھے مسلمانوں کے درمیان تفرقہ آرائی اور ان کی کفر کی طرف بازگشت کا خیال نہ ہوتا اور دین کے لیے خطرہ نہ ہوتا تو میں ان حکومتوں سے مقابلہ کی طاقت خوب رکھتا تھا" شرح ابن ابی الحدید جلد ۱ ص۳۰۷ ۸ ۔ نہج البلاغہ کے خطبہ نمبر ۱۹۰ میں امامؑ نے فرمایا ہے: "لقد علم المستحفظون من اصحاب محمدؐ انی لم ارد علی اللہ ولا علی رسولہ ساعۃ قط، ولقد واسیتہ بنفسی فی المواطن التی تنکص فیہما الابطال وتتاخر فیہا الاقدام نجدۃ اکرمنی اللہ بہا" اصحاب رسولؐ میں سے جو امانت دار ہیں وہ جانتے ہیں کہ میں نے ایک لحظہ کے لیے بھی خدا اور اس کے رسولؐ کے حکم سے سرتابی نہیں کی ہے اور خطرناک ترین مواقع پر جبکہ بڑے بڑے بہادروں نے پسپائی اختیار کر لی اور اپنے قدم پیچھے کر لیے میں نے ان کے ساتھ مواسات قائم کیا اور خدا نے میری شجاعت کی بنا پر ان کے درمیان مجھے مکرم بنایا ۹ ۔ شرح ابن الحدید جلد ۱ ص۲۱۳ ۱۰ ۔ ایضاً جلد ۱۰ ص۶۶ خطبہ نمبر ۱۸۱ ۱۱ ۔ شرح ابن الحدید جلد ۶ ص۹۹ و ۱۰۰ ۱۲ ۔ شرح ابن ابی الحدید جلد ۴ ص۱۳-۱۴-۱۳ ۱۳ ۔ شرح ابن الحدید جلد ۶ ص۹۳ ۱۴ ۔ ایضاً جلد ۷ ص۲۸۵ خطبہ ۱۸ ۱۵ ۔ بحار الانوار جلد ۴۲ ص۲۳۹ ۔ راغب "مفردات" میں "فوز" کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں: الفوز الظفر بالخیر مع حصول السلامۃ" فوز اس کامیابی کو کہتے ہیں جو نیک ہو اور سلامتی کے ساتھ حاصل ہوئی ہو" ۱۶ ۔ شرح ابن ابی الحدید جلد ۹ ص۱۱۶ و جلد ۱۵ ص۱۴۳ ۱۷ ۔ ایضاً جلد ۱۷ ص۱۶ (خط نمبر ۴۷) ۱۸ ۔ "قارب" اس کو کہتے ہیں جو پانی کی تلاش میں نکلتا ہے اور اس کے اور پانی کے درمیان ایک شب کا فاصلہ ہوتا ہے۔ ۱۹ ۔ شرح ابن ابی الحدید جلد ۱۵ ص۱۴۳ ۲۰ ۔ شرح ابن ابی الحدید جلد ۳ ۔ ص۲۰۶-۲۰۵

جناب محمد امین زین الدین
ترجمہ: جناب ممتاز علی

اخلاق امام صادق علیہ السلام کی نگاہوں میں

فکر کے لیے نقد و نظر اور بیان کے لیے توضیح اور تصویر کشی لازمی ہے لیکن حق کے لیے ان دونوں سے بالاتر ایک حکومت عادلہ ہوتی ہے جو صاحب بصیرت کو نور ہدایت اور دلیل و حجت عطا کرتی ہے۔ لیکن کسی بھی مصنف پر تصویر کشی سے پہلے فکر و نظر کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

قلمکار جب انسانیت کی کسی عظیم شخصیت پر قلم اٹھاتا ہے تو اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوت نظر کو گہرائیوں تک لے جائے اور اس سے پہلے صحیح علم سے رہنمائی حاصل کرے اور دلیل حق قائم کرے خصوصاً ایسی شخصیتوں پر قلم اٹھانے سے پہلے بڑی زحمت ہوتی ہے جو تاریخ کا معجزہ ہیں — جیسے امام جعفر صادق علیہ السلام —— ایسے موقع پر اگر علم صحیح انسان کی رہنمائی نہ کرے تو بہت سے رموز و اسرار سد راہ ہو سکتے ہیں۔

جب میں نے امام جعفر صادقؑ پر قلم اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے عجیب سا محسوس ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے قلم ہاتھ سے چھوٹ جائے گا، اور الفاظ ہونٹوں پر دم توڑ دیں گے۔ جب غیر محدود آفاق میں محدود فکر بشر پرواز کی کوشش کرتی ہے تو ایسی ہی کمزوریاں اس کے آڑے آتی ہیں جب مصور لامتناہی شعاعوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے تو حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ فکر بشر اس بات کی تعیین نہیں کر پاتی کہ غیر محدود آفاق سے کسی چیز کو تجزیہ و تحلیل کے لیے مخصوص کرے۔ مصور سوچنے لگتا ہے، کہ ان شعاعوں میں سے کن کرنوں کو چن لیا جائے جس سے ایک منفرد تصویر ابھر کر سامنے آسکے — یہی کیفیت میری بھی تھی، میں سوچ رہا تھا کہ امام جعفر صادقؑ کی لامحدود شخصیت کا کون سا گوشہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کروں، اس لیے کہ آپؑ کی زندگی کا ہر حصہ لائق توجہ اور ہر رخ تجزیہ و تحلیل کے قابل ہے آپؑ کی زندگی کا ہر گوشہ علم اور ہر خاصیت اپنی جگہ خود ایک اعجاز ہے۔

علم اخلاق وہ علم ہے جو نفس بشر کے کمالات کو ابھارتا ہے ۔ عقل انسانی کی قوت و استقلال میں اضافہ اور اس کی دستگیری کرتا ہے ۔ جب وہ کمزور ہونے لگتی ہے تو اس کو قوت وطاقت عطا کرتا ہے علم اخلاق ایک ـــــ پیغام عام ـــــ ہے اور ہر انسان کا فریضہ ہے کہ وہ اس پیغام کو دوسروں تک پہنچائے ۔

علم اخلاق ایک عظیم امانت ہے اور اس امانت کو ایک عاقل کا دوسرے عاقل تک منتقل کرنا ضروری ہے ۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے سلسلہ میں گفتگو کرنے کے لیے علم اخلاق کے موضوع کو اختیار کیا ہے ۔ یوں تو آپ کی کوئی خصوصیت ایسی نہیں ہے جو ممتاز نہ ہو لیکن علم اخلاق کو خصوصی عنایت حاصل ہے اور یہی مخصوص عنایت میری توجہ کا مرکز بنی اسی عنایت کی وجہ سے آپ سے نقل ہونے والا ہر لفظ اور آپ کی طرف منسوب ہر حدیث علم اخلاق پر ایک اچھا اثر مرتب کرتی ہے ۔

ہم نے اس موجودہ بحث میں خود امام علیہ السلام کے اخلاق کو موضوع نہیں بنایا ہے ۔ اس لئے کہ یہ موضوع تو اس کا ہے جو خود امام علیہ السلام کی شخصیت پر گفتگو کرنا چاہئے ۔ لیکن جو صرف ان کی علمی عظمت بیان کرنا چاہتا ہو اس کے لئے ضروری ہے وہ اس بات کو موضوع بنائے کہ ـــــ اخلاق کی حیثیت امامؑ کی نظر میں کیا ہے ـــــ ؟ یہ اور بات ہے کہ اخلاق کا اس حیثیت سے جائزہ لینے کے بعد اکثر مقامات پر آپ کی عظمت خود بخود ابھر کر سامنے آجائے گی ۔

(۲)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اخلاق کے سلسلہ میں فلسفیوں کے کلام سے استفادہ نہیں کیا ہے ، بلکہ آپ کے کلام کا سرچشمہ وحی اور قرآن ہے ۔ حقیقی فلسفہ وحکمت کی باتیں تو اصل میں قرآن اور ارشادات محمد وآل محمد علیہم السلام کی ضیا پاشی کا نتیجہ ہیں ۔ جو شخصیتیں شبستان محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں زندگی گذاریں اور ارشادات پیغمبر کی چھاؤں میں جن کا اٹھنا بیٹھنا ہو وہ ارسطو اور افلاطون جیسے فلسفیوں کے افکار سے بے نیاز ہوتی ہیں ۔ انہیں فکر کے تانہ بانہ میں الجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔

یہ اسی گھرانے کی خصوصیت ہے کہ ایک ہی طرح کی حدیثیں اکثر اماموں سے لفظی اور معنوی حیثیت سے مروی ہیں اور بعینہ وہی بات پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کہی ہے ایسا لگتا ہے جیسے سب ایک ہی نور کی کرنیں ہیں۔

(۳)

اخلاق انسانیت کا ایک اہم ترین رخ ہے جس کی طرف بار بار دین اسلام نے متوجہ کیا ہے، نیز اخلاق انسانی استوار کرنے کے لیے بڑے اہتمام سے کام لیا ہے۔ قرآن اور حدیثوں کا مطالعہ کرنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اسلام نے اخلاقیات کے اوپر کتنا زور دیا ہے۔ یہ دین اسلام کی وہ خصوصیت ہے جو اس کو دوسرے تمام ادیان سے نہ صرف ممتاز کرتی ہے بلکہ اس کی بقا کی بھی ضامن ہے۔

جب اخلاق غلط ماحول اور تربیت کی وجہ سے تباہ ہونے لگیں جب انسانی عادتیں بگڑنے لگیں، جب امراض روحانی قوم کی معنویت کو نقصان پہونچانے لگیں اور خیر وسعادت پر اثر انداز ہوں تو دین اور مصلح کی ذمہ داری ہے کہ وہ قوم کے اخلاقی نقائص کو دور کرے اور انسانی نفس میں جو خلا اس مرض کی بنا پر پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی نشان دہی کرتے ہوئے اس وبائی مرض کو رفع کرے تاکہ وہ فرد قوم کا ایک صالح جزو بن کر ایک ایسا بہترین معاشرہ تشکیل دینے میں معاون ہو جو خیر کے راستہ کی طرف گامزن ہو جائے۔

اسلام ایک فردی اجتماعی دین ہے۔ یعنی اسلام جس طرح معاشرہ کی سعادت اور اصلاح کی کوشش کرتا ہے اسی طرح وہ فرد کی سعادت اور اصلاح کا بھی خواہاں ہے۔ وہ صرف سماج کی تنظیم کی کوشش نہیں کرتا بلکہ فرد کو بھی مہذب بنانے کے اصول بتاتا ہے چونکہ معاشرہ کی اصلاح کے لیے فرد کا صالح ہونا ضروری ہے۔ اسی لئے دین اسلام نے فرد کی سعادت کا جو اہتمام کیا ہے اس کے دو رخ رکھے ہیں۔

ایک جانب تو وہ افراد کی سعادت کا اہتمام اس انداز سے کرتا ہے کہ اس پر چل کر ہر فرد ذاتی طور پر منزل کمال تک پہونچ سکے۔

اس اہتمام کا دوسرا رخ یہ ہے کہ فرد فقط اپنی ذات تک اس کمال کو محدود نہ رکھے بلکہ ایک صالح معاشرہ بنانے میں معاون ثابت ہو ــــ لہٰذا دین اسلام کو "دین اخلاق" کہنا نہایت ہی موزوں ہے اور اس کے رہبروں کے لیے بھی لازم ہے کہ ان میں روح اخلاق موجود ہو ــــ امام جعفر صادق علیہ السلام

ان ہی رہبروں میں سے ایک رہبر تھے۔

فلسفہ اخلاق یوں تو قدیم تہذیب کی میراث کا ایک جزو ہے۔ اور انسانوں نے جب بھی وجود کے فلسفہ پر بحث کی ہے تو فلسفہ اخلاق کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے۔ چونکہ انسان اس بات کو جانتا تھا کہ نفس بشری وجود کی ایک اہم فرد ہے اور اخلاق نفس بشر کے منظم اجزاء اور خواص ہیں لہٰذا اس نے بحث اخلاق میں ایک طویل مدت تک بڑی کوشش کی ہے اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلا ہے۔

لیکن جب ہم عرب کے جاہلی دور کو دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس فلسفہ کو سننے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کی۔ فلسفۂ اخلاق صرف چند فلسفیوں کی میراث اور چند شعراء کے افکار کی زینت بنا رہا۔

لیکن دین اسلام، جس نے ان ہی عربوں کے درمیان نشو ونما پائی اور حضرت رسول اکرم محمد عربیؐ جس کی تعلیمات کو پیش فرماتے رہے۔ اس نے علم اخلاق کو کئی جہتوں سے پیش کیا اور اس کے کچھ قواعد وضوابط بھی مقرر کئے، ایسے قواعد جو مختلف زمان ومکان کے لیے مفید ثابت ہوں۔

اسلام نے علم اخلاق کو اس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے کہ عرب کی جاہلی قوموں نے بھی اس کو مطابق فطرت پایا اور فلسفیوں کو بھی اس میں دلیل و برہان کی جھلک نظر آئی دین اسلام کی تمام باتیں عین فطرت اور مطابق دلیل و برہان ہیں۔ اس لئے کہ ان کا سرچشمہ وحی سماوی ہے جس میں غلطی کا امکان نہیں پایا جاتا۔ اگر وقت ملا تو ہم اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کریں گے اور اس ضمن میں "اسلام میں اخلاق" کے موضوع پر جناب احمد امین کے نظریات کا جائزہ لیں گے۔

(۴)

علم اخلاق انسان کے کسی خاص طبقہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ عام انسانی حق ہے اس کے نظام وقواعد اسی بنیاد پر بنائے گئے ہیں کہ اس سے تمام انسان برابر سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ جب تک انسانوں میں تربیت نفس کا ملکہ باقی رہے گا تب تک وہ فائدہ حاصل کرتے رہیں گے۔

یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ عام انسانوں کو علم اخلاق کی بے حد ضرورت ہے اس لئے کہ اخلاقی امراض لوگوں میں بہت ہیں اور مریض کو طبیب سے زیادہ دوا کی ضرورت ہوتی ہے۔

عوام غیر مانوس اصطلاحوں اور دور از فہم عبارتوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لیے امامؑ پر لازم تھا کہ وہ ان کی فہم وفراست کے مطابق توضیح فرماتے۔ لہٰذا اور دوسرے افراد نے جو علم اخلاق

کے مطالب پیش کئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ واضح اور روشن انداز امام علیہ السلام کا ہے اس لیے کہ وحی الٰہی نے ائمہؑ کو ان تمام بحثوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

(۵)

شیعہ علماء حدیث کو ہمیشہ سے اپنے ائمہ کے چھوٹے بڑے اقوال وارشادات کو جو "فقہ" جعفری یا دوسرے موضوعات سے متعلق رہے ہیں جمع کرنے کا بے حد شوق رہا ہے اس شوق کے نتیجہ میں بڑی بڑی کتابیں وجود میں آئیں اخلاقیات امام جعفر صادق علیہ السلام ان میں سے اس کا ایک حصہ ہے۔

اس تدوین اخلاق کے سلسلہ میں شیعوں کو امتیاز حاصل رہا ہے یہ امتیاز اس لیے نہیں تھا کہ ائمہؑ کے نصائح شیعوں کے لیے مخصوص تھے بلکہ یہ امتیاز انہیں اس لیے حاصل ہے کہ انھوں نے بڑے اہتمام سے ائمہ کے آثار کو جمع کیا ہے۔ اگرچہ امام کی نظر میں صرف چند ہی شیعہ ایسے تھے جن کو نصیحت کرنا واجب تھا لیکن ہمارے ائمہ کی خیر و اصلاح سے محبت یہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو اگر ان کی نصیحت فائدہ پہونچا رہی ہے تو اسے روک دیا جائے۔ سفیان بن سعید ثوری اور اس کے ساتھیوں کو جو امامؑ نے اخلاق کی تعلیم دی ہے وہ ہمارے دعوی کی بہترین دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا:

"خیر الناس من انتفع بہ الناس"

(لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے)

اور آپ ہی نے پیغمبر کی یہ حدیث پیش فرمائی:

"من لم یہتم بامور المسلمین فلیس منھم"

(جو مسلمانوں کے امور کا اہتمام نہ کرے وہ مسلمان ہی نہیں ہے)

شیعوں کو اس وجہ سے امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنے ائمہ کی تعلیمات کو دوسروں سے زیادہ سننے والے اور ان کے اقوال کو جمع کرنے والے ہیں اور امام علیہ السلام ان کی اخلاقی تربیت کے ضامن اور ان کے مذہب کے قائد و رہبر ہیں۔

اخلاقیات امام جعفر صادق علیہ السلام کے لعل و گہر حدیث و اخلاق کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں فقط ڈھونڈھنے والی نگاہ چاہیئے۔ یوں تو کوئی مستقل کتاب اخلاق امام جعفر صادقؑ کے نام سے نہیں ہے۔ بشرطیکہ "مصباح الشریعۃ" کو مستثنیٰ کر دیا جائے اس لئے کہ علماء کا اس کے بارے میں

اختلاف ہے۔ پھر بھی ان بکھرے ہوئے موتیوں کو جو حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں یکجا کر دیا جائے تو یہ اخلاق کا ایک بہترین گلدستہ بن سکتا ہے۔

"مصباح الشریعہ" کے بارے میں ناقدین علم حدیث نے شک و شبہ اور تردد کا اظہار فرمایا ہے ہم اس قول کے اثبات یا نفی کے سلسلہ میں یہاں بحث نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ اس طرح کی بحثیں دوسری کتابوں کا حصہ ہیں۔ احادیث اخلاق و سنن توثیق کی محتاج نہیں ہیں۔ "مصباح الشریعہ" پر بہت سے علماء نے اعتماد بھی کیا ہے اور ایک جماعت نے اس کو معتبر جانا ہے آنا ہی اس کی صحت کے لئے کافی ہے۔"

خلق خلق کے لغوی معنی ، عادت، دین اور مروت کے ہیں۔ اہل لغت نے الگ الگ ہر معنی کے لیے اقوال عرب سے شواہد پیش کئے ہیں ـــ یہ تمام الفاظ قریب المعنی ہیں۔ لیکن شاید لغت میں یہ لفظ ایک ہی معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے اور بقیہ معانی اسی کے متبادل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

علمائے اخلاق "خلق" کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ خلق نفس کا ایک ملکہ ہے جب انسان سے بغیر غور و فکر کے افعال صادر ہوتے ہیں تو یہ ملکہ ابھر کر سامنے آتا ہے اس ملکہ کی یہی خاصیت بھی ہے۔ یہ ملکہ اپنے اسی خاصیت کی بنا پر مشخص ہوتا ہے۔

بعض علمائے اخلاق کہتے ہیں کہ الخلق صورۃ الارادۃ خلق "صورت" ارادہ کا نام ہے شاید یہ علماء اس تعریف کے ذریعہ مزید وضاحت کے ساتھ خلق کے مفہوم کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال خلق کی یہ دوسری تعریف ایک طویل شرح چاہتی ہے ـــ لیکن اگر لفظ "صورۃ" سے مراد وہ ملکہ ہو جو نفس کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے اور عمل کے وقت ارادہ کا پابند ہوتا ہے تو پھر دونوں تعریفوں میں اختلاف نہیں رہ جائے گا۔

انسان کے نفس میں بہت سے صفات پائے جاتے ہیں جیسے وفا، صدق، سخاوت، شجاعت وغیرہ یہی صفات انسان کے بہت سے افعال و اعمال کا مصدر ہیں۔ انہی نفسانی صفات کا نام اخلاق ہے۔

علماء اخلاق پہلی منزل میں نفس کی ان ہی صفات سے اس حیثیت سے بحث کرتے ہیں کہ یہ صفات معتدل اور غیر معتدل دونوں ہو سکتی ہیں نیز ان میں تبدیلی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن وہ افعال جو انسان اپنے ارادہ اور اختیار سے انجام دیتا ہے جسے عقلاء خیر اور شر کہتے ہیں۔ اس کو علماء اخلاق

"سلوک" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دوسری منزل خیر و شر سے اس حیثیت سے بحث کرتے ہیں کہ یہ باطنی اخلاق کا ظاہری مظہر ہیں۔ اس لیے کہ عمل انسانی نفس کی صفت کو گر وہ منحرف ہے تو مہذب بناتا ہے اور اگر مہذب ہے تو یہ عمل اسے منحرف بھی کر سکتا ہے۔

اس لیے ہم اختیاری عمل کو اس عمل کا موضوع نہیں قرار دے سکتے۔ اس لیے کہ یہ رائے اصول علم سے متفق نہیں ہے۔ اگرچہ احمد امین صاحب نے اس رائے پر بہت اصرار کیا ہے اور اس کی بڑی طویل شرح بھی فرمائی ہے۔

اس علم کا موضوع ہی "خلق" ہے۔ خلق نفس کی صفت ہے نفس کے عمل کا نام خلق نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عمل اختیاری اس کے خارجی مظہر ہیں۔ جناب احمد امین اسی بنیاد پر دوسری چیزیں بھی پیش کرتے ہیں جن کو ہم آئندہ پیش کریں گے۔

اخلاق نہ تو کسی تصادم و تصادف کی پیداوار ہے اور نہ یہ کوئی اتفاقی نتیجہ ہے۔ اس لیے کہ اخلاق ایک ملکہ ہے اور ملکہ کے لیے بنیاد کا ہونا ضروری ہے جس طرح کسی عمارت کے لیے بنیاد لازمی ہے۔ اخلاق کی بنیاد طبیعت و سرشت، وراثت، تربیت اور عادت ہے۔ قدیم فلسفیوں کا یہ قول کہ "جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کا نفس — کورے کاغذ کی طرح صاف ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ اس کے منشاء کے مطابق تصویریں ابھرتی رہتی ہیں" — اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے کا ذہن ایک آئینہ کی طرح ہوتا ہے جس میں بہت تیزی سے اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ جن چیزوں کو دیکھتا ہے ان سے متأثر ہونے لگتا ہے اور ہر نئی چیز اس کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے — "کورے کاغذ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ فطری اور موروثی طبیعتوں سے عاری ہوتا ہے، یہ ساری چیزیں تو اس کے اندر پائی ہی جاتی ہیں۔ بس اخلاقی ملکہ سے اس کا نفس خالی ہوتا ہے۔ معربی اس کو صرف اخلاق سے آراستہ کرتا ہے۔ اس کے اندر فطرت و سرشت کو ایجاد نہیں کرتا۔ اس مقام پر پہونچ کر وہ ان لوگوں کی رد بھی اپنے اسی قول سے کرتے ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ "انسان فطرتاً فاعل خیر ہے" اور جو یہ کہتے ہیں کہ "انسان جبلت کے اعتبار سے شریر ہے۔"

اس جگہ ہم جناب احمد امین کے ان اقوال کو ترک کرتے ہیں جو انہوں نے علماء اخلاق کے اس قول کی تفسیر میں پیش کئے ہیں۔

لیکن وہ قانون وراثت جس کی طرف موصوف نے اشارہ فرمایا ہے اور جس کے ذریعہ انہوں نے مذکورہ بالا نظریہ کی تردید کی ہے۔ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ بچہ اپنے اسلاف کے اخلاق کا وارث ہوتا ہے، اس سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ بچہ کے اندر فطری اور موروثی طور پر ابتدائی اور بنیادی اخلاقی ضد پایا جاتا ہے۔ فلسفہ قدیم بھی اس کا منکر نہیں ہے۔ قدیم شریعتیں اور قدیم عربی ادب بھی اس کا اعتراف کرتا ہے۔

اخلاق انسانی کی تشکیل میں اس بنیاد کا اثر ایک نہج پر نہیں ہے اس لیے کہ طبائع، میلانات اور رغبتوں کے اعتبار سے مختلف شکل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں ــ طبیعت موروثی ہوتی ہے ــ تربیت ارادۂ عمل کے وقت نفس کو متوجہ کرتی ہے ــ اور عادت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ رونما ہونے والی صفت، نفس میں جم کر اخلاق کی شکل اختیار کر لیتی ہے ۔ اس طرح مبادی اخلاق کی دو قسمیں ہوئیں اختیاری اور اضطراری۔

۱ــ اختیاری مبادیات اخلاق انسان کے ارادہ و اختیار کے محتاج ہوتے ہیں ــ اختیاری کی صف میں "عادت" اور "تربیت" کی بعض چیزیں آتی ہیں ۔ جیسے مدرسہ اسکول اور دوست احباب۔

۲ــ اضطراری مبادیات اخلاق کے وجود میں ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس خود ان کا اثر انسان کے ارادہ پر ضرور پڑتا ہے ۔ اس صف میں طبیعت و وراثت اور تربیت کی دوسری چیزیں شامل ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی اس کی تصریح کی ہے آپ فرماتے ہیں "ان الخلق منحۃ یمنحہا اللہ فمنہ سجیۃ ومنہ نیۃ" اخلاق خدا کا عطیہ ہیں اس میں سے کچھ "سجیۃ" (طبیعت وعادت) ہیں اور کچھ کا نام ارادہ ہے ۔ اس حدیث کے بقیہ حصہ میں "سجیۃ" کا مطلب جبلت بیان کیا گیا ہے ۔ صاحب السجیۃ ھو مجبول" لا یستطیع غیرہ وصاحب النیۃ یصبر علی الطاعۃ تصبراً فھو افضلھا ۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جبلت جس چیز کی طرف دعوت دیتی ہے اور فطرت جس چیز پر ابھارتی ہے وہ اخلاق حسن ہے ۔ یہ چیز مشق سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔

اور کچھ چیزیں وہ ہوتی ہیں جو انسان کے میلان رجحان اور رغبت کے خلاف ہوتی ہیں

ایسی چیزیں مجاہدۂ نفس اور مشق سے حاصل ہوتی ہیں یہ دوسری قسم زیادہ بہتر اور افضل ہے۔
جب ہم نے مذکورہ بالا اصول پر غور کیا تو پتہ چلا کہ عادت اپنی خصوصیت میں منفرد ہے۔ عادت اخلاق کی تشکیل میں مستقل حیثیت رکھتی ہے باستقلال طباع وغیرہ کو حاصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اخلاق نام ہے ملکہ کا۔ اور نفس میں ملکہ بغیر تکرار عمل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا انسانی طبیعت اور موروثی صفات اخلاق کی تعمیر میں عادت کی محتاج ہیں۔ عادت کو انسان کی ہر صفت کے بدل دینے میں قدرت حاصل ہے۔ اور عقل کو طبائع کی درستگی میں دخل حاصل ہے اس لیے کہ عقل کے اندر عادات کو سدھارنے اور سنوارنے کی قدرت موجود ہے۔
امام جعفر صادق علیہ السلام اس مفہوم کی مندرجہ ذیل الفاظ میں وضاحت کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

"ماضعف بدن عمّا قویت علیہ نیتہ"

اس کا بدن کمزور نہیں ہے جس کی نیت یعنی عزم مستحکم ہے۔

طبائع نفسانی کو راہ راست پر لانا جہاد ہے۔ موروثی عادات سے چھٹکارا پانا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ یہ مشکل اس وقت آسان ہو جاتی ہے جب انسان کا ارادہ (نیت) قوی ہو لیکن اگر ارادہ کمزور ہے تو آدمی اپنے اندر خوبیاں نہیں پیدا کر سکتا

دوسرے مقام پر صادق آل محمدؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"ان اللہ ارتضیٰ دیناً فاحسنوا صحبتہ بالسخاء وحسن الخلق"

اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا ہے۔ لہٰذا تم سخاوت اور حسن اخلاق کے ذریعہ اپنے اسلام کو اور جلا بخشو۔

یہ اللہ کا احسان و کرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے لیے دین اسلام کو منتخب فرمایا۔ یہ دین دنیا و آخرت دونوں ہی میں کامیابی کا ضامن ہے لہٰذا بندوں پر واجب ہے کہ وہ برے اخلاق کا مقابلہ کریں اس لیے کہ برے اخلاق پر باقی رہنا اسلامی تقدس کے خلاف ہے۔ حضرتؑ کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ تہذیب اخلاق اگرچہ جہاد اکبر ہے۔ لیکن حدود امکان سے باہر نہیں ہے۔
اسی طرح کی ایک دوسری حدیث بھی امام جعفر صادق علیہ السلام کی ملتی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ:
"من اساء خلقہ عذب نفسہ" جس کا اخلاق بگڑ جائے اس کا نفس عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

بد خلقی ایک عذاب ہے جو انسان اپنے ہی ہاتھوں اپنے لیے مہیا کرتا ہے۔ یہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے جس سے ہر عاقل کا بچنا لازمی ہے ــــ عذاب ان معنوں میں ہے کہ یہ نفس کی کمزوری اور چراغ عقل کے گل ہوجانے کا سبب ہے۔ عذاب اس لیے ہے کہ یہ انسانیت کے لیے نقص ہے تعاون اور اعتدال کو ختم کردیتا ہے۔ اس عذاب کو انسان اپنا لیتا ہے اور اسی میں مبتلا رہتا ہے۔ امام علیہ السلام مذکورہ حدیث کے ذریعہ انسان کے ارادہ کو ایک ایسا ہتھیار سپرد کردینا چاہتے ہیں جس سے کام لے کر صفات رذیلہ سے دور رہا جاسکے اور نقائص و عیوب سے مقابلہ کیا جاسکے۔

بعض علماء اخلاق تصور کرتے ہیں کہ اخلاق خود نفس کی پیداوار ہے جو تغیر و تبدل یا تہذیب و اصلاح کو قبول نہیں کرتا۔ عقل کا اس پر کوئی زور نہیں ہے اور نہ ارادہ کے ذریعہ اس میں کوئی تبدیلی کی جاسکتی ہے ــ یہ ایک باطل نظریہ ہے جو سیاست کی بنیادوں کو ڈھا دیتا ہے اور شریعت کے فائدہ کو لغو اور نظم اخلاق کو باطل کردیتا ہے۔ اور یہی باتیں اس نظریہ کے باطل ہونے کے لیے کافی ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے قول "صاحب السجیة ھو مجبول لا یستطیع غیرہ" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اخلاق کو سدھارا نہیں جاسکتا بلکہ اس کا مفہوم فقط یہ ہے کہ اخلاق کی تشکیل عادتوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ انسان کے لیے زیادہ دشوار محاذ اس وقت ہوتی ہے جب (برے) اخلاق کو جنم دینے میں طبیعت اور عادت دونوں مدد کریں۔ جب طبیعی میلانات کا ساتھ ارادہ بھی دینے لگتا ہے تو عمل میں تیزی پیدا ہوجاتی ہے اور عمل کی تکرار عادت کا روپ اختیار کرلیتی ہے پھر اسی سے (برے) اخلاق کی بنیاد پڑتی ہے پھر بھی اگر اس کا دفاع کیا جائے اور عادت سدھارنے کی کوشش کی جائے تو اس میں درست ہونے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ عادت کو بدلنا آسان ہے مگر بگڑی ہوئی طبیعت میں اعتدال پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔

اسی کو اہل بیت علیہم السلام نے جہاد کے نام سے تعبیر کیا ہے اور اسے جہاد کہنا حق بجانب بھی ہے۔ اخلاق کو درست کرنا مجاہد کی ہوشیاری کی دلیل ہے اس میدان میں غالب آنے والے کے لیے وہی اجر ہے جو ایک مجاہد کا اجر ہوتا ہے۔ پیغمبرؐ نے کسی جہاد کی واپسی پر فرمایا تھا:

مرحباً بقوم قضوا الجهاد الاصغر وبقی علیهم الجهاد الاکبر[۴]۔

مرحبا ہو اس قوم پر جو جہاد اصغر سے پلٹ کر آرہی ہے لیکن ابھی جہاد اکبر باقی ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ:

جہاد اکبر جہاد نفس کو کہتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ:

واجعل نفسک عدواً تجاهده

تم اپنے نفس کو اس دشمن کی طرح سمجھو جس سے تم جہاد کررہے ہو۔

نفس سے مراد یہاں ملکات وغیرہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس دھوکہ باز دشمن سے بڑا دشمن اور کون ہوگا جس سے جنگ کی جائے۔ یہ وہ دشمن ہے جو نصیحت کی آستین میں بے وفائی کا خنجر چھپائے ہوتا ہے۔ جو تمناؤں کی مٹھاس میں قاتل زہر گھول دیتا ہے یہ وہ داخلی دشمن ہے جس سے دفاع ہر حال میں واجب ہے۔

حواشی

۱۔ الخلق الکامل جزو اوّل ص۵۱

۲۔ کافی حدیث ۱۱ باب حسن الخلق

۳۔ کافی حدیث ۴ باب الکلام

۴۔ وسائل کتاب الجہاد باب وجو جہاد النفس کی پہلی حدیث

خوش خبری :-

مجلۂ توحید کے سلسلہ میں قارئین کرام کی دلچسپی اور مقبولیت کے پیش نظر ہماری عرصہ سے خواہش تھی کہ اس سہ ماہی رسالہ کو ماہانہ نہ سہی تو کم سے کم دوماہی ضرور کردیا جائے ۔ الحمدللہ ہماری یہ دیرینہ خواہش پایۂ تکمیل کو پہونچی اور اب آپ کا یہ رسالہ ہر دوسرے ماہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا جاتا رہے گا۔ اگرچہ کسی کام کا اقدام آسان ہوتا ہے مگر اس کے معیار کو برقرار رکھنا کارے دارد، پھر بھی ہم نے اس امید پر یہ عظیم بیڑا اٹھالیا ہے کہ ہمارے تمام معاونین خصوصاً مقالہ نگار حضرات اپنی خصوصی توجہ سے فراموش نہیں کریں گے ۔

= ادارہ =

جناب اکبر علی منصفی ۔ ناگپور ۔ ہندوستان

اسلامی ریاست کے مقاصد

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور (سورۃ الحج /۴۱)

یعنی ؛ وہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین پر تمکن واقتدار دیدیں تو وہ (باقاعدہ) نماز قائم کریں گے، زکات دیں گے، نیک کاموں کا حکم اور بد سے روک ٹوک کریں گے اور تمام کاموں کا انجام خدا ہی کے ہاتھوں میں ہے ۔

اگرچہ بظاہر یہ جملہ شرطیہ ہے لیکن حقیقت میں یہاں شرط خبر کا معنی دے رہی ہے ۔ سیاق وسباق عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی فرمانروائی وحکومت خدا کے ہاتھ میں ہے وہ ولایت وحکومت ہر ایک کو نہیں بلکہ اپنے ان خاص بندوں کو دیتا ہے جو اس کے مطیع وفرمانبردار، مخلص و مددگار اور صالح و پرہیزگار ہوتے ہیں ۔ وہ ایسے ہی افراد کو اپنی زمین کی مملکت کا انتظام کرنے کے لیے معین ومقرر کرتا ہے جو دولت وطاقت وکثرت کے نشہ سے دور اور نخوت وشرارت و بے اعتدالی سے منزہ ہوتے ہیں ۔ محبت الٰہی میں سرشار فرائض منصبی کے ادا کرنے میں کوشاں اور خدا کی طرف سے عاید کردہ ذمہ داریوں کے بجالانے میں شب و روز منہمک رہتے ہیں ۔ وہ خود بھی قانون الٰہی کی پابندی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی پابند بناتے ہیں ۔ وہ ہر برائی سے خود بھی بچتے ہیں اور دوسروں کو بھی بچاتے ہیں اور ہر نیک کام بجالاتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کا عادی بناتے ہیں ۔ وہ اپنا مقصدِ حیات پورا کرکے

کمال کی انتہا کو پہنچتے ہیں اور دوسروں کو بھی پہونچانے کی کوشش کرتے ہیں۔
اس آیۂ مبارکہ نے اسلامی ریاست، اس کے مقاصد اور اس کے فرمانروا کے فرائض منصبی کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اسلام صرف عقیدہ کا نام نہیں :

اسلام کوئی ایسا دین و مذہب نہیں ہے جس میں صرف عقائد کو پیش کیا گیا ہو۔ بلکہ وہ بہترین نظام عمل اور مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے۔ اس کا دستور زندگی اتنا جامع و مستحکم ہے جو انفرادی واجتماعی زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے۔ جب کوئی مسلمان اسلام کو قبول کر لیتا ہے تو گویا وہ اپنے خالق ومالک سے یہ عہد و پیمان کر لیتا ہے کہ میں ہر حالت میں حکومت الٰہیہ کا فرمانبردار و وفادار اور قانون الٰہی کا پابند و تابعدار رہوں گا۔ اسی کو قرآن مجید نے یوں واضح کیا ہے :

ان اللّٰہ اشتریٰ من المؤمنین انفسھم واموالھم بانّ لھم الجنّۃ

(سورۃ التوبہ / ۱۱۱)

یعنی، بیشک خدا نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنّت کے عوض خرید لیے ہیں

یوں تو ہر مخلوق خدا کی مملوک ہے لیکن ایمان واسلام کا اقرار کر کے اس نے خالق کی مالکیت و حاکمیت اور اپنی بندگی و محکومیت کو برضاء و رغبت تسلیم کر لیا ہے۔ اسے اب نہ تو قانون سازی کا اختیار ہے نہ اس کی حکمرانی سے سرکشی کا حق ہے۔ اپنی مرضی کے تحت نہ کسی کو انفرادی حکومت کا حق ہے، نہ کسی مخصوص جماعت یا افراد یا عمومی حکومت کے قیام کا حق حاصل ہے۔ ہر مسلم صادق و مومن مخلص کے نزدیک بس خدا ہی مقنن و قانون ساز ہے اور خدا ہی کو حکمرانی و فرمانروائی کا حق ہے نہ کوئی حاکم خود بن سکتا ہے نہ بنا سکتا ہے۔ نہ اس کی حکومت ہے نہ اس کی ملکیت ہے اور نہ اسے مالک کی اجازت اور اس کی رضامندی کے بغیر اس پر تصرف کا حق ہے۔ اسلام کی سلامتی اور ایمان کی خیر بس اسی میں ہے کہ حکومت الٰہیہ کو تسلیم کر کے اس کے فرمان کی تعمیل کی جائے۔

معلوم ہوا کہ انسان حاکم ہے نہ کسی انسان کا محکوم مگر یہ کہ خالق خود کسی کو حاکم بنانے اور کسی کی اطاعت کا حکم دیدے۔ انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے اور کسی کو اس کی آزادی سلب کرنے کا حق نہیں ہے بیشک آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے لیکن آزادی سے مراد کسی قسم کی پابندی نہ ہو ایسا بھی نہیں ہے۔

اگرچہ انسان انسان کا غلام ہے نہ انسان انسان کا بادشاہ وہ نہ مالک ہے نہ مملوک، پھر بھی فطری آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان بلامنت غیرے وجود میں آگیا ہے اور انسان مطلق العنان ہے جو چاہے کرے جیسے جی چاہے رہے۔ اور اگر بالفرض آزاد پیدا بھی ہوا ہو تو یقیناً آزاد زندگی نہیں بسر کرسکتا ورنہ کشتی حیات بحر ہستی کی طوفانی موجوں سے ٹکرا کر نذر گرداب ہلاکت ہوجائے گی۔ مطلق آزادی کا نعرہ بے خودی کے سوا کچھ بھی نہیں چونکہ یہ سب جانتے ہیں کہ زندگی کے بہت سے شعبے ہیں اور ہر شعبہ میں مختلف راہیں ہیں اور ہر راہ میں سینکڑوں موڑ اور لاتعداد نشیب و فراز ہیں۔ اس کے علاوہ اس رہ گذر حیات میں مسافرین کا ایک جم غفیر ہے جس میں مختلف قسم کے افراد ہیں، مختلف صلاحیتیں، مختلف ذہنیتیں اور مختلف حیثیتیں ہیں۔ کوئی سوار ہے کوئی پیادہ ہے کسی کی حیوانی سواری ہے کسی کی مشینی سواری ہے، کوئی تیز رو ہے کوئی سست رفتار ہے۔ کسی کو جلدی ہے کسی کو اطمینان ہے کوئی ضرورت سے اور کوئی محض تفریح کے لیے نکلا ہے، مرد بھی ہیں، عورتیں بھی۔ بوڑھے بھی ہیں جوان بھی۔ چھوٹے بھی ہیں بڑے بھی۔ صحت مند بھی ہیں بیمار بھی۔ کمزور بھی ہیں طاقتور بھی۔ اپاہج بھی ہیں سالم بھی۔ بینا بھی ہیں نابینا بھی۔ اگر یہ سب پوری آزادی سے گزریں جس طرح چاہیں ویسے گزریں، جدھر سے چاہیں ادھر سے گزریں تو نہ جانے کہاں کہاں تصادم ہو اور نہ جانے کس کس طرف تباہی برپا ہو اور نہ معلوم زندگی کے کتنے نامراد ناکام جنازے نکلتے ہوئے دکھائی دیں۔ اسی لیے ہر ملک اور ہر شہر میں آمد و رفت (ٹریفک) کے کچھ اصول معین کردیئے گئے ہیں تاکہ یہ پیکر بقا آغوش فنا میں نہ سوجائے۔

ذرا غور فرمائیں کہ جب زندگی کا ایک معمولی سا راستہ آزادی سے طے نہیں کیا جاسکتا تو زندگی کی طویل راہ مطلق العنانی کے ساتھ کیوں کر طے ہوسکتی ہے۔ پتہ چلا قید و بند اور نظم و ضبط کے ساتھ زندگی کی تمام راہوں کو طے کرنا ضروری ہے۔ تاکہ خود بھی اور دوسرے راہگیر بھی سلامت رہیں اور ہر راہرو محفوظ طور پر منزل مقصود تک پہونچ جائے۔ ہاں یہ بات البتہ معقول و قابل قبول ہے کہ یہ قید و بند اور نظم و ضبط، نامعقول ناجائز، بے جا بے محل خلاف عقل خلاف فطرت اور خلاف ضمیر نہ ہو۔ انسان کا انسان پر تفوق جتانا اور تحکم سے کام لینا، یہ خلاف فطرت اور خلاف مزاج ہے۔ یہ چیز بلا مرجح، بلا اولویت بے محل اور ظلم پر مبنی ہے اور یہی بلا استحقاق تصرف ناقابل برداشت ہوتا ہے اور جب پیمانہ صبر چھلک اٹھتا ہے تو بغاوت و انقلاب کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن جائز پابندی معقول بندش مناسب نظم و ضبط یہ تو قابل تعریف ہے فطرت کے مطابق ہے شرافت بشری کا طرۂ امتیاز ہے۔

اب رہا استحقاق و ترجیح و اولویت کا مسئلہ۔ تو اگر انسان اپنی ہستی کی تہی دامانی پر نظر کرے تو از خود سمجھ لے گا کہ انسان نہ از خود پیدا ہوتا ہے نہ از خود زندہ رہتا ہے اور نہ از خود مرتا ہے۔ انسان کا وجود غیر کا رہین منت ہے۔ انسان کی بقا غیر کے رحم و کرم پر منحصر ہے انسان کی ارتقاء اور کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہے انسان کی موت میں کوئی اور قوت کارفرما ہے۔ کیا انسان کی یہ بیچارگی یہ بے کسی یہ بے بسی اس کے لیے سبق آموز نہیں ہے؟؟! کہ وہ ذات جو اس کی ذات سے بالکل الگ ہے، جس کے دست نگر تمام منزلیں طے ہو رہی ہیں ظاہر ہے وہ اس طرح کسی کا دست نگر نہیں ہو سکتا یہ مجبور ہے وہ قادر ہے یہ مملوک ہے وہ مالک ہے یہ مخلوق ہے وہ خالق ہے یہ مرزوق ہے وہ رازق ہے اور اس کی یہی نسبت سارے عالم سے ہے۔ اسی لئے وہ رب العالمین اور خیر المحسنین ہے۔ اب آپ خود ہی انصاف سے بتائیے کہ ایسی ذات جو ان اوصاف کی حامل ہو وہ مستحق حاکمیت ہے کہ نہیں! وہ قابل ترجیح ہے کہ نہیں؟ وہ اولیٰ ہے کہ نہیں! انسان کی عقل بشر کا شرف عدل کی صفت پکار پکار کر کہے گی کہ بے شک وہ ہر حیثیت سے حاکم ہونے کا مستحق ہے اولیٰ ہے مرجح ہے اقدم ہے۔ پس معلوم ہوا کہ خدا خالق و مالک ہے اور وہی ساری کائنات کا حقیقی حکمراں ہے۔ لیکن وہ اپنی خدائی زبردستی نہیں منوانا چاہتا، نہ اپنے رسول کی رسالت زبردستی منوانا چاہتا نہ اپنے امام کی امامت و ولایت زبردستی منوانا چاہتا ہے۔ اس کا اس نے بندے کو اختیار دیا ہے

فجعلنٰہ سمیعا بصیرا انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا

واما کفورا (سورۃ الدہر/۲۰۳)

ہم نے انسان کو دانا، بینا بنایا ہے، اسے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ اب وہ خود چاہے تو شاکر بنے یا چاہے تو کافر بن جائے۔

اس کا اسے اختیار ہے لیکن اگر وہ اپنی خدائی قہراً و جبراً منوانا چاہتا تو کس کی مجال تھی کہ جو سر مو سرتابی کر سکتا۔ لیکن ایسی صورت میں انسان کا شرف اور اس کا امتیاز باقی نہ رہتا اور نہ اس کی عقل کا جوہر نمایاں ہوتا۔ چنانچہ ارادی و اختیاری افعال میں تو وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے لیکن تکوینی و فطری و اضطراری معاملات میں تو بہر حال اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنی ہی پڑتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السمٰوٰت

والارض طوعا وکرھا والیہ یرجعون (سورہ آل عمران/۸۳)
کیا یہ لوگ خدا کے دین کے علاوہ کوئی اور دین ڈھونڈ رہے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب کے سب خوشی وناخوشی اس کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں اور سب کو اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

اسلام نے اسی حکومت الٰہیہ کو انسان کے ذہن میں مختلف عنوان سے متر کثر کیا ہے اور اسی حقیقت کو جب سمجھ دار آدمی غور کرتا ہے تو سچے دل سے اقرار کرتا ہے کہ بیشک زمین و آسمان کی حکومت کا مالک وہی خالق ہے جو رازق ہے۔ قرآن اسی جانب اشارہ کرتا ہے:

(۱) و للہ ملک السموات والارض و مابینھما (سورۃ المائدہ/۱۷)
اللہ ہی کے لیے زمین و آسمان کی سلطنت ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے سب اسی کا ہے۔

(۲) الا لہ الخلق و الامر (سورۃ الاعراف/۵۴)
خبردار ہو جاؤ خلق کرنا اسی کے لیے ہے اور حکم نافذ کرنا بھی اسی کے لیے ہے۔

(۳) ولم یکن لہ شریک فی الملک وخلق کل شی فقدرہ تقدیرا۔ (سورۃ الفرقان/۲)
اور کوئی خدا کے ملک میں شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے پھر ایک اندازہ پر درست کیا ہے۔

(۴) قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شئی قدیر (سورۃ آل عمران/۲۶)
اے رسول کہئے کہ اے اللہ تو ہی ملک کا مالک ہے اور تو جسے چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے، جسکو چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔ ہر خیر تیرے دست قدرت میں ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

۵) و للّٰہ خزائن السمٰوات و الارض و لٰکن المنافقین لا یفقھون (سورۃ المنافقین/۷)
حالانکہ سارے زمین و آسمان کے خزانے کا مالک خدا ہے لیکن منافق لوگ اتنی بات نہیں سمجھتے۔

۶) الیس اللّٰہ باحکم الحاکمین (سورۃ التین/۸)
کیا خدا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ (بے شک ہے)

۷) ان الحکم الا للّٰہ (سورۃ یوسف/۴۰)
بس حکومت تو خدا ہی کے واسطے خاص ہے۔

۸) انّ الارض للّٰہ یورثھا من یشاء من عبادہ (سورۃ الاعراف/۱۲۸)
بے شک زمین خدا کی ہی ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔

۹) وما اختلفتم فیہ من شیٔ فحکمہ الی اللّٰہ (سورۃ الشوریٰ/۱۰)
اور تم لوگ جس چیز کے بارے میں اختلاف رکھتے ہو اس کا فیصلہ خدا ہی کے حوالہ ہے۔

۱۰) یقولون ھل لنا من الامر من شیٔ قل انّ الامر کلّہ للّٰہ (سورۃ آل عمران/۱۵۴)
وہ لوگ کہتے ہیں امر یعنی حکومت میں کچھ ہمارا بھی حصہ ہے اے رسول کہدو کہ پوری حکومت اللّٰہ کی ہے۔

۱۱) یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم (سورۃ النساء/۵۹)
اے ایمان لانے والو! اللّٰہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول اور جو تم میں صاحبانِ امر ہیں ان کی اطاعت کرو۔

۱۲) وعد اللّٰہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنّھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا۔ (سورۃ النور/۵۵)

خدا نے وعدہ کر لیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کیے ہیں، انھیں ضرور ضرور زمین پر جانشین بنائے گا۔ جیسا کہ ان سے پہلے والوں کو جانشین بنایا تھا اور ضرور ضرور ان کے دین کو جو ان کے لیے پسند کیا ہے اسے ہر طرف پھیلا دے گا اور ضرور ضرور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا اس وقت لوگ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیں گے۔

(۱۳) اللہ یوتی ملکہ من یشاء (سورۃ البقرہ/۲۴۷)

خدا جس کو چاہتا ہے اپنا ملک عطا فرماتا ہے۔

(۱۴) وربک یخلق مایشاء ویختار ما کان لھم الخیرۃ سبحان اللہ وتعالیٰ عما یشرکون (سورۃ القصص/۶۸)

اور تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے بندوں کو انتخاب کرنے کا حق نہیں ہے۔ خدا کی ذات پاک و بلند ہے اس چیز سے جس کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ حکمران بنا اور بنانا دونوں کار خدائی میں دخالت و شرکت ہے جو اس کی مرضی کے خلاف ہے اور غلط قبضہ و بے جا تصرف ہے۔ چنانچہ بیحرہ بن فراس عرب کے قبیلہ کا سردار رسول خدا کی کارگزاریوں کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ کل ساری دنیا پر چھا جائیں گے چنانچہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ ہم اس شرط پر آپ کا تعاون کرنے پر تیار ہیں کہ آپ اپنے بعد اقتدار و خلافت ہمارے سپرد کر دیجئے آنحضرتؐ نے فرمایا: الامر الی اللہ یضعہ حیث یشاء حکومت و خلافت خدا کے ذمہ ہے وہ جسکو چاہتا ہے مقرر کرتا ہے۔ نہ میں حکمراں بنا سکتا ہوں نہ خلیفہ بنا سکتا ہوں، اس کا چننا بنانا خدا کی طرف ہے۔ (محسن انسانیت ص ۳۵ و ص ۱۹۵)

ظاہر ہو گیا کہ اسلام میں نہ شخصی حکومت ہے نہ کسی خاص جماعت کی حکومت ہے نہ عوامی اور اجتماعی حکومت ہے۔ حکومت، سلطنت، ریاست، امارت، ولایت جو کچھ ہے صرف اللہ کے لیے ہے بس وہی خالق و رازق و مالک ہے۔ وہی حقیقی حکمراں اور وہی اصلی فرمانروا ہے۔ اسی چیز کو ایک مثال سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے۔ ایک کاشتکار یا کسان جو اپنے کھیت کا مالک ہے

کھیت کو قابل کاشت بنانے کے لیے زمین کو کھودتا ہے۔ ڈھیلوں کو توڑتا ہے، ہموار بناتا ہے پھر کھاد ڈالتا ہے جوتتا ہے، بوتا ہے اور پانی ڈالتا ہے دن رات جانفشانی کرتا ہے نگرانی کرتا ہے اب جبکہ کونپلیں پھوٹیں امیدوں کے سبزے لہلہانے لگے۔ بالیوں میں دانے آکر محنتوں کا ثمرہ دکھانے لگے۔ کھیت کا مالک خوش ہوا کہ خدا کا شکر ہے کہ محنت کا پھل کھانے کا وقت آگیا دانے کاٹنے کے لائق ہو گئے، کہ اچانک ایک آدمی، یا چند مخصوص افراد یا اجتماعی طور پر بہت سے لوگ کھیت میں گھس پڑیں کچھ کھیت روندیں، کچھ اناج کی بالیاں بھون کر چبالیں، کچھ لوٹ مار کر کے تہس نہس کر دیں کچھ باندھ کر گھر لے جائیں اور کچھ وہیں قبضہ جمائے کسان کا حق دبا کر بیٹھ رہیں۔

تو آپ سوچ بتائیے کیا یہ ان کا کام صحیح ہے؟ کیا ان کا استعمال درست ہے؟ کیا کسی کے مال پر قبضہ جمانا جائز ہے؟ بلا اجازت دوسرے کی ملکیت میں داخل ہونا حلال ہے؟ کیا مال غیر پر تصرف حرام نہیں؟ کیا دوسرے کا حق لینا قابل مذمت اور لائق ملامت نہیں؟

دنیا کا ہر سمجھدار عقلمند آدمی یہی کہے گا کہ قبضہ غاصبانہ ہے تصرف حرام ہے خرد برد کرنا نقصان ہے۔ لوٹ مار کرنا چوری ہے ڈاکہ ہے، بلا اجازت گھسنا زبردستی ہے غنڈہ گردی ہے۔ نقصان کا تاوان دینا پڑے گا اور زبردستی گھس پیٹ لوٹ مار یہ سب چوری ڈاکہ ہے جرم ہے اور وہ مجرم ہے اور سزا کا حقدار ہے۔

پس اسی طرح خدا کے ملک و ملکیت میں بیجا مداخلت، بلا استحقاق تصرف ہے۔ بندہ کو انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے کیا حق حاصل ہے کہ خدا کے مال کو بغیر اس کی اجازت کے بلا استحقاق اس کے ضابطہ کے خلاف تصرف کرے۔ کیا ایسا کرنے والے سے مواخذہ نہ ہوگا؟ کیا اس نے گناہ نہیں کیا؟ کیا وہ عذاب الہی کا مستحق نہیں؟

ہاں جب وہ اجازت دیدے جس کو اجازت دیدے، جس طرح اجازت دیدے، جتنی اجازت دیدے اس کی مرضی کے مطابق اس کے دستور العمل کے مطابق قبضہ بھی جائز ہے تصرف بھی حلال ہے۔ ورنہ حرام ہے، گناہ ہے، جرم ہے اور مع جرمانہ کے سزا کا حقدار ہے تاکہ آئندہ دوسرے لوگ ایسی جرأت وجسارت نہ کریں۔ پس جو کچھ خدائی میں ہے خدا کا ہے جو کچھ خلق میں ہے خالق کا ہے اور اسی مالک حقیقی کا ہے جس کی ملکیت میں ہے۔ پس اگر وہ اپنے کچھ خاص بندوں کو جو انسان کامل ہیں اور اعلیٰ

خصوصیات کے حامل ہیں، اوّلیت و اَوْلویت اور سبقت و رجحان کی بنا پر مطابق مشیّت، نظم و ضبط کی صلاحیت دیکھ کر اپنی نیابت دیدے اور انھیں اپنی ولایت بخشدے اپنی حکومت کا حکمراں اور اپنی سلطنت کا سلطان بنادے۔ تو کسی دوسرے کو اعتراض کا کیا حق ہے۔ اپنا مال، مالک جس کو چاہے دیدے، اسے دینے کا حق ہے اسے تصرّف کا حق ہے۔ وہ جس کو ولی و حاکم بناتا ہے اس کا پورا جائزہ لے کر بناتا ہے جسمیں نقص و عیب نہیں ہوتا۔ اور وہ اس حسن و خوبی سے فرائض منصبی کو ادا کرتا ہے کہ مالک حقیقی خوش ہو کر ارشاد فرماتا ہے کہ :

اِنَّ ھٰذا کان لکم جزآءً وّ کان سعیکم مشکورا (سورۃ الانسان/۲۲)

"بے شک یہ سب کچھ جو تمہیں دیا ہے وہ تو تمہارے محنتوں کا صلہ ہے اس کے باوجود تمہاری سعی جمیل لائق شکر گزاری ہے"۔ اور خالق و مخلوق کے درمیان ان کی کارگزاریاں اس حد کمال کو پہونچیں کہ وہ خدائے رؤف بالعباد اپنے بندوں کی مشقت و کارگزاریوں کا قدرداں پوری پوری جزا شایان شان دیتا ہے فرماتا ہے :

ولسوف یعطیك ربك فترضیٰ (سورۃ الضحیٰ/۵)

(یعنی) عنقریب تمہارا پروردگار تمہیں اس قدر دے گا کہ تم راضی و خوش ہوجاؤ گے۔

خدا کی اس دین پر جو ناکارہ نااہل اور محروم تھے، انھیں شاق گزرا وہ ان خاصان خدا سے حسد کرنے لگے اور درپئے آزار ہوگئے۔ خدا نے ان دونوں قسم کے بندوں کی حیثیت کو نمایاں کر کے اصل و نقل کو نمایاں کر دیا ہے تاکہ بندگان خدا مشتبہ نہ ہوں فریب نہ کھا سکیں اور راہ ہدایت سے بھٹک نہ جائیں۔ ارشاد ہوتا ہے :

ام یحسدون النّاس علیٰ ما اٰتٰھم اللہ من فضلہ فقد آتینا آل ابراھیم الکتٰب والحکمۃ و اٰتیناھم ملکا عظیما (سورۃ النساء/۵۴)

کیا یہ لوگ ان سے حسد کرتے ہیں جنہیں خدا نے اپنے فضل سے عطا کیا ہے۔ بے شک ہم نے آل ابراہیمؑ کو کتاب بھی دی ہے اور حکمت بھی دی ہے اور انھیں بہت بڑی سلطنت بھی دی ہے۔

بہر حال — ویختار ما کان لھم الخیرۃ

(یعنی ، خدا جس کو چاہتا ہے اپنی مخلوق میں سے منتخب کرتا ہے) بندوں کو انتخاب و اصطفاء و برگزیدگی کا حق نہیں ہے اس کا حق صرف اور صرف خدا کو ہے۔ وہ اپنے بندوں کی صلاح و فلاح وسلامتی و ترقی کے پیش نظر ان کے درمیان صحیح نظم ونسق قائم کرنے والے اپنے کسی خاص بندے کو اس کی اعلیٰ خصوصیات وکمال اطاعت کی وجہ سے اقتدار وسلطنت دیتا ہے اور زمین کی وراثت وامارت و ولایت وحکومت و ریاست مرحمت فرماتا ہے تاکہ نظام عالم برقرار رہے یہ اسکی کرامت، حکمت، مصلحت اور مرضی ومشیت ہے۔

لیکن وہ بندہ جو وارث، والی، حاکم یا فرمانروا ہوتا ہے باوجودیکہ وہ سب کچھ ہے پھر بھی خدا کا محکوم، فرمانبردار، اطاعت شعار، تابعدار ہونا ضروری ہے وہ دوسرے بندوں کی طرح خود بھی مامور ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مخلوق میں کسی بندہ کو نہ حکومت کا حق ہے نہ انتخاب کا حق ہے ۔ ان چیزوں کا حق بس صرف خدا کو ہے چونکہ اسی کا سب کچھ ہے پس بندہ کا حکمرانی اختیار کرنا یا دوسروں کو اس کے لیے منتخب کرنا حقوق اللہ میں مداخلت کرنا ہے جس کو قرآن نے "سبحان اللہ وتعالیٰ عمّا یشرکون" سے تعبیر کیا ہے۔ اسی لیے امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں "مَن طلب الریاسه هلک" اور دوسری روایت میں ہے "هلک واهلک" جس نے ناحق ریاست طلب کی وہ خود بھی ہلاک ہوا اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔ (اصول کافی ج ۲ ص ۴۳۹)۔ پس خدا کی مرضی کے مطابق اس کے منتخب کردہ اعلیٰ خصوصیات کے مالک کمال اطاعت شعار اس کے انبیاء ہیں ان کے بعد ان کے اوصیاء ہیں جو حکومت اسلامیہ مملکت الٰہیہ ریاست دینیہ کے حاکم وفرمانروا ہیں۔

انبیاء واوصیاء کے بعد احکام الٰہیہ کے عارف، نظام اسلامیہ کے عالم، قواعد وضوابط دینیہ پر عامل اور معارف حقہ کے ناظر و وارث، نائب امام محمد حجۃ الاسلام، مرجع انام سوائے علماء اعلام وفقہا کرام کے کون ہو سکتا ہے۔ یہ حضرات قانون الٰہی پر خود بھی عمل کرتے ہیں اور اس کے نفاذ کے مجاز بھی ہیں۔ علماء کی طرف نیابت و ولایت کی منتقلی کو امام معصومؑ نے نص فرمایا ہے۔ اور ان کی تقلید وفرمانبرداری کی تاکید کی ہے۔

① پیغمبر خداؐ فرماتے ہیں :

فانّ حبّهم اخلاص و بغضهم نفاق (جامع الاخبار ص ۴۸)

پس بے شک ان کی (علماء کی) محبت اخلاص ہے اور ان کی طرف سے بغض نفاق ہے۔
میں نے نہایت اختصار کے ساتھ پوری حدیث نقل کرنے کے بجائے محل شاہد عبارت پر اکتفاء کیا ہے۔

(۲) امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:
جو ہمارے حلال و حرام کو جانتے ہیں اور ہمارے احکام کو پہچانتے ہیں اور ہماری روایتوں کو بیان کرتے ہیں، تم ان کے فیصلوں پر راضی ہو ہم نے انھیں تم پر حاکم مقرر کیا ہے۔
"فارضوا به حکما فانی قد جعلته علیکم حاکما (منتہی الامال ص۳۴۶)
علماء حکم ہیں اور حاکم ہیں، تمہارا فیصلہ کرنے والے ہیں، تم پر حکم صادر کرنے والے اور فرمان جاری کرنے والے ہیں۔
اب کس مومن و مسلم میں اسلام و ایمان کے دعوے کے ساتھ حکم عدولی کی ہمت اور مخالفت کی جرأت ہے؟

(۳) رسول خداؐ فرماتے ہیں:
الفقهاء امناء الرسل .... (اصول کافی ج ا ص۸۲)
یعنی علماء و فقہاء پیغمبران خدا کے امانت دار ہیں۔

(۴) آنحضرتؐ کا ہی ارشاد ہے:
اللهم ارحم خلفائی .... (وسائل ج ۱۸ ص۶۶-۶۵۔ الحکومۃ الاسلامیہ)
بار الہا! میرے خلفاء (جانشینوں) پر رحم فرما اور یہ تین مرتبہ فرمایا۔ دریافت کیا گیا کہ خلفاء سے مراد کون لوگ ہیں؟ فرمایا وہ علماء و فقہاء ہیں جو میرے بعد میری سنت و حدیث کی تعلیم دیں گے۔

(۵) امام صادقؑ فرماتے ہیں:
انّ العلماء ورثة الانبیاء .... (اصول کافی ج ا ص۶۰۔ بحار الانوار ج ۲ ص۹۲)
بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

(۶) توقیع امام زمانہ عجل اللہ فرجہ میں ہے جب نئے مسائل درپیش ہوں تو ہماری حدیثوں کے بیان کرنے والے فقہاء کی طرف رجوع کرو:
... فانه حجتی علیکم و انا حجة الله علیهم (بحار الانوار ج ۲ ص۹۰)

یعنی عالم فقیہ بے شک ہماری طرف سے تم پر حجت ہے اور ہم ان پر خدا کی طرف سے حجت ہیں۔

⑦ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :

مجاری الامور بید العلماء باللہ الامناء علی حلالہ وحرامہ

(منتہی الامال صـ ۳۴۶)

یعنی احکام کا جاری کرنا علماء فقہاء کے ہاتھ میں ہے ۔ وہ خدا کے امانت دار ہیں اس کے حرام و حلال کے بتلانے ہیں۔ (خدا کی امانت داری بہت بڑی بات ہے اور غور کرنے کی چیز ہے)

⑧ امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں :

جو عالم فقیہ اپنے نفس کو بچائے رکھے اور اپنے دین کی حفاظت کرے اور اپنی خواہشات کی مخالفت کرے اور اپنے مولیٰ کے حکم کی اطاعت کرے پس عوام کو چاہئے کہ اس کی تقلید کرے

..... فللعوام ان یقلدوہ (بحار الانوار ج ۲ صـ ۸۸ - تحریر الوسیلہ صـ ۴)

⑨ قال النبیؐ من احتقر صاحب العلم فقد احتقرنی ومن احتقرنی فھو کافر

(عماد الاسلام صـ ۵)

رسول خداؐ فرماتے ہیں: جس نے عالم دین کی توہین کی اس نے میری توہین کی اور میری توہین کرنے والا کافر ہے۔

⑩ فقہ الرضاؑ میں ہے :

منزلۃ الفقیہ فی ھذا الوقت کمنزلۃ انبیاء بنی اسرائیل

(الحکومۃ الاسلامیہ صـ ۱۰۱)

یعنی اس زمانے میں عالم فقیہ کا مقام پیغمبران بنی اسرائیل کے مثل ہے ۔

⑪ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں :

..... لان المومنین الفقہاء حصون الاسلام کحصن سور المدینۃ لھا...

(الحکومۃ الاسلامیہ صـ ۶۳)

اس لیے کہ فقہاء مومنین ، اسلام کا قلعہ ہیں جیسے کہ سور البلد شہر کی حفاظت و سلامتی کا سبب ہے پس معلوم ہوا کہ احکام الٰہیہ کے نافذ کرنے اور امت اسلامیہ کی حفاظت و ہدایت نیز اسلامی

ریاست کی بقاء وارتقا کے لیے کسی نائب امام حجت امام کی قیادت ضروری ہے اور وہی حکومت وولایت کے اہل اور حقدار ہیں۔ وہی امام کی طرف سے حکومت وریاست وسلطنت اسلامیہ کے حکمران وسلطان وفرمان روا ہیں۔ امت مسلمہ کی سیاست کے ذمہ دار ہیں قیام نظام حکومت اسلامیہ کے بقدر استطاعت ضامن ہیں۔ بس انکی حکومت وفرمانروائی نہ کسی کے ماننے یا نہ ماننے پر موقوف ہے نہ تخت وتاج کی محتاج ہے نہ لاؤلشکر کی پابند ہے۔ نہ تزک واحتشام کی رہین منت ہے نہ اسلحہ وخزانہ پر منحصر ہے نہ ملک گیری وکشورکشائی کی دستنگر ہے۔ ان کمالات کی جامع شخصیت اوران فضائل واوصاف کی حامل شخصیت جہاں کہیں ہو جس حال میں ہو وہ دین کی قائد اور اسلام کی محافظ ہے مسلمانوں کی حکمراں ہے سیاست امت مسلمہ کی ضامن ہے، ایسا شخص مذہبی پیشوا ہے محکمہ شرعیہ کا ذمہ دار ہے امت کا امام اور دین کا رہنما ہے۔

جیسے اس وقت رہبر انقلاب اسلامی امام الامت، حامی ملت، مجاہد اکبر، حاکم شریعت، مرجع انام، اسلامی فرماں روا، دینی پیشوا حجۃ الاسلام آیۃ اللہ العظمیٰ آقا الحاج السید روح اللہ الموسوی الخمینی مدظلہ العالی مادامت الایام واللیالی ہیں۔ جو خود فقیر بے نوا ہیں لیکن مملکت اسلامیہ کے فرمانروا ہیں۔ خود بے سروساماں ہیں لیکن سلطنت اسلامیہ کے سلطاں ہیں، مادی تخت وتاج سے بے نیاز ہیں، لیکن دینی حکومت کے تاجدار ہیں سیرت محمد وآل محمدؐ کے پیرو ہیں، خدا وائمہ ہدیٰ کے فرماں بردار ہیں۔ احکام شرعیہ کے پابند ہیں، فرمان الٰہیہ کے تابعدار ہیں۔ ایسی غیر معمولی عظیم شخصیت اپنے علم وعمل اور فضل وکمال، نیز شدت اطاعت خدا ورسول خدا وائمہ ہدیٰؑ کے سبب اس اعزاز وعہدہ پر فائز ہیں۔ آپ کی روحانیت کے سامنے مادی اقتدار قدموں پر سر جھکائے ہوئے ہے۔ دشمنان دین ومذہب طاغوتی طاقتیں سپر انداختہ نظر آتی ہیں۔ عصر حاضر کے بڑے طاقتور شیاطین حواس باختہ پھر رہے ہیں۔ اور زبان اعتراف سے ان کے حق وصداقت کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔

اس سپہر علم، فلک فضل، آسمان کمال کے نیر تاباں سے حق وصداقت کی وہ روشنی پھوٹ رہی ہے جس نے دنیائے ہستی کے گوشے گوشے کو جگمگا دیا ہے کوئی ملک کوئی قوم کوئی قبیلہ کوئی گھر اور کوئی بھی فرد ایسی نہیں ہے کہ اس کی شعاعیں اس تک پہونچ کر اسے منور نہ کئے ہوئے ہوں جس نے نہ صرف مادی انقلاب پیدا کیا ہے بلکہ زبردست ذہنی انقلاب پیدا کر دیا ہے جس کو ہر مکتبہ فکر کا انسان محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس مقدس بزرگ نے اپنے علم وعمل کی روشنی سے اس زمانہ کے تمام انسانوں کو یہ

دکھا دیا کہ حقانیت وصداقت ہی اصل طاقت ہے جو لازوال ہے جس کے سامنے دولت وطاقت وکثرت اپنی تمام شان وشوکت وجاہ وجبروتیت کے ساتھ اس کے قدموں پر ڈھیر ہے۔ ضد تعصب یا حق پوشی کی اور بات ہے ورنہ ہر حساس دل اور بیدار دماغ رکھنے والا اس حقیقت کا معترف ہے۔

آپ کی رہ نمائی میں اس مملکت اسلامیہ ایران اور اس کی تعلیمات دینیات نے ہر انسان میں خواہ وہ کتنا ہی ضعیف و نہتا کیوں نہ ہو وہ جرأت و حوصلہ پیدا کر دیا ہے کہ وہ حق کی حمایت اور صدق کی حفاظت کے لئے خدا کے لیے غیر سے بے پرواہ ہو کر میدانِ جہاد میں سر سے کفن باندھ کر نکل آتا ہے۔ اور اس طرح اپنے حقوق و فرائض پورا کرتا ہے کہ دیکھ کر دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ ظالم کے ظلم کو دور کرتا ہے۔ مظلوم کے حق کو دلا دیتا ہے خود بھی امن اور چین سے رہنا چاہتا ہے۔ دوسروں کو بھی امن و چین سے دیکھنا پسند کرتا ہے۔ غرض خلقت کی تکمیل کر کے دین و دنیا کی کامیابی اور سعادت ابدی کی سرفرازی چاہتا ہے اور دوسروں کو بھی ان نعمتوں سے لطف اندوز دیکھنا پسند کرتا ہے۔ اور یہی ریاست اسلامیہ کا مقصد ہے۔

(باقی آئندہ)

جناب ڈاکٹر سید جلال الدین مدنی
ترجمہ: جناب سید مہدی سرباز

جمہوری اسلامی ایران میں بنیادی حقوق

دستورِ اساسی پر ایک نظر

اسلامی جمہوریہ ایران کا دستور اساسی ایک مقدمہ اور ایک متن پر مشتمل ہے۔ مقدمے کا آغاز اللہ تعالیٰ کے مبارک نام اور قرآن پاک کی ایک آیت کریمہ سے یوں ہوتا ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔

اس مقدمے کے اندر یوں تو ایرانی قوم کے جہاد کی ابتداء خاص طور پر اس آخری صدی میں مشروطیت اور "نہضتِ ملی" کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن فتح انقلاب پر ختم ہونے والی تحریک کا سر آغاز ۱۳۴۲ شمسی کے واقعات ہیں۔ اسی مقدمے میں ولایت فقیہ کی بنیادوں پر استوار اسلامی حکومت کی پر زور تائید کی گئی ہے۔ یہ نظریہ حضرت امام خمینی مدظلہ العالی نے شاہی مظالم کے انتہائی شدید دور میں پیش فرمایا تھا۔ خشم ملت (قوم کا غصہ)، جو دی ماہ ۱۳۵۶ھ ش میں اپنی انتہا کو پہنچا تھا اور وہ قیمت جو قوم نے چکائی اور ہزاروں شہیدوں کا نذرانہ پیش کیا۔ یہاں تک کہ بہمن ۱۳۵۷ھ ش میں اسلامی انقلاب کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ ان عناوین سے بحث کرتے ہوئے مقدمہ میں دوسرے مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسلامی طرز حکومت، ولایت فقیہ عادل، اسلام میں اقتصادیات ذریعہ ہیں مقصد نہیں جیسے عناوین پر اختصار کے ساتھ بحث ہوئی ہے، کچھ دوسرے مسائل کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

جیسے:-
"عورت دستور اساسی کی نظر میں"[9]، "نظریاتی فوج"[10]، "دستور اساسی میں مسئلہ قضا"[11]، "قوہ مجریہ"[12]، "ذرائع ابلاغ عامہ"[13] اور "نمائندگان"[14] وغیرہ۔
مجلس خبرگان نے دستور اساسی کا متن مرتب کرنے کے بعد اس مقدمہ کو ترتیب دیا ہے۔

دستور اساسی کی بارہ فصلوں پر ایک نظر

دستور اساسی کا متن بارہ فصلوں پر مشتمل ہے اور ہر فصل کے اندر کئی کئی دفعات موجود ہیں جبکہ بارہویں فصل میں صرف ایک اصل ہے۔ اس طرح مجموعی اعتبار سے دستور اساسی ۱۷۵ دفعات پر مشتمل ہے، چونکہ بعض فصلیں لمبی ہونے کی وجہ سے کئی کئی بحثوں میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ جیسے قوہ مقننہ اور مجریہ سے متعلق فصلیں۔
مجموعی طور پر دستور اساسی کی فصلوں میں درج ذیل مطالب پائے جاتے ہیں:-

۱۔ کلّیات:

دستور اساسی کی پہلی فصل چودہ اصولوں کو بیان کرتی ہے، جو حسب ذیل ہیں:-
اسلامی جمہوریہ کی اساس، دستور اساسی کے مقاصد، موازین اسلامی سے قوانین کی تطبیق، نظریہ ولایت فقیہ کی منظوری، ملک کے انتظام عوامی آراء کی شمولیت، مختلف سطحوں پر شوریٰ کا قیام، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی تاکید، استقلال وآزادی کے تحفظ پر زور، خاندان کے تقدس کی حفاظت، مسلم قوموں کا اتحاد، ملک کے سرکاری مذہب کا تعارف، تمام مذاہب کے پیروکاروں کے حقوق کا تحفظ اور مجموعی طور پر غیر مسلموں کے ساتھ سلوک۔

۲۔ اسلامی جمہوریہ کی علامتیں

دوسری فصل میں چار دفعات کے تحت زبان، رسم الخط، تاریخ اور ملک کے پرچم کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے۔

۳۔ ملّت کے حقوق :

تیسری فصل میں چوبیس دفعات میں ملت کے حقوق بیان کئے گئے ہیں۔ اور انکی حفاظت و نگرانی پر زور دیا گیا ہے۔ اسی فصل میں افراد ملت کے حقوق کے بارے میں رنگ و نسل، زبان، قوم اور قبیلہ کے امتیازات سے ہٹ کر مساوات کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح مرد اور عورت کو بھی مساوات کی بنیاد پر قانون کی حفاظت فراہم کی گئی ہے۔ نیز عورت کے مادی و معنوی حقوق کی بحالی اور اس کی شخصیت کے ارتقاء کے لیے اسلامی معیاروں کو ضروری قرار دیا ہے۔ خاص طور پر ایام حمل اور بچوں کی تربیت کے دوران یا عمر رسیدہ خواتین کی حمایت کرنے والے قوانین کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ایک فصل میں انسان کی حیثیت، جان و مال، حقوق کا تحفظ، رہائش اور کام کی فراہمی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لوگوں کے عقائد و نظریات کے بارے میں چھان بین اور جاسوسی ممنوع قرار دی گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں ہر عقیدے کے لئے آزادی کی گنجائش پیدا کر دی گئی ہے۔ البتہ ذرائع ابلاغ اور نشریات کی آزادی کو عقائد اسلامی اور عام حقوق میں عدم مداخلت کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ خطوط کی چھان بین، ٹیلیفونی مکالمات کا ٹیپ کرنا یا سننا، اور جاسوسی کو قانون کی اجازت کے بغیر ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی طرح ہر طرح کی سنسر شپ اور افشا گری کو بھی منع کیا گیا ہے۔ افراد ملت کے دیگر حقوق جن کا اس فصل میں تذکرہ ہوا ہے وہ درج ذیل ہیں:۔

پارٹی یا گروہ کی تشکیل، جلسے جلوس کا انعقاد اپنے پسندیدہ کام کا انتخاب، اجتماعی سہولتوں سے بہرہ وری، مفت تعلیم کی سہولت، مناسب رہائش، عدالتوں میں رجوع کا حق، وکیل کا انتخاب اور شہریت کا حصول وغیرہ۔

افراد ملت کے حقوق کی حفاظت کے لیے الزام جرم، گرفتاری اور سزاؤں کی صورت میں بھی محکم اصول وضع کئے گئے ہیں۔ ہر طرح کی ایذا رسانی سے روکا گیا ہے اور اس سلسلے میں اصل برأت پر عمل کیا گیا ہے یہاں تک کہ کسی قیدی یا جلاوطن فرد کی بھی ہتک حرمت کرنا سزا کا موجب ہے۔

دستور اساسی کے اندر افراد ملت کے حقوق کی تفصیل ہم مناسب موقعوں پر بیان کریں گے۔

۴۔ اسلامی جمہوریہ میں اقتصادیات :

چوتھی فصل میں تیرہ دفعات شامل ہیں، جو اقتصادیات اور مالی امور سے متعلق ہیں۔ اگرچہ

دستور اساسی اسلام کی پیروی کرتے ہوئے اقتصاد کو اصل اور بنیاد قرار نہیں دیا ہے لیکن پھر بھی اقتصادیات کو خاصی اہمیت دی گئی ہے۔ اقتصادیات سے متعلق اصولوں میں بنیادی ضروریات کی فراہمی، سب افراد کے لیے کام کے حصول کی خاطر امکانات و ذرائع کی فراہمی، اقتصادیات کے جامع پروگرام کی تنظیم، کام کے انتخاب میں آزادی کی رعایت، ضرر رسانی کی ممانعت، بیرونی تسلط سے بچنے کی ضرورت، اور علوم و فنون سے استفادہ کرنے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ مزید یہ کہ زراعت، مال مویشی اور صنعتوں کی ترقی پر زور دیا گیا ہے تاکہ عوام کی ضروریات بآسانی پوری کی جا سکیں۔ دستور اساسی انفال اور عمومی سرمایہ کو فرد کی مالکیت سے خارج کر دیتا ہے لیکن جائز کاموں سے حاصل ہونے والے منافع کی مالکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اور مالکیت کے اصول و ضوابط کو عام قوانین کے تحت طے کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر اس فصل کے اندر اقتصادیات کو تین بنیادوں، سرکاری، کوآپریٹیو اور خصوصی پر استوار کیا ہے، اور ہر شعبہ کے لئے حدود معین کر دئے گئے ہیں لیکن ان کی جزئیات کو عام قانون کے ذریعہ طے کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔
چنانچہ حکومت کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ وہ سود، غصب، غیر مجاز طریقے سے سرمایے کی فراہمی، چوری، جوے، موقوفات کے ناجائز استعمال، سرکاری معاملات اور ٹھیکوں میں ناجائز استفادے، بنجر اور افتادہ زمینوں کی فروخت، فسق و فجور اور فحشا کے اڈوں کے قیام اور دوسرے تمام غیر مشروع طریقوں سے حاصل کی ہوئی دولت کو ضبط کرے اور حقدار کو پہنچا دے یا بیت المال میں داخل کرے۔

۵۔ حاکمیت اور اس سے متعلق قوتیں:

پانچویں فصل چھ دفعات پر مشتمل ہے جس میں ملت کا حق حاکمیت اور اس سے پیدا ہونے والی قوتیں بیان کی گئی ہیں۔ دستور اساسی میں کائنات اور انسان پر حاکمیت مطلقہ کا حق صرف خداوند عالم کے لئے مختص جانا ہے۔ اور انسان کو اللہ کے جانشین کی حیثیت سے اپنے اجتماعی مقدسات کا حکم تسلیم کیا گیا ہے۔ نیز یہ امر واضح کر دیا گیا ہے۔ کہ انسان کے اس الٰہی حق کو کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔
ملت سے حاصل ہونے والی حکومتی قوتوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

قوہ مقننہ   قوہ مجریہ   قوہ قضائیہ

یہ قوتیں ایک دوسرے سے جدا اور مستقل طور پر ولایت امر اور امامت امت کی نگرانی میں

فرائض انجام دیتی ہیں ۔ قوّہ مقننہ عوامی نمائندوں پر مشتمل مجلس کے ذریعہ تشکیل ہوتی ہے جبکہ اہم مسائل کے بارے میں براہ راست عوام سے رائے لینے کی تجویز بھی بعض حالات میں موجود ہے۔
قوہ مجریہ ان امور کے سواجن کی ذمہ داری صریحی طور پر رہبر کو سونپ دی گئی ہے ۔ صدر، وزیراعظم اور وزرا کی شکل میں اپنے فرائض انجام دے گی ۔ قوّہ قضائیہ کی ذمہ داریاں عدالتوں سے مربوط ہیں۔

قوّہ مقنّنہ

چھٹی فصل ۳۸ دفعات پر مشتمل ہے جو دفعہ ۶۲ سے ۹۹ تک دستور اساسی کی طولانی ترین فصل ہے یہ قوّہ مقننہ سے مخصوص ہے ۔ یہ فصل دو بحثوں پر منقسم ہے ۔ پہلی بحث میں مجلس شوریٰ کی تشکیل کے طریقے بیان ہوئے ہیں جبکہ دوسری بحث میں مجلس کے اختیارات اور صلاحیت کے بارے میں گفتگو ہے ۔
مجلس شوریٰ کے نمایندے براہ راست خفیہ ووٹ کے ذریعے چار سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں جنکی تعداد ۲۷۰ ارکان پر مشتمل ہے جسمیں ہر دس سال بعد اضافے کی گنجائش موجود ہے ۔ مجلس میں مذہبی اقلیتوں، زرتشتی، یہودی، آشوری وکلانی اور جنوب وشمال کے ارمنی عیسائیوں کا ایک ایک نمائندہ بھی ہوتا ہے ۔ مجلس کی تشکیل کا طریقہ، ہیئت رئیسہ کا انتخاب، حلف برداری اور مجلس کی علانیہ کاروائی سے متعلق بھی توضیح دی گئی ہے ۔ مجلس کی بنیادی ذمہ داری قانون وضع کرنا ہے ۔ اس سلسلے میں مذہبی احکامات اور دستور اساسی سے تجاوز منع ہے ۔ مختلف موضوعات بلوں اور تجویزوں کی صورت میں مجلس میں پیش ہوتے ہیں ۔ اور مجلس کو ملک کے تمام امور میں تحقیق و تفحص کا حق حاصل ہے ۔ عام قوانین کی تشریح و توضیح بھی مجلس کے فرائض میں داخل ہے ۔
ہنگامی حالات میں مجلس پابندیاں بھی لگا سکتی ہے ۔ البتہ مجلس (پارلیمنٹ) سے مخصوص اختیارات میں ملکی سرحدوں میں معمولی تبدیلی قبول کرنا، اندرونی اور بیرونی بلامعاوضہ امداد اور قرض کی لین دین، غیر ملکی ماہرین کی ملازمت اور سرکاری عمارتوں و اموال کا نقل و انتقال وغیرہ شامل ہے مجلس کا ہر نمائندہ قوم کے سامنے جوابدہ ہے ۔ نمائندگی کا حق صرف منتخب نمایندے کو حاصل ہے ۔ چونکہ نمائندگی کا حق کسی اور کے حوالے نہیں کیا جاسکتا ۔ اسی طرح پارلیمنٹ بھی قانون وضع کرنے کا کام کسی شخص یا کمیٹی کے حوالے نہیں کر سکتی جبکہ پارلیمنٹ کے اندر تشکیل پانے والے کمیشن کچھ شرائط کے ساتھ

اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مجلس کے ممبران اظہار رائے میں پوری طرح آزاد ہیں۔ انھیں اپنے نظریات کو بیان کرنے کے جرم میں سزا نہیں دی جا سکتی۔

وزراء کے لیے ضروری ہے کہ کام شروع کرنے سے قبل مجلس کا اعتماد حاصل کریں۔ وزراء مجلس کے سامنے جوابدہ ہیں۔ جب کسی مسئلے کے بارے میں کوئی نمائندہ مجلس سوال اٹھاتا ہے تو وزیر وزیروں پر جواب دینا لازمی ہے۔ سوال کے بعد کسی وزیر یا وزیروں کے خلاف تحریک عدم اعتماد ممبران پارلیمنٹ کی طرف سے شدید اقدام ہے۔ البتہ اس کے لیے کم از کم دس ممبروں کے دستخط ضروری ہیں اور اس کے بعد وزیر یا وزراء کی جواب دہی اور اس سلسلہ میں رائے اعتماد ضروری ہے۔ چنانچہ اگر رائے اعتماد نہ ہو تو کابینہ کے ٹوٹ جانے کا امکان ہے۔ اسی طرح دفعہ ۹۰ کے تحت مجلس سے قوا سہ گانہ کی شکایت بھی کی جا سکتی ہے۔ اسی فصل میں شورای نگہبان کی تشکیل اس کے حقوق و ذمہ داری کو بھی بیان کیا گیا ہے اس سلسلے میں ۹ دفعات مخصوص ہیں۔

شورای نگہبان کے بارہ اراکین ہوتے جن میں سے فقیہ عادل عالم حالات زمانہ اور روزمرہ کے مسائل سے باخبر چھ ارکان رہبر یا شورای رہبری کی جانب سے منتخب ہوتے ہیں۔ جبکہ دوسرے چھ ارکان قانون کے مختلف شعبوں کے ماہرین ہوتے ہیں، جو شورای عالی قضائی اور مجلس کی ہم آہنگی سے منتخب ہوتے ہیں۔ شورای نگہبان کے اراکین کی مدت چھ سال ہے۔

شورای نگہبان کے ذریعہ مجلس کی قانونی حیثیت ثابت ہوتی ہے چونکہ مجلس کے تمام مصوبات شورای نگہبان کی تائید کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ شورای نگہبان کی ذمہ داری مصوبہ قوانین کو موازین اسلامی اور دستور اساسی سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ دستور اساسی سے مطابقت کے سلسلہ میں تمام بارہ اراکین کو رائے دینے کا حق حاصل ہے جبکہ موازین اسلامی سے ہم آہنگی کے مسئلے میں صرف فقیہ اراکین ہی رائے دے سکتے ہیں۔ دستور اساسی کی تفسیر و توضیح بھی شورای نگہبان کی ذمہ داری ہے جس کے بارے میں ۳/۴ یعنی ۹ ووٹوں سے فیصلہ ہو سکتا ہے۔ شورای نگہبان کی ایک اور ذمہ داری صدارتی، پارلیمانی اور مجلس خبرگان کے انتخابات اور ریفرنڈم کی نگرانی کرنا ہے۔

۷۔ مشورتی کمیٹیاں:

قانون اساسی کی ساتویں فصل مشورتی کمیٹیوں سے متعلق ہے اس میں ۱۰۰ سے ۱۰۷ تک ۷ دفعات

شامل ہیں۔

چھوٹے بڑے شہروں، دیہاتوں، مختلف علاقوں اور صوبوں میں اجتماعی، اقتصادی، ثقافتی، زرعی اور حفظانِ صحت کے پروگراموں کو آگے بڑھانے کے لیے شوراتی کمیٹیوں کے قیام پر زور دیا گیا ہے۔ شوراتی کمیٹیوں کے اراکین کا انتخاب عوام کرتے ہیں تمام شوراتی کمیٹیوں کی نگراں اعلیٰ صوبائی کونسل ہے۔ جو تمام صوبوں کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس اعلیٰ شوراتی کمیٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے دائرہ اختیارات کے اندر رہتے ہوئے براہِ راست یا حکومت کے توسط سے تحقیق یا تصویب کی خاطر پارلیمنٹ میں تجویز پیش کرے۔

کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں، گورنروں اور دوسرے سرکاری عہدیداروں پر لازم ہے کہ شوراتی کمیٹیوں کے دائرہ کار کے اندر ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ اسی طرح تولیدی، صنعتی، زرعی اداروں میں بھی مزدوروں، کسانوں، ملازموں اور ڈائریکٹروں پر مشتمل شوریٰ کا قیام عمل میں آنا چاہیئے۔ بلکہ تعلیمی، اداری اور خدمات سے متعلق جگہوں پر بھی شوریٰ قائم ہونی چاہیئے۔ شوریٰ کو قانون وضوابط سے مخالفت کی صورت میں کالعدم قرار دیا جاسکتا ہے۔ مخالفت قانون کی تشخیص کا طریقہ کار قانون معین کرے گا۔ البتہ کالعدم قرار پانے والی شوراتی کمیٹیوں کو عدالت میں شکایت کا حق حاصل ہے۔

رہبری:

دستورِ اساسی کی آٹھویں فصل رہبر یا شورای رہبری کے بارے میں ہے۔ یہ فصل (۱۰۷ تا ۱۱۲) چھ اصولوں پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلے رہبر یا شورای رہبری کے انتخاب کے طریقے کو تین شکلوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلی شکل یہ ہے کہ عوام کی بھاری اکثریت کسی شخص کو مرجع و رہبر کے طور پر تسلیم کرلے۔ ایسی صورت میں مجلس خبرگان سے رائے لینے کی ضرورت نہیں، جس طرح امام خمینی مدظلہ کے بارے میں انجام پایا۔ دوسری صورت میں عوام کی منتخب مجلس خبرگان کسی شخص کو اس کی صلاحیتوں کے پیش نظر منتخب کرتی ہے۔ جبکہ تیسری صورت یہ ہے کہ مجلس خبرگان صلاحیتوں کی تحقیقات کے بعد ۳ یا ۵ افراد پر مشتمل شورای رہبری کا انتخاب کرتی ہے۔ لیکن اراکین مجلس خبرگان کا انتخاب طریق کار اور صلاحیت اس قانون کے تحت ہے، جسے فقہای شورای نگہبان

پاس کرنے کے بعد رہبر کی منظوری کے لیے ان کی خدمت میں پیش کریں گے کہ یہ عمل بھی انجام پا چکا ہے۔

رہبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ مرجعیت کے قابل اور علمی و اجتہادی صلاحیت و تقویٰ کے مالک ہوں اس کے علاوہ قیادت کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی، اجتماعی بصیرت نیز شجاعت، قدرت، اور تدبیر و تدبر کے بھی حامل ہوں۔

رہبر یا شورای رہبری کی ذمہ داریاں درج ذیل چھ حصوں میں بیان ہوئی ہیں۔

شورای نگہبان کے فقیہ ارکان کا تقرر، ملک کی عدالتوں کے اعلیٰ ترین فرد کا تقرر، مسلح افواج کی قیادت، عوام کی طرف سے صدر منتخب ہونے کے بعد صدارتی حکم کا صدور، ملکی مفادات کے پیش نظر صدر کو عہدے سے برطرف کرنا، جبکہ چیف جسٹس قانونی فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کے سلسلہ میں صدر کے خلاف فیصلہ صادر کر دے یا مجلس شوریٰ کی نظر میں سیاسی اعتبار سے صدر اپنے عہدے کا اہل نہ رہے۔

سپریم کورٹ کی تجویزوں کی روشنی میں اسلامی قانون کے مطابق سزاؤں میں تخفیف یا عفو

دستور اساسی میں رہبر یا شورای رہبری کی برطرفی کے بارے میں بھی غور کیا گیا ہے جب کبھی رہبر اس مقام کے لیے لازمی شرائط میں سے کسی ایک کا اہل نہ رہے یا فرائض کی انجام دہی میں کمزور ہو۔ اور خبرگان اس ضعف اور شرط کی کمی کو محسوس کریں تو رہبر کو ہٹانے کے لیے اقدام کیا جا سکتا ہے۔ اس برطرفی سے متعلق طریقہ کار اور قانون کا فیصلہ مجلس خبرگان کے پہلے اجلاس پر رکھ چھوڑا ہے۔

رہبر کے لیے اتنے اختیارات، خصوصیات اور صلاحیتوں کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ قانون کے سامنے رہبر کو کوئی امتیاز نہیں دیا گیا ہے بلکہ قانون کی نگاہ میں ملک کے تمام دوسرے افراد کے مانند ہیں۔

۹۔ قوہ مجریہ:

دستور اساسی کی نویں فصل قوہ مجریہ سے متعلق ہے جو تین بحثوں پر مشتمل ہے۔ اس فصل میں (۱۱۳ سے ۱۵۱ تک) ۴۹ دفعات شامل ہیں۔

پہلی بحث صدر جمہوریہ سے متعلق ہے۔ دوسری بحث وزیر اعظم اور وزراء کے بارے میں، اور تیسری بحث فوج اور سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی سے مخصوص ہے۔

دستور اساسی میں صدر جمہوریہ کو رہبر کے بعد ملک کا سب سے اعلیٰ عہدیدار بتایا گیا ہے، جس کے فرائض میں قوہ مجریہ کی قیادت، دستور اساسی کا نفاذ، مجریہ، مقننہ اور عدلیہ ارتباط اور ہم آہنگی کا برقرار کرنا شامل ہے۔ صدر جمہوریہ براہ راست عوام کی رائے سے چار سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں جبکہ مدت صدارت گزرنے کے بعد صرف ایک مرتبہ دوبارہ صدارت کے لیے امیدوار ہو سکتے ہیں۔

صدر کا انتخاب مذہبی سیاسی شخصیتوں میں ہوگا اس کے علاوہ صدر جمہوریہ کے لیے ایرانی الاصل، ایرانی شہریت کا حامل، مدیر و مدبر، امین و متقی، درخشاں ماضی کا حامل، اسلامی جمہوریہ ایران کے بنیادی اصولوں پر ایمان و اعتقاد رکھنا نیز سرکاری مذہب کا پیروکار ہونا ضروری ہے۔

صدر جمہوریہ عوام کی مطلق اکثریت سے (الیکشن میں حصہ لینے والے عوام کے کم از کم ۵۱ فیصد ووٹ سے) منتخب ہوں گے۔ اگر پہلی مرتبہ صدارت کا امیدوار مطلوبہ اکثریت حاصل نہ کر سکا تو دوبارہ الیکشن منعقد ہوگا۔

صدارتی انتخابات دورہ صدارت کے ختم ہونے سے ایک ماہ قبل شورای نگہباں کی نگرانی میں انجام پا جانا چاہیئے۔ صدر اپنا عہدہ سنبھالنے سے پہلے مجلس شورای اسلامی میں شورای نگہبان کے اراکین اور چیف جسٹس کی موجودگی میں حلف اٹھائے گا۔ صدر قوم کے سامنے جوابدہ ہے۔ صدر کے فرائض میں سے مجلس کے مصوبات پر دستخط کرنا اور ان کو نافذ کرنے کے لیے ذمہ داروں کے حوالے کرنا بھی ہے نیز مجلس سے رائے اعتماد حاصل کرنے کے بعد وزیر اعظم کی تقرری کے حکم نامے پر بھی صدر دستخط کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری حکومتوں کے ساتھ معاہدوں پر بھی صدر ہی دستخط کریں گے۔ البتہ اس کے لئے پہلے مجلس کی منظوری ضروری ہے۔ صدر اپنی صدارت میں کابینہ کا اجلاس بلا سکتے ہیں اور اگر حکومت کے مصوبات کو غیر قانونی تصور کریں تو تجدید نظر کے لیے کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے سفیروں سے اسناد سفارت قبول کرنا اور دوسرے ممالک میں بھیجے جانے والے سفیروں کے کاغذات پر دستخط کرنا بھی صدر مملکت کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح سرکاری نشانات کا دینا بھی صدر کا فریضہ ہے۔

دستور اساسی میں عارضی صدارتی کمیٹی کے بارے میں بھی غور کیا گیا ہے۔ صدارتی کمیٹی میں ملک کے چیف جسٹس، وزیر اعظم اور پارلیمنٹ کے اسپیکر شامل ہوتے ہیں۔ یہ کمیٹی صدر مملکت کی صدارت

سے علیحدگی ، دو ماہ سے زیادہ کی بیماری یا موت کی صورت میں تشکیل پاتی ہے یا صدر معزول ہو جائے اور بعض وجوہات کی بناء پر انتخابات منعقد نہ کرائے جاسکیں۔ صدارتی کیٹی کی یہ ذمہ داری ہے کہ ایسا طریقۂ کار اختیار کرے کہ پچاس دنوں کے اندر دوسرے صدر کا انتخاب عمل میں آسکے۔ ریفرنڈم کے سوا اس کیٹی کے پاس صدر کے پورے اختیارات ہوتے ہیں۔ عارضی صدارتی کیٹی کے دوران نہ حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک چلائی جاسکتی ہے اور نہ ہی دستور اساسی میں نظرثانی و ترمیم کی جاسکتی ہے۔

اس فصل کی دوسری بحث وزیر اعظم اور وزراء سے متعلق ہے اگرچہ وزراء وزیر اعظم کی تجویز اور صدر جمہوریہ کی توثیق سے مقرر ہوتے ہیں۔ لیکن مجلس سے رائے اعتماد لینا ضروری ہے۔ وزراء کی تعداد اور اختیارات کا مسئلہ عمومی قوانین کے تحت طے کیا جاتا ہے۔ کابینہ کا سربراہ وزیر اعظم ہوگا۔ اور وزیر اعظم وزراء کی کارکردگی پر نگرانی کرے گا۔ نیز حکومت کے پروگراموں کو ہم آہنگ کرنے کی تدبیر کرے گا۔ حکومت کے منصوبوں اور پالیسیوں کو وزیروں کے مشورے سے معین اور نافذ کرے گا اور مجلس کے سامنے وزیر اعظم کابینہ کی کارکردگی کے بارے میں جوابدہ ہے اگرچہ ہر وزیر مجلس کے سامنے خود اپنی ذمہ داریوں کے لئے جوابدہ ہے لیکن کابینہ میں تصویب شدہ امور میں دوسرے وزیروں کی کارکردگی میں سہیم و شریک ہے۔ وزیر اعظم کے اپنے عہدے پر باقی رہنے کے لیے مجلس کا اعتماد ضروری ہے۔ حکومت اپنا استعفیٰ صدر جمہوریہ کو پیش کرے گی اور نئی حکومت قائم ہونے تک اپنے فرائض انجام دیتی رہے گی۔

تمام وزیروں کی تقرری و برطرفی کا اختیار وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہے لیکن صدر جمہوریہ کی منظوری شرط ہے اور ہر نئے وزیر کے لیے مجلس سے رائے اعتماد لینا ضروری ہے۔ اگر حکومت پر اظہار اعتماد کے بعد آدھے وزرا بدل جائیں تو حکومت کے لیے دوبارہ مجلس سے رائے اعتماد لینا ہوگا۔

کابینہ کی ذمہ داریوں میں سے اجرائی اصولوں کی تدوین اور اداری فرائض کی انجام دہی کے لئے ہدایات جاری کرنا ہے۔ ہر وزیر کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ اپنے دائرۂ اختیار میں رہتے ہوئے کابینہ میں طے شدہ امور کی حد میں سرکلر جاری کرے بشرطیکہ وہ قوانین کے منافی نہ ہوں۔

دستور اساسی سرکاری یا عمومی اموال سے متعلق دعاوی اور ان کے عدالت میں لے جانے کے لیے بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس کے لئے کابینہ کی منظوری نیز مجلس کی باخبری کو لازمی قرار دیتا ہے اور فریق کے غیر ملکی ہونے کی صورت میں پارلیمنٹ کی منظوری ضروری ہے۔

بنیادی قانون میں ارتکاب جرم کی صورت میں صدر جمہوریہ وزیر اعظم اور وزراء کو بھی عام شہریوں کی صف میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کے خلاف عام عدالتوں میں تحقیقات کرائی جا سکتی ہے کسی قسم کی مراعات نہیں دی گئی ہے فقط تحقیقات کے بارے میں پارلیمنٹ کو مطلع ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ رہبر، شورای رہبری کے اراکین، صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، وزراء ان کی بیویوں اور بچوں کی جائداد اور سرمائے کے بارے میں تحقیقات کرانے کی ذمہ داری ملک کی اعلیٰ عدالت کے ذمہ ڈالی گئی ہے تاکہ عہدوں پر فائز ہوتے سے قبل و بعد کے سرمایوں کا اندازہ لگایا جا سکے تاکہ اپنے حق سے زیادہ اموال پر قبضہ نہ کیا جا سکے۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی موجود ہے کہ صدر مملکت، وزیر اعظم اور وزراء سمیت دوسرے سرکاری عہدیداروں اور ملازموں کو ایک سے زیادہ عہدوں پر فائز رہنے کی اجازت نہیں۔ صرف وزیر اعظم ضروری مواقع پر وقتی طور پر چند وزارت خانوں کی ذمہ داری قبول کر سکتے ہیں۔

قوہ مجریہ سے متعلق تیسری بحث میں فوج اور سپاہ پاسداران پر توجہ دی گئی ہے، جس کے مطابق ملک کی آزادی، سرزمین اور نظام جمہوری اسلامی کی حفاظت، فوج کی ذمہ داری ہے۔ اسی لئے فوج کو اسلامی نظریاتی اور عوامی ہونا چاہئے۔ فوج میں ایسے افراد کو بھرتی کرنا چاہئے جو انقلاب کے مقاصد پر ایمان رکھتے ہوں اور ان مقاصد کے حصول کی خاطر قربانی پر آمادہ ہوں۔ اسی لیے یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ کوئی غیر ملکی شخص فوج اور انتظامی قوتوں میں ملازم نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی ملک کے اندر کسی غیر ملک کو فوجی اڈوں کے قیام کی اجازت ہوگی۔

امن کے زمانے میں فوج کو امدادی، تعلیمی، پیداواری اور جہاد سازندگی کے امور میں خدمت کرے گی۔ لیکن عدل اسلامی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور صرف اس حد تک کہ فوج کی جنگی صلاحیتیں متاثر نہ ہوں۔ فوجی وسائل سے ذاتی استفادہ کرنا یا فوجیوں سے ذاتی ملازم یا ڈرائیور کی حیثیت سے کام لینا ممنوع ہے۔ فوجیوں کی ترقی و تنزلی قانون کے مطابق انجام پائے گی۔ انقلاب اور اس کے ثمرات

کے تحفظ کے لیے سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی کو دستور اساسی میں قانونی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔
مسلح افواج اور سپاہ پاسداران کی ذمہ داری اور دائرہ کار قانون معین کرے گا۔ آخر میں حکومت پر یہ
ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تمام افراد ملت کے لیے فوجی تربیت کے منصوبے اور وسائل فراہم کرے
تاکہ اسلامی معاشرے کے تمام افراد میں مملکت اسلامیہ اور اسلامی جمہوریہ کے نظام سے مسلح دفاع
کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ لیکن اسلحہ رکھنے کے لئے سرکاری اجازت نامے ضروری ہیں۔

خارجہ پالیسی:

۱۰۔ دستور اساسی کی دسویں فصل خارجہ پالیسی سے متعلق ہے جس کے چار اصول (۱۵۲ سے ۱۵۵ تک)
ہیں۔ اگرچہ خارجہ پالیسی تو مجریہ کی ذمہ داری کا ایک حصہ ہے لیکن اہمیت کے پیش نظر اس کے لیے
ایک الگ فصل رکھی گئی ہے۔ آئین کے مطابق خارجہ پالیسی میں نہ کسی ملک کی دخالت کو قبول کرنے
کی گنجائش ہے۔ نہ ہی کسی ملک میں مداخلت مقصود ہے۔ بلکہ ملک کے جغرافیائی حدود اور آزادی کی
حفاظت، تمام مسلمانوں کے حقوق کا دفاع، سپر پاورز کے مقابلہ میں غیر جانبداری، غیر محارب ممالک
کے ساتھ صلح آمیز تعلقات وغیرہ خارجہ پالیسی کے مقاصد ہیں۔ اسی لیے اس طرح کے تمام معاہدے
ممنوع قرار پا گئے ہیں جن کے نتیجے میں ملک کے قدرتی وسائل، اقتصادیات، ثقافت، فوج اور ملک کے
دوسرے شعبوں میں غیر ملکی تسلط قائم ہو جائے۔

اس فصل میں آیا ہے کہ اسلامی جمہوریہ اسلامی مقاصد کے تحت تمام معاشروں میں انسانوں
کی بہتری کی متمنی ہے اور آزادی، استقلال نیز حکومت حق و عدل کو تمام انسانوں کا بنیادی حق تصور
کرتی ہے۔ اسی لیے دوسری ملتوں کے داخلی معاملات میں عدم مداخلت کے اصول پر کاربند رہتے
ہوئے پوری دنیا میں سامراجیت کے خلاف مستضعفین کی حق طلبانہ تحریکوں کی حمایت
کرتی ہے۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر ایسے افراد کو سیاسی پناہ فراہم کرتی ہے جو ایران کے
قوانین کے مطابق تباہ کار اور خائن نہ ہوں۔

۱۱۔ عدلیہ:

دستور کی گیارہویں فصل عدلیہ سے متعلق ہے جو (۱۵۶ سے ۱۷۴ تک) ۱۹ دفعات پر مشتمل ہے۔

عدلیہ ایک مستقل طاقت ہے جو فرد اور اجتماع کے حقوق کی حامی اور عدل وانصاف کے قیام کی ذمہ دار ہے۔ قوہ عدلیہ کے اعلیٰ اختیارات شورای عالی قضائی نامی کونسل کے پاس ہوتے ہیں۔ یہ کونسل پانچ ارکین پر مشتمل ہے جنہیں سے دو رکن چیف جسٹس اور اٹارنی جنرل ہیں۔ ان کو درجہ اجتہاد پر فائز اور عدالتی امور سے آگاہ ہونا چاہئے۔ انھیں سپریم کورٹ کے قاضیوں کے مشورے سے رہبر منصوب کرتا ہے۔ بقیہ تین اراکین بھی امور عدالت سے واقف اور مجتہد ہوتے ہیں۔ جو عدالتوں کے قاضیوں کی جانب سے منتخب ہوتے ہیں۔

شورای عالی قضائی کے اراکین پانچ سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ یہ دوبارہ بھی منتخب ہو سکتے ہیں۔

قوہ قضائیہ اور قوہ مجریہ و قوہ مقننہ کے درمیان تعلقات و ہم آہنگی برقرار کرنے کی ذمہ داری وزیر قانون پر ہے۔ وزیر قانون کو "شورای عالی قضائی" کی تجویز پر وزیر اعظم مقرر کریں گے۔ اس فصل میں عدلیہ کے فرائض پانچ مرحلوں میں بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ شکایات کی تحقیقات اور ان سے متعلق فیصلے کرنا۔ زیادتیوں، شکایتوں، دعووں اور دشمنیوں کو رفع دفع کرنا نیز امور حسبیہ کے بارے میں فیصلہ دینا۔

۲۔ عوامی حقوق کا احیاء، عدل و انصاف اور مشروع آزادیوں کی توسیع۔

۳۔ قوانین کے بہتر اجراء کی خاطر نظارت و نگرانی۔

۴۔ جرائم کا پتہ لگانا، تحقیقات کرنا، مجرمین کے لیے سزا و تعزیر تجویز کرنا، اسلامی قانون جزاء کے تحت حدود کا نافذ کرنا۔

۵۔ جرائم کی روک تھام اور مجرمین کی اصلاح کے لیے مناسب اقدام کرنا۔

"شورای عالی قضائی" کے فرائض بھی تین مرحلوں میں یوں بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ قوہ قضائیہ کی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مناسب تنظیموں کا قیام۔

۲۔ اسلامی جمہوریہ کے مناسب حال عدالتی بل تیار کرنا۔

۳۔ عادل اور شائستہ قاضیوں کو مقرر کرنا۔ اور قانون کے مطابق قاضیوں کی معزولی، تبدیلی، جگہ کا تعین ترقی اور اختیارات کا فیصلہ کرنا وغیرہ

ملک کی عدالت عالیہ کی ذمہ داری ہے کہ عدالتوں میں قوانین کے صحیح اجراء کی نگرانی کرے۔ عدالت عالیہ شورای عالی قضائی کے معین کردہ اصول وضوابط کے تحت تشکیل پاتی ہے اور عدالتوں کی کاروائیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

"دیوان عدالت اداری" (جہاں سرکاری ملازمین کی شکایات اور اداری جرائم کے بارے میں فیصلہ ہوتا ہے) شورائے عالی قضائی کی نگرانی میں قائم ہوگا تاکہ سرکاری کارندوں اور حکومتی طریقہ کے خلاف عوام کی شکایتوں کی شنوائی ہوسکے۔

"سازمان بازرسی کل کشور" شورای عالی قضائی کی نگرانی میں قائم ہوگا تاکہ قوہ قضائیہ ملک میں قانون کے صحیح اجراء سے متعلق نگرانی کرسکے۔

قاضیوں کے خصوصیات اور شرائط کو فقہی اصولوں کی روشنی میں قانون طے کرے گا جب کہ قاضی کو قانونی فرائض کی ادائگی کے لیے آزادی اور استقلال حاصل ہے۔ چنانچہ قاضی کو جب تک عدالتی کاروائی کے ذریعے مجرم اور غیر قانونی کاروائیوں کا مرتکب ثابت نہ کیا جائے، اپنے عہدے سے ہٹایا نہیں جاسکتا ہی نہیں بلکہ ان کی مرضی کے بغیر ان کے عہدے یا محل خدمت میں تبدیلی بھی نہیں ہوسکتی۔ البتہ شورای عالی قضائی کے اراکین معاشرے کی مصلحت کے پیش نظر اتفاق رائے کے ساتھ استثنائاً ایسا کرسکتے ہیں۔

مقدمات کی کاروائی علنی ہوگی جس میں لوگوں کی شرکت پر کوئی پابندی نہیں مگر یہ کہ عدالت یہ تجویز کرے کہ کسی مقدمے کی کھلی کاروائی عفت عمومی ونظم وضبط کے منافی ہے تو کھلی سماعت نہ ہو۔ یا مقدمے کے فریقین کی علنی سماعت نہ کرنے کا تقاضا کریں۔ سیاسی اور مطبوعاتی مقدمات کی سماعت کھلی عدالت میں ہیئت منصفہ کی موجودگی میں ہوگی اور انصاف سے متعلق ہیئت منصفہ کے شرائط واختیارات اور اس کے انتخابات کا طریقہ کار نیز سیاسی جرم کی تعریف وغیرہ عام قوانین کے تحت طے ہوگی۔

فوج، پولیس، پاسداران انقلاب اور سرحدی حفاظتی فورس کے ان جرائم کی چھان بین جن کا تعلق ان کے نظامی وانتظامی فرائض سے ہو اور ان کے خلاف مقدمات کی سماعت فوجی عدالت میں ہوگی جبکہ ان افراد کے عام جرائم کے مقدمات عام عدالتوں میں پیش ہوں گے۔ اگرچہ فوجی عدالت بھی عدلیہ ہی کا ایک حصہ ہے۔ قاضی کا فرض ہے کہ ہر مقدمے کا فیصلہ تدوین شدہ

قوانین کی تلاش کرے لیکن میسر نہ آنے کی صورت میں اسلام کے معتبر مصادر یا معتبر فتواؤں کی روشنی میں فیصلہ صادر کرے۔

قاضی کسی مقدمے کا فیصلہ نہ دینے کے لیے، سکوت، مبہم، یا مدون قوانین کے متعارض ہونے کا بہانہ کرکے صدور حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔ ضروری ہے کہ عدالت کا حکم مدلل ہو اور جن قانونی دفعات کے مطابق اس نے فیصلہ کیا ہے ان کا ذکر بھی ضروری ہے۔

کسی فعل کا ارتکاب یا ترک بعد میں بننے والے قوانین کی اساس پر جرم شمار نہیں ہوگا۔ عدالت کے قاضیوں کا فریضہ ہے کہ حکومت کے ایسے سرکلر اور ہدایت ناموں پر عمل نہ کریں جو اسلامی احکام کے خلاف یا قوہ مجریہ کے اختیار سے باہر ہوں۔ اس کے علاوہ ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ ایسے احکام کو لغو کرنے کے لیے محکمانہ امور سے متعلق عدالت (دیوان عدالت اداری) سے درخواست کرے۔ اس فصل میں قاضیوں کی غلطی سے ہونے والے نقصانات کے بارے میں بھی پیش بینی ہوئی ہے، اور طے پایا ہے کہ جب کبھی قاضی موضوع حکم یا تطبیق حکم میں غلط فہمی کی بنا پر عمداً غلطی کا مرتکب ہو جائے جس کے نتیجے میں کسی کو مادی یا معنوی نقصان پہنچے تو تقصیر عمدی ہونے کی صورت میں احکام اسلامی کی روشنی میں مقصر ضامن ہے۔ دوسری صورت میں حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ اس خسارے کا ازالہ کرے۔

۱۲۔ ذرائع ابلاغ عامہ:

دستور اساسی کی آخری فصل ذرائع ابلاغ کے بارے میں ہے۔ اس فصل کی ایک ہی دفعہ ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ ذرائع ابلاغ عامہ (ریڈیو ٹیلی ویژن) کو اسلامی احکام کے مطابق انتشارات اور تبلیغات کی آزادی حاصل ہے۔ یہ ادارے مجریہ، مقننہ اور عدلیہ کی مشترکہ نگرانی میں کام کریں گے اور اس نگرانی کا طریقہ کار عام قوانین معین کریں گے۔

نتیجہ:

ہم نے دستور اساسی کی بارہ فصلوں سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ان ۱۷۵ دفعات کا ذکر

کر دیا ہے جن سے دستور اساسی مرتب ہوا ہے ۔ دستور اساسی کا یہ مجموعہ مجلس خبرگان کے کل ممبروں کی دو تہائی اکثریت کی حمایت سے آبان ماہ کی ۲۴ تاریخ ۱۳۵۸ ش بمطابق ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ کو تصویب ہوا ۔ چونکہ ذی الحجہ کا مہینہ قمری سال کا آخری مہینہ ہے اس لیے ہمارا دستور اساسی چودھویں صدی کے آخری دنوں میں مکمل ہوا ۔ چنانچہ ہم نے پندرھویں صدی کا آغاز اس نئے قانون کے زیر سایہ کیا ۔ اگرچہ ان قوانین کو بنے ہوئے صرف چند سال کا مختصر عرصہ گذرا ہے اور ابھی اس کے بعض اصولوں کے نفاذ کے طریقہ کار کو معین کرنے کے لیے عام قوانین نہیں بنے ہیں پھر بھی ملک میں رونما ہونے والی تبدیلیوں نے دستور اساسی کو جھانچنے کا موقع فراہم کر دیا یہاں تک کہ جن دفعات کے بارے میں یہ خیال تھا کہ شاید وہ ایک طویل مدت کے بعد قابل عمل ہوں ۔ لیکن اسی مختصر عرصے میں ان کے بارے میں بحث و گفتگو انجام پائی اور نافذ بھی ہو گئیں ۔ مثلاً دفعہ ۱۱۰ میں ہے کہ قوای مسلح افواج کی ہائی کمان ولی فقیہ کے ہاتھ میں ہو گی لیکن اس کے نفاذ اور طریقہ کار میں بحث و گفتگو تھی ۔ ایسے حالات میں عراق نے ایران پر جنگ مسلط کر دی اور اس دفعہ پر بہترین طریقہ پر عمل ہو گیا بلکہ وقتی طور پر ہائی کمان دوسرے کو سونپ دینے کا بھی امتحان ہوا ۔ اسی دفعہ کی پانچویں شق کے بارے میں یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید ایک صدی کے دوران بھی ایسا موقعہ نہیں آئے گا ۔ لیکن اس شق پر بھی انہی چند برسوں میں بہتر طریقے سے عمل ہوا اور پہلے صدر مملکت کو اس شق پر عمل کرتے ہوئے برطرف کر دیا گیا ۔ چونکہ مجلس شوریٰ نے صدر مملکت میں سیاسی بصیرت کے فقدان پر رائے دی اور رہبر نے ملک کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی معزولی کا حکم صادر فرمایا ۔ اسی مختصر مدت میں ایک صدارتی امیدوار کے ایرانی الاصل ہونے کے سلسلہ میں شک ہوا ۔ چنانچہ وہ خود بخود الیکشن سے الگ ہو گئے ۔ محدود زمانے کے لیے صدارتی کمیٹی کا قیام جو شاذ و نادر ہی امکان پذیر سمجھا جاتا تھا مختصر مدت کے اندر دو مرتبہ صدارتی کمیٹی تشکیل دینی پڑی ۔ نیز دوسری اور تیسری صدارت کے انتخابات قانون میں معین پچاس دنوں کے اندر کرائے گئے ۔ شورای موقت ریاست جمہوری سے متعلق ایک نادر اعتراض صدر مملکت اور وزیر اعظم کی ایک ساتھ شہادت کے موقعہ پر ختم ہوا جب دفعہ ۱۳۰ کے سلسلہ میں شورای نگہبان کی توضیحات کے پیش نظر صدارتی کمیٹی دو افراد پر مشتمل اس شرط کے ساتھ تشکیل پائی کہ دونوں کے نظریات ایک ہوں چنانچہ پارلیمنٹ کے اسپیکر اور

چیف جسٹس پر مشتمل صدارتی کمیٹی بنی جس نے اتفاق رائے سے مجلس میں نئے وزیر اعظم کا نام پیش کر دیا۔
ان واقعات سے یہ ممکن نظر آنے لگا کہ دستور اساسی میں پیش آنے والی شاذ و نادر مشکلات کو شورای نگہبان کی توضیح کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہے کہ اسلامی جمہوریہ کا نیا دستور متحرک ہے اور مشکل حالات میں تیزی کے ساتھ منطبق ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دستور اساسی کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ ملک کے قوانین کے لیے بنیادیں فراہم کرے اور ہر روز اس میں تبدیلی و اصلاح کی ضرورت نہ ہو۔

حواشی:

۱۔ اسلامی جمہوریہ ایران کا دستور ایرانی معاشرے کی ثقافتی، معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی بنیادوں کا آئینہ دار ہے جو اسلامی اصول و ضوابط کی اساس پر قائم ہیں اور جو تمام امت اسلامیہ کی دلی امنگوں کو منعکس کرتی ہیں۔ ایران کے عظیم الشان اسلامی انقلاب کی ماہیت نے اور اپنے نقطۂ آغاز سے فتح و نصرت کے حصول تک کی جدو جہد نے، جو عوام کے تمام طبقات میں جاری و ساری رہی ہے، اس بنیادی امنگ اور اساسی تمنا کو واضح کیا ہے اور اب اس دور فتح یابی کی ابتدا میں یہ عظیم قوم یک جان ہو کر اس تمنا کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔

گذشتہ صدی میں برپا ہونے والی دیگر ایرانی تحریکات کے مقابلے میں اس انقلاب کا امتیازی نشان اس کا اسلامی اور عوامی ہونا ہے، ایران کے مسلمان عوام نے جو رد استبداد کے خلاف تحریک مشروطیت اور استعمار کے خلاف برپا ہونے والی اس تحریک سے، جس کا مقصد پٹرول کو قومیانہ تھا، گذر کر جو گرانقدر تجربہ حاصل کیا، اس سے ان کو اس امر کا احساس ہوا کہ ان تحریکوں کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلنے کی وجہ یہ تھی کہ ان میں جدوجہد کی اساس میں علمائے دین کا ہاتھ نہ تھا۔ ہرچند کہ گذشتہ تحریکوں میں اسلامی فکر اور علمائے دین کی رہبری نے اپنا حصہ ضرور ادا کیا لیکن چونکہ یہ جدوجہد اپنے اصلی اسلامی مراکز سے دور رہی، اس لیے ان تحریکوں میں بہت جلد سست روی کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس لیے قوم کے شعور بیدار نے مرجع عالی قدر حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی مدظلہ کی رہبری میں اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ اس تحریک کے تار و پود کو صحیح اسلامی اصول و ضوابط کے مطابق تشکیل دیا جائے۔ اس دفعہ ملک کے جملہ علمائے

دین اور طلبہ، عوام کے شانہ بشانہ صف اول میں جنگ آزما ہوئے اور ان کی رہنمائی میں کارفرما ہونے والے ادیبوں اور تعلیم یافتہ روشن خیال لوگوں نے اپنے اندر ایک نئے جوش و خروش کا احساس کیا۔ ایران کی اس تحریک کا آغاز ۱۳۸۲ ہجری قمری میں ہوا جو ۱۳۴۱ ہجری شمسی کے اور ۱۹۶۳ء کے مطابق ہے۔

تحریک کا آغاز :

حضرت امام خمینی نے اس نام نہاد "انقلاب سفید" کے خلاف علم جہاد بلند کیا جس کا مقصد امریکی سازش کے وسیلے سے استبدادی حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنا اور ایران کے سیاسی ثقافتی اور اقتصادی تعلقات کو عالمی امپریلزم کے ساتھ استوار کرنا تھا امام خمینی کی اس مخالفت نے پوری قوم کو حرکت میں لانے کے لیے اساسی عامل کی حیثیت اختیار کی۔ اس کے بعد ملت اسلامیہ کا وہ انقلاب عظیم و خونین برپا ہوا جس کا نقطۂ آغاز خرداد ۱۳۴۲ ہجری شمسی (جون ۱۹۶۳ء) میں نمودار ہوا اور جو درا صل اس عظیم الشان تاریخی کارنامے کے وقوع پذیر ہونے کی ابتدا تھی۔ اس انقلابی اسلامی رہبری کے سلسلے میں امام خمینی کی مرکزی حیثیت کو مستحکم کر دیا۔ امریکی مشیروں کے تحفظ کے کالے قانون کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں امام خمینی کو ایران بدر کر دیے جانے کے باوجود قوم اور امام خمینی کے درمیان مضبوط تعلقات برقرار رہے اور مسلمان قوم نے بالخصوص پڑھے لکھے طبقے نے جو رہبری امام خمینی کے عہد پرکار بند تھا اور مجاہد علمائے دین نے قید و بند تشدد، پھانسیوں اور ملک بدر کیے جانے کے باوجود اپنی راہ پیدا کی۔

اس دوران میں معاشرے کے باشعور اور ذمے دار افراد نے دینی مدارس مسجدوں اور یونیورسٹی کے مورچوں سے عوام کو روشنی دکھانے کی ذمہ داری قبول کی اور اسلام کی انقلابی و باثمر درس گاہ سے اثرات حاصل کر کے یہ کوشش کی کہ مسلمان قوم میں جد و جہد اور دینی شعور کی سطح کو بلند کیا جائے۔ استبدادی اور ظالمانہ حکومت نے مدرسہ فیضیہ، یونیورسٹی اور اسی طرح کے اور اداروں پر جہاں انقلاب کا لاوا پک رہا تھا، حملہ کر کے عوام کے انقلابی غیظ و غضب سے نجات حاصل کرنے کے لیے مکروہ، وحشیانہ اور ظالمانہ اقدامات کا آغاز کیا۔ ان حالات میں ہماری مسلمان قوم نے پھانسی کے تختوں، قرون وسطیٰ کے آلات تشدد میں اور طویل مدت کی قید کی صورتوں میں اپنے اس عزم راسخ کی قیمت ادا کی کہ اس جد و جہد کو برقرار رکھا جائے۔ ہزار ہا جوان مسلمان مردوں اور عورتوں کے خون نے جو اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے میدانوں میں گولیوں کا نشانہ بنے یا گلی کوچوں میں دشمن کی بندوقوں

کی زد میں آئے۔ ایران کے اسلامی انقلاب کو بقاء و استمرار بخشا۔ حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی کے مختلف مواقع پر جاری ہونے والے بیانات اور پیغامات نے امت اسلامی کے عزم و ارادہ کو مزید گہرائی اور توانائی بخشی۔

۳۔ حکومت اسلامی:

ولایت فقیہ کی اساس پر اسلامی حکومت کے قیام کے تصور نے، جو امام خمینی نے پیش کیا اور اس وقت جب استعماری حکومت کا جبر و تشدد اپنے عروج پر پہونچ چکا تھا، مسلمان عوام کے اندر ایک مخصوص روح مقاومت پھونک دی اور اسلامی جد و جہد کے لیے راہ کھول دی جس نے ملک کے اندر اور باہر مخلص مسلمان مجاہدین کی طرف سے برپا ہونے والی جد و جہد آزادی کو تیز کر دیا۔

یہ تحریک اسی نہج پر جاری رہی یہاں تک کہ عوام کے غیظ و غضب اور بے اطمینانی نے، جو ملک کے اندر روز افزوں تشدد و جبر کا نتیجہ تھی، مجاہد علماء اور طلبہ کو تحریک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لینے پر مجبور کر دیا اور اسے چار دانگ عالم میں پھیلا دیا جس نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا اور اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے ظلم و جور اور جبر و تشدد میں کمی پیدا کرے۔ اس نے حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ ملک کے اندر سیاسی فضا کو آسودہ کرے تاکہ یوں بزعم خویش اپنے آپ کو آخری زوال اور سقوط سے بچانے کے لیے مناسب پیش بندی کر سکے۔ لیکن قوم نے، جو جوش سے سرشار، شعور سے بہرہ ور اور چٹان سے پختہ تر ارادے کی مالک تھی، امام خمینی کی بے مثال رہنمائی اور ناقابل تسخیر رہبری و قیادت میں بالآخر کامرانی و فتح یابی کو حاصل کیا اور یا ایک جان ہو کر نئی راہ پر گامزن ہو گئی۔

۴۔ عوامی غیظ و غضب:

۱۷ دی ۱۳۵٦ ہجری شمسی (۷ جنوری ۱۹۷۷ء) کو حکومت وقت کی طرف سے شائع ہونے والے توہین آمیز خط نے، جس میں علماء دین بالخصوص حضرت آیت اللہ العظمیٰ خمینی کی ہتک عزت کی گئی تھی، اس تحریک کو مہمیز دی اور ملک کے طول و عرض میں عوامی غیظ و غضب کا طوفان پھٹ پڑا۔ عوام کے غصے کے اس سیلاب کی روک تھام کے لیے حکومت نے کوشش کی کہ ان احتجاجی مظاہرات کو خون کے دریا میں بہا دے۔ لیکن اس اقدام نے انقلاب کی رگوں میں تازہ خون دوڑا دیا جس کا اظہار آئندہ ہفتوں اور شہداء کے چہلم کے مواقع پر ہوا اور یوں اس تحریک نے ملک کے طول و عرض میں ایک

جان ہوکر توانائی حاصل کی۔ اس نے عوامی جوش کو ملک کے تمام اداروں تک پہنچا دیا جنھوں نے عام ہڑتال کے ذریعہ سے اس تحریک کے ساتھ اپنی یکجانی کا اظہار کیا اور ظالمانہ حکومت کو ختم کرنے کے لیے کوچہ و بازار میں مظاہرات میں گرم جوشی سے حصہ لیا۔ یوں ایران کے طول و عرض میں مردوں اور عورتوں کے مختلف سیاسی اور مذہبی طبقات نے اس جدوجہد میں نمایاں طور پر اتحاد و سالمیت کا ثبوت دیا خواتین نے بالخصوص اس مقدس جہاد میں گرم جوشی سے شرکت کی۔ مائیں اپنے بچے گود میں لیے شہر کے مختلف کوچوں میں مشین گنوں کے سامنے سینہ سپر ہوگئیں۔ یہ خواتین اس جدوجہد میں معاشرے کا سب سے بڑا طبقہ اور فیصلہ کن عامل تھیں۔

۵۔ قوم نے جو قیمت ادا کی:

ایک سال کی مسلسل جدوجہد اور جنگ آزمائی کے نتیجے میں ۶۵ ہزار شہدا کی جانیں اور ہزارہا زخمیوں کا خون دے کر، نیز اربوں تومان کی مالیت کی جائداد استقلال، آزادی اور حکومت اسلامی کے قیام کی نذر کرنے کے بعد شجر انقلاب بارآور ہوا، یوں اس عظیم تحریک کو ایمان، اتحاد قومی اور اپنے حساس مراحل میں پختہ کار رہبری، نیز قوم کے جذبۂ قربانی کے سہارے فتح و کامرانی حاصل ہوئی۔ اس کامیابی نے امپریلیزم کی تمام قیاس آرائیوں اندازوں اور انتظامات کو خاک میں ملا دیا اور یوں دنیا میں عوامی انقلاب کی بہار کا آغاز ہوا۔

۲۱ اور ۲۲ بہمن ۱۳۵۷ شمسی (۱۰ و ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء) وہ دن تھے جب ایران میں شہادت شہنشاہیت کی بنیاد ہلادی گئی اور داخلی استبداد اور اس پر بھروسہ کرنے والی غیر ملکی طاقتوں کو منھ کی کھانا پڑی۔ انھیں دنوں میں اس عظیم کامیابی کے ساتھ ہی ساتھ اسلامی حکومت کے قیام کی خوشخبری سنائی دی جو مسلمان قوم کی دیرینہ خواہش تھی۔

ایرانی قوم نے ایک جان ہوکر اپنے مراجع تقلید، علمائے اسلام اور رہنماؤں کی سرکردگی میں اسلامی جمہوریت کے بارے میں ریفرینڈم کے دوران میں اپنی آخری اور قطعی رائے کا اظہار کرکے اسلامی جمہوریت کے نظام کا اعلان کیا اور ۹۸،۲ فیصد کی اکثریت سے اس نظام کے حق میں مثبت رائے دی۔

اب اسلامی جمہوریۂ ایران کا دستور، جو تمام سیاسی، اجتماعی، ثقافتی اور اقتصادی اور معاشرتی

روابط مطمح ہائے نظر کی آئینہ داری کرتا ہے، اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ اسلامی حکومت کے کھنڈروں کے بجائے ایک نئے نظام حکومت کی داغ بیل ڈالے۔

۶۔ اسلام میں طرز حکومت:

اسلام کے نقطۂ نظر سے حکومت نہ تو طبقاتی صورت حال سے ابھرتی ہے اور نہ اس کا قیام کسی فرد یا گروہ افراد کے برسر اقتدار آنے کا نام ہے بلکہ وہ ایک ہم فکر اور ہم عقیدہ قوم کے سیاسی مطمح ہائے نظر کے تبلور (crystalization) کا نام ہے جو اپنے لیے ایک نظام معین کرتی ہے جس میں رہ کر وہ اپنے فکری تغیرات اور (عقائدی تحویلات کے دوران میں اپنا راستہ، اپنی منزل آخری یعنی اللہ کی طرف رجوع) تک معین و برقرار رکھ سکے۔

ہماری قوم نے دوران انقلاب میں اپنے آپ کو طاغوتی زنگ اور کافرانہ غبار سے پاک کیا، غیر ملکی آئیڈیالوجیوں کے اثرات سے نجات حاصل کی اور دنیادی زندگی کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر ایک بار پھر اپنایا۔ اب یہ اسی بنیاد پر ایک ایسے مثالی معاشرے کی داغ بیل ڈال رہی ہے جو اسلامی اقدار و اصول کی آئینہ دار کرے۔ اس کے دستور کا مشن یہ ہے کہ اپنی تحریک کے بنیادی اصولوں کو قالب اظہار دے اور ایسے حالات کو وجود میں لائے جن میں رہ کر انسان اسلام کی اقدار کو پروان چڑھا سکے۔

یہ دستور، انقلاب ایران کے اسلامی طرز فکر کو پیش نظر رکھ کر، جو ملک کے اندر اور باہر تمام مظلوم انسانوں کو ظالموں اور متکبروں پر فتح دلانے کی تحریک تھا، اس امر کی کوشش ہے کہ ایران کے اندر اور بیرون ملک اس انقلاب کی روح کو زندہ و پائندہ رکھا جائے۔ یہ امر خاص طور پر پیش نظر ہے کہ دنیا کی دیگر اسلامی تحریکوں کے ساتھ اور مسلمان اقوام کے ساتھ بین الاقوامی تعلقات استوار کیے جائیں تاکہ تمام دنیا میں اتحاد امت کی راہ ہموار ہو سکے۔ ان ھٰذہٖ امتکم امۃ واحدۃ و انا ربکم فاعبدون (بے شک تمہاری یہ امت ایک امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس تم میری عبادت کرو) اور یوں دنیا کی مظلوم اور محروم اقوام کو ظلم و استبداد سے نجات دلانے کے لیے جد و جہد کو قائم و دائم رکھا جا سکے۔

اس عظیم تحریک کی ماہیت کے پیش نظر، یہ دستور اس امر کی ضمانت ہے کہ ہر قسم کی نظریاتی معاشرتی یا اقتصادی آمریت کو ختم کرنے میں مدد دی جائے اور استبدادی اور آمری نظام کو توڑنے

کے لیے لوگوں کو حق خود اختیاری دلایا جائے" ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم" (اور وہ بوجھ جو ان کی گردن پر تھا اور وہ پھندے جو ان پر (پڑے تھے) ان سے ہٹا دیتا ہے) (اعراف ۱۵۷)

دینی تعلیمات کے مطابق معاشرے کی تشکیل کے لیے سیاسی بنیادیں اور اصول دریافت کرنے کے لیے ارباب صلاحیت نے زمام حکومت و نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لی "ان الارض یرثها عبادی الصالحون" (بے شک یہ زمین ان کی وراثت ٹھہرتی ہے۔ جو میرے باصلاحیت بندے ہیں) قانون سازی، جو معاشرے کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے ضابطے معین کرتی ہے، قرآن مجید اور سنت پر مبنی ہوگی۔ اس بنا پر یہ امر نہایت ضروری اور اہم ہے کہ عادل و پرہیزگار علمائے اسلام (فقہائے عادل) سنجیدگی اور دقت نظر سے اس پر غور کریں۔ چونکہ حکومت کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو نظام الٰہی کی منزل تک پہنچنے میں ان کی مدد و ہدایت کرے (والی اللہ المصیر اور خدا کی طرف ہی ٹھکانہ ہے) جب تک معاشرے کے تمام عناصر اس سفر میں فعال طور پر حصہ نہ لیں اور معاشرے کو بدلنے میں شرکت نہ کریں اس وقت اس کے لیے نہ تو زمین ہموار ہو سکتی ہے اور انسان میں خدائی اخلاق کے امکانات ظہور پذیر ہو سکتے ہیں (تخلقوا باخلاق اللہ)

اس لحاظ سے، یہ دستور تمام سیاسی منصوبہ بندیوں اور فیصلوں میں اس قسم کی مشارکت کے لیے معاشرے کے تمام افراد کے لیے مواقع فراہم کرتا ہے تاکہ ہر فرد ارتقاء کے اس سفر میں شریک ہو اور ہدایت و رہنمائی کی ذمہ داری قبول کرے کہ زمین پر ضعیف لوگوں کی حکومت کے قیام کا مطلب یہی ہے (ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلهم ائمة ونجعلهم الوارثین)

۵ ولایت فقیہ عادل:

ولایت امر اور امامت مستمر کے اصول کی بنیاد پر یہ دستور ایسے فقیہ جامع الشرائط کی رہبری کے لیے زمین ہموار کرتا ہے، جسے عوام نے اپنا رہبر و رہنما تسلیم کر لیا ہو تاکہ یہ فقیہ عادل اس امر کا ضامن ہو سکے کہ حکومت کے مختلف ادارے اپنے صحیح اسلامی فرائض کی بجا آوری سے انحراف نہ کرنے پائیں (مجاری الامور بید العلماء باللہ الامناء علی حلاله وحرامه)

۸۔ اقتصاد وسیلہ ہے مقصد نہیں:

اقتصادی بنیادوں کو مضبوط کرنے کا مقصد یہ ہے کہ منزل ہدایت و ارتقاء کے سفر میں انسان کی محتاجیاں دور کی جائیں نہ یہ کہ دوسرے نظاموں کے مانند دولت جمع کی جائے یا نفع اندوزی نگاہ میں رہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مادہ پرست نظاموں میں اقتصاد بذات خود مقصد ہوتا ہے اور اسی بنا پر ارتقاء و ہدایت کے مختلف مراحل میں یہ اقتصاد تخریب، فساد اور تباہی کا عامل بن جاتا ہے۔ لیکن اسلام میں اقتصاد وسیلہ ہے اور کسی وسیلے سے سوائے اس کے اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ منزل مقصود تک پہونچانے میں بہتر طور پر کارآمد ثابت ہو۔

اس نقطۂ نظر سے اسلام کے اقتصادی پروگرام کا مقصد ایسی مناسب زمین ہموار کرنا ہے جس میں انسان کے مختلف تخلیقی امکانات ظہور پذیر ہو سکیں اس لحاظ سے اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر فرد کے لیے مساوی اور متناسب مواقع فراہم کرنے کی ضمانت دے ہر فرد کے لیے کام نکالے اور ارتقاء کے سفر کو جاری رکھنے کے لیے تمام ضروریات کے پورا کرنے کا بیڑا اٹھائے۔

۹۔ دستور اور عورت:

اسلامی اجتماعی بنیادوں کی تخلیق کے لیے، وہ تمام بشری طاقتیں جو اب تک بیرونی استحصال کی خدمت کرتی رہی ہیں، اپنے اصلی تشخص اور انسانی حقوق کو حاصل کریں گی۔ حقوق کی اس بازیابی کے سلسلے میں یہ بات بالکل قدرتی ہے کہ چونکہ خواتین اب تک طاغوتی نظام کے ماتحت زیادہ ستم رسیدہ رہی ہیں، اس لیے اب انھیں زیادہ حقوق حاصل ہوں گے۔

خاندان معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور انسانی ترقی اور نشو نما کا اساسی ادارہ ہے خاندان کی تشکیل میں، جو انسانی ترقی اور نشو و نما کی اصل اساس ہے عقیدے اور مطمح ہائے نظر میں یگانگت اس کی بنیاد بنتی ہے۔ لہٰذا اسلامی حکومت کے اولین فرائض میں شامل ہے۔ اب عورت خاندانی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے اس حالت میں باہر آ گئی ہے، جب اسے ایک چیز سمجھا جاتا تھا یا نفع اندرونی اور استحصال کو پھیلانے کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اب وہ از سر نو اپنے مادرانہ فرائض کی بجا آوری کے لیے جو اس کے بے حد اہم اور گرانقدر فریضہ ہے، پھر سے تیار ہو رہی ہے کہ وہ ایسی نسلوں کو تربیت دے جو تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں اور زندگی کے مختلف میدانوں

میں دوسروں کے ساتھ شانہ بشانہ سرگرم طور پر جد و جہد کرسکیں۔ اس لحاظ سے اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق اسے بے حد اہم ذمہ داری کے قابل گردانا جائے گا اور اسی کے مطابق زیادہ احترام اور زیادہ قدر و قیمت کا مستحق سمجھا جائے گا۔

۱۰۔ عقائد فوج:

ملک کی دفاعی قوتوں کی تشکیل اور ان کو ضروری ساز و سامان سے آراستہ کرنے کے سلسلے میں توجہ اس امر پر ہے کہ ایمان اور عقیدہ اصل اساس ہوں۔ اس لحاظ سے اسلامی جمہوریۂ ایران کی فوج اور سپاہ پاسداران انقلاب مذکورہ بالا ہدف کے حصول کے پیش نظر منظم کیے جائیں گے۔ یہ نہ صرف ملک کی حدود کی حفاظت کریں گے، بلکہ پیغام عقیدہ یعنی راہ خدا میں جہاد اور حاکمیت قانون الٰہی کو دنیا میں پھیلانے کے لیے بھی ذمہ دار ہوں۔

(واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم)

۱۱۔ عدلیہ اور دستور

اسلامی تحریک کے اصولوں کے مطابق عدلیہ کے لیے عوام الناس کے حقوق کی نگہداشت کا مسئلہ تاکہ امت مسلمہ میں انحرافات پیدا نہ ہوں، بے حد اہمیت کا مالک ہے۔ اس لیے ایک ایسے نظام عدلیہ کا قیام جو اسلامی اصول عدل پر مبنی ہو اور ایسے ججوں پر مشتمل ہو جو عادل بھی ہوں اور دینی اقدار سے بھی کما حقہٗ واقف ہوں، دستور کے پیش نظر ہونا لازم ہے۔ اس نظام کی بنیادی طور پر حساس حیثیت اور اس کے عقائدی ہونے کی جہت سے یہ بات لازم ہے کہ اسے ہر قسم کے غیر صحت مندانہ روابط و تعلقات سے جدا رکھا جائے۔

واذا حكمتم بين الناس ان تحكموا بالعدل

۱۲۔ انتظامیہ (Executive)

انتظامیہ کے لیے لازم ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے راہ ہموار کرے کیونکہ اسے اسلامی قواعد و ضوابط کو نافذ کرنے اور یوں معاشرے میں عادلانہ اور مناسب تعلقات استوار کرنے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور چونکہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے راہ ہموار کرنے کے سلسلہ میں

اس کی ضرورت ہے اس لیے اسلامی نقطہ نظر سے ہر ایسے نظام کی نفی ہوتی ہے جو منزل مقصود کی راہ میں پیچیدگیاں اور رکاوٹ پیدا کرے اسی بنا پر بیوروکریسی کے طاغوتی حکمرانوں کی پیدا کردہ اور پروردہ ہے ملک سے نکال باہر کی جائے گی تاکہ ایک ایسی انتظامیہ (Executive) وجود میں آ سکے جو اپنی انتظامی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں بہتر اور زود تر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکے۔

۱۳ وسائل تعلقات عامہ :

وسائل تعلقات عامہ (ریڈیو، ٹیلی ویژن) کے لیے لازم ہے کہ وہ انقلاب اسلامی کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لیے اسلامی ثقافت و تعلیمات کی نشر و اشاعت کا کام کریں اور اس سلسلے میں مختلف افکار و خیالات کے صحت مندانہ تبادل کو فروغ دیں اور ایسے خیالات کی ترویج سے گریز کریں جو تخریبی ہوں اور اسلام کے خلاف ہوں۔

ہم سب کا فرض ہے کہ ایسے اصول قانون کی پیروی کریں جو انسان کی آزادی اور عزت نفس کو اپنے مقاصد کی فہرست میں اولین حیثیت دیتے ہوں اور انسانی ترقی و نشوونما کی راہیں کھولتے ہوں اور یہ بات بھی لازم ہے کہ ایک مسلمان قوم با ایمان اور باصلاحیت کے مالک کارکنوں کا انتخاب کرکے اور ان کے کام کی مسلسل نگرانی کرکے ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل میں فعال طور پر شریک ہو اور یہ توقع کرے کہ اس طرح ایک مثالی اسلامی معاشرہ قائم کرکے اس قابل ہو سکے گی کہ وہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے نمونہ بن سکے اور ان پر گواہ بنے:

وکذٰلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس۔

۱۴ نمائندے:

متخصصین کی ایک جماعت نے جو عوامی نمائندوں پر مشتمل تھی، دستور کی تدوین کی۔ اس کی اساس یہ تھی کہ انھوں نے حکومت کی پیش کردہ تمام سفارشات کے مسودے اور لوگوں کے مختلف گروہوں کی طرف سے پیش کی جانے والی تجاویز کے مسودات کا مطالعہ کرکے یہ دستور تیار کیا جو بارہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۷۵ آرٹیکل ہیں۔ یہ دستور ہجرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پندرھویں صدی کے آغاز میں جو اسلام کے حریت بخش دبستان کا نقطہ آغاز تھی، ان مقاصد کو پیش نظر

رکھ کر تیار کیا گیا جو اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اس کی تدوین اس امید پر کی گئی ہے کہ آیندہ صدی دنیا کے مظلوم انسانوں کے برسرِ اقتدار آنے اور تمام ظالموں کو شکست کھانے سے عبارت ہوگی۔

AL-TAWHĪD

A Quarterly Journal of Islamic Thought and Culture

ترتیب

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس ۵۹۷

قم، جمہوری اسلامی ایران

فون : ۲۴۵۸۴

رمضان، شوال ۱۴۰۶ھ / جون، جولائی ۱۹۸۶ء

اخلاق

فکر و فلسفہ

نوٹ:-

ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے
سے اتفاق ضروری نہیں۔

شذرہ
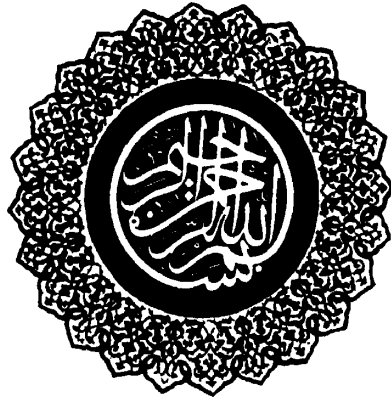
صلح کس سے؟

خلیج فارس میں کفر و اسلام کی پانچ سالہ جنگ اپنے نازک اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔
والفجر ۸ کے انتہائی کامیاب اور معجز نما آپریشن نے بین الاقوامی تبصرہ نگاروں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ دنیائے استکبار اور اس کے زیر اثر تبصرہ نگار اس نظریہ کو بڑی آب و تاب کے ساتھ نشر اور لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ خلیج کی جنگ لامقصدیت کا شکار ہو گئی ہے، اس جنگ میں کوئی فاتح ہو گا نہ مفتوح۔
عالمی استکبار اپنے خاص مقاصد کے تحت چاہتا بھی یہی تھا کہ اگر ایران کی شکست ممکن نہ ہو تو جنگ اس طرح سے ختم ہو کہ اس میں کوئی غالب ہو نہ مغلوب، لیکن والفجر ۸ کے حیرت انگیز نتائج نے ان کے اندازوں کو غلط ثابت کر دکھایا، ان کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا، فتح "فاؤ" لشکر اسلام کی مکمل فتح و ظفر کی بشارت دے رہی ہے، خود استکباری طاقتیں بھی زبان سے نہ سہی، دل میں ضرور اس حقیقت کی معترف ہیں، ان کی بوکھلاہٹ اور احمقانہ اقدامات اس کی غمازی کر رہے ہیں، چنانچہ لشکر اسلام کی یقینی و قطعی کامیابی کو روکنے کے لئے مختلف حربے آزمائے جا رہے ہیں۔ مثلاً:-

- جمہوری اسلامی ایران کو ڈرانے دھمکانے کی غرض سے "غیر تفریحی مقاصد" کے لئے خلیج فارس میں موجود استعماری طاقتوں کے بحری بیڑوں کی نمائش۔
- بڑی طاقتوں کی براہ راست مداخلت کی دھمکی۔
- ایران کی معیشت کو کمزور بنانے کے لئے رجعت پسند عرب ممالک کے تعاون سے تیل کی قیمت میں غیر معمولی بحران۔
- جمہوری اسلامی ایران کی توجہ جنگ خلیج فارس سے جنگ خلیج سرت کی جانب موڑنے کے لئے

لیبیا پر جارحانہ حملے کے منصوبے۔

لیکن کوئی مانے یا نہ مانے خود استعماری طاقتیں اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ ان کی یہ شیطانی چالیں تیران الٰہی پر کچھ زیادہ کارگر نہیں ہو سکتیں، غازیان اسلام کے بڑھتے ہوئے قدم ان گیدڑ بھبکیوں اور عیارانہ سازشوں سے نہیں رک سکتے، موت کو شہادت اور مفارقت دنیا کو سعادت ابدی جاننے والے جیالے ان کے بحری بیڑوں کو کب خاطر میں لائیں گے، نور الٰہی کے سہارے دیکھنے والے مومنین ان کی سازشوں کے تانے بانے بکھیر کر رکھ دیں گے، لہٰذا استعماری طاقتوں نے اپنے بیمار دل اور شیطانی ذہن سے ایک نیا منصوبہ بنایا اور اس دفعہ مجاہدین اسلام کی اساس و بنیاد کو متزلزل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ شاخ ہی نہ رہے جس پر آشیانہ ہے، اس چشمے ہی کو خشک کر دیا جائے جس سے وہ سیراب ہوتے ہیں، اس اسلامی فکر ہی کو مخدوش کر دیا جائے جو انہیں لازوال طاقت عطا کر رہی ہے۔

چنانچہ وقت ضرورت کے لئے استعماری ٹیکسال میں ڈھلے ہوئے علماء سوء کا سہارا لیا گیا، معاویہ شاہی دسترخوانوں پر روٹی توڑ کر خواب خرگوش میں سوئے ہوؤں کو جگایا گیا کہ اٹھو! دیکھو! دیکھو! غضب ہو گیا، دو مسلمان آپس میں برسر پیکار ہیں، مسلمان مسلمان کا خون بہا رہا ہے، تمہارا فریضہ ہے کہ دونوں میں صلح کراؤ اور اگر صلح کے لئے تیار نہ ہوں تو باغی سے جنگ کرو، یہ درباری کٹھ ملا اپنے آقاؤں کے حکم سے بغداد کی نام نہاد اسلامی کانفرنس میں جمع ہو کر وائٹ ہاوس اور کریملین میں تیار شدہ فارمولے کو لے کر نکلے، بالکل اسی طرح جس طرح جنگ صفین میں معاویہ نے نیزوں پر قرآن بلند کر کے حضرت علیؑ کے سپاہیوں کو گمراہ اور مولاؑ کی جیتی ہوئی جنگ کو شکست میں تبدیل کر دیا تھا، آج پھر ان نام نہاد علماء نے آیہ شریفہ "وان طائفتان من المومنین اقتتلوا ...." کو اس کے سیاق و سباق سے جدا کر کے بلند کیا اور بغداد ہی میں بیٹھے بیٹھے ایران کو اجباری صلح تسلیم نہ کرنے کے جرم میں باغی قرار دے کر جملہ مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ایران کے خلاف جنگ میں شرکت کریں کیونکہ ایران حکم خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اب ان قرآن سے بے خبر اور استعماری ٹکڑوں پر پلنے والے کٹھ ملاؤں یا دنیا و مافیہا سے بے خبر گوشہ نشینوں کو کون سمجھائے کہ:

اوّلاً: یہ آیت دو مومن گروہوں کے سلسلہ میں ہے نہ کہ مومن و کافر گروہوں کے بارے میں۔ یہ آیت احکام الٰہی کی بالادستی تسلیم کرنے والوں کے درمیان صلح و صفائی برقرار کرنے کا حکم دے رہی ہے

اس گروہ سے گلے ملنے کی ہرگز تلقین نہیں کرتی جو اسلامی تعلیمات کو اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتا ہو۔ اس کی نابودی کے لیے شب و روز منصوبے بنارہا ہو اور اسی مقصد کے تحت دوسرے گروہ پر جنگ مسلط کی ہو۔ البتہ واضح رہے کہ ہماری مراد ملت عراق نہیں ہے بلکہ بعثی حکومت ہے جس کا سرغنہ صدام ہے، ملت عراق اور ملت ایران میں کوئی فرق نہیں۔ جمہوری اسلامی ایران عراقی مسلمانوں کو صدام جیسے سفاک کے چنگل میں آئے اپنا بھائی تصور کرتی ہے، ملت عراق کا بعث پارٹی سے کوئی ربط نہیں بلکہ آج ہزاروں عراقی مسلمان محاذ جنگ پر اپنے ایرانی بھائیوں کے شانہ بشانہ کافر بعث پارٹی کے خلاف مصروف جہاد ہیں۔

بعثی گروہ نہ صرف یہ کہ آیہ شریفہ "وان طائفتان من المومنین ....." کا مصداق نہیں ہے اور خدا اس گروہ سے صلح کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس گروہ سے صلح کی دعوت دینا بھی حرام سمجھتا ہے چنانچہ سورۂ محمد میں ارشاد رب العزت ہے:

"...... فلا تهنوا وتدعوا الى السلم وانتم الاعلون والله معكم ولن يتركم اعمالكم"

نہ سستی و کاہلی سے کام لو اور نہ دشمنان دین سے صلح کی دعوت دو۔ ڈرو نہیں، تم برتر و سربلند ہو خدا تمہارے ساتھ ہے، وہ تمہارے اعمال کو کم نہیں کرے گا، تمہاری شفقتوں اور زحمتوں کا اجر محفوظ ہے۔

آیۂ شریفہ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو دشمنان دین سے صلح کی اجازت نہیں دیتی بلکہ ان سے صلح کی دعوت کو بھی حرام سمجھتی ہے۔ بعثی حکومت کا کفر اور دین دشمنی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں، اس کے منشور کا ایک سرسری مطالعہ اور اس کے کارناموں کا جائزہ اس حقیقت کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لئے توحید کے گذشتہ دو شماروں کا مطالعہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

ثانیاً: اگر بفرض محال ہم صدامی ٹولے کو مومن مان بھی لیں تو اب ان نام نہاد علماء کا فریضہ صلح کرانا نہیں ہے کیونکہ یہ "مقدس فریضہ"!! الجزائر، ۱۹۷۵ء میں صدام اور شاہ جیسے "مومنوں"!! میں صلح کرا کے انجام دے چکا ہے جس کی دستاویز دونوں "مومنوں" کی دستخط سے ایک معاہدے کی شکل میں جمہوری اسلامی ایران کے پاس آج بھی موجود ہے اور اسے "مومن" صدام حسین طاقت کے نشے میں ٹیلی ویژن پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی بغاوت کا ثبوت دے چکے ہیں لہٰذا اب ان "علماء" اسلام کا فریضہ ہے کہ وہ باغی صدام

سبکدوش ہوں۔ ساتھ دے کر اپنی شرعی ذمہ داری سے
حسین کے خلاف جمہوری اسلامی ایران کا ساتھ دے کر اپنی شرعی ذمہ داری سے سبکدوش ہوں۔
صلح، جنگ، مذاکرہ اور گفتگو ان سب کا ایک خاص وقت اور موقع ہوتا ہے، صلح کے وقت جنگ اور جنگ کے موقع
پر صلح خلاف عقل و شرع ہے، ایران اسلامی احکام کا پابند ہے اس کی صلح و جنگ دونوں ہی معیار شریعت کے مطابق انجام
پاتی ہیں، ایران نہ تو طاقت کے نشہ میں جنگ کا آغاز کرتا ہے اور نہ ہی دشمن کی طاقت سے ڈر کر صلح کی بھیک مانگتا ہے۔ اس کی واضح
مثال سعودی عرب و کویت کے ساتھ ایران کا رویہ ہے، سعودی عرب و کویت نے عراق کی بھرپور مدد کی، ان کے سرکاری ذرائع
ابلاغ ایران کی بے حرمتی میں ذلالت و رذالت کی آخری حدوں سے گذر گئے لیکن ایران انھیں ابھی تک اخوت و برادری
کا پیغام دیتا جا رہا ہے اور دنیا جانتی ہے کہ ایران کی اسلامی افواج کے سامنے ان لوگوں کی کوئی حقیقت نہیں، ایران
اپنی سرحد پر بیٹھے بیٹھے ہی دور مار توپوں سے کویت کو تہس نہس کر سکتا ہے لیکن ایران صبر و تحمل سے کام لے کر انھیں
اپنی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کر رہا ہے۔ مگر افسوس نہ ان کٹھ پتلی حکمرانوں کی سمجھ میں بات آ رہی ہے اور نہ صلح کے
پیشہ ور دلالوں کے کان پر جوں رینگ رہی ہے نہ ہی بین الاقوامی خیر سگالی وفود کویت و سعودی عرب کو سمجھا رہے ہیں۔
جب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوگا اور ایران حکم خدا کے مطابق تنبیہی کاروائی شروع کر دے گا اس وقت
بہت دیر ہو چکی ہوگی اگر مذاکرہ کرنا ہے اگر گفتگو کرنی ہے تو جنگ کی آگ بھڑکنے سے پہلے کیوں نہیں اقدام کرتے؟
ہزاروں انسانی جانوں کی قربانی کے بعد گفتگو و مذاکرہ معنی نہیں رکھتا، اس وقت صرف ایک ہی راستہ باقی بچتا ہے
اور وہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے جس کا حکم عقل بھی دیتی ہے اور شرع بھی اور یہی دنیا کی سیرت بھی رہی ہے،
زیادہ دور نہ جائیے دوسری جنگ عظیم کا مطالعہ کیجئے اتحادیوں نے اپنے خیال میں جنگی مجرموں کے ساتھ کیا سلوک
کیا؟ انھیں سزا دینے کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اقوام متحدہ کے سابق سیکرٹری جنرل اور آسٹریلیا کے صدارتی
امیدوار کورٹ والڈہایم "کی فائل نازیوں سے تعاون کے الزام میں آج مدتوں بعد کھنگالی جا رہی ہے تاکہ
ثبوت جرم کی صورت میں انھیں قرار واقعی سزا دی جائے، پھر اگر اسلامی ایران صدام جیسے سفاک جنگی مجرم کو سزا
دینے کا مطالبہ کرتا ہے جس کی بربریت و درندگی کسی پر پوشیدہ نہیں تو اسے کیوں مطعون کیا جاتا ہے، صدام
کے جرائم اتنے زیادہ واضح و آشکار ہو چکے ہیں کہ سلامتی کونسل کے چودھری اراکین، جو ہمیشہ صدام کی پشت پناہی
کیا کرتے تھے اور آج بھی کر رہے ہیں انھیں بھی اس کے جنگی جرائم کا اقرار کرنا پڑا ہے۔
ایران اپنے موقف میں حق بجانب ہے، عقل و شریعت اس کی پشت پناہ ہیں۔ اہل انصاف اس کے حامی و مدد گار
ہیں، مستضعفین عالم کی دعائیں اس کے سر پر سایہ فگن ہیں حکم الٰہی اس کے پیش نظر ہے وہ سفاک و خون ریز مجرم
کو قرار واقعی سزا ملنے تک اپنے اسلامی جہاد کو جاری رکھے گا، اسے دشمنان خدا و بشریت کے طعن و تشنیع لعن
و ملامت کی کوئی پروا نہیں کیونکہ قرآن مجید اسے ان الفاظ میں شاباشی دے رہا ہے:

یجاهدون فی سبیل الله ولا یخافون لومة لائم ذالک فضل الله یؤتیه من یشاء
والله واسع علیم (مائدہ/ ۵۴)

تفسیر
قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
حدیث کی روشنی میں۔
مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔
مرتضیٰ حسین

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِن فَآءُو فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ:

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے سے قسم کھالیں انھیں چار مہینے تک کی مہلت ہے۔ پھر اگر وہ رجوع کرلیں تو بے شک اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے (۲۲۶) اور اگر طلاق کا پختہ ارادہ ہو، تو (بھی) اللہ سننے، جاننے والا ہے۔ (۲۲۷)

تفسیر:

۲۲۶- لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ ....

میاں بیوی ایک گھر کو خوشیوں اور آسائشوں کا گہوارہ بناتے ہیں جس میں نئی زندگیاں جنم لیتی ہیں۔ آخر آدمی ہیں، ان میں بدمزگی اور جھگڑا بھی ہو جاتا ہے۔ اسلام نے اس مرحلے پر برادری والوں کو شریک تدبیر بنایا ہے، ان سے کہا ہے، جب میاں بیوی لڑیں تو صلح کرادو۔ لیکن نادان شوہر یا جاہلیت کا سماج ایسے موقع پر نافرمان یا تلخ بیان، بد اخلاق اور ناعاقبت اندیش (کبھی کبھی نیک اور بے قصور) بیوی کو یہ سزا دیتے اور شرعی حلف اور قانونی قسم کھا لیتے ہیں۔ "قسم ہے ہم بھی تم سے ہمبستری نہ کریں گے"۔ اس کے بعد بیوی اندرونی اور نفسیاتی شکنجے میں جکڑ جاتی ہے۔ قرآن نے اس غیر انسانی عمل پر گرفت کی ہے۔

ایلاء:

اسلام میں عورت سے چار ماہ تک دوری نظر انداز کی گئی ہے، بشرطیکہ زوجہ صحت و جوانی کی بنا پر کسی خطرے سے دوچار نہ ہو ورنہ اسے شوہر پر حق ہے اور شوہر کو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ "ایلاء" یعنی ترک ہمبستری کی قسم شرعی کے بعد قرآن مجید نے حکم دیا کہ عورت پر ظلم نہ ہونے پائے۔

قسم کھانا بجائے خود ناپسندیدہ عمل ہے۔ اس موقعہ پر چار ماہ تک تو خیر لیکن اس سے زیادہ علیحدگی نہیں رہے گی، چار مہینے میں اگر بیوی نے غلطی کی تھی تو وہ حالات ہموار کرے اور اگر شوہر نے غلط فیصلہ کیا تھا تو وہ رجوع کرے اور قسم کا کفارہ ادا کرے تاکہ عائلی زندگی بحال ہو۔ اللہ رحمت و مغفرت کرنے والا ہے

۲۲۷۔ وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ ....

چار ماہ بعد بھی حالات سازگار نہ ہوں اور سنجیدگی سے طلاق کا فیصلہ کر لیا جائے تو پھر طلاق دے دی جائے خواہ مخواہ ایک زندگی کو عذاب بنانا اچھا نہیں مگر ذہن میں یہ رہے کہ اس میں بدنیتی و ضرر رسانی مقصود نہ ہو کیونکہ اللہ تمہارے مشوروں اور منصوبوں کو سنتا اور جانتا ہے۔ اس سے کوئی بات چھپی نہیں ہے

وَالۡمُطَلَّقٰتُ
يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ ‌ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنۡ يَّكۡتُمۡنَ مَا
خَلَقَ اللّٰهُ فِىۡٓ اَرۡحَامِهِنَّ اِنۡ كُنَّ يُؤۡمِنَّ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ
وَبُعُوۡلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ اِنۡ اَرَادُوۡٓا اِصۡلَاحًا ‌ؕ
وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِىۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ وَلِلرِّجَالِ عَلَيۡهِنَّ
دَرَجَةٌ ‌ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۝

ترجمہ:

طلاق پانے والی عورتیں تین طہر تک اپنے تئیں روکیں اور ان پر ہرگز جائز نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو (کچھ) پیدا کیا ہو اسے چھپائیں بشرطیکہ وہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتی ہوں اور ان کے شوہر اگر سلوک سے رہنا چاہیں تو انہیں واپس لانے کے زیادہ حق دار ہیں اور بیویوں کا شوہروں پر ویسا ہی حق ہے جیسا شوہروں کا حق بیویوں پر ہے۔ دستور کے مطابق۔ ہاں! مردوں کو عورتوں پر ایک فوقیت (ضرور) ہے اور اللہ

زبردست ہے، حکمت والا ہے۔(۱۲۸)

تفسیر:

دو مزاجوں کے تضاد اور شوہر و زوجہ میں نفسیاتی ٹکراؤ دور نہ ہونے کی صورت میں دونوں کو جدا کرنے کا عمل "طلاق" کہلاتا ہے۔ نکاح سے جنسی روابط جائز اور نسبی رشتے جنم لیتے ہیں، نکاح خدا اور رسول کا پسندیدہ عمل ہے اور اسلامی معاشرے میں خوشی کی تقریب ہے۔ طلاق، اسلام کی نظر میں بدترین عمل ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "ما من شئ مما احلّه الله ابغض اليه من الطلاق وان الله عزوجل يبغض المطلاق الذواق" حلال چیزوں میں طلاق اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، خاص کر صرف لذت اندوزی کے لیے طلاق دینے والے سے اللہ نفرت کرتا ہے۔

بہرحال، نکاح میں عورت کو شوہر کے انتخاب و قبول کا حق دیا گیا ہے کہ وہ چھان بین کر کے شریک زندگی پسند کرے، اس کے بعد جدائی کا حق شوہر کو دیا ہے مگر کڑے شرائط اور مخلصانہ سعیِ مفاہمت کے بعد، جب باہم زندگی بسر کرنے کے امکانات ختم ہو جائیں، مگر مرد دو حرف کہنے سے آزاد نہیں ہوتا، اس کے بعد بھی عورت کے حقوق باقی رہتے ہیں۔ آیاتِ ذیل میں طلاق اور اس کے لوازم کا بیان ہے۔

عدت: شرعی طلاق کے بعد طلاق یافتہ کسی دوسرے سے نکاح نہیں کر سکتی، تین حیض آنے اور پاک ہونے کی مدت پوری کرنا ہو گی تاکہ حمل ہو تو معلوم ہو جائے اور کسی کی اولاد غیر شخص کو نہ مل جائے، لہٰذا عورت پر واجب ہے کہ تین ماہ تک وہ رحم کی حالت سے باخبر رکھے حمل ہو تو حمل، حیض ہو تو حیض بتاتی رہے۔ اس مدت کو عدت کہتے ہیں (حاملہ کا عدہ بچہ پیدا ہونے تک ہے)

عدت کے دوران طلاق رجعی دینے والے کو عورت سے رجوع کا حق ہے اس کا مقصد اصلاح و درستی احوال ہے۔ خصوصاً حمل یا بچہ پیدا ہونے کی صورت میں دونوں کے لیے ایک اور بہتر موقع ہاتھ آتا ہے۔ عورت جسے مرد کے نفسیات کو خوش کرنے اور گھر کو جنت بنانے کا ڈھنگ آتا ہے وہ تلخیٔ حیات کو ٹال سکتی ہے۔ مرد کو بھی عورت کی طرح حقوق اور باہمی مساوات و ہمدردی کا پورا خیال رکھنا چاہیئے۔ بلکہ مرد کو جذبات پر قابو رکھنے اور فیصلے میں غور و فکر کرنے، مسائل کو حل کرنے اور زندگی کے بارے میں دوراندیشی کرنے میں عورت پر برتری حاصل ہے۔ رہی اختیار کی بات تو اللہ کے سوا، قدرت و اختیار و حکمت کا مالک ہے کون! مردوں کو اپنے درجہ پر مغرور نہ ہونا

چاہیے۔

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ:

طلاق (رجعی) دوبار ہے۔ اس کے بعد دستور کے مطابق روکنا یا حسن سلوک کے ساتھ چھوڑنا (ہوگا) اور تم مردوں کے لیے جائز نہیں کہ انھیں (بیویوں کو) جو کچھ دے چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس لے لو۔ سوائے اس صورت کے جب دونوں کو حدود (و احکام) الٰہی پر قائم نہ رہنے کا ڈر ہو تو پھر دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ بیوی کچھ بدلہ (مال) دے کر طلاق حاصل کر لے۔ یہ اللہ کے احکام ہیں لہٰذا ان سے آگے نہ بڑھو اور جو اللہ کے احکام سے تجاوز کریں گے وہی ظالم ہوں گے۔ (۲۲۹)

تفسیر:

فرض کیجئے کہ زن و شوہر میں تعلقات قائم نہیں رہ سکتے، خاندان اور حاکم شرع کی کوشش ناکام ہوئی۔ تو اسلام مرد کو اجازتِ طلاق دیتا ہے۔ لیکن بیوی گھر میں رہے گی اور اجازت شوہر کے بغیر ادھر اُدھر نہیں گھومے گی۔ مرد نان و نفقہ کا پابند ہے۔ "عدۃ" کی مہلت ہے کہ اس مدت میں ٹھنڈے دل سے سوچ لیں۔ اثنار عدت رجوع اور بعد تمام مدت عدت پھر سے نکاح کر سکتے ہیں۔ دوبارہ نکاح کے بعد پھر نباہ نہ ہو سکے تو ایک طلاق و رجوع کا پھر حق ہے کہ معاشرتی نظام یہی چاہتا ہے۔ قانون اصلاح احوال کا تقاضہ کرتا ہے۔ دوسری مرتبہ رجوع کرنے کے بعد طلاق کی نوبت آئی تو بات

ہاتھ سے نکلی، اب حل یہی ہے کہ مکمل جدائی ہو جائے۔

طلاق رجعی میں دراصل اصلاحِ احوال ممکن ہے، رجوع ہو تو حسنِ سلوک اور حسن معاشرت کی نیت سے۔ تکلیف دہی اور شرارت کے لیے نہیں۔ چھوڑنا ہو تو عمدگی اور آبرومندانہ انداز میں غصہ، انتقام اور کینہ جوئی نہ ہو۔ زمانہ عدت میں اسے رہنے سہنے، کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی آسانیوں سے محروم نہ کیا جائے۔ عمدگی (احسان) یہ ہے کہ جو (مہر) دیدیا ہے اسے واپس نہ لو (النساء ۴/۲۱)

الّا ان یخافا الا یقیما حدود اللہ۔ ایک صورت یہ ہے کہ بیوی کسی طرح شوہر کا ساتھ نہیں چاہتی اور دونوں حدود الٰہی کی پابندی نہیں کرسکتے تو عورت مہر شوہر کو واپس (یا ہبہ) کرے اور "طلاقِ خلع" حاصل کرسکتی ہے۔

جو مرد و زن اللہ کے مقررہ قوانین وحدود سے تجاوز کرے گا وہ ظالم ہوگا۔ اپنی ذات پر ظلم کرے گا، معاشرے پر ظلم کرے گا، اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اس طلاق و رجوع میں انصاف کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ
حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن
يَتَرَاجَعَا إِن ظَنَّا أَن يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ
اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾

ترجمہ:

(دو طلاقوں کے بعد) اگر پھر طلاق دے تو اس کے بعد جب تک وہ عورت (اس شوہر) کے علاوہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے اس (طلاق دینے والے) کے لیے حلال نہیں، ہاں اگر وہ طلاق دیدے تو ان دونوں (شوہر سابق اور اس مطلقہ) کے لیے میل ملاپ کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ دونوں گمان رکھیں کہ حدود الٰہی

محفوظ رہیں اور یہی اللہ کے احکام ہیں جنہیں وہ سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لیے بیان کرتا ہے۔ (۲۳۰)

تفسیر:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زوجۂ رفاعہ نے سوال کیا۔ اس کے چچا زاد بھائی نے اس سے نکاح کیا اور طلاق دے دی، تین مرتبہ طلاق پانے کے بعد اس نے عبدالرحمٰن نامی آدمی سے شادی کی، اتفاقاً جنسی عمل کیے بغیر اس نے بھی طلاق دے دی کیا پہلے شوہر کے گھر آباد ہوسکتی ہوں؟ آنحضرتؐ نے اس عمل سے منع کیا تفصیل آیت میں موجود ہے۔ یعنی نئے شوہر سے ہم بستری اور شرائط طلاق کے بغیر پرانے شوہر سے نکاح کی اجازت نہیں ہے۔

طلاق ــ گھر اجاڑنے اور لذت اندوزی و عیاشی یا عورتوں کو ذلیل کرنے کا ذریعہ نہیں: نکاح وطلاق کا مقصد، باکرامت معاشرے کو جنم دینا ہے۔ بار بار رجوع کا حق اس لیے دیا گیا ہے کہ عورت کو ذلت اور جسم فروشی و جسم نمائی سے بچایا جائے، روز روز اس کا بستر بدلنا اس کے لیے کوئی آبرومندی نہیں ہے۔ جب دونوں دوامی جدائی پر کمربستہ ہوں تو پھر غیر آدمی سے نکاح دائمی کرنا ہوگا اور اس میں بدنیتی نہ ہونا چاہیئے۔ ہنستے بستے کے لیے دونوں کی شرافت و کرامت کا تقاضا یہی ہے کہ اب اسی گھر کو آباد کریں۔ لیکن اگر یہ عورت نئے شوہر کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوسکے یا شوہر اس بیوی کو پسندیدہ نہ سمجھے تو جس تدبیر طلاق ہوسکتی ہے اس کے بعد پہلا شوہر اور یہ عورت اپنے نفسیاتی رجحانات اور مزاجی افتاد کی بنیاد پر، نیا نکاح کرسکتی ہے مگر اللہ کی طرف سے سخت تنبیہ کے ساتھ حدود واحکام خدا کی پابندی کا اطمینان کریں اور آئندہ احتیاط رکھیں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ
اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ
وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ
ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ

عَلَيْكُمْ وَمَآ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا أَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

ترجمہ:

اور جب اپنی بیویوں کو طلاق دو اور وہ "عدہ" کے ختم پر پہنچیں تو یا انھیں اچھے انداز میں آباد کر لو یا بحسن وخوبی رخصت کر دو (پیچھا نہ کرو) اور انھیں نقصان رسانی اور ظلم و زیادتی کے لیے روکے نہ رکھو جو اس قسم کے کام کرتا ہے وہ اپنے اوپر ستم ڈھاتا ہے اور احکام الٰہی کو "مذاق" نہ بناؤ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور اس نے تم پر جو کتاب وعلم و دانش نازل کی ان سے تمھیں نصیحت کرتا ہے اور اللہ سے تقویٰ رکھو اور جان لو کہ بےشک اللہ ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر:

اَمسِکوھنّ بمعروف و سرّحوھنّ بمعروف۔ قرآن کا معجزہ ہونا ثابت کرنے والے فقرے ہیں۔ "معروف" ان آیات میں بارہ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی انسانی تقاضوں، اخلاقی اصولوں، شرعی دستور اور اچھے انداز میں یہ نہ ہو کہ عدہ ختم ہو رہا تھا اور یہ سوچ کر اس بیوی کو روک لیا کہ اس نے بڑی اذیتیں دی ہیں اب ہم اسے خوشی نصیب نہ ہونے دیں گے۔ یہ نیت، یہ طریق کار اور فکر وعمل کا یہ انداز تقوے کے خلاف ہے، آداب واحکام اسلامی کا تمسخر ہے۔ قرآن مجید اور سنتِ رسولؐ تمھاری اصلاح کے لیے ہے۔ بندۂ مومن کو انھیں دو حدوں میں محدود رہنا چاہیے اور ہر وقت اللہ سے ڈرنا چاہئے وہ دلوں کے بھید اور لبوں کی حرکت سے باخبر ہے وہ حسن نیت کا اچھا بدلہ اور بدنیتی پر سرزنش کرتا ہے۔ جو بدی کرتا ہے وہ اپنے اوپر خود ظلم کرتا ہے کیونکہ اس کا یہ عمل حکم خدا کی توہین کے برابر ہے۔ اس کی مذمت ہوتی ہے اور بدی کے بدلے نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بندۂ مومن" احکام خدا اور قانون الٰہی کے تمسخر کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ أَنْ

يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ ذٰلِكَ
يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ
ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا
تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ:

اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت (عدّہ) تمام کریں تو انھیں اپنے شوہروں کے ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو (خصوصاً، جب وہ باہمی طور پر شریعت کے مطابق رضامند ہو جائیں، یہ اسی شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہو۔ یہ تمہارے خاندان کے حق میں پھلنے پھولنے اور گندگی دور کرنے کی بات ہے۔ اور (اصل میں تو) علم اللہ ہی کو ہے اور تم جانتے ہی نہیں۔ (۲۳۲)

تفسیر:

عاصم بن عدی نے جمیلاء کو طلاق دے دی، عدہ گذر گیا تو عاصم و جمیلاء دونوں دوبارہ عقد پر راضی ہو گئے لیکن جمیلاء کے بھائی معقل بن یسار نے منع کیا۔ یا ۔ جابر بن عبداللہ نے اپنی چچازاد بہن کے معاملے میں رکاوٹ ڈالی اور بات آنحضرتؐ تک پہنچی اس کے بعد وحی آئی۔

اس آیت میں عورتوں کو ایک حق دیا اور "اولیاء" کو دخل اندازی سے روکا گیا ہے۔ جب مدت عدہ تمام ہو جائے تو عورت دو مرحلوں سے گذر چکی ہے۔ گھریلو زندگی اور اس سے دوری، عدہ، یکسوئی اور فکر کی مہلت۔ اب اس فیصلہ کا حق ہے۔ وہ اپنے پہلے شوہر سے جس نے ابھی تک رجوع نہیں کی تھی دوبارہ اپنا سرتاج بنانا چاہتی ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ مومن و متقی مرد و عورت اللہ کو علیم و خبیر جان کر ایمان داری سے فیصلہ کرنا چاہیں تو اچھا ہے۔

دوسرا امر دیکھیں تو دیکھ بھال لیں، پہلے سے عقد کرنا ہے ذہنی طور پر مطمئن ہیں بڑی آبرو کی بات ہے اگر بچے ہیں تو ان کی نشوونما اور پھلنے پھولنے میں مدد ملے گی اور نہیں ہیں جب بھی بداخلاقی

اور معاشرتی سبکی کا داغ تو دھل ہی جائے گا۔ پھر خدا پر توکل و اعتماد ہے تو یقیناً نتائج اچھے ہوں گے۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ
لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ
وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا
لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ
مِثْلُ ذَٰلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا
اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

ترجمہ:

اور مائیں اپنے بچوں کو ان کی خاطر جب دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہیں، دو برس دودھ پلائیں اور ان کا کھانا، کپڑا دستور کے مطابق بچے والے کے ذمے ہے کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہ دی جائے۔ نہ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچے کے سبب ضرر پہنچایا جائے اور ایسی ہی ذمہ داری باپ کے قائم مقام (وارث) پر ہے۔

پھر اگر ماں باپ دونوں (دو برس کے اندر) دودھ چھڑانے پر راضی ہو جائیں اور صلاح مشورہ کریں، تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اگر تم لوگ اپنی اولاد کو (دانا سے) دودھ پلوانا چاہو تو اس میں بھی تم پر کوئی گناہ نہیں۔ بشرطیکہ جو دستور کے مطابق

طے کیا ہے وہ اس کے حوالے کردو۔ اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو۔ اور جان لو کہ جو کچھ تم
کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔ (۲۳۳)

تفسیر:

جس طرح والدین کے صفات اور نسلی امتیازات، نیز جسمانی ڈھانچہ اولاد کو میراث میں ملتا ہے اسی طرح شیرِ مادر کی تاثیر نفسیات پر دیر تک باقی رہتی ہے۔ جس ماں کے پیٹ میں بچہ پیدا ہوا، اور کم از کم سات ماہ تک غذا حاصل کی نشو و نما پائی اسی ماں کا دودھ اس کے لیے بہترین خوراک اور مادر و فرزند کے نفسیاتی روابط کا ذریعہ ہے: قرآن مجید نے رضاعت کو ماں کا حق قرار دیا ہے۔ خواہ ماں شوہر کے عقد میں ہو یا طلاق پا چکی ہو۔ دو سال رضاعت کی مدت ہے۔

رضاعت، عورت کے لیے سخت کام ہے لہٰذا خصوصی طور پر باپ کو بحدِ امکان، آداب و دستور کے مطابق اہتمام و انتظام خوراک و صحت رکھنا ہوگا اور اسے یہ حق نہیں کہ دودھ پلانے سے اسے روکے یا اس کی پرورش اور دیکھ بھال سے منع کرے یا کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔ اسے "حضانت" کہتے ہیں جس میں بچے کو جھولا جھلانا، نہلانا دھلانا، تیل ملنا، کپڑے بدلنا جیسے کام داخل ہیں اس حق میں ماں کو اولیت حاصل ہے۔ ادھر ماں کو یہ حق نہیں کہ باپ کو ضرر پہنچائے اور اخراجات یا بیٹے کو دیکھنے، گود میں لینے ..... کے معاملات میں رکاوٹ بنے۔ باپ اگر مر جائے تو اس کے وارث بچے کی ماں کے نان و نفقہ و ضروریات کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔

"لا تکلف نفس الا وسعھا" ایک کلیہ ہے۔ نہ اللہ کسی بندے پر ناقابل عمل ذمہ داری عاید کرتا ہے نہ کسی انسان کو دوسرے آدمی پر اس طرح کا حکم جاری کرنے کا حق ہے۔

۔ فان ارادا فصالا .... " محبت و شفقت والدین کے سایے میں نشو و نما حاصل کرنے اور بچے کی خوراک پر توجہ کے بعد تربیت کا مرحلہ آتا ہے۔ ارشاد ہے کہ دونوں ماں باپ ذہنی و فکری معاملات سے گھر کی فضا کو معطر رکھیں دودھ بڑھانا ہو تو باہمی صلاح مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کریں۔

"وان اردتم ان تسترضعوا" اگر ماں باپ یہی مناسب سمجھیں کہ بچے کو آیا سے یا کسی اور خاتون سے دودھ پلوائیں تو اجازت ہے مگر اس عورت کو بھی دستور و اخلاق کے مطابق یا اس کے

مطالبہ کی بنیاد، ہدیہ، تنخواہ یا معاوضہ ادا کریں۔

۔ واتقوا اللہ ۔ بچے کی اساس رکھنے اور بنیاد قائم کرنے کا مرحلہ ہے یہ وقت تقوے اور اللہ کے علیم و بصیر ہونے کے عقیدے کو عملی بنانے کا ہے۔ مومن کا فرض ہے کہ بچے کو اللہ کی رضا اور اس کی بندگی کے لیے پالیں اور ایسی تربیت کریں جس کے نتیجے میں وہ رسولؐ و آل رسول کا پیروکار اور اللہ کا پسندیدہ انسان بن کر ماں کی تربیت اور باپ کی تعلیم کا مثالی نمونہ بنے۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ

مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ

أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ

فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ

أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن

لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا

عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا

أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ

غَفُورٌ حَلِيمٌ

ترجمہ:

اور تم میں سے جو لوگ بیویاں چھوڑ کر وفات پائیں تو وہ عورتیں اپنے تئیں روکے رکھیں چار مہینے اور دس دن۔ پھر جب وہ عدہ تمام کریں تو شائستہ طریقے سے اپنے حق میں جو کرنا چاہیں، تمہارے لیے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو

اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے (۲۳۴) اور تمھارے لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ (بیوہ) عورتوں سے اشارے میں رشتے کی بات کرلو۔ یا اپنے دلوں میں (یہ ارادہ) چھپائے رکھو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم ان کا ذکر کرو گے۔ مگر ان عورتوں سے خفیہ عہد و پیمان نہ کرنا۔ مگر اس میں مضائقہ نہیں کہ رواج شریعت کے موافق کوئی بات کہدو اور جب تک مقرر مدت (عدہ) نہ گذر جائے نکاح کا ارادہ نہ کرنا اور جان رکھو اللہ اس کو ضرور جانتا ہے جو تمھارے دلوں میں ہے۔ اس سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ یقیناً بخشنے والا، علم والا ہے (۲۳۵)

تفسیر:

۲۳۴۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ . . . .

توفی: گرفتن۔ پکڑنا۔ یذر (ذ بے ماضی) واگذار کردن۔ چھوڑنا جو اپنے شوہروں کو کھو بیٹھیں ضروری ہے کہ چار ماہ دس دن عدہ رکھیں اور شادی سے اپنے آپ کو روکے رہیں۔

آدمیت کا احترام اور گذشتہ دلوں کے قانونی حقوق اور روابط، محبتوں اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے سبکدوش ہونے کے لیے تم نصیب خاندان کی تسلی اور خود اپنے اوپر گذرنے والے سانحے میں نفسیات و جذبات پر قابو پانے کے لیے، شوہر کا "عدہ وفات" چار ماہ دس دن ہے۔ اس زمانے میں سوگوار نظر آئے۔ زیب و زینت و آرائش نہ کرے۔ عدہ پورا ہو جائے تو انھیں مناسب شوہر کے انتخاب میں روکنے ٹوکنے کی ضرورت نہیں۔

وہ اور تم سب کو اللہ اور شریعت کا پاس لحاظ رکھنا چاہیئے۔ منکرات میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے۔

بیوہ ــ غیر مسلم معاشروں میں چھوت بلکہ سوختنی فروختنی سمجھی جاتی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ ممالک و اقوام میں بہت سے پڑھے لکھے لوگ ایسے مذاہب کو مانتے ہیں جس میں بیوہ کے لیے مقدر یہی ہے۔ اسلام نے ان خرافات کو ٹھکرا کر ایک معقول اور متوازن فکر دی۔ عورت عدے میں ہے کہ امانتِ شکم کا حال معلوم ہو جائے۔ وہ مرنے والے کی یادگار ہوگی۔ گھر کے خالی ہونے سے جو نفسیاتی خلفشار اور فکری انتشار ہے اسے سکون ملے گا۔ اگر عورت جنسی کشمکش میں مبتلا رہے

تو وہ مستقبل کے بارے میں اچھی طرح سوچ سمجھ لے۔ بیوہ کے نکاح پر نہ اللہ کی طرف سے کوئی پابندی ہے نہ کسی رو کنے کا حق ہے۔ بس عدہ اور ولادت کا انتظار کرنا لازم و مفید ہے۔

۲۳۵۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ ....

اللہ دلوں کے بھید جانتا ہے، اس لیے عدّہ نشین خواتین کے بارے میں وہ تمہاری نیت سے باخبر ہے۔ اس ارادے کے سلسلے میں:

(الف) منگنی کی بات اشارے کنایے میں بھی کر سکتے ہو اور اپنے دل میں فیصلے کا بھی حق ہے۔ (ب) عدہ نشین سے خفیہ عہد و پیمان کی اجازت نہیں ہے۔ بات چیت معروف طریقے اور مناسب انداز سے کرو (ج)، عدّے کے تمام ہونے سے پہلے عقد کا فیصلہ نہ کرنا۔

جذبات میں بے قابو نہ ہو، اللہ سے ڈرتے رہنا۔ وہ خود بخشنے والا اور درگذر فرمانے والا ہے مگر تم جان بوجھ کر غلطی نہ کیا کرو۔ آداب بندگی کا یہی تقاضا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ
تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ
قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾
وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ
فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَن يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي
بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَن تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا
تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

ترجمہ:

تم پر کوئی گناہ نہیں ۔ اگر ایسی عورتوں کو طلاق دو جن سے نہ تم نے ہمبستری کی ہے نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے ۔ اس صورت میں ان کو مال و متاع دو (فائدہ پہنچاؤ) خوشحال اپنی مقدور اور نادار اپنی گنجائش کے مطابق معروف طریقہ سے (روپیہ پیسہ کپڑے لتے) دے ۔ نیک آدمیوں پر یہ حق ہے (۲۳۶) اور اگر تم انہیں مس کرنے سے پہلے طلاق دے دو اور ان کا مہر مقرر کر چکے ہو تو جو کچھ معین کیا تھا اس کا نصف تمہارے ذمے ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ وہ عورتیں (خود) معاف کر دیں یا وہ شخص چھوڑ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا اختیار ہو اور تمہارا معاف کرنا پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے اور باہمی معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو ۔ یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے دیکھتا ہے (۲۳۷)

تفسیر:

۲۳۶۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ ....

بعض حالات میں جنسی تعلقات قائم ہونے سے پہلے طلاق کی نوبت آجاتی ہے ۔ ایسے مرحلے میں عورت کے حق کی نگہداشت ضروری ہے اگر مہر معین نہیں کیا تھا تو "متعہ" دو یعنی حسب امکان روپیہ ، کپڑے سواری وغیرہ جیسی حیثیت ہو ۔ احسان اور بھلائی کرنے والے افراد معاشرے میں حسن کردار کا مظاہرہ کیا کریں ۔

۲۳۷۔ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ ....

دوسری صورت یہ ہے کہ مباشرت نہیں کی اور مہر مقرر ہو چکا تھا ۔ اب طلاق دینے والے کو

آدھا مہر ادا کرنا چاہیئے۔ عورت اور اس کے ولی کو وہ رقم معاف کرنے کا بھی حق ہے اس سے عورت کی کرامت اور تقوے کی نشان دہی ہوتی ہے۔

اللہ کو حاضر و ناظر جاننے والوں کو ایک اصول ملحوظ رکھنا چاہیئے اور وہ ہے، باہمی معاشرتی معاملات میں فیاضی۔

جناب شیخ محمود قانصوہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

ملاعبہ جائز ہے بشرطیکہ انزال نہ ہو

روایات اہل بیت :

١ ــ محمد بن يعقوب، عن عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد، عن علي بن الحكم، عن داود بن النعمان، عن منصوربن حازم، قال: قلت لأبي عبدالله(ع): ماتقول في الصائم، يُقَبّل الجارية والمرأة؟ فقال: أما الشيخ الكبير مثلي ومثلك فلا بأس، وأما الشاب الشبق، فلا، لأنه لايؤمن، والقُبلة إحدى الشهوتين، قلت، فما ترى في مثلي يكون له الجارية فيلاعبها؟ فقال لي: إنك لشبق يا أبا حازم (الحديث). [72]

١۔ ...... منصور بن حازم کا بیان ہے کہ میں نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: اس روزے دار کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں، جو اپنی بیوی یا کنیز کا بوسہ لیتا ہے؟ حضرت نے فرمایا: اگر وہ میری اور تمہاری طرح بوڑھا ہو تو حرج نہیں، لیکن شہوت سے بھرپور جوان کے لیے جائز نہیں، کیونکہ وہ اپنے کو (بوسے کے بعد کی منزلوں سے) محفوظ نہیں رکھ سکتا، بوسہ بھی ایک قسم کی شہوت ہے، میں نے عرض کیا، میرے جیسے شخص کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ اپنی کنیز سے بوس وکنار کرسکتا ہے؟ حضرت نے فرمایا: اے ابو حازم تم میں بہت زیادہ شہوت پائی جاتی ہے۔

توحید ۲۵

٢ ــ محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه وعن محمد بن أحمد بن محمد، جميعاً عن ابن أبي عمير، عن حماد، عن الحلبي، عن أبي عبدالله(ع) أنه سُئِلَ عَن رجل يمسُّ من المرأة شيئاً، أيفسد ذلك صومه أو ينقضه؟ فقال: إنَّ ذلك ليكره للرجل الشاب مخافة أنْ يسبقه المني.[٧٣]

٢۔ . . . . حلبی سے روایت ہے کہ امام صادقؑ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو (حالت روزہ میں) اپنی بیوی سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے، کیا اس کا روزہ باطل ہوجائے گا؟ حضرتؑ نے فرمایا: یہ عمل جوانوں کے لئے مکروہ ہے کیونکہ منی نکل آنے کا خوف ہے۔

روایات اہل سنت:

١ ــ أخبرنا أبوالفتح هلال بن محمد بن جعفر، أنبأ الحسين بن يحيى بن عياش القطان، حدثنا الحسن بن محمد بن الصباح، حدثنا ابن أبي عدي، عن شعبة (ح وأخبرنا) أبوبكر بن فورك ، أنبأ عبدالله ابن جعفر، حدثنا يونس بن حبيب، حدثنا أبو داود، حدثنا شعبة (ح وأخبرنا) أبوالحسن علي بن محمد المقري، أنبأ الحسن بن محمد بن اسحاق، حدثنا يوسف بن يعقوب، حدثنا سليمان بن حرب، حدثنا شعبة، عن الحكم، عن ابراهيم: ان علقمة وشريح بن أرطأة رجل من النخع كانا عند عائشة رضي الله عنها فقال أحدهما لصاحبه: سلها عن القبلة للصائم، فقال: ما كنت لأرفث عند أم المؤمنين، فقالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يُقبّل وهو صائم، و يباشر وهو صائم، وكان أملككم لأربه.[٧٤] أقول وأحاديث تقبيل النبي(ص) لأزواجه ولاسيّما عائشة في غاية الكثرة، نقل منها البيهقي مايزيد عن العشرة، وروى الترمذي بأسانيد متعددة عن عائشة نحوه.[٧٥] وأخرج مسلم منها الكثير، لعله يبلغ خمسة عشر حديثاً، بعضه له أسانيد.... فراجع.[٧٦] وكذا عبدالرزاق

والبخاري وآبن ماجة، وكذا أبو داود.[۷۷] ومالك [۷۸] والدارقطني [۷۹] وأبوداود الطيالسي [۸۰] والدارمي [۸۱].

۱۔ .... ابراہیم کہتے ہیں علقمہ اور شریح بن ارطاۃ حضرت عائشہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، ایک نے دوسرے سے کہا: حضرت عائشہ سے روزے دار کے بوسہ لینے کے بارے میں دریافت کرو، اس نے جواب دیا: میں ام المومنین کے سامنے اس طرح کی گفتگو نہیں کرسکتا، چنانچہ خود حضرت عائشہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالت روزہ میں بوس وکنار فرماتے تھے، حالانکہ انھیں اپنی خواہشات پر تم لوگوں سے زیادہ قابو حاصل تھا ....

۲ ــ أخبرنا أبو بكر أحمد بن الحسن القاضي، حدثنا أبو العباس محمد بن يعقوب، حدثنا العباس بن محمد الدوري، حدثنا سهل بن محمد بن الزبير العسكري، حدثنا يحيى بن زكريا بن أبي زائدة، حدثني أبان البجلي، عن أبي بكر بن حفص، عن عائشة أن النبي(ص) رخّص في القبلة للشيخ وهو صائم، ونهى عنها الشاب، وقال: الشيخ يملك أربه، والشاب يفسد صومه [۸۲].

۲.... حضرت عائشہ کہتی ہیں پیغمبرؐ نے بوڑھوں کو حالت روزہ میں بوسہ لینے کی اجازت دی ہے لیکن جوانوں کو اس سے منع کیا ہے۔ اور فرمایا ہے بوڑھا اپنی خواہشات پر قابو پاسکتا ہے لیکن جوان اپنے روزے کو باطل کر بیٹھے گا۔

۳ ــ أخبرنا أبو علي الروذباري، أنبأ محمد بن بكر، حدثنا أبوداود، حدثنا نصر بن علي، أنبأ أحمد، أنبأ اسرائيل، عن أبي العنبس، عن الأغر، عن أبي هريرة: أن رجلاً سأل النبي(ص) عن المباشرة للصائم، فرخّص له، وأتاه آخر فسأله، فنهاه، فاذا الذي رخّص له شيخ، والذي نهاه شاب.[۸۳]

۳...... ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے پیغمبر سے حالت روزہ میں بوس وکنار کے بارے میں سوال کیا حضرت نے اسے اجازت دے دی، لیکن ایک دوسرے

شخص نے جب یہی سوال کیا تو حضرتؑ نے اسے منع کر دیا، جس شخص کو آپؑ نے اجازت دی تھی وہ بوڑھا تھا اور جس کو روکا تھا وہ جوان تھا۔

روزے دار کے لئے اپنی بیوی کی زبان چوسنا جائز ہے

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ وباسناده ــ محمد بن الحسن ــ عن محمد بن أحمد، عن محمد بن أحمد العلوي، عن العمركي البوفكي، عن علي بن جعفر، عن أخيه موسى بن جعفر(ع)، قال: سألته عن الرجل الصائم، أله أنْ يمص لسان المرأة، أو تفعل المرأة ذلك ؟ قال: لابأس. [٨٤]

١۔ ۔ ۔ ۔ علی بن جعفر اپنے بھائی امام موسیٰ کاظمؑ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے آپؑ سے روزے دار کے متعلق دریافت کیا: کیا وہ اپنی بیوی کی زبان چوس سکتا ہے یا اس کی بیوی اس کی زبان چوس سکتی ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا کوئی حرج نہیں۔

٢ ــ وعنه عن أحمد بن محمد، عن الحسين (يعني ابن سعيد)، عن النضر بن سويد، عن زرعة، عن أبي بصير، قال: قلت لأبي عبدالله (ع): الصائم يُقَبِّل؟ قال: نعم، ويعطيها لسانه تمصه. [٨٥]

٢ ۔ ۔ ۔ ۔ ابو بصیر کا بیان ہے کہ میں نے امام صادقؑ کی خدمت میں عرض کیا: روزے دار بوسہ لے سکتا ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا: ہاں، بیوی کو اپنی زبان بھی چوسنے کے لیے دے سکتا ہے۔

روایت اہل سنّت:

١ ــ حدثنا محمد بن عيسى، حدثنا محمد بن دينار، حدثنا سعد بن أوس العبدي، عن مصدع أبي يحيى، عن عائشة: (ما يقرب من المضمون المذكور). [٨٦]

۱...... حضرت عائشہ سے بھی اسی مضمون کی روایت نقل ہوئی ہے۔

عمداً قے کرنا جائز نہیں لیکن خود بخود آنے سے روزہ باطل نہ ہوگا

روایات اہل بیت:

١ ــ محمد بن يعقوب، عن محمد بن اسماعيل، عن الفضل بن شاذان وعن أبي علي الأشعري، عن محمد بن عبدالجبار، جميعاً عن صفوان بن يحيى، عن آبن مسكان، عن الحلبي، عن أبي عبدالله(ع) قال: إذا تقيَّأ الصائم، فعليه قضاء ذلك اليوم، وإنْ ذرعه من غير أن يتقيَّأ، فليتم صومه. [87]

۱...... حلبی سے روایت ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا: اگر روزے دار عمداً قے کرے تو وہ اس دن کے روزے کی قضاء کرے گا لیکن اگر خود بخود قے آجائے تو روزے کو مکمل کرے گا (قضاء واجب نہ ہوگی)۔

٢ ــ محمد بن يعقوب عنه ــ علي بن ابراهيم ــ عن أبيه، عن القاسم بن محمد الجوهري، عن سليمان بن داود، عن سفيان بن عيينة، عن الزهري، عن علي بن الحسين(ع) (في حديث) قال: وأما صوم الإباحة لمن ــ فمن ــ أكل أوشرب ناسياً، أوتقيَّأ من غير تعمد، فقد أباح الله له ذلك وأجزأ عنه صومه. [88] أقول: وهذا الحديث ينفع في الباب الآتي.

۲........ زہری روایت کرتے ہیں کہ امام زین العابدینؑ نے فرمایا: اگر کوئی شخص بھولے سے کھا پی لے۔ یا غیر اختیاری طور پر قے کرے تو خداوند عالم نے اس کے اس عمل کو مباح قرار دیا ہے، اس کا روزہ صحیح ہوگا۔

٣ ــ محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد، جميعاً عن ابن أبي عمير، عن حماد، عن الحلبي، عن أبي عبدالله (ع) قال: إذا تقيّأ الصائم، فقد أفطر، وإنْ ذرعه من غير أنْ يتقيأ فليتم صومه.[٨٩] أقول: وجه دلالته على عدم القضاء دلالة المقابلة على المغايرة، بأنْ كان المنظور اليه كون التقيؤ في شهر رمضان، فالمراد بإفطار المتقيىء هوالحكمي، بمعنى لزوم قضائه، فالمقابل له لايلزمه القضاء، وإنْ كان المنظور اليه كون التقيؤ في غير شهر رمضان، فالمراد بالإفطار الحقيقي، فمقابله عدم الإفطار الحقيقي، ومعناه صحة الصوم. وبالجملة دلالة (ليتمّ صومه) على عدم القضاء لاريب فيها، إذ لامعنى للأمر باتمام الصوم في غير رمضان، مع كون المتقيىء مفطراً.

٣۔ .... حلبی امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا: اگر روزہ دار نے عمداً قے کیا تو اس نے اپنا روزہ باطل کر لیا لیکن اگر بے اختیار قے غالب آ جائے تو اپنے روزے کو مکمل کرے۔

٤ ــ وبإسناده ــ محمد بن الحسن ــ عن الحسين بن سعيد، عن حماد، عن عبدالله بن ميمون، عن أبي عبدالله، عن أبيه (ع) قال: ثلاثة لايُفطِرْنَ الصائم: القيء، والإحتلام، والحجامة... (الحديث).[٩٠]

٤ .... عبد اللہ بن میمون کا بیان ہے کہ امام صادقؑ نے اپنے والد گرامی سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: "تین چیزیں روزے کو باطل نہیں کرتیں: قے، احتلام، فصد...

روایات اہل سنت:

١ ــ وأخبرنا أبو عبدالله الحافظ وأبو الحسن السبعي وأبونصر منصور بن الحسين العنزي، قالوا: حدثنا أبوالعباس محمد بن يعقوب، حدثنا الربيع بن سليمان، حدثنا عبدالله بن وهب، حدثني عيسى ابن يونس، عن (ح وأخبرنا) أبو طاهر الفقيه، أنبأ أبو بكر القطان، حدثنا

محمد بن يزيد السلمي، حدثنا شداد بن حكيم، حدثنا عيسى بن يونس (ح وأخبرنا) أبوالخير جامع بن أحمد المحمد آباذي، حدثنا أبوطاهر محمد بن الحسن المحمد آباذي، حدثنا عثمان بن سعيد، حدثنا مسدد، حدثنا عيسى بن يونس، حدثنا هشام بن حسان، عن محمد بن سيرين، عن أبيٰ هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من ذرعه القيء وهو صائم، فليس عليه قضاء، وإن استقاء، فليقض. ورواه الترمذي، عن علي بن حجر، عن عيسى بن يونس مثله.[91] وأخرجه ابن ماجة، عن عبيدالله بن عبدالكريم، عن الحكم بن موسى، عن عيسى بن يونس مثله. وأيضاً عن عبيدالله، عن علي بن الحسن بن سليمان، عن حفص بن غياث، عن هشام مثله،[92] وأخرجه الحاكم، عن أبي العباس، عن ابراهيم بن أبي داود، عن أبي سعيد يحيى بن سليمان، عن حفص مثل ابن ماجة وباسنادين، عن علي بن حجر، مثل الترمذي.[93]

۱۔ . . . . ابوہریرہ کی روایت ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: اگر کسی شخص کو حالت روزہ میں خود بخود قے آجائے تو اس پر روزے کی قضا واجب نہیں ہے۔ لیکن اگر عمداً قے کرے تو قضا واجب ہوگی۔ . . . .

۲ ــ أخبرناه أبومحمد عبدالله بن يوسف الاصبهاني، أنبأ أبوسعيد ابن الأعرابي، حدثنا سعدان ابن نصر، حدثنا أبومعاوية، عن حجاج، عن أبي اسحاق، عن الحارث، عن علي رضي الله عنه، قال: إذا أكل الرجل ناسياً وهو صائم فإنما هو رزق رزقه الله إياه، وإذا تقيَّأ وهو صائم فعليه القضاء، وإذا ذرعه القيء فليس عليه القضاء.[94] وروى أبوداود نحوه عن مسدد، عن عيسى بن يونس، عن هشام، عن ابن سيرين، عن أبي هريرة.[95] أقول: وهذا الحديث ينفع في الباب الآتي.

۲۔ . . . . . . حارث کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: اگر کوئی شخص حالت روزہ میں بھولے سے کچھ کھالے تو یہ خدا کا عطا کیا ہوا رزق ہے اور اگر حالت روزہ میں عمداً قے کرے تو اس پر قضا

واجب ہے لیکن اگر خود بخود قے آجائے تو قضا واجب نہیں ....

۳ ــ أخبرناه أبوعلي الروذباري، أنبأ محمد بن بكر، حدثنا أبو داود، حدثنا محمد بن كثير، حدثنا سفيان، عن زيد بن أسلم، عن رجل من أصحابه، عن رجل من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لايفطر من قاء، ولامن آحتلم، ولا من آحتجم. وقد رواه عبدالرحمن بن زيد بن أسلم، عن أبيه، عن عطاء ابن يسار، عن أبي سعيد الخدري، إنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: ثلاثة لايفطرن الصائم: القيء، والإحتلام، والحجامة.[۹۶]

۳۔ .... ایک صحابی کا بیان ہے کہ پیغمبر خداؐ نے فرمایا: قے کرنے، محتلم ہوتے اور فصد کھلوانے سے روزہ باطل نہیں ہوتا .... ابوسعید خدری کہتے ہیں پیغمبر خداؐ کا ارشاد ہے: تین چیزوں سے روزہ باطل نہیں ہوتا: قے، احتلام، فصد۔

سہواً کھانے پینے سے روزہ باطل نہیں ہوتا

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ محمد بن علي بن الحسين بإسناده، عن الحلبي، عن أبي عبدالله(ع) أنه سُئِلَ عن رجل نسي فأكل وشرب ثم ذكر، قال: لايفطر، إنما هو شيء رزقه الله، فليتم صومه.[۹۷] ورواه في الكافي، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد، جميعاً عن أبي عمير، عن حماد، عن الحلبي مثله.[۹۸]

۱۔ ..... حلبی کہتے ہیں امام صادقؑ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس نے بھولے سے کھا پی لیا بعد میں اسے یاد آیا (کہ وہ روزے سے ہے) حضرتؑ نے فرمایا:

روزہ باطل نہ ہوگا، یہ خدا کا عطا کردہ رزق ہے، اسے چاہئے کہ اپنے روزے کو مکمل کرے...

۲ ــ محمد بن يعقوب، عن عدة من أصحابنا، عن سهل بن زياد، عن أحمد بن أبي نصر، عن داود بن سرحان، عن أبي عبدالله (ع) في الرجل ينسى ويأكل في شهر رمضان، قال: يتم صومه، فإنما هو شيء أطعمه الله إياه.[٩٩]

وينفع في الباب حديث الزهري عن السجاد(ع)... فراجع عبارة الحديث التي ذكرناها في باب: من ذرعه القيء.

۲۔ . . . . . . داؤد بن سرحان کہتے ہیں کہ امام صادقؑ نے ایک شخص کے بارے میں جس نے ماہ رمضان میں بھولے سے کھا پی لیا تھا فرمایا: اپنے روزہ کو مکمل کرے گا کیوں کہ وہ خدا کا دیا ہوا کھانا ہے۔

اس سلسلے میں باب قے میں بیان ہونے والی زہری کی روایت سے بھی اس سلسلہ میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

روایات اہل سنت:

١ ــ أخبرنا أبو احمد عبدالله بن محمد بن الحسن المهرجاني وأبو نصر أحمد بن علي بن أحمد الفامي، قالا: حدثنا أبو عبدالله محمد بن يعقوب الشيباني، حدثنا ابراهيم بن عبدالله، أنبأ عبدالله بن بكر السهمي، حدثنا هشام، عن محمد بن سيرين، عن أبي هريرة قال: قال رسول الله(ص): إذا نسي أحدكم فأكل أوشرب وهو صائم، فليتم صومه، فإنما أطعمه الله وسقاه.[١٠٠] وروى الترمذي نحوه، عن أبي سعيد الأشج، عن أبي خالد الأحمر، عن حجاج بن أرطأة، عن قتادة، عن ابن سيرين.[١٠١] ورواه مسلم، عن عمرو بن محمد الناقد، عن اسماعيل بن ابراهيم، عن هشام مثله.[١٠٢] وأخرجه البخاري، عن عبدان، عن يزيد بن زريع، عن هشيم مثله.[١٠٣] ونقل الهيثمي نحوه، عن أبي هريرة، نقلا عن الطبراني في الأوسط، وعن الحسن أنه بلغه عن رسول الله

نحوه.[104] وروى الدارقطني نحوه بأسانيد متعددة.[105] وأخرج الدارمي نحوه، عن عثمان بن محمد، عن جرير، عن هشام، وأيضاً عن أبي جعفر محمد بن مهران، عن حاتم بن اسماعيل، عن الحارث بن عبدالرحمن، عن عمه، عن أبي هريرة.[106]

۱۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابوہریرہ سے روایت ہے کہ پیغمبر خداؐ نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی حالت روزہ میں بھولے سے کھا پی لے تو اسے چاہئے کہ اپنے روزہ کو پورا کرے کیونکہ اسے خدا نے کھلایا پلایا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

٢ ــ أخبرنا أبوالقاسم عبدالخالق بن علي بن عبدالخالق المؤذن، أنبأ أبوأحمد محمد بن جعفر الكرابيسي، حدثنا الحسين بن الفضل البجلي، حدثنا هوذة بن خليفة، حدثنا عوف، عن خلاس ومحمد، عن أبي هريرة، عن النبي (ص) قال: إذا صام أحدكم يوماً ونسي فأكل وشرب، فليتم صومه، فإنما أطعمه الله وسقاه.[107] وأخرجه ابن ماجة، عن أبي بكر بن أبي شيبة، عن أبي أسامة، عن عوف، عن خلاس ومحمد بن سيرين مثله.[108]

۲۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابوہریرہ راوی ہیں کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی کسی دن روزہ رکھے اور بھول کر کھا پی لے تو اسے چاہئے کہ اپنے روزے کو پورا کرے کیونکہ اسے خدا نے کھلایا پلایا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

روزے دار کے لئے سر پر پانی ڈالنا جائز ہے

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ وعنه ــ محمد بن يعقوب ــ عن محمد بن الحسين، عن

علي بن الحكم، عن العلاء بن رزين، عن محمد بن مسلم، عن أبي جعفر(ع): الصائم يستنقع في الماء ويصب على رأسه... (الحديث). ورواه الشيخ بإسناده، عن علي بن الحسن، عن فضالة، عن علي بن أسباط، عن العلاء. وبإسناده، عن محمد بن يعقوب مثله.[۱۰۹]

۱۔ .... محمد بن مسلم امام محمد باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ: روزے دار پانی میں داخل ہو سکتا ہے اور اپنے سر پر پانی ڈال سکتا ہے ....

روایت اہل سنت:

۱ ـ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ، أنبأ أبو بكر بن أبي نصر المروزي، حدثنا أحمد بن محمد بن عيسى، حدثنا القعنبي فيما قرأ على مالك، عن سمي مولى أبي بكر، عن أبي بكر بن عبدالرحمن، عن بعض أصحاب النبي(ص) (وروى حديثاً الى أن قال) قال أبو بكر بن عبدالرحمن: وقال الذي حدثني لقد رأيت رسول الله(ص) بالعرج، يصب على رأسه الماء وهو صائم من العطش (أوقال من الحر).[۱۱۰] ورواه أبو داود، عن عبيدالله بن مسلمة القعنبي.[۱۱۱] ورواه عبدالرزاق، عن ابن جريج، أخبرت عن أبي بكر.[۱۱۲]

۱۔ .... ابوبکر بن عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ ایک شخص نے مجھ سے کہا: میں نے پیغمبرؐ کو دیکھا کہ آپ حالت روزہ میں پیاس (یا گرمی کی شدت) سے اپنے سر پر پانی ڈال رہے تھے...

روزہ دار کے لئے ہانڈی چکھنا جائز ہے۔

روایت اہل بیتؑ:

۱ ـ محمد بن يعقوب، عن الحسين بن محمد، عن معلى بن محمد، عن الحسن بن علي الوشا، عن أبان بن عثمان، عن الحسين بن زياد، عن

أبي عبدالله (ع) قال: لابأس للطباخ والطباخة أن يذوق المرق وهو صائم.[113] وروى الشيخ (ره) نحوه بإسناده عن الحسين بن سعيد، عن الحسن بن علي بن فضال، عن عبدالله بن بكير، عن محمد بن مسلم. وعن الحسين بن سعيد، عن ابن أبي عمير، عن حماد، وبهذا السند عن حماد، عن الحلبي.[114]

۱۔ . . . . . . حسین بن زیاد کہتے ہیں کہ امام صادقؑ نے فرمایا: باورچی اور باورچن کے لیے حالت روزہ میں شوربا چکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں . . . .

روایت اہل سنّت:

۱ ــ أخبرنا الفقيه أبوالفتح العمري، أنبأ عبدالرحمن الشريحي، أنبأ أبوالقاسم البغوي، حدثنا علي بن الجعد، حدثنا شريك، عن سليمان، عن عكرمة، عن ابن عباس، قال: لابأس أنْ يتطاعم الصائم بالشيء ــ يعني المرقة ونحوها ــ[115] أقول: ولم أجد في الباب حديثاً عن النبي (ص).

۱۔ . . . . . . عکرمہ راوی ہیں کہ ابن عباس نے کہا: روزہ دار کے لئے شوربا وغیرہ چکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اقول: اس سلسلہ میں پیغمبرؐ کی کوئی حدیث نہ مل سکی۔

احتلام سے روزہ باطل نہیں ہوتا۔

روایت اہل بیتؑ:

۱ ــ وعنه ــ محمد بن الحسن ــ عن حماد بن عيسى، عن عبدالله بن ميمون، عن أبي عبدالله عن أبيه (ع) قال: ثلاثة لايُفطِرْنَ

الصائم: القيء، والإحتلام، والحجامة... (الحديث).[116]

۱۔ . . . . امام صادقؑ اپنے والد بزرگوار امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت فرماتے ہیں: تین چیزوں سے روزہ باطل نہیں ہوسکتا؛ قے؛ احتلام، فصد . . . . .

روایت اہل سنّت؛

۱ ــ أخبرنا أبو محمد جناح بن نذير بن جناح القاضي بالكوفة، أنبأ أبو جعفر محمد بن علي بن دحيم، حدثنا أحمد بن حازم بن أبي غرزة، حدثنا يحيى (هو الحماني)، حدثنا عبد الرحمن بن زيد بن اسلم، عن أبيه، عن عطاء، عن أبي سعيد، قال: قال رسول الله (ص): لا يفطر من قاءَ، ولا من آحتجم، ولا من آحتلم.[117] ●

۱۔ . . . . ابوسعید راوی ہیں کہ پیغمبرؐ خدا نے فرمایا: قے کرنے والے فصد کھلوانے والے اور محتلم ہونے والے کا روزہ باطل نہیں ہوتا۔

حواشی

۷۲ ــ الوسائل (ج ۷، ص ٦٨) والكافي (ج ٤، ص ١٠٤).

۷۲ ــ الوسائل (ج ۷، ص ٦٨) والكافي (ج ٤، ص ١٠٤).

۷۳ ــ نفس المصدر السابق.

۷۴ ــ البیهق (ج ٤، ص ۲۲۹).
۷۵ ــ الترمذي (ج ۳، ص ۱۰۷).
۷۶ ــ مسلم (ج ۳، ص ۱۳٤، ۱۳٥ و۱۳٦).
۷۷ ــ مصنّف عبدالرزاق (ج ٤، ص ۱۸۸ و۱۸۹ و۱۹۰) والبخاري (ج ۳، ص۷۸) وابن ماجة (ج ۱، ص۵۳۷ و ص۵۳۸) وأبو داود (ج ۲، ص ۳۱۱).
۷۸ ــ موطأ مالك بشرح تنوير الحوالك (ج ۱، ص۲۷۳ و ۲۷٤).
۷۹ ــ الدارقطني (ج ۲، ص ۱۸۰ و۱۸۱).
۸۰ ــ منحة المعبود (ج ۱، ص ۱۸۷).
۸۱ ــ الدارمي (ج ۲، ص ۱۲).
۸۲ ــ البيهقي (ج ٤، ص ۲۳۲). ونقله عن يحيى بن زكريا، عن اسرائيل، عن أبي العنبس، عن الأغر، عن أبي هريرة، عن النبي(ص) مثله (نفس المصدر).
۸۳ ــ البيهقي (ج ٤، ص ۲۳۱) وأبوداود (ج ۲، ص ۳۱۲).
۸٤ ــ الوسائل (ج ۷، ص ۷۲).
۸٥ ــ الوسائل (ج ۷، ص ۷۲). والظاهر أن الضمير يرجع الى محمد بن الحسن.
۸٦ ــ أبوداود (ج ۲، ص ۳۱۱).
۸۷ ــ الوسائل (ج ۷، ص ٦۱).
۸۸ ــ الوسائل (ج ۷ ص، ٦۱، و۳۳).
۸۹ ــ الوسائل (ج ۷، ص ٦۰). الكافي (ج ٤، ص ۱۰۸). وروى نحوه بسند آخر عن محمد بن اسماعيل، عن الفضل بن شاذان وأبو علي الأشعري، عن محمد بن عبدالجبار، جميعاً عن صفوان، عن ابن مسكان، عن الحلبي، عن الصادق (ع) وفيه: (إذا تقيأ الصائم، فعليه قضاء ذلك اليوم مثله).
۹۰ ــ الوسائل (ج ۷، ص ٦۲). وذكر الحديث بتمامه ص٥٦. راجع رؤية الحجامة.
۹۱ ــ البيهقي (ج ٤، ص ۲۱۹) والترمذي (ج ۳، ص ۹۸) وراجع الدارقطني (ج ۲، ص ۱۸٤ و ۱۸٥).

٩٢ ــ إبن ماجة (ج ١، ص ٥٣٦)، وليس فيه: (وهو صائم) وفيه (من آستقاء) بدل (ان استقاء).
٩٣ ــ المستدرك (ج ١، ص ٤٢٦).
٩٤ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢١٩).
٩٥ ــ أبوداود (ج ٢، ص ٣١٠).
٩٦ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٢٠) ورواه الترمذي كما ذكرناه في رواية الحجامة (راجع رواية الحجامة).
٩٧ و٩٨ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٣٣) ونقله في الوسائل عن الكافي بسنده مثله. وفي الكافي (ج ٤، ص ١٠١).
٩٩ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٣٣). الكافي (ج ٤، ص ١٠١).
١٠٠ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٢٩).
١٠١ ــ الترمذي (ج ٣، ص ١٠٠).
١٠٢ ــ مسلم (ج ٢، ص ١٦٠).
١٠٣ ــ البخاري (ج ٣، ص ١٥٧).
١٠٤ ــ مجمع الزوائد (ج ٣، ص ١٥٧).
١٠٥ ــ الدارقطني (ج ٢، ص ١٧٨ و١٧٩ و١٨٠).
١٠٦ ــ الدارمي (ج ٢، ص ١٣).
١٠٧ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٢٩).
١٠٨ ــ إبن ماجة (ج ١، ص ٥٣٥).
١٠٩ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٢٢) والكافي (ج ٤، ص ١٠٩).
١١٠ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٦٣).
١١١ ــ أبوداود (ج ٢، ص ٣٠٧).
١١٢ ــ مصنّف عبدالرزاق (ج ٤، ص ٢٠٦)، وليس فيه من العطش أوالحر.
١١٣ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٧٥) والكافي (ج ٤، ص ١١٤). وروى نحوه عن علي‌بن ابراهيم عن أبيه. عن ابن أبي عمير كالشيخ.

١١٤ ــ الإستبصار (ج ٢، ص ٩٥).
١١٥ ــ البيهق (ج ٤، ص ٢٦١).
١١٦ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٥٦). راجع مارويناه في باب الحجامة وباب عدم جواز القيء عمداً.
١١٧ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٦٤). وراجع في مدارك هذا الحديث مارويناه في باب الإحتجام ومارويناه في باب عدم جواز القيء عمداً.

جناب ڈاکٹر مصطفیٰ اولیائی
ترجمہ: جناب سید حسین مہدی حسینی

علم حدیث کا ارتقاء

حدیث کے لغوی معنی ہے تازہ، جدید اور نئے کے ہیں لیکن اصطلاح میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و احوال اور کردار ہی کو حدیث کہا جاتا ہے۔ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ اگر عالم خواب میں بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی چیز سنی جائے تو اسے بھی حدیث کہا جا سکتا ہے۔

بعض مواقع پر اہل حدیث کی تحریروں سے لفظ "حدیث" اور "سنت" مترادف لفظیں معلوم ہوتی ہیں جبکہ صاحب تلویح دونوں کے درمیان فرق کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

"سنت کا دائرہ بہ نسبت "حدیث" کے وسیع ہے۔ سنت سے مراد غیر از قرآن ہر وہ چیز جو پیغمبر اسلامؐ سے صادر ہو خواہ آنحضرتؐ کے ارشاد ہوں یا احوال و کردار۔ جبکہ حدیث سے مراد صرف اقوال ہیں۔[1]

چونکہ اکثر اہل سنت قرآن کریم کی قدامت کے قائل ہیں لہٰذا قرآن کے علاوہ ہر وہ چیز جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صادر ہوئی ہے اسے "حدیث" کہتے ہیں۔[2]

بعض کا خیال ہے:۔

صحابہ و تابعین (اصحاب کے اصحاب) کے اقوال کو بھی حدیث کہا جا سکتا ہے۔[3] فرقہ شیعہ کے نزدیک علم حدیث وہ علم ہے جس کے ذریعہ پیغمبرؐ و امامؑ کے اقوال و احوال و کردار کی معرفت حاصل ہو سکے۔[4]

اس جگہ مناسب ہوگا لفظ "سنت" "روایت" اور "خبر" کی مختصر تعریف کرتا چلوں تاکہ آئندہ کے مباحث کے سمجھنے میں مدد مل سکے۔

سنّت :"سنن" سے مشتق ہے۔ سنن کے معنی طریقہ کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سنّت قرآن کے مقابلہ میں ہے اور اس سے مراد معصومؑ کے اقوال، احوال اور کردار ہیں — علم حدیث کی اصطلاح میں سنّت حدیث سے اعم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنّت کی بعض اہم کتابوں میں جیسے سنن بیہقی و ابن ماجہ وغیرہ حدیث کے معنی میں استعمال ہوئی ہیں اور سنّت سے مراد حدیث لی گئی ہے۔

حدیث و خبر :-

علماء اہل حدیث نے خبر و حدیث کے درمیان فرق میں بھی اختلاف کیا ہے۔

بعض کا خیال ہے —

حدیث و خبر دونوں مترادف ہیں۔

کچھ کہتے ہیں۔

خبر کا دائرہ بہ نسبت حدیث کے وسیع ہے کیونکہ خبر کا اطلاق پیغمبر و غیر پیغمبر دونوں کے کلام پر ہوتا ہے لیکن حدیث صرف پیغمبر سے مخصوص ہے[۶]۔

جیسا کہ ابھی تحریر کر چکا ہوں کہ کچھ لوگ قولِ صحابہ و تابعین کو بھی حدیث تسلیم کرتے ہیں۔ اسی لئے بعض کا خیال ہے کہ غیر پیغمبر کے کلام کو بھی حدیث کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے دونوں کے درمیان عام خاص مطلق کی نسبت پائی جاتی ہے یعنی ہر حدیث کو خبر کہا جا سکتا ہے لیکن ہر خبر کو حدیث نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ قول بھی پہلے ہی قول کے مانند ہے۔

بعض کا خیال ہے۔ حدیث و خبر دونوں مترادف لفظیں ہیں[۷]۔

روایت :-

روایت کو حدیث کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ صاحب مجمع البحرین نے اس کی تعریف یوں کی ہے۔

روایت اصطلاح میں اس خبر کو کہتے ہیں جس کا سلسلۂ نقل، معصومؑ پر منتہی ہو[۸]۔

اثر :

جناب شیخ بہائی نے "نہایہ" میں اثر و حدیث کو مترادف تسلیم کیا ہے۔ کچھ نے اثر کو حدیث سے اعم مانا ہے اور ایک گروہ اثر اس کو کہتا ہے جسے صرف صحابہ سے نقل کیا گیا ہو[۹]۔

حدیث قدسی :

حدیث قدسی سے مراد وہ کلام الٰہی ہے جو بہ عنوان معجزہ نازل نہ ہوا ہو ۔ اس کے برخلاف قرآن کا اس کا نزول بہ عنوان معجزہ ہوا ہے۔ جناب سید شریف جرجانی فرماتے ہیں :

حدیث قدسی مفہوم و معنی کے اعتبار سے تو کلام خدا ہے لیکن مرسل اعظمؐ نے ان معانی و مفاہیم کو اپنے الفاظ کے قالب میں پیش کیا ہے ۔ حدیث قدسی کے معانی و مفاہیم کو پروردگار عالم نے بذریعہ الہام یا بذریعہ خواب پیغمبر کو تعلیم دیا ۔ پیغمبرؐ اسلام نے اپنے لفظوں میں اسے بیان فرمایا ۔ برخلاف قرآن کہ اس کی لفظیں بعینہ پیغمبر پر نازل ہوئیں ۔ قرآن و حدیث قدسی کے درمیان کچھ فرق قائم کئے گئے ہیں ۔

ا: قرآن معجزہ ہے اور حدیث قدسی کے لیے ضروری نہیں کہ معجزہ ہو ۔

ب: نماز میں قرآن کی سوروں کا پڑھنا واجب ہے حدیث قدسی واجب نہیں ۔

ج: قرآن کا منکر کافر ہے لیکن حدیث قدسی کا منکر کافر نہیں ہوتا ۔

د: نزول قرآن کے لیے جبرئیل کو وسیلہ تسلیم کیا گیا ہے لیکن حدیث قدسی میں ایسا نہیں ۔

س: قرآن کے الفاظ کا خدا کی طرف سے ہونا ضروری ہے ۔ حدیث قدسی کے لیے یہ ضروری نہیں ۔

س: قرآن کو مس کرنے کے لیے طہارت شرط ہے لیکن حدیث قدسی کے لیے ایسا ضروری نہیں[۵]

علم حدیث :

پیغمبر اسلام نے بعثت سے وفات تک کے تیئس[۲۳] سالہ دور اقتدار و رہبری میں جب کسی آیت کے معنی و مفہوم کی توجیہ و تفسیر مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھی بیان فرمادی ، یا اگر مسلمانوں کے لئے کوئی رُخ غیر واضح تھا تو ان کے سوال پر انہیں سمجھا دیا ۔

فطری طور سے اسلام کے عروج و کمال کے ساتھ ساتھ سوالات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا رہا ، یہاں تک کہ یہ سوالات معاشرہ کے سبھی اخلاقی ، اجتماعی اور شہری مسائل پر محیط ہو گئے ۔

اسلام نے جس معاشرہ کی داغ بیل ڈالی تھی وہ اپنی جاذب تعلیمات کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا ۔

زمانہ پیغمبر میں جن جن کو آنحضرت کی بارگاہ نور میں حاضری کی سعادت حاصل ہوتی ، زندگی کے

مختلف شعبوں سے متعلق سوالات کرتا رہتا ۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک مرکز انوار الٰہی ان کے درمیان باقی رہا لیکن جس وقت آنحضرت کی شمع حیات خاموش ہوئی، اس وقت مسلمانوں کو احساس ہوا کہ اگر پیغمبر کے ارشادات جمع نہ ہوتے تو آئندہ نسلوں کو بے حد مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لہٰذا نسل آئندہ کی حفاظت کا تصوّر کرکے زمانہ ابوبکر ہی سے مسلمانوں نے تدوین حدیث کی ضرورت محسوس کرلی ۔ لیکن علیؑ کی دوررس نگاہوں نے اس ضرورت کو عہد ختمی مرتبتؐ میں ہی محسوس کرلیا تھا، لہٰذا متعدد بار ایسا ہوا کہ جب پیغمبرؐ ارشاد فرماکر خاموش ہوجاتے تو امیرالمومنینؑ اسی بزم میں ارشاد پیغمبر اسلامؐ کو قلمبند فرمالیتے یا اگر کبھی کوئی چیز املاء فرماتے تو حضرت امیرالمومنینؑ اسے من و عن ضبط فرمالیتے تھے میری اس تحریر کی شہادت مختلف کتابوں سے ملتی ہے۔

صاحب تاسیس الشیعہ (ص۲۰۹) لکھتے ہیں: —

بلاشبہ خلفاء مرسل اعظم کے دور میں شیعہ فرقہ وہ پہلا فرقہ ہے جو اخبار و آثار کی جمع آوری میں دوسروں پر سبقت لے گیا۔ اس فرقہ نے اپنے امام حضرت امیرالمومنینؑ کی اقتدا و پیروی کی کیونکہ پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ ہی سے امیرالمومنینؑ حدیث کی تالیف و تصنیف میں مشغول تھے۔

شیخ ابوالعباس نجاشی — محمد بن غذافر کے حالات میں لکھتے ہیں: ۔

میں حکیم ابن عینیہ کے ہمراہ حضرت امام محمد باقرؑ کی خدمت میں باریاب ہوا — حکیم نے حضرت سے سوال کیا — لیکن کسی وجہ سے حضرتؑ حکیم سے کبیدہ خاطر تھے لہٰذا جواب سے تامل فرمایا — پھر میں نے دیکھا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنے فرزند کی طرف رخ کرتے ہوئے فرمایا — "کتاب علیؑ" تو لانا —

بڑی تختی پر لکھی ہوئی کتاب حضرت کے سامنے پیش کی گئی حضرت نے اس کتاب سے سائل کے جواب کو نکالتے ہوئے فرمایا — "یہ کتاب امیرالمومنینؑ کی تحریر اور رسول اللہؐ کا املاء ہے۔"

اس واقعہ کو لفظ بہ لفظ نجاشی نے بھی لکھا ہے میں نے اس کی تحقیق و تعلیق کی ہے۔ نجاشی و تاسیس الشیعہ کے علاوہ بھی دوسری کتابوں سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ حدیثیں زمانہ پیغمبر اسلام میں بھی تدوین ہو چکی تھیں۔

دوسرا ثبوت جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیعہ اوروں سے تدوین حدیث میں مقدم ہیں۔ حدیث جناب ام الائمہؑ ہے ۔ شہزادئی فرماتی ہیں:۔

ایک دن وہ حدیثیں جسے امیر المومنینؑ نے قلمبند کیا تھا غائب ہوگئیں۔ حضرتؑ نے اپنے خدمت گذاروں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا ۔ اسے تلاش کرو! میرے نزدیک حسنینؑ سے اس کی قدر و قیمت کم نہیں[۱۲]۔"

حضرات اہل سنت کے درمیان تدوین حدیث کا سلسلہ پیغمبر اسلامؐ کی وفات، اور وہ بھی مدتوں کی بحث و اختلاف کے بعد شروع ہوا۔

حضرت عائشہ کا بیان ہے:۔

میرے والد ابوبکر نے پیغمبر کی پانچ سو حدیثیں جمع کر کے جلا دیا[۱۳]۔

خلیفہ دوم کے لیے بھی روایتیں ملتی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ لوگوں کو جمع حدیث سے روکا کرتے تھے[۱۴]۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فرقہ اہل سنت کے درمیان تدوین حدیث کا سلسلہ دوسری صدی ہجری کی ابتداء سے شروع ہوا۔ اور اس تدوین کی طرف بھی خلیفہ وقت عمر بن عبد العزیز نے متوجہ کیا[۱۵]۔ اکثریت کے بیان کے مطابق ۔ اہل سنت میں ابن جریح نے سب سے پہلے تدوین حدیث کی ذمہ داری قبول کی[۱۶]۔ اس کا تذکرہ بھی بے جا نہ ہوگا کہ خاندان رسالت کے ساتھ ساتھ خود ان کے شیعوں کو بھی تدوین حدیث کے سلسلہ میں حضرات اہل سنت پر تقدم حاصل رہا۔

آپ کے اہل بیتؑ کے بعد سب سے پہلی فرد جس نے اس میں حصہ لیا وہ "ابو رافع" ہیں[۱۷]۔ ابو رافع کے بعد شیعوں کی بہت بڑی جماعت تدوین حدیث میں مشغول رہی، ان میں سے کچھ ابو رافع کے معاصر تھے اور کچھ متاخر۔ کچھ کے اسماء یہ ہیں[۱۸]:

عبید اللہ ابن ابی رافع ۔ علی ابن ابی رافع ۔ سلمان فارسی ۔ ابوذر غفاری۔ اصبغ بن نباتہ وغیرہ

حضرت امیر المومنین علیہ السلام اور فاطمہ زہراؑ کے بعد حسب ذیل حضرات کو طبقہ اول میں احادیث شیعہ کا پیشوا تسلیم کیا جاتا ہے۔

ابو رافع ۔ سلمان فارسی ۔ میثم تمار ۔ اصبغ بن نباتہ ۔ مجاشعی کوفی ۔ عبید اللہ بن ابی رافع

حرث بن عبداللہ اعور ہمدانی۔ ربیعہ بن سمیع۔ سلیم بن قیس۔ علی بن ابی رافع۔ عبداللہ بن حر۔ محمد بن قیس بجلی یعلی بن مرہ۔ جابر بن عبداللہ انصاری۔

- دوسرے طبقہ میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے بعد یہ حضرات نمایاں حیثیت رکھتے ہیں:۔
  جابر بن یزید جعفی ــ زید بن علی۔ حسین بن ثور۔ زیاد بن المنذر
- تیسرے طبقہ میں :۔

یحیٰی بن قاسم۔ عبدالمؤمن۔ زرارہ بن اعین۔ محمد بن مسلم۔ بسّام صیرفی۔ ابوعبیدہ حذّاء زکریا بن عبداللہ۔ ثور بن قمامہ۔ مجد بن مغیرہ۔ محمد بن زائدہ حضرمی۔ معاویہ بن عمارہ۔ مطلب زہری۔ عبداللہ بن میمون۔

طبقہ چہارم ـــ میں راویان حدیث کی تعداد چار ہزار سے زاید تھی۔ ان میں سے کچھ عراقی وحجازی تھے اور کچھ شامی وخراسانی۔ اور ان سب کا سلسلہ روایت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام پر منتہی ہوتا ہے۔[19]

اہل سنت کے یہاں پیشوایان حدیث میں ان حضرات کا نام نمایاں ہے:۔

مکہ معظمہ میں ـــ ابن جریح۔

مدینہ منورہ میں ـــ ابن اسحاق و مالک۔

بصرہ میں ـــ ربیع بن صبیح، سعید بن ابی عروبہ اور حماد بن سلمہ۔

کوفہ میں ـــ سفیان ثوری۔

شام میں ـــ اوزاعی۔

واسط میں ـــ ہیثم۔

یمن میں ـــ معمر۔

ری میں ـــ جریر بن عبدالحمید۔

خراسان میں ـــ ابن مبارک۔[20]

علمائے اہلسنت کے درمیان اختلاف ہے کہ مذکورہ افراد میں سب سے پہلے کس نے تدوین حدیث کا کام شروع کیا۔ ابن حجر کے بیان کے مطابق ـــ ربیع بن صبیح متوفی سنہ ۱۶۰ھ ـــ اور ـــ سعید بن عروبہ متوفی

۱۵۶ھ میں۔ ان دونوں حضرات کے بعد مدینہ منورہ میں مالک اور مکہ معظمہ میں عبدالملک بن جریج اس طرف مشغول ہوئے[۲۱]۔ لیکن حاجی خلیفہ کہتے ہیں: عبدالملک بن جریج اور مالک بن انس نے حدیث کی تدوین کا کام سب سے پہلے شروع کیا اور سب سے پہلے جس نے احادیث کی ابواب بندی کی ہے وہ ربیع بن صبیح ہیں[۲۲]۔ خواہ ابن جریج ہوں جنھوں نے تدوین حدیث کی داغ بیل ڈالی یا ربیع بن صبیح یا کوئی اور مثلاً مالک یا سعید بن ابی عروبہ یہ سب کے سب دوسری ہجری میں پروان چڑھے لیکن شیعوں میں احادیث کی جمع آوری کا سلسلہ ان حضرات کے وجود سے تقریباً ایک صدی قبل شروع ہو چکا تھا۔

احادیث کی جمع آوری اور اس کی تدوین کے اسباب وعلل اور اس کی ضرورت کے سلسلہ میں مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے صدر اوّل ہی میں یعنی وفات مرسل اعظمؐ کے فوراً بعد ہی سے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ جس طرح انہیں احادیث کے مفہوم کو درک کرنے میں قدرے زحمت ہو رہی ہے آئندہ نسلوں کو بھی اس سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لہٰذا اصحاب مرسل اعظمؐ کی حیات تک تو قدرے اس مشکل کو برطرف کیا جاسکتا تھا کیونکہ یہی حضرات احادیث کے لیے منبع اولی کی حیثیت رکھتے تھے۔ مرسل اعظمؐ کے ارشادات واقوال کے لیے اصحاب آنحضرت کی باتیں بعد والوں کے لیے مشعل راہ ہوئیں اور پھر فطری و قہری طور سے "علم حدیث" کا دروازہ کھل گیا۔

اصحاب کے اصحاب (تابعین) جب کسی مسئلہ میں اصحاب کی طرف رجوع کرتے تو اسے دوسروں سے بھی نقل کرتے رفتہ رفتہ یہ انداز مسلمانوں کے لیے قرآن فہمی کا ذریعہ اور آیات الٰہیہ کی توجیہ و تفسیر کے انداز سے عوام میں رائج ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ تذکرہ کر چکا ہوں کہ شیعوں کو اس ضرورت کا احساس زمانۂ پیغمبر اسلامؐ میں ہو چکا تھا۔

جس وقت تدوین حدیث کی ضرورت محسوس کی گئی تو ایسا بھی اتفاق ہوا کہ اگر مہینوں کے دور دراز فاصلہ پر کوئی شخص ایسا تھا جس کے پاس کوئی حدیث تھی تو جناب جابرؓ جیسی فردوں نے اسے حاصل کرنے کے لیے اس دور دراز مقام کا سفر کیا اور حدیث کو حاصل کیا[۲۳]۔

وہ افراد جن سے مرسل اعظمؐ کی حدیثیں نقل ہوئی ہیں۔ بعض مورخین کی تحریر کے مطابق ایک لاکھ چودہ ہزار تک پہنچ چکے تھے[۲۴]۔ اگرچہ اس تعداد پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سے اہم ترین شخصیتیں جن سے روایت لی گئی ہے، درج ذیل ہیں:

علیؑ۔ عبداللہ بن مسعود۔ ابی بن کعب۔ سلمان فارسی۔ عمار یاسر۔ حذیفہ بن یمان۔ عبدالرحمٰن بن عوف انس بن مالک۔ ابوموسیٰ اشعری۔ عائشہ۔ عمر۔ ابوہریرہ۔ ابن عباس۔ عبادہ بن صامت۔ جابر بن عبداللہ انصاری اور ابوسعید خدری۔ اور تابعین (اصحاب کے اصحاب) میں شعبی۔ ابن مسیب اور ابن سیرین کا نام نمایاں ہے[25]۔

صاحب "التدریب الراوی" نے ان احادیث کی تعداد جو ہر صحابی سے کثرت کے ساتھ نقل ہوئی ہے اسے اس انداز سے پیش کیا ہے:۔

ابوہریرہ	پانچ ہزار تین سو چوہتر	(۵۳۷۴)	حدیثیں
عبداللہ بن عمر	دو ہزار چھ سو تیس	(۲۶۳۰)	//
انس بن مالک	دو ہزار دو سو چھیاسی	(۲۲۸۶)	//
عائشہ	دو ہزار دو سو آٹھ	(۲۲۰۸)	//
عبداللہ بن عباس	ایک ہزار چھ سو ساٹھ	(۱۶۶۰)	//
جابر بن عبداللہ انصاری	ایک ہزار پانچ سو چالیس	(۱۵۴۰)	//
ابوسعید خدری	ایک ہزار ایک سو ستر	(۱۱۷۰) (۲۶)	//

لیکن دیگر اصحاب میں ایسا کوئی صحابی نہیں جس سے ایک ہزار سے زاید روایت نقل ہوئی ہو۔ اس کے اسباب وعلل روشن ہیں، بنی امیہ کی سیاست اسے گوارہ نہیں کرسکتی تھی کہ حضرت امیرالمومنینؑ اور آپ کے اصحاب سے کافی حد تک نقل روایت کی جائے۔

اگرچہ یہ یقینی ہے کہ راویان حدیث میں سارے کے سارے قابل اعتماد و وثوق نہ تھے۔ انشاءاللہ تعالیٰ اس موضوع پر "علم درایت" میں روشنی ڈالوں گا۔ لیکن قبل اس کے کہ "علم درایت" کی تعریف اور اسکی ابتداء کا ذکر کروں مناسب ہے علم حدیث میں شیعہ سنی دونوں فرقوں کے نزدیک باعتبار زمانہ تدوین وتحریر میں جو پیش رفت وترقی ہوئی ہے، اس کا تذکرہ کرتا چلوں۔

حدیث شیعوں کی نظر میں:

اصول اربعمائۃ: اگرچہ پہلے اشارہ کرچکا ہوں کہ شیعوں کے نزدیک تدوین حدیث کا سلسلہ مرسل اعظمؐ

کے زمانہ میں ہی شروع ہو چکا تھا اور اس موضوع پر بزرگ علماء نے جو کتابیں تصنیف فرمائیں اسے "اصول" کے نام سے پکارا گیا۔ اس کا اعتراف بہرحال کرنا پڑے گا کہ یہ اصول فن تحریر کے لحاظ سے اپنے اندر بہت سی خامیاں رکھتے تھے کیونکہ اس وقت کے علماء کا مطمع نظر کتب نویسی نہ تھا بلکہ زیادہ تر توجہ حدیث کی جمع آوری پر تھی، زیادہ تر ان لوگوں کے بیانات کو احاطۂ تحریر میں لائے جنھوں نے حضرات ائمہ معصومینؑ خصوصاً امام محمد باقر و جعفر صادق علیہما السلام سے کچھ سنا تھا۔

احادیث کے یہ قلمی مسودے جسے ہمارے علماء اعلام یا ان کے شاگردوں نے تحریر کیا تھا اس کا نام ـــ اصول ـــ رکھا۔ ان مسودوں میں ہر وہ حدیث نقل کی گئی تھی جسے یا خود انہوں نے معصومؑ سے سنا تھا یا کسی نے حدیث معصوم کو ان سے نقل کیا تھا۔ مفکرین شیعہ نے ان سیکڑوں اصولوں میں سے جو زمانہ امیرالمومنینؑ سے امام حسن عسکری علیہ السلام تک لکھے گئے تھے صرف چار سو افراد کی چار سو املوں کو اہمیت دی اور انھیں "اصول چہار صدگانہ" کے نام سے موسوم کیا۔

ان "چار سو اصول" کی ہر ایک اصل کے ذیل میں مختلف موضوعات پر متعدد حدیثیں تحریر تھیں اور تنظیم و ترتیب سے محروم تھیں۔ ان مسودوں کا خلاصہ "محاسن برقی" "کافی" "من لا یحضر" اور "تہذیب" میں تحریر ہو چکا ہے۔ لیکن ان کتابوں میں لکھے جانے کے باوجود احادیث کا بڑا ذخیرہ ۴۴۸ھ میں "طغرل ترک" کے حملہ کے وقت جب اس نے کرخ بغداد میں شاپور کے کتب خانہ میں آگ لگائی تو جل کر ضائع ہو گیا، اور جو اس حادثہ سے بچ گیا وہ دوسرے حوادث زمانہ کی نذر ہوتا رہا لیکن جب زمانہ جناب ابن ادریس و ابن طاؤس آیا تو ان بزرگواروں نے جہاں تک ممکن ہو سکا حفاظت کی، آج بھی ان میں کا کچھ حصہ ہمارے درمیان باقی ہے۔ جو تقریباً دو سو کے قریب ہے۔ ان مسودوں کو "کتاب" یا "نوادر" کے نام سے بھی پکارا گیا ہے۔

تہران یونیورسٹی کے کتب خانہ میں نو سو باسٹھویں (۹۶۲) نسخہ پر نوادر کی ایک کتاب اور ان "اصول" کی بارہ کتابیں ملتی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

کتاب زید الزراد، کتاب عصفری، کتاب عاصم بن حمید حناط، کتاب زید نرسی، کتاب جعفر حضرمی، کتاب محمد حضرمی، کتاب عبد الملک بن حکیم، کتاب مثنی بن ولید حناط، کتاب حداد سندی، کتاب حسین بن عثمان کتاب کاہلی، کتاب سلام خراسانی، نوادر ابوالحسن علی اسباط بن سالم۔[۲۸]

کتب اربعہ: متأخرین علم حدیث نے ان اصول سے بہت سی کتابیں تدوین کیں ان میں سے

چار کتابوں کو بہت زیادہ شہرت و اہمیت حاصل ہے۔

(۱) کتاب الکافی: ۔ تالیف ابوجعفر محمد بن یعقوب کلینی رازی متوفی ۳۲۹ھ اس مجموعہ میں سولہ ہزار ننانوے حدیثیں حضرات ائمہ ہدیٰ سے بہ عنوان مسند ذکر ہوئی ہیں۔[۲۹]

(۲) کتاب من لایحضرہ الفقیہ: تالیف شیخ محترم صدوق الطائفہ ابوجعفر محمد بن علی بن بابویہ قمی متوفی ۳۸۱ھ اس مجموعہ میں نو ہزار چوالیس ۹۰۴۴ حدیثیں ذکر ہوئی ہیں۔[۳۰]

(۳) تہذیب: تالیف شیخ الطائفہ ابوجعفر محمد بن حسن طوسی متوفی ۴۶۰ھ۔ اس مجموعہ میں تیرہ ہزار پانچ سو نوے ۱۳۵۹۰ حدیثیں تحریر ہیں۔[۳۱]

(۴) استبصار: یہ کتاب بھی جناب شیخ الطائفہ طوسیؒ کی کاوش ہے۔ اس مجموعہ میں پانچ ہزار پانچ سو گیارہ ۵۵۱۱ حدیثیں درج ہیں، استبصار کی چار جلدیں ہیں۔

اس جگہ یہ ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ "اصول چہار صد گانہ" جناب شیخ محترم مرحوم ابوجعفر احمد بن محمد بن خالد برقی کی تالیف "محاسن" تک محدثین کے درمیان برابر نقل ہوتے رہے۔ لیکن جب کتاب محاسن منظر عام پر آئی تو اس نے تاریخ علم حدیث کا ایک نیا باب کھول دیا۔ کیونکہ یہی وہ دور تھا جس میں احادیث کے پراگندہ ذخیروں کو جمع کرنے کا کام شروع ہوا اور چوتھی و پانچویں صدی آتے آتے "کتب اربعہ" عظیم شاہکار بن کر سامنے آگئیں۔

تیسرا مرحلہ: کتب اربعہ کی تالیف کے بعد جو دور آیا اس میں محدثین ان کتابوں پر حواشی لگا رہے تھے یا پھر شرحیں تحریر کر رہے تھے یہی دو باتیں ان کی توجہ کا مرکز تھیں۔ مختلف افراد نے ان کتابوں کی متعدد شرحیں تحریر فرمائی ہیں۔ ان میں سے اکثر عام نگاہوں سے اوجھل کتاب خانوں کی زینت بن گئیں۔ اس کے باوجود اس وقت ایک سو بیس شرحیں اور حاشیے ہم تک پہنچے ہیں۔[۳۲]

بہر حال شرح نویسی کے زمانہ کو "حدیث شیعہ" کے لیے زمانہ فترت و سکوت و جمود سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ حدیث کو جس قدر ارتقائی منزلوں سے گذرنا چاہیئے تھا وہ نہ ہو سکا بلکہ ایک محدود دائرہ و محور میں گردش کر کے رہ گئی۔ یہ حالت سلاطین صفویہ کے ابتدائی دور تک باقی رہی، لیکن جس وقت مذہب شیعہ پورے ملک کے سرکاری مذہب کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا تو پھر "علم حدیث" میں زندگی پیدا ہوگئی۔

اہم علماء اور کتابیں : سلاطین صفویہ کے زمانہ میں مایۂ ناز محدثین پیدا ہوئے اور انہوں نے شیعوں کو غفلت و بے خبری کے ماحول سے نکال کر علم و آگہی کے دور میں پہنچا دیا ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ گیارھویں صدی کے اختتام اور بارھویں صدی کے آغاز میں "علم حدیث" پھر ارباب علم و دانش کی توجہ کا مرکز قرار پایا ۔ اسی زمانہ میں جبین دھر پر تین اہم شخصیتیں ستارہ درخشاں بنکر جگمگائیں جن کے اسم گرامی یہ ہیں :

محمد بن مرتضیٰ ملا محسن فیض کاشانی	متوفی	سنہ ۱۰۹۱ھ
محمد بن حسن حر عاملی	"	سنہ ۱۱۰۴ھ
ملا محمد باقر بن محمد تقی مجلسی	"	سنہ ۱۱۱۱ھ

ان میں سے ہر ایک نے علم حدیث میں بیش قیمت کتابیں تحریر فرمائی ہیں ۔ علم حدیث کے مختلف دور کا جائزہ لینے کے بعد اگر میں ان علماء اعلام کے عہد زرین کو" اہم علماء اور اہم کتابوں کا دور" کہوں تو بے جا نہ ہوگا ۔

۱ ۔ ملا محسن فیض مرحوم نے کتاب "وافی" تالیف کی ، یہ کتاب کتب اربعہ پر حاوی ہے ۔ اس مجموعہ حدیث میں مرحوم نے مکررات کو حذف بھی فرمایا ہے اور مشکل احادیث کی توجیہ بھی فرمائی ہے ۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے متین و عمدہ ہے ۔

۲ ۔ وسائل الشیعہ ، اس کے مؤلف مرحوم شیخ محمد بن حسن حر عاملی ہیں مرحوم نے اس کتاب کی تالیف میں حد درجہ محنت و جانفشانی سے کام لیا ہے ۔ یہ کتاب بھی کتب اربعہ پر حاوی ہے ۔ مؤلف مرحوم نے اس کی تالیف میں اور دوسری کتابوں سے بھی سہارا لیا ہے ۔

۳ ۔ بحار الانوار ــــ اسے شیعہ "دائرۃ المعارف" کہنا چاہئے ۔ یہ کتاب شیعہ و سنی احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ ہے ۔ بحار الانوار ، کی تالیف میں علامہ مجلسی نے جس قدر عرق ریزی سے کام لیا اس کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ناتمام ہے ۔ مرحوم مجلسی کو اگر موت نے دس سال کی مزید مہلت دیدی ہوتی تو وہ یقیناً ضعیف احادیث کو اس سے نکال دیے ہوتے ۔ اور پھر یہ بحار الانوار مروارید و مرجان کا موجزن سمندر اور سیم و زر کا بیش بہا مخزن قرار پاتی ۔ اب یہ ہمارا فریضہ ہے کہ احادیث کے بحر زخار سے تابناک حدیثوں کو نکال کر اس کمی کو پورا کر دیں جسے علامہ مجلسی نہ کر سکے ۔

حدیث کا ارتقائی و تحقیقی دور : ان علماء کی تالیفات کے بعد اس دور کا آغاز ہوا جس میں

"علم حدیث" کو نمایاں ترقی ملی۔ کیونکہ بعد کے علماء اعلام نے جناب علامہ مجلسی، حر عاملی اور مرحوم فیض کاشانی کے انداز کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسی روش پر مزید دقت نظر کے ساتھ تالیف و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا جن لوگوں نے اس راہ میں شہرت پائی، وہ مرحوم علامہ محمد حسین بن علامہ تقی اور محمد نوری مازندرانی طبرسی ہیں۔ کتاب "مستنبط المسائل" اور "مستدرک الوسائل" لکھ کر وسائل الشیعہ کے ابواب میں مزید اضافہ کر دیا۔ مرحوم طبرسی کی کتابیں مذہب شیعہ کا عظیم ذخیرہ ہیں ۱۳۱۹ھ میں اس کتاب کی تکمیل ہوئی ہے اور ایک سال بعد مرحوم طبرسی نجف اشرف میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ (تاسیس الشیعہ ص ۲۸۹)

حدیث اہل سنّت کی نظر میں :۔

آغاز تدوین: صاحب "کشف الظنون" لکھتے ہیں جب صحابہ کی بعد دیگری مرنے لگے تو تدوین حدیث کی ضرورت محسوس ہوئی جیسا کہ لکھ چکا ہوں سب سے پہلے ابن جریج نے حدیث میں کتاب تحریر کی۔[۳۲] اس کے بعد تقریباً ۱۷۹۲ حدیثوں پر مشتمل حدیث کا مجموعہ امام مالک نے تدوین کیا جس کا نام "موطاء امام مالک" رکھا گیا اور سب سے پہلے جس شخص نے ان احادیث کو ابواب کی شکل میں پیش کیا وہ ربیع بن صبیح بصراوی تھے

صحاح ستہ: احادیث کی جمع آوری کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا یہاں تک کہ۔ امام بخاری پھر ترمذی۔ ابو داؤد سجستانی اور نسائی نے اس راہ میں بہت کام کیے۔[۳۴]

امام مالک مدینہ منورہ کے عالم تھے انہوں نے اپنی کتاب موطاء میں احادیث کو فقہی ترتیب کے اعتبار سے جمع کیا ہے[۳۵]

امام احمد حنبل نے اپنی مسند میں ہر صحابی کی روایت کو علیٰحدہ علیٰحدہ تحریر کیا ہے[۳۶]۔ ان کے بعد جب بخاری کا زمانہ آیا تو انہوں نے حجازی، شامی اور عراقی حدیثوں کو الگ الگ باب میں درج کیا۔

مسلم نے مکرر احادیث کو حذف کر دیا اور جن حدیثوں کو تحریر بھی کیا ان کا انداز فقہی ابواب کی ترتیب کے اعتبار سے تھا مسلم کے بعد اسی زمین پر ابو داؤد، ترمذی اور نسائی نے بڑی دقت نظر کے ساتھ نمایاں کارنامے انجام دئے۔[۳۷]

جمع بین صحاح: دور تالیف کے گذر جانے کے بعد جو زمانہ آیا اس میں بڑی کتابوں کے خلاصہ تھوڑے

اپنے تصرفات کے ساتھ کئے جانے لگے۔ اس انداز کی طرف جن لوگوں نے قدم بڑھائے ان میں ــــ ابوعبداللہ محمد حمیدی، ابوبکر احمد بن محمد رقانی، ابومسعود ابراہیم بن محمد دمشقی، سرفہرست ہیں جنھوں نے بخاری و مسلم کی روایتوں کو یکجا کیا ـــ اس کے بعد ابوالحسن زرین بن معاویہ عبدری نے ترمذی و موطا، سنن ابی داود و نسائی، اور مسلم و بخاری کی حدیثوں کو یکجا کیا۔ ابوالحسن کے بعد ابن اثیر نے "اصول ستہ اور کتاب زرین" کی حدیثوں کو جمع کرنے کا کام شروع کیا، ابن اثیر کا انداز گذشتہ انداز سے زیادہ بہتر تھا۔

پھر سیوطی نے صحاح ستہ اور مسانید عشر کی حدیثوں کو یکجا کیا اور اس کا نام "جمع الجوامع" رکھا لیکن اس مجموعہ میں ضعیف حدیثیں بھی شامل تھیں۔[۲۸]

خلاصہ: ابتداء میں علماء کا مقصد صرف اور صرف احادیث کی جمع آوری تھا، کتاب نویسی پر ان کی کوئی توجہ نہ تھی۔ ہر شخص اپنی یادداشت کے لیے لکھ لیا کرتا تھا۔

مرحلہ دوم: اس دور میں کتاب نویسی کا رجحان پیدا ہوچکا تھا لیکن اس ارتقائی دور کے باوجود چند خامیاں تھیں، حدیثیں یکجا نہ تھیں ایک حدیث کو تلاش کرنے کے لیے پوری پوری کتاب کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔

مرحلہ سوم: یہ وہ زمانہ تھا جس میں ذخیرہ احادیث کے لیے (تبویب) باب بندی کی جانے لگی تھی ہر شخص علیحدہ علیحدہ انداز سے باب بندی کر رہا تھا۔

مرحلہ چہارم: اس دور میں مکرر حدیثیں حذف کی جانے لگیں اور اس طرح مطالعہ کرنے والوں کے لئے مزید سہولت پیدا ہوگئی۔

مرحلہ پنجم: پانچواں وہ دور تھا جب محدثین نے مختلف زاویہ نظر سے احادیث کو پرکھنا شروع کردیا۔ یعنی احادیث سے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات معلوم کرنے شروع کردیے۔ اس طرف بھی متوجہ ہوئے کہ کون سی حدیث الفاظ کے اعتبار سے غیر مانوس ہے[۲۹] ـــ اس قسم کے دوسرے موضوعات پر تفصیلی بحث آئندہ صفحات پر کروں گا ـــ

حواشی:-

۱؎ علم الحدیث۔ السنۃ قبل التدوین ص۱۶۔ لغت نامہ دھخدا جلد (ح) ص۳۹۸۔ التدریب الراوی ص۲۶ و ۵

۲ە التدریب الراوی۔

۳ە التدریب الراوی ص۶۔ کشف الظنون۔ لغت نامہ دھخدا جلد (ح) ص۳۹۱۔ منقول از "خلاصۃ الخلاصہ"۔

۴ە علم حدیث ص۹

۵ە نہایۃ الدرایہ ص۔ لیکن السنۃ قبل التدوین ص۱۶ میں سنت سے مراد صرف پیغمبرؐ کے اقوال، احوال اور کردار ہیں۔
لغت نامہ دھخدا جلد (ح)، ص۳۹۹

۶ە التدریب الراوی ص۶۔

۷ە التدریب الراوی ص۶۔ لغت نامہ دھخدا جلد (ح) ص۳۹۹۔ اکثر افراد روایت کو بھی حدیث کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔

۸ە علم الحدیث ص۲۔

۹ە نہایۃ الدرایۃ۔

۱۰ە لغت نامہ دھخدا جلد (ح) ص۳۹۸۔ دائرۃ المعارف اسلامی (انگلش) ص۲۸

۱۱ە تاسیس الشیعہ ص۲۷۹۔ رجال نجاشی۔ اس نکتہ کی یاد آوری ضروری ہے کہ شیعہ و سنی روایت کے مطابق حضرت علیؑ وفات پیغمبرؐ کے بعد اس وقت تک گھر سے باہر نہ نکلے جب تک قرآن کو مرتب نہ کرلیا البتہ وہ قرآن اس موجودہ قرآن سے کیت کے لحاظ سے مختلف نہ تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ حضرت علیؑ نے اسے ترتیب نزول کے مطابق مدون کیا تھا اور ساتھ ہی میں شرح و تفسیر نیز ناسخ و منسوخ کا بیان بھی موجود تھا، اگر آج حضرت علیؑ کا تدوین کیا ہوا قرآن مسلمانوں کے پاس موجود ہوتا تو علم حدیث میں زیادہ مشکل باقی نہ رہ جاتی کیونکہ آپ "راسخون فی العلم" کے مصداق تھے اور عصر پیغمبرؐ میں حضور کی احادیث کو جمع کرتے تھے۔ ابن سیرین کہتے ہیں: حضرت علیؑ نے ترتیب نزول کے مطابق قرآن مرتب کیا تھا اگر وہ کتاب ہم تک پہنچتی تو خزانۂ علم ثابت ہوتی، فصل الخطاب ص۔ سلمان کہتے ہیں: ..... حضرت علیؑ نے جب تک قرآن کو مرتب نہ کرلیا گھر سے باہر نہ آئے آپ نے ترتیب نزول کے مطابق اور بیان ناسخ و منسوخ نیز شرح و تفسیر کے ہمراہ مدون کیا تھا۔ فصل الخطاب ص۵

۱۲ە اعیان الشیعہ ج۱ ص۲۷۴۔ دائرۃ المعارف امامیہ (ح) ص۸۔ علم الحدیث۔ تذکرۃ الحفاظ ذھبی ص۱۰ میں حضرت علیؑ کے سلسلہ میں ہے..... وکان اماما عالما متحریا فی الاخذ بحیث انہ یستحلف من یحدثہ بالحدیث

۱۳ە التدریب الراوی ص۲۸۵۔

۱۴؎ تذکرۃ الحفاظ ذہبی ص۲۷ فجر الاسلام ص۲۶۵ پرتو اسلام ج ا ص۲۲۵

۱۵؎ دائرۃ المعارف امامیہ حرف حاء ص۶۹، التدریب الراوی۔ کشف الظنون قائمہ ص۶۳۷

۱۶؎ کشف الظنون قائمہ ۶۳۷، تاسیس الشیعہ ص۲۷۸ ص۲۷۹ لغتنامہ دہخدا حرف الف ط۲۹۵، تقریب التہذیب ص۳۳۳ وفیات الاعیان ص۳۲۸، فجر الاسلام ص۲۶۵

۱۷؎ تاسیس الشیعہ ص۲۸ - اول من دون الحدیث من شیعۃ امیر المومنین بعدہ ابو رافع مولی رسول اللہ۔ رجال نجاشی ص۲۰۳ دائرۃ المعارف امامیہ حرف حاء ص۶۹-۷۰ دہخدا ج الف ص۲۹۵ الذریعہ ج ا ص۱۴ -

۱۸؎ اعیان الشیعہ ص۲۷۲ ج ا دائرۃ المعارف امامیہ ص۶۹ طبقات سعد ج ۴ ص۷۳ - چونکہ ابو رافع کے لئے یہ ملتا ہے کہ یہ آنحضرت کے چاہنے والوں میں تھے اور فرزندان ابو رافع حضرت امیرؑ کے کاتبوں میں تھے، اس سے یہ ثابت ہوا کہ ابو رافع صحابی مرسل اعظمؐ ہونے کی وجہ سے اہل سنّت کے سب سے پہلے مدون حدیث "ابن جریح" سے پہلے تھے۔

۱۹؎ دائرہ المعارف امامیہ حرف حاء ص۷۰ تاسیس الشیعہ ص۲۸۷ ص۲۸۰ حضرت امام محمد باقرؑ و امام صادق علیہما السلام کے بعد بھی حضرت ائمہ ھدیٰ علیہم السلام سے روایتیں نقل ہوئی ہیں لیکن ان راویوں کو بھی طبقہ چہارم میں شمار کیا جاتا ہے۔ امام علی رضاؑ کی حدیث "سلسلۃ الذھب" کے لیے جیسے حضرت نے نیشاپور میں القاء فرمایا تھا کہا جاتا ہے کہ ۲۲ ہزار افراد قلم و کاغذ لیے اس حدیث کو تحریر کر رہے تھے۔ اگرچہ اس کے علاوہ بھی بہت سے افراد اس اجتماع میں شریک تھے جنھوں نے اس حدیث کو سنا مگر لکھا نہیں۔

شاید اس کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ یہ بات منگولیوں کے حملہ سے چار سو سال قبل کے نیشاپور کی ہے جب وہ آبادی سے چھلک رہا تھا، لہٰذا اس وقت کی آبادی کو دیکھتے ہوئے اس حدیث کے راویوں کے عدد میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں۔

۲۰؎ فجر الاسلام از ص۲۶۷-۲۶۵ تاسیس الشیعہ ص۲۷۸ التدریب الراوی کشف الظنون قائمہ ۶۳۷ و ۶۳۸

۲۱؎ فجر الاسلام ص۲۶۶ -

۲۲؎ کشف الظنون قائمہ ۶۳۷-

۲۳؎ علم الحدیث ص۱۳ مکتب تشیع اردی بہشت ۱۳۳۹ ص۶۱-۵۸

۲۴ علم الحدیث، فجر الاسلام ص۲۶۵ پرتو اسلام ص۲۶۴

۲۵ مقدمہ التدریب الراوی - علم الحدیث -

۲۶ التدریب الراوی - علم الحدیث - مذکورہ بالا بعض افراد سے نقل شدہ روایات کے تعداد کے سلسلہ میں احمد امین اور سیوطی کے درمیان اختلاف ہے ۔ مثلاً احمد امین کے خیال میں عائشہ سے ۲۲۱۰ ابن عباس سے ۱۵۰۰ اور عمر بن خطاب سے ۵۳۷ روایات نقل ہوئی ہیں ۔ فجر الاسلام - پرتو اسلام ص۲۶۲

۲۷ الذریعہ ج ۲ ص۱۲۵ تا ۱۳۵ ، فہرست کتاب دانشگاہ تہران ص۱۰۸۸ نہایہ الدرایہ کے ص۱۲ پر شہید ثانی کی طرف نسبت دی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا ـــ امر فرقۂ امامیہ جو چار سو مصنفین کے ذریعہ لکھا گیا اسے "اصول" کہتے ہیں ان اصول کے ذریعہ جو بہترین کتابیں وجود میں آئیں ـ کافی ، تہذیب ، استبصار ، اور من لا یحضر ہیں ۔ "اصول" کی وہ کتابیں جناب ابن طاؤس تک پائی جا رہی تھیں مرحوم ابن طاؤس نے ان کتابوں سے نقل کیا ہے" ۔ کتب اربعہ" جو ان اصول کے مقابلہ میں زیادہ کامل و جامع تھیں اس وجہ سے رفتہ رفتہ وہ اصول ضائع ہو گئے ۔ جناب ابن ادریس نے بھی اپنی کتاب سرائر کے آخر میں ان کتابوں سے استفادہ کیا تھا ۔

۲۸ فہرست کتب دانشگاہ تہران ص۱۰۸۹ تا ۱۰۹۵ الذریعہ نے ۱۱۷ اصل ذکر کی ہے ۔ ۲۹ دائرۃ المعارف امامیہ (ح) ص۳ ۔ تاسیس الشیعہ ص۲۸۸

۳۰ دائرۃ المعارف امامیہ (ح) ص۳ تاسیس الشیعہ ص۲۸۸ علوم الحدیث ص۵۶ ۔ ۳۱ تاسیس الشیعہ ص۲۸۸ ۔ فہرست طوسی ۔ بس علم الحدیث ص۵۷ ۔ دائرۃ المعارف امامیہ (ح) ص۳ ۔ اس کتاب کی احادیث کی تعداد ۱۳۵۹۲ درج ہے ۔

۳۲ الذریعہ ج ۲ ص۱۶ ج ۶ ص۱۷۰ تا ۱۹۱ و ص۱۸۳ ج ۱۳ ص۸۳ تا ۱۰۰ و ص۱۵۴ فہرست کتب خانہ دانشگاہ تہران بعد از ص۱۲۷۷ تاسیس الشیعہ ص۲۹۰ ۔

۳۳ یہ بات سنی نظریہ کے مطابق ہے ورنہ شیعہ اسے تسلیم نہیں کرتے ۔ بہرکیف حضرات اہل سنت کے درمیان ابن جریح یا ربیع بن صبیح دوسرے مقدم ہیں ۔ شیعہ نقطہ سے اہل بیت طاہرین کے بعد ابو رافع پہلے شخص ہیں جنہوں نے تدوین حدیث کا کام شروع کیا ۔ تاسیس الشیعہ ص۲۸۰ ۔ رجال نجاشی ص۲۹۲ ۔ دائرۃ المعارف امامیہ (ح) ص۶۹ ـ ۷۰ ۔ الذریعہ جلد اوّل ص۱۴ ۔ لغت نامہ دھخدا (الف) ص۲۹۸

۳۴ کشف الظنون قائمہ ۶۳۷ ۳۵ تاریخ ابن خلدون ص۴۹۸ ۳۶ کشف الظنون قائمہ ۶۳۷ ۔

۳۷ تاریخ ابن خلدون ص۴۹۸ ۳۸ کشف الظنون قائمہ ۶۳۹

۳۹ کشف الظنون قائمہ ۶۳۷ تا ۶۳۹

جناب محمد امین زین الدین
ترجمہ و اقتباس: جناب ممتاز علی

اخلاق۔ امام صادقؑ کی نگاہوں میں

خیر و سعادت

ذی روح مخلوق کا یہ امتیاز ہے کہ وہ اپنے ارادہ سے اپنے افعال انجام دیتی ہے۔ لیکن یہ قدرت جمادات اور نباتات میں نہیں پائی جاتی۔ ذی روح مخلوق اپنی مرضی کے مطابق پہاڑی کی سنگلاخ چوٹیوں کو سر کر سکتی ہے، جدھر چاہے جا سکتی ہے لیکن دریا کے پانی میں یہ صلاحیت نہیں وہ اپنے ارادہ سے اپنی خواہش کے مطابق کچھ نہیں کر سکتا اسے اپنی کسی حرکت پر اختیار نہیں۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ ذی روح مخلوقات میں ایک ایسی قوت ہوتی ہے جو اس کو دوسرے موجودات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس قوت کا نام "ارادہ" ہے قدیم منطقیین ذی روح مخلوق کو اپنی اصطلاح میں "المتحرک بالارادۃ" اپنے ارادہ سے حرکت کرنے والا کہتے ہیں۔

یہی ارادہ ہے جو حیوان کے ہر کام کا محرک بنتا ہے اس ارادہ میں حیوانات کے ساتھ انسان بھی شریک ہے۔ لیکن انسان کی فوقیت اور امتیاز کا سبب اس کا تدبّر اور تعقل ہے۔ وہ پہلے غور و فکر کرتا ہے، نتائج کو سوچتا ہے، حالات حاضرہ کے آئینہ میں مستقبل کا سراغ لگاتا ہے پھر اس کے بعد ان کاموں کو اپناتا ہے جو اچھے ہوں۔ مگر حیوانات کو تفکر اور تدبّر سے کوئی واسطہ نہیں صرف وہم انھیں غرائز کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے، وہم و غریزہ کے علاوہ حیوانات کی رانہمائی کرنے والا اور

کوئی نہیں ہے ۔

حیوانات کی طبیعت ان کے غرائز اور میلانات کو ابھارتی ہے جوان کا غریزہ کہتا ہے وہی ارادہ ہوتا ہے اور پھر اسی کے حکم کے مطابق حیوان اپنے اعمال انجام دیتے ہیں ان کے پاس کوئی ایسی مستقل چیز نہیں ہے جو میلان طبع اور غرائز کا رخ موڑ دے یہ بات صرف انسان میں پائی جاتی ہے انسان اپنے ارادہ واختیار سے میلانات کا رخ موڑ سکتا ہے ۔ انسان فطرت کے احکام کو بدل دینے کی قوت رکھتا ہے۔

انسان کے اندر ایک اور خصوصیت ہوتی ہے جسے ہم جودت وندرت کہہ سکتے ہیں یہی جودت طبع اس کو اچھے اغراض ومقاصد کے لیے ابھارتی ہے اور انسان بہتر سے بہتر کام انجام دینے کی کوشش کرتا ہے ۔اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کے کام کو اوّلیت حاصل ہو ۔انسان کو ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسان مدح وستائش کا طلبگار بھی ہوتا ہے اس لئے کہ وہ ستائش پر اپنے دل میں ایک طرح کی لذت محسوس کرتا ہے ۔ لہٰذا پتہ چلا کہ انسان کی غرض اول، کمال مطلق کو حاصل کرنا ہے ۔ جودت طبع اس کی ایک صفت ہے' اس صفت کی جھلک اس کے ہر مقصد اور ہر کمال میں نظر آتی ہے ۔

علم اخلاق کا موضوع یہ ہے کہ انسان کے صفات اور اعمال کس طرح مہذب بنائے جا سکتے ہیں اور ان میں توازن پیدا کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے ۔ لہٰذا واضح ہو گیا کہ علم اخلاق کی غرض یہ ہے کہ انسان کو اعمال وصفات کے اعتبار سے منزل کمال تک پہونچا دیا جائے بعینہٖ "سعادت" کی بھی یہی تعریف قدیم فلسفیوں نے کی ہے لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ علم اخلاق کی غرض انسان کی سعادت ہے ۔

"سعادۃ کل کائن حصولہ علیٰ کمالہ الذی قد تھیأ لہ"

ذی روح کے لیے جو کمال مہیا ہے اس کمال کو حاصل کر لینے کا نام سعادت ہے ۔ یہ سعادت کی وہ تعریف ہے جو قدیم فلسفیوں نے کی ہے اس کے بعد فلاسفہ کہتے ہیں کہ وجود، مطلقاً خیر ہے اور اس خیر (وجود) میں مزید اچھائیوں کو جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے ۔ لہٰذا خیر جب خیر کو جذب کرلے گا تو رنگ اور گہرا ہو جائے گا ۔ اسی لئے انسان اپنے اعمال وصفات میں جس کمال مطلق کو حاصل کرتا ہے ارسطو اس کو "خیر اعلیٰ" کے نام سے یاد کرتا ہے ۔ اس کی نظر میں خیر اعلیٰ کو سعادت کہتے ہیں مذکورہ دونوں تعریفوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خیر وسعادت

کا مطلب ایک ہے، ممکن ہے کسی دوسرے رخ سے فرق بھی ہو۔

"انسان کے تمام اعمال کی غرض لذت اندوزی ہے" یہ ایک نظریہ ہے جو فلسفیوں کے درمیان ایک زمانہ تک موضوع بحث بنا رہا اس پر جو تنقیدیں ہوتی ہیں وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں ملاحظہ ہو بعض افراد کہتے ہیں کہ:

۱۔ عمل کے نتیجہ اور انتہا کا نام غرض ہے لہٰذا وجود کے اعتبار سے عمل مقدم اور غرض مؤخر ہو گی، لیکن لذت چونکہ عمل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے اور بسا اوقات عمل کے ختم ہونے کے ساتھ لذت بھی ختم ہو جاتی ہے لہٰذا لذت کو عمل کی غرض نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مثلاً اگر کوئی شخص وطن یا دین کی محافظت کے لئے جنگ کر رہا ہو تو دفاع یا جہاد کے وقت وہ لذت محسوس کرتا رہتا ہے عمل کے ساتھ ساتھ لذت بھی حاصل ہوتی رہتی ہے لیکن کسی چیز کی انتہا (غرض) اس چیز کے ساتھ ساتھ نہیں ہو سکتی یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس جنگ میں قتل کر دیا جائے یا کامیابی سے ہمکنار نہ ہو تو ایسی صورت میں لذت کو عمل کی غرض نہیں کہہ سکتے دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جنہیں عمل کے وقت بہت زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے لیکن عمل کے بعد لذت نہیں محسوس ہوتی لہٰذا غرضِ عمل، لذت نہیں ہے۔

۲۔ "انسان کے اعمال کی غرض لذت ہے" اس نظریہ پر ناقدین یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کبھی کبھی طبیعت اور غریزہ کے تقاضہ کی بنا پر ایسے کام انجام دیتا ہے جس کی لذت یا الم کا اس کو شعور بھی نہیں ہوتا ہے لذت یا تکلیف کا شعور تجربہ کی منزل سے گذرنے کے بعد ہوتا ہے جیسے ایک بچہ جب پہلی بار اپنی ماں کی چھاتی سے دودھ پینے کے لئے روتا ہے تو وہ دودھ ملنے کی لذت یا نہ ملنے کی تکلیف سے ناآشنا ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے غریزہ کے تقاضہ کی بنا پر روتا رہتا ہے اس لئے کہ ابھی تک اس کو دودھ پینے کی لذت محسوس ہی کہاں ہوئی ہے۔ لہٰذا لذت کو عمل کی غرض نہیں قرار دیا جا سکتا۔

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ مذکورہ بالا نظریہ نہ تو مطلقاً صحیح ہے اور نہ ہی بالکل غلط ہے اس لئے کہ بعض جگہیں وہ ہیں جہاں کوئی دوسری چیز غرض نہیں ہوتی بس لذت ہی غرض ہوتی ہے۔

لہٰذا انسان جو کام اپنے ارادہ اور اختیار سے کرتا ہے وہ دو طرح کے ہیں۔ اخلاقی اور غیر اخلاقی۔

۱۔ **اخلاقی :۔** اخلاقی عمل وہ عمل ہے جو صحیح اخلاق کا مظہر ہوتا ہے جو عقل کی رہنمائی میں انجام پاتا ہے یہ وہ عمل ہے جس کی غرض کمال انسانی ہے۔ اس قسم کے اعمال سے پہلے بھی لذت حاصل ہو سکتی ہے اور عمل کے ساتھ ساتھ بھی لذت کا وجود ممکن ہے۔

۲۔ **غیر اخلاقی :۔** غیر اخلاقی عمل وہ عمل ہے جو نہ تو خلق صحیح کا مظہر ہوتا ہے اور نہ ہی عقل کی رہبری میں انجام پاتا ہے۔ اختیاری عمل کی اس قسم میں لذت بھی غرض ہو سکتی ہے اور کمال کو بھی غرض کہا جا سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ غرض وہ ہو جسے فاعل "کمال" سمجھ رہا ہے۔ مگر واقعاً کچھ بھی نہ ہو صرف غلط فہمی ہو۔

بہرحال چاہے لذت کا مطلقاً "خیر" ہونا ثابت ہو یا نہ ہو ہم لذت کو اس وقت تک سعادت نہیں کہہ سکتے جب تک سعادت کا مفہوم ـــ "خیر اعلیٰ" ـــ رہے گا۔ دراں حالیکہ بہت سی ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں لذت، الم اور تکلیف میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

بعض فلاسفہ تمام اعمال کی غرض لذت ہی کو قرار دیتے ہیں لیکن ان کے درمیان لذت کی تعیین اور توصیف میں اختلاف ہے ـــ احمد امین صاحب فرماتے ہیں کہ "سعادت اس لذت کو کہتے ہیں جو رنج و الم سے خالی ہو" یہ ان کی اپنی رائے ہے جسے تمام فلسفیوں کی رائے نہیں کہا جا سکتا ہمیں اس بات سے بھی انکار نہیں ہے کہ بعض فلسفی احمد امین صاحب کی رائے سے اتفاق بھی کرتے ہیں تاہم سب کی رائے احمد امین صاحب کی رائے سے متفق نہیں ہے۔

سعادت کو "خیر اعلیٰ" کے نام سے عوام و خواص سبھی جانتے ہیں لیکن اختلاف اس بات پر ہے کہ "خیر اعلیٰ" کون سی چیز ہے؟ خواص کا کہنا ہے کہ ـــ خیر اعلیٰ ـــ بہت ہی خوبصورت مثالیہ اور نمونہ کو کہتے ہیں۔ لیکن خواص کی اس رائے کو عوام کی عقل نہیں سمجھ سکتی۔ اس لئے کہ عوام کی رائے اس سلسلہ میں بہت ہی ناقص ہے جسے خواص آسانی سے نہیں قبول کرتے۔

عوام کے نزدیک خیر اعلیٰ کا بہت وسیع مفہوم ہے وہ سعادت کا مطلب دولت و ثروت نیز صحت اور خوش حالی سمجھتے ہیں۔ عوام اسی طرح کی چیزوں کو سعادت کہتے ہیں مگر خواص کو ان چیزوں میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسے وہ کمال کہہ سکیں اس بنا پر وہ ان چیزوں کو سعادت نہیں کہتے اس کے علاوہ سعادت کے معنی کچھ اور ہوں تو یہ دوسری بات ہوگی۔[۱]

ان فلسفیوں کے نزدیک ارتقاء نفس کو کمال نفس کہتے ہیں جب نفس عقل کی معراج پر پہونچ جائے اور کامل انسانیت کو حاصل کرتے تب کمال نفس حاصل ہوتا ہے ــــ ان دونوں طرح کے فلسفیوں میں ایک درمیانی اور متوسط طبقہ بھی ہے، ان کا نظریہ مذکورہ نظریات سے جداگانہ ہے۔ ان کے نزدیک سعادت کوئی اور ہی چیز ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: دعامۃ الانسان العقل - وبالعقل یکمل[۴] دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں: الیقین یوصل العبد کل حال سنی ومقام عجیب - یقین انسان کو بلند مرتبہ تک پہنچا دیتا ہے۔ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ: "ان الایمان افضل من الاسلام وان الیقین افضل من الایمان وما من شئ اعز من الیقین[۵]" ایمان اسلام سے اور یقین ایمان سے افضل ہے یقین سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ آپ فرماتے ہیں: ان اللہ بعدلہ وقسطہ جعل الروح والراحۃ فی الیقین والرضا وجعل الہم والحزن فی الشک والسخط[۶] اللہ کا یہ عدل ہے کہ اس نے روح و راحت کو یقین و رضا میں اور حزن والم کو شک اور ناراضگی میں قرار دیا ہے۔

یہی رائے بعض فلسفیوں کی بھی ہے وہ کہتے ہیں کہ نفس کا مراتب عقلیہ کی بلندیوں تک پہنچ جانا کمال ہے،، اور امام فرماتے ہیں کہ: "روح اور راحت کو اللہ نے یقین میں پوشیدہ رکھا ہے ــــ یقین، حکمت اور کامل انسانیت کی بلندی کو کہتے ہیں یہی یقین کامل ہے جسے اللہ نے اسلام اور مطلق ایمان سے افضل قرار دیا ہے۔

ممکن ہے کوئی روح کا مطلب لذت سمجھے۔ اس لئے کہ حدیث میں یہ لفظ رنج والم کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں انسان کا کمال "خیر اعلیٰ" یا "سعادت" کو حاصل کرنا ہی سمجھ میں آتا ہے اور "نجات" کا مطلب بھی امام کے قول میں یہی ہے آپ فرماتے ہیں کہ: "السعادۃ سبب خیر تمسک بہ السعید فیجرہ الی النجاۃ[۷]۔ "سبب خیر سے تمسک کا نام سعادت ہے، اور خیر ہی انسان کو نجات دلاتا ہے اور اگر اس سے بھی زیادہ صراحت مطلوب ہو تو مندرجہ ذیل حدیث پر غور کرنا چاہیئے۔ امام فرماتے ہیں: "اذا منّ اللہ علی العبد جمع لہ الرّغبۃ فی المعروف والقدرۃ والاذن فھنا لک تمّت السعادۃ والکرامۃ[۸]" جب اللہ

اپنے بندے پر احسان کرتا ہے تو نیکیوں کی طرف رغبت، قدرت اور اذن عطا کرتا ہے۔ اس کے بعد سعادت و کرامت مکمل ہوتی ہے۔

امامؑ کی نظر میں ایمان کے دو رخ ہیں ایک کا نام اعتقاد اور دوسرے کا نام عمل ہے یقین کا مرتبہ اعتقاد کے ذریعہ مدکمال تک پہونچتا ہے اور عمل پر بھی اس کا گہرا اثر ہوتا ہے اسی کے ذریعہ ایمان کامل حاصل ہوتا ہے۔ یقین اسلام اور مطلق ایمان سے زیادہ افضل ہے۔

امام علیہ السلام یہ بھی فرماتے ہیں کہ "لا ینبغی لمن لم یکن عالما ان یعد سعیداً"[9] جو عالم نہیں ہے اس کو صاحب سعادت نہیں شمار کیا جا سکتا۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ کیوں کر سعادت حاصل کر سکتا ہے جو کمال علم سے محروم ہو۔ وہ کیوں کر کامل انسانیت کو پا سکتا ہے جو جہل کی قیادت میں اپنا سفر طے کر رہا ہو۔

خیر

انسان اپنے اختیاری کاموں کو نتائج پر غور و فکر کرنے کے بعد ہی انجام دیتا ہے پہلے وہ فعل و ترک میں موازنہ کرتا ہے اس کے بعد جو مناسب ہوتا ہے اسے اختیار کرتا ہے۔ دنیا میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی طرف ہمارا دل کھنچتا ہے اور ہم ان کو انجام دیتے ہیں اور کچھ چیزوں سے تنفر کی بنا پر ہم اس کے قریب بھی نہیں جاتے۔ جن چیزوں کی طرف دل متوجہ ہوتا ہے علمائے اخلاق ان کو خیر اور جن سے تنفر پیدا ہو جاتا اس کو شر کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن ان کے درمیان خیر و شر کی میزان اور معیار میں اختلاف ضرور ہے۔

ارسطو کا کہنا ہے کہ: "الخیر هو موضوع جمیع الآمال"[10] خیر تمام آرزوؤں کا مرکز ہے ایک دوسرے فلسفی کا کہنا ہے: "الخیر ما یتشوقہ الجمیع" جس کا ہر ایک کو اشتیاق ہو اس کو خیر کہتے ہیں۔ ان تعریفات کے درمیان جو فرق ہے وہ واضح ہے۔

قدیم علماء اخلاق خیر کے دو معنی بیان کرتے ہیں خیر مطلق اور خیر مضاف۔

خیر مطلق۔ یعنی جس میں ہر رخ سے خیر ہی خیر ہو۔ مذکورہ بالا تعریفوں میں خیر سے مراد خیر مطلق ہے۔

خیر مضاف: اس وسیلہ کو کہتے ہیں جو خیر مطلق کی طرف لے جائے، لہٰذا خیر مطلق غرض و غایت ہے اور خیر مضاف وسیلہ اور ان دونوں کے درمیان وہی فرق ہے جو فرق مقصد اور ذریعہ میں ہوتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک غرض دوسری اہم غرض تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے لہٰذا اس مقام پر پہلی غرض دوسری غرض کی بہ نسبت خیر مضاف کہی جائے گی۔ اس لئے کہ اس نے خیر مطلق تک پہونچایا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے خیر مطلق کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے آپ فرماتے ہیں کہ: جعل الخیر کلہ فی بیت وجعل مفتاحہ الزھد فی الدنیا [۱۱]

اللہ نے خیر کو ایک گھر میں قرار دیا ہے لیکن اس کی کنجی زہد ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ:-

السعادۃ سبب خیر یتمسک بہ السعید فیجرہ الی النجاۃ۔ [۱۲]

سعادت خیر کا سبب ہے جس سے خوش نصیب انسان تمسک اختیار کرتا ہے اور خیر نجات کا ضامن ہے۔

خیر مضاف کے لئے آپ کا ارشاد گرامی ہے:-

اذا اردت شیئاً من الخیر فلا تؤخرہ [۱۳]

جب کسی بھلائی کا ارادہ کرو تو اس میں تاخیر نہ کرو۔

افتحوا نہارکم بخیرٍ، واملوا علی حفظتکم فی اولہ خیراً وفی آخرہ خیراً۔ [۱۴]

اپنے دن کا آغاز خیر سے کرو اور جب تک بیدار رہو اول و آخر خیر ہی کی امید رکھو

آپ فرماتے ہیں: احسن من الصدق قائلہ وخیر من الخیر فاعلہ۔ [۱۵] سچائی سے بہتر اور خیر کو انجام دینے والا خیر سے بہتر ہے۔

حواشی:

۱ ذی روح مخلوق سے مراد وہی ہے جسے قدیم منطقیوں کی اصطلاح میں حیوان سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس میں نباتات

اور جراثیم شامل نہیں ہیں اگرچہ آج کی سائنس انھیں بھی جانداروں میں شمار کرتی ہے۔

۲ بعض افراد سعادت اس چیز کو کہتے ہیں جو خیر اعلیٰ تک پہونچانے کا ذریعہ ہو۔

۳ اصول کافی حدیث ۲۳ باب العقل والجہل۔

۴ جامع السعادت ص۷

۵ اصول کافی حدیث اول باب فضل الایمان علی الاسلام۔

۶ اصول کافی حدیث باب فضل الیقین۔

۷ احتجاج طبرسی ص۱۹۱

۸ تحف العقول ص۸۹ ۹ تحف العقول ص۸۹

۱۰ کتاب علم اخلاق "نیقوماخوس" تعریب احمد لطفی السیدبک ص۱۶۸ جزء اول۔

۱۱ اصول کافی حدیث ۳ باب الزہد۔

۱۲ احتجاج طبرسی ص۱۹۱

۱۳ امالی صدوق ص۲۲۰

۱۴ اصول کافی حدیث ۳ باب تعجیل الخیر۔

۱۵ بحار جلد ۱۵ باب الصدق ولزوم اداء الامانۃ۔

جناب شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
ترجمہ: جناب سید مہدی سرباز

اسلام کا تصور کائنات

انسان

انسان کے سلسلے میں جن اہم ترین مسائل پر گفتگو ضروری ہے (انسان کے متعلق اسلام کا نظریہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ موضوع کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) سرشت انسان:

اس بارے میں مندرجہ ذیل آیہ کریمہ پر توجہ کرنا مفید ثابت ہوگا۔

واذقال ربك للملئكة انی خالق بشراً من صلصال من حماء مسنون فاذا سويته ونفخت فيه من روحي فقعوا له ساجدين (حجر/۲۸)

جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: کہ میں خمیر دی ہوئی کھنکھناتی مٹی سے ایک انسان کو خلق کرنے والا ہوں۔ پس جیسے ہی میں اس کو منظم اور آراستہ کرلوں اور اسمیں اپنی روح پھونک دوں اس کے آگے سجدہ ریز ہوجانا۔

اس آیۂ کریمہ میں سرشت انسانی کے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

الف: **خاکی پہلو**: جس کو صلصال اور حماٍ مسنون سے تعبیر کیا گیا ہے۔ صلصال خشک اور پکی ہوئی ٹھکریلی مٹی کو کہتے ہیں جبکہ حما مسنون سے سڑا ہوا کیچڑ مراد ہے۔ البتہ قرآن مجید میں اس سلسلے میں اور بھی تعبیریں موجود ہیں۔ مثلاً "طین لازب" یعنی لیس دار مٹی اور "سلالۃ من طین" مٹی کا جوہر وغیرہ۔ ان تعبیروں میں انسان کی مادی اور خاکی

صورت نظر آتی ہے جو تاریک، جامد، ساکت، آلودہ، سخت، بے احساس، خاموش اور بے شعور ہے۔

(ب) **انسان کا ملکوتی پہلو:** جس کا اظہار آیہ شریفہ کے دوسرے حصے سے ہوتا ہے، جس میں اس کو الہٰی روح و نفس کا حامل بتایا گیا۔ اس کلمہ سے انسان کو اس اعلیٰ مرتبہ پر پہونچا دیا گیا ہے جہاں وہ یکتا و پاکیزہ، متحرک و حساس اور صاحب کمال نظر آتا ہے۔ نیز انسان میں جو روح الہٰی پھونکی گئی ہے اس سے ارادہ، خلاقیت، تعمیری جذبہ اور نورانیت کا پتہ ملتا ہے۔ اس طرح انسان دوہری سرشت کا مالک ہے۔ شیطانی و رحمانی، خاکی و ملکوتی، ظلماتی و نورانی، ساکن و متحرک اور پاک و آلودہ . . . . .

انسان ان ہی دو پہلوؤں کے درمیان ہاتھ پیر مارتا ہے۔ انسان کے بارے میں اسلام کے اس نظریے سے چند نکات سامنے آتے ہیں۔

(۱) انسان میں بلا شبہ مادی پہلو موجود ہے۔ اسی لئے اس میں مادی ضروریات اور شہوانی خواہشات و میلانات بھی ہیں۔ اور ان سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ حسب ضرورت ان جذبات کی تسکین کا سامان ضروری ہے۔ اسی لئے اسلامی قوانین میں انسان کے ان مادی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ اسلام انسان کو مجرد اور ملکوتی موجود نہیں سمجھتا کہ اس کی تمام کوششوں کا دار مدار مادی خول سے نجات دلانا ہو جیسا کہ بعض عرفانی مذاہب کا خیال ہے یا مثال کے طور پر بدھ مت کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے اگر ایسا ہی ہوتا تو تمام جذبات و خواہشات قربان کر دئے جاتے بدن کو ریاضت و مشقت میں مبتلا کرنا پڑتا اور جتنا زیادہ جسمانی ریاضت اور خود فراموشی کی کوشش کی جاتی اتنی ہی روح کو آزادی ملتی اور انسان اپنی اصل منزل سے قریب تر ہوتا جاتا۔ لیکن اسلام کا یہ نظریہ نہیں ہے۔ اسلام نے انسان کے مادی پہلوؤں کو فراموش نہیں کیا ہے۔

(۲) اس کے ساتھ ہی ساتھ انسان کا خمیر اعلیٰ شرافتوں اور روحانی عظمتوں سے تیار ہوا ہے وہ منتخب پروردگار ہے اور اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ روح الہٰی انسان میں پھونکی گئی ہے۔ اس لحاظ سے انسان تمام موجودات میں ایک عظیم شرف کا حامل نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان فطری طور پر آلودہ و گناہ گار نہیں۔ جیسا کہ بعض عیسائیوں کا فلسفہ ہے تاکہ انسان ابتداء ہی سے اپنے کو پست اور محکوم مخلوق سمجھے۔ اس کی پوری زندگی گناہ ذاتی سے رہائی نیز فطرت میں داخل شر سے نجات حاصل کرنے میں مشغول رہے۔

(۳) انسان کے خاکی پہلو کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے اسلام انسان کو ان کے زیر اثر رونما ہونے والے خطرات سے خبردار کرتا ہے کہ کہیں وہ اپنے اس خاکی پہلو کا اسیر نہ بن جائے اور پھر وہ اپنی کم نظری

کی وجہ سے گناہوں میں گرفتار نہ ہو جائے اور نفسانی خواہشات اور اخلاقی برائیوں کے دلدل میں پھنس کر ساکت و بے حرکت نہ ہو جائے اور اس طرح پسماندگی و تاریکی میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے۔

(۴) دوسری طرف یہ عظیم خوشخبری دیتے ہوئے کہ انسان نفس ربانی کا حامل ہے، اسے ترقی کی جانب قدم بڑھانے کی رغبت دلائی ہے، یعنی انسان اس عظیم سرمائے کے سہارے کمال حاصل کر سکتا ہے، علم حاصل کر سکتا ہے، اپنے ارادے اور تشخیص سے پیش آنے والی مشکلات کو حل کر سکتا ہے۔ نیز کمال کی طرف بڑھ سکتا ہے اور اس طرح انسان رشد و ارتقاء کی منزلیں طے کر سکتا ہے۔

(۵) انسان دونوں پہلوؤں کے درمیان مکمل اعتدال کا خیال رکھے یعنی مادی زندگی کو بھی سنوارے اور روحانی حیات کو بھی ترقی دے نیز مادی زندگی میں دوسروں کے حقوق کا خیال رکھے۔ یہی وہ عادلانہ اور درمیانہ راستہ ہے جس کا ہر چیز میں اسلام خیال رکھتا ہے۔

اسی لئے ہم اسلام کو ایک ایسا دین سمجھتے ہیں جو انسان کی دنیا و آخرت، مادی و معنوی، جسمانی و روحانی ہر رخ سے رہبری کر سکتا ہے۔ ہم اسلام کی اس وسیع ترین معنوی، اخلاقی اور عرفانی تعلیمات کے دوش بدوش اقتصادی و مادی زندگی کے اصولوں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔

(۶) بہر حال انسان کی خلقت اس نہج پر ہوئی ہے کہ اگر چاہے تو صاحب اقتدار و شرافت، عقلمند و سربلند نیز متحرک و مترقی ہو سکتا ہے اور چاہے تو جاہل و گناہ گار، گنوار، عقل کے مارے ہوئے غیر ترقی یافتہ افراد کی فہرست میں شامل ہو سکتا ہے۔

بھائی چارگی اور خاندانی ارتباط:

یا ایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منہا زوجہا و بث منہما رجالاً کثیراً و نساءً (سورہ نساء/۱)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک شخص سے خلق کیا اور اس سے اس کی رفیق حیات پیدا کی پھر ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ انسان کے اندر خاکی اور ملکوتی دونوں سرشتیں پائی جاتی ہیں، گویا انسان ایک طرف فرشتوں سے بالاتر اور دوسری طرف حیوانوں سے بھی پست مراحل کے درمیان قدم بڑھا رہا ہے۔ دیکھنا

یہ ہے کہ ان دونوں متضاد کششوں کو نظر انداز کئے بغیر اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کرتے ہوئے کس طرح کمال کی راہ طے کرتا یا پھر ہلاکت اور برائیوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

موجودہ بحث میں ہم انسانوں کے درمیان تعلقات و روابط کی کیفیت پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کریں گے۔ مذکورہ آیۂ شریفہ سے واضح ہے کہ تمام انسان ایک ہی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ماں باپ ایک ہی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام افراد بشر ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے بہن بھائی ہیں۔

ہم اس بحث میں کرۂ زمین پر انسان کے وجود کو حضرت آدمؑ کے بعد قرار دینا اور دوسرے ادوار میں انسان کے وجود کی نفی کرنا نہیں چاہتے۔ نہ ہی ہمارا مقصد انسان اوّل کی کیفیت خلقت سے بحث کرنا ہے۔ یہ خود ایک جداگانہ مسئلہ ہے۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس آیۂ کریمہ نیز بعض دوسری آیتوں سے یہ ثابت ہے کہ انسانوں کے درمیان بہت قریبی رشتہ و قرابت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ سارے انسان ایک ہی جوڑے کی اولاد ہیں۔ اس لئے رنگ و نسل، شکل و زبان اور جسمانی وضع قطع کو اختلافات کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ بہرحال یہ مختلف نسلیں ایک ہی سرچشمہ سے مربوط ہیں۔ لہٰذا ذات اور خاندان کے اعتبار سے برابر اور بھائی بھائی ہیں ان کے درمیان سطحی قسم کے اختلافات نے مختلف نسلوں، قوموں اور قبیلوں کو جنم دیا ہے۔ فلسفہ اسلامی کے پیش نظر یہ اختلاف صرف ایک دوسرے کو پہچاننے اور افراد ——— خاندان کو مشخص کرنے کے لیے ہے۔ اس کو فخر و مباہات اور ذاتی فضیلت و امتیاز کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے جیسا کہ ارشاد قدرت ہے:

یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللّٰہ اتقیٰکم ان اللّٰہ علیم خبیر۔ (حجرات/۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ تمہیں قوموں اور خاندانوں میں بانٹ دیا تاکہ ایک دوسرے کی پہچان ہو سکے۔ بلاشک اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ عزت والا تم میں سے وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے بے شک ذات خداوندی علیم و خبیر ہے۔

اس آیت قرآنی کی روشنی میں نسل انسانی ایک تنومند درخت کے مانند ہے جس کا تنا ایک ہے لیکن سیکڑوں

شاخیں ہیں اور پھر ہزاروں ٹہنیاں ہیں جو ان شاخوں سے نکلتی ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ ان ٹہنیوں میں حرارت، روشنی اور آب و ہوا نیز دیگر حالات کے تحت کچھ فرق پیدا ہو جائے لیکن پھر بھی ان تمام شاخوں کی غذا ایک ہی مرکز (جڑ) سے وابستہ ہے۔ اور سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں، البتہ شکل و رنگ حتی کہ لیاقت، صلاحیت اور ہوش وغیرہ کا فرق خوبصورتی اور نیا پن، نیز رقابت اور جدوجہد کے لیے محرک ہوتے ہیں اور یہ انسان شناسی کے سلسلہ میں خود ایک مستقل بحث ہے۔ بہرحال اسلام تمام انسانوں کو ایک ہی خاندان کے افراد تصور کرتا ہے اور سب کو برابری کی نگاہ سے دیکھتا ہے نیز بڑی شدت کے ساتھ اس بات کا خواہاں ہے کہ ہر طرح کے نسلی امتیازات جو ظلم و بربریت اور حق تلفیوں کی بنیاد ہیں، جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبے میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

"تمہارا خدا ایک ہے، تمہارے باپ بھی ایک ہیں۔ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو۔ اور آدم مٹی سے خلق ہوئے ہیں۔ خداوند عالم کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ وہی عزیز ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو عرب کو عجم پر کوئی فضیلت نہیں، مگر یہ کہ جو زیادہ متقی ہو۔"

حجۃ الوداع بڑی عظیم اہمیت کا حامل تھا۔ چونکہ دور و نزدیک کے مسلمانوں کو جمع کرنے کا یہ آخری موقع تھا۔ اس موقعہ پر اہم ترین مسائل کی یاد دہانی ضروری تھی، جنہیں انسانوں کے درمیان مساوات و برابری کا مسئلہ بھی شامل تھا۔ اصولی طور پر اسلام کا ایک اہم جہاد یہ بھی تھا کہ عرب و عجم کے درمیان پائے جانے والے شدید تعصبات کے خلاف جدوجہد کی جائے اور سب کو ہم عقیدہ و صالح انسان کی حیثیت سے ایک مرکز پر اکٹھا کر دیا جائے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اسلامی معاشرے میں ایک بڑی آفت جو آئی اور اس میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا گیا، یہی نسلی تعصبات تھے۔ بنی امیہ جن کی خیانتوں اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے ان کی سازشوں سے انکار کی گنجائش نہیں۔ ان کا اصل مقصد نسلی امتیازات کو دوبارہ زندہ کرنا، نیز غیر عرب پر عربوں کو خاص کر بنی امیہ کو برتری و فوقیت دینا تھا۔ چنانچہ ایرانی مسلمانوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا گیا جو غیر مسلم اہل کتاب کے ساتھ برتا جاتا تھا۔ ایک مدت تک ایرانی مسلمانوں سے جزیہ بھی لیا جاتا رہا۔ یہی ناروا امتیازات اور دوسروں کے حقوق سے بے توجہی آخر کار عرب اور ایرانی مسلم معاشرے میں بنی امیہ کے خلاف جدوجہد کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

آج بھی دنیا کی ایک بڑی مشکل، نسلی امتیازات کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ نازیوں کی نسلی برتری کا تصور بین الاقوامی جنگوں کا سبب بنا۔ اسی طرح صیہونیوں کی نسل پرستی نے اور ان کے آقاؤں کے استعماری مفادات کے علاوہ نسلی برتری کے تصور نے مشرق وسطیٰ میں بحرانی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

نسلی امتیازات کا تصور امریکی معاشرے میں بھی بہت سے پیچیدہ مسائل کا باعث بنا ہے یہ مسئلہ امریکہ کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ نیز یہی مسئلہ افریقی ممالک میں ایک طرف سے استعماری تسلط کا بہانہ بنا ہوا ہے، اور دوسری طرف سے اس کے خلاف آزادی کی تحریکیں بھی اسی کا نتیجہ ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ نسلی امتیازات صرف ماضی ہی میں جنگوں اور حق تلفیوں کے لیے نہیں ہوئے ہیں بلکہ حال اور مستقبل بھی اس مصیبت کا شکار ہے، ایسے میں اسلام کی انسانی آواز بلند ہے کہ "تم سب برابر اور بھائی بھائی ہو، ایک دوسرے کے ساتھ محبت و دوستی سے تعاون کرو۔"

انسانی نفسیات اور اس کی قدریں:

ونفس وما سوّٰها فالهمها فجورها وتقوٰيها قد افلح من زكّٰها وقد خاب من دسّٰها (شمس / ۷-۱۰)

قسم انسان کی جان کی اور جس نے اس کو مرتب و منظم کیا۔ پھر اس کو برائی و بدنصیبی اور سعادت و پرہیزگاری کے اسباب سے آگاہ کیا۔ بے شک وہ لوگ نجات پا گئے جو اپنے نفس کا تزکیہ کرتے ہیں اور ہلاک ہوا وہ شخص جو اس کو آلودہ کرتا ہے۔

یہاں تک انسان کی خلقت اور افرادِ بشر کے خاندانی اتحاد کے بارے میں بحث ہوئی۔ اب انسانی روح و نفسیات کے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ سے گفتگو ہوگی۔

قرآن مجید میں انسانی روح کو نفس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ممکن ہے کہ روح کا مسئلہ اپنی فلسفیانہ وسعتوں کے ساتھ موردِ بحث قرار پائے کہ آیا روح مجرد ہے، یا مادی۔ یا ایسا مجرد ہے جو مادے سے ظاہر ہوتا ہے؟ کیا روح کا وجود پہلے سے تھا؟ جو بعد میں انسان کو عطا کی گئی؟ یا خود انسان اپنے خاص ارتقاء کے دوران روح کی نشو و نما کرتا ہے؟ اس کے علاوہ وہ تمام باتیں آغازِ فلسفہ سے اب تک ہوتی رہی ہیں۔ لیکن ہم یہاں ان بحثوں میں الجھنا نہیں چاہتے۔ ہمیں نفسیات کی حقیقت کے بارے میں بحث نہیں

کرنا ہے۔ بلکہ اس کی قدر وقیمت خصوصیات اور آثار کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

"قسم نفس انسانی کی جس نے اس کو منظم کیا اور" لفظ سوّا تسویہ سے لیا گیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روح انسانی ایک خاص نظام واصول کی تابع ہے۔ اس کے اپنے منصوبے اور ذرائع ہیں۔ اس کے بعد ارشاد قدرت ہے:

"نفس انسانی کو خوش نصیبی اور بدنصیبی، تقویٰ و فجور کے اسباب وعلل سے آگاہ کیا گیا ہے۔"

یہ انسان کے لئے بڑی عزت کا مقام ہے کہ اس کے اندر برائیوں اور اچھائیوں کے درمیان تمیز کرنے اور فیصلے کی قوت موجود ہے اور وہ اپنے باطن میں ایک پیغمبر کا حامل ہے جو اس کو راستے اور اس کے خطرات سے آگاہ کرتا ہے۔ اس اعتبار سے انسان ایسی بصیرت کا مالک ہے جس کے ذریعہ اپنی اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکتا ہے۔ یہیں سے ہمیں انسان کے اندر عقل وضمیر کی موجودگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ نحل کی آیت ۷۸ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واللہ اخرجکم من بطون امہاتکم لا تعلمون شیئًا وجعل لکم
السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون۔ (نحل/۷۸)

خداوند عالم نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے نکالا جبکہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے
پھر تمہیں آنکھ، کان اور دل عطا کیا۔ تاکہ شاید تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

لفظ "فواد" سے (دل اور قلب) سے روح انسانی مراد ہے۔ نیز اس آیہ شریفہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پیدائش کے موقعہ پر انسان کچھ نہیں جانتا۔ لیکن اس کے پاس حصول علم کی صلاحیت اور ذرائع موجود ہوتے ہیں کیونکہ اس کی آنکھیں اور کان باہر سے معلومات کے حصول کے راستے ہیں۔ پھر انسان کا دل اور نفس ان حاصل شدہ معلومات کو منظم کرتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ انسان کی فکر وعقل بعض مسائل کو درک کرتی ہے پھر اس سے نتیجہ نکالتی ہے۔ اس کا تجزیہ کر کے عمومیت دیتی ہے۔

ان عظیم نعمتوں کا شکر انہیں بروئے کار لانا ہے۔ درحقیقت شکر کا مقصد انسانوں کو شوق دلانا ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے اور صلاحیتوں سے استفادہ کریں اور علم حاصل کریں۔ پس انسان کے اندر تمیز، فیصلے، سوچ اور سمجھ کی صلاحیت وسیع پیمانے پر موجود ہے۔

اگرچہ ابتدا میں انسان کے پاس کچھ نہ تھا۔ لیکن ہر چیز کا مالک تھا۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنے

اندر موجود سرمائے کا احساس کرے اور ان کو کام میں لائے: تاکہ کچھ نہ ہونے سے سب کچھ ہونے کی منزل تک پہنچ سکیں۔

پہلی آیت میں تخلیق روح کے بعد اس کے قیمتی اور اہم نفس سے استفادہ کی دعوت دی گئی ہے۔ "بیشک جو نفس کا تزکیہ کرے گا فلاح پا گیا۔" تزکیہ کا مفہوم ہی سجانا اور منظم کرنا ہے۔ یہ سجانے کا عمل بھی تربیت کا مقدمہ ہے جس طرح کوڑے کرکٹ، غیر ضروری گھاس اور درختوں کی زاید شاخوں کو دور کرنا پودے کی نشوونما کا سبب ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح نفس کو ہر قسم کی آلودگی سے بچانا انسان کی تربیت و رشد کے لئے ابتدائی قدم شمار ہوتا ہے۔

جو روح کی نشوونما میں کامیاب ہوا وہ نجات پا گیا۔ اس نے نفس کو پر ثمر بنایا اور اس کو کمال کی جانب بڑھایا۔ اور جس نے اس نفس کو آلودہ کر دیا وہ ہلاک ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ اگر انسان کا ضمیر، بصیرت اور صلاحیتوں، غلط عادتوں، اخلاقی برائیوں اور موہوم طبقاتی کشمکش سے آلودہ ہو جائے۔ تو انسان ترقی نہیں کر سکتا۔ اور امید و کمال کی کونپلیں خشک ہو جائیں گی۔

چنانچہ مذکورہ امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے وسیع پیمانے پر صحیح وسائل تعلیمی، تربیتی اور تبلیغاتی اداروں کا قیام اور برائیوں کے خلاف جہاد، کائنات کے بارے میں اسلامی تصورات کی روشنی میں ایک ضروری و واجب اقدام ہے۔

خلیفۃ اللہ:

واذ قال ربك للملئكة انى جاعل فى الارض خليفة قالوا اتجعل
فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك
ونقدس لك قال انى اعلم ما لا تعلمون وعلم آدم
الاسماء كلها ۔ (بقرہ/۳۰)

جس وقت تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا۔ کیا ایسے کو (خلیفہ بنائے گا) جو زمین میں فساد و خونریزی کرے گا۔ جبکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ اس نے (اللہ تعالیٰ نے) کہا جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اور آدمؑ کو تمام اسماء کی تعلیم دی.......

اس آیت سے انسان کے بارے میں جس اسلامی نظریہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ انسان کا "خلیفۃ اللہ" ہونا ہے البتہ مقام علم کو اس کی شرافت و عزت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ آیہ مذکورہ کے ذیل میں بعض پہلوؤں پر بحث ہمارا مقصد نہیں۔

مثلاً فرشتوں کو کہاں سے معلوم ہوا کہ انسان خون ریز و فسادی ہے؟ کیا پہلے بھی روئے زمین پر انسان بستے تھے جیسا کہ بعض روایات میں مذکور ہے۔ کیا حضرت آدمؑ کی تشریف آوری سے قبل انسانوں کا وجود تھا؟ یا کلمہ فی الارض سے اندازہ لگایا گیا؟ چونکہ ایسا موجود جس کا رابطہ زمین سے ہو اس سے لگاؤ بھی رکھیگا۔ یہ مادی رابطہ انسانوں کو ایک دوسرے سے متصادم کرائے گا، اور جنگ برپا کرائے گا یا کسی اور طرح سے سمجھ لیا ہو۔ اور یہ کہ فرشتوں کے اس سوال سے اعتراض مراد نہیں تھا بلکہ تحقیق منظور تھی۔ اس طرح لفظاً "نحن ... حقیقت سجدہ اور اسماء کا مفہوم وغیرہ بھی اس وقت ہماری بحث میں شامل نہیں۔ لہٰذا ہماری بحث کا موضوع صرف خلیفۃ اللہ اور علم آدم ہے۔ اس آیت میں خلیفہ سے مراد یہ نہیں کہ کسی شخص کی عدم موجودگی یا موت کی صورت میں کسی کو جانشین مقرر کیا جائے تا کہ خلیفہ بنانے والے کی طرف سے امور انجام دے چنانچہ اگر خلاق عالم نے انسان کو خلیفہ بنایا ہے تو ایسا ہرگز نہیں کہ خدا امور زمین سے دست بردار ہو گیا ہو۔ اور نہ ہی زمین اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ بلکہ اس کا یہ مقصد ہے کہ کچھ صفات اور توانائیاں انسان کو عطا کی ہیں جو اللہ کی صفات کمال کے نمونے ہیں، البتہ وہ خداوند عالم کے صفات سے قابل موازنہ نہیں ہے۔ محدود و لامحدود، خالق و مخلوق نیز کمال مطلق اور ذات ناقص کے درمیان بے نہایت فرق ہے۔

کائنات کے بارے میں اسلامی تصور یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام انسان کو خلیفۃ اللہ مانتا ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ ارادہ و اختیار کا مالک ہے تو اس نے انسان کو بھی ارادہ و آزادی عطا فرمائی ہے۔ انسان فکر و ارادہ و آزادی اور قوت فیصلہ کے ذریعہ بہت سے امور انجام دے سکتا ہے خداوند عالم قدرت تصرف رکھتا ہے اور اشیاء کو دگرگوں کر سکتا ہے۔ اسی خدا نے انسان کو بھی اشیاء کے اندر تصرف کی طاقت عطا کی ہے۔ چنانچہ انسان اللہ تعالیٰ کے فراہم کردہ خام اور طبیعی مواد سے اپنی ضرورت کے ساز و سامان بنا سکتا ہے۔

خداوند عالم عالم ہے اور انسان کو بھی نور علم سے نوازا ہے۔ یہی علم آدم ان کے امتیاز کا باعث ہوا جس کے آگے فرشتوں کو تعظیم بجالانے کا حکم دیا گیا اور یہ ایک فطری عمل ہے کہ اپنے سے زیادہ

ماہر اور عاقل کا احترام کیا جاتا ہے۔ عالم و دانشور اونچے درجات پر فائز ہوتے ہیں جبکہ دوسرے ان کے آگے کمتر ہوتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ خالق ہے۔ اس نے انسان کو تخلیقی صلاحیتوں سے سرفراز فرمایا ہے تاکہ ہمیشہ شریفانہ زندگی میں نئے قدم اٹھا سکے، لیکن فقیر نہ بنے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کا فریضہ ہے کہ سوچ سمجھ کر باقاعدہ پروگرام کے ساتھ آگے قدم بڑھائے۔ خداوند عالم ازلی و ابدی ہے اور کسی خاص زمانے میں مقید نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ چنانچہ ہم اپنی اخروی زندگی کو ابدیت الٰہی کی ایک جھلک قرار دے سکتے ہیں۔ انسان کے بارے میں یہ ایک مستقل مسئلہ ہے کہ وہ اس ظاہری زندگی کے بعد نابود نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسری وسیع تر شکل میں اپنی زندگی کو جاری رکھتا ہے۔ اس طرح قیامت یا حیات بعدالموت صرف انسانوں سے مخصوص ہے جو انسانوں کے لیے ایک عظیم شرف ہے۔

بہرحال انسان خلیفۂ الٰہی کے درجہ پر فائز ہو کر ہر طرح کی عظمت و بزرگی کی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اور یہ قوت رکھتا ہے کہ الٰہی جلوؤں کو اپنے وجود میں درک اور درجہ کمال تک پہنچنے کی کوشش کرے علم و ارادہ تخلیق و تحرک اور حیات و زندگی کے میدان میں موثر قدم اٹھائے اور اپنے آپ کو کمال مطلق سے وابستہ سرچشمہ قرار دیتے ہوئے غیر محدود کمالات کا رخ کرے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون (بقرہ/۱۵۶)

واذا انعمنا علی الانسان اعرض ونا بجانبہ واذا مسہ الشر کان یئوسا (سورہ اسریٰ/۸۳)

جب ہم انسان کو نعمتوں سے نوازتے ہیں تو وہ (انسان) منہ موڑ لیتا ہے۔ اور پہلو تہی کرتا ہے اور جب وہ مصیبتوں میں گرفتار ہوتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔

گذشتہ صفحات میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ انسان ملکوتی اور خاکی دونوں صفات کا مالک ہے۔ اسی لحاظ سے قرآن کریم میں انسانوں کے بارے میں دو طرح کی آیتیں موجود ہیں، جنہیں سے بعض آیتیں انسان کی فضیلت و کرامت اور اچھی صفات کو بیان کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

ولقد کرمنا بنی آدم (سورہ اسریٰ/۷)۔ وفضلناھم (اسریٰ/۷)۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (سورہ تین/۴)

اسی طرح بعض قرآنی آیات انسان کو ظالم، جاہل، مایوس، کفران نعمت کرنے والا جتنی اسفل السافلین کے

درجے کا مالک بتاتی ہیں۔ ان ھم الّا کالانعام بل ھم اضل (فرقان/۴۴)

یہ دونوں تعبیریں اس لئے ہیں کہ انسان ہمیشہ اپنے آپ کو ان دونوں قطبوں کے درمیان محسوس کرے۔ اگر ہمیشہ تعریف و توصیف کی جاتی رہتی تو انسان مغرور و خود پسند ہو جاتا جس کے نتیجے میں وہ اپنے عیوب اور آفتوں کی جانب توجہ نہ دیتا۔ اس کے برعکس اگر ہمیشہ انسان کے منفی پہلوؤں کی بات ہوتی تو انسان اپنے آپ کو پست و ذلیل سمجھنے لگتا جس کے نتیجے میں امید و تحرک اور اصلاح کے دروازے اس پر بند ہو جاتے اس آیت میں دو ایسی نفسیاتی حالتوں کا تذکرہ ہوا ہے جو انسان کی سعادت و تحرک کے لیے آفت ہیں۔

(۱) جب ہم انسان کو نعمتوں سے نوازتے ہیں۔ تو وہ خدا اور حقیقت سے روگردانی اختیار کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو فرائض کی انجام دہی و ایثار سے الگ کرلیتا ہے۔ نعمت ملنے کی صورت میں معاشرتی کوششوں میں احتیاط سے کام لیتا ہے اور گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے

چنانچہ سورہ علق میں ارشاد قدرت ہے: ان الانسان لیطغیٰ ان رأہ استغنیٰ

یعنی جب انسان خود کو بے نیاز پاتا ہے تو سرکش ہو جاتا ہے۔

اسی طرح طاقت و ثروت کی آفت یہ مسائل ہیں۔ بعض مقامات پر شر و غفلت کا سبب آسائش کے امکانات، خوش حال و مطمئن زندگی بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے۔

فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللہ مخلصین لہ الدین فلما نجّٰھم الی البر اذا ھم یشرکون (عنکبوت/۶۵)

جب وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے (غرق اور مرنے کے خطرات سے دوچار ہوئے) تو خداوند عالم کو خلوص کے ساتھ یاد کرنے لگے۔ لیکن جونہی ہم نے ان کو ساحل تک پہنچایا پھر مشرک ہو گئے۔

البتہ یہ مقصد نہیں کہ اسلام مال و دولت کو ہمیشہ غفلت و بغاوت کا سرچشمہ قرار دیتا ہو اور ہم یہ سوچنے لگیں کہ غربت و تنگدستی ہی اچھی چیز ہے ایسا ہرگز نہیں بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ لوگ متمکن اور ثروت مند ہوں۔ اور انہی وسائل سے اپنی اصلاح اور معاشرے کی مدد کریں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہر نعمت کے ساتھ جو آفتیں لگی ہوئی ہیں۔ ان کے بارے میں انسان کو علم ہو تاکہ لوگ حصول نعمت کے ساتھ ان آفتوں سے خود کو محفوظ رکھ سکیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف

ونھوا عن المنکر و للہ عاقبۃ الامور (۴۱/۲۲)
وہ لوگ جن کو ہم نے جب زمین میں جاگزین کیا (ان کو حکومت اور طاقت بخشی) تو انہوں نے
نماز قائم کی زکوٰۃ دی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کیا اور تمام امور کے نتائج
خداوند عالم کے ہاتھ میں ہیں، ان کے اندر طاقت و ثروت نے یاد الٰہی کی حالت پیدا کر دی خدمت
خلق اور ایثار کا جذبہ پیدا کیا۔ بہتری اور راہ حق میں برائیوں کے خلاف جدوجہد کرنے کا حوصلہ عطا کیا۔

(۲) آیت کا دوسرا حصہ آفت مصیبت سے مربوط ہے:
جب انسان پر کسی دکھ، رنج اور مشکلات کا حملہ ہوتا ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے، جبکہ محرومیت اور مایوسی، جمود و شکست کا باعث بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان مایوس اور شکست خوردہ ہو جائے تو اس سے ہر طرح کی جدوجہد اور عمل کی امیدیں سلب ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں انسان ہر طرح کی ذلت و خواری کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تاکہ زندہ رہنے کے لیے چند لقمے حاصل کر سکے۔
یہ حالت فقر و غربت کا منفی پہلو ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ بلکہ اس طرح کی آفتوں سے دور رہنا چاہیے، ایک غریب شخص رسالتمآبؐ کے حضور پہنچا اور آپ سے مدد کی درخواست کی، حضرت نے اس شخص سے فرمایا: "من سئلنا اعطیناہ و من استغنیٰ اغناہ اللہ" جو کوئی ہم سے مانگے ہم اس کو دیں گے لیکن جو کوئی خود دولت و استغناء کی کوشش کرے گا خدا اس کو بے نیاز کر دے گا۔ رسول اکرمؐ کی یہ نصیحت باعث بنی کہ وہ شخص کام کی تلاش میں گیا اور مستقل محنت کے نتیجے میں چند ہی دنوں کے اندر خوش حال و مطمئن زندگی کا مالک بن گیا۔ حضرت ابوذر جو مکتب اسلام کے تربیت یافتہ ہیں، فرماتے ہیں: میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جس کے گھر میں کھانے کیلئے کچھ نہ ہو اور وہ ننگی تلوار لیکر اپنا حق لینے کیلئے گھر سے نکل آئے
اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی فقر و غربت بھی جدوجہد کا باعث بن جاتی ہے جس طرح جنگ شکست اور بیماری بعض قوموں کی ترقی کا سبب بنی۔ اس کے برعکس کم ترقی یافتہ تربیت اور منفی پہلو رکھنے والوں کے لیے ایک معمولی شکست ناامیدی، مایوسی اور مشکلات کا باعث بن جاتی ہے۔
لہٰذا ان دو طرح کی آفتوں سے دونوں حالتوں میں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے یعنی اول آرام و آسائش کی نعمتوں میں مغرور اور غافل نہ ہوں نیز جدوجہد و ایثار کو ترک نہ کریں ثانیاً مشکلات کے عالم میں مایوس اور پست ہو کر ذلت و خواری کو قبول نہ کریں بلکہ نعمت کے حصول کے زمانے میں خدمت، تحرک اور عفو و بخشش کے جذبے کو اپنا کر شکر بجا لانا چاہیے اور محرومیت کے موقعوں پر بھی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے ــــ و للہ عاقبۃ الامور (۴۱/۲۲)۔

جناب سید احمد فہری
ترجمہ: سید حسین مہدی حسینی

علم و تعلیم۔ امام خمینی اور شہید ثانی کی نظر میں

اخلاص عمل

حضرات اساتذہ و طلاب کے لئے "خلوص نیت" کی اہمیت و افادیت پر زور دیتے ہوئے جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ نے ائمہ ھدیٰ علیہم السلام کی احادیث کا خاصا حصہ تحریر فرمایا ہے، ان میں سے کچھ کا تذکرہ گذشتہ صفحات پر کر چکا ہوں۔ ان روایات کے تذکرہ کے بعد شہید ثانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"اگرچہ "اخلاص عمل" بے حد ممدوح و قابل قدر ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بے حد دشوار بھی ہے۔ حصول اخلاص کے لیے دقت نظر، فکر سلیم، اور سعی پیہم کی ضرورت ہے۔ ہر شخص کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے اندر جذبہ اخلاص پیدا کرے کیونکہ اعمال کی قبولیت اور سزا و جزا کا دار و مدار اخلاص ہی پر ہے۔

عابد کی عبادت، عالم کی تحصیل علم میں جد و جہد اور مجاہد کی میدان کارزار میں فداکاری اسی اخلاص کے سہارے مثمر و مفید ہو سکتی ہے۔ گویا نعمت اخلاص کو پانے کے لئے چیتے کا تجسس اور فرہاد کا جگر درکار ہے۔

اگر انسان اپنے تئیں اپنے عمل کا جائزہ لے تو اسے اندازہ ہوگا کہ اس کے انجام دئے ہوئے اعمال خدا کی "خوشنودی" کی خاطر بہت کم ہیں۔ دنیاوی مقاصد کی طمع نے اس کے عمل کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ خصوصاً طالب علموں کے یہاں یہ چیزیں زیادہ پائی جاتی ہیں کیونکہ ابتدائے تعلیم سے ان کا مقصد منصب کی آرزو، دولت و ثروت کی طمع

عوام میں اپنے علم وکمال کی شہرت اور صاحبان علم وکمال کی اہانت ہوا کرتی ہے ۔
بہت ممکن ہے اسی وقت ابلیس انہیں اپنی کمند میں لانے کے لیے ان حسین الفاظ میں گمراہ کر رہا ہو۔
تمہارا مقصد خدا کے دین اور حریم اسلام کی حفاظت ہے رسولؐ خدا جس کے بانی و موسس ہیں ۔
ابلیس کے گمراہ کرنے اور اس کی گرفت کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب حضرات طلاب کرام کی صنف کا ان سے زیادہ صاحب فضل وکمال کسی بزم میں آتا ہے اور عوام اس کا احترام واکرام کرتے ہیں ۔ اگر اس وقت یہ حضرات اس کے مقابلہ میں اپنے استقبال سے زیادہ مسرور ہیں اور جن لوگوں نے اس صاحب فضل کا اعزاز واکرام کیا اس کی بہ نسبت اپنے احترام کرنے والوں کی طرف رجحان زیادہ رکھتے ہیں تو اس کا مطلب ہے، ابلیس کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ان لوگوں کو اس کی خبر نہیں کہ وہ ابلیس کے چنگل میں آچکے ہیں ۔
کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ صاحبان علم اس حد تک تنگ نظری کا شکار ہو جاتے ہیں کہ انہیں یہ بھی گوارہ نہیں ہوتا کہ ان کے حلقہ درس کے طلبہ کسی اور سے علمی استفادہ کریں جبکہ انہیں یہ احساس ہے کہ اگر ان کے شاگرد نے ان کے علاوہ کسی اور سے استفادہ کیا تو وہ اس کی ترقی کے لیے زیادہ مفید و موثر ہوگا ۔ یہ وہی جذبۂ شہرت وعزت ہے جو اس کے نہاں خانۂ دل میں چھپا اپنا کام کرتا رہتا ہے ۔ اگرچہ اپنے تئیں یہی خیال کرتے ہیں کہ وہ ان بری صفتوں سے خالی ہیں ۔ مگر درحقیقت یہ حضرات اپنے نفس کے ہاتھوں بک چکے ہوتے ہیں ۔ اگر تعلیم کا مقصد خدا کی رضا وخوشنودی ہوتا تو جس وقت اپنے سے بہتر پڑھانے والے کی اطلاع ملی تھی ۔ ان الفاظ میں خدا کا شکر بجالانا چاہیے تھا کہ :

کریم ! تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمارے کاندھوں سے ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا کر دیا ہمارے لئے ایک معاون و مددگار پیدا کیا — کریم ! تیرا فضل ہے کہ تو نے

اس دانشور کے وجود سے پڑھے لکھوں کے عدد میں اضافہ فرمایا ۔کیونکہ اہل علم
مثل قطب زمین سنت الٰہیہ کو زندہ کرنے والے قوانین اجتماعی کے محافظ اور
بندگان خدا کے لئے معلم و راہبر ہیں ۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ابلیس اپنی گرفت میں لانے کے لئے ان افکار کو جنم دیتا ہے ۔" تم اپنی صنف کے
عالم کو دیکھ کر مغموم و ملول اس لئے نہیں ہوئے کہ عوام میں اس کی عزت و تعظیم زیادہ ہوئی بلکہ وجہ یہ ہے کہ
اگر کہیں یہ سب تمہارے مواعظ و بیان سے مستفید و متاثر ہوتے تو ان سب کا
اجر و ثواب تمہیں ملتا ۔تمہارے رنج و ملال کا سبب ثواب کی کمی ہے ثواب کی
قلت و کمی پر ملول ہونا تو ممدوح ہے ۔

مگر اس غریب سے کون کہے کہ اگر حقیقتاً ثواب کی کمی کی خاطر حزن و ملال ہے تو منصب کو اس کے اہل کے سپرد کرنے اور حق کے سامنے سپر انداختہ ہو جانے میں ثواب زیادہ ہے اور اگر کہیں یہ حقیقتاً رنج و اندوہ کی جگہ ہوتی تو درجۂ نبوت و امامت کے نہ ملنے پر حضرات انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے ماننے والوں کو بھی مغموم و محزون ہونا چاہئے تھا ۔اگر کوئی ان باتوں پر رنجیدہ خاطر ہے تو یقیناً شدید مذمت کے قابل ہے ۔یہ انداز کسی مذہبی کے لیے زیبا نہیں، حضرات انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے ماننے والوں کے شایان شان تو صرف یہی ہے کہ جب کوئی ان سے بہتر و بالاتر سامنے آجائے تو مذہبی ذمہ داریوں کو اس کے حوالہ کر کے خود پیچھے ہٹ جائیں ۔۔۔ اور اگر ایسا نہیں کیا تو اس کا مطلب ہے وسوسۂ شیطانی کا شکار ہیں ۔

حضرات اہل علم کو گمراہ کرنے کے لیے ابلیس کے پاس بے شمار حربے ہیں ۔کبھی وہ اہل علم ہی کی زبان سے اس طرح بولتا ہے ۔

اگر کوئی مجھ سے بہتر پیدا ہو جائے تو نہ یہ کہ مجھے تکلیف ہوگی بلکہ خوشی کا سبب
ہوگا ۔

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے نفس کا جائزہ و امتحان لئے بغیر اس قسم کی پیشنگوئیاں کرنا خود اسی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ابلیس کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے ۔کیونکہ بے بنیاد

وعدے کرنا نفس کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے۔ نفس کے خصوصیات میں سے ہے کہ جب تک حالات سامنے نہیں آتے اس وقت تک پامردی و بہادری کا مظاہرہ کیا کرتا ہے لیکن جس وقت حالات سامنے آجاتے ہیں اپنے کئے ہوئے وعدوں سے مکر جاتا ہے۔ ہاں! اپنے وعدوں پر وہ ڈٹا رہتا ہے۔ خدا جس کا پشت پناہ ہو۔ نفس کے ان حیلوں سے وہ شخص آشنا ہوتا ہے جس نے برسوں ریاضت نفس کی ہو ورنہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں کہ نفس کے حیلوں سے اپنے کو بچا سکے۔ اور جو اپنے نفس میں ایسے مہلک اثرات محسوس کرتا ہے اس کا منصبی فریضہ ہے کہ کسی خدا رسیدہ کو تلاش کرے جو اس کے درد کا درماں بن سکے ؎

دل بیمار شد از دست رفیقاں مددی

تا طبیباش بر سر آریم و دوای بکنیم

اور اگر کسی خدا رسیدہ تک رسائی ممکن نہ ہو تو اس فن میں لکھی ہوئی کتابوں سے استفادہ کرنا چاہئے۔ مگر افسوس آج نہ کوئی خدا رسیدہ ہے اور نہ اس فن کی کتابیں — ہاں! گذرے ہوئے قافلہ کی صدائے بازگشت ہے جو کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ معبود سے نصرت و مدد کا آرزومند ہوں — اس بے چارگی کے عالم میں جب نہ کتابیں ہوں اور نہ عارف و کامل افراد تو واجب ہے کہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر خاموشی اختیار کرے۔ یہاں تک کہ تعلیم و تعلم کے حالات فراہم ہو جائیں۔

ممکن ہے اس جگہ پھر شیطان دل و دماغ میں یہ خیالات پیدا کرتے ہوئے نمودار ہو:

اگر اصلاح نفس کے لئے ارباب علم و دانش نے اس قدر دقت نظر کا مظاہرہ کیا اور عوام کو اس کا خوگر بنایا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ علم و آگہی گھٹ جائے گی اور عوام میں آثار مذہبی مٹ جائیں گے۔ کیونکہ بہت کم ایسے ہوں گے جو ان نکتوں کی طرف متوجہ ہوں اور اپنے میں یہ حالات پیدا کر سکیں۔ چونکہ دین کی ترویج و تبلیغ اہم عبادت ہے لہٰذا یہ خیالات قابل اعتنا نہیں۔

جب شیطان نفس میں ایسے خیالات پیدا کرے تو اسی وقت صاحب نفس کا فریضہ ہے کہ اپنے نفس کو مخاطب کرتے ہوئے کہے — تو دین کی فکر نہ کر تیرے گوشہ نشین ہونے

سے دین کے آثار مٹ نہیں سکتے۔

جب تک شیطان زندہ ہے شب و روز ہزاروں افراد دہلیز اقتدار تک پہنچنے کے لئے دست و گریباں ہوتے رہیں گے۔

ارباب علم سے شیطان کے فریب سے بچو کیونکہ خدمت دین کرنے والے بہت سے ایسے افراد ہوں گے جو خدمت دین تو کر رہے ہوں گے لیکن انہیں ابلیس کی سرپرستی حاصل ہو گی جیسا کہ مرسل اعظم کا ارشاد ہے:

ان اللّٰہ یویّد ھذا الدّین باقوام لاخلاق لھم

خدا اس دین کی تائید ایسے گروہ سے کرے گا جس کے لئے خود کوئی اجر و ثواب نہ ہو گا۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت کا ارشاد ہے:

ان اللّٰہ یویّد ھذا الدین بالرّجل الفاجر

خدا اس دین کو مرد فاجر و بد کردار سے تقویت دے گا۔

ارباب علم سے! آپ کے لئے مناسب نہیں کہ آپ ان وسوسوں پر گوش بر آواز ہو کر عوام کے درمیان ظاہر ہوں اور ایک دن ایسا ہو کہ منصب و اقتدار کی تمنا آپ کے دلوں میں جڑ پکڑ لے اور نفاق کا تخم نہاخانہ دل میں نشو و نما پانے لگے، کیونکہ مرسل اعظم کا ارشاد ہے:

حب الجاہ والمال ینبت النفاق کما ینبت الماء البقل

جاہ و مال کی تمنا نفاق کو نہاخانہ دل میں اس طرح شاداب کرتی ہے جس طرح سبزے پانی سے لہک اٹھتے ہیں۔

ایک جگہ حضرت کا ارشاد ہے:

اگر دو بھیڑیے گوسفندوں کے گلہ پر ٹوٹ پڑیں تو اتنا نقصان نہیں ہو گا جتنا فرد مسلم کے حریص دنیا ہونے سے ہوتا ہے۔

اس مذموم صفت کا خواہ کم سے کم ہی اثر دل کی گہرائیوں میں کیوں نہ پایا جا رہا ہو

اس سے رہائی و خلاصی کی فکر کرنی چاہئے۔

ابلیس عوام سے زیادہ حضرات طلاب و افاضل کو اس بلا میں گرفتار کرتا ہے کیونکہ ان حضرات کا اس مذموم صفت میں مبتلا ہونا دوسروں کی بہ نسبت زیادہ نقصان دہ ہے کیونکہ ارباب علم، عوام کے لیے نمونۂ عمل ہیں اگر انہوں نے کسی ایسے کام کو انجام دیا تو عوام کو کہنے کا موقع مل جائے گا کہ اگر یہ عمل بُرا ہوتا تو پڑھے لکھے اس کے مرتکب کیوں ہوتے، اور نتیجہ میں وہ خود بھی اس کے خوگر ہوں گے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ عالم و جاہل کے گناہوں کے بوجھ میں بھی فرق ہوگا جاہل روز محشر صرف اپنے کئے کا بوجھ اٹھائے گا لیکن عالم چونکہ دوسروں کے لیے نمونۂ عمل و راہنما ہوتا ہے لہٰذا اسے اپنے کئے کی سزا تو بھگتنی ہی ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان سب کے بارِ گناہ کو اٹھانا ہوگا جنہوں نے اس کی اتباع و پیروی کی تھی۔

"احادیث حضرات ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے اس کی تائید ہوتی ہے۔"

مختصر یہ کہ تحقیقت "اخلاص عمل" کو سمجھنا بڑا دشوار مرحلہ ہے۔ "اخلاص عمل" وہ ناپید اکنار و عمیق دریا ہے جس میں مخلصین و صالحین کے سوا نہ جانے کتنے تہہ نشیں ہو گئے، انسان کا فریضہ ہے کہ اخلاص عمل کی بھرپور رعایت کرے ورنہ نادانستہ طور سے اس جادہ کا راہی و سالک ہو جائے گا جسے ابلیس نے ہموار کیا تھا۔"

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ عصر حاضر کے معلّم اخلاق حضرت امام خمینی دام ظلہ نے بھی "اخلاص عمل" کی غیر معمولی تاکید فرمائی ہے، رہبر انقلاب نے اپنی مختلف تقاریر و پیغامات میں امت اسلامیہ کو "خلوص عمل" کی اہمیت و عظمت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "خلوص عمل کا اعمال سے وہی رشتہ ہے جو روح کو جسم سے ہے۔"

امام خمینی دام ظلہ "اخلاص عمل" کے سلسلہ میں تاکید کرتے ہوئے "روایات اربعین" کی ایک روایت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"عزیزو! اپنے افعال و اعمال کا عقابی نظروں سے جائزہ لو اور ہر آن و لمحہ اپنے نفس کا محاسبہ کرو کہ اس نے جو قدم بھی راہ خیر میں اٹھایا ہے یا کس لئے تھا؟

اپنے نفس کا محاسبہ اس طرح کر سکتے ہو۔
جب تم کسی سے نماز شب کے مسائل کا سوال کرتے ہو یا اس کی دعاؤں کا تذکرہ کرتے ہو تو اسی جگہ ٹھہر کر نفس کا جائزہ لو اور اپنے تئیں سوال کرو کہ مسائل کے دریافت کرنے کی وجہ کیا ہے ؟ کہیں ایسا تو نہیں سوال کے ذریعہ لوگوں پر اظہار کرنا مقصود ہو کہ "میں نماز شب کا عادی ہوں" یا جب کبھی زیارت سے واپسی ہو اور باتوں میں بات پیدا کر کے اپنے سفر سے لوگوں کو آگاہ کرو تو ایسی جگہ اپنے نفس کو ٹٹولو کہ اس اظہار کا مقصد کیا ہے ؟ کیوں لوگوں پر یہ ظاہر کر رہے ہو کہ کتنی بار مشرف ہو چکے ہو ؟ یا مثلاً جب کبھی راہ خدا میں صدقہ دیتے ہو تو کیا وجہ ہے کہ نفس مچلتا رہتا ہے کہ کسی طرح لوگوں کو اس کی اطلاع ہو جائے اسی مقام پر ٹھہر کر سوچو اظہار کی تمنا کا سبب کیا ہے ؟ اگر نفس جواب دے کہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں میں بھی نماز شب، زیارت اور صدقہ کا جذبہ پیدا ہو جائے تو ایسے پاک باطن پر خدا کا شکر کرنا چاہیئے ـــ لیکن محاسبہ نفس کرتے وقت شیطان کے پھندے سے آزاد ہونا چاہیئے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ملعون ریاکاری کو بنام تقویٰ پیش کر رہا ہو۔ خدانخواستہ اگر عمل خدا کی خوشنودی کے لیے نہ ہو تو خدا اسے قبول نہیں کرتا۔ ریاکار عذاب جہنم کا مستحق ہے۔

ہمیں چاہیئے کہ نفس کی مکاریوں سے بچنے کے لئے خدا سے دعا کرتے رہیں اس کی تائید و توفیق کے خواہاں رہیں۔ اگرچہ اجمالی طور سے ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اعمال خالص خدا کے لئے نہیں ہوتے ہیں۔ اگر ہم خدا کے مخلص بندے ہوتے تو کیا وجہ تھی کہ ابلیس کو ہم پر اس قدر تسلط و غلبہ ہے جبکہ اس نے خدا سے وعدہ کیا ہے کہ اس کے بندوں سے کوئی سروکار نہیں رکھے گا۔ اس کے بندوں کی طرف کمند فریب و اغوا نہیں پھینکے گا۔

ہمارے جلیل القدر استاد (شاہ آبادی اعلی اللہ مقامہ) نے کیا عمدہ تشبیہ دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ابلیس کی مثال بارگاہ خداوندی کے کتے کی ہے۔ جو شخص بھی خدا سے ارتباط رکھتا ہو گا اس پر نہ ابلیس بھونکے گا اور نہ اذیت دے گا۔ کیونکہ گھر کا

کتا گھر میں آنے جانے والوں پر حملہ آور نہیں ہوتا، بلکہ ان پر غراتا ہے جو اجنبی ہوتے ہیں۔ اسی طرح شیطان بھی خانۂ خدا میں انہیں داخلہ کی اجازت نہیں دیتا جو صاحبِ خانہ (خدا) سے آشنائی نہیں رکھتے — لہٰذا جب کبھی یہ دیکھو کہ شیطان کو تم پر تسلط ہے تو سمجھ لو کہ تمہارے افعال و اعمال رضائے خدا کے لئے نہیں انجام پائے ہیں اگر تم اپنے افعال و اعمال میں مخلص تھے تو کیا وجہ ہے کہ حکمت و آگہی کا چشمہ تمہارے قلب سے تمہاری زبان پر موجزن نہ ہوا جبکہ حدیث معصوم ہے:

اگر کسی نے چالیس شبانہ روز خدا کی خوشنودی کی خاطر عمل انجام دیا تو حکمت و معرفت کے دریا اس کے قلب سے زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔

اس کے معنی ہیں کہ ہمارے اعمال خدا کے لیے نہیں انجام پاتے، یہ اور بات ہے کہ ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔ یہی وہ مرض ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔

افسوس ہے ان نماز گذار اور جمعہ و جماعت میں شرکت کرنے والے دیندار افراد پر کہ وہ میدان محشر میں لائے جائیں گے تو انہیں اس وقت احساس ہو گا کہ نہ صرف گناہ گار ہیں بلکہ ان کا نامہ اعمال سیاہ ہے اور ان کا شمار کافر و مشرک کے زمرہ میں ہے۔

افسوس ان لوگوں پر ہے جو طاعت و بندگی کے بعد جہنم میں ڈالے جائیں۔ یہ وہی لوگ ہوں گے جنھوں نے نمازیں پڑھی ہوں گی، روزے رکھے ہوں گے، صدقے دئے ہوں گے، لیکن ریاکاری اور دکھاوے کے سبب ان کے اعمال رائگاں ہو جائیں گے اور ان کا شمار مشرکین کی فہرست میں ہو گا۔

عقیدۂ توحید رکھنے والے گناہ گار کے گناہ کو خدا اپنے فضل و کرم سے بخش دے گا۔ لیکن مشرک کے لئے خود اسی کا ارشاد ہے کہ اگر توبہ کئے بغیر مر جائے تو مغفرت نہیں ہو گی آپ نے سنا ہو گا حدیث معصوم ہے — "ریاکار مشرک ہے" —

ہم میں سے جو بھی اپنے مذہبی عہدے، درس و تدریس، روزہ و نماز، اور اعمال صالحہ کو عوام پر اس لئے ظاہر کرتا ہے کہ لوگوں کے دل میں اس کی قدر و منزلت پیدا ہو تو ایسا شخص نگاہ معبود میں مشرک ہے۔ اور آیات و روایات کی روشنی میں لائق مغفرت نہیں۔

یہی وہ وقت ہے جب ضمیر آواز دیتا ہے۔

اے انسان! کاش فسق و فجور کی آلودگی، گناہوں کی کثافت میں "غرق" لیکن عقیدہ توحید کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں پہنچا ہوتا تو نجات کی امید تھی۔ ریاکاری کی طاعت و بندگی نے تجھے نہ صرف محروم ثواب کیا بلکہ مشرکین کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ عزیزو! اپنے انجام کی فکر کرو، عوامی شہرت و عزت کوئی حقیقت نہیں رکھتی، انسانی قلوب کی کوئی حیثیت نہیں، یہ تو اتنا بھی نہیں کہ اسے کھا کر ایک پرندہ مختصر و معمولی سیر ہو سکے۔

قادر و توانا صرف خدا ہے اس کی عظمت و جلالت کے سامنے انسان کی کوئی حقیقت نہیں فاعل علی الاطلاق اور مسبب الاسباب صرف اس کی ذات گرامی ہے۔ اہل دنیا اگر ایک دوسرے کے مددگار بھی ہو جائیں تو معمولی سے مچھر اور مکھی پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ یہ تو یہ مکھیاں اگر ان کے دسترخوان سے اپنے دہن میں لے کر کچھ اڑ بھی جائیں تو یہ اس کے واپس لینے پر قادر نہیں۔ قدرت صرف اور صرف دست پروردگار عالم میں ہے۔ تمام موجودات عالم پر اس کا حکم چل رہا ہے۔

ہر انسان کو چاہیئے لوح قلب پر جس طرح ہو سکے عقل و خرد کے قلم سے تحریر کرے — لاموثر فی الوجود الا اللہ — غیر از خدا کوئی موثر نہیں۔ مرحلہ توحید میں سب سے پہلا مرحلہ "توحید فعلی" کا ہے۔ "توحید فعلی" کے معنی ہیں صفحہ قلب پر "کلمہ لاالہ الا اللہ" کا گہرا نقش ابھارنا تاکہ اس کے ذریعہ دل مضطرب کو سکون اور فکر پریشان کو اطمینان مل سکے۔ "کلمہ لاالہ الا اللہ کی حقیقت کے ذریعہ دل کو باور کرائیے کہ انسان نفع و نقصان پر قادر نہیں۔ ضرر و نفع پر قادر صرف خداوند کریم ہے — عزیزو! اگر فکر کے آئینہ کو اس کثافت و کدورت سے پاک و صاف نہیں کیا تو خوف ہے کہیں "رب لما حشرتنی اعمیٰ" کے مصداق نہ ہو جاؤ۔

اگر قلب نے "کلمہ توحید" سے اطمینان حاصل کر لیا اور اسے جزو عقیدہ قرار دے دیا تو امید ہے کہ بقیہ افعال بھی صحیح انجام پائیں گے اور شرک و ریا و کفر و نفاق کا دور دور گذر نہ ہو سکے گا۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ وہ عقیدہ ہے کہ عقل و شرع

جس کی تائید کرتی ہے۔ اس میں جبر کا کہیں سے شائبہ نہیں۔

ممکن ہے کچھ افراد جو کلمۂ "توحید" کے ابتدائی و بنیادی مطالب سے علم و آگہی نہیں رکھتے وہ اسے جبر سے تعبیر کریں، اگرچہ ایسا نہیں، لا الہ الا اللہ کہنا توحید ہے اور جبر توحید نہیں شرک ہے۔ لا الہ الا اللہ ہدایت ہے اور جبر ضلالت و گمراہی ہے۔

جبر و قدر کے بیان کا یہ موقع نہیں، جو لوگ جانتے ہیں ان پر معنی واضح و روشن ہیں کہ جبر و توحید میں کیا فرق ہے۔

بہرحال پروردگار عالم سے ہر آن و لمحہ خصوصاً تنہائیوں میں گریہ وزاری خاکساری وانکساری کے ساتھ دعا کرنا چاہیئے کہ جادہ ہدایت پر چلنے کی توفیق اور قلب کو نور وحدانیت سے منور فرمائے۔ تاکہ دنیا کی ہر چیز نظروں میں ہیچ ہو جائے۔ گریہ وزاری کے ساتھ خدا سے دعا کرنی چاہیئے کہ عمل میں اخلاص باقی رہے اور ہمیشہ خلوص عمل کی رہنمائی بھی کرتا رہے۔ عزیزو! جب آپ میں خدا سے راز و نیاز کی حالت و کیفیت پیدا ہو تو اپنی دعاؤں میں مجھ بندہ ضعیف و بے مایہ و بے حقیقت کو جس نے اپنی پوری عمر ہوا و ہوس" امراض قلبی میں گذار دی ہے جس پر نہ کسی آیت کا اثر ہوا اور جسے نہ کسی دلیل و برہان نے متأثر کیا" فراموش نہ فرمائیں گے۔ ممکن ہے آپ کی دعاؤں سے کوئی راہ نجات پیدا ہو جائے۔ کیونکہ خدا مومن کی دعائیں رد نہیں کرتا۔"

جناب احمد بن زینی دحلان مفتی مکہ
ترجمہ: جناب خادم حسین

فتنۂ وہابیت

احمد بن زین بن احمد دحلان مکی، فقیہ، مؤرخ اور مختلف علوم کے ماہر تھے، آپ شیخ الاسلام اور مفتی مکہ کے درجہ پر فائز ہوئے۔ موصوف ۱۲۳۱ھ کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۴ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پا گئے۔ آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، پیش نظر مقالہ موصوف نے وہابیوں کے خلاف سنی مسلک کے نقطۂ نظر سے تحریر فرمایا ہے۔ ادارہ پوری امانت کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

سلطان سلیم سوم (سنہ ۱۲۰۴ - سنہ ۱۲۲۲ھ) کے دور حکومت میں بہت سے فتنوں نے سر ابھارا، ان میں سے دو قابل ذکر ہیں ایک حجاز میں وہابیوں کا فتنہ جس میں انہوں نے حرمین شریف پر قبضہ کر کے مصری و شامی حاجیوں پر پابندی لگائی تھی اور دوسرا فرانسیسیوں کا فتنہ جس میں (سنہ ۱۲۱۳ سے

۱۲۱۶ھ تک) مصر پر قبضہ ہوا تھا۔ ہم دونوں کے بارے میں مختصر طور پر بیان کریں گے کیونکہ تفصیلات کتب تاریخ میں درج ہیں اور دونوں کے بارے میں متعدد کتابیں اور رسائل بھی شائع ہو چکے ہیں جہاں تک وہابی فتنہ کی بات ہے، یہ لوگ شروع میں امیر مکہ اور حجاز میں سلطنت عثمانیہ کی طرف سے مقرر کردہ نائب شریف غالب بن مساعد سے جنگ میں مصروف رہے، جنگ کا آغاز ۱۲۰۵ھ سلطان سلیم سوم ابن سلطان مصطفیٰ سوم ابن احمد کے دور سلطنت میں ہوا۔ وہابی فرقہ اس واقعہ سے کئی سال پہلے ہی وجود میں آچکا تھا۔ شروع میں ان لوگوں کی شان و شوکت و طاقت ان ہی کے ملک کے دائرے میں محدود تھی، بعد میں شرارت و شیطنت میں مزید وسعت اور اضافہ ہوا، لاتعداد افراد کو قتل کیا، ان کا مال لوٹا اور عورتوں کو بیوہ کر دیا، یہاں تک کہ ان کا ملک وسعت کے اعتبار سے روز بروز بڑھتا گیا۔ اس فرقہ کا بانی محمد بن عبدالوہاب نامی ایک خبیث شخص تھا، جس کا تعلق مشرق کے قبیلہ بنی تمیم سے تھا، عمر دراز پانے کے نتیجہ میں لوگ اسے صاحب نظر اور تجربہ کار سمجھتے تھے کیونکہ سو سال کے قریب عمر پائی تب کہیں جا کر یہ مصیبت سامنے آئی۔ وہ ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوا اور ۱۲۰۷ھ میں ہلاکت پائی، بعض مورخین نے تاریخ ہلاکت ۱۲۰۶ھ بتائی ہے۔

یہ شخص شروع میں مدینہ منورہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے مقیم تھا، اس کے والد کا شمار نیک و صالح علماء میں تھا اور یہی حال اس کے بھائی شیخ سلیمان کا تھا، اس کے باپ بھائی اور مشائخ بسا اوقات اس کی حرکتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ شخص گمراہی و ذلت و خواری کے اسباب فراہم کرے گا اور یہی وجہ تھی کہ اکثر اوقات اسے ڈانٹتے پھٹکارتے رہتے اور لوگوں کو اس سے خبردار کرتے تھے، یہاں تک کہ خدا نے انھیں وہ دن بھی دکھا دیا جس میں اس نے گمراہ کن خیالات و افکار کی مدد سے جاہل افراد کو اپنا شکار بنایا، علماء دین کی مخالفت کی اور مومنین پر کفر کا الزام لگایا اور یہ دعویٰ کیا کہ زیارت قبر رسول ؐ و اولیاء و صالحین بدعت و شرک ہے، حاجت روائی کے لئے رسول اللہ ؐ کو مخاطب قرار دینا شرک ہے اور جو کوئی خدا کے سوا کسی دوسرے کا سہارا لیتا ہے خواہ وہ مجازی طور پر ہی کیوں نہ ہو مشرک کہلائے گا، مثال کے طور پر جیسے فلاں

دوا نے مجھے فائدہ پہنچایا یا فلاں پیر و ولی نے میری حاجت پوری کی۔ غرض کہ طرح طرح کے بے بنیاد دلائل کا سہارا لیا، دھوکہ فریب پر مبنی عبارتیں گڑھ کر عام انسانوں کو دھوکا دیا یہاں تک کہ کچھ لوگ اس کی پیروی بھی کرنے لگے۔ اس سلسلے میں اس نے کئی کتابچے بھی شائع کئے جس کے نتیجہ میں اس کے ماننے والے اکثر و بیشتر اہل توحید کو کافر سمجھنے لگے۔ امراء مشرق اور درعیہ کے باشندوں سے میل مراسم بڑھائے یہاں تک کہ وہ لوگ نصرت دعوت پر آمادہ ہو گئے اور اسے اپنے اقتدار کی توسیع و قوت کا ذریعہ سمجھنے لگے، ان لوگوں نے عرب و صحرا نشینوں پر حملے شروع کئے اور انھیں اس طرح اپنا مطیع و فرمانبردار بنالیا کہ انھیں اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ جو کوئی ابن عبدالوہاب کے کہے کی اطاعت نہیں کرتا وہ شخص ظالم، کافر، مشرک ہے اس کا خون مباح اور حلال ہے، اس فتنہ و فساد کی جڑ ۱۱۴۳ھ میں نمودار ہوئی اور ۱۱۵۰ھ کے بعد سے پھیلنا شروع ہوئی۔ علماء دین نے اس کی تردید و مخالفت میں بہت سے رسالے شائع کئے یہاں تک کہ اس کے بھائی شیخ سلیمان اور اس کے اساتذہ نے بھی مخالفت میں قلم اٹھایا۔ جن لوگوں نے اس کی نصرت و مدد کی اور اس کی دعوت کو فروغ بخشا ان میں مشرق کے امیر محمد بن سعود والی درعیہ کا نام سرفہرست ہے اس شخص کا تعلق بنی حنیفہ قوم مسلیمہ الکذاب سے تھا جب محمد بن سعود کا انتقال ہوا تو اس ذمہ داری کو اس کے بیٹے عبدالعزیز بن محمد بن سعود نے نبھایا۔ مدینہ منورہ میں ابن عبدالوہاب کے اکثر و بیشتر اساتذہ کا کہنا تھا کہ یہ شخص گمراہ ہوگا یا اس کے ذریعہ وہ لوگ گمراہ ہوں گے جو شقی ہیں اور اپنے دل میں خوف خدا نہیں رکھتے اور وہی ہوا۔ محمد ابن عبدالوہاب نے اپنے مذہب کے سلسلے میں یہ دعویٰ کیا کہ اس مذہب کا اصلی مقصد شرک سے دوری و برائت اور توحید خالص ہے۔ چھ سو سال سے لوگ شرک میں مبتلا ہیں اور اس نے دین کو نئی زندگی و حیات بخشی ہے۔ مشرکین کے سلسلے میں نازل ہونے والی آیتوں کو اہل توحید کی جانب منسوب کیا، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے،

ومن اضلّ ممّن یدعوا من دون اللہ من لایستجیب لہ الیٰ یوم القیامۃ وھم عن دعائھم غافلون۔

اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو سکتا ہے جو خدا کے سوا ایسے شخص کو پکارے جو اسے قیامت تک جواب ہی نہ دے۔ اور ان کو ان کے پکارنے کی خبر تک نہ ہو۔

یا ارشاد ہوتا ہے:

ولا تدع من دون اللہ مالا ینفعک ولا یضرک

اور خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کو نہ پکارنا جو نہ تجھے نفع ہی پہنچا سکتی ہے نہ نقصان ہی پہنچا سکتی ہے۔

اس طرح کی اور دوسری بہت سی آیتیں ہیں مذکورہ آیتوں کے سہارے محمد بن عبد الوہاب نے یہ دعویٰ کیا کہ جو شخص پیغمبر گرامیؐ یا دیگر انبیاء و رسل اور اولیاء و صالحین کو شفاعت یا حاجت روائی کے لئے پکاریگا اس کا شمار مشرکوں میں ہوگا اور یہ آیتیں اس پر صادق قرار پائیں گی، اس طرح سے اس نے خاتم المرسلینؐ اور دوسرے اولیاء و انبیاء و صالحین کی زیارت اور ان کے مزاروں پر حاضری دینے کو شرک قرار دیا اس نے اس آیت:

"ما نعبدهم إلا ليقربونا الى الله زلفىٰ"

(اور کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ خدا کی بارگاہ میں ہمارا تقرب بڑھا دیں گے۔

کے سلسلے میں جو مشرکوں کی بت پرستی کو بیان کرتی ہے کہا:

جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کو حاجت کے وقت پکارتے ہیں۔ ان کی مثال ان مشرکوں کی ہے جو کہتے ہیں: ما نعبدهم إلا ليقربونا الى الله زلفىٰ (ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ خدا کی بارگاہ میں ہمارا تقرب بڑھا دیں گے۔)

اس سلسلے میں وہ کہتا ہے:

مشرکوں کا عقیدہ یہ نہ تھا کہ بت ہی تمام اشیاء خلق کرتے ہیں بلکہ قول باری تعالیٰ کے مطابق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تمام اشیاء کا خالق خدا ہے۔

ولئن سألتهم من خلقهم ليقولن الله (الزخرف/۸۷)

اور اگر تم ان سے پوچھو گے کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے۔

ولئن سألتهم من خلق السموات والارض ليقولن الله (لقمان/۲۵)

اور (اے رسولؐ) تم اگر ان سے پوچھو کہ سارے آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور کہدیں گے اللہ تعالیٰ نے۔

اور خداوند کریم نے انھیں مشرک و کافر صرف اس لئے قرار دیا کہ وہ لوگ یہ کہتے تھے:

"لیقربونا الی اللہ زلفی" اس طرح سے ان لوگوں کی مثال بھی کافروں کی ہے جو خدا کے سوا کسی دوسرے کو حاجت روائی کے لیے پکارتے ہیں۔ اس کے دعوے کی تردید میں بہت سے رسائل شائع کئے گئے اور اس کے دعویٰ کو باطل قرار دیا گیا کیوں کہ مومن، انبیاء و مرسلین اور اولیاء و صالحین علیہم افضل الصلوات والسلام کی پرستش نہیں کرتے اور نہ ہی انھیں خدا کا شریک مانتے ہیں بلکہ ان کا عقیدہ تو یہ ہے کہ وہ لوگ خدا کے پیدا کئے ہوئے بندے ہیں اور ان کی عبادت کرنا جائز نہیں جبکہ مشرکین جن کے بارے میں مذکورہ آیت نازل ہوئی وہ لوگ بتوں کو لائق پرستش سمجھتے تھے اگرچہ ان کا عقیدہ یہ رہا کہ بت کوئی شئ پیدا نہیں کرتے لیکن جہاں تک مؤمنین کی بات ہے وہ انبیاء و اولیاء علیہم السلام کو ربوبیت یا پرستش کی نظر سے ہرگز نہیں دیکھتے بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ لوگ خدا کے محبوب بندے ہیں اور انہیں کی برکت سے خدا اپنے بندوں پر رحم و کرم کرتا ہے، اس لئے وہ لوگ ان متبرک ہستیوں کو واسطہ و ذریعہ قرار دیتے ہیں اور ان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کے متعدد شواہد خود کتاب و سنت میں موجود ہیں۔ مسلمان نفع نقصان یا فائدہ پہنچانے والا خالق اور مستحق و لائق عبادت صرف خداوند وحدہ لاشریک کو جانتے اور مانتے ہیں، اس کے ماسوا کسی دوسرے کی تاثیر کے معتقد نہیں۔ انبیاء و اولیاء کسی شئ کو خلق نہیں کرتے اور نہ سود و زیاں ان کے اختیار میں ہے، خداوند کریم صرف ان کی برکت کے نتیجہ میں اپنے بندوں پر رحم و کرم کرتا ہے، جبکہ مشرکوں کا شرک اس بات میں مضمر تھا کہ وہ لوگ بتوں کی پرستش کرتے تھے اور انہیں عبادت و ربوبیت کا مستحق سمجھتے تھے، مشرک محض اس لیے نہیں کہلائے کہ انہوں نے کہدیا تھا: "مانعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی" بلکہ انکا عقیدہ یہ تھا کہ بت، پرستش کے لائق ہیں اور جب بت پرستی کا الزام ان کے سر آیا تو معذرت کے ساتھ کہنے لگے "ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ خدا کی بارگاہ میں ہمارا تقرب بڑھا دیں گے۔" لہٰذا محمد بن عبدالوہاب یا اس کے ماننے والوں کو کونسا حق پہنچتا ہے کہ وہ مومنین کو ان مشرکین کے مثل قرار دیں جو بتوں کی عبادت و پرستش کو جائز مانتے ہیں؟ جبکہ مذکورہ آیتیں اور اس کی نظیر دوسری تمام آیتیں مومنین سے نہیں کفار و مشرکین سے مخصوص ہیں۔ امام بخاری نے عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوارج کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا: "یہ لوگ کافروں سے متعلق آیتوں کا سہارا لے کر انہیں مؤمنین کے سر تھوپتے ہیں۔" ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اخوف ما اخاف علی امتی رجل یتأول القرآن یضعہ فی غیر موضعہ۔"
اپنی امت میں سب سے زیادہ خوف مجھے اس آدمی سے ہے جو قرآن کی بے جا و مہمل تاویل کرے۔

مذکورہ دونوں احادیث اسی وہابی طائفہ اور اس مذہب کے ماننے والوں پر صادق آتی ہیں اور اگر بالفرض حاجت روائی یا شفاعت کے لئے کسی کو ذریعہ بنانے کا عمل شرک ہوتا جسے مومنین برابر انجام دیتے ہیں تو یہ عمل رسول یا اُن کے اصحاب و اسلاف سے سرزد نہ ہوتا، اور یہ بات مستند احادیث و روایات میں موجود ہے کہ رسول اللہؐ کی دعاؤں میں سے ایک دعا ہمیشہ یہ تھی:

اللّٰھم انی اسألک بحق السائلین علیک
بار الہا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ان سوالیوں کے صدقے میں جو تجھ سے سوال کرتے ہیں۔

بے شک یہ عمل غیر اللہ کو وسیلہ بنانے کے مرادف ہے، لیکن اس کے باوجود پیغمبر اسلامؐ اپنے اصحاب کو یہ دعا سکھاتے تھے اور دہرانے کی تلقین کیا کرتے تھے، اس سلسلے میں تفصیلی بحث اُن کتب و رسائل میں درج ہے جو محمد بن عبد الوہاب کی تردید میں لکھی جا چکی ہیں، اور یہ بات بھی رسولِ خدا کے بارے میں صحیح ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام کی والدۂ ماجدہ فاطمہ بنت اسد (رحمۃ اللہ علیہا) کا انتقال ہوا تو آنحضرتؐ نے ہی دست مبارک سے قبر میں اتارا اور دعا کی" اللّٰھم اغفر لأمی فاطمۃ بنت اسد و وسّع علیھا مدخلھا بحق نبیک و الانبیاء الذین من قبلی انک ارحم الرّاحمین۔"

حدیث صحیح میں ہے کہ رسول اللہؐ کی خدمت میں ایک نابینا حاضر ہوا اور آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ وہ اپنی دعاؤں سے اس کی بینائی لوٹا دیں تو آنحضرتؐ نے اسے طہارت اور دو رکعت نماز بجا لانے کے بعد یہ دعا پڑھنے کا حکم دیا" اللّٰھم انی اسئلک و اتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ یا محمد انی اتوجہ بک الی ربی فی حاجتی لتقضی اللّٰھم شفعہ فیّ " پالنے والے میں تیرے نبی محمد رحمۃ للعالمین کا واسطہ دیکر تجھ سے سوال کرتا ہوں اے محمدؐ آپ کا سہارا لے کر اپنے پروردگار کی طرف حاجت روائی کے لئے رخ کرتا ہوں۔ اس شخص نے

عمل انجام دیا اور خدا نے اس کی بینائی واپس کر دی۔

ایک دوسری حدیث صحیح میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ہمارے نبیؐ کا واسطہ اس وقت دیا تھا جب انہوں نے شجرہ ممنوعہ سے تناول فرمایا۔ اس کے بعد آدمؑ نے جب عرش پر جنت کے کمروں اور ملائکہ کی جبین پر آنحضرتؐ کا نام دیکھا تو خدا سے اس کے بارے میں سوال کیا خدا نے جواب دیا: اے آدم یہ تمہاری اولاد میں سے ایک فرزند ہے اگر یہ نہ ہوتا تو تمہیں پیدا نہ کرتا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا: "پروردگارا! اس فرزند کے صدقے میں اس باپ پر رحم فرما! ندا آئی اے آدم اگر تم نے اہل زمین و آسمان کی شفاعت کے لیے محمدؐ کا واسطہ دیا ہوتا تو ہم انہیں بھی معاف کر دیتا۔" اسی طرح حضرت عمر نے اس وقت حضرت عباس بن عبد المطلب کا واسطہ دیا تھا جب لوگ طلب باراں کے لئے اکٹھا ہوئے تھے، ان کے علاوہ بھی بہت سی مشہور روایات ہیں مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ نابینا والی دعا کو صحابہ کرام آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بھی پڑھتے رہے حالانکہ اس روایت میں لفظ یا محمدؐ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ طلب حاجت کے لیے پکارا گیا ہے، جو لوگ صحابہ کرام یا ان کے تابعین کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں اس طرح کی باتیں کثرت سے ملیں گی، منجملہ بلال بن الحارث صحابی رسولؐ کا آنحضرت کی قبر کے پاس یہ کہنا: "یا رسول اللہ استسق لامتك" بالکل اسی دعا کے مانند ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیارت اہل قبور کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے۔ جن لوگوں نے محمد بن عبد الوہاب کے خلاف قلم فرسائی کی ان میں اسی کے بڑے بڑے اساتذہ منجملہ شیخ محمد بن سلیمان کردی شامل تھے جنہوں نے "متن" "بافضل" کی شرح ابن حجر پر حاشیہ لکھی ہے، موصوف نے محمد بن عبد الوہاب کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: "اے محمد بن عبد الوہاب میں تمہیں رضائے خدا کے لئے نصیحت کرتا ہوں کہ تم مسلمانوں کی برائی کرنا چھوڑ دو، اگر تم کسی شخص سے یہ سنو بھی کہ وہ طلب حاجت کے لیے کسی دوسرے کا سہارا لے کر خدا کے سوا اس کی تاثیر کا قائل ہے تو اسے صحیح راستہ دکھلاؤ اس کے سامنے ایسے دلائل پیش کرو کہ وہ مان جائے کہ خدا کے سوا کسی دوسرے کی کوئی تاثیر نہیں اور اگر سننے کر بھی انکار کرے تو صرف اسی پر کفر کا فتویٰ لگاؤ تمہیں تمام مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگانے کا کوئی حق نہیں، جبکہ تم تمام مسلمانوں کے بہ نسبت چھوٹی سی اقلیت ہو، جو شخص مسلمانوں کی اکثریت سے خارج ہوگیا ہے نسبت کفر کا وہ زیادہ سزاوار ہے اس لئے کہ وہ ایمان نہ رکھنے والوں کے طریقے پر عمل کرتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ومن یشاقق الرسول من بعدِ ماتبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولّه ماتولّیٰ ونصله جهنم وساءت مصیرا۔ (النساء/۱۱۵)

اور جو شخص راہ راست کے ظاہر ہونے کے بعد رسولؐ سے سرکشی کرے اور مؤمنین کے طریقے کے سوا کسی اور راہ پر چلے تو جدھر وہ پھر گیا ہے ہم بھی ادھر ہی پھیر دیں گے اور (آخر) اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ تو (بہت ہی) برا ٹھکانا ہے۔

بھیڑیا انھیں بھیڑ بکریوں پر ہاتھ صاف کرتا ہے جو اپنے گلے سے الگ ہوگئی ہوں۔ جہاں تک زیارت قبر رسولؐ کی بات ہے تو صحابۂ کرام اور بعد کے سبھی بزرگوں نے اس عمل کو انجام دیا ہے، نیز فضیلت زیارت کے سلسلے میں بہت سی احادیث علیحدہ طور پر قلم بند ہوئی ہیں۔ خدا کے سوا غائب، میّت (مردہ) اور عباد کو پکارنے کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اذا افلتت دابة احدکم بارض فلاة فلیناد یا عباد الله احبسو فان لله عباداً یجیبونه۔"

اگر کسی کا چوپایہ نامعلوم جگہ پر کھو جائے تو اسے پکارنا چاہیئے، اے خدا کے بندو! اسے روک لو، یقیناً خدا کے ایسے بندے بھی ہیں جو کہا مان لیں گے۔

اور دوسری حدیث ہے:

اذا اضل احدکم شیئاً او اراد عوناً وهو بارض لیس فیها انیس فلیقل یا عباد الله اعینونی وفی روایة اغیثونی فان لله عباداً لا ترونهم۔"

اگر تم میں سے کوئی شخص ایسی جگہ جہاں کوئی یاور و مددگار نہ ہو، کوئی شئی کھو بیٹھے یا مدد کا خواہاں ہو، اسے چاہیئے کہ وہ پکار کر کہے اے خدا کے بندو! میری مدد کرو (دوسری روایت میں اعینونی کی جگہ لفظ اغیثونی استعمال ہوا ہے) اس لیے کہ خدا کے ایسے بندے بھی موجود ہیں جنھیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کبھی سفر کیا کرتے اور رات ہو جاتی تو کہا کرتے تھے، "یا ارض ربی و ربک الله" زمین تیرا اور میرا پروردگار خدا ہے۔ اسی طرح زیارت کے دوران کہا کرتے تھے: "السلام علیکم یا اهل القبور" یا تشہد کو لیجیے

جس میں ہر مسلمان "السلام علیک ایہا النبی" نماز کے دوران کہتا ہے، غرضکہ کسی کو پکارنے یا واسطہ قرار دینے میں کوئی قباحت نہیں مگر یہ کہ وہ پکارے جانے والے یا جسے واسطہ قرار دیا گیا ہے۔ لسے صاحب تاثیر مستقل مانے لیکن اگر وہ اس بات کا معتقد ہو کہ خدا کے سوا کسی دوسرے کی کوئی تاثیر نہیں تو اسمیں کوئی حرج نہیں، اسی طرح کسی فعل کو خدا کے ماسوا کسی سے منسوب کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اسی کی تاثیر کا معتقد نہ ہو، جو خدا کی تاثیر کے سوا کسی دوسرے کی تاثیر کا قائل نہ ہو گویا اس نے مجاز عقلی کی بنا پر وہ بات کہی ہے جیساکہ اس دوا نے مجھے فائدہ پہنچایا یا مثلاً فلاں ولی نے مجھے شفا بخشی یا مثال کے طور پر کوئی شخص کہے، اس کھانے نے میرا پیٹ بھر دیا، اس پانی نے میری پیاس بجھا دی، اس دوا نے مجھے شفا بخشی، لھذا اس طرح کی باتیں اگر مسلمان سے صادر بھی ہوتی ہیں تو مراد مجاز پر مبنی ہوتی ہے، اور اس سلسلے میں اسلام بہترین نمونہ ہے، لہٰذا اس بارے میں کسی کو کافر ٹھہرانا مناسب نہیں، محمد بن عبد الوہاب کی تردید میں جو کچھ مختصر طور پر بیان کیا گیا کافی ہے اور جسے تفصیل میں جانا ہو وہ ان کتب و رسائل کی طرف رجوع کرے جو اس سلسلے میں شائع ہوئی ہیں، میں نے بھی ایک مختصر رسالے میں تمام باتیں ذکر کی ہیں جو شخص دیکھنا چاہے اسے دیکھ سکتا ہے۔ جب محمد بن عبد الوہاب اور اس کے ماننے والوں نے اس خبیث دعوت (جس کے ذریعہ مسلمانوں اور مومنین کو کافر ٹھہرایا گیا) کا آغاز کیا، مشرق کے قبائل کو یکے بعد دیگرے اپنا مطیع و فرماں بردار بنالیا، ان کے اقتدار میں وسعت ہوئی، یمن و حرمین اور قبائل حجاز کو اپنے قبضے میں کر لیا، اس طرح سے ان کا ملک شام سے لے کر مزریب تک پھیل گیا۔ شروع میں ان لوگوں نے اپنے علماء کو حرمین شریفین یہ سوچ کر روانہ کیا تھا کہ یہ لوگ مکر و فریب اور جھوٹ کے سہارے علماء حرمین کے افکار و خیالات بدل دیں گے، جب یہ لوگ حرمین پہنچے اور علماء حرمین کے سامنے اپنے عقائد کا تذکرہ کیا جواب میں تردید کے سوا کچھ نہ حاصل ہوا، اس کے علاوہ علماء حرمین نے واضح دلائل و براہان کے ذریعہ ان کے عقائد کے فساد اور ان کی کفر آمیز باتوں کو آشکار کر کے قاضی شرع مکہ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا تاکہ عوام پر ان کا کفر واضح ہو جائے۔ وہابی علماء حرمین کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکے جس سے علماء حرمین پر ان کی جہالت و گمراہی واضح ہو گئی۔ یہ واقعہ شریف مسعود بن سعید بن زید (متوفی ۱۱۶۵ھ) کے دورۂ امارت میں ہوا، شریف نے ان ملحدوں کو قید کرنے کا حکم صادر کیا، کچھ قید کر لئے گئے،

اور کچھ لوگ فرار ہوگئے، فراریوں نے اپنے علاقے درعیہ پہنچکر جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا نتیجہ میں ان کی گمراہی وتکبر میں مزید اضافہ ہوا، اسی کے بعد سے امراء مکہ نے ان کے مکہ میں حج کے لیے داخل ہونے پر پابندی لگائی، یہ لوگ رفتہ رفتہ ان قبائل پر حملے کرنے لگے جو امیر مکہ کے تابع وفرماں بردار تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۲۰۵ھ میں امیر مکہ شریف غالب بن مساعد بن سعید بن سعد بن زید اور ان کے درمیان جنگ چھڑ گئی اسی دوران بہت سے واقعات نمودار ہوئے، بہت سے لوگ مارے گئے، رفتہ رفتہ ان کا اقتدار بڑھتا گیا ان کی بدعت پھیلتی گئی یہاں تک کہ اکثر وبیشتر قبائل واعراب جو امیر مکہ کے زیر اطاعت تھے وہ وہابیوں سے مغلوب ہوگئے، سنہ ۱۲۱۷ھ میں ان لوگوں نے لشکر فراہم کرکے ذی القعدہ کے مہینے میں طائف کا محاصرہ کر لیا اس پر قبضہ کرکے تمام باشندوں کا قتل عام کر دیا، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو نہ چھوڑا، سوائے چند لوگوں کے کوئی ان کے شر سے نجات نہ پاسکا، تمام سامان لوٹ کر مکہ کی جانب رخ کرنا چاہ ہی رہے تھے کہ انھیں مکہ میں بہت سے مصری وشامی حاجیوں کی موجودگی کا علم ہوا، اور اس ڈر سے کہ تمام حاجی ان سے مقابلے پر کمربستہ نہ ہوجائیں، انہوں نے اواخر ماہ حج اور حاجیوں کی واپسی تک طائف میں قیام کیا، اس کے بعد اپنا لشکر لے کر مکہ پر قبضہ کرنے کے لئے راہی مکہ ہوئے، شریف غالب مقابلے کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے راہی جدہ ہوئے، اور اہالی مکہ نے اس خوف کے تحت کہ وہابی ان کے ساتھ وہی سلوک نہ کر بیٹھیں جو طائف کے باشندوں کے ساتھ کیا تھا، انہوں نے اپنا نمائندہ وہابیوں کے پاس بھیج کر پناہ طلب کی، ان لوگوں نے پناہ دی اور ۸ محرم سنہ ۱۲۱۸ھ مکہ میں داخل ہوگئے، یہ لوگ ۱۴ دن رہے اور اپنے تئیں لوگوں کے اسلام کی تجدید کرتے رہے اور لوگوں کو مزاروں پر جانے اور دعائیں مانگنے (جو ان کے نزدیک شرک ہے) سے روکتے رہے۔ اس کے بعد یہ لوگ اپنا لشکر لے کر شریف غالب امیر مکہ کے مقابلے کے لئے جدہ روانہ ہوئے، جب ان لوگوں نے جدہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اہل شہر نے توپوں سے ان کا مقابلہ کیا، بہت سے وہابی قتل ہوگئے، یہ لوگ جدہ کو اپنے قبضے میں نہ لے سکے، ناچار ہوکر آٹھ دن بعد اپنے علاقے میں واپس چلے گئے اور جاتے جاتے مکہ میں اپنی فوج، قبضہ برقرار رکھنے کے لئے چھوڑ گئے اور شریف غالب کے بھائی شریف عبدالمعین کو امیر معین کر گئے، امیر عبدالمعین نے اہالی مکہ کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے اور وہابیوں کے شر سے نجات پانے کی خاطر ان کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اسی سال

ربیع الاوّل کے مہینہ میں شریف غالب والی جدّہ شریف پاشا کے ہمراہ ایک عظیم لشکر لے کر مکّہ کی طرف روانہ ہوئے، مکہ پہنچ کر وہابیوں کے لشکر کو مار بھگایا اور ایک بار پھر سے مکّہ کی امارت شریف غالب کے سپرد ہو گئی اس کے بعد سے وہابیوں نے مکہ کو چھوڑ کر عرب قبائلیوں سے جنگیں لڑیں، یہاں تک کہ طائف پر ان کا دوبارہ قبضہ ہو گیا اور انہوں نے (عثمان مضایفی) کو امیر طائف مقرر کر دیا۔ یہ لوگ مکہ اور مدینہ کے اطراف میں بسنے والے قبیلوں سے لڑتے رہے یہاں تک کہ وہ تمام قبائل جو امیر مکّہ کے زیر اثر تھے ان کے قبضے میں آگئے، اس کے بعد ان لوگوں کا مکّہ پر قبضہ جمانے کا ارادہ ہوا، سنہ ۱۲۲۰ھ میں مکہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا، راستے کاٹ دیئے اور ہر طرح سے حلقۂ حصار کو تنگ کرتے گئے۔ ہر طرح کی رسد اور اشیائے خورد و نوش کی درآمد بند کر دی گئی۔ یہاں تک کہ مکہ کے باشندے بھوک سے تنگ آکر کتّے کھانے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ اہل مکہ جان بچانے کی خاطر مجبوراً شریف غالب کو ان لوگوں سے صلح کرنا پڑی، کچھ لوگوں نے صلح کے لیے وساطت کی اور کچھ شرطوں پر صلح ہو گئی، ان شرطوں میں سے ایک شرط یہ تھی کہ مکّہ کے باشندوں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھا جائے اور دوسری شرط یہ تھی کہ مکّہ کی امارت شریف ہی کے ہاتھ میں رہے۔ اس طرح صلح کے بعد وہ لوگ اواخر ذی القعدہ کے دوران سنہ ۱۲۲۰ھ میں مکّہ میں داخل ہوئے اور مدینۂ منوّرہ پر بھی قبضہ کر کے روضۂ مبارک میں موجود سارے مال کو لوٹ لیا اور اس حد تک بے حرمتی کی کہ زبان بیان کرنے سے قاصر ہے۔ انہوں نے مبارک بن مضیان کو مدینہ منورہ کا امیر مقرر کیا اور ان کی حکومت حرمین میں سات سال تک جاری رہی، اس دوران انہوں نے مصری اور شامی حاجیوں پر مکہ میں داخل ہونے کی پابندی لگائی، کعبہ پر کالے رنگ کے کپڑے کا غلاف چڑھایا، لوگوں کو اپنے اپنے دین و مذہب پر چلنے سے روکنے لگے، سگریٹ نوشی پر پابندی عائد کی، اس طرح سے جو شخص ممنوعہ اعمال انجام دیتا اور انہیں اس بات کا علم ہو جاتا تو سخت سے سخت سزا دی جاتی یہی نہیں، انہوں نے تمام اولیاء کرام کی قبروں تک کو منہدم کر دیا، عثمانی حکومت اس زمانے میں عیسائیوں سے جنگ لڑنے میں مصروف تھی سلاطین کو قتل یا معزول کرنے کے مسئلہ میں بھی اختلاف تھا جس کے بارے میں انشاء اللہ بیان کریں گے، کچھ عرصہ کے بعد وہابیوں سے جنگ کی تیاری کے لیے والی مصر محمد علی پاشا کے نام شاہی فرمان صادر ہوا سنہ ۱۲۲۶ھ میں محمد علی پاشا نے ایک عظیم لشکر فراہم کیا اور اس کی قیادت سلطان کے حکم سے اپنے بیٹے طوسون پاشا کے حوالے کی، یہ لوگ اسی سال ماہ رمضان میں مصر سے نکلے، خشکی و

آبی راستوں سے گذرتے ہوئے ینبع پہنچے، اس علاقے کو وہابیوں کے شر سے پاک کیا، اور جب یہ لشکر صفراء حدیدہ پہنچا وہاں کے عرب قبائل (جو وہابیوں کے فرمان بردار تھے) سے سامنا ہوا اس لشکر اور حربیہ میں رہنے والے عرب قبائل کے درمیان صفرا اور حدیدہ کے مقام پر شدید جنگ ہوئی اور سوائے معدودے چند سارا لشکر نیست و نابود ہوگیا اور ان کا تمام ساز و سامان غنیمت کے طور پر عرب قبائل نے لوٹ لیا، یہ جنگ ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۲۲۶ھ میں ہوئی اور رفو کردہ لشکر میں سے صرف چند افراد مصر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ محمد علی پاشا نے سنہ ۱۲۲۷ھ میں ایک دوسرا لشکر تیار کیا اور خود حجاز پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، شعبان کے مہینے میں محمد علی پاشا سے پہلے ایک لشکر پوری تیاری کے ساتھ روانہ ہوا، اس لشکر کے ساتھ اٹھارہ توپیں اور تین بم تھے، جو کچھ وہابیوں کے قبضہ میں تھا اس لشکر نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا، رمضان کے مہینے میں جنگ کئے بغیر صفراء اور حدیدة پر مکر و فریب اور رشوت کے سہارے قبضہ کرلیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے بڑے شیخوں کو ایک لاکھ ریال اور چھوٹے شیوخ کو اٹھارہ ہزار ریال دیئے اور ان کے لئے ماہانہ وظائف بھی معین کئے، یہ سب کام شریف مکہ شریف غالب کے مشورے سے انجام پایا جو بظاہر وہابیوں کے زیر اطاعت تھے پہلی بار شکست کی وجہ یہ تھی کہ اس لشکر نے شریف غالب سے خط و کتابت نہیں کی تھی کہ وہ کوئی چارہ جوئی اور تدبیر کرسکے، اس طرح یہ لشکر ذی القعدہ کے مہینے میں وارد مدینہ ہوا، جب کامیابی کی خبر مصر تک پہنچی، وہاں کے باشندوں نے تین دن تک چراغاں کا اہتمام کیا خوشیوں کے شادیانے بجائے، توپوں کے گولے داغے اور روم کے تمام بادشاہوں کو فتح و کامیابی کے پیغام بھیجے، اسی دوران اس لشکر نے اوائل محرم سنہ ۱۲۲۸ھ جدّہ پر قبضہ کیا جو دریائی راستے سے روانہ ہوا تھا، بعد میں یہ لشکر راہی مکہ ہوا اور اسے بھی اپنے قبضے میں کرلیا، یہ سب کام بھی بغیر جنگ شریف غالب کے خفیہ مشوروں سے انجام پائے۔ جس وقت یہ لشکر جدّہ پہنچا تھا اس وقت وہابیوں کا تمام لشکر خوف کی وجہ سے مکہ سے امیروں سمیت فرار ہو لیا تھا، وہابیوں کا امیر سعود سنہ ۱۲۲۷ھ حج کرکے طائف اور اس کے بعد درعیہ واپس جا چکا تھا اور اسے تب تک معلوم نہ تھا کہ لشکر سلطان مدینہ پر قابض ہوچکا ہے، جب درعیہ پہنچا اسے مکہ اور طائف کا علم ہوا اور جب یہ لشکر مکہ اور جدّہ پر قابض ہوا، طائف کا امیر عثمان مضایفی اور وہابیوں کا سارا لشکر فرار ہوگیا۔ ربیع الاول سنہ ۱۲۲۸ھ میں محمد علی پاشا نے ایک وفد دارالسلطنت روانہ کیا اور ان کے ہمراہ مکہ، مدینہ، جدّہ اور طائف کی کنجیاں بھی ارسال کیں، جلوس کی شکل میں یہ ایلچی سونے اور چاندی کی کشتیوں میں کنجیاں لئے ہوئے دارالسلطنت پہنچے،

اس جلوس کے آگے سونے اور چاندی کے پیالوں میں لوبان سلگ رہی تھی، پیچھے ڈھول اور شہنائیاں بج رہی تھیں، اس خوشی میں نہایت عمدہ چراغاں کا اہتمام ہوا، توپوں کے گولے داغے گئے اور کنجیاں لانے والوں کو اکرام وانعام و خلعت سے نوازا گیا، محمد علی پاشا کے رتبے میں اضافہ کیا گیا۔ شوال ۱۲۲۸ھ میں محمد علی پاشا خود حجاز کے لئے روانہ ہوا، روانگی سے پہلے شریف غالب نے طائف میں وہابیوں کے امیر عثمان مضائفی کو گرفتار کر لیا یہ شخص وہابیوں کا سب سے بڑا امیر تھا، اسے زنجیروں میں جکڑ کر مصر روانہ کیا گیا، لیکن وہ ذی القعدہ کے مہینے میں محمد علی پاشا کے حجاز روانہ ہونے کے بعد مصر پہنچا، اس کے بعد دارالسلطنت روانہ کیا گیا اور وہاں اسے قتل کر دیا۔ ذی القعدہ کے مہینہ میں محمد علی پاشا مکہ پہنچا، اور وہاں شریف غالب بن مساعد کو گرفتار کرکے دارالسلطنت روانہ کیا اور مکہ کی امارت اس کے بھتیجے شریف یحییٰ ابن سرور بن مساعد کے سپرد کی محرم ۱۲۲۹ھ میں مبارک بن مضیان (جو مدینہ منورہ میں وہابیوں کا امیر تھا) کو دارالسلطنت روانہ کیا گیا۔ قسطنطنیہ میں اسے اعلی عوام دیمیان جلوس کی شکل میں پھرایا گیا تاکہ سب اسے پہچان لیں۔ اس کے بعد اسے قتل کرکے اس کا سر باب السرایا پر لٹکا دیا گیا، یہی سلوک عثمان مضائفی کے ساتھ بھی کیا گیا، لیکن جہاں تک شریف غالب کی بات ہے، انھیں سلانیک روانہ کیا گیا اور وہ کافی عرصے تک وہیں خوشحال زندگی گذارتے رہے یہاں تک کہ ۱۲۳۰ھ میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں پر انھیں دفن کیا گیا اور مقبرہ زیارت گاہ میں بدل گیا، انھوں نے مکہ پر چھبیس سال حکومت کی تھی۔ محمد علی پاشا نے وہابیوں کا خاتمہ کرنے کی غرض سے کئی ایک لشکر تربت، بیشہ، غامد، زہران اور عسیر روانہ کئے اور خود بھی ان کا پیچھا کرتا ہوا شعبان ۱۲۲۹ھ میں اس علاقے تک پہنچا، بہت سے لوگوں کو قتل اور بہت سے لوگوں کو اسیر کیا اور ان کے علاقے کو تباہ و برباد کر دیا۔ جمادی الاوّل ۱۲۲۹ھ میں وہابیوں کا امیر سعود ہلاک ہوا، اس کے بعد اس کے بیٹے عبد اللہ نے زمام سنبھالا۔ محمد علی پاشا موسم حج کے دوران وہابیوں کے اس علاقے سے مکہ چلا آیا اور وہاں رجب ۱۲۳۰ھ تک رہا اس کے بعد مصر روانہ ہو گیا، مکہ میں حسن پاشا کو چھوڑ گیا، نیمۂ رجب ۱۲۳۰ھ محمد علی پاشا مصر پہنچا، اس طرح سے مکہ میں اس کی مدت اقامت ایک سال سات مہینے شمار ہوتی ہے۔ محمد علی پاشا اس وقت تک مصر واپس نہ ہوا جب تک کہ اس نے امور حجاز کو درست کر نہیں دیا، اور قبائل حجاز میں پھیلے ہوئے وہابیوں کا خاتمہ کر نہیں لیا۔ وہابیوں میں سے کچھ لوگ درعیہ میں باقی رہ گئے جن کا امیر عبد اللہ بن سعود تھا، محمد علی پاشا نے اس سے جنگ لڑنے کے لئے لشکر فراہم کیا اور اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کی قیادت میں اس کی طرف روانہ کیا۔ اس واقعہ سے پہلے عبد اللہ بن سعود محمد علی پاشا کے بیٹے طوسون

سے جب وہ مدینہ میں تھا خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ اس نے طوسون سے ایک معاہدہ کیا تھا جس میں یہ
تھا کہ اس شرط پر اس کی امارت باقی رہے گی کہ وہ خود کو محمد علی پاشا کا مطیع مان لے۔ لیکن محمد علی
پاشا راضی نہ ہوا صلح کرنے کے بجائے اس نے لشکر تیار کیا اور اپنے بیٹے ابراہیم پاشا کی قیادت میں سنہ ۱۲۳۱ھ
کے اواخر میں عبد اللہ بن سعود کے مقابلے کے لئے روانہ کیا، یہ لشکر سنہ ۱۲۳۲ھ درعیہ پہنچا اور سنہ ۱۲۳۳ھ
ذی القعدہ کے مہینہ میں عبد اللہ بن سعود سے جنگ ہوئی۔ جب مصر خبر پہنچی، ایک ہزار توپوں کے گولے
داغے گئے، ڈھول پیٹے گئے اور سات دن تک مصر اور چاروں طرف کے شہروں اور قصبوں میں چراغاں
کیا گیا۔ وہابیوں کو قلع و قمع کرنے میں محمد علی پاشا نے اہم کردار ادا کیا، پورے پورے خزانے مال و
دولت کے صرف کر دیئے، یہاں تک کہ درباریوں میں سے کچھ کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ اسلحوں کے حمل
ونقل کے لیے پینتالیس ہزار ریال ادا کئے ہیں۔ ایک دفعہ ذخیرہ کو ینبع سے مدینہ تک پہنچانا تھا تو ہر اونٹ
کی اجرت چھ ریال دی گئی تھی جس میں سے آدھا امیر ینبع اور آدھا بیہ امیر مدینہ نے دیا تھا اور کل رقم
ایک لاکھ چالیس ہزار ریال ہوئی تھی۔ ابراہیم پاشا نے عبد اللہ بن سعود اور ان کے دوسرے امراء
کو گرفتار کر کے مصر روانہ کیا، عبد اللہ بن سعود ۱۷ محرم سنہ ۱۲۳۴ھ کو مصر پہنچا، مصر کے لوگوں نے
اسے ایک خچر پر سوار کر کے جلوس نکالا تاکہ سب لوگ اسے دیکھ لیں، کافی لوگ اسے دیکھنے کے لیے
جمع ہو گئے تھے، جب محمد علی پاشا کے پاس پہنچا، اس نے کھڑے ہو کر خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال
کیا اور اپنے پاس بٹھا کر گفتگو کی، محمد علی پاشا نے پوچھا اتنی دیر کیوں ہوئی؟ جواب میں کہا جنگ جاری
تھی، پاشا نے پوچھا میرے بیٹے کو کس طرح کا پایا جواب میں اس نے کہا، اس نے کوتاہی نہیں کی ہمت
سے کام لیا اور ہم نے بھی، لیکن خدا کو یہی منظور تھا، پاشا نے اس سے کہا میں اپنے آقا سلطان کے
پاس تمہاری بخشش کی سفارش کروں گا جواب میں کہا ہے نصیب، پاشا نے اسے خلعت پہنائی اور
خود اسماعیل پاشا کے گھر بولاق چلا گیا۔ عبد اللہ بن سعود کے ساتھ ایک چھوٹا سا صندوق تھا،
پاشا نے سوال کیا یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا یہ وہ سب چیزیں ہیں جنھیں میرے والد نے مدینہ
میں روضۂ اقدس سے اٹھائی تھیں، اب انھیں میں سلطان کے پاس لے جا رہا ہوں، پاشا نے صندوق
کھولنے کا حکم دیا، صندوق کھلا تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس میں تین عدد شاہی خزانوں کے بہترین مصحف
جس سے بہتر کسی نے کبھی بھی نہیں دیکھے تھے اور اس کے ساتھ میں تین سو بڑے موتیوں کے دانے،

ایک نے مرد کا بڑا دانہ اور ایک سونے کی پٹی رکھی ہوئی ہے۔ پاشا نے اس سے کہا، جو کچھ تم لوگوں نے روضۂ اقدس سے لوٹا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ تھا، اس نے جواب دیتے ہوئے کہا جو کچھ آپ کے سامنے ہے وہی میرے باپ کے حصے میں آیا، انہوں نے سب خود ہی نہیں لیا، کچھ عرب لے گئے اور کچھ اہل مدینہ، کچھ حرم شریف کے خدام کو کچھ شریف مکہ، پاشا نے کہا، ہاں صحیح ہے ہم نے کچھ چیزیں ان میں سے شریف مکہ کے یہاں بھی پائی تھیں۔ اس کے بعد عبداللہ بن سعود کو دارالسلطنت روانہ کر دیا گیا، اسی دوران محرم ۱۲۳۵ھ پاشا درعیہ کو پورے طور پر خراب کرنے کے بعد حجاز سے مصر واپس پہنچا۔ ربیع الاول کے مہینہ میں جب عبداللہ بن سعود دارالسلطنت پہنچ گیا، اسے پورے شہر میں پھرایا گیا تاکہ لوگ پہچان لیں۔ اس کے بعد باب ہمایوں کے پاس اسے قتل کر کے دوسری جگہوں پر اس کے ماننے والوں کو بھی قتل کیا گیا، یہ وہابیوں کی مختصر سی داستان تھی اگر ہر واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا جاتا تو کتاب طولانی ہو جاتی۔ وہابیوں کا فتنہ و فساد ایک مصیبت تھی جو مسلمانوں پر نازل ہوئی۔ ان لوگوں نے کافی حد تک مسلمانوں کا خون بہایا اور ان کے مال و دولت کو لوٹا، ان کا ظلم و ستم عام ہو چکا تھا اور شر ہر جگہ پھیل چکا تھا، لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت سی احادیث نقل ہیں جن میں اس فتنہ کے بارے میں تذکرہ ہوا ہے، بعنوان مثال اس حدیث کو لے لیجئے، فرماتے ہیں:

"یخرج اناس من قبل المشرق یقرأون القرآن لا یجاوز تراقیھم یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیۃ سیماھم التحلیق"

مشرق کی جانب سے کچھ ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو قرآن پڑھتے ہوں گے۔ لیکن وہ انکی حلق سے نہ اترے گا، یہ لوگ دین سے اس طرح بھاگیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل کر بھاگتا ہے، ان کی نشانی یہ ہے کہ سر منڈے ہوں گے۔

یہ روایت بہت سے راویوں نے نقل کی ہے، کچھ روایتیں صحیح بخاری میں موجود ہیں اور کچھ دوسرے مأخذ و منابع میں، لہٰذا تمام روایتیں نقل کرنے یا راویوں کا نام ذکر کر کے بحث کو طولانی نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ یہ حدیث صحیح اور مشہور ہیں۔ مذکورہ حدیث میں (سیماھم التحلیق) سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اشارہ وہابیوں کی طرف ہے، اس لئے کہ یہ لوگ اپنے ساتھیوں کو سر منڈانے کا حکم دیا کرتے تھے ورنہ خوارج یا دیگر بدعت پسندوں کے یہاں جو ان سے پہلے تھے یہ بات موجود نہ تھی۔ مفتی زبید،

جناب عبدالرحمٰن اھدل کا کہنا ہے کہ وہابیوں کی تردید کے لیے کتاب لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں صرف مذکورہ حدیث میں سے (دیسماہم التحلیق) کا تذکرہ کر دینا کافی ہے، کیونکہ ان سے پہلے بدعت پسندوں میں سے کسی کا طریقہ یہ نہ تھا۔ اتفاق سے ایک ایک عورت کو محمد بن عبدالوہاب کی پیروی کے لیے مجبور کیا گیا تو وہ عورت مان گئی، محمد عبدالوہاب نے اس عورت کو سر منڈوانے کا حکم دیا، عورت نے جواب دیتے ہوئے کہا جب تم عورتوں کے بال منڈوانے کے لیے کہہ سکتے ہو جبکہ وہ عورتوں کی زینت ہے تو مردوں کو ڈاڑھی منڈوانے کا حکم دو کیونکہ ڈاڑھی مردوں کی زینت ہے، وہ یہ سنکر لاجواب رہ گیا۔ یہ لوگ رسول اللہ کو واسطہ قرار دیکر طلب شفاعت کے لیے منع کرتے تھے جبکہ شفاعتِ رسول ؐ کے سلسلے میں متعدد احادیث موجود ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ پیغمبر گرامیؐ پر صلوٰۃ بھیجنے یا درود وسلام کو شرک گردانتے اور منبر پر یا اذان کے بعد آنحضرت ؐ پر صلوات بھیجنے کو منع کرتے تھے، ان کی طرف سے ممانعت کے باوجود ایک بار ایک نیک نابینا مؤذن نے اذان کے بعد آنحضرتؐ پر جب صلوات بھیجی تو اسے گرفتار کر کے محمد بن عبدالوہاب کے پاس لے آئے، اس نے اسے قتل کئے جانے کا حکم دیا، جو کچھ یہ لوگ کیا کرتے تھے اگر سب کا تذکرہ کیا جائے تو دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ اس لئے صرف اسی مختصر پر اکتفا کرتے ہیں واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

جناب محمدی ری شہری
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

انسانی فطرت

شہادت ــــ نہج البلاغہ کے آئینہ میں

شہادت سے عشق والفت کا راز:

جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ شہادت کی آرزو اور اس کے لئے بے قراری و بے تابی کا جذبہ فقط علی ابن ابی طالبؑ کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ بہت سے ایسے صادق العقیدہ مسلمانوں نے دامن اسلام میں پرورش پائی ہے جنکی دلی تمنا یہی تھی کہ ان کا انجام شہادت ہو۔ مثال کے طور پر:۔

بوڑھے اور لنگڑے مرد مجاہد عمرو بن جموح کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے چار جانباز بہادر نوجوان فرزند پیغمبرؐ کی معیت میں شیر کے مانند شمشیر آزمائی کر رہے تھے۔ جنگ احد کے موقع پر ان بہادروں نے چاہا کہ اپنے بوڑھے باپ کو میدان جنگ سے دور رکھیں چنانچہ انہوں نے اس بوڑھے مجاہد سے کہا کہ خداوند عالم نے آپ کو جنگ سے معذور قرار دیا ہے۔ آپ پر جنگ میں شرکت کرنا واجب نہیں ہے۔

عمرو پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا نبی اللہ! میرے لڑکے نہیں چاہتے کہ میں جنگ میں شرکت کروں لیکن میں بارگاہ ربوبیت میں خواستگار ہوں کہ اپنے اسی لنگڑے پاؤں کے ساتھ راہ بہشت اختیار کروں۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: خدا نے تم کو معذور قرار دیا ہے اور جہاد تم پر واجب نہیں ہے۔ (عمرو کا اصرار بڑھتا گیا) آخر حضرتؐ نے عمرو کے فرزندوں سے فرمایا: "تم باپ کی راہ میں حائل نہ ہو اسلئے کہ خدا نے شہادت ان کا مقدر بنا دیا ہے۔ عمرو نے پیغمبرؐ کے ہمراہ سفر اختیار کیا اور اس جنگ میں شہید ہوئے۔[۲۱]

شہادت کے بعد عمرو بن جموح کے فرزندوں نے باپ کے جنازے کو ایک شتر پر بار کیا کہ لاش

مدینہ لے جائیں۔ شتر ہر طرف تیزی کے ساتھ بھاگتا تھا لیکن مدینہ کا رخ اختیار نہ کرتا تھا بار بار کی کوشش کے بعد جب اونٹ کسی صورت مدینہ کی طرف بڑھنے پر آمادہ نہ ہوا تو ان نوجوانوں کو یاد آیا کہ ان کے باپ نے مدینہ سے نکلتے وقت دعا کی تھی :۔

اَللّٰھُمَّ لَا تَرُدَّنِیْ اِلَیْھَا۔ "پروردگارا! مجھے اب مدینہ پلٹ کر آنا نصیب نہ ہو"

چنانچہ وہ لوگ باپ کی میت کو قتل گاہ کی طرف واپس لائے اور میدان احد میں ہی ان کو سپرد خاک کر دیا۔[۲۲]

تاریخ میں ایسے افراد بھی ملتے ہیں جو پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی شہادت کے لیے دعا کی خواہش کرتے تھے، جیسا کہ ایک مجاہد اسلام جن کا نام خیثمہ تھا یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے بڑے جوش و ولولہ کے ساتھ جنگ احد میں شربت شہادت نوش فرمایا حتی کہ جنگ سے قبل آپ نے پیغمبر سے التجا کی تھی کہ دعا فرمائیں کہ مجھے شہادت نصیب ہو۔

جنگ شروع ہونے سے قبل جب حضور صلعم اپنے اصحاب سے جنگ کے بارہ میں مشورہ کر رہے تھے خیثمہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور قریش کے ساتھ نبرد آزمائی کے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے آخر میں کہا کہ :۔

"مجھے امید ہے، کہ خداوند عالم ہم کو اس جنگ میں فتح و کامرانی عطا کرے گا اس لئے کہ میری نظر میں یہی سنت الٰہی رہی ہے۔ اور اگر (بالفرض) کامیابی نہ بھی ملی تو شہادت نصیب ہو گی۔ جنگ بدر میں اس سعادت سے ہمکنار ہونے کی آرزو ہی رہ گئی اگرچہ اس وقت بھی میری دلی خواہش یہی تھی کہ کاش مجھے شہادت نصیب ہو یہاں تک کہ میں نے اپنے اور اپنے فرزند کے درمیان قرعہ نکالا کہ کون گھر پر رہے، اور کون محاذ جنگ پر جائے، قرعہ میرے بیٹے کے نام نکلا اور میں محروم رہ گیا۔ گذشتہ شب میں نے اپنے بچے کو خواب میں دیکھا کہ نہایت ہی حسین و جمیل شکل میں بہشت میں بہنے والی نہروں اور اس کے میووں کے درمیان چہل قدمی کر رہا ہے اور مجھ سے کہتا ہے۔ آؤ میرے ساتھ ملحق ہو جاؤ اور جنت میں میرے رفیق بن جاؤ تاکہ مجھ سے جو کچھ میرے رب نے وعدہ کیا ہے، درست ثابت ہو۔"

اس کے بعد خیثمہ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا : "یا رسول اللہ! میں نے اس حال میں صبح کی کہ اپنے کو بہشت میں فرزند کی معیت کا مشتاق پایا۔ میری عمر زیادہ ہو چکی، میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں اب میری دلی تمنا ہے کہ اپنے خدا سے ملاقات کروں، دعا فرمائیں کہ خدا مجھے شہادت عطا کرے۔"

تاحد ۱۰۴

پیغمبرؐ نے ان کے لئے دعا کی اور وہ جنگ احد میں شہید ہوئے۔[۲۳] یہ واقعات شاہد ہیں کہ شہادت کی خواہش صرف حضرت علیؑ کی ذات پر منحصر نہیں پھر بھی وہ چیز جو امامؑ کو دوسروں پر امتیاز عطا کرتی ہے وہ آپ کا حد سے بڑھا ہوا شوق شہادت اور اس سلسلہ میں شدت کے ساتھ عشق و بے تابی کا مظاہرہ ہے۔
اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیکھیں "سرخ موت" کے لئے اس جذبۂ عشق و بیتابی کا فلسفہ کیا ہے؟ عام لوگ کیوں اس سے وحشت اور خوف کھاتے ہیں اور اسلام نے اس وحشت و خوف سے نکلنے کیلئے جو جہاد اور قربانی کی راہ میں سب سے بڑا مانع ہے کون سا اسلحہ استعمال کیا ہے۔

انسان موت سے کیوں ڈرتا ہے؟

(۱) موت کو فنا تصور کرنا: اس طرز فکر کا حامل انسان فطری طور پر زندگی کو موت پر ترجیح دے گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ اس وقت بھی زندہ رہنے کی خواہش ہو جب پٹ پٹک کر اس منزل پر پہنچ چکا ہو کہ دم گھٹ گھٹ کر نکل جانا چاہتا ہو۔ جیسا کہ جالینوس نے سکندر کے بارے میں کہا۔ لیکن مرد مسلمان یقیناً یہ خوف نہیں رکھتا اس لئے کہ اسلام کی نظر میں موت فنا نہیں ہے بلکہ عالم بقا کا دریچہ ہے (خلقتم للبقاء لا للفناء) اور یہ بقا اور جاوداں زندگی کا تصور شہید کے سلسلہ میں تو بڑے شدومد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ شہید کو مردہ نہ کہنا کیونکہ شہید زندہ ہے، زندۂ جاوید ہے، وہ کبھی نہیں مرتا:

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون[۲۴]
شہدائے راہ خدا کو مردہ نہ کہنا وہ زندہ ہیں یہ اور بات ہے کہ تم اس واقعیت کو درک نہیں کر پاتے۔

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء[۲۵]
گمان میں بھی نہ لانا کہ وہ لوگ جو خدا کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں مردہ ہیں، نہیں! وہ زندہ ہیں

علامہ مجاہد آیت اللہ طالقانی اپنی کتاب "پرتوی از قرآن" جلد دوم ص ۲۲ پر مذکورہ پہلی آیت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:-

" جوانان مدینۂ فاضلہ کے شجاع و دلیر ہونے کے سلسلے میں سقراط اعظم کہتے ہیں: انکو ایسا درس دینا چاہئے کہ وہ موت کے خوف سے آزاد ہو جائیں اور ایسے تمام لغت و اشعار نیز جھوٹی کہانیاں جو آخرت کو تاریک و وحشت ناک بتاتی ہیں اور وہ گریہ و زاری جنکی بزرگوں کی طرف نسبت دی جاتی

ہے، ان کے کانوں تک نہیں پہونچنے دینا چاہئے۔ ان چیزوں کو تحریر و تقریر سے قطعی حذف کر دینا چاہئے تاکہ ایسے آزاد منش افراد پیدا ہوں جو موت کو ذلت و خواری تصور کرتے ہوئے دوستوں اور عزیزوں کی موت کو حادثۂ فاجعہ نہ شمار کریں۔"[۱۹]

(۲) **مادی زندگی سے انس و محبت:** شاید موت سے خوف کی اہم ترین وجہ یہی ہے۔ اسی لئے اسلام نے شہادت اور راہ حق میں قربانی کے سلسلہ میں اس کے خلاف سخت نبرد آزمائی کی ہے اور ایسے مسلمانوں کو جو چند روزہ مادی زندگی کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنی ذمہ داری اور نظام عدل اسلامی کے استقرار و نفاذ میں کوتاہی برتتے ہیں سخت طور پر مورد نصیحت و فہمائش قرار دیا ہے۔ سورۂ توبہ کی ۳۸ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:۔

یا ایھا الذین آمنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض ارضیتم بالحیاۃ الدنیا من الآخرۃ ؟!

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ راہ خدا میں (دشمنان حق و عدالت سے جنگ کے لیے) نکل پڑو تو تم زمین پر سنگینی پیدا کرتے ہو (یعنی زمین سے چپٹے بیٹھے رہتے ہو) ؟! کیا دنیوی زندگی کو حیات جاوید پر ترجیح دیتے ہو؟ یاد رکھو دنیا کی لذتیں آخرت کی خوشیوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔

اسی طرح سورۂ نساء کی ۷۷ ویں آیت میں بھی مسلمانوں کے اس گروہ سے جو حکم جہاد پر قتل ہو جانے کے ڈر سے اعتراض کرتے تھے سخت زجر و توبیخ کی گئی ہے:۔

"... فلما کتب علیھم القتال اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیۃ اللہ او اشد خشیۃ وقالوا ربنا لم کتبت علینا القتال ..."

کیا تم ان لوگوں کو نہیں دیکھتے کہ (مکہ میں) ان سے کہا گیا کہ (فی الحال) جہاد سے باز رہو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو لیکن جب (مدینہ میں) جہاد کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک جماعت لوگوں (دشمنوں) سے ایسا ڈرنے لگی جیسے خدا سے ڈرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدایا! کیوں ہم پر جہاد واجب قرار دیا ہے۔ کیوں نہ اس حکم کو کچھ اور بعد میں بھیجا؟ ان سے کہہ دیجئے کہ دنیا کی لذتیں مختصر ہیں

آخرت اہل تقویٰ کے لیے بہتر ہے۔

حضرت علیؑ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں روز ضربت سے صرف ایک ہفتہ قبل معاویہ سے دوبارہ جنگ شروع کرنے کے سلسلہ میں نہایت ہی پرجوش خطبہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اس خطبہ میں حضرتؑ اپنی فوج کی روحانی تقویت اور ان کو جنگ و فداکاری پر آمادہ کرنے کے لئے فرماتے ہیں:۔

"..... ازمع الترحال عباد الله الاخیار! وباعوا قليلاً من الدنيا لا يبقىٰ بكثير من الآخرة لا يفنىٰ۔"

خدا کے نیک بندے، جب مسلمانوں پر تیرگی کے بادل منڈلا رہے ہوتے ہیں، شوق شہادت کے ساتھ اس دنیا سے کوچ کا ارادہ کرتے ہیں اور اس ناپائیدار دنیا کی مختصر سی زندگی کو آخرت کی جاوداں زندگی کے ہاتھوں فروخت کردیتے ہیں۔

ماضرّ اخواننا الذين سُفِكت دمائهم بصفّين الّا يكونوا اليوم احياء يسيغون الغصص، ولشربون الرنق۔

ہمارے وہ بھائی جنھوں نے جنگ صفین میں اپنے خون سے زمین رنگین کی اپنا کوئی نقصان نہیں کیا کیونکہ آج وہ زندگی سے نجات حاصل کر چکے ہیں ورنہ انھیں بھی اس غم والم اور بدسلوکی کا تلخ گھونٹ پینا پڑتا۔

"قد والله لقوا الله فوفّاهم اجورهم واحلّهم دار الامن بعد خوفهم"

خدا کی قسم انھوں نے خدا سے ملاقات کی اور رب العزت نے انہیں وہ کامل جزا دی جس کے وہ سزاوار تھے ان کو مقام خوف و ابتلاء سے نکال کر جائے امن و عافیت میں پہونچا دیا۔[۲۷]

۲۔ کوتاہی عمل کے سبب موت سے ڈرتے ہیں: مذکورہ دونوں عوامل کے علاوہ ایک چیز اور خوف مرگ کا باعث بنتی ہے اور وہ جرم و گناہ سے آلودگی ہے جس کے نتیجہ میں انسان ابدی زندگی قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

امام حسن عسکریؑ اپنے آباء طاہرین علیہم السلام سے روایت کرتے ہیں کہ کسی نے حضرت علیؑ سے سوال کیا "موت کے لیے آمادگی کسے کہتے ہیں؟ اور کس طرح انسان موت کے لئے آمادہ کہا جا سکتا ہے"

امامؑ نے جواب دیا "تمام فرائض و واجبات کا ادا کرنا اور تمام محرمات و گناہ سے پرہیز کرنا مکارم اخلاق سے آراستہ ہونا نیز پسندیدہ عادات سے متصف ہونا اس لئے کہ اس صورت میں انسان کسی طرح کا خوف اور پرواہ نہیں رکھتا اور بلا جھجک موت کی طرف قدم بڑھاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں خود موت اس کے سراغ میں آتی ہے" اس کے بعد امامؑ نے قسم کھائی کہ خود آپ کی ذات ایسی ہی ہے۔

واللہ ابن ابی طالب لایبالی اوقع علی الموت أم الموتُ وقع علیہ

خدا کی قسم فرزند ابو طالبؑ کو اس بات کی فکر نہیں ہے کہ موت اس پہ آ پڑے یا وہ موت پہ جا پڑے۔[۲۸]

ان پر افتخار کلمات کو امامؑ نے مختلف مواقع پر فرمایا ہے:

(الف، عقیل کے جواب میں:۔

آپ کے بھائی جناب عقیل نے جب سمجھ لیا کہ جس طرح چاہئے اس طرح اہل کوفہ امام کی اطاعت نہیں کرتے اور معاویہ سے جنگ میں سستی و کاہلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو امامؑ کی دلجوئی کے لئے ایک خط لکھا جس کے آخر میں جنگ جاری رکھنے کے سلسلہ میں امام کے نظریات جاننے کی خواہش کی ہے نیز یہ کہ آیا امامؑ چاہتے ہیں کہ جنگ جاری رکھی جائے تاکہ شہادت نصیب ہو تو ان کو بھی مطلع کریں تاکہ وہ خود ان کے بچے اور ان کے بھائی بھی آپ کے ہمراہ رہیں کیونکہ امامؑ کے بغیر انہیں زندگی گوارہ نہ ہوگی۔

امامؑ نے جواب میں تحریر فرمایا:۔

"میری رائے عہد شکنوں سے جنگ کرنا ہے، یہاں تک کہ خدا سے ملاقات کرلوں۔ لشکر کی فراوانی میرے لئے شان و شوکت میں اضافہ کا سبب نہیں بنتی نہ ہی ان کا مجھ سے علیٰحدگی اختیار کرلینا خوف و ہراس میں مبتلا کرتا ہے۔ خدا کی قسم راہ حق میں شہید ہونا مجھے غمناک و مضطرب نہیں کرتا کیونکہ میں حق پر ہوں اور خدا اس کے ساتھ ہے جو حق پر گامزن ہو۔ ہر طرح کی نیکی و خیر مرنے کے بعد اس کے لئے ہے جو حق کا ساتھ دیتا ہے۔[۲۹]"

(ب، جنگ صفین میں:۔

ایک دن حضرتؑ بغیر زرہ پہنے ہوئے ایک پیراہن میں صفوں کے درمیان گشت کر رہے تھے کہ آپ کے فرزند امام حسنؑ نے فرمایا: "بابا! یہ طریقہ میدان جنگ کے لئے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

امامؑ نے فرمایا:۔

یا بنیّ اِنّ اباک لایبالی وقع علی الموت ام الموت وقع علیہ[30]

اے میرے فرزند! تیرا باپ اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ وہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے یا موت اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔

(ج) جب قتل کی دھمکی دی گئی:۔

امام کی فوج کے ایک سالار، اشعث بن قیس، امامؑ سے محو گفتگو ہیں، امامؑ کے لہجہ کی سختی کو دیکھتے ہوئے اشعث نے کنایۃً یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ آپ کی یہ سختی آپ کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔

اس دھمکی پر امام علیہ السلام خشمگین ہوئے اور فرمایا:۔

ابالموت تخوفنی او تہددنی، فواللہ ما ابالی وقعت علی الموت او وقع الموت علیّ۔[31]

مجھکو تم موت سے ڈراتے اور تہدید کرتے ہو، خدا کی قسم میں اس بات سے نہیں ڈرتا کہ میں موت پر جا پڑوں یا موت مجھ پر آ پڑے۔

تقدیر الٰہی:۔

اسلام نے خوف مرگ کے تمام اسباب وعلل کا سدباب کرنے کے ساتھ ہی ساتھ دشمنان حق وانصاف کے خلاف جنگ کرنے، میدان کارزار میں شریک ہونے نیز وہ تمام اسلامی ذمہ داریاں جس کے انجام دینے میں خطرات کا احتمال پایا جاتا ہے، ان سب کا ایک بہترین حل "تقدیر الٰہی" کے عنوان سے پیش کیا ہے جو ہر طرح کی بے چینی اور اضطراب کو مجاہد کے ذہن سے دور کر دیتا ہے اور قلب کو وہ قوت و طاقت عطا کر دیتا ہے جس کے سہارے مجاہد میدان کارزار میں ثابت قدم رہتا ہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت جنگ احد میں اپنی شکست نیز مقتولین کی ایک بڑی تعداد کی وجہ سے خوف ووحشت اور یاس وناامیدی کا شکار ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان کے دلوں میں دشمنوں کا ایسا خوف مسلط ہو چکا تھا کہ آپس میں یہ کہا کرتے تھے کہ:۔

لو کان لنا من الامر شیئ ما قتلنا ھٰھنا۔[32]

اگر ہم حق پر ہوتے اور کامیابی ہمارے نصیب میں ہوتی تو ہم اس طرح سے یہاں قتل نہ کئے جاتے۔

قرآن مجید ان کے جواب میں کہتا ہے:

قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل الی مضاجعھم

وہ لوگ جو میدان جہاد میں شہید ہوئے ہیں ان کا قتل ہونا اس لئے نہیں ہے کہ وہ حق پر نہیں تھے بلکہ اس لئے ہے کہ یہ امر "تقدیر الٰہی" بن چکا تھا جس سے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے ان کا انجام بہرصورت یہی ہونا تھا کہ وہ بستر شہادت پر آرام کریں۔ چنانچہ (آپ ان سے کہہ دیجئے) اگر تم جنگ میں نہ آتے اور اپنے گھروں میں بیٹھ رہتے تو بھی وہ لوگ جو شہید ہوئے ہیں اپنے گھروں سے نکل پڑتے اس لئے کہ ان کا اس طرح قتل ہونا مقدر بن چکا تھا اور مقررہ موت سے ایک لمحہ کے لئے بھی تقدیم و تاخیر یا فرار ممکن ہی نہیں ہے [۳۳]

ایک دوسری آیت میں ان لوگوں کے بارے میں جو میدان جنگ میں یا عالم مسافرت میں مرتے ہیں یا قتل کئے جاتے ہیں اس طرح اعلان کرتا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین کفروا وقالوا لاخوانھم اذا ضربوا فی الارض او کانوا غزی لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا لیجعل اللہ ذالک حسرۃ فی قلوبھم [۳۴]

اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو تم بے دین افراد کے مانند نہ بن جاؤ کہ جب ان کے بھائی (دینی) مسافرت اختیار کرتے ہیں یا جنگ میں شرکت کے لئے آمادہ ہوتے ہیں (اور پھر جنگ یا سفر میں مر جاتے ہیں یا قتل کر دئے جاتے ہیں) تو کہتے ہیں: کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے یا قتل نہ کئے جاتے (تم اس طرح کی باتیں نہ کیا کرو) تاکہ خدا اس خیال کو ان کے دلوں میں حسرت بنا دے۔

کیوں؟

قرآن نے اس غلط طرز فکر کا جواب تین مختلف عنوان سے دیا ہے جن میں سے پہلا جواب یہ ہے:۔

واللہ یحیی ویمیت واللہ بما تعملون بصیر[۲۵]

چونکہ موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اسے دیکھتا ہے اور آگاہ ہے

جنگ صفین میں ایک سخت مقابلہ کے دوران امیرالمومنین کی فوج کے دو سپاہی "زیاد بن نضر" اور "عبداللہ بن بدیل" ایک دوسرے سے محو گفتگو ہیں:۔

زیاد، عبداللہ سے کہتے ہیں: آج کا دن بڑا سخت ہے، سوائے ان لوگوں کے جن کا قلب قوی اور ارادہ مستحکم ہے کوئی ثابت قدم نہیں دکھا سکتا۔ خدا کی قسم اس میں کوئی شک نہیں کہ چاہے ہماری فوج میں ہو یا دشمن کی فوج میں سوائے بے وقعت و بے حقیقت افراد کے کوئی باقی نہیں بچے گا۔ عبداللہ نے جواب دیا: "میرا بھی یہی خیال ہے"

دونوں کی گفتگو جب امامؑ کے کانوں تک پہونچی تو آپ نے فرمایا:۔

اپنی اس گفتگو کو اپنی ذات تک محدود رکھنا کسی دوسرے کے سامنے زبان پر نہ لانا دھیان میں رکھنا، خداوند عالم نے لوگوں میں ایک مخصوص گروہ کے لئے "شہادت" اور دوسروں کے لیئے "موت" مقرر کردی ہے اور ہر گروہ اپنے "مقدر" کو جو اس کے بارہ میں طے پاچکا ہے، ضرور پہونچے گا۔ البتہ وہ افراد نہایت ہی خوش قسمت ہیں جو راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور اس کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر "شہادت" کا شرف حاصل کرتے ہیں[۲۶]

ایک دوسرے خطبہ میں امامؑ میدان جنگ سے فرار اختیار کرنے والوں کے بارہ میں فرماتے ہیں:۔

ان الفار لغیر مزید فی عمرہ ولا محجوز بینہ وبین یومہ

جو لوگ میدان سے فرار اختیار کرتے ہیں یاد رکھیں کہ فرار سے ان کی عمر میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کے اور انکی موت کے دن میں کوئی فاصلہ پیدا ہوتا ہے۔[۲۷]

خاصان خدا کے شوق شہادت کا راز:

جب ہم نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ "خوف مرگ" کے تمام اسباب وعلل ایک سچے مسلمان خصوصاً خاصان خدا کی نظر میں معدوم ہیں تو اب ہم شہادت کے سلسلہ میں ان کے بے پناہ ذوق و شوق کو دو خاص امروں کے تحت بیان کردینا ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) **شہادت سے نجات کا یقین اور کمال مطلق حاصل ہوتا ہے**: شاید وجود انسانی میں کمال وارتقاء کا کوئی ایسا مرحلہ نہ ہوگا جہاں پہونچکر نجات اور دائمی سعادت کا وہ یقین حاصل ہوتا ہو جو راہ خدا میں شہید ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے اس لئے کہ اس منزل پر فائز ہونے والے کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سعادت وکامرانی کی ضمانت دی گئی ہے۔

دوسرے لفظوں میں تمام کمالات انسانی کا انحصار ختم بخیر پر ہوتا ہے کہ موت کس حالت میں آئی ہے؟ وہ کمال جو حاصل کیا تھا مرتے وقت باقی تھا یا زندگی میں ہی اس سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ لیکن "شہادت" وہ کمال مطلق ہے جس میں زوال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مرنے والے کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام حالات میں خدا سے موت کا تقاضا یا تمنا کرنے کی اسلام نے بڑی شدت کے ساتھ ممانعت کی ہے[۲۸] اس کے برخلاف خدا وند عالم سے شہادت کی تمنا اور آرزو کرنا ادعیۂ ماثورہ میں سے ہے۔ زیارت جامعۂ "ائمۃ المومنین" کے بعد کی ایک دعا میں جو ائمہ علیہم السلام سے منقول ہے اس طور پر دعا کی گئی ہے:۔

وَاَحْيِنِي يَارَبِّ سَعِيداً وَتَوَفَّنِي شَهِيداً

خدایا میری زندگی سعادت کے ساتھ اور موت شہادت کے ساتھ ہو۔

ابو بصیر ایک دعا نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ دعا امام صادقؑ ماہ رمضان میں پڑھا کرتے تھے اس میں ہے:۔

"واسئلك ان تجعل وفاتي قتلاً في سبيلك تحت راية نبيك مع اوليائك"

خدایا! تجھ سے میری التجا ہے کہ میری موت اپنی راہ میں شہادت کے ذریعہ قرار دے جو تیرے نبی کے پرچم کے زیر سایہ تیرے اولیا کی معیت میں حاصل ہو۔

ماہ رمضان کی ایک دوسری دعا میں ہے:۔

وقتلا في سبيلك فوفق لنا

خدایا مجھے توفیق عنایت فرما کہ تیری راہ میں شہید ہو جاؤں۔

"صحیفۂ سجادیہؑ" کی پہلی دعا جو پروردگار عالم کی ستائش میں ہے اس کے اختتامی کلمات اس طرح سے ہیں:۔

حمداً نسعد بہ فی السعداء من اولیائہ، ونصیر بہ فی نظم الشھداء بسیوف اعدائہ۔"

تمام تعریفیں اس کے لئے ہیں جس کی مدد سے سعادت یافتہ خاصان خدا کے زمرہ میں شمولیت کا شرف حاصل ہو۔ اور وہ لوگ جو اللہ کے دشمنوں کی تلواروں سے شہید ہوئے ہیں ان کی صف میں جگہ نصیب ہو۔

۲۔ **شہادت عملی ارتقاء کا آخری زینہ ہے:** شہادت کا کمال مطلق ہونا اور اس راہ میں جہاد و تعب اور سختیاں برداشت کرتے ہوئے سعادت و ارتقاء سے براہ راست رابطہ پیدا کرلینا اس بات کا باعث ہوا کہ اسلامی مصادر میں شہید کو بزرگ ترین مقام اور درجہ دیا گیا ہے حتیٰ کہ شہادت کو اہم ترین عمل قرار ہوئے اس کو راہ تکامل و ارتقاء کا آخری زینہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں:۔

فوق کل ذی برٍ برٌ حتی یقتل الرجل فی سبیل اللّٰہ فاذا قتل فی سبیل اللّٰہ فلیس فوقہ برٌ۔[۲۹]

ہر نیکی سے بالاتر ایک نیکی ہے یہاں تک کہ راہ خدا میں شہید ہو جائے۔ جب شہادت نصیب ہوگئی تو اب عمل صالح کی اس سے بلند تر کوئی منزل باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب شہید شہادت کے بعد عنایت و کرامت خداوندی کا مشاہدہ کرتا ہے تو دوبارہ دنیا میں واپس آنے، راہ خدا میں جہاد کرنے اور پھر دشمن خدا کے ہاتھوں قتل ہو جانے کی تمنا کرتا ہے۔[۳۰]

بہرحال پیغمبر اسلام ارشاد فرماتے ہیں: "اشرف الموت قتل الشھادۃ" "بہترین موت شہادت ہے۔"[۳۱]

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "اکرم الموت القتل" "شریفانہ ترین موت (راہ خدا میں) قتل ہونا ہے۔"[۳۲]

دوسری جگہ حضرت فرماتے ہیں: "وہ شخص جو راہ شہادت طے کرتے ہوئے خدا سے ملاقی ہوتا ہے اس پیاسے کے مانند ہے جسے پانی مل جائے۔ جنت اس کے نیزے کی دھار کے نیچے ہوتی ہے۔"[۳۳]

جتنے بھی مصادر دستیاب ہیں ان کی روشنی میں شیعوں کے اماموں میں سے کوئی بھی امام اور

رہبر اپنی طبعی موت سے نہیں مرا بلکہ ان سب نے اپنے لئے خوبصورت ترین موت یعنی "شہادت" کو پسند کیا ہے۔

ابن شہر آشوب کہتا ہے کہ ہمارے بہت سے علماء (امامیہ) اس بات کے معتقد ہیں کہ تمام کے تمام ائمہ شیعہ (علیہم السلام) شہادت کے ذریعہ دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ اس کی دلیل امام جعفر صادق علیہ السلام کا وہ ارشاد ہے جسمیں آپ فرماتے ہیں:

واللہ مامنا الا مقتول شہید[43]

خدا کی قسم ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کو قتل اور شہید نہ کیا گیا ہو۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام پیغمبر اسلام سے نقل فرماتے ہیں کہ:۔

امر امامت کو آپ کے خاندان کے بارہ منتخب افراد سنبھالیں گے۔ ہم میں سے کوئی نہیں ہے مگر یہ کہ یا مقتول ہوا یا مسموم ہوا۔[44]

امام رضا علیہ السلام بھی اس مضمون کی تائید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

مامنا الا مقتول[45]

ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو مقتول نہ ہو۔

اللھم احینا حیاتھم، وامتنا مماتھم وتوفنا علی ملتھم واحشرنا فی زمرتھم ولا تفرق بیننا وبینھم طرفۃ عین ابدا۔

حواشی:

41. سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۹۶
42. سیرت ابن ہشام جلد ۳ ص ۹۶
43. بحار الانوار جلد ۲۰ منقول از واقدی ص ۱۲۵
44. البقرہ / آیت ۱۵۴

توحید ۱۱۴

۲۵ آل عمران / ۱۶۹

۲۶ اقتباس از کتاب سوم "جمہوریت افلاطون"

۲۷ شرح ابن ابی الحدید جلد ۱۰ ص ۹۹

۲۸ بحار الانوار جلد ۱، ص ۲۶۳ نقل از "امالی" و "عیون الاخبار" جلد ۲ ص ۱۳۰ نقل از کتاب "السدرة الباهرة" جلد ۱۴، نقل از عیون الاخبار۔

۲۹ شرح ابن ابی الحدید جلد ۲ ص ۱۲۰

۳۰ بحار الانوار جلد ۱۴ ص ۳

۳۱ شرح ابن ابی الحدید جلد ۶ ص ۱۱۷

۳۲ آل عمران / آیت ۱۵۴

۳۳ تفسیر المیزان جلد ۴ ص ۵۰

۳۴ آل عمران / آیت ۱۵۶۔

۳۵ آل عمران / آیت ۱۵۶ ۔

۳۶ شرح ابن ابی الحدید جلد ۳ ص ۱۸۴

۳۷ شرح ابن ابی الحدید جلد ۸ ص ۵ ۔

۳۸ ایک شخص امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کرتا ہے کہ: "مولا! میں زندگی سے تھک چکا ہوں کیا اجازت ہے کہ خدا سے موت کی خواہش کروں؟" امام نے جواب دیا: "خدا سے حیات میں اضافہ کے لئے دعا کیا کرو تاکہ زیادہ سے زیادہ اسکی اطاعت نیز نافرمانی سے پرہیز کا موقع ملے۔ چنانچہ اگر زندہ رہا اور اطاعت الٰہی میں وقت صرف کیا تو تیرے لئے بہتر ہے اس موت سے جس کے بعد نہ اطاعت کر سکتا ہے نہ معصیت۔

دوسری روایت میں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ ایک ایسے شخص کی عیادت کو تشریف لے گئے جو موت کی آرزو کر رہا تھا۔ نبیؐ نے اس کو منع کیا کہ موت کی دعا نہ کر اس لئے کہ اگر تو نیکوکار ہے تو طولانی عمر کی صورت میں زیادہ اعمال صالحہ بجالا سکتا ہے اور اگر گناہ گار ہے تو تاخیر موت کے سبب توبہ نیز گناہ کے کفارہ کے لئے زیادہ وقت میسر ہوگا۔ لہٰذا موت کی تمنا کسی صورت میں بھی درست

نہیں ہے (بحار الانوار جلد ۶ ص۱۲۸)

۳۹ اصول کافی جلد ۲ ص۳۴۸ ، بحار الانوار جلد ۱۰۰ ص۱۰ نقل از کتاب "خصال"
کتاب غایات میں مذکورہ عبارت یوں نقل ہوئی ہے:
"فوق کل بر، بر حتی یقتل الرجل فی سبیل اللہ ...."

۴۰ سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ ص۱۲۸

۴۱ بحار الانوار جلد ۱۰۰ ص۸ بہ نقل از امالی۔

۴۲ شرح ابن ابی الحدید جلد ۷ ص۳۰۰۔

۴۳ ابن ابی الحدید مولا کے اس کلام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: عبارت کا یہ ٹکڑا پیغمبر اسلام کے ایک قول سے اقتباس کیا گیا ہے جس میں حضور فرماتے ہیں: (کہ بہشت ان کی تلواروں کے سایہ میں ہوتی ہے) ــــ پیغمبر کے ایک صحابیؓ نے جنگ احد میں آپ کو یہ کہتے ہوئے اس وقت سنا جبکہ آپ کے ہاتھوں میں چند دانہ خرمہ کے تھے جن کو وہ دہن کی طرف لے جارہا تھا، یہ فقرہ سن کر اس نے نبی سے عرض کیا: "سبحان اللہ میرے اور بہشت کے درمیان اس چھوٹے سے خرمہ کے دانہ سے زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔" یہ جملہ کہہ کر خرموں کو زمین پر پھینکا اور شمشیر کو بے نیام کرتے ہوئے قریش (کفار) پر حملہ آور ہوا یہاں تک کہ اس کو شہادت نصیب ہوئی۔ (شرح ابن ابی الحدید جلد ۸ ص۶)

۴۴ بحار الانوار جلد ۲۷ ص۲۰۹

۴۵ بحار الانوار جلد ۲۷ ص۲۱۷

۴۶ بحار الانوار جلد ۲۷ ص۲۱۴۔

جناب محمد یزدی
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

صلح؟ یا جنگ

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز (سورۂ حج / ۴۰)

"اور اگر خداوند عالم بعض لوگوں کے شر بعض دوسرے لوگوں کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو نہ کوئی خدا کی عبادت کرتا نہ ہی عبادت گاہوں کا نام ونشان باقی رہتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خداوند عالم ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے دین کی نصرت کرتے ہیں۔ یقیناً خدا قوی و عزیز ہے"

موجودہ بحث کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) عمومی مسائل (۲) ایران عراق جنگ

عمومی مسائل:۔

لفظ جنگ چونکہ پہلی نظر میں قتل و غارت گری، قید و بند، تباہی و ویرانی، مہاجرت و دربدری جیسے تصورات ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ نیز یہ کہ معلولین و مفقودین اور پھر خاندانوں کے لیے مصیبتوں اور پریشانیوں کے علاوہ دسیوں دوسرے اقتصادی، اجتماعی اور اخلاقی مسائل اس کے ذریعہ جنم لیتے ہیں لہٰذا لوگوں کے درمیان اس کا چہرا اتنا بھیانک، کریہہ اور ناقابل دید ہوتا ہے کہ اس کا نام لیتے ہی ہر شخص اس کا مخالف ہو جاتا ہے۔

اس کے برخلاف صلح کا نعرہ اپنے ہمراہ سکون و اطمینان اور امن و سلامتی کے ساتھ ساتھ زندگی کو معمول پر لانے فطری شعور و صلاحیت کو برقرار کرنے نیز طرح طرح کے حسین و جمیل ادراکات و احساسات کے بیدار کرنے کا باعث ہوتا ہے لہٰذا اس کا چہرہ نہایت ہی نرم و جاذب، خوش آیند و خوبصورت اور پرکشش نظر آتا ہے۔

لیکن — انسانی زندگی کی اس طویل تاریخ میں جو جنگیں رونما ہوئی ہیں اور جو مصالحتیں عمل میں آئی ہیں ۔ دوسرے مسائل کی طرح ان کی بھی چھان بین ہوئی ہے اور ان کا بھی لوگوں نے تجزیہ و تحلیل کیا ہے جس میں ان کے اسباب و علل پر بھی بحث کی گئی ہے اور ان کے اثرات و نتائج کا بھی دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے ۔خصوصاً دو عظیم عالمی جنگوں کے بعد اس کام میں بڑی تیزی پیدا ہوئی ہے کیونکہ ان جنگوں میں بے پناہ جانی و مالی نقصانات سامنے آئے تھے[2] ۔چنانچہ آیندہ اس قسم کے حادثات کے رونما ہونے سے بچنے کیلئے ایک وسیع پیمانے پر بین الاقوامی ادارہ کا وجود عمل میں آیا ۔ اگرچہ یہ ادارہ اپنے قیام سے لے کر آج تک کوئی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ نہ کرسکا پھر بھی تیسری عالمی جنگ کے روکنے کے سلسلہ میں (جو اپنی نوعیت کی خطرناک ترین جنگ تصور کی جاتی ہے[3]) کسی نہ کسی حد تک ضرور کامیابی حاصل کی ہے ۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں جنگوں کا تسلسل مثلاً ویتنام کی جنگ، جنوبی و شمالی کوریا کی جنگ، عرب اسرائیل جنگ، ہند و پاک جنگ، ایران و عراق جنگ یا افغانستان میں روسی جارحیت اور لبنان میں بڑی طاقتوں کی دخل اندازی وغیرہ کے روکنے کے سلسلہ میں یہ ادارہ کوئی مثبت اقدام نہیں کرسکا ہے[4] ۔

بنیاد :۔

تمام جنگوں اور صلحوں کے بنیادی اسباب و علل نیز ان کے نتائج و اثرات کا الگ الگ مطالعہ کرنے سے بھی یہ بات واضح ہے اور اگر ان میں گذشتہ ادوار میں ہونے والی جنگوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان سب کا مختصر الفاظ میں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ :۔

جنگ کو ہوا دینے والی استعماری طاقتیں محض کمزور و ناتواں اقوام پر تسلط حاصل کرنے نیز ان کے اموال اور سرمایہ کو غارت کرنے کی غرض سے حملہ آور ہوتی رہی ہیں چنانچہ آتش جنگ بھڑکا کر قتل و خونریزی اور تخریب کاری کے ذریعہ اپنے مقابل کو غلامی کی زنجیر میں جکڑ دینا اور ان پر مسلط ہو جانا ہی ان کا وطیرہ رہا ہے ۔ ردعمل کے طور پہ کمزور و ستم زدہ اقوام اپنی تمام تر طاقت و صلاحیت کے

کے ساتھ ان وسعت پسند بڑی طاقتوں کے مظالم کا دفاع کرنے کے لئے میدان میں آگئیں اور ستمگروں سے مقابلہ کے لیے اپنا گھر بار اپنا وجود، اپنی حیات اور وسائل زندگی سب کچھ داؤں پر لگا دیا ۔

اس بات کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں کہ آج ہمارے دور میں بڑی طاقتیں اپنے اسلحوں کے کارخانوں کی پہیہ جام ہونے سے بچانے کے لیے جس پر ان کے اقتصاد کا دار مدار ہے، مسلسل طور پر آتش جنگ روشن کر کے اس کو ہوا دیتی رہتی ہیں ۔

انجام: نتیجہ کے طور پر کبھی تو ظالم طاقتیں ہیروشیما جیسے ہزاروں افراد سے پُر شہروں کو خاکستر بنا کر کامیابی کے جشن مناتی ہیں اور کبھی کمزور اقوام ہمت و جواں مردی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے حتیٰ کہ اپنا سب کچھ قربان کر کے مخالف کو شکست دیکر اپنا تحفظ کرتی ہیں ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جنگ کے طول کھینچنے کی صورت میں بے پناہ نقصانات کے بوجھ تلے دب جانے کی وجہ سے دوسروں کو رابطہ بنا کر طرفین ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ کر یا گول میز کانفرس میں صلح کی قرارداد پر دستخط کر دیتے ہیں جن میں سے اکثر قرار دادیں بار ہا ٹوٹتی یا تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور کبھی کبھی تو ایک لمبی جنگ پر منتہی ہوتی ہیں ۔

مقدس مقاصد :-

اگرچہ تمام جنگوں اور صلحوں کا محور اکثر و بیشتر مادی مسائل یا کسی نہ کسی طرح دنیوی حکومت و اقتدار کا حصول ہی ہوتا ہے اس لئے کہ جنگ کو فروغ دینے والے کا مقصد، ہی مادی منفعت اور قدرت و حکومت میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے اور دوسری طرف حملہ آوروں کا مقابلہ اور دفاع یا صلح و مصالحت کی باتیں بھی محض اپنی جان و مال اور قدرت و حکومت کی حفاظت اور دنیوی مقاصد کے تحفظ کے لئے کی جاتی ہیں ۔

پھر بھی تحقیق و مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان اقدامات کے پیچھے کہیں کہیں ایک اور جذبہ بھی کارفرما رہا ہے جو زیادہ تر مذہبی جنگوں میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے ۔ جنگ و صلح کے تمام مراحل میں چاہے دشمن سے مقابلہ کی منزل ہو یا اسارت اور اس سے متعلق دیگر مسائل ہوں، مال غنیمت اور اس کی تقسیم کا مسئلہ ہو یا صلح و مصالحت اور اس کی شرطوں کی بات ہو ایک مقدس جذبہ کے آثار و نشانات واضح طور پر نظر آتے ہیں جو دوسری جنگوں سے قطعی مختلف ہیں ۔

قرآن آواز دیتا ہے : ایک شخص دس اشخاص کے خلاف دس ہو کے، سو ہزار کے خلاف مقابلہ

کے لئے کھڑے ہوجائیں نہیں تو کم از کم ایک شخص دو اشخاص سے دس بیس سے، سو دو سو سے ہزار دو ہزار سے جنگ و مقابلہ کریں۔

اگر دشمن عین عالم جنگ میں خود سپردگی کا اعلان کردے یا راہ فرار اختیار کرلے تو اس کا پیچھا نہیں کرنا چاہئے۔ اور اگر اسیر ہوجائے تو اس کو تکلیف و ایذا نہیں پہونچانا چاہئے۔ بوڑھے مردوں، عورتوں اور بچوں، مختصر یہ کہ تمام غیر فوجی افراد سے جنگ کرنا ممنوع ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کو زہر آلود کرنا یا موجودہ اصطلاح میں کیمیائی اسلحوں کا استعمال کرنا قطعاً جائز نہیں۔ یہ تمام آثار وافکار اسی مقصد و جذبہ کی عکاسی کرتے ہیں جو مذہبی جنگوں میں ملحوظ خاطر رکھی گئی ہیں۔

مذہبی جنگ :۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مذہبی جنگوں سے ہماری مراد محض وہ جنگیں ہیں جو پیغمبر، امامؑ یا ان کے جانشین کے حکم و فرمان سے لڑی گئی ہیں نہ کہ ہر وہ جنگ جس پر مذہب کا ٹائٹل لگا دیا گیا ہے مثال کے طور پر صلیبی جنگیں ہماری فہرست میں شامل نہیں ہیں۔

جہاد اور دفاع :۔

اسلام میں جنگ کی دو نوعیتیں ہیں :

۱۔ جنگ ابتدائی : اس کو اصطلاح میں "جہاد" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسمیں ابتدائی طور پر غیر مسلمین کو نبیؐ یا امامؑ اسلام کی دعوت دیتا ہے چنانچہ اگر غیر مسلم جماعت اہل کتاب میں سے ہے تو اس سے کہا جاتا ہے اسلام قبول کرے یا حکومت اسلامی کو جزیہ (ٹیکس) ادا کرے کیونکہ حکومت اسلامی اس کے تحفظ کی ذمہ دار ہے۔ دوسری صورت میں جنگ کے لئے آمادہ ہوجائے۔ اب اگر ابتدائی دونوں صورتیں مسترد کردی جائیں تو جنگ لازمی ہوجاتی ہے۔ فقہ اسلامی کے تحت یہ قانون زمانۂ پیغمبر اسلامؐ یا ائمہ معصومینؑ کے عہد سے خصوصیت نہیں رکھتا۔

۲۔ جنگ دفاعی : یہ دفاعی جنگ ہے جو کسی خاص زمانہ، مقام، حالات یا حکومت سے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ جب بھی کوئی ان پر ظلم و زیادتی یا چڑھائی کرے، اپنے حسب امکان اس کا دفاع کریں۔ البتہ جنگ کی صورت میں اپنی فنی خصوصیات و صلاحیت کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں شرعی قوانین و احکام کے ذمہ داروں کے حکم پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس طرح کی جنگوں کو

دفاع کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے چاہے حملہ و زیادتی کفار و غیر مسلم جماعتوں کی طرف سے ہو یا خود مسلمانوں کے درمیان ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف حملہ آور ہو۔ چنانچہ دوسری صورت میں یعنی خود مسلمانوں کے درمیان نزاع ہونے کی صورت میں ابتدائی طور پر ان کے درمیان صلح و صفائی کی کوشش ضروری ہے اور جب ایسا ممکن نہ ہو اور ایک گروہ دوسرے گروہ پر ظلم و زیادتی سے باز نہ آئے تو اس وقت تک جب تک کہ باغی گروہ اپنی خود سپردگی کا اعلان نہ کر دے جنگ جاری رکھنا واجب و لازم ہے۔[۱۱]

پہلی قسم کی جنگ کا مقصد اسلام کی حاکمیت کو تسلیم کرانا اور بشریت کو نجات دلانا ہے دوسرے الفاظ میں یہ وہ آخری راستہ ہے جس کے ذریعہ خدا کے نبیوں کی رسالت کا مقصد پورا ہوتا ہے لہٰذا قدرتی طور پر اسکی اہمیت براہ راست انبیاء الٰہی و پیغمبر اسلام کے مقصد بعثت کی اہمیت سے وابستہ و مربوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا انبیاء اور ائمہ کی اہم ترین ذمہ داریوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا مقصد و محرک خدا و رسولؐ کی اطاعت و فرمانبرداری اور ان کے دین کی ترویج و اشاعت ہے۔

لیکن دوسری قسم کی جنگوں کا مقصد خدا و رسول کے دین اور مقدسات الٰہی کی حفاظت و نگہبانی ہے کیونکہ اگر ان کا دفاع نہ کیا گیا تو نہ عبادت باقی رہے گی نہ عبادت گاہوں کا نام و نشان باقی رہے گا پوری زمین فساد سے بھر جائے گی اور زمین پر زندگی بسر کرنے والے اپنی اصل فطرت کو دفن کر دیں گے[۱۲] اس جنگ کا مقصد و محرک عقلی و شرعی قانون و دستور کی اطاعت ہے۔ اپنی حیات و زندگی کا دفاع کرنا تمام زندہ قوموں اور معاشروں کی سرشت و فطرت میں داخل ہے۔[۱۳] چونکہ تمام دنیا دار شہوت پرست، منصب و اقتدار کے حریص اپنی چیرہ دستیوں اور استعماری ذہنیتوں کے علاوہ دینی افکار و عقائد خصوصاً مذہب اسلام کے جامع نظریات و افکار کو اپنی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں، اس لئے مسلسل طور پر مذہب اور اہل مذہب سے برسر پیکار رہے ہیں۔

ظاہر ہے اس قسم کی جنگوں میں اگر حملہ آور غیر مسلم ہو تو مسلمان عوام بڑی آسانی کے ساتھ دفاعی مہموں میں حصہ لیتے ہیں اور پوری آزادی کے ساتھ دفاعی امور انجام دیتے ہیں لیکن اگر خود مسلمانوں میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر دست درازی کرتا ہے تو دفاعی مراحل ایک نپے تلے قوانین اسلام میں محدود رہ کر انجام پاتے ہیں۔ ان احکام کی تفصیلی شرح کے لئے فقہی کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک دوسرا نکتہ جس کو حتمی طور پر ذہن نشین کر لینا چاہئے وہ چیز ہے جسے جارحیت کا نشانہ بنایا گیا

ہے اور اسی پر دفاع کا انداز اور مشکلات کا تحمل منحصر ہوتا ہے۔ قہری طور پر اگر اسلام کی اساس و بنیاد مثلاً قرآن کو حملہ کا نشانہ بنایا گیا ہے تو اس کا دفاع کرنا بہر قیمت واجب و لازم ہے چاہے اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے ۔ اگر ہزار ہا انسان کروڑوں روپئے اور سیکڑوں آبادیاں سے پُر شہر و دیہات اسلام و قرآن کی حفاظت کے لیے نیز ان پر منڈلانے والے خطرات کو دور کرنے کے لیے کام آجائیں پھر بھی ان کی کوئی اہمیت و قیمت نہیں ہے۔

ایران عراق جنگ

۶ مارچ ۱۹۷۵ء کو الجزائر میں ایران و عراق کے درمیان طویل اختلافات کو ختم کرنے کی غرض سے بحث و گفتگو کے بعد ایک معاہدہ عمل میں آیا جس پر دونوں ملکوں کے حکمرانوں نے دستخط کئے۔ اس معاہدہ میں اقوام متحدہ کے منشور کے ۲۳ ویں آرٹیکل کی پہلی شق کا حوالہ دیتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ کسی بھی اختلاف کی صورت میں دونوں فریق عدالت کی طرف رجوع کریں گے اور اسی پر اس کا آخری فیصلہ چھوڑ دیا جائے گا۔

۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو مرجع عظیم الشان آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی مدظلہ العالی کی قیادت میں ۱۵ سال کی مسلسل جد و جہد اور قربانیوں کے بعد ایران کا عظیم اسلامی انقلاب کامیابی سے ہمکنار ہوا اور کفر نواز طاغوتی نظام کا خاتمہ ہو گیا ۔

اس کامیابی کے عین پچاسویں دن یعنی ۲۔ اپریل ۱۹۷۹ء کو عراق نے مہران کے بے دفاع مظلوم عوام کو اپنے ہوائی حملوں کا نشانہ بنایا اور ۳۔ اپریل کو قصر شیریں پر مسلحانہ حملہ کر دیا پھر ۷ اپریل کو مہران کے تیل کی تنصیبات پر حملہ کیا گیا ۔ یہ سرحدی حملے زمینی ہوائی اور دریائی تینوں صورتوں میں مختلف شکلوں سے نہایت ہی مختصر مختصر وقفہ کے ساتھ جاری رہے ۔ مجموعی طور پر کل ۶۳۶ چھوٹے بڑے زمینی ہوائی اور دریائی حملے ریکارڈ کئے گئے ۔ اسی قسم کی دوسری حرکتیں جو اس بات کی واضح نشان دہی کرتی تھیں کہ عراق بہت بڑے پیمانے پر ایک زبردست حملہ کی تیاری کر رہا ہے چنانچہ ہم فکر و ہم آہنگ خلیجی ممالک کا ہنگامی دورہ، ایران عراق کے سرحدی علاقوں میں فوجی حمل و نقل

کے لئے راستوں کی تعمیر، ریزرو فوج کا بلاوا وغیرہ یہ سب چیزیں کسی بڑے حملے کی نشاندہی کر رہی تھیں لیکن افسوس اس وقت کے نام نہاد قوم پرست حاکموں اور فراریوں کی تساہلی کی وجہ سے ان علامتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی اور ممکنہ خطرات سے بچنے کے لئے اقدام نہیں کیا گیا صرف وزارت خارجہ ایران کی طرف سے عراقی وزارت خارجہ کو اس سلسلہ میں خبردار کر دینے پر ہی اکتفا کیا گیا۔

لائق توجہ یہ ہے کہ صدام نے اپنے فاسد مقاصد کو پردۂ راز میں رکھنے کے لئے اعلان کیا کہ :۔

"ہم آپ کو اور تمام دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم اپنے تمام پڑوسی ملکوں خصوصاً ایران سے بہترین پڑوسیوں جیسے روابط کے خواہش مند ہیں اور عراق ایران کی سرزمین کے بارے میں نہ تو کسی قسم کی طمع رکھتا ہے نہ ہی ایران کے خلاف کسی جنگ کا ارادہ رکھتا ہے۔ عراق ہرگز کسی وسعت پسندانہ جذبہ کے تحت محاذ جنگ کھول کر اپنے حدود اربعہ بڑھانا نہیں چاہتا۔"[۱۲]

یہاں تک کہ ۳۰ اگست۔ ۳، ۷ اور ۱۰ ستمبر ۱۹۸۰ء کو مہران، زین کوس اور میمک کے علاقوں پر عراق نے شدید ترین حملے کئے جس کے نتیجہ میں مہران کی سرحدی چوکیوں نیز نوسود کے علاقہ میں واقع باویسی اور سمتیر نامی پہاڑیوں پر عراق کا تسلط ہو گیا —— ۱۷ ستمبر ۱۹۸۰ء کو صدام نے عراقی پارلیمنٹ کے سامنے ایک غیر معمولی جلسہ کو خطاب کیا اور کہا "میں آپ حضرات کے سامنے اعلان کرتا ہوں کہ ۶ مارچ ۱۹۷۵ء کے معاہدہ کو ہم یکسر فسخ کرتے ہیں اور شورای قیادت اس سلسلہ میں اپنے فیصلہ کا اعلان کرے گی۔"[۱۳]

پانچ روز بعد ۲۲ ستمبر ۱۹۸۰ء کو عراق نے بھرپور حملہ شروع کیا جس میں زمینی، ہوائی اور دریائی افواج کے کل ۱۲ عراقی ڈویژنوں نے شرکت کی۔ یہ حملہ مغربی سرحدوں میں جنوب سے شمال تک ۱۳۰۰ کلو میٹر سے زیادہ حصوں میں پھیلا ہوا تھا۔ ہوائی حملہ تہران کے مہرآباد ہوائی اڈہ تک، دریائی حملہ خلیج فارس کے دہانوں تک اور زمینی حملہ مغرب میں سرپل ذہاب اور اسلام آباد تک، جنوب میں اہواز تک پھیلے ہوئے تھے۔ حتی کہ آبادان کا محاصرہ کر لیا گیا اور قصر شیریں، سرپل ذہاب، نفت شہر، ہویزہ، اور خرم شہر جیسے پُر رونق شہروں اور سیکڑوں دیہاتوں کو تباہ و برباد کر کے ان پر قبضہ حاصل کر لیا گیا — مختصر یہ کہ ایران کا ۲۴ ہزار مربع کلو میٹر علاقہ جو پانچ سرحدی صوبوں خوزستان، ایلام، کردستان، باختران اور آذربائیجان غربی پر مشتمل تھا، عراقی فوج

کے قبضہ میں آگیا۔ ان کے علاوہ بہت سے آبادیوں سے معمور علاقے، صوبوں کے مراکز اور شہر مثلاً اہواز، باختران
ارومیہ، تبریز، ہمدان، بوشہر اور سنندج وغیرہ مسلسل طور پر ہوائی حملوں کی زد میں لائے گئے۔
اپنے ان تمام سیاہ کارناموں کے ساتھ صدام نے ٹیلیویژن پر آکر کھلے طور پر الجزائر کا معاہدہ پارہ پارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ معاہدہ اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جب ہم کمزور تھے اب ہم مضبوط و توانا ہیں اور اب اس معاہدے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔"
ان ہی حالات میں جبکہ جمہوری اسلامی ایران کے بہت سے شہروں اور علاقوں پر صدامیوں کا قبضہ تھا غیر ملکی خبرنگاروں کے سامنے اپنے ایک انٹرویو کے دوران بین الاقوامی قوانین کا مذاق اڑاتے ہوئے صدام کہتا ہے:۔
"وہ لوگ جو جنگ میں پھنسے ہیں انھیں اس کے نتائج کو بھی قبول کرنا چاہئے۔ آخر یہ کون سی بات ہوئی کہ وہ لوگ جو جنگ میں شکست اٹھا چکے ہوں ان سے کہا جائے کہ اب جبکہ ہم نے تم کو محاذ جنگ پر شکست دیدی ہے اپنی زمینوں پر واپس آجاؤ اور اپنے اختیار و تحویل میں لے لو۔"

پہلا دفاعی قدم:۔

صدام کے ان توسیع پسند جارحانہ اقدامات کو دیکھ کر جمہوری اسلامی ایران کے انقلابی عوام کے دلوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور پورے ملک میں ایک عظیم ولولہ پیدا ہو گیا کوچہ و بازار سے لوگ گروہ در گروہ محاذ جنگ پر جانے کے لئے نکل پڑے تاکہ ان حملوں کا منھ توڑ جواب دیا جاسکے جنگ پر آمادہ عوام کی وہ کثرت تھی کہ ان فداکاروں کو کام میں لانا فوجی افسروں کے لئے ایک مشکل مسئلہ بن گیا۔ ان دو کروڑ افراد کو منظم و مرتب کر کے فوجی تربیت دینا ضروری تھا چنانچہ فوج سپاہ، اور رضا کار عملہ کے افراد میدان عمل میں آگئے۔
۱۵ اکتوبر، ۲۸ نومبر ۱۹۸۰ء اور ۱۰ جنوری ۱۹۸۱ء کو دزفول ہویزہ ماہ شہر اور آبادان کے علاقوں میں معزول و معزور بنی صدر کی نگرانی میں مروجہ کلاسیکل فوجی کاروائیاں انجام پائیں لیکن ان میں شکست دامنگیر ہوئی۔
ایران کی طرف سے سب سے پہلی کامیاب کاروائی جس نے جنگ کو ایک نیا رخ عطا کر دیا "امام مہدی عجل اللہ فرجہ الشریف" نامی آپریشن تھا جو سوسنگرد کے علاقہ میں عمل میں آیا۔ اس کے بعد ۴ اور ۱۴ اپریل ۱۹۸۱ء کو کرخہ اور شوش کے علاقوں میں حملے ہوئے اور پھر فوج کی سربراہی نیز صدر جمہوریہ کے عہدے سے

بنی صدر کی معزولی کے بعد ۲ اور ۱۸ ستمبر ۱۹۸۱ء کو شیخ تپہ اور سوسنگرد سیکٹر میں پھر ۲۷ ستمبر کو شمالی آبادان میں "ثامن الائمہ" نامی کاروائی کی گئی۔ اس کاروائی کو سپاہ پاسداران انقلاب اسلامی اور فوجی رضاکاروں کے ساتھ مل کر امام خمینی مدظلہ کے حکم سے خراسان کے ۷۷ ویں فوجی ڈویژن نے سر کیا، جسمیں اسلامی مملکت ایران کی ایک سو پچاس کلومیٹر مربع زمین دشمنوں کے تسلط سے آزاد کرائی گئی۔

اور پھر اسی طرح مندرجہ ذیل نقشہ کے مطابق ایک مخصوص وقت اور تاریخ میں فوجی کاروائیاں عمل میں آتی رہیں جن کے نتائج بھی نقشہ میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں :۔

نمبر شمار	کاروائی	تاریخ	سیکٹر	نتائج	دشمن کے نقصانات
۱	ثامن الائمہ	۸۱/۹/۲۷ء	آبادان کے شمال میں واقع علاقہ اور کارون کا ایک مشرقی حصہ	۱۵۰ کلومیٹر مربع زمین اور فوجی اہمیت کی حامل دو شاہراہیں جو آبادان۔ ماہ شہر اور اہواز۔ آبادان کو ملاتی ہیں۔ آزاد ہوئیں ۔	دو ہزار افراد مارے گئے اور ایک ہزار ۸ سو افراد اسیر کئے گئے۔
۲	طریق القدس	۸۱/۱۱/۲۸ء	کرخہ اور ساس کے جنوب میں واقع علاقے نیز سوسنگرد کے مغرب میں واقع علاقے۔	۶۵۰ کلومیٹر مربع زمین جسمیں بستان شہر بھی شامل ہے آزاد کرائے گئے۔	۴ ہزار ۵ سو افراد قتل و زخمی اور ۵۴۶ افراد اسیر ہوئے۔ ۱۲ جہاز سرنگوں اور ایک سو ستر ٹینک اور فوجی بکتر بند گاڑیاں منہدم ہوئیں
۳	مطلع الفجر	۸۱/۱۲/۱۱ء		۱۶۰ کلومیٹر مقبوضہ زمین آزاد کرائی گئی۔	سو افراد اسیر ہوئے۔
۴	فتح المبین	۸۲/۳/۲۲ء	دزفول کا مغربی علاقہ شوش، اور دریائے کرخہ	۲ ہزار ۵ سو کلومیٹر زمین آزاد کرائی گئی۔	۲۵ ہزار افراد قتل و زخمی اور ۱۵ ہزار ۴ سو پچاس افراد اسیر ہوئے ۳۶۰ ٹینک تباہ اور ۲ سو قابل استفادہ ٹینک مال غنیمت میں ہاتھ آئے۔

نمبر شمار	کاروائی	تاریخ	سیکٹر	نتائج	دشمن کے نقصانات
۵	بیت المقدس	۳۰/۴/۸۲ء	خرم شہر	۵ ہزار ۵ سو کلومیٹر مربع زمین آزاد کرائی گئی جس میں خرم شہر ہویزہ، حمیدیہ چھاؤنی کے علاوہ اہواز و خرم شہر کی درمیانی شاہراہ بھی شامل ہے۔	۱۶ ہزار افراد قتل و زخمی اور ۱۹ ہزار افراد اسیر ہوئے ۱۸۰ ٹینک ۲۹ جنگی جہاز اور ۳ ہیلی کاپٹر تباہ و برباد ہوئے اور ایک سو پانچ قابل استفادہ ٹینک غنیمت میں ہاتھ آئے۔
۶	رمضان	۱۳/۶/۸۲ء	خرم شہر، زید چھاؤنی عراق۔	اسی کلومیٹر مربع عراقی زمین بعثیوں کے تسلط سے آزاد کرائی گئی۔	ایک لاکھ پچاس ہزار بارودی سرنگیں بیکار کی گئیں۔ ایک ہزار ایک سو دس افراد اسیر اور ۵ ہزار ۵ سو افراد قتل و زخمی ہوئے۔ ۱۲ عدد ٹی۔۷۲ ٹینک غنیمت میں ہاتھ آئے ــــ
۷	مسلم ابن عقیل	۱/۱۰/۸۲ء	سومار	۱۵۰ مربع کلومیٹر زمین آزاد ہوئی تینر سلمان کشتہ، قلعہ جوع، سان بابا میان تنگ کبکہ، سومار اور کانی شیخ کی سرحدی چوکیاں اسلامی فوج کے قبضہ میں آئیں۔	ایک سو ستر افراد اسیر ہوئے۔
۸	محرم	۱/۱۰/۸۲ء		۵ سو اسی کلومیٹر مربع زمین آزاد کرائی گئی۔	۳ ہزار ۵ سو افراد اسیر ہوئے۔

نمبر شمار	کاروائی	تاریخ	سیکٹر	تازہ نتائج	دشمن کے نقصانات
۹	والفجر مقدماتی	۸۳/۲/۶ء	امتداد چزابہ سے لیکر رشیدیہ چھاونی تک	۳ سو کلومیٹر زمین آزاد کرائی گئی۔	۲ ہزار ۵ سو افراد قتل و زخمی اور ایک سو دس افراد اسیر ہوئے ۱۴ ویں ڈویژن کا ستر واں پیدل فوجی دستہ اور ۵۰۵ ویں دستہ کا ۲ میکنزم دستہ نیز ۱۴ ویں ڈویژن کے دور مار دستہ بالکل تباہ کر دیئے گئے ۶ جنگی جہاز سرنگوں اور دسیوں ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں منہدم کی گئیں۔
۱۰	والفجر اول	۸۳/۵/ء	فکہ کا شمالی علاقہ	۱۵۰ مربع کلومیٹر زمین آزاد کرائی گئی۔	۸۵۰ افراد قتل و زخمی اور ۲۵۰ افراد اسیر ہوئے ۹۸ ٹینک اور ۵ ہیلی کاپٹر منہدم ہوئے۔
۱۱	والفجر دوم	۸۳/۶/۲۰ء	پیران شہر و روان دوز	۲ سو کلومیٹر مربع عراقی زمین بعثیوں کے تسلط سے آزاد کرائی گئی۔	حاجی عمران کا فوجی اڈہ اور عراقی فوج کی دیگر پچاس پناہ گاہیں اور اجتماعی مراکز آزاد ہوئے۔ ۱۳ جنگی جہاز اور ہیلی کاپٹر سرنگوں ہوئے ۸۴ توپیں ۱۲ ہزار بارودی مشین گنیں، سو آٹومبیلیں، ایک سوا سی توپ کے گولے ۲۰ توپ خانے جس سے گولے پھینکے جاتے ہیں اور ۱۸ لودر غنیمت میں ہاتھ آئے۔

صلح یا جنگ

نمبر شمار	کاروائی	تاریخ	سیکٹر	نتائج	دشمن کے نقصانات
۱۲	والفجر سوم	۸۳/۶/۲۴ء	کافی سخت ازالوآباد راجی کے فوجی مراکز اور کنجا نچم کے علاقے	پچاس کلو میٹر مربع عراقی زمین آزاد ہوئی، مہران سے ایلام جانے والی شاہراہ آزاد ہوئی شہر مہران کی امنیت مستحکم ہوئی۔	تین ہزار ۵ سو افراد قتل و زخمی ہوئے اور قابل اعتناء تعداد میں اہم چیزیں تباہ یا مال غنیمت میں ہاتھ آئیں۔
۱۳	والفجر چہارم	۸۳/۱۰/۱۹ء	ایران کے مغرب میں واقع عراقی سرزمین	لا لاحمرہ، گرمک اور لاری پہاڑیاں اسلامی لشکر کے تسلط میں آئیں۔	
۱۴	والفجر پنجم	۸۳/۲/۱۷ء	دھلران و مہران کا درمیانی علاقہ	شہر عمارہ اور کوت کو ملانے والے علاقوں پر قبضہ حاصل ہوا۔	
۱۵	والفجر ششم		چیلات (دھلران کا شمالی مغربی علاقہ)	چالیس کلومیٹر مقبوضہ علاقہ آزاد ہوا۔ فوجی اہمیت کی حامل ایک شاہراہ جو چرابہ اور طیب کو ملاتی ہے تصرف میں آئی۔	
۱۶	خیبر	۸۴/۳/۲۲ء	بصرہ کا مشرقی حصہ		
۱۷	میمک		بیجا و بینار وغیرہ کے درے۔	خان لیلاب اور گرگن کے فوجی اڈوں پر قبضہ حاصل ہوا	

اس کے بعد بدر نامی کاروائی کا ایک سلسلہ رہا پھر "قدس" "عاشورا" اور "قادر" نامی کاروائیاں انجام پائیں [۱] جن میں سے ہر ایک کے نتائج کے اعداد و شمار کے مطابق کافی زمین آزاد ہوئی، غنیمت ہاتھ آئے اور اُسرا کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا، دشمن کو مسلسل طور پر شکست کھا کر پیچھے کی طرف ہٹنا پڑا۔ ظاہر ہے اس راہ میں ایران کو بھی بہت سے گراں قدر عزیزوں اور جانبازوں کی شہید، اسیر اور مفقود کی صورت میں قربانیاں پیش کرنی پڑیں جن کی فہرست، نام و شرح احوال وصیتوں کے ساتھ "بنیاد شہید" کی طرف سے شائع ہو چکی ہے اور ان کے اہل و عیال کی کفالت کی ذمہ داری بھی یہ ادارہ قبول کر چکا ہے۔ جمہوری اسلامی ایران نے جب آبادان کا محاصرہ توڑ کر خرم شہر کو فتح کیا اور ہویزہ، سرپل ذہاب، قصر شیریں وغیرہ کے علاقوں کو دشمن فوج کے ہاتھوں سے آزاد کرا لیا تو شکست خوردہ دشمن کو اپنی کمزوری اور شکستِ مسلسل کا یقین ہو گیا چنانچہ اس نے جنگ کا رخ بدلنے کے لئے ایک دوسرا چولا اختیار کیا اور جنگ کا رخ بحری راستوں اور آباد شہروں پر بمباری کی طرف موڑ دیا تاکہ استعماری ایجنٹوں کے ذریعہ پروپیگنڈے کرا کے اپنی شکست فاش پر پردہ ڈالا جا سکے۔ لیکن الحمد للہ اس مرحلہ میں بھی دشمن کو مسلسل طور پر بے پناہ نقصانات اٹھانے پڑے۔

جہاں تک بین الاقوامی قوانین کی پامالی کا سوال ہے دشمن نے اسمیں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مسلسل طور پر آبادیوں سے پُر علاقوں، اسکولوں اور اسپتالوں پر بمباری کے علاوہ کھلم کھلا کیمیاوی و آتش گیر مادوں اور اسلحوں کا استعمال کیا۔ قیدیوں کے ساتھ ناروا سلوک کئے گئے جن کا تفصیلی ذکر ہفتہ جنگ کی چھٹی سالگرہ کے موقع پر "ستاد تبلیغات جنگ" کی طرف سے دو مستقل کتابچوں کی صورت میں شائع کیا جا چکا ہے اور یہاں اس کا دہرانا مقصود نہیں ہے۔ دشمن نے ابتدائی دنوں سے ہی جب یہ محسوس کر لیا کہ اس کے ناپاک عزائم جن کے حصول کے لئے جمہوری اسلامی ایران پر اس نے جنگ مسلط کی تھی، اب اس کے بس سے باہر ہو چکے ہیں اور ان کی تکمیل ممکن نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس کے برخلاف جنگ کا جاری رہنا خود عراق کے لئے روز بروز مشکلات و پریشانی میں اضافہ کا سبب ہو رہا ہے اپنے انداز گفتگو میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی اور صلح کے نعرے لگانے لگا۔ مستکبرین عالم کی پروپیگنڈہ مشینریوں نے صلح کے مسئلہ کو اس طور پر ہوا دینا شروع کیا گویا جنگ کے جاری رکھنے میں سارا قصور جمہوریہ اسلامی ایران کا ہے اور عراق بے چارہ مظلوم اور صلح کا طالب ہے۔

اس کے ساتھ ہی صلح وصفائی کا پیغام لے کر مختلف وفود کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ ہر ایک نے اپنے خاص استکباری انداز میں بڑے ہی نرم ونازک میٹھے لب ولہجہ میں ایران سے جنگ بندی کی درخواست کی۔ ان وفود کی تعداد ان کے مذاکرات کی تفصیل نیز ان کی آمد کے مقاصد جو بیشتر خود ان کے اپنے ملک وقوم کے مفاد سے وابستہ ہیں، جن کے پیش کرنے کی گنجائش اس مقالہ میں نہیں ہے بلکہ یہ خود مستقل ایک کتاب چاہتے ہیں۔

جمہوریۂ اسلامی ایران کے قائدین اور ذمہ داروں نے روز اول ہی جب پہلا وفد خیر سگالی کا پیغام لے کر ایران وارد ہوا تھا واضح الفاظ میں اپنے موقف کا اظہار کر دیا تھا کہ :-

جنگ کا خاتمہ تین اہم بنیادوں پر منحصر ہے۔

(۱) دشمن افواج کا جمہوریۂ اسلامی ایران کی سرزمین سے مکمل انخلاء۔

(۲) بین الاقوامی عدالت میں تجاوز وحملہ آور کے خلاف قانونی چارہ جوئی۔

(۳) جنگی نقصانات کی ادائیگی۔

جن میں سے آخرالذکر دو شرطیں اب بھی جیوں کی تیوں برقرار ہیں جبکہ پہلی شرط کا حل خود اسلامی جانبازوں نے دشمن کے ہاتھوں سے اپنی زمین چھین کر انہیں اپنی سرحدوں سے بھی پیچھے ڈھکیل کر، حاصل کر لیا ہے۔

دوران جنگ جہاں تک بڑی طاقتوں کی طرف سے براہ راست یا بعض عرب ملکوں کے ذریعہ عراق کی مالی، فوجی یا سیاسی مدد کا سوال ہے یہ ایک طولانی بحث ہے اور اس کے لئے بھی مستقل ایک مقالہ کی ضرورت ہے، البتہ اس کو تاریخ کی خوش بختی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ وہ تمام پردہ پوشیاں جو اس سلسلہ میں اوائل جنگ سے کی جاتی رہی ہیں اب ان کا پردہ چاک ہو چکا ہے اور امریکہ فرانس اور روس کی عراق کے ساتھ باضابطہ تعاون کا اقرار دنیا کے تمام اخبارات ورسائل نیز دیگر ذرائع ابلاغ نے کھل کر کر لیا ہے۔ جس کی تفصیل "خبر گزاری جمہوری اسلامی" ایران کی جانب سے شائع ہونے والے نشریوں میں منظر عام پر آ چکی ہے۔

صلح یا قتال :

ان حالات میں اب جبکہ وہ بڑی طاقتیں بھی جو عراق کی حمایت وپشت پناہی کر رہی تھیں اور

کر رہی ہیں اپنی غلطیوں اور خام خیالیوں کا اعتراف کر چکی ہیں اور اپنے مقاصد کی طرف سے بالکل مایوسی کا شکار ہیں، اس چیز کو دھیان میں رکھتے ہوئے کہ ان کا اولین مقصد ایران سے نظام اسلامی کا خاتمہ کرنا تھا اور یہ لوگ اسلام کو اپنے وجود کے لیے بہت بڑا خطرہ بنا کر پیش کرتے ہیں نیز یہ کہ یہی لوگ اس وقت جبکہ صدام نے یکطرفہ طور پر الجزائر معاہدہ کو پارہ پارہ کر کے ایران پر حملہ کیا تھا، صدام کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے اور اسکی چرب زبانیوں پر تالیاں بجا رہے تھے۔ اب شکست کو یقینی دیکھ کر مختلف ذرائع سے بہانہ بنا بنا کر صلح کی پیشکش کر رہے ہیں۔ کیا اس طرح کی صلح کی اپیل کوئی مفہوم و معنی رکھتی ہے اور ان حالات میں صلح کی پیشکش قبول کرنا درست ہوگا؟!!

ایک ایسا شخص جو نہ صرف یہ کہ جمہوریہ اسلامی ایران پر حملہ کا باعث ہوا ہے بلکہ جس نے جنگ میں بین الاقوامی قوانین کی پامالی کر کے انسانیت کش اقدامات کئے ہیں اور جو سخت ترین سزاؤں کا مستحق ہے، اس کے ساتھ تو صلح کا تصور کرنا بھی محال ہے چہ جائیکہ واقعی صلح کرنا۔ کون اس طرح صلح کو قبول کرنے پر تیار ہو سکتا ہے؟

کون اس بات کی ضمانت دینے کو تیار ہوگا اور کس کے دستخط کو قابل اعتماد و یقین مانا جاسکتا ہے کہ پھر کل یا پرسوں الٰہی نظام کے خلاف سازش کر کے دوسری جنگ نہیں چھیڑ دی جائے گی اور تمام ذمہ داریوں کو پامال نہیں کر دیا جائیگا؟؟

آیا ایک ایسا شخص جس نے نہ صرف یہ کہ خود اپنے دستخط کو پاؤں تلے روند ڈالا بلکہ دسیوں بین الاقوامی قوانین کو پامال کرتا رہا اور صرف اپنی قوت و طاقت پر اکڑتا رہا کیا سوائے طاقت اور منہ توڑ جواب کے اس کو کوئی اور چیز خاموش کر سکتی ہے؟ شہید رجائی نے کیا خوب کہا تھا کہ "ہمارے نوجوان محاذ جنگ پر مذاکرہ میں مشغول ہیں۔"

خدا کی طرف بازگشت:-

اگر محض اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور چونکہ عراق میں رہنے والے بھی مسلمان شمار ہوتے ہیں لہٰذا بالفرض بغداد میں حاکم جماعت کو بھی مومنین کی فہرست میں شامل فرض کر لیا جائے اور ہر طرح کے تعصب نیز پہلے سے مرتب خیالات کو بالائے طاق رکھ کر فیصلہ کیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا صدام نے واقعی طور پر مکمل خدا کی طرف بازگشت کی ہے اور خدا پر دل سے ایمان رکھتا ہے؟

یا یہ کہ اب اپنے آپ کو اپنے ہی جال میں پھنسا ہوا دیکھ کر صلح کے نعرے بلند کر رہا ہے؟ جبکہ اپنے کلام کا اختتام اب بھی طاقت و قوت کے اظہار اور شیخی بگھارنے پر کرتا ہے۔

مذکورہ بالا گزارشات کے پیش نظر، جو جنگ کی ایک ہلکی سی جھلک ہے ہماری نظر میں صدام کے باغی ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں ہے اور اسلام سے بغاوت کرنے والے کے لیے خداوند عالم کا واضح اعلان موجود ہے :-

"فقاتلوا التی تبغی حتّٰی تفئ الیٰ امر اللہ" اس کے ساتھ قتال کرنا واجب ہے جبتک کہ وہ خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کر دے اور اپنے آپ کو عدالت کے حوالے نہ کر دے۔

چونکہ حملہ آور غاصب سے اپنی جان و مال کا بدلہ لینا اور اس کی دست درازیوں کا مزا چکھانا خدا کا حکم ہے لہٰذا جنگ چھیڑ کر مسلمانوں کے جان و مال کو نقصان پہونچانے والے کے ساتھ صلح کا کوئی مفہوم نہیں۔ چنانچہ اسی خیال کی وضاحت رہبر کبیر انقلاب حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی دام ظلہ العالی نے ان الفاظ میں کی ہے: "صدام سے صلح کرنا قرآن کی خلاف ورزی کرنا ہے۔"

ایک امریکی رپورٹ :-

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امریکہ سے شائع ہونے والی ایک رپورٹ جو کافی طولانی ہے اور جس کا ترجمہ "ستاد تبلیغات جنگ" کے اہتمام سے جنگ کی پانچویں سالگرہ کے موقع پر منظر عام پر آچکا ہے، حتّی الامکان مختصر ترین انداز میں پیش کر دی جائے ـــ نیویارک سے شایع ہونے والے "مریپ رپورٹ" نشریہ نے اپنے ایک مخصوص شمارہ میں "خلیج فارس کی انوکھی جنگ" کے عنوان کے تحت مشرق وسطیٰ سے متعلق نامور خبر نگاروں اور تبصرہ نویسوں کے مستند اور تفصیلی مقالات جنگ کے بارے میں شائع کئے ہیں اگرچہ ان مقالات میں مذہبی و اسلامی نقوش نیز انقلاب اور ایران کے خلاف کئے جانے والے حملے کے اصل اسباب وعلل کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے بلکہ بہت سی غلط اور بے بنیاد باتیں خصوصاً اسلحوں کی فراہمی کے سلسلہ میں خلاف واقعہ داستانیں گڑھی گئی ہیں پھر بھی مجموعی طور پر جنگی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے جنگ جس منزل تک پہونچ چکی ہے اور آئندہ کیا رخ اختیار کر سکتی ہے اس کی بہت ہی دلچسپ تشریح کی ہے۔

ابتدا میں ایران عراق سرحدی تنازعات، حکومت کے تیار کردہ جانی و مالی نقصانات، دونوں

طرف کے جنگی قیدیوں کے اعداد و شمار پیش کرنے کے بعد یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ "دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی نوعیت کی یہ انوکھی اور منفرد جنگ ہے۔" اس کے بعد ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۷ء تک دونوں ملکوں کے درمیان ہونے والے مختلف معاہدوں نیز سیاسی انقلابات کے تحت ان قرار دادوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا مختصر خاکہ پیش کرتے ہوئے ۱۹۷۵ء میں شاہ اور صدام (جو اس وقت صدر جمہوریہ عراق کا خصوصی معاون تھا) کے دستخط سے طے پانے والے الجزائر معاہدہ کو پیش کیا ہے جس کی رو سے خط "تال وگ" شط العرب کا وسط، دونوں ملکوں کی سرحد قرار پاتا ہے۔ ان تفاصیل کو پیش کرنے کے بعد صدام کو یکطرفہ طور پر معاہدہ توڑ کر جنگ کی ابتداء کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کے بعد جنگ کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مراحل جنگ:

مقالہ نگار کے خیال میں یہ جنگ اب تک پانچ مراحل طے کر چکی ہے جو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے محض اشاروں پر اکتفا کریں گے۔

پہلا مرحلہ — عراق کا حملہ:-

۲۲ ستمبر کو عراقی جنگی طیاروں نے ایران کے دس ہوائی اڈوں پر بمباری کی اور دوسرے ہی دن ۲ لاکھ افراد پر مشتمل عراقی فوج کا ایک تہائی حصہ ایرانی سرحدوں کو عبور کر کے خوزستان میں داخل ہو گیا اس کے بعد خرم شہر پر عراقی فوج کا قبضہ دزفول، اہواز اور خصوصاً آبادان کا محاصرہ نیز دیگر سیاسی و نظامی حالات اور بڑی طاقتوں کی چیرہ دستیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرا مرحلہ — راہیں مسدود ہو گئیں:-

ایران کی تقریباً ۱۴ ہزار کلومیٹر مربع زمین خوزستان کے علاقہ میں عراق کے تسلط و اختیار میں آگئی لیکن پھر اس کے بعد عراق آگے قدم نہ بڑھا سکا۔ ایران اگرچہ اس درمیان اپنی فوج کو منظم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا پھر بھی اس کے لئے اہواز، دزفول اور آبادان کا محاصرہ توڑنا ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۴ اپریل ۸۱ء کو ایران کی ہوائی فوج عراقی سرزمین میں گھس کر حملے کرنے میں کامیاب ہو گئی اور عراق کے ۴۶ جنگی جہاز "الولید" کے فوجی اڈہ پر تباہ کر دئے گئے — اس کے بعد ایران کے سیاسی مسائل، بنی صدر کی معزولی، تیل کی برآمد نیز جنگ بندی کے سلسلہ میں مختلف وفود کی آمد و رفت وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرا مرحلہ۔ ایرانی حملوں کی شروعات :۔

۲۲۔ مارچ ۱۹۸۲ء کو پاسداران انقلاب اسلامی نیز نیم فوجی رضاکار دستوں پر مشتمل ۲ لاکھ ایرانی جانبازوں نے خرم شہر کے شمال میں واقع دزفول اور شوش کے علاقوں میں عراقی افواج کے خلاف زبردست پیش قدمی کی۔ ایک ہزار سرفروشوں کا دستہ اس طور پر کہ ہر ایک ۲ سے لے کر ۵ سو گز تک کے فاصلوں پر مار کرنے والے راکٹ نما میزائیل اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے تھا دشمنوں کے لشکر کو پسپا کرتا ہوا آگے بڑھا اور عراق کی ایک میکنزم اور دو بکتر بند ڈویژنوں کا صفایا کر دیا۔ تقریباً ۱۴۔۱۵ ہزار عراقی اسیر کئے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب ایران نے غیر ملکی خبر نگاروں کو محاذ جنگ کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دی۔ یہاں تک کہ امریکی خبر رساں ایجنسیوں نے عراقی فوج کو "ایک شکست خوردہ فوج" سے تعبیر کیا"۔[۲۰]

اس مرحلے میں عراق کی پسپائی صرف محاذ جنگ تک محدود نہیں رہی بلکہ شام نے اس بنیاد پر کہ عراق "باغیوں" کی حمایت کر رہا ہے اپنی سرحدوں کو عراق کے لئے بند کر دیا اور بانیاس کے ٹرمنل سے عراقی تیل کی سپلائی پر پابندی عائد کر دی۔ ۱۱، اپریل ۸۲ء کو صدام نے اپنے اقتصادی کھوکھلے پن کا ساری دنیا کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے اپنے عرب اتحادیوں کے سامنے کھلے طور پر دست سوال دراز کر دیا۔ چنانچہ ۱۵ سے لیکر ۱۷ ہزار تک مصری جوان عراقی فوج میں شرکت کے لئے روانہ کئے گئے۔ اس کے علاوہ مصر نے ڈیڑھ ملین ڈالر کی قیمت کے جنگی ساز و سامان سے عراق کی مدد کرنا منظور کیا۔ اردن کے شاہ حسین نے ۲۰ ہزار افراد پر مشتمل (۲ ڈویژن، فوج عراق و ایران کی بارڈر پر عراق کی حمایت میں) روانہ کرنے کا اعلان کیا۔

عراقی وزیر اعظم کے خصوصی معاون طہ یسین رمضان نے ۱۹۸۳ء کے اوائل میں اعلان کیا کہ:

"مملکت عراق کی عوامی فوج میں تمام عرب ممالک کی جانب سے ۱۴ ہزار رضاکار فوجی موجود ہیں"۔[۲۱]

۱۲، اپریل کو صدام نے اعلان کیا کہ اگر عراق کو یقین دلا دیا جائے کہ ایرانی سرحدوں سے عراقی فوج کو واپس بلا لینے سے جنگ بند کر دی جائے گی تو عراق اس کے لئے تیار ہے۔ لیکن ایران نے ۳۰۔ اپریل کو ہی تازہ جوابی حملہ کے ذریعہ جنیہ اور خرم شہر میں پھیلے ہوئے ۲۲ میل لمبے سرحدی علاقوں پر قبضہ حاصل کر کے اس درخواست کو مسترد کر دیا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر ۲۵ ہزار افراد

مشتمل عراقی فوج کے خلاف ستر ہزار ایرانی جانبازوں کو میدان میں اتار کر ۲۴ مئی کو خرم شہر آزاد کرالیا۔ ۱۲ ہزار عراقیوں نے اسلحہ ڈال کر اپنے آپ کو ایرانی فوج کے سپرد کر دیا اور بقیہ نے راہ فرار اختیار کی۔ اس کے ساتھ ہی ایران نے اعلان کیا کہ "صدام کی برطرفی کے بعد ہی کسی قسم کی گفتگو کا امکان ہے"۔ خبروں کے مطابق شام اور سعودی عرب کے درمیان صدام کی ممکنہ جانشینی کے مسئلہ پر تبادلۂ خیال بھی ہوا جس میں دمشق نے جمہوریۂ عراق کے سابق صدر حسن البکر اور سعودی عرب کی طرف سے ریاض میں تعیم عراقی سفیر شفیق دراجی کا نام پیش کیا گیا۔[۲۲]

چوتھا مرحلہ: عراقی سرزمین پر چڑھائی:

۱۲ جولائی کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی طرف سے جنگ بندی کی درخواست کی گئی جس کو ایران نے رد کر دیا اور دوسرے ہی دن اپنی پانچ ڈویژن فوج کے ساتھ بصرہ پر جو اہمیت کے لحاظ سے عراق کا دوسرا بڑا شہر ہے، قبضہ کرنے کے لئے پیش قدمی کی اور ایرانی لشکر تقریباً دس میل عراقی سرزمین میں داخل ہو کر بصرہ سے صرف سات میل کے فاصلہ تک پہونچ گیا۔ عراق نے اپنے دفاع کے لئے جگہ جگہ مسلح دفاعی چوکیاں اور توپ خانے نصب کر رکھے تھے ان کے علاوہ میدان میں بارودی سرنگوں کا ایک جال سا بچھا رکھا تھا نیز خاردار تاروں سے پورا علاقہ گھیر دیا گیا تھا جس میں عراق کی چار ڈویژن فوج دفاع کے لئے موجود تھی تقریباً ایک ہفتہ کی اس شدید جنگ میں ۲½ لاکھ افراد نے حصہ لیا تھا۔

اس کے بعد مقابلہ آرائی کے نتیجہ میں ہونے والے نقصانات، اس کے سیاسی نتائج نیز مرکش میں کی جانے والی عرب اتحادیوں کی کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ: ایران نے اکتوبر کے آخری دنوں اور نومبر کے ابتدائی دنوں میں چار نئے حملے کئے جن میں سے تین حملے محاذ جنگ کے مرکزی علاقوں میں کئے گئے اور ایران کو ان میں مختصر مختصر علاقوں پر قبضہ بھی حاصل ہوا لیکن وہ عراقی سرزمین میں گھس کر تسلط حاصل نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ عراق نے پہلی بار اپنی فوج کی مدد کے لئے بڑے وسیع پیمانے پر جنگی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کا استعمال کیا اور کسی حد تک فتوحات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ اگرچہ عراق ۱۱۷ جنگی جہاز اور ۲ ہزار تین سو سے بھی زائد ٹینک اور فوجی بکتر بند گاڑیاں اپنے ہاتھوں سے کھو چکا تھا پھر بھی بڑی بھاری

تعداد میں اپنے نقصانات کا تدارک کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جدید ترین اسلحوں کی فراہمی میں فرانس عراق کا سب سے بڑا اسپلائر تھا مصر نے دوسرے جنگی ساز و سامان کا کوٹا پورا کر دیا جس میں چینی ساخت کے جنگی جہاز۔ میگ ۱۹ اور ۲۱ بھی شامل تھے اس طرح عراق اپنی ہوائی طاقت جنگ شروع ہونے سے قبل کی سطح یعنی ۳۳۲ جنگی جہازوں کی تعداد تک پہونچانے میں کامیاب ہوگیا۔ ان حالات کے پیش نظر روس نے بھی بغداد سے جنگی ہتھیاروں سے متعلق رابطہ دوبارہ برقرار کرلیا۔

ایران بھی شام، لیبیا اور چند دیگر غیر عرب ملکوں مثلاً شمالی کوریا سے جنگی اسلحہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا پھر بھی ایران کے جنگی جہاز، جو پرواز کی صلاحیت رکھتے تھے، ان کی تعداد ۴۵ سے گھٹ کر صرف اسی تک محدود ہوکر رہ گئی تھی۔" اس کے بعد مقالہ نگار نے ایرانی ہوائی فوج کی تقویت کے اسباب، اقتصادی مسائل اور تیل برآمد کرنے کے طریقۂ کار کا جائزہ لینے کے بعد کہا ہے کہ: "ایران نے ۳۱ جولائی کو پیران شہر کے علاقہ میں حملہ کیا۔ اطلاعات کے مطابق مخالفوں، کردوں اور عراقی شیعوں نے بھی ایرانی فوج کے شانہ بشانہ ہوکر عراقیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ اس جنگ میں ایران نے ۹ میل عراقی سرزمین کی طرف پیش قدمی کی۔ حاج عمران کی فوجی چھاؤنی پر ایران کا تسلط ہوجانے کی وجہ سے عراق کردوں کی شورش کا تدارک کرنے سے معذور ہوگیا۔" اس کے بعد فرانس کی مسلسل حمایت اور مختصر طور پر سیاسی و اقتصادی حالات کا تجزیہ پیش کرنے کے بعد مقالہ نگار نے لکھا ہے: "واشنگٹن اور پیرس دونوں ہی عراقی فوج کے سقوط کے مخالف تھے اور جنگ میں ایران کی دانشمندانہ روش کے خلاف اتفاق نظر رکھتے تھے۔ امریکہ ایران کی کامیابی سے رونما ہونے والے نتائج نیز جزیرہ نمائے عرب میں سیاسی اقتدار کی اتھل پتھل سے خوف زدہ تھا جبکہ فرانس براہ راست صدام کی بقا میں ہی اپنا فائدہ مضمر پاتا تھا۔"

۱۹ راکتوبر کو ایران نے شمالی محاذ پر ایک نیا حملہ کیا اور عراقی فوج کو بانہ اور مریوان کے علاقوں سے پیچھے ڈھکیل کر ۲۵ میل عراقی سرزمین کے اندر تسلط حاصل کرلیا۔ اسی حملہ کے دوران پہلی بار عراق کی جانب سے کیمیاوی اسلحوں کے استعمال کی خبریں منتشر ہوئیں۔[۱۲]

اس مرحلہ کا اختتام کرتے ہوئے محاذ جنگ کے مختلف حصوں میں ہونے والے چند دیگر حملوں کے ذیل میں طرفین کی فتح و شکست، اقتصادی اعتبار سے عراق کی نسبتاً بہتر صورت حال، قرضوں کی

ادائیگی کی مدت میں توسیع اور اسلحوں کی فراہمی کے بہتر امکانات پر روشنی ڈالی گئی ہے اس کے بعد ایران کی خستہ کن وطویل جنگ کی حکمت عملی کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں عراقی طاقت وصلاحیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "عراق اپنی ہوائی طاقت کی برتری کے باوجود اپنی زمینوں کو ایرانی جانبازوں کے قبضہ سے نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا نہ ہی وہ ایران کو کوئی ناقابل تحمل نقصان پہونچا سکا چنانچہ اسی غرض سے عراق نے ایران کی تیل تنصیبات کو مورد حملہ قرار دیا ہے۔

پانچواں مرحلہ — تیل بردار جہازوں کی جنگ :-

" جنگ کی ابتداء سے ہی طرفین ایک دوسرے کے اقتصادی مراکز خصوصاً تیل کی پیداوار اور برآمدگی کرنے والی تنصیبات کی تباہی و بربادی کی کوشش کرتے رہے ہیں ۔ چنانچہ ایران کی آبادان میں واقع عظیم تیل ریفائنری نیز دیگر تیل کے کنویں اور پائپ لائنیں اور دوسری طرف عراقی فولاد کے کارخانہ نیز بصرہ کے اطراف میں واقع کیمیکل فریلائزر اور پٹروکمسٹری کمپنیاں مسلسل طور پر حملوں کا نشانہ بنائی گئیں " اس کے بعد ایک دوسرے کے خلاف طرفین کی جنگی کاروائیاں، تیل بردار کشتیوں کو پہونچائے گئے نقصانات ، جزیرہ خارک پر عراقی حملہ اور اس کے ذریعہ تیل کی برآمدات پر مرتب ہونے والے دوجانبہ اثرات ، تیل بردار جہازوں کے بیمہ کی قیمتوں میں تغیر ، بانیاس میں واقع موصل کی پائپ لائنوں کے کھولنے کے سلسلے میں دمشق پر دباؤ ، عراق کے ذریعہ بحری جہازوں کی خرید ، امریکی آواکس اور فرانسیسی اگزوسٹ مینرائیلوں کی اہمیت ، ایران میں تیل کی سپلائی کے امکانات اور اس کی جنگی حکمت عملی نیز اسی طرح کے دیگر اہم مسائل کی وضاحت کرنے کے بعد مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ :

جنگ اور اس کا مستقبل :-

" زمینی لڑائی میں آیندہ نئی جنگی سرگرمیوں کا مرکز جنوب میں پھیلا ہوا محاذ ہوگا ایران کا امتیاز زمینی جنگ میں مضمر ہے ایران نے بصرہ پر حملہ کرنے یا اس کا عراق کے دوسرے علاقوں سے رابطہ منقطع کرنے کی غرض سے جنوبی محاذ پر پانچ لاکھ افراد کو لگا رکھا ہے اپنے اس منصوبہ میں اگر ایران کامیاب ہو جاتا ہے تو عراقی فوج کے سقوط اور صدام کی سرنگونی کے امکانات روشن ہیں ۔ البتہ اس جنگ میں ایرانی فوج کو شکست دیکر اس کی زمینوں پر قبضہ حاصل کرنے یا وہاں

کی حکومت کا خاتمہ کرنے کا کوئی امکان نہیں پایا جاتا ۔ جنگ کی آخری صورت حال کے تحت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عراق اور اس کے اتحادیوں سے ایران اپنی طاقت کے بلبوتے پر عائد کردہ صلح کے شرائط منظور کرانے میں کامیاب ہو جائے گا ۔ ہو سکتا ہے کہ ایران میں رہبری سے متعلق اختلاف نظر کی جو خبریں گشت کر رہی ہیں، اسمیں صداقت پائی جاتی ہو پھر بھی تمام شواہد اس بات کی نشان دہی کر رہے ہیں کہ مستقبل قریب میں کم از کم ایک زبردست زمینی حملہ ایران کی طرف سے ضرور ہونا چاہئے۔ اس کے بعد ایران کی شکست ہو جانے کی صورت میں حالات کیا رخ اختیار کر سکتے ہیں اس مسئلہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور عراق کے حالات کی تشریح کی گئی ہے ۔ آخر میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ :

"وہ چیز جو تمام چیزوں سے زیادہ بعید نظر آتی ہے یہ ہے کہ اس مرحلہ میں پہونچنے کے بعد یہ جنگ کسی مذاکرہ یا رسمی معاہدہ پر اختتام پذیر ہو جائے ۔ یا اگر کوئی معاہدہ ہو بھی جائے تو وہ زیادہ مدت تک باقی بھی رہے ۔ اس جنگ میں دونوں طرف سے خون، دولت اور سیاسی سرمائے کی وہ قربانیاں پیش کی جا چکی ہیں جو اس قسم کے کسی بھی صلح آمیز حل کو تقریبًا ناقابل تصور قرار دیتے ہیں، اس کے برخلاف اس طرح کے کسی بھی معاہدے سے ایک دوسرے کے خلاف دشمنی اور اتہام طرازی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جانے کا احتمال پایا جاتا ہے ۔"

یہ تھا امریکہ سے شائع ہونے والے ایک نشریہ کے افکار و نظریات کا خلاصہ جو ایران عراق جنگ کی چوتھی سالگرہ کے اختتام اور پانچویں سال میں ورود کے موقع پر قلم بند کیا گیا تھا ۔ اب جبکہ ہم جنگ کے چھٹے سال میں داخل ہو چکے ہیں اور اس درمیان بہت سے دوسرے حوادث و واقعات رونما ہو چکے ہیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں مندرجہ ذیل عنوان کے تحت ایک اور مرحلہ کا اضافہ کر دیا جائے ۔

شہروں کی جنگ یا اعصابی جنگ :۔

اس جنگ میں یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ تمام بین الاقوامی قوانین کو پامال کرتے ہوئے عراق نے ایران کے شہروں، سکونتی علاقوں اور غیر فوجی ٹھکانوں کو میزائیلوں اور ہوائی حملوں کا نشانہ بنایا شہری عوام کو اپنی انسانیت سوز حرکت سے بے انتہا فشار میں مبتلا کر دیا گیا تا کہ جمہوریہ اسلامی کو

اپنی پالیسیوں میں نرمی اختیار کرنی پڑے جس کے جواب میں ایران نے قلب بغداد پر وہ ضرب کاری لگائی جو کسی کے تصور میں بھی نہ تھی، جمہوریہ اسلامی ایران اس صلاحیت و طاقت کا مالک ہے اور اس طرح دشمن اپنی اس سازش میں بھی ناکام ہوگیا۔ اور مستقبل میں ممکنہ ایرانی حملوں کے خوف سے اضطراب و وحشت کی زندگی گزارنی پڑی۔ دشمن نے اپنے متفرق ہوائی حملوں اور آخر میں جزیرہ خارک کے ٹرمنلس پر حملہ کرکے یہ چاہا تھا کہ ایران کو اقتصادی کشمکش میں مبتلا کر دیا جائے لیکن جمہوریہ اسلامی ایران کے دور رس قائدین نے مناسب اقدامات کرکے اس کا جواب دیا نیز اس کا سد باب کرنے کے لئے منصوبے تیار ہو چکے ہیں۔

اگرچہ مقالہ کچھ طولانی ہوگیا ہے پھر بھی ناظرین محترم سے ہماری خواہش ہے کہ ایک بار پھر ان تمام بیان شدہ حقائق کی روشنی میں خود فیصلہ کریں کہ آیا ان حالات میں جنگ کی ابتداء اور پھر اس کے بعد رونما ہونے والے نتائج اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ کلمہ صلح زبان پر بھی لایا جائے؟ یا ہمارا فریضۂ شرعی، عقلی و سیاسی یہ ہے کہ ہم جنگ کو جاری رکھیں تاکہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے اور دشمن کو حکم الٰہی کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیا جائے؟؟

حواشی :

۱۔ کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم وعسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم (سورہ بقرہ ۲/۲۱۶) ۔ ۲۔ پہلی جنگ عظیم میں چھ کروڑ سپاہیوں نے شرکت کی۔ دس ملیون افراد قتل ہوئے ۲۹ ملیون افراد معلول اور پانچ ملیون افراد مفقود ہوئے۔ تقریباً ۱۲ ملین عورتیں بچوں کے اسقاط کے سبب درد و تکلیف میں مبتلا ہوا ہوئیں۔ اس تباہ کن جنگ کے اخراجات ایک اندازہ کے مطابق ۴ سو ارب ڈالر بتایا جاتا ہے ـــ دوسری جنگ عظیم میں ۶ سال کے دوران تقریباً ۷ ملیون سپاہیوں نے میدان جنگ کی صعوبتیں برداشت کیں ۳۶ ملیون افراد قتل ہوئے، ۲۹ ملیون معلول اور ہزاروں افراد مفقود ہوئے۔ اس جنگ میں تقریباً تین سو نوے ہزار ارب گولے داغے گئے، ۷ ملیون لیٹر خون زمین پر بہایا گیا اور اس جنگ کا خرچ ایک اندازہ کے مطابق تقریباً ایک ہزار ایک سو باون ارب ڈالر بتایا جاتا ہے۔

۳ ـ شرق و غرب کے اختیار میں جو ایٹمی اسلحے اس وقت موجود ہیں ان سے پورے کرۂ ارض کو سات مرتبہ ناقابل زندگی بنایا جا سکتا ہے اور حیات کو مکمل طور پر خطرے سے دوچار کیا جا سکتا ہے۔ ۴ ـ اس ادارہ کی بے چارگی اور ان تمام بڑی طاقتوں کے سامنے جو ویٹو پاور رکھتی ہیں اس کی بے بسی کا ثبوت ہمارے مقالہ کے دائرہ سے باہر کی چیز ہے۔

۵ ـ شمالی کوریا میں ہونے والی صلح کی قرار داد کے دوران نشست کی ترتیب اور اوراق کی ردوبدل وغیرہ کا دوسرے مقامات سے موازنہ کرنے کے بعد یہ دونوں صورتیں سامنے آتی ہیں۔ ۶ ـ جیساکہ مصر و اسرائیل، جنوبی کوریا و شمالی کوریا، جاپان و امریکہ وغیرہ کی صلحوں میں دیکھا گیا۔ ۷ ـ یا ایہا النبی حرض المومنین علی القتال ..... باذن اللہ واللہ مع الصابرین۔ (سورہ الانفال ۸/۶۵–۶۶) ـ ۸ ـ ایسے موقع پر جہاں جنگ سے فرار کرنے والا یا خود سپردگی کرنے والا حملہ آوروں یا باغیوں سے ساز باز کرے اور اسلام کے خلاف کام کرے وہاں حکم مختلف ہے۔

۹ ـ اس سلسلے میں مسلمانوں کے درمیان اپنی تمام مختلف شرائط کے ساتھ اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ ۱۰ ـ وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینہما فان بغت احدیہما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفیٔ الی امر اللہ فان فاءت فاصلحوا بینہما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین (حجرات ۴۹/۹) ـ ۱۱ ـ ولولا دفع اللہ الناس بعضہم ببعض لفسدت الارض ولکن اللہ ذو فضل علی العالمین (سورہ بقرہ ۲۵۱/) ـ ۱۲ ـ دفاع کے تمام انواع و اقسام سمجھنے کے لیے امام خمینی مدظلہ العالی کی "تحریر الوسیلہ" ملاحظہ فرمائیں۔ ۱۳ ـ عراقی ریڈیو "صوت الجماہیر" کا عربی نشریہ وقت ۸½ بجے شب تاریخ ۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء ـ ۱۴ ـ عراقی فری کوینسی پر براہ راست نشر شدہ صدام کی ٹی وی تقریر وقت ۸½ بجے شب تاریخ ۱۷ ستمبر ۱۹۸۰ء ـ ۱۵ ـ حکومت عراق کی طرف سے بین الاقوامی قانون شکنی سے متعلق کتابچہ ص ۵ ـ ۱۶ ـ نشریۂ عربی "صوت الجماہیر" عراق وقت ۳½ بجے سہ پہر تاریخ ۱۲ نومبر ۱۹۸۰ء

۱۷ ـ یہ مقالہ بہت پہلے مرتب کیا گیا تھا لہٰذا یہاں اس کے بعد انجام پانے والی کارروائیوں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد چھوٹی بڑی کئی کارروائیاں انجام پائیں جن میں لشکر اسلام کو بڑی نتیجہ خیز کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ خصوصاً انقلاب اسلامی ایران کی آٹھویں سالگرہ کے موقع پر ۲۱ بہمن ۱۳۶۴ ش (۱۰ فروری ۱۹۸۶ء) کو شروع ہونے والی "والفجر ہشتم" کارروائی (فتح فاؤ) اور والفجر نہم کارروائی نے صدام کی کافر بعثی حکومت کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ ۱۸ ـ ابتدائے جنگ سے خلیج فارس میں غیر جانبدار کشتیوں پر حملہ شروع ہونے کے بعد ۲ سو کشتیاں (جن میں سے نوے کشتیاں اب تک شط العرب میں پھنسی ہوئی ہیں) نقصان اٹھا چکی ہیں۔ ۶ سو ملین ڈالر فقط ان کشتیوں کی قیمت و معاوضہ کے طور پر دیا گیا ہے جبکہ کشتیوں پر بار اموال اس کے علاوہ ہیں۔ سب سے بڑا نقصان ۱۳۸ غیر جانبدار دیانوردوں کا ہے ان پر اصل حملہ آور عراق کے جنگی جہاز تھے جنھوں نے ایکیم اور ۳۹ اگزوسٹ میزائیلوں سے نشانہ بنایا۔ ۱۹ ـ نیویارک ٹائمز ۱۵ اپریل ۱۹۸۱ء ۲۰ ـ فائننشل ٹائمز ۱۳ اپریل ۱۹۸۲ء ۲۱ ـ ایم۔ ایف۔ ایف۔ ڈی ۱۸ فروری ۱۹۸۳ء ۲۲ ـ اس کا انکشاف لندن سے شائع ہونے والے اخبار گارڈین کے ۱۳ مئی ۸۲ء کو شائع شدہ ڈیوڈ ہرسٹ کے ایک مضمون سے ہوتا ہے۔ مگر دوسروں کا اس سلسلہ میں خیال ہے کہ یہ بات سعودی حکام سے بہت بعید ہے کہ وہ خود کو اس قسم کے مسائل میں الجھائیں گے ۲۳ ـ جیساکہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے مقالہ نگار اس سلسلہ میں سخت اشتباہات کا شکار ہوا ہے۔ ۲۴ ـ گارڈین (لندن) ۲۵ نومبر ۸۳ء۔

جناب علی ارشاد مبارکپوری۔ ہندوستان

اسلامی حکومت میں حاکم اعلیٰ کی حیثیت

اور تینوں قوائے حکومت (مقننہ، مجریہ اور عدلیہ) سے اس کا رابطہ

اسلامی حکومت :

دنیا میں اس وقت کم و بیش پچاس ایسی حکومتیں ہیں جو اسلامی حکومتیں کہلاتی ہیں لیکن کیا یہ سب حکومتیں واقعاً اسلامی حکومتیں ہیں؟ یا صرف اس بنا پر کہ ان کے حکمراں واقعاً یا برائے نام مسلمان ہیں، ان حکومتوں پر اسلامی حکومت کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے؟ اگر اس مسئلہ پر حقائق کی روشنی میں انصاف سے غور کیا جائے تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ درحقیقت حکمراں کا مسلمان ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ حکومت بھی اسلامی ہے۔

تمام ملل و ادیان عالم اس امر پر متفق ہیں اور سوائے دہریوں اور مادہ پرستوں کے کسی کو بھی اس بات سے انکار نہیں ہے کہ تمام موجودات عالم کا خالق و مالک و رب خداوند عالم ہے، اسی نے اپنی قدرت کاملہ سے ان سب کو خلعت وجود بخشا اور ان سب کا نظام اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا اور ظاہر ہے کہ جب وہ عالمین کا خالق و مالک ہے تو ان کی مالکیت اور ان پر حاکمیت کا حق بھی اسی کو حاصل ہوگا چنانچہ قرآن مجید بھی اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔ الا لہ الخلق والامر (اعراف/۵۴) "آگاہ ہو جاؤ کہ پیدا کرنا اسی کا کام ہے اور امر و حکمرانی بھی اسی کے لیے ہے، یہی نہیں بلکہ فرماں روائی کا حق صرف اسی کو حاصل ہے اور حکومت فقط اسی کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان الحکم الا للہ" (انعام/۵۷) حکومت سوائے خدا کے کسی کی نہیں ہے۔" ایک دوسری جگہ

ہوا ہے، "ان الحکم الا للہ وامر ان لا تعبدوا الا ایاہ" (یوسف/۴۰)
حکومت سوائے خدا کے کسی کی نہیں ہے اور اس نے یہ حکم دیا ہے کہ تم بس اسی کی عبادت کرو۔" ایک اور جگہ
فرمایا ہے: "لم یکن لہ شریک فی الملک" (فرقان/۲)
حکومت میں اس کا کوئی شریک (بھی) نہیں ہے۔" ان کے علاوہ بھی قرآن مجید میں بہت سی آیتیں ہیں جو
ہمارے دعوے کی مؤید ہیں اور اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حکومت کا حق صرف اسی ذات لم یزل ولا یزال کو
حاصل ہے اور اس کے سوا کسی کو نہیں بلکہ حکومت میں اس کا کوئی شریک تک نہیں ہے۔ اور جب حکومت اس کی
ہے تو قانون بھی اسی کا نافذ و جاری ہونا چاہئے چنانچہ اس نے اس کا بھی انتظام فرمایا ہے۔

دین اسلام ایک ایسا دین ہے جو اللہ کا پسندیدہ دین ہے:۔
"ان الدین عند اللہ الاسلام" جو اسی کا بنایا ہوا ہے اور جسکو اس نے اپنے منتخب
بندوں (انبیاء و مرسلینؑ) کے ذریعہ بھیجا ہے، یہ دین محض نظریاتی نہیں ہے کہ چند امور کو صرف مان لیا جائے
تو دین اسلام میں داخلہ کی سند مل جائے گی اور ماننے والا مسلمان کہے جانے کا مستحق ہو جائے گا، بلکہ یہ دین مکمل
ضابطۂ عمل بھی ہے چنانچہ مرسل اعظمؐ نے اسلام کی تعبیر ان الفاظ میں فرمائی ہے:۔

"الاسلام۔ ان تشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمداً عبدہ ورسولہ
وتقیم الصلوٰۃ وتؤتی الزکوٰۃ وتصوم شھر رمضان
وتحج البیت" (جامع الاخبار)

"اسلام یہ ہے کہ تم وحدانیت الٰہی کی گواہی دو اور رسالت محمدؐ کی گواہی دو اور نمازیں
قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، ماہ رمضان میں روزے رکھو اور خانہ خدا (کعبہ) کا حج بجا لاؤ۔"

غرض یہ کہ یہ دین اپنے ماننے والوں کے لیے ایک مکمل لائحہ عمل اور جامع ضابطۂ حیات رکھتا ہے، آغوش
مادر سے لے کر کنار لحد تک زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق حکم اور قانون موجود نہ ہو اور یہ
قانون کسی فرد بشر یا کسی جماعت کے بنائے ہوئے نہیں ہیں جن میں متنفذ و صاحبان ثروت افراد کے مفاد کا ہر طرح لحاظ
رکھا جاتا ہے بلکہ دین اسلام کے یہ آئین و قوانین اور یہ انسانی دستور حیات خود نباض فطرت انسانی اور مزاج شناس
بشر یعنی خلاق ارض و سماء نے پورے جامعۂ بشریت کی فلاح و بہبود دنیوی و اخروی کو پیش نظر رکھ کر مرتب فرمائے ہیں،
ابد تک ہر زمانے کے لوگوں کی ضروریات اور وسعت نفس کا لحاظ رکھتے ہوئے بنائے ہیں، اور انھیں اپنے منتخب بندوں

انبیاء و مرسلین کے ذریعہ پھیلایا اور نافذ کرایا، اسی الٰہی قانون کی آخری اور جامع و مکمل کتاب "قرآن مجید" ہے جس میں قیامت تک پیش آنے والے تمام مسائل و مشکلات کا حل موجود ہے جسے اس نے اپنے آخری پیغمبر مرسل اعظم حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا اور آنحضرت نے ان قوانین کو نافذ و جاری فرمایا اور نئے سرے سے الٰہی و اسلامی حکومت کی مستحکم بنیاد رکھی۔

سطور بالا کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلامی حکومت درحقیقت وہ حکومت ہے جس میں الٰہی قوانین اس کے منتخب بندوں کے ذریعہ نافذ ہوں، بالفاظ دیگر "اللہ کی حکومت بندوں پر بندوں کے ذریعہ" کا نام ہے اسلامی حکومت، جس کی بنیاد حریت و مساوات پر ہے یعنی جابر و ظالم افراد اور طاقتوں کے جبر و تشدد اور ان کی غلامی سے بندگان خدا کی مکمل آزادی، یہاں کسی بندہ کو بندوں پر حکومت و سلطنت کا حق قطعاً حاصل نہیں ہے اور اللہ کے سب بندے برابر ہیں کسی کو کسی پر کسی قسم کی فوقیت حاصل نہیں ہے یہاں شہنشاہیت، قیصریت، سلطنت، ظل اللہ اور رجلالۃ الملک کی کوئی گنجائش نہیں ہے، حکومت و سلطنت صرف اللہ کی ہے، اپنے تمام بندوں پر، اور سب پر الٰہی قانون یکساں طور پر نافذ ہوگا اور اس کی پابندی سب پر لازم ہے اس سے کوئی فرد بشر حتّٰی کہ خود حاکم وقت بھی مستثنٰی نہیں ہے۔ البتہ اس اعتبار سے کہ وہ الٰہی نمائندہ ہے، اس کی اطاعت تمام بندگان خدا پر واجب ہے کیوں کہ اگر اس کی اطاعت ہی نہ کی جائے گی تو قوانین و احکام کا نفاذ و اجرا اور نظم و نسق کا قیام ناممکن ہو جائے گا، اسی لئے قرآن مجید نے بھی اس طرف خاص طور سے بندوں کو متوجہ کیا ہے:۔

"اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" (نساء/۴۲)

"اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے پیغمبر کی اور ان صاحبان امر کی بھی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہوں گے۔"

پیغمبر اسلام مرسل اعظمؐ کی تبلیغ رسالت کی ۲۳ سالہ سیرت طیبہ کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرسل اعظمؐ نے بیان وحی اور اصول و عقائد و احکام اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ہی ساتھ احکام و قوانین اسلام کے نافذ و جاری کرنے اور اسلامی نظام اجتماع کے قائم و برقرار کرنے کی طرف بھی خصوصی توجہ مبذول فرمائی، آنحضرتؐ نے نئے سرے سے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی، قوانین و احکام اسلامی نافذ فرمائے، لوگوں کے نزاعی معاملات میں خود فیصلے فرمائے اور مدینہ میں نیز دوسرے مقامات پر قاضی مقرر فرمائے، قبائلی عرب کے رؤسا اور اطراف کے بادشاہوں کے پاس تبلیغی خطوط روانہ کئے، سفراء مقرر کئے،

صلح نامے لکھے، معاہدے فرمائے جہاد کے احکام نافذ کئے اور غزوات میں خود تشریف لے جاکر اسلامی فوج کی رہنمائی فرمائی، زکوٰۃ، صدقات و خمس و خراج کے ذریعہ مالیات کا شعبہ قائم اور مستحکم کیا، تجارت کے قوانین نافذ کئے۔

تجارت کے شعبہ پر بھی نگراں معین فرمائے۔ غرض حکومت کے تمام ضروری قواعد و ضوابط مقرر و مرتب فرمائے اور مسلمانوں کو اس کے مطابق عمل کا پابند بنا دیا۔

آیۂ مبارکہ اطیعوا اللّٰہ الخ کے مطابق مرسل اعظمؐ کے بعد آپ کے خلفاء اس حکومت اسلامی کے سربراہ ہوئے اور انہوں نے بھی اسلامی حکومت کو برقرار رکھا۔ حضرت علیؑ کے پنج سالہ دور خلافت میں بھی (اگرچہ آپ کا بہت سا قیمتی وقت اندرونی شورشوں اور بغاوتوں کو دبانے اور انہیں ختم کرنے میں صرف ہوا پھر بھی) مرسل اعظمؐ کے مقدس دور کی طرح اسلامی حکومت قائم تھی، احکام اسلامی کے اجراء کا سلسلہ قائم تھا، امراء (گورنروں) اور قضاۃ کا تعین، اجراء حدود و تعزیرات اسلامی کا عمل برقرار تھا۔

جناب امیرؑ کے بعد حکومت کی باگ ڈور ایسے نا اہل ہاتھوں میں پہنچ گئی جس کے انجام کے طور پر واقعہ کربلا نمودار ہوا۔ ان لوگوں نے اسلام کے عادلانہ نظام کو مسخ کر دیا، احکام و قوانین اسلامی کو آہستہ آہستہ پس پشت ڈالنا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں ہر طرف لاقانونیت، مطلق العنانی، ظلم و جور، مکر و فریب کا بازار گرم ہو گیا۔ عام طور سے مسلمانوں کے مزاج میں یہ بری خصلتیں اس قدر رچ بس گئی تھیں کہ یزید جیسا شرابخوار و بدکار شخص بنام خلافت حکومت پر قابض ہو گیا، اس ملعون نے تخت حکومت پر اپنے منحوس قدم رکھتے ہی احکام الٰہی کا علانیہ مضحکہ اڑانا شروع کر دیا، رسالت و وحی و الہام کی بالاعلان تکذیب کرنے لگا حتی کہ اس نے نخل اسلام ہی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی ٹھان لی لیکن ابھی دین اسلام کا حقیقی محافظ اور اسلامی حکومت کا حقیقی فرمانروا زندہ موجود تھا جس کے لیے مرسل اعظمؐ نے فرمایا تھا "حسین منی و انا من الحسین" ہاں! حقیقی صاحب الامر حسینؑ سے زیادہ کس کے دل میں اسلام کا درد ہوتا، وہی حسینؑ آگے بڑھے اور آواز دی۔ اسلام! میرے نانا کے دین اسلام! خدا کے پسندیدہ دین اسلام! گھبرانا نہیں، ابھی حسینؑ تیری حفاظت کے لیے موجود ہے اور پھر حسینؑ نے اپنے مقدس خون سے جس میں لعاب دہن رسولؐ کی آمیزش تھی، اور اپنے بہتر انصار و اعزہ کے خون سے جنمیں حسینؑ کا آخری ہدیہ ایک ششماہہ بچہ علی اصغرؑ بھی تھا شجرۂ اسلام کی آبیاری کی، پھر حسینؑ کی نگاہوں نے اپنے بیمار فرزند سید سجادؑ کو پابند طوق و سلاسل اور اہل حرم کی تشہیر اور اسیری کا المناک منظر بھی دیکھا مگر صابر و شاکر رہے۔ کیونکہ ان قربانیوں کا مقصد بہت عظیم تھا اور حسینؑ

اتنی عظیم قربانیاں دیکر اپنے عظیم مقصد میں کامیاب ہوگئے، گلشن اسلام کو خزاں کی دستبرد سے ہمیشہ کے لیے بچالیا، احکام و قوانین اسلامی کو حیات تازہ ملی اور اسلام پھر سے زندہ ہوگیا۔

اولی الامر کا یہ سلسلہ امام حسینؑ کے بعد بارہویں امام علیہ السلامؑ تک جاری رہا اور ظاہری اقتدار نااہلوں کے قبضہ میں ہونے کے باوجود ہر امام بحیثیت اولی الامر اپنے اپنے دور میں جب جب اور جیسے جیسے موقع ملا قوانین و احکام الٰہی کے نفاذ و اجراء میں برابر مصروف اور کوشاں رہا اور دین اسلام پر کبھی آنچ نہیں آنے دی، اسلامی حکومت کی کشتی نا اہل ملاحوں کے ذریعہ کمزور و زنگ آلود ہونے کے باوجود چلتی رہی کیونکہ اس کے حقیقی ناخدا ابھی ظاہر بظاہر موجود تھے اور ہر خطرناک بھنور میں بذات خود اس کی حفاظت و ناخدائی کرتے رہے مگر آفتاب ہدایت کے سحاب غیبت کبریٰ میں نہاں ہوجانے کے بعد باطل کی گھنگور گھٹا چھاگئی، الٰہی احکام سے کنارہ کشی و روگردانی کا سلسلہ بڑی تیزی سے آگے بڑھتا گیا، دشمنان اسلام یہود و نصاریٰ تو اسی تاک میں تھے ہی جس طرح آفتاب غروب ہونے کے بعد چوروں اور اچکوں کی بن آتی ہے اسی طرح ان دشمنان اسلام نے غیبت صغریٰ کے بعد کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی پرانی فریب کارانہ چالوں سے کام لینا شروع کیا اور مسلمانوں کو ایسا سبق پڑھادیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف "اسلامی جام" میں "ولایتی شراب" چھلکنے لگی یعنی اسلامی حکومت کا نام تو باقی رہ گیا لیکن اسلامی یعنی الٰہی قانون کا کہیں نام و نشان باقی نہیں رہ گیا، یہی نہیں بلکہ قرآن مجید کو اپنی مقدس کتاب کہتے نہ تھکنے والے مسلمان حکمرانوں نے نہ صرف یہ کہ قرآنی حدود و تعزیرات کو اپنے "اسلامی حکومت" کے آئین و قوانین میں جگہ دینا پسند نہیں کیا بلکہ دشمنان اسلام کے پر فریب پروپیگنڈوں سے اتنا متاثر ہوئے کہ خود بھی قرآنی و اسلامی حدود و تعزیرات پر معترضانہ زبان کھولنے کی جسارت کرنے لگے، کہیں عربی کے بجائے ترکی زبان میں نماز پڑھنے کا "سرکاری حکم" دیا گیا، تو کہیں قرآن مجید کے بجائے "اوستا" کو آسمانی کتاب کا درجہ دیدیا گیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلامی حکومت اور اس کے قوانین صرف دو ڈھائی سو سال ہی کے لیے تھے جس کا آغاز حضور مرسل اعظمؐ کی ذات اقدس سے ہوا اور اولی الامر کی آخری فرد (معصوم) یعنی بارہویں امام علیہ السلام کی غیبت صغریٰ کے بعد اس کا خاتمہ ہوگیا، اب مسلمانوں کو دین اور احکام دین کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی؟ حالانکہ ہر مسلمان کا بلا تفریق مسلک و فرقہ یہ عقیدہ ہے کہ حضور مرسل اعظمؐ خدا کے آخری پیغمبر ہیں، قرآن مجید خدا کی آخری کتاب ہے اور یہ شریعت محمدیؐ آخری اور مکمل شریعت ہے اور یہ سب قیامت تک کے لیے ہیں اسلام اور احکام اسلام کسی زمان و مکان اور کسی گروہ و جماعت تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ دین اور احکام دین قیامت تک کے لیے

کافۃ للناس" تمام بنی نوع انسان بلاتفریق رنگ و نسل کی ہدایت کے لیے آئے ہیں۔ ؟

جواب بالکل صاف اور واضح ہے کہ جب یہ سارے احکام و دستورات قرآنی و اسلامی قیامت تک کے لیے
ں تو اس کی بقا کا انتظام بھی ہمیشہ ضروری ہے اور اسلامی حکومت کی تشکیل ہمیشہ واجب ہے تاکہ قوانین الٰہی
ے نفاذ و اجراء کا سلسلہ قائم رہے۔ آیہ مبارکہ "اطیعوا اللہ ..... واولی الامر منکم" اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی
تی ہے، ظاہر ہے یہ حکم اطاعت ہمیشہ کے لیے ہے اور اس کے لیے صاحبان امر کا بھی ہمیشہ اور ہر زمانہ میں وجود
روری ہے۔ اب اگر اولی الامر سے صرف معصوم ہستیاں (ائمہ معصومینؑ) ہی مراد ہیں تو آج ان کی اطاعت
ے کیا معنی ہیں؟ کیا صرف عبادات (نماز و روزہ، حج وغیرہ) میں ان کی اطاعت واجب ہے اور بقیہ تمام احکام
سلامی میں صرف زبانی اطاعت کافی ہے اور عملاً ہم دشمنان اسلام کے باطل و غیر اسلامی قوانین کے پابند رہیں؟
ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ جس طرح غیبت صغریٰ کے بعد سے آج تک اور جب تک مصلحت امامت اس کی مقتضی ہو کہ
مؑ کا ظہور ہو اس وقت تک ہم عبادات میں اطاعت تو انہیں معصومینؑ کی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ لیکن درمیان
ں واسطہ عادل فقہاء ہیں جن کے ذریعہ معصومینؑ کے احکام ہمیں معلوم ہوتے ہیں اور ان کے مطابق ہم عمل کرتے
ں اسی طرح تمام امور اجتماعی اور احکام اسلامی میں بھی وہی فقہا مرجع ہیں اس لیے کہ اولی الامر، ائمہ طاہرین
یہم السلام، محض عبادات میں صاحبان امر نہیں تھے بلکہ نبی کی طرح تمام اجتماعی امور اور حکومتی قوانین میں بھی صاحبان
ر تھے لہٰذا جس طرح فقہاء کو عبادات میں معصومؑ کی نیابت حاصل ہے اسی طرح اسلامی حکومت کی تشکیل اور
ام احکام و قوانین اسلامی کے نفاذ و اجراء کے بارے میں بھی نیابت کا حق حاصل ہے، چنانچہ بہت سی احادیث
روایات بھی اس کے مؤید ہیں جن میں سے ہم چند روایات یہاں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ روایت مقبولہ عمر بن حنظلہ: (بنظر اختصار اصل عربی عبارتیں ترک اور صرف ترجمہ پر اکتفا کی جاتی ہے)

"محمد یعقوب..... عمر بن حنظلہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اپنے دو شیعہ ساتھیوں کے بارے میں سوال کیا کہ ان دونوں کے درمیان قرض یا میراث کے بارے میں نزاع ہے اور یہ لوگ داد خواہی کے لیے قاضی یا خود بادشاہ کے پاس گئے ہیں، آیا ان کا یہ فعل درست و جائز ہے؟ امام نے فرمایا کہ "جو شخص بھی کسی حق یا باطل معاملہ میں ان لوگوں (قضاۃ و سلاطین) کی طرف رجوع کرے گا اس نے درحقیقت طاغوت کی

طرف رجوع کیا ہے اور جو کچھ وہ ان کے فیصلہ کے مطابق حاصل کرے گا چاہے وہ اس کا حق ہی ہو پھر بھی حرام رہے گا کیونکہ اس نے اسے ایسے طاغوت کے حکم سے حاصل کیا ہے جس سے انکار کا حکم اللہ نے دیا ہے، خدا فرماتا ہے کہ: "یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ" راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا کہ پھر وہ دونوں کیا کریں؟ حضرتؑ نے فرمایا کہ وہ لوگ اپنوں میں دیکھیں (یعنی ایسے شخص کو تلاش کریں) جو ہماری حدیثوں کا راوی ہو اور ہمارے حلال و حرام کو پہچانتا ہو اور ہمارے احکام و قوانین کی معرفت رکھتا ہو۔ اس کو اپنا قاضی بنائیں اور اس کے فیصلہ پر راضی رہیں اس لیے کہ میں نے اس کو تم پر حاکم بنایا ہے (ایسا شخص میری طرف سے تم پر حاکم ہوگا) (وسائل ج ۱۸ باب ۱۱ ص ۹۸)

اس خبر کا اول و آخر اور امامؑ کا آیہ مبارکہ سے استشہاد بتاتا ہے کہ موضوع سوال حکم کلی تھا اور امامؑ نے بھی تکلیف کلی کو بیان فرمایا ہے۔ راوی کے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ نزاع و اختلاف کے موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ امامؑ فرماتے ہیں کہ فقیہ کی طرف رجوع کیا جائے اور اس کے حکم کو قبول کیا جائے کیوں کہ وہ میری طرف سے تم پر حاکم ہے اور ایسے حاکم کے حکم کی اطاعت تمام افراد حتّٰی کہ مجتہدین پر بھی واجب ہے اور جس نے بھی اس سے انکار کیا اس نے خدا کے حکم سے انکار کیا" الرّادّ علیہم کالرّادّ علینا" فرمان معصومؑ ہے، امامؑ جو دین و دنیا کے امور عامّہ میں زعامت و رہبری کے مالک ہیں اپنی طرف سے فقیہ و مجتہد کو امت مسلمہ پر حاکم قرار دیا ہے اور فقیہ امت مسلمہ کے لیے تمام امور عامہ میں واجب الاتباع ہے اور اسلامی حکومت کے یہی معنی ہیں۔

(۲) ابو خدیجہ (حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے معتمد اصحاب میں سے ہیں) کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے مجھے حکم دیا کہ حضرتؑ کی طرف سے آپ کے شیعوں کو یہ پیغام پہنچا دوں کہ اگر کبھی تم لوگوں کے درمیان آپس میں کوئی نزاع ہو جائے یا لین دین کے معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو اس فاسق جماعت کی طرف فیصلہ کے لیے رجوع مت کرنا بلکہ تم میں جو شخص ہمارے حلال و حرام کو پہچانتا ہو اس کو اپنا حاکم بنا لینا کیونکہ میں نے ایسے شخص کو تم پر قاضی معین کیا ہے۔ خبردار! تم میں سے کوئی ایک دوسرے کے خلاف کوئی نزاعی معاملہ بادشاہ ظالم تک نہ پہنچائے۔ (وسائل ج ۱۸ ص ۱۰۰)

اس روایت میں "تدارءٍ فی شیءٍ" سے حقوقی اختلاف مراد ہے جن میں فاسقین کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا گیا ہے، نیز "جماعت فساق" سے مراد وہ قاضی ہیں جو حاکم وقت کی طرف سے منصب قضاوت پر مامور تھے، حدیث کے آخر میں سلطان جائر کی طرف رجوع کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے جو تمام غیر اسلامی حکومتوں کو شامل ہے اور حکومت کے تینوں گروہوں (مقننہ، مجریہ اور عدلیہ) کو بھی شامل ہے۔ مزید برآں قابل غور امر یہ ہے کہ روایت میں پہلے فاسق کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا گیا ہے اس کے بعد ظالم بادشاہوں کی طرف رجوع کرنے سے روکا گیا ہے اس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں یعنی ممانعت صرف قاضی سے فیصلہ حاصل کرنے کی نہیں ہے بلکہ تمام امور میں انکی طرف رجوع کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اسی طرح تمام امور میں فقیہ کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مذکورہ دونوں روایتوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ اس روایت میں تعیین قاضی کو فرمایا ہے اور عمر بن حنظلہ کی روایت میں اجراء کرنے والے حاکم اور قاضی کا بھی ذکر ہے۔

(۳) "العلماء حکام علی الناس" علماء لوگوں پر حاکم ہیں۔ (مستدرک بحوالہ غرر الحکم)

(۴) سکونی جناب امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا:

الفقهاء امناء الرسل مالم یدخلوا فی الدنیا قیل یا رسول الله وما دخولهم فی الدنیا قال اتباع السلطان فاذا فعلوا ذالک فاحذروهم علی دینکم۔ (اصول کافی ج ۱ ص ۴۶)

اس روایت میں مرسل اعظمؐ نے فقیہ کو پیغمبروں کا امین فرمایا ہے اور وہ امانت جو فقیہ کے پاس ہے اور پیغمبر نے اس کے سپرد کی ہے اس سے مراد علم واحکام و معارف الٰہیہ ہیں اس بنا پر فقہاء ان احکام کی حفاظت کرنے اور عوام تک ان کے پہنچانے اور جاری و نافذ کرنے پر مامور ہیں، اور یہ مسلم امر ہے کہ احکام الٰہی صرف عبادات و معاملات تک محدود نہیں ہیں بلکہ ایک پاک وصاف سیاسی معاشرہ کی تشکیل اور عادلانہ اجتماعی نظام کا قائم کرنا بھی منجملہ احکام الٰہی واسلامی ہے اور ظاہر ہے کہ اس امانت کی ادائیگی حکومت کی طاقت وقدرت کے بغیر ناممکن ہے اس لیے فقیہ عادل کا فرض ہے کہ حکومت کی تشکیل کر کے اس امانت کو ادا کرے

(۵) یہ روایت ایک توقیع مبارک ہے"...... اسحاق بن یعقوب کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن عثمان العمری کے ذریعہ حضرت حجتؑ کی خدمت میں ایک خط لکھ کر کچھ مشکل مسائل کا حل دریافت کیا...

توحضرت نے اپنے قلم سے اس خط کا جواب تحریر فرمایا کہ "حوادث واقعہ میں تم ہماری حدیثوں کے راویوں کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ لوگ میری طرف سے تمہارے اوپر حجت ہیں اور میں خدا کی طرف سے ان پر حجت ہوں۔"

(کتاب اکمال الدین واتمام النعمۃ بحوالہ وسائل ج ۱۸ ص ۱۰۱)

اس روایت میں حوادث واقعہ سے کیا مراد ہے؟

اگر ان سے مراد احکام و مسائل شرعیہ ہیں تو شیعوں کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اس لیے کہ یہ بات تو مذہب تشیع کے واضحات میں سے ہے اور اس کے متعلق متواتر روایات موجود ہیں کہ مسائل شرعیہ میں فقہا کی طرف رجوع کرنا چاہیے، چنانچہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے زمانہ میں بھی پیروان ائمہؑ مسائل شرعیہ میں بحکم امامؑ فقہاء کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے مسائل پوچھا کرتے تھے لہٰذا حضرت حجتؑ کے دور غیبت صغریٰ میں نواب اربعہ سے رابطہ رکھنے والے اور حضرتؑ کو خط بھیجنے والے بھی یہ جانتے ہوں گے کہ مسائل شرعیہ میں کس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس بنا پر حوادث واقعہ سے مراد مسائل شرعیہ نہیں ہیں بلکہ ان سے مراد دور غیبت میں پیش آنے والے انفرادی و اجتماعی امور اور سماجی معاملات ہیں جن کے بارے میں امامؑ سے سوال کیا گیا ہے اور انھیں کے بارے میں حضرت حجتؑ نے جواب مرحمت فرمایا ہے، سوال بطور کلی ہے کہ جب ہم آپ تک نہیں پہنچ سکتے تو اجتماعی معاملات میں کیا کریں اور سماجی امور میں کس کی طرف رجوع کریں؟ (ممکن ہے کہ خط میں حوادث کا ذکر بھی کیا گیا ہو مگر روایت میں ان کا ذکر ضروری یا مناسب نہ سمجھا گیا ہو) بہرحال سوال بطور کلی تھا اور حضرتؑ نے جواب بھی بطور کلی تحریر فرمایا کہ حوادث و مشکلات میں ہمارے رواۃِ حدیث یعنی فقہاء کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ لوگ میری طرف سے تم پر حجت ہیں۔

حجت سے مراد کیا ہے، حضرتؑ حجۃ خدا ہیں اس کے کیا معنیٰ ہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرتؑ صرف مسائل شرعیہ ہمارے لیے بیان فرمائیں اور بس؟ باقی تمام امور اسلامی معطل رہیں؟ نہیں ہرگز نہیں! بلکہ جناب سرور کائناتؐ تمام اہل عالم کے لیے تمام امور دنیوی و اخروی میں مرجع تھے اسی طرح ائمہ طاہرینؑ تمام امور عامہ میں مرجع تھے اور اسی طرح فقہا بھی امت مسلمہ کے تمام امور دنیوی و اخروی میں مرجع ہیں۔

(۶) مولائے کائنات حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نہج البلاغہ کے مشہور و معروف خطبہ شقشقیہ کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں:

اما والذی خلق الحبۃ و برء النسمۃ لولا حضور الحاضر وقیام الحجۃ بوجود الناصر وما اخذ اللہ علی العلماء ان لا یقاروا علی کظۃ ظالم ولا سغب مظلوم لالقیت حبلها علی غاربها۔ الخ

قسم اس ذات کی جس نے دانہ کو شگافتہ کیا اور انسان کو پیدا کیا اگر بیعت کرنے والے حاضر نہ ہوتے اور مددگاروں کے موجود ہونے سے مجھ پر حجت تمام نہ ہو جاتی اور ایسا نہ ہوتا کہ خداوند عالم نے علماء سے یہ عہد و پیمان لے لیا ہے کہ ستمگروں کی پرخوری و غارت گری اور مظلوموں کی محرومی و بے کسی پر خاموش نہ بیٹھیں تو میں یقیناً مہار خلافت کو اس کی پشت پر ڈال دیتا اور سابق کی طرح اب بھی تمہاری زعامت قبول نہ کرتا، اور تم یہ محسوس کر چکے ہو کہ تمہاری یہ دنیا (اور اس کی زعامت) میرے نزدیک بکری کی ناک کی رطوبت سے بھی زیادہ بے وقعت ہے۔

امامؑ فرماتے ہیں کہ زعامت قبول کرنے کی وجہ وہ عہد و پیمان ہے جو اللہ نے علماء سے لیا ہے کہ وہ ظالموں کے ظلم و غارت گری پر خاموش نہ رہیں بلکہ احتجاج کریں یہاں تک کہ وہ ظلم سے شرمندہ ہو کر باز آجائیں اور مظلوموں کی حق تلفی اور ان کے حقوق غصب کیے جانے پر خاموش نہ بیٹھیں بلکہ مظلوموں کی طرف سے دفاع کریں یہاں تک کہ انھیں ان کے حقوق مل جائیں، ورنہ مجھے تمہاری دنیا کی ریاست کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ظالم کو دبانے اور مظلوم کو اس کا حق دلانے کے لیے کوشش کرنا ضروری ہے اور یہ امر اس وقت تک بطریق احسن ممکن نہیں ہے جب تک کہ حکومت نہ ہو اس لیے تشکیل حکومت آج بھی ضروری و واجب ہے کیونکہ اس کے اسباب آج بھی موجود ہیں اور کل بھی موجود رہیں گے اور اس تشکیل حکومت کی ذمہ داری علماء پر ہے کیونکہ خدا نے ان سے عہد لیا ہے۔

(۷) یہ خبر جناب شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے چار معتبر طریقوں سے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے نقل کی ہے۔

جناب امیرؑ فرماتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے تین مرتبہ پے در پے فرمایا "اللّٰھم ارحم خلفائی" حضرتؐ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! آپ کے خلفاء و جانشین کون لوگ ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو میرے بعد آئیں گے اور میری حدیث و سنت کو نقل کریں گے اور اسے میرے بعد لوگوں کو یاد کرائیں گے (پڑھائیں گے) "فیعلمونها الناس من بعدی"[۲]

اس روایت میں اگر آخری فقرہ "فیعلمونھا" نہ ہوتا (جیسا کہ بعض کتابوں میں ہے) تو اس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہاں خلفاء سے مراد ناقلانِ حدیث اور راویانِ اخبار ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ بات ذرا بعید از فہم ہوتی کیونکہ رواۃ اخبار میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ لیکن آخر میں اس فقرہ کی موجودگی نے جیسا کہ مستند روایتوں میں ہے واضح کر دیا کہ اس سے مراد فقہاء امت ہیں جنھیں مرسل اعظم ؐ نے لفظ خلفاء سے یاد فرمایا ہے اور کسی قسم کی کوئی قید نہیں لگائی ہے۔ لہٰذا اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فقیہ ریاست دینی کے ساتھ حکومت و ریاست دنیوی میں بھی پیغمبرؐ کا جانشین ہے، اور اس امر کی مزید تائید دوسرے طریقہ سے بھی ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ آنحضرت نے جب تین مرتبہ اللھم ارحم خلفائی فرمایا تو لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آنحضرت ؐ نے فرمایا کہ ایسے ایسے لوگ ہیں جو میرے بعد آئیں گے، تو لوگوں نے پھر یہ نہیں پوچھا کہ وہ لوگ کس امر میں آپ کے جانشین ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انھیں یہ معلوم ہو گیا کہ وہ جانشین علماء و فقہاء ہوں گے تو وہ سمجھ گئے کہ جب وہ فقہاء کا گروہ ہے تو یقیناً وہ لوگ سوائے پیغمبر کے عہدۂ معنوی (نبوت و رسالت) بقیہ تمام امور دنیوی و اخروی جن کی ذمہ داری پیغمبرؐ کے دوش پر تھی وہ تمام ذمہ داریاں پیغمبر کے جانشینوں یعنی فقہاء پر عائد ہوں گی جن میں منصب حکومت بھی ہے، غرضیکہ یہ خبر فقیہ کے خلیفہ رسولؐ ہونے کی بنا پر ان کے لیے تشکیل حکومت پر ایک روشن دلیل ہے۔

(۸) صحیحہ قداح۔ عبداللہ بن میمون القداح نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ جناب رسولؐ خدا نے فرمایا: جو شخص طلب علم کے لیے جاتا ہے تو خداوند عالم اس کے لیے جنت کے دروازے کھول دیتا ہے، اور ملائکہ اظہار خوشنودی کے لیے طالب علم کے پیروں کے نیچے اپنے پر بچھاتے ہیں تمام زمین و آسمان والے یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں طالب علم کے لئے استغفار کرتی ہیں۔ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چودھویں شب میں چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر، علماء انبیاء کے وارث ہیں انبیاء مال و دولت میراث میں نہیں چھوڑتے بلکہ علم کا وارث بناتے ہیں لہٰذا جس نے بھی اس علم سے کچھ حاصل کر لیا اس نے کثیر حصہ پا لیا۔ (اصول کافی ج ۱ ص ۳۴ باب العلم و تعلم)

(۹) اسی روایت سے ملتی جلتی ایک دوسری خبر بھی قدرے اختلاف کے ساتھ دوسرے اسناد سے وارد ہوئی ہے اور وہ یہ ہے:

ابوالبختری امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا: "بے شک علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں اور یہ اس لیے کہ انبیاء درہم و دینار میراث میں نہیں چھوڑتے بلکہ اپنی حدیثوں کو بطور میراث چھوڑتے ہیں اس لئے جس نے بھی ان کی احادیث سے کچھ حاصل کیا اس نے بہت بڑا حصہ حاصل

کرلیا، پس اب تمھیں دیکھنا یہ ہے کہ تم نے اپنا یہ علم کس سے حاصل کیا ہے کیونکہ ہم اہل بیت پیغمبرؐ میں نسلاً بعد نسلٍ کچھ ایسے عادل افراد ہوں گے جو مبالغہ کرنے والوں کی تحریف اور باطل پرستوں کی غلط نسبت اور جاہلوں کی تاویل کو دین سے دور کرتے رہیں گے۔ (اصول کافی ج ۱ ص ۳۲)

مذکورہ بالا آخری دونوں خبروں کے ذریعہ استدلال کرنے سے پہلے ہم ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں:۔ اور وہ یہ ہے کہ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ مذکورہ تمام روایات میں ع ۳، ۶، ۷ و ۸ روایتوں میں علماء سے مراد ائمہ طاہرینؑ ہیں جو لوگوں پر حاکم ہیں، اور جن سے خدا نے نظام عدل قائم کرنے کا عہد و پیمان لیا ہے اور جو انبیاء کے وارث ہیں، لہٰذا ان روایتوں سے استدلال صحیح نہیں ہے اور ان سے ولایت فقیہ کا اثبات نہیں ہوتا۔

توجواباً ہم عرض کریں گے کہ مرسل اعظمؐ سے علماء کے بارے میں دو حدیثیں اور بھی وارد ہوئی ہیں:

۱۔ "میں قیامت کے دن اپنی امت کے علماء پر فخر کروں گا، میری امت کے علماء مجھ سے پہلے والے تمام انبیاء کی طرح ہیں"۔ (جامع الاخبار)

۲۔ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کے مثل ہیں۔"

ظاہر ہے کہ ان دونوں روایتوں میں علماء سے مراد علماء امت ہیں نہ کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام، ورنہ ہمیں مذہب شیعہ کے اس مسلم عقیدہ سے دست بردار ہو جانا پڑے گا کہ ہمارے تمام (۱۲) ائمہ علیہم السلام حضرت مرسل اعظمؐ کے سوا تمام انبیاء و مرسلینؑ سے افضل ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ائمہ انبیاء کے وارث ہیں اور لوگوں کو ائمہ سے علم اور احادیث حاصل کرنا چاہیئے درست نہیں ہے۔

مزید برآں ائمہ طاہرین علیہم السلام کے فضائل و مناقب میں مرسل اعظمؐ سے جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ صاف و صریح الفاظ میں نام بنام وارد ہوئی ہیں، زمان پیغمبرؐ میں تقیہ کا کوئی محل نہیں تھا کہ حضرت کنایہ و استعارہ سے کام لیتے، علماء امت کی فضیلت میں وارد حدیثوں اور فضائل و مناقب حضرات ائمہ اطہارؑ میں جو بے شمار حدیثیں موجود ہیں ان کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے، انھیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ: چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ ائمہ اطہارؑ قدرت کے نزدیک جس عظیم قدر و منزلت کے مالک تھے اور اولی الامر (معصوم) ہونے کی حیثیت سے آنحضرتؐ کو جو بلند مراتب و مدارج حاصل تھے انھیں خود پروردگار عالم قرآن مجید

ہیں اور مرسل اعظمؐ نے اپنی حدیثوں میں اسی انداز سے ان کے شایان شان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اور علماء امت جن فضائل کے مستحق تھے اور ان کے اوپر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انھیں احادیث میں دوسرے انداز سے بیان کیا گیا ہے، جس نے بھی اخبار و احادیث کا مطالعہ بہ نظر غائر کیا ہوگا اسے دونوں قسم کی حدیثوں کے درمیان نمایاں فرق معلوم ہوا ہوگا۔ اس بنا پر روایت ۲ میں حکام، ۶ میں عہد و پیمان لیے جانے والے علماء اور ۸ و ۹ میں ورثہ انبیاء سے ائمہ معصومینؑ کو مراد لینا خلاف ظاہر ہے اور علماء امت کو مراد لینا درست ہے۔

روایت ۸ و ۹ میں اس اعتبار سے بھی علماء سے ائمہ معصومینؑ کو مراد لینا درست نہیں ہے کہ روایت ۸ کی ابتداء میں طالب علم کے فضائل اور ۸ و ۹ دونوں کے آخر میں فمن اخذ منہ اخذ بحظ وافر اور فمن اخذ بشیءٍ منھا فقد اخذ حظاً وافراً اور پھر یہ فقرہ فانظروا علمکم ھذا عمن تأخذونہ" یہ تمام باتیں خود ہی واضح کر رہی ہیں کہ یہاں علماء سے مراد علماء و فقہاء امت ہیں نہ کہ ائمہ طاہرینؑ، کیونکہ ان حضرات کا علم وہبی اور من جانب اللہ تھا نہ کہ ہماری طرح اکتسابی، جسے حاصل کرنے کے لیے ادھر ادھر جانے اور دوسروں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، ائمہ معصومینؑ کی ذوات مقدسہ اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہیں کہ کسی غیر معصوم سے کسب علم کریں، البتہ فقہاء امت کو اس کی طرف متوجہ رہنے کی ضرورت ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ وہ کس سے علم حاصل کر رہے ہیں، یعنی انھیں سوچ سمجھ کر صحیح مقام سے علم حاصل کرنا ہوگا تاکہ اس علم کے ذریعہ انبیاء کے وارث بن سکیں۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ علماء و فقہاء امت انبیاء کے وارث اور مرسل اعظمؐ کے خلفاء ہیں تو ان کے لیے حکومت و ولایت بھی ثابت ہے، چنانچہ تفسیر مجمع البحرین میں آیۂ مبارکہ "النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم" کے ذیل میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ "یہ آیت امارت، حکومت و ولایت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اب چونکہ نبی مومنین پر حکومت و ولایت رکھتا ہے، اور فقہا بمنزلۂ انبیاء اور وارث انبیاء ہیں لہٰذا (زمان غیبت امامؑ میں) وہی ولایت و حکومت علماء کے لیے بھی ثابت ہے اور اسی طرح جب پیغمبر کی اطاعت واجب ہے تو فقہا کی اطاعت بھی واجب ہوگی۔

(۱۰) ..... علی ابن حمزہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوالحسن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "جب کوئی مومن (یا مومن فقیہ) مرجاتا ہے تو اس پر فرشتے، زمین کے وہ حصے جن پر وہ خدا کی عبادت

کیا کرتا تھا اور آسمان کے دروازے جن سے اس کے اعمال اوپر جاتے تھے (یہ سب کے سب) اس پر گریہ کرتے ہیں اور قلعۂ اسلام میں ایسا شگاف پڑ جاتا ہے جسے دنیا کی کوئی چیز پر نہیں کر سکتی، کیونکہ مومن فقہاء اسلام کے قلعے ہیں جس طرح شہر پناہ کے قلعے شہر کے لئے۔" (اصول کافی کتاب فضل العلم)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ فقہاء مومنین اسلام کے قلعے ہیں، اور اس جملہ سے امام علیہ السلام فقہاء کو مامور فرماتے ہیں کہ وہ نگہبان رہیں، عقائد، احکام اور اسلام کے عادلانہ نظام کی نگرانی کریں، ظاہر ہے کہ معصوم نے یہ جملے تکلفاً نہیں فرمائے ہیں جس طرح ہم لوگ ایک دوسرے کو "حجۃ الاسلام" یا "مولانا" اور "علامہ" کے خطاب سے نوازا کرتے ہیں، معاذ اللہ معصوم نے یہ گراں قدر خطاب تکلفاً اور بلاوجہ نہیں مرحمت فرمایا بلکہ درحقیقت فقہاء کو مامور فرمایا ہے اور اس جملے کے ذریعہ ان کے فرائض اور انکی ذمہ داریاں بیان فرمائی ہیں۔

مومن فقیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ قوانین اسلام کی حفاظت کرے، احکام اسلام کو نشر کرے، مسلمانوں کے اجتماعی امور کو درست کرے، حدود اسلامی کو جاری کرے، ظالموں کو ان کی زور زبردستی سے روکے، مظلوموں کے حقوق کی غارت گری اور ان کے استحصال کا سلسلہ بند کر کے انھیں ان کے حقوق دلوائے، مسلمانوں کی سرحدوں اور اسلامی وطن کی معقول حفاظت کا انتظام کرے وغیرہ وغیرہ کیونکہ فقیہ مومن اسلام کا قلعہ ہے اور قلعہ کا مقصد اس کے دائرہ میں جو کچھ بھی ہے اس کی حفاظت اور ہر قسم کے نقصان سے بچانا ہوتا ہے۔

"تلک عشرۃ کاملۃ" الحمدللہ یہ دس روایتیں "ولایت فقیہ" کے اثبات کی غرض سے پیش کی گئیں امید ہے انشاءاللہ یہ عشرہ کاملہ ثبوت مقصد کے لیے کافی ہوں گی۔

سربراہ حکومت اسلامی کے شرائط:

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ زمان غیبت میں فقہاء کو تشکیل حکومت کا حق حاصل ہے تو اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ فقہاء میں سے رئیس و سربراہ حکومت کے لیے کیا شرائط ضروری ہیں۔

اسلامی حکومت کے سربراہ میں چند شرائط کا پایا جانا لازمی ہے:-

۱۔ **قانون داں ہونا** ۔ اسلامی حکومت چونکہ قوانین و احکام الہٰی کی حکومت ہے لہٰذا اس کے حاکم اعلیٰ کو ان قوانین کا پورا علم ہونا ضروری ہے اور صرف حاکم اعلیٰ ہی کو نہیں بلکہ حکومت کے ہر عہدہ دار کو اس کے عہدہ سے متعلق تمام قوانین کا علم ہونا چاہیے۔ البتہ حاکم اعلیٰ کو علم کے لحاظ سے سب پر فضیلت

اور حکومت کے تمام شعبوں سے متعلق واقفیت ہونی چاہیئے۔ اگر حاکم اعلیٰ قوانین اسلامی سے لاعلم ہو تو وہ حکومت کا اہل نہیں ہے۔

۲۔ عادل ہونا ۔ حاکم اعلیٰ کا اعتقادی اور اخلاقی کمال کے درجے پر فائز ہونا ضروری ہے۔ اس کا دامن آلودۂ عصیاں نہیں ہونا چاہیئے، بیت المال اور مملکت کے آمد و خرچ کی ذمہ دار شخصیت اور خدا کی مخلوق پر حکومت کرنے والے اور ان کی جان و مال و عزت و ناموس کے محافظ کو معصیت کار نہیں ہونا چاہیئے، ارشاد خداوندی ہے: "لاینال عہدی الظالمین" خدا ظالموں کو ایسے اختیارات نہیں دیتا، اگر حاکم اعلیٰ عادل نہ ہوگا تو لوگوں کے حقوق کی ادائیگی، جزائی قوانین کے اجراء اور مالیات کے صرف کرنے میں انصاف سے کام نہیں لے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے نااہل بھائی بندوں، قرابت داروں اور جی حضوری کرنے والوں کو معاشرہ پر حاکم بنادے اور بیت المال کو اپنی ہوس رانی اور شخصی مفاد میں صرف کر ڈالے، اس لئے حاکم اعلیٰ کا عادل ہونا ضروری ہے۔

واضح ہو کہ مذکورہ دونوں شرطیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور اگر حاکم اعلیٰ میں ان میں سے ایک بھی نہ پائی جائے گی تو وہ قطعاً اور کسی حالت میں حکومت کرنے کا اہل نہ ہوگا۔

۳۔ رجولیت ۔ حاکم اعلیٰ کا مرد ہونا ضروری ہے، کیونکہ احادیث و اخبار میں جن علماء و فقہا کو حکومت کرنے کے لیے کہا گیا ہے، ان سے مراد مرد ہیں، بلکہ بعض روایات میں تو صاف و صریح الفاظ میں یہ حکم موجود ہے، چنانچہ ایک روایت جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے جس میں حضرتؑ نے فرمایا ہے کہ "عورت منصب قضاوت پر فائز نہیں کی جا سکتی اور وہ امیر و حاکم بھی نہیں ہو سکتی اور سیاسی معاملات میں مشورہ بھی نہیں دے سکتی۔" (خصال ج ۲ ص ۱۴۱)

پیغمبر اسلامؐ سے روایت کی گئی ہے، حضرتؐ فرماتے ہیں کہ "وہ جماعت نجات نہیں پا سکتی جن کے اوپر عورت حکومت کرے۔" (خلاف شیخ طوسیؒ ج ۱ ص ۳۱۱)

عقلی اعتبار سے ممکن ہے اس میں یہ راز ہو کہ عورت کا دل نازک ہوتا ہے، اس میں رحم و مروت کا جذبہ غالب رہتا ہے، اور حکومت میں کبھی کبھی سختی سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً حدود و تعزیرات کے اجراء کے موقع پر، لہٰذا اس کا نفاذ و اجراء صنف نازک کے لیے مشکل ہوگا۔

۴، ۵ و ۶ ۔ بلوغ، عقل اور رشد (یعنی احمق نہ ہونا) ۔ یہ تینوں شرطیں محتاج دلیل نہیں ہیں کیونکہ

یہ امر بدیہی ہے کہ ان تینوں کے برعکس صفات (نابالغی، جنون اور سفاہت) کے حامل افراد شرعاً خود اپنے شخصی امور میں دوسروں کے محتاج و دستنگر ہوتے ہیں اس بنا پر حکومت جو ایک الٰہی امانت ہے ان کے سپرد کیسے کی جا سکتی ہے؟

۶۔ حاکم اعلیٰ کا اعلم ہونا۔ یہ بھی ایک ضروری شرط ہے چنانچہ جناب امیر علیہ السلام اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

ایھا الناس ان احق الناس بھذا الامر اقوٰھم علیہ واعلمھم بامر اللہ الخ

"اے لوگو! حکومت کے لیے لائق ترین فرد وہ شخص ہے جو اچھی طرح سے حکومت چلا سکے اور احکام الٰہی کا سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔"

نیز مرسل اعظمؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ "کسی قوم نے حکومت کے لیے کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کیا جس سے بڑا عالم موجود ہو مگر یہ کہ وہ حکومت تنزلی کی طرف مائل رہی یہاں تک کہ (وہ اپنے کئے پر پچھتائے اور) وہ اس امر کی طرف پلٹے جسے چھوڑ دیا تھا۔" (یعنی اعلم کو حاکم بنایا تو حکومت سنبھلی)

نیز مرسل اعظمؐ نے فرمایا کہ "اگر کوئی شخص کسی قوم کی زعامت قبول کرے جبکہ اس کے مقابلہ میں اعلم وافقہ شخص موجود ہو تو اس قوم کی حالت قیامت تک ابتر رہے گی۔" (کلام ج ۲ صفحہ طبع جدید)

اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی روایتیں موجود ہیں جن کا ذکر کافی طول کا باعث ہوگا۔

البتہ اگر کسی زمانہ میں ایک ہی وقت میں کئی جامع الشرائط اعلم و افقہ افراد مجتمع ہو جائیں اور ان میں سے کسی ایک کی تشخیص ممکن نہ ہو تو حکم قرآنی کے مطابق شورائے کے ذریعہ کسی ایک کا انتخاب کر لیا جائے اور اگر اس طرح بھی ممکن نہ ہو تو انہیں فقہاء کی ایک مجلس شورائے نگہبان کی تشکیل سے اس مسئلہ کو بآسانی حل کیا جا سکتا ہے۔

قوائے حکومت:

مرسل اعظمؐ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کے دور میں حکومت کی دو قوتیں (مجریہ اور عدلیہ) تو موجود تھیں مگر اس قدر باقاعدہ و مفصل نہیں تھیں جیسی ہمارے زمانہ میں انکا وجود ہے، چنانچہ حضور مرسل اعظمؐ نے روایات متفقہ بین الفریقین کے مطابق ابتدائے دعوت اسلام یعنی

دعوت ذوالعشیرہ کے موقع پر ہی (تمام حاضرین کی خاموشی اور مولائے کائنات کے کمسنی کے باوجود پُرجوش وعدۂ نصرت کے بعد مرسل اعظمؐ نے) جناب امیرالمومنینؑ کو اپنا بھائی، وزیر اور اپنے بعد کے لیے اپنا وصی وجانشین مقرر فرما دیا تھا، چنانچہ جناب امیرالمومنینؑ بھی حکومت کے تمام کاموں میں آنحضرتؐ کے ہمیشہ معاون و مددگار اور سب سے زیادہ معتمد رہے۔ اسی طرح آنحضرتؐ نے کئی افراد کو قاضی بنا کر اطراف میں بھیجا منجملہ ان کے جناب امیرالمومنینؑ کو آنحضرتؐ نے یمن بھیجا تھا کہ انھیں احکام دین کی تعلیم دیں اور ان کے معاملات کا فیصلہ کریں۔

جناب امیرالمومنین علیہ السلام بھی اپنے دور حکومت میں وزیر رکھتے تھے، ان میں سے ایک عبداللہ بن عباس تھے جو عرصہ تک حکومت کے اہم امور میں حضرتؑ کے معتمد رہے، دوسرے ابورافع ہیں جو وزیر مال تھے اور بیت المال کی کنجیاں انھیں کے ہاتھ میں رہتی تھیں۔ اسی طرح حضرتؑ کے زمانہ میں بھی جگہ جگہ قاضی مقرر تھے جو لوگوں کے مقدمات فیصل کیا کرتے تھے۔

البتہ تو وہ مقننہ کا کسی کمیٹی یا جماعت کی شکل میں کوئی وجود نہیں تھا جو مل جل کر قانون سازی کا کام انجام دیتی کیونکہ اسلامی حکومت میں قوت مقننہ فقط ذاتِ رب العالمین ہے اور حضرت ختمی مرتبتؐ قوانین واحکام الٰہی کے سب سے بڑے عالم تھے جنھیں خود قدرت نے سب کچھ پڑھا کر اور "علمک مالم تکن تعلم" کی قرآنی سند عطا فرما کر بھیجا تھا لہٰذا وہاں اسمبلی اور پارلیمنٹ کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، خود مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احکام الٰہی کے مطابق اسلامی حکومت کی تشکیل کی، الٰہی قوانین نافذ وجاری کئے، عادلانہ اسلامی نظام قائم کیا، انتہائی بگڑے ہوئے معاشرہ کو ایک خوشنما اور نیا روپ دیا۔

اسی طرح مولائے کائنات جناب امیرالمومنین علیہ السلام کے ظاہری حکومت وخلافت کے مختصر دور میں بھی علیحدہ سے کسی مقننہ کمیٹی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ حضرت بھی بمصداق حدیث نبوی:- "انا مدینۃ العلم وعلیؑ بابھا" صاحب علم لدنی اور الٰہی احکام وقوانین کے ماخذ ومدرک (کتاب خدا اور سنت پیغمبرؐ) کے سب سے بڑے عالم تھے اور اپنے علم میں کسی غیر معصوم کے محتاج نہیں تھے، مرسل اعظمؐ کی حدیث مبارک شاہد ہے کہ "اقضیکم علیؑ" "تمہارے درمیان سب سے بہتر فیصلہ کرنے والے علیؑ ہیں"، لھذا حضرتؑ نے بھی اپنے علم کے مطابق قوانین واحکام الٰہی کو نافذ وجاری

فرمایا اور امت مسلمہ کے درمیان عادلانہ نظام قائم کیا، لوگوں کو نبی کی طرح حریت و مساوات کا عملی درس دیا، تقویٰ و پرہیزگاری کی تعلیم دی امت مسلمہ کو اسلامی حکومت کی ذمہ داری کا صحیح طریقہ سکھایا کیونکہ امت نبوی پاکیزہ تعلیمات کو کافی حد تک بھلا چکی تھی اور اس کے اثرات دلوں سے بہت کچھ محو ہو چکے تھے۔

آج بھی اسلامی حکومت کے لیے وہ مقننہ فقعافات سلطان السلاطین ہی ہے، اور تا ابد رہے گی لیکن آج باوجودیکہ ہمارے علماء اعلام علیہم الرحمۃ و الرضوان نے غیبت صغریٰ واقع ہونے کے بعد ہی سے اس طرف توجہ مبذول رکھی اور اب تک تمام قوانین و احکام اسلامی (عبادات، ایقاعات، عقود و احکام) کو کتاب خدا و سنت رسولؐ سے استنباط کر کے شرح و بسط کے ساتھ بے شمار کتابیں تحریر فرما چکے ہیں، پھر بھی آج دو اسباب کی بنا پر قوہ مقننہ کی ضرورت ہے۔

اولاً اس لئے کہ ہر فقیہ کا فتویٰ اگرچہ قرآن و سنت اور بعض دیگر اجماع و عقل ہی کی روشنی میں صادر ہوتا ہے لیکن ہر فقیہ کی تحقیق کا انداز جداگانہ ہوتا ہے لہٰذا مدارک میں متحد ہونے کے باوجود فتاوے میں کہیں کہیں اختلاف رونما ہو جاتا ہے اور غالباً اسی لئے عوام پر زندہ فقیہ کی تقلید واجب ہے (اِلّا یہ کہ زندہ فقیہ اپنے سے پہلے والے فقیہ (میت) کی تقلید کی اجازت دیدے)۔

دوم اس لیے کہ ہمارے زمانہ میں معاشرہ میں روز نت نئے عالمی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا حل قرآن و سنت اور بعض دیگر اجماع و عقل کی روشنی میں تلاش کرنا ضروری ہے، تاکہ دنیا کے ان تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور وقت اور ماحول کے تقاضوں کے پیش نظر تمام مسلمانوں کے ذہنوں کو عموماً اور جوانوں کے ذہنوں کو خصوصاً مطمئن کیا جا سکے اور اسلامی حکومت کا طرز جہانبانی الہٰی آئین کے دائرہ میں محصور ہوتے ہوئے بھی عالمی حکومتوں کے طرز فرمانروائی سے بہت زیادہ جداگانہ نظر نہ آئے۔

تینوں قویٰ سے حاکم اعلیٰ کا رابطہ : قوت عدلیہ کے لیے قوانین کا عالم ہونا بہرحال ضروری ہے اور عدالت بھی، البتہ دوسری دو قوتوں میں تمام لوگوں کا قانون داں اور فقیہ و مجتہد ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ہر منصب دار کے لیے بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ فقیہ و مجتہد ہوں البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ جن جن عہدوں سے متعلق ہوں ان کے بارے میں پوری معلومات رکھتے ہوں۔ اور حاکم اعلیٰ کا بحیثیت ولی فقیہ ان سب سے تعلق لازم و ضروری ہے اور یہ تینوں قوتیں براہ راست حاکم اعلیٰ کی زیر نگرانی ہوں گی تاکہ یہ یقین و اطمینان حاصل ہوتا رہے کہ حکومت کے تمام امور اسلامی آئین و قوانین کے مطابق انجام پا رہے ہیں۔

حواشی :

۱؎ سورۂ نساء / ۶۰ - وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس (فیصلہ کے لیے) لے جائیں حالانکہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگ اس سے انکار کریں۔ ۲؎ معانی الاخبار ص ۳۷۴ عیون الاخبار ج ۲ ص ۳۷، الفقیہ ج ۴ ص ۳۰۲ و جلاء العیون وغیرہ ۳؎ کافی کے اسی باب میں ایک دوسری روایت بھی ہے جس میں "اذلات المومن الفقیہ" ہے۔ ۴؎ بحار الانوار ج ۱۰ ص ۱۱۶

آخری قسط

جناب اکبر علی منصفی۔ ہندوستان

اسلامی ریاست کے مقاصد

ہر شخص جانتا ہے کہ انسان متضاد قوتوں کا مجموعہ اور مختلف صلاحیتوں کا حامل ہے۔ جہاں انسانیت نواز اقدامات انجام دیتا ہے وہاں اس سے انسانیت سوز حرکتیں بھی سرزد ہوتی ہیں اور ایسا اوقات تو حیوان سے بھی بدتر حرکتوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ چونکہ فہم و دانش، حرص و ہوس، غیظ و غضب، بغض و حسد، رحم و کرم، کبر و غرور، ضد و تعصب، رنج و الم، کیف و سرور پھر ان میں کمی و زیادتی اور ان کے غلبہ کی بنا پر افراط و تفریط کا ارتکاب ہوتا ہے لہٰذا اعتدال پر قائم رکھنے کے لئے علم و حلم و رشد و ہدایت کی راہ اختیار کرنے کے لئے اور ظلم و جہالت سے بچنے کے لیے تعلیمی اور تربیتی اداروں کا قائم کرنا ازبس ضروری ہے جو مختلف تعلیمی و تعمیلی شعبوں پر مبنی ہوں، تاکہ لوگوں کو صحیح فائدہ پہونچے۔

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ فرماتے ہیں "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ" علم کا حاصل کرنا تمام مسلمان مرد اور تمام مسلمان عورتوں پر فرض ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا ہے العلم علمان علم الادیان و علم الابدان علم دو قسم کا ہے ایک دینی ایک دنیاوی، ایک مادی ایک روحانی اور دونوں پر کمال حاصل کرو۔ تیسرے مقام پر فرماتے ہیں: من ترک الدنیا للآخرۃ والآخرۃ للدنیا فلیس منی (ص۲ مقدمۃ القرآن)
"جو دین کو چھوڑے دنیا کے لیے یا دنیا کو چھوڑے دین کے لیے وہ ہم سے نہیں ہے" یعنی دنیا و دین دونوں سنبھالو اور دونوں سنوارو۔

صادق آل محمد فرماتے ہیں کہ میں پسند کرتا ہوں کہ میرے دوستوں کو علم حاصل کرنے کے لیے ان کے سروں پر مارا جائے۔

چونکہ انسان حد سے تجاوز کرکے ظلم و جرم کا مرتکب ہوتا ہے لہٰذا اس کے انسداد اور حق مظلوم دلانے نیز جرمانہ و سزا دینے کے لیے عدلیہ کا قیام ضروری ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرسکیں۔ اور اطمینان سے امن و سلامتی کے سائے میں زندگی بسر کریں۔

محکمۂ دفاع کا قیام بھی ضروری ہے تاکہ اگر اجتماعی حیثیت سے کوئی دشمن حملہ آور ہو تو اس کا پوری پوری طرح دفاع کیا جا سکے۔ یہ دفاع جنگ نہیں ہے بلکہ حفاظت خود اختیاری ہے جو دنیا میں کسی ملک اور کسی قوم کے نزدیک عیب نہیں بلکہ دنیا کی ہر حکومت اپنے ملک کی حفاظت کے لیے محکمہ دفاع کو انتہائی محکم و مضبوط بنانے میں مصروف ہے اور دفاع کے نام بڑے بڑے مہلک تھیار بناتے ہیں کہ مبادی کل ضرورت پڑ جائے۔ زبردست مصارف برداشت کرتے ہیں۔

لہٰذا اگر مملکت اسلامیہ اپنے دفاع اور تحفظ خود اختیاری کا بندوبست کرے تو اس کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کرکے بدنام کرنے کی ناکام کوشش کیوں کی جائے؟ جبکہ دنیا جانتی ہے کہ زبردستی بلاقصور ان پر حملہ کیا گیا۔ اور ان کی جان و مال کا نقصان کیا گیا اور ان کی زمین میں گھس آئے۔ لیکن جب جوابی کارروائی شروع ہوئی اپنے بچاؤ کی تدبیریں کی گئیں تو دشمنوں نے مختلف قسم کے پروپیگنڈے شروع کردئے۔ ظاہر ہے کہ کوئی انصاف پسند اور عقلمند اس دفاعی کارروائی کو اقدام بیجا نہیں کہہ سکتا۔ مولیٰ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں؛

ردّ و الحجر من حیث جاء (نہج البلاغہ ص۹۷)

پتھر جدھر سے آئے اسی طرف پھینکدو۔

من سلّ سیف البغی قتل بہ (نہج البلاغہ ص۹۲۶)

جو بغاوت کی تلوار کھینچتا ہے وہ اسی سے قتل کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ٹیکنک، صنعت و حرفت اور فنکاری کی طرف بھی پوری توجہ دے لوگوں کو شوق دلائے اور ہر صحیح ذوق رکھنے والے کے لیے کام فراہم کرے فیکٹری قائم کرے کارخانے لگوائے کاریگروں کی ہمت افزائی کرے۔ کارکنوں کی مدد کرے تاکہ ہر شخص حسب حال مصروف کار ہو بیکاری دور ہو تمام لوگوں کو ضرورت کی ہر

چیز آسانی سے میسر آئے اور ملک خود کفیل ہو دوسروں کا محتاج نہ ہو۔ ۱۵ ۱

ابن عباس رسولِ خدا سے روایت کرتے ہیں کہ آپ جب کسی شخص کو دیکھتے تھے جس کی ظاہری حالت تعجب خیز ہوتی تو دریافت فرماتے کہ یہ کوئی صنعت و حرفت جانتا ہے ؟ پس اگر کہا جاتا کہ نہیں؟ تو فرماتے کہ یہ میری نظروں سے گر گیا، پوچھا گیا کہ یا رسولؐ اللہ کیونکر؟ فرمایا کہ جب کوئی ہنرمند پیشہ ور نہ ہوگا تو خستہ حال ہو کر قرضہ پر زندگی بسر کرے گا (یا پھر مانگ کر ذلت کی زندگی گزارے گا)۔[۱] (جامع الاخبار ص ۱۴۳ - کنز العمال ج ۲ ص ۲۹)

مملکتِ اسلامیہ کے فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شعبۂ زراعت کی طرف خصوصی توجہ دے اور کاشتکاروں کا بھرپور تعاون کرے تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو۔ ملک آسودہ رہ کر کارہائے نمایاں انجام دے۔ اگر بھوک مری میں مبتلا ہوگا تو نظامِ زندگی و نظامِ ملکی دونوں متأثر و معطل ہوں گے جرائم کی شرح میں اضافہ ہوگا۔ ملک کی ترقی رک جائے گی۔ ایک دوسرا اہم شعبہ تجارت ہے۔ تاجروں کو ہر قسم کی سہولتیں پہنچانا ضروری ہے۔ ان کی محنتوں کی داد دیں نہ کہ انھیں مبتلائے فریاد کریں تاکہ درآمد و برآمد کا سلسلہ استوار ہو، زائد چیزیں دوسری جگہ لیجائیں جہاں حاجت ہو اور جس ضروری چیز کی کمی ہو وہ دوسری جگہ سے جہاں زیادہ ہو لاکر پورا کیا جائے۔ اس طرح توازن برابر کیا جائے۔ اسلامی ریاست کے اغراض و مقاصد میں ہر وہ چیز داخل ہے جس پر بندگانِ خدا کی صلاح و فلاح، حیات و نجات کا مدار ہے پس ان تمام شعبوں کی خبر گیری و خاطر خواہ بندوبست، ان کی پوری نگہداشت، رعایا کی ضروریات و جائز مطالبات کا پورا کرنا، ان کی تخفیفِ زحمت کا لحاظ رکھنا، ان کے تمام مبتلا بہ مسائل کا حل تلاش کرنا، خواہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے یہ تمام ریاستِ اسلامیہ کا اولین فرض ہے اور عین مقصد ہے۔ یہ تمام چیزیں قرآن و حدیث کی روشنی میں مرتب کئے جانے والے دستور العمل پر مشتمل فقہی کتابوں میں موجود ہیں۔ مولیٰ امیر المومنین علیہ السلام نے حضرت مالک اشترؓ کو جو دستورِ حکومت لکھا ہے وہ آج بھی اربابِ حکومت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت میں فرق:

ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی حکومت میں فرق ہے۔ عام طور سے لوگ مسلمانوں کی حکومت کو اسلامی حکومت کہتے اور سمجھتے ہیں، مسلمان بادشاہوں کے

کردار کو زبردستی اسلام کے سر تھوپتے ہیں۔ حالانکہ بصد افسوس اسلام اور مسلمان دو متباین حقیقت بن چکے ہیں اسلام کا آئین خدا ساز ہے اور مسلمان کا آئین خود ساختہ ہے۔ وہ کچھ کہتا ہے یہ کچھ کہتے ہیں اس کا طرز حکومت اور ہے ان کا طرز حکومت اور ہے۔ بانی اسلام نیزان کے حقیقی نائبین کا عمل اور ہے، مسلمان سلاطین کا عمل اور ہے اسی حقیقت کے پیش نظر بعض مغربی محققین نے کہا ہے کہ تمام مذاہب و ادیان میں سب سے اچھا دین اسلام ہے اور تمام اقوام میں سب سے برے مسلمان ہیں۔ دیکھئے کتنا واضح فرق ہے کہ جس کو غیر مسلم تک محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن آج تک عام طور سے اکثر مسلمان اس فرق کو محسوس نہ کر سکے یا محسوس کیا تو تعصب سے اظہار نہ کر سکے۔ نام کے مسلمان حکمراں کو اسلامی فرمانروا کہتے اور سمجھتے رہے ہیں اور مسلمان حکومت کو اسلامی حکومت کہتے ہیں نام نہاد مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں کے غیر شرعی و غیر معقول کردار کی توجیہ اور اسے اسلام سے منسوب کر کے دوسرے بے گناہ مسلمانوں کو مصیبت میں ڈالنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ اگر بے جا پاسداری چھوڑ کر صاف صاف یہ اقرار کر لیا جائے کہ مسلمان سلاطین کا کردار انکا ذاتی و انفرادی کردار ہے جس کے وہ خود ذمہ دار ہیں نہ اس کا اسلام ذمہ دار ہے نہ اس کی دوسرے مسلمانوں سے باز پرس کی جا سکتی ہے اور نہ اس کی جوابدہی اور صفائی دوسرے مسلمانوں پر لازم ہے۔ جو کچھ دولت و طاقت و کثرت کے نشہ میں ان سے سرزد ہوا ہے وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں اگر اچھا ہے تو اچھا ہے، برا ہے تو برا ہے، اگر معقول ہے تو معقول ہے نامعقول ہے تو نامعقول ہے اگر شرعی ہے تو شرعی ہے، غیر شرعی ہے تو غیر شرعی — قابل مدح ہے تو قابل مدح ہے قابل مذمت ہے تو قابل مذمت ہے۔ دوسروں کے لئے خود کو کیوں بیجا زحمت میں مبتلا کریں۔ رسول خداؐ فرماتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر احمق کون ہوگا جو دوسروں کی دنیا کے لیے اپنا دین برباد کرے۔ سچ بولئے حق بولئے۔ پس اگر مسلمان بادشاہ فعل حرام کا مرتکب ہوتا ہے تو گنہگار ہے مجرم ہے شرعاً سزا کا مستحق ہے، ناقابل عفو ہے۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ

جو ذرّہ برابر نیکی کرے گا اس کی جزا پائے گا اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا سزا پائے گا۔

شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو والملائکۃ واولوا العلم قائماً بالقسط۔ (آل عمران/۱۸)

یعنی خدا اور فرشتے اور علم والے گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے

خدا عدل و انصاف کے ساتھ قائم ہے۔ خدا کی بارگاہ میں سب بندے برابر ہیں لیکن
فرمانبردار و نافرمان، گنہگار و پرہیزگار برابر نہیں ہوسکتے۔

اسلامی حکومت خدا کی حکومت ہے جو خالق و رازق و مالک ہے وہی حقیقی حکمراں ہے اور اس کی طرف سے بانیٔ اسلام اور ان کے نائبین برحق، اسلامی فرمانروا ہیں اور ان کے بعد ان کی طرف سے حق ولایت و حکومت فقہاء کرام کو حاصل ہے ان میں بھی جو افقہ و اتقیٰ ہیں وہ خواہ برسر اقتدار ہوں یا نہ ہوں ان کے قبضہ میں تخت و تاج ہو یا نہ ہو، چاہے لاؤ لشکر دولت و خزانہ ان کے پاس ہو یا نہ ہو، ظاہری تزک و احتشام ہو یا نہ ہو، کوئی مانے یا نہ مانے مگر وہی اسلامی فرمانروائی کے مستحق ہیں، ان کا حکم ماننا ان کا فیصلہ قبول کرنا لازم ہے ان کی طرف رجوع کرنا فرض ہے، ان کی تقلید کرنا واجب ہے۔ ان کی حکومت نہ شرق و غرب میں محدود ہے اور نہ کسی قوم و قبیلہ میں محصور ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ لوگ نہ مانیں، مخالفت کریں تو یہ خود ان لوگوں کا قصور ہے، کوتاہی ہے، ناعاقبت اندیشی ہے۔ مالک حقیقی نے اپنی ربوبیت کی ذمہ داری پر ان کی سلامتی و کامیابی کا مکمل و مستحکم و جامع انتظام کر دیا ہے جو ہر زمانے کے لئے ہے تاکہ بندوں کو شکایت کا موقع نہ رہے۔

بہرحال یہ فرق واضح ہوگیا کہ اسلامی مملکت اور مسلمان مملکت میں فرق ہے۔ اسلامی حکمراں اور ہے مسلمان حکمراں اور، دونوں میں بڑا فرق ہے جنہوں نے اسی فرق کو نظرانداز کر دیا۔ انہوں نے ظالم و جابر، فاسق و فاجر، غیر متشرع و غیر متدین مسلمان بادشاہوں کے کردار کو، بے اعتدالیوں کو، اسلام کی طرف منسوب کر کے بڑا ظلم کیا ہے بڑا غضب کیا ہے اسلام اور اہل اسلام کی توہین اور تضحیک کا موقع فراہم کیا ہے اور یہ خیانت ہے، خلاف دیانت ہے، قابل مواخذہ ہے۔ خدا و رسول و امام ہدیٰ کے بعد عالم فقیہ کے متعلق ایک جملہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اگر کوئی غیر معصوم سے عصمت کا مطالبہ کرے تو ظاہر ہے کہ یہ غلط اور بے سود ہے۔ فقیہ نہ معصوم ہے نہ سہو و خطا سے بری، اس میں عصمت تلاش کرنا خود خطا ہے، جبکہ فقہاء مخطئہ ہونے کے خود معترف ہیں۔ پس معصوم کے بعد سوائے فقیہ اعرف و اعلم و افقہ و اورع و اتقیٰ کی طرف رجوع کرنے کے کوئی چارہ نہیں، اس لئے کہ غیر عالم، غیر عارف، غیر فقیہ، غیر متورع، غیر متقی، غیر محتاط کی طرف رجوع کرنا مذموم ہے، قبیح ہے، حرام ہے۔ پس جب احکام شرعیہ اسلامیہ معطل نہیں ہوسکتے اور بندہ مکلف ہے احکام شرعیہ کی پابندی کا، تو لامحالہ عالم دین، حاکم شرع، فقیہ عصر، اعلم و عادل کی طرف رجوع کرنا از بس ضروری ہے، عقلاً بھی

اور شرعاً بھی۔

اسلامی قانون کا نفاذ اور عدم تشدد:

قانون الٰہی جو شریعت اسلامیہ ہے خدا کا بنایا ہوا دستور العمل ہے جس کو قرآن شریف نے پیش کیا ہے اور سنت نبویہ نے اس کی تشریح و تفصیل کی ہے اس کے نفاذ و اجراء کے لیے اقتدار و سلطنت کی ضرورت ہے تاکہ وہ ہر شخص سے حسب حال تعمیل کرائے اور صحیح و غلط عمل کے مطابق جزاء و سزا دے تاکہ امن برقرار رہے، معاشرہ خوشگوار رہے، لوگ امن و سلامتی کے ساتھ ترقی کریں اور دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کریں۔

یہاں اقتدار و حکومت و سلطنت سے یہ شبہ نہ ہونا چاہئیے کہ زبردستی لوگوں کو مسلمان بنایا جائے یا لوگوں کو ان کے مذہب بدلنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ یا زبردستی کسی پر چڑھ دوڑا جائے اور ان سے ان کا دین ترک کرایا جائے۔ ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہے اور اسلام میں کوئی ایسا قانون نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ

الناس مسلّطون علیٰ اموالهم۔

انسان اپنے مال کا مالک ہے اسے بغیر اس کی مرضی کے لینا حرام ہے، گناہ ہے، جرم ہے۔ اور اسلام قبول کرنے کے لیے کسی پر دباؤ ڈالنے کا ہرگز حکم نہیں ہے۔ اسلام قبول کرنا دین و دنیا کی صلاح و فلاح کا سودا ہے۔ اپنی پسند و اختیار کی منزل ہے خوب دیکھ بھال کر جانچ پڑتال کر سمجھ بوجھ کر ہنسی خوشی سے پسند آئے تو قبول کرلو ورنہ:

لکم دینکم ولی دین تمہارا دین تمہارے لیے ہے اور ہمارا دین ہمارے لیے ہے۔

دوسرے مقام پر قرآن پکار پکار کر کہتا ہے:

لا اکراہ فی الدین دیکھو دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔

ہاں خدا نے پیغمبرؐ سے یہ ضرور کہا ہے کہ میرے بندوں تک اسلام کا پیغام یعنی میرا پیام پہنچا دو جس میں دنیا و آخرت کی سلامتی و کامیابی کا مژدہ ہے، حق و صداقت کا پیغام ہے پہنچا دو "وما علی الرسول الا البلاغ" اور بس رسول کے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے۔ اب لوگ مانیں چاہیں نہ مانیں وہ جانیں

انکا کام جانتے تاکہ کل یہ نہ کہیں کہ خدا نے ہمیں ہدایت نہ کی اگر وہ ہماری رہنمائی کرتا تو ہم گمراہ نہ ہوتے، تو اس نے اتمام حجت کے لیے اپنا پیغام پہنچا دیا لیکن زبردستی منوایا نہیں۔

لیکن افسوس بر حال معاندین کہ بلا کسی تعارض کے صرف حق کی آواز بلند کرنا گوارا نہ کیا انبیاء کو اوصیاؑ وائمہ کو علماء و فقہا کو کیا کیا قربانیاں دینی پڑی ہیں اور اب بھی کیا کیا قربانیاں دینی پڑ رہی ہیں اور انھیں کس کس طرح ستایا جاتا ہے اور ان پر کیسے کیسے جھوٹے الزامات لگائے جاتے ہیں اور کتنے غلط قسم کے پروپیگنڈے کرتے رہے ہیں جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ یہ کسی صاحب نظر باخبر شخص سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن الحق یعلو ولا یعلیٰ۔ حق غالب رہے گا حق مغلوب نہیں ہو سکتا۔ یہ کیوں ایسا ہوتا ہے، اس لئے کہ ہر باطل کو خطرہ ہوتا ہے وہ خوف زدہ ہوتے ہیں کہ کہیں حق ہم پر غالب آجائے، ہمارے ذاتی مفاد کو ٹھیس نہ لگے ہمارے فاسد اغراض ادھورے نہ رہ جائیں ہمارا اقتدار ہم سے چھین نہ جائے۔ چونکہ باطل حق سے نبرد آزما ہے اور وہ خود حق کو سے برسر پیکار ہیں اس لیے رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ ایک موقع پر ارشاد باری ہے:

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم (الانعام/۱۰۹)

(یعنی) تم انھیں برا بھی مت کہو جن کو وہ لوگ پکارتے ہیں، مانتے ہیں، جو خدا کے علاوہ ہیں، ورنہ وہ دشمنی میں خدا کو برا کہہ بیٹھیں گے۔

تو جب ان کے بتوں کو برا کہنے کو منع کیا گیا ہے تاکہ ان کے پجاریوں کی دل آزاری نہ ہو تو پھر ان پر سختی کیونکر روا رکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے مقام پر ہے:

قل اتحاجوننا فی اللہ وھو ربنا وربکم ولنا اعمالنا ولکم اعمالکم ونحن لہ مخلصون۔ (سورۃ البقرہ/۱۳۹)

(یعنی) اے رسول کہدو کہ کیا اللہ کے بارے میں تم ہم سے حجت کرتے ہو حالانکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے تمہارا بھی پروردگار ہے ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں، ہم تو اسی سے خلوص رکھنے والے ہیں۔

دیکھیے کتنا صلح جو امن آگیں پیغام ہے۔ کہیں سے خفیف سا دباؤ کا شائبہ پایا جاتا ہے؟

حق کا پیغام سن لو، نہیں مانتے مرضی تمہاری، مگر چین سے رہو، چین سے رہنے دو۔ خود بھی جیو، دوسروں کو بھی جینے دو۔ پیغمبر اسلام محسن انسانیت فرماتے ہیں کہ:

لاضرر ولاضرار فی الدین

یعنی دین میں نہ خود نقصان اٹھانا ہے نہ دوسروں کو نقصان پہنچانا ہے۔

یہ ہے اسلام کا طرز عمل و طریقہ کار جس پر بانیٔ اسلام اور ان کے حقیقی نائبین ہمیشہ گامزن رہے اور ان کے فرمان کے صحیح ترجمان فقہاء زماں صاحبان عمل و عرفان علماء کرام ان کے جانشین خاص و عام ہمیشہ اسی پر عملدرآمد کرتے رہے ہیں۔ پس ایسی مملکت اسلامیہ جہاں احکام اسلامیہ صحیح نافذ ہوں اور اس کے حکمراں قول و عمل کے اعتبار سے حقیقتاً حق نمائندگی ادا کرتے ہوں اور بقدر استطاعت حسب حال فرمان الٰہی جاری کرتے ہوں وہ اسلامی فرماں روا ہیں اور ان کی حکومت اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق ہے۔ جہاں اسلام کا حاکم بھی اسلام کے احکام پر عمل کرتا ہو اور محکوم بھی۔ حاکم و محکوم دونوں تابعدار ہیں۔ نہ راعی مستثنیٰ نہ رعایا مستثنیٰ ہے فرمانروا بھی مسئول ہے، فرماں بردار بھی مسئول ہے۔

مملکت اسلامیہ میں جتنے بھی مذاہب کے ماننے والے ہیں، ان سب کے لئے امن و امان ہے نہ ان کے دنیاوی معاملات میں رکاوٹ کی جائے گی نہ ان کے دینی عبادات میں رکاوٹ کی جائے گی۔ ان پر کسی قسم کا ظلم و زیادتی اور دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا۔ انھیں پوری پوری آزادی ہے۔ غیر مسلم باشندہ کو کافر ذمی اسی لیے کہتے ہیں کہ اسلامی فرمانروا ان کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کا ذمہ دار ہے، بشرطیکہ ایسے جرائم کا ارتکاب نہ کرے جو نقض امن اور دوسروں کے عسر و حرج، ضرر و نقصان کا باعث ہو۔ اگر ایسا کرے گا تو مجرم ہے، سزا کے قابل ہے اسمیں مسلم و غیر مسلم کا کوئی سوال نہیں۔ چونکہ سزا جرم کی وجہ سے دی جا رہی ہے نہ کہ مذہب کی وجہ سے۔ حکومت اسلامیہ کا جو بھی باشندہ خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم جرم و جنایت کے بدلے میں برابر سزا پائے گا۔ چونکہ ملک کے تمام باشندے برابر ہیں اور ان سب کی نگہداشت کرنا اور انکی داد و فریاد سننا اور انصاف کرنا اور اچھے برے کام کے لحاظ سے جزا و سزا دینا حکومت اسلامیہ کے حکمراں کا اولین فرض ہے۔ بہر حال جرم کا مرتکب مجرم ہے چاہے کافر ہو یا مسلم۔ اگر مجرم کو جرم کی سزا نہ دی جائے تو اس کی حوصلہ افزائی ہو۔

آج دنیا میں جہاں جہاں سے سزا اٹھا دی گئی ہے یا تخفیف سزا کی مہم چلا کر، سزا کو قید یا جرمانہ سے تبدیل کیا گیا ہے یہ خواہ رقت قلبی و ترحم کے جذبہ سے ہو یا پھر "میں تجھکو بچاؤں تو مجھ کو

بچاؤ کے تحت ہو تاکہ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر جرائم کو فروغ دیا جائے۔ پس جہاں جہاں ایسا ہوا ہے کہ مجرم کو معاف کیا گیا ہے یا سزا میں تخفیف کی گئی ہے یا سزا کو معمولی قید و جرمانہ سے بدل دیا گیا ہے وہاں وہاں آپ دیکھئے جرائم نے ایک طوفان کی شکل اختیار کرلی ہے اور ایک سیلاب کی طرح امڈ پڑا ہے جس نے پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ جرائم پیشہ ارباب حکومت کا ناطقہ بند کئے ہوئے ہیں۔ انسداد جرم ارباب اقتدار کے بس سے باہر ہے۔ جرائم روز بروز کم ہونے کے بجائے زیادہ سے زیادہ بڑھ رہے ہیں، قتل و غارت کا بازار دن دھاڑے گرم ہے اور قانون کے محافظ تماشائی بنے دیکھ رہے ہیں، یہ ہے بے بسی کا عالم۔

اسلام کا معجز نما طریقہ، انسداد جرم۔

لیکن اسلام نے انسداد جرم کا جو موقف اختیار کیا ہے وہ نہایت حیرت انگیز ہے جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اسلام کی بالادستی ماننا پڑتی ہے کہ اسلام کی رسائی عقل سے بالاتر ہے۔

چنانچہ اولاً تو اسلام نے بغیر کسی رو رعایت کے مجرم کے جرم کی سزا قرار دی جو اتنی عبرتناک و متاثر کن ثابت ہوئی کہ مجرموں کے حوصلے پست ہوگئے اور جرائم پیشہ انجام جرم دیکھ کر اقدام جرم سے باز آگئے اور عدم تخصیص یگانہ و بیگانہ نے ہر ایک کے حواس ٹھکانے کر دئے ہیں۔

ثانیاً اسلام نے اسباب جرم کو ختم کر کے جرم کو ختم کر دیا اور جرم کو ختم کر کے مجرم کو ختم کر دیا۔ ارض ہستی کو جرم و مجرم سے پاک کر دیا۔

اسباب جرائم کیا ہیں؟ چوری کا سبب حرص و افلاس، قتل کا سبب غیظ و غضب، بغض و حسد اور زنا کا سبب بے حیائی و شہوت، خیانت کا سبب کاہلی وغیرہ غرض کہ ہر جرم کا کوئی نہ کوئی سبب ہے اور وہی اس کی جڑ ہے۔ اسلام نے تعلیم و تربیت اور وعظ و نصیحت کر کے انسان کے نفس کا تزکیہ کیا۔ دل و دماغ کا تصفیہ کیا اور کمال علم و حسن عمل اور زیور معرفت سے اس طرح آراستہ کیا کہ اسباب خیر و برکت و ثواب کا خوگر ہوگیا اور اسباب نحوست و شر و عذاب سے متنفر و دور ہوگیا۔ اس طرح جرائم کی جڑیں کاٹ دیں اور جب جڑیں کٹ گئیں تو جرائم کٹ گئے اور جب جرائم کٹ گئے تو مجرم کا

وجود نہ رہا۔ اب سرزمین ہستی پر نہ جرم رہا نہ مجرم رہے۔ یہ ہے اسلامی حکمت عملی اسلامی حسن تدبر اسلامی طریقہ کار جو نفسیاتی طور سے ہر طرح کامیاب ہے۔ یعنی شدت نفرت سے تصور و خیال تک گناہ سمجھنے لگا تو پھر ارتکاب کیونکر کرسکتا ہے۔

پس ایک مسلمان جو حکومت الٰہیہ کا فرمانبردار وفادار ایماندار ہے اس کا نصب العین اور اس کا طرز عمل بس یہی ہوگا۔ کہ — انّ صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین (سورہ الانعام/۱۶۲)

میری نماز میری عبادت میری موت میری حیات سب خدا کے لئے ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔

اسلامی، علمی، فکری دوماہی رسالہ

جلد ۳، شمارہ ۴،

ترتیب

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس ۵۹۷
قم، جمہوری اسلامی ایران
فون : ۲۴۵۸۴

ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ / اگست، ستمبر ۱۹۸۶ء

فکر و فلسفہ

قانون
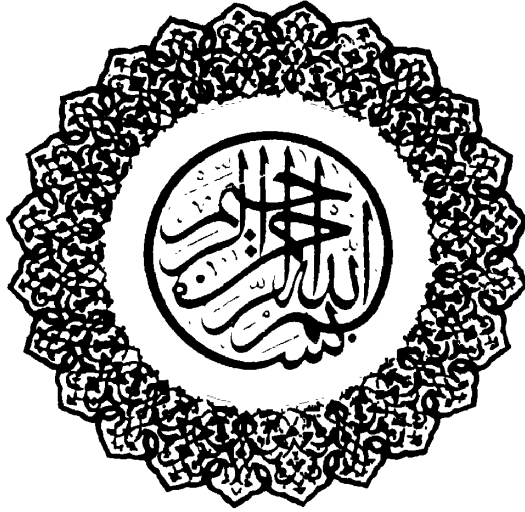
- ادارے کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں
- مندرجات توحید نقل کرنے کی اجازت ہے لیکن توحید کا حوالہ ضروری ہے۔

شذرہ

حج عبادت و سیاست کا حسین امتزاج

حج فروعِ دین کا ایک اہم اور اساسی جزو ہے، عبادتوں میں یہ امتیاز صرف حج کو حاصل ہے کہ قرآن مجید کا پورا ایک سورہ اس کے نام سے موسوم ہے۔ قرآن میں یہ لفظ مختلف مناسبتوں سے دس مرتبہ ذکر ہوا ہے۔ نو مرتبہ "حَج" اور ایک مرتبہ "حج البیت"۔

حَج، قصد زیارت ہے اور "حج" نتیجۂ قصد یعنی زیارت مقصودہ، لوگوں پر جو چیز واجب ہے وہ "حج البیت" زیارت مقصودہ ہے، نہ صرف قصد زیارت کافی ہے اور نہ زیارت بغیر عزم و ارادہ۔

○

موسم حج کی آمد آمد ہے، اسلامیان عالم دنیا کے گوشہ گوشہ سے کوئی محبوب کی طرف رواں دواں ہیں، کچھ پہنچ چکے ہیں، کچھ راہ میں ہیں اور کچھ "سیر الی اللہ" کے لئے خود کو تیار کر رہے ہیں۔

حج، یوں تو ہمیشہ ہی سے مسلمانوں کے درمیان موضوع بحث رہا ہے لیکن اسلامی انقلاب کی کامیابی اور انقلابی مسلمانوں کے ذریعہ اعمال و مناسک حج میں ایک نئی جان پڑ جانے کے بعد بیش از بیش موضوع سخن بن گیا ہے مسلمان خود اپنے آپ سے بھی اور ایک دوسرے سے بھی یہ سوال کرتے ہیں کہ حج کیا ہے؟ بارگاہ ربوبیت میں صرف تضرع و زاری اور راز و نیاز کا نام ہے یا سعی و طواف کے ساتھ ساتھ سیاسی و معاشرتی امور کی جانب توجہ بھی ضروری ہے؟

خدائے علیم و حکیم نے مرد عورت، بوڑھے، جوان ہر مستطیع پر صرف اس لئے حج واجب کیا ہے کہ وہ

ایک خاص مقام پر جمع ہو کر اس کی عبادت کریں، اس کی بارگاہ میں رو میں گڑگڑائیں اور اپنے رکوع و سجود اور مقام و قعود نیز طواف و سعی کا نذرانہ پیش کریں اور بس، یا ان اعمال کے شانہ بشانہ مسلمانوں کے عالمی مسائل پر غور و خوض، ان کے دکھ درد کے علاج کے لئے سوچ بچار، دشمنان اسلام کی سازشوں کا جائزہ اور اس کے مقابلہ کے لئے مل جل کر منصوبہ سازی نیز ان کے خلاف عملی اقدامات کا مظاہرہ بھی واجب و لازم ہے ؟

ہمیں کسی الٰہی حکم و قانون کے سلسلہ میں اپنی ذاتی رائے اور نظریہ کو شامل کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہم خدا کو وحدہ لاشریک اور حکیم و علیم مانتے ہیں اور صرف بندے ہیں، جن کا فریضہ احکام الٰہی کو اچھی طرح سمجھ کر اس کا بے چون و چرا نفاذ ہے، لہٰذا اس سوال کا جواب خدا اور اس کے معین کردہ نمائندوں کے ارشادات میں تلاش کرنا ہوگا۔ افسوس کہ موضوع وسیع ہے گنجائش کم۔ کیونکہ یہ "شذرہ" ہے تفصیلی مقالہ نہیں۔ لہٰذا ہم دریا کو کوزے میں سمونے کی کوشش کرتے ہوئے نہایت اختصار سے کام لیں گے۔

○

اسلامی مآخذ و مصادر کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یوں تو اسلام کی جملہ عبادتوں میں سیاسی و معاشرتی پہلو پائے جاتے ہیں لیکن حج میں یہ جنبہ بہت نمایاں ہے۔ نماز یومیہ (با جماعت) ایک محلہ کے مسلمانوں کے باہمی اجتماع کا ذریعہ ہے۔ نماز جمعہ ایک شہر کے مسلمانوں کے اجتماع کا موقع فراہم کرتی ہے اور حج دنیا کے گوشہ گوشہ کے خوشحال و صحت مند مسلمانوں کی سالانہ کانفرنس ہے، تاکہ ایک الٰہی مرکز پر جمع ہو کر روحانی و عبادی فضا میں مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ لیں، الٰہی اقتدار کے سایہ میں مستکبروں کی شیطانی طاقتوں کے خوف و ہراس سے آزاد ہو کر لائحہ عمل تیار کریں، رب العزت کا ارشاد ہے:

جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس

اللہ نے کعبہ کو تمہاری بقاء کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کی بقا کا دار و مدار کعبہ پر ہے، اگر کعبہ سے صحیح استفادہ نہ کیا گیا تو مسلمان فنا ہو جائیں گے۔

قرآن مجید میں لفظ "قیام" "جعل" کے ساتھ صرف دو مقام پر آیا ہے ایک اسی آیت میں اور

دوسرے سورۂ نساء کی چوتھی آیت میں :

ولا تؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاماً

اپنے مال کو جسے خداوند عالم نے تمہاری بقاء کا ذریعہ بنایا ہے، نادانوں کے حوالے مت کرو۔

دونوں آیتوں میں "قیاماً" سے مراد سبب بقاء و مایۂ زیست ہے، لہٰذا آیۂ شریفہ کا مطلب یہ ہوگا کہ حج، زیارت کعبہ اور خانۂ خدا میں حاضری اسلامی معاشرہ کی دنیوی و اخروی بقاء و نجات کا ضامن ہے۔ موسم حج میں مسلمانوں کا اجتماع صرف ان کی اخروی زندگی ہی کو نہیں سنوارتا بلکہ ان تمام عناصر کے ارتقاء و بقاء کا باعث ہے جو ہماری فردی و اجتماعی زندگی میں دخیل ہیں۔

آیۂ شریفہ میں غور و خوض ہمیں اس عظیم معنی کی طرف ہدایت کرتا ہے کہ جن چیزوں کا مسلمانوں کے مفادات و مصالح سے ارتباط ہے وہ سب حج میں حاصل ہوتی ہیں، ہمارے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں جس کے سہارے ہم اس آیت کے اطلاق کو صرف مروجہ عبادت و پرستش میں مقید و منحصر کر سکیں، لہٰذا اطلاق پر عمل کرنے پر مجبور ہیں۔

کون سی مصلحت اس سیاسی عمل سے بڑھ کر ہوگی جو مسلمانوں کو متحد کر کے استعمار و استحصال کے مقابلے میں سیسہ پلائی دیوار کے مانند کھڑا کر دے۔ بحکم قرآن ہے کہ اپنے مال کو جو تمہاری بقاء کا ذریعہ ہے، سفیہوں اور نادانوں کے سپرد مت کرو، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اعمال و موسم حج ان لوگوں کے سپرد کر دیا جائے جو اس سے ناواقف ہیں اور مسلمانوں کی زندگی میں اس کے اہم کردار سے غافل ہیں۔

انصاف کیجئے کیا اس دور کا یہ حج جس کا حکم سعودی فرمانروا دے رہے ہیں کہ حجاج خاموشی کے ساتھ نماز و طواف میں مشغول رہیں، ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں سے تعلق و ارتباط استوار نہ کریں، ایک دوسرے کے دکھ درد نہ سنیں، اپنے مشترکہ دشمنوں کے خلاف زبان نہ کھولیں۔ اسلام کے درپے دشمنوں کے جرائم کا تذکرہ نہ کریں۔ بحکم قرآن :

لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین آمنوا الیہود والذین اشرکوا

مومنوں کے سخت ترین و دیرینہ دشمن یہودیوں اور مشرکوں کے انسانیت سوز مظالم یاد نہ دلائیں

کیا ایسا حج "قیاماً للناس" کا مصداق بن سکتا ہے؟ ایسا حج سبب بقاء مسلمین کہلانے کا مستحق ہے یا باعث زوال مسلمین کہے جانے کا ؟

○

قرآن مجید ایک مقام پر حج ابراہیمی کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :

وَاَذِّن فِی النَّاسِ بِالحَجِّ یَأتُوكَ رِجَالاً وَعَلیٰ كُلِّ ضَامِرٍ یَأتِینَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِیقٍ لِیَشهَدُوا مَنَافِعَ لَهُم۔

لوگوں کو حج کی دعوت دے دو کہ وہ سوار و پیادہ دور و نزدیک سے آئیں تاکہ اپنے فائدوں کا مشاہدہ اور اسے حاصل کریں۔

یہ مفادات کیا ہیں جن کے حصول و مشاہدہ کے لئے دعوت حج دی جا رہی ہے کیا اس سے مراد کچھ خاص اور معین منافع ہیں یا مطلق یا ہر قسم کا منافع ؟

چند نکات پر غور کیجئے بات واضح ہو جائے گی۔

• "لیشہدوا منافع لھم" "ویذکروا اسم اللہ" کے مقابلہ میں بیان ہوا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حج دو پہلوؤں کا حامل ہے ۱۔ عبادی جو یاد و ذکر الٰہی میں جلوہ گر ہے۔ ۲۔ معاشرتی و سیاسی جو مشاہدہ منافع میں نمایاں ہے۔

• لفظ منافع بطور مطلق ذکر ہوا ہے کسی قسم کی قید نہیں لہٰذا اس میں ہر قسم کا منافع شامل ہے۔ اقتصادی ہو یا سیاسی، علمی ہو یا معاشرتی۔ ہمیں یہ حق نہیں کہ اس کو کسی خاص منفعت میں محدود کر دیں مد مقابل جملہ " ویذکروا اسم اللہ " قرینہ ہے کہ منافع میں عبادت کے سوا کچھ اور بھی چیزیں شامل ہیں اسے محض دعا و نماز و طواف میں مقید کرنا کج اندیشی یا خیانت و تحریف ہے۔ ان آیات کے ذیل میں شیعہ و سنی مفکرین و مفسرین نے بھی حج کے سیاسی و اقتصادی و معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے حصول کی تاکید کی ہے۔

○

آیات کے علاوہ خود پیغمبر اسلام کا عمل بھی گواہ ہے کہ حج محض چند عبادی اعمال و مناسک کا نام نہیں۔ پیغمبر اسلام نے حج کے دوران حضرت علیؑ کو سورہ توبہ کی تلاوت اور کفار و مشرکین سے برائت و

وبیزاری کے اعلان کا حکم دیا۔
فتح مکہ کے موقع پر فریضۂ حج کی ادائیگی کے دوران مسلمانوں کو یہ نعرہ لگانے کا حکم دیا گیا:

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ولہ الملک ولہ الحمد ویحیی ویمیت وھو علی کل شیئ قدیر، لا الہ الا اللہ وحدہ وحدہ وحدہ انجز وعدہ و نصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ

معبود صرف اللہ ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ حق حکومت صرف اسی کو ہے، تمام تعریفوں کا وہی مستحق ہے۔ وہی مارتا ہے اور جلاتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ وہ وحید و فرید و یکتا ہے، اس نے اپنے وعدہ کو پورا کر دیا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلے ہی شرک کے متحدہ محاذ کو تہس نہس کر دیا۔

دوران حج مسجد الحرام میں پیغمبر اکرمؐ کا خطبہ بھی قابل غور ہے۔ مسجد الحرام انسانوں سے چھلک رہی ہے۔ مسلمان و مشرک، دوست و دشمن سب اکٹھا ہیں۔ ایسے میں پیغمبر اسلامؐ خطبہ کا آغاز کرتے ہیں اور اپنی تحریک کا مقصد بیان کرتے ہیں۔ حضرتؐ نے اس خطبہ میں جاہلیت کے بے جا تفاخر اور نسلی برتری پر کاری ضرب لگائی انسانوں کی وحدت و مساوات کا سبق دیا، معیار برتری، تقویٰ و پرہیزگاری بتایا، عصر جاہلیت میں بہائے گئے خون اور مالی وجانی دعوؤں کے کالعدم قرار دیے جانے کا اعلان کیا، مسلمان کو مسلمان کا بھائی بتایا، اپنے بعد مسلمانوں کو انحراف و اختلاف سے خبردار کیا اور ایک دوسرے کی جان و مال کے احترام کا سبق دیا۔

کربلا جانے سے پہلے مکۂ معظمہ میں سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کا خطبہ بھی بہترین سند ہے۔ حضرتؑ نے حاجیوں کے جم غفیر میں مناسک حج کے دوران حاکم جور یزید کی اسلام دشمنی کا پردہ چاک کر کے مسلمانوں کو تحفظ اسلام کے لیے دعوت قیام دی۔

ائمہ معصومینؑ سے بھی ایسی بہت سی حدیثیں نقل ہوئی ہیں، جن میں حکمت و فلسفہ حج سے بحث ہوئی ہے ان میں اکثر روایتوں میں حج کے سیاسی و معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ملتی ہے، علل الشرائع

وعیون اخبار الرضا میں فضل بن شاذان وہشام بن الحکم وغیرہ کے توسط سے نقل ہونے والی احادیث میں واضح اشارہ ملتا ہے کہ حج کا مقصد عبادی جہات کے علاوہ اقتصادی وسیاسی منافع کا حصول بھی ہے، امام رضاؑ علیہ السلام حکمت وفلسفہ حج بیان کرتے ہوئے ایک حدیث میں فرماتے ہیں کہ حج کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ اسلامیان عالم شرق وغرب سے ایک مرکز پر جمع ہو کر ایک دوسرے سے آشنا ہوں، آپس میں اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی مسائل پر گفتگو اور اس سے متعلق منافع حاصل کریں۔ دردبیان اور اس کا درمان تلاش کریں۔

ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ مشرق ومغرب میں بسنے والی پوری دنیا کے لئے حج میں فائدہ ہے، جو لوگ حج سے مشرف ہوئے ان کے لئے بھی اور جو اس سعادت سے محروم رہے ان کے لئے بھی۔

مقصد یہ ہے کہ حج ایک ایسا مرکز ہے جہاں مسلمین ایک دوسرے کے حالات وامکانات ووسائل سے آگاہ ہوں گے، کفار سے تجارتی معاہدوں کے بجائے خود آپس میں لین دین کریں گے اور اس طرح اسلامی مشترکہ منڈی وجود میں آئے گی۔ علم وتعلیم کی دولت سے مالامال ترقی یافتہ ملک واے اپنے پسماندہ بھائیوں کی حالت سے باخبر ہو کر انھیں فکری مدد پہنچانے کے لئے اپنے مسلمان انجینئر، ڈاکٹر اور ٹیچر وغیرہ بھیجیں گے یوں ثقافتی تعاون کو فروغ ملے گا۔ ظالم وستمگر حکومت کے چنگل میں اسیر بھائیوں کے حالات سے واقف ہو کر ان کی آزادی کے لئے سیاسی وعسکری لائحہ عمل تیار کریں گے۔ اس وقت نہ افغانستان سفاک کیمونسٹوں کی جارحیت کا نشانہ بنے گا اور نہ مظلوم فلسطین صیہونی درندوں کے ظلم وستم کا تختۂ مشق بنے گا، یہی مقصد ہے معصومؑ کے اس ارشاد کا:

... مع ما فی ذالك لجمیع الخلق من المنافع لجمیع من فی شرق الارض وغربها ومن البر والبحر ممن یحج وممن لم یحج ....

اگر حج کو صرف ذکر وورد میں محصور کر دیا جائے تو معصومؑ کے یہ کلمات بے معنی ہوں گے، حج سے مشرف اور حج سے محروم دونوں مستفید نہ ہو سکیں گے۔ حج سے محروم افراد اسی وقت مستفید ہو سکتے ہیں جب حج کے سیاسی ومعاشرتی پہلوؤں پر توجہ دی جائے ورنہ دوسروں کے ذکر وورد سے انھیں کیا فائدہ ہوگا؟ لہٰذا یہ کہنا پڑے گا کہ حج نہ صرف عبادت ہے اور نہ محض سیاست، بلکہ اس میں عبادت وسیاست کا حسین امتزاج ہے۔

- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

حَافِظُوا
عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝
فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اٰمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا
اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ:
تمام نمازوں کی حفاظت کرو اور (خاص طور سے) بیچ والی نماز کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے قنوت گذار بن کر کھڑے ہو (۲۳۸) پھر اگر خوف زدہ ہو (جنگ میں) تو پیدل یا سوار (حالت میں) نماز ادا کرو۔ اور جب امن میں ہو تو اللہ تعالیٰ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا جسے تم نا واقف تھے (۲۳۹)

تفسیر:

۲۳۸۔ حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰةِ ....

قرآنِ مجید کا انداز بیان صرف اسی کے ساتھ مخصوص ہے، یہ اسلوب بذات خود معجزہ ہے۔ نکاح و طلاق و مہر کے مسائل بیان کرتے کرتے نماز کی اہمیت کا تذکرہ ہدایت آفریں بھی ہے اور اس عبادت کو کسی حال میں بھی فراموش نہ کرنے کی تاکید۔ ہر نماز کے وقت، آداب، شرائط اور پابندی کا دھیان رہے خصوصاً "صلوٰۃ وسطیٰ" کے لیے اہتمام رکھو۔ اکثر روایات اہل بیتؑ میں صلوٰۃ وسطیٰ کے معنی نماز ظہر بتائے گئے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت جمعہ کے دن نازل ہوئی اور آنحضرتؐ نے اس کے بعد نماز جمعہ پڑھی جس میں قنوت بھی ادا کیا۔

۲۳۹۔ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا ....

انتہائی خوف و جنگ میں بھی نماز ترک نہیں کی جا سکتی، سفر میں چار رکعتی نماز دو رکعت اور بحالت جنگ نماز خوف یہ ہے کہ دشمن اگر سمت قبلہ کے مخالف رخ پر ہے تو مسلمان سپاہی

دو ٹکڑیوں میں بانٹے جائیں (بشرط امکان) ایک ٹکڑی دشمن کو دیکھتی اور نمازیوں کی حفاظت کرتی رہے دوسری ٹکڑی امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر دوسری رکعت بہ تخفیف فرادیٰ پڑھ لے، امام دوسری رکعت میں دوسری ٹکڑی کا انتظار کرے۔ پہلی ٹکڑی حفاظتی پوزیشن سنبھال لے اور دوسری ٹکڑی امام کی دوسری رکعت میں شریک ہو کر اپنی پہلی رکعت جماعت سے ادا کر کے دوسری رکعت فرادیٰ بہ تخفیف پڑھے اور امام تشہد میں انتظار کرے یہ لوگ دوسری رکعت کے تشہد میں امام کے ساتھ شریک ہو کر نماز تمام کریں۔ نماز مغرب کا طریقہ یہ ہے کہ امام پہلی ٹکڑی کو ایک رکعت پڑھا کر انتظار میں کھڑا رہے اور نمازی باقی دو رکعتیں پڑھ کر اپنی پوزیشن پر چلے جائیں اور دوسرا دستہ دوسری تیسری رکعت میں پہلی دوسری رکعت ادا کر کے تیسری کو بہ تخفیف فرادیٰ پڑھ کر تشہد و سلام امام کے ساتھ بجالائے۔ اگر دشمن، چور، ڈاکو اور صحرائی جانوروں کا خطرہ یہ طریقہ نہ برتنے دے اور کوئی راہ نہ ہو تو ممکن حد تک رو بقبلہ ہو کر نماز شروع کر دے، رکوع و سجود کے لیے اشارہ کرے، یہ بھی ممکن نہ ہو تو چار رکعتی کے لیے دو رکعت اور ہر رکعت کے لیے ایک تکبیر کہے۔ مغرب کے لیے تین تکبیریں۔ اور ہر تکبیر میں یہ کہے سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر یہ نماز سواری میں بھی ہو سکتی ہے اور پیدل بھی۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ

مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا

إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا

فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ كَذَٰلِكَ

يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝

ترجمہ:

اور تم میں سے جو لوگ مرنے کے قریب ہوں اور اپنے بعد بیویاں چھوڑیں۔ ان پر لازم ہے کہ اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک نفقہ دیتے اور گھروں سے نکالنے کی (وراثہ کی) وصیت کریں۔ پھر اگر وہ خود سے جائیں تو وہ عورتیں اپنے بارے میں قاعدے کی بات (نکاح) کریں تم پر اس کا کوئی گناہ (بوجھ) نہیں اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے (۲۴۰) اور جن عورتوں کو (بغیر مہر طے کیے اور ہم بستری کیے) طلاق دی جائے ان کو دستور کے مطابق کچھ دینا، متقی لوگوں پر حق ہے (۲۴۱)
اس طرح اللہ تم لوگوں کو صاف صاف اپنے احکام تبلاتا ہے (۲۴۲)

تفسیر:

۲۴۰۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رشتہ کا احترام اور عائلی ڈھانچہ کی اہمیت کے پیش نظر وقت وفات جو وصیتیں کی جائیں ان میں اس شریک حیات کو فراموش نہ کرنا چاہیے جس سے محبت کے پیمان کیے تھے اور وصیت یہ ہو کہ اس غم نصیب کو سال بھر تک گھر میں رہنے کی اجازت دی جائے۔ ہاں، اگر وہ خود اپنے لیے دوسرا گھر آباد کرنا پسند کرے تو رکاوٹ نہ ڈالی جائے، دستور و شریعت کے مطابق اسے یہ حق حاصل ہے اللہ کی حکمت و قدرت کا تعین رکھنا چاہیئے۔

۲۴۱۔ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مطلقہ عورتوں کے بارے میں دوبارہ حسن سلوک اور مالی کمک کی بات عورتوں کے احترام و نگہداشت کی اہمیت ثابت کرتی ہے اور اس اہمیت کو متقی لوگوں پر حق بتایا گیا ہے۔

۲۴۲۔ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسلامی فکر و ادراک کے لیے قرآن میں معجز نما آیات و ہدایات بیان کر کے اللہ نے اپنی حجت تمام کر دی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

ترجمہ:

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (اس قوم کی تاریخ پر توجہ نہیں) جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے تھے اور وہ ہزاروں تھے۔ تو اللہ نے ان سے فرمایا: مرجاؤ! پھر خدا نے انھیں زندہ کیا۔ بے شک اللہ، انسانوں پر فضل و کرم فرماتا ہے مگر زیادہ لوگ شکر ادا نہیں کرتے ﴿۲۴۳﴾

تفسیر:

موت سے ڈرنا مومن کا شیوہ نہیں ہے۔ دین کو جب قربانی کی ضرورت پڑجاتی ہے تو جہاد کا حکم دیا جاتا ہے۔ حکم جہاد کے بعد پس و پیش برا ہے۔ گذشتہ زمانے میں ایک قوم پر ایسا ہی وقت پڑ گیا تھا، نبی نے فرمایا، جنگ کرو۔ قوم نے سوچا، جان بچاؤ، یہ سوچ کر ہزاروں افراد گھر چھوڑ کر شہر یا بستی سے بھاگے، مگر سب کے سب راستے میں لقمۂ اجل ہو گئے، اللہ کے حکم سے کون بچ سکتا ہے، موت کا جو وقت اس نے مقرر کر دیا ہے اسے ٹالنا ممکن نہیں۔ کچھ دنوں بعد نبی نے دعا فرمائی۔ اللہ نے ان سب کو زندہ کیا۔

یہ نبی حزقیل تھے، یا کوئی اور قرآن مجید نے نبی کا نام اور جزئیات کو چھوڑ دیا ہے اس کا مقصد ہدایت ہے کہ شخصی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی و موت۔ اللہ کا فضل و کرم ہر صورت میں بندوں کے شامل حال ہوتا ہے۔ انسان کو ہمہ وقت اس کا شکر بجا لانا اور تعمیل حکم کرنا چاہیے۔

جہاد سے جان بچاؤ گے تو کیا موت تمہیں چھوڑ دے گی۔ موت کو حیات اور زندگی کو موت میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اگر وہ جان مانگتا ہے تو عذر کیوں ہے، اسی کی امانت ہے اسے واپس کر دو۔ وہ اس کا صلہ دے گا، اور تم بندگی کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤ گے۔ لوگوں کی چہ میگوئیاں اور اکثریت کی رائے پر نہ جاؤ۔ اکثریت ناشکرے لوگوں کی ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ
اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا
حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ
وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

ترجمہ:

اور تم سب اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان رکھو کہ بلاشک وشبہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے (۲۴۴) کون ہے جو اللہ کو قرض دے: قرض حسن، پھر اللہ اضافہ کر دے اس کے عوض میں بہت بڑھا چڑھا کر اور اللہ (ہی) بڑھاتا بھی ہے گھٹاتا بھی ہے اور اسی کی طرف تم پلٹا دیے جاؤ گے (۲۴۵)

تفسیر:

۲۴۴۔ وقاتلوا فی سبیل اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پہلا واقعہ توجہ دلانے کے لیے تھا اور اب جہاد کا حکم ہے۔ ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جب جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے اس لمحہ اور اس کے نتائج سے اللہ عزاسمہ باخبر ہے۔ اس کے بندوں کو تعمیل میں لیت و لعل کا حق نہیں ہے۔

۲۴۵۔ من ذا الذی یقرض اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جان کی طرح مال بھی عزیز ہے، دولت کا ضیاع ممنوع ہے۔ البتہ جہاد یا حالتِ امن میں جب اللہ کے دین کو ضرورت پڑ جائے تو اسے بچانا جائز نہیں۔ یہ حسنِ کلام خالق فیاض ہے کہ اس نے دین کی راہ اور اسلام کی خاطر (ضروریاتِ جنگ ہوں یا غربا کی خبر گیری) مطالبۂ مال کو قرض فرمایا پھر اس کی واپسی کی یقین دہانی کرائی۔ جس طرح زندگی اس کا عطیہ ہے اسی طرح دولت اسی کی دین ہے۔ وہ جب چاہے اور جسے چاہے دولت دے اور جس کو چاہے بے زر و مفلس کر دے لہٰذا اس کی راہ میں دولت خرچ کرو۔ وہ کئی گنے اضافے کے ساتھ ادا کرے گا: جب اس کی بارگاہ میں جاؤ گے تو بہت بڑا اجر بھی حاصل کرو گے۔

قرضِ حسن: وہ مال ہے جو صرف رضائے خدا کے لیے دستورِ شریعت کے مطابق دیا جائے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِن بَنِي إِسْرَائِيلَ

مِن بَعْدِ مُوسَىٰ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا

نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ

الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ

اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ

الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا

قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ

وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ

مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾

ترجمہ:

کیا تم نے سردارانِ بنی اسرائیل کے اس معاملے پر غور نہیں کیا۔ موسیٰؑ کے بعد جب انھوں نے اپنے نبی سے مطالبہ کیا کہ ہمارے واسطے ایک مَلِک (بادشاہ) مقرر کر دیجیے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ نبیؑ نے کہا، کہیں یہ تو نہ ہوگا کہ تم پر جہاد فرض کیا جائے (اور) تم جنگ نہ کرو۔ انھوں نے کہا: ہمارے پاس کون سا عذر ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں گے۔ حالانکہ ہمیں ہمارے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بچے ہم سے جدا کر دیے گئے ہیں۔ پھر بھی جب ان پر جہاد واجب کیا گیا تو ان میں سے تھوڑے آدمیوں کے علاوہ سب نے روگردانی کی اور اللہ، ظالموں کو خوب جانتا ہے ﴿۲۴۶﴾ اور ان کے نبیؑ نے ان سے کہا: اللہ نے تمھارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: اس کو ہم پر حکمرانی کا حق کہاں سے ملا؟ اس کے مقابلے میں تو ہم حکومت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اس کو تو مالی خوش حالی بھی نہیں دی گئی ہے؟ (نبی نے) کہا: بے شک اللہ نے اسے تم پر فضیلت دی ہے اور اسے علم و جسم میں برتری بخشی ہے اور اللہ اپنا ملک جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی گنجائش والا، واقف کار ہے ﴿۲۴۷﴾ اور ان کے نبی نے ان سے کہا: اس کے (من جانب اللہ) بادشاہ ہونے کی نشانی (معجزہ) یہ ہے کہ تمھارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمھارے پروردگار کی طرف سے تسکین کا سامان ہے۔ اور اولاد موسیٰ

وہارون کا کچھ چھوڑا ہوا سامان ہے۔ اسے ملائکہ اٹھائے ہوں گے۔ بے شک اس بات میں تمہارے لیے معجزہ ہے۔ اگر تم مومن ہو (۲۴۸)

تفسیر:

۲۴۶۔ ألم تر الی الملاء ....

موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل نے کیا کیا ضدیں کی تھیں؟ حضرت کلیم اللہ نے ان کی ہدایت و سربلندی کے لیے کیا کیا دکھ جھیلے؟ سب کچھ بتایا جا چکا۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد اللہ نے انہیں ہادی و رہنما کے بغیر نہ چھوڑا، مگر ان کی عادتیں وہی رہیں اور آج بھی وہ اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد ایک واقعہ یہ ہوا کہ جالوت بنی اسرائیل کا دشمن ہو گیا۔ اس نے اتنا ستایا کہ بنی اسرائیل بے گھر بے در ہو گئے، اور گھبرا کر اپنے نبی کے پاس گئے، مشہور ہے کہ ان کا نام اشموئیل تھا۔ نبی سے کہا، ہم تنگ آچکے ہیں زندگی دوبھر ہو چکی ہے، اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں ایک ایسا قائد عطا کرے جو اس صورت حال سے نجات دلائے، ہم جالوت سے جنگ چاہتے ہیں۔ انھوں نے نفسیاتی طور پر قوم کے نمائندہ وفد کو جھنجھوڑا۔ تم لوگ سوچ لو، ایسا نہ ہو کہ قائد لڑنے کا حکم دے اور تم بھاگ جاؤ۔ وفد نے کہا، جناب والا! کیسی باتیں فرماتے ہیں، گھروں سے نکالے جانے، بیوی بچوں سے بچھڑنے ظلم کی حدیں گذرنے کے بعد بھی جان عزیز رکھی جا سکتی ہے؟ مگر ہوا یہی، جب اللہ نے جہاد کا حکم دیا تو بنی اسرائیل لڑنے کو تیار نہ ہوئے۔ مسلمانوں کو ایسے کردار سے بچنا چاہئے۔ تمہارا نبی مکرمؐ بھی بڑے تاریک دور کے بعد آیا ہے اور تم بھی بے گھر و بے در ہو چکے ہو۔

۲۴۷۔ وقال لھم نبیھم ان اللہ قد بعث ....

نبی نے اپنی حجت تمام کرنے کے بعد خدا سے دعا کی، اللہ نے طالوت کو نامزد کیا، نبی نے قوم کو بشارت سنائی تو ان لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ غریب گھر کا آدمی ہم سرمایہ داروں پر حکمران بنا دیا گیا، لوگ اسے سربراہ کیسے مانیں؟ نبیؑ زمانہ نے فرمایا: خدا کی نگاہ حکمت میں سربراہ کو صاحب علم و قوت ہونا چاہئے۔ طالوت تم سے ان صفات میں افضل ہے اور افضل ہی صاحب حکومت ہے۔

۲۴۸۔ وقال لھم ان آیۃ ملکہ ......

مزید یہ کہ اللہ نے اسے ایک معجزہ سے نوازا ہے اس کے ہاتھوں اللہ تمہیں تابوت سکینہ واپس ولادے گا۔ پھر جب اللہ نے خود کسی کو سربراہی دی ہے تو کسی کو چون و چرا کا جواز کیا ہے۔

"تابوت سکینہ" وہ صندوق جس میں حضرت موسیٰ اور ہارون نیز ان کی اولاد کے تبرکات تھے الواح، تورات کا اصل نسخہ، عصا، من کی بھری ہوئی بوتل اور دوسری تاریخی چیزیں۔ بنی اسرائیل اسے اپنا ذہنی سکون اور مذہبی دستاویز جانتے تھے۔ حضرت طالوت سے پہلے بنی اسرائیل نے اذر الفری میں اس صندوق کو ایک بیل گاڑی پر رکھ کر اصل ٹھکانے سے ہٹا دیا تھا مگر وہ گاڑی ان لوگوں کو نہ مل سکی جس سے یہ لوگ بہت پریشان تھے۔ اللہ فرشتوں کے ذریعہ حضرت طالوت کو وہ صندوق پہنچوا دیا۔ اس کے بعد جس اطمینان قلب کی ضرورت تھی وہ بھی پوری ہو گئی لہٰذا جنگ نہ کرنے کا نفسیاتی پہلو بھی تشنہ رہا۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اللہ کے حکم سے اپنے بعد کے لیے حضرت علیؑ کو سربراہ امت مقرر کیا وہ بھی اسی بنیادی صفت افضلیت سے سرفراز تھے وہ بھی معجز نما تھے، وہ بھی کرامت انبیاء کے امین تھے۔ مگر امت اس بارے میں وہی باتیں کرتی ہے جو گذشتہ دور میں ہوا کرتی تھیں۔ اسی طرف آخر آیت میں اہل ایمان کو متوجہ کیا گیا ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم

مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ
مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا
أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ
الْكَافِرِينَ ۝ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ
وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا
دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ
اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝

ترجمہ:

جب طالوت لشکر کے ساتھ باہر آئے (تو) کہا: یقیناً اللہ ایک نہر کے ذریعے تمہاری
آزمائش کرنے والا ہے۔ جو اس کا پانی پیے گا وہ میرا ساتھی نہیں۔ اور جو اس سے سیراب
نہ ہوگا وہ میرا ساتھی ہے۔ ہاں، ایک آدھ جو پی لے تو پی لے۔ ان سب نے خوب پیا۔
بس تھوڑے ہی سے آدمی تھے (جنھوں نے احتیاط کی) پھر جب طالوت اور ان کے
مومن ساتھی اس نہر کے پار ہوئے (تو) انھوں نے کہا: آج ہم میں جالوت اور
اس کی فوج کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔ (لیکن) جن لوگوں کو اللہ کے حضور
حاضری کا خیال تھا (انھوں نے) کہا: بارہا چھوٹے گروہ اللہ کے اذن سے بڑے
گروہ پر غالب آئے ہیں۔ اور اللہ ثابت قدم لوگوں کے ساتھ ہے۔ (۲۴۹) اور
جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آئے (تو) انھوں نے
کہا: ہمارے پالنے والے ہم پر صبر کی بارش کر دے اور ہمارے قدموں کو جما دے
اور ہمیں اس کافر قوم پر فتح یاب کر (۲۵۰) پھر انھوں نے کافروں کو اللہ کے

اذن سے شکست دی۔ اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اس (داؤدؑ) کو سلطنت و حکمت عطا کی اور اسے جن چیزوں کا چاہا، علم دیا۔ اور اللہ، انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے کے ذریعے نہ ہٹاتا تو یقیناً زمین کا نظام بگڑ جاتا۔ مگر اللہ تو بڑے فضل (وکرم) والا ہے جہانوں (بستیوں) پر (۲۵۱)

تفسیر:

۲۴۹۔ فلمّا فصل طالوت بالجنود ......

فَصَلَ کے معنی ہیں ایک جگہ سے نکل گیا، سورۂ یونس میں ہے "فلمّا فصلت العیر (۹۴)"

طالوت نے ایک فہیم و حکیم قائد کی طرح ساتھیوں کو نصب العین پر استوار کے لیے مخاطب کیا۔ اصل تقریر کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ آگے ایک نہر آنے والی ہے، وہاں تمہاری عزیمت کا امتحان ہوگا۔ جو لوگ اس سے بھی بھر کے پانی پییں گے وہ بے مقصد اور بے صبرے قرار پائیں گے ہم ان کو اپنا نہ سمجھیں گے، ہمارے ساتھی وہ جانباز ہوں گے جو پانی چکھ کر چھوڑ دیں گے دو گھونٹ پی کر جہاد فی سبیل اللہ کرنے کو تیار ہوں گے۔ نہر کے سامنے پہنچے تو اکثریت پانی پر ٹوٹ پڑی، امتحان میں کامیاب اور پیاس پر صبر کر کے ساتھ چلنے والے کم نکلے۔

نہر سے آگے بڑھ کر دشمن کا سامنا ہوا تو چلو بھر پانی پینے والے دہل گئے اور یہ تھوڑے سے آدمی بھی اعلیٰ معیار پر پورے نہ اترے۔ یہ کہنے لگے۔ حریف سے ٹکر مشکل ہے۔ البتہ، کم میں کم تر باعزیمت افراد نے استقامت و شوق لقاء الٰہی کا مظاہرہ کر کے ایک اصول بتایا" کہ فتح و نصرت کا دارومدار افراد کی کثرت پر نہیں ہے۔ کامیابی کی بنیاد ہے عقیدہ و نصب العین کی بلندی و استواری" اکثر ایسا ہوا ہے کہ بے مقصد اکثریت پر بامقصد اقلیت نے برتری حاصل کی ہے۔ ماضی بعید کی یہ بات قرآن مجید نے ہمیشہ کے لیے ضابطے کے طور پر سمجھا کر مسلمانوں کو شہادت یا نصرت پر تیار کیا ہے۔ ثابت قدم و راسخ العقیدہ کا مددگار اللہ ہوتا ہے۔

۲۵۰۔ ولمّا برزوا لجالوت ....

طالوت، صاحب عزیمت اور صاحب علم و بصیرت قائد تھا۔ اس نے بھاری تعداد میں سے چند اللہ والوں کو ساتھ لے کر خدا کی راہ میں دشمن سے ٹکر لی۔ پہلے دعا کی، اور ساتھیوں کو اپنا عقیدہ سمجھایا، دشمن کو منکر خدا اور خود مومن باللہ ہونے کا اعلان کر کے حریف پر جھپٹا اور ان کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

اس موقع پر قائدِ سپاہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا محمد حنفیہ سے ایک کلام قابل توجہ ہے۔ بیٹا جمل کی لڑائی میں جانے لگا تو حضرت علیؑ نے فرمایا:

"پہاڑ ہل جائیں تم نہ ہلنا۔ جبڑا جمالینا، سر اللہ کے حوالے کر دینا، زمین میں قدم گاڑ کر کھڑ ہونا۔ اور دشمن کی جمعیت کے آخری حصے پر نظر رکھنا، آنکھوں کو جھکائے رکھنا اور اس کا یقین رہے کہ فتح اللہ کی طرف سے ہے۔

دوسرا نکتہ، کربلا کے پیاسے شہیدوں کی جنگ میں دفتر بن کر سامنے آتا ہے کہ تھوڑے سے مومن، بلند نصب العین لے کر میدان میں آئے اور پانی پر نہیں اسلام اور حسینؑ کے لیے لڑے نتیجے میں زندگی جاوید اور فتح ابدی حاصل ہوئی۔

۲۵۱۔ فھزموھم باذن اللہ . . . .

باعقیدہ و مومن افراد جیت گئے اور اللہ کے حکم سے دشمن ہار گیا۔ اور شریک لشکر ایک کم سن مگر سب سے بڑا عارف باللہ، داؤدؑ آگے بڑھا اور قائد لشکر کفار جالوت کو قتل کر کے پلٹا۔ حضرت داؤدؑ کا اللہ نے تعارف یوں کرایا۔ اللہ نے انھیں حکومت عطا کی کیونکہ انھیں حکمت و علم وسیع عطا کیا تھا۔ طالوت کو بھی علم و قوت اقدم برحق کی بنا پر قائد متقرر کیا گیا۔

ولولا دفع اللہ الناس۔ حق و باطل میں سرد و گرم جنگ ایک فطری بات ہے۔ اس سے ایمان کی طاقت ابھرتی اور معاشرے میں پھیلے ہوئے متعفن اخلاق و عقائد کی تطہیر ہوتی ہے۔ اگر معاشرتی کثرت اور بروں کی اکثریت کو کھل کھیلنے کی چھٹی دے دی جائے تو نظم کائنات تباہ ہو جائے، شر و فساد زمین پر غالب آکر، قانون تنازع للبقاء کا حق غلط اور پرچم ہدایت سرنگوں ہو جائے۔ یہ خدا کا فضل ہے جس نے پہلے امن و اخلاق کی تعلیم دی، صبر و تحمل کا پابند کیا۔

پھر کہا کہ حق کے ہاتھ کٹے ہوئے نہ سمجھنا، وقت آنے پر ظلم کا سر بھی کاٹا جا سکتا ہے اور فساد فی الارض ختم کرنے کے لیے جہاد و قتال بھی لازم ہو جاتا ہے اور اس کے لیے کثرت افراد سے زیادہ باعزیمت افراد کی ضرورت ہے۔ دنیا کی بقا اور بہبود اسی میں ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا

عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

ترجمہ:

یہ اللہ کی آیتیں ہیں، جنھیں ہم ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ اور تم یقیناً رسولوں میں سے ایک رسول ہو (۲۵۲)

تفسیر:

یہ واشگاف حقائق اور یہ سچی اور اونچی باتیں، یہ معجزہ گفتار و کردار جو سب کو سنا رہے ہو جسے سب دیکھ رہے ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ تم عام قائد، عام آدمی نہیں ہو بلکہ سچے رسول ہو، تم نے جو کچھ احکام و واقعات سنائے وہ حق اور سچے ہیں۔

جناب شیخ محمود قانصوہ

شیعہ سنی کتب میں کثیر روایات

پانچویں فصل

آداب روزہ

(ا) آداب روزہ کا لحاظ نہ رکھنے والے کے روزے کا بھوک اور پیاس کے سوا کوئی اثر نہیں۔
(ب) سب وشتم، فحش گوئی اور بے ہودہ باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔
(ج) خوشبو لگانا مستحب ہے۔
(د) سحر کھانا مستحب ہے۔
(ھ) سحر میں کھجور کھانا مستحب ہے۔
(و) جن چیزوں سے افطار کرنا چاہیئے۔
(ز) وقت افطار کیا کہنا چاہیئے۔
(ح) افطار کرانے والے سے کیا کہنا چاہیئے۔
(ط) روزے دار کو افطار کرانا مستحب ہے۔
(ی) جب روزے دار کے سامنے کھانا آتا ہے تو فرشتے اس پر صلوات بھیجتے ہیں۔
(ک) جب برادر مومن کھانے کی دعوت دے تو روزہ توڑ دینا مستحب ہے۔

آداب روزہ کی رعایت نہ کرنے والے کے روزے کا بھوک اور پیاس کے سوا کوئی اثر نہیں۔

روایات اہل بیتؑ:

۱ ـ كتاب الإمامة والتبصرة عن سهل بن أحمد، عن محمد بن محمد بن الأشعث، عن موسى بن اسماعيل بن موسى بن جعفر، عن أبيه عن آبائه (ع)، قال: قال رسول الله (ص): «رُبَّ قائم حظّه من قيامه السهر، وربَّ صائم حظه من صيامه العطش»۱، ونحوه في أسرا ر الصلاة۲. وفي نهج البلاغة: «كم من صائم ليس له من صيامه إلاّ الظمأ وكم من قائم ليس له من قيامه إلاّ السهر والعناء، حبذا الأكياس وافطارهم»۳.

۱. .... موسیٰ بن اسماعیل بن امام موسیٰ کاظمؑ اپنے آباؤ اجدادؑ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے: کتنے ہی ایسے عابد شب زندہ دار ہیں جن کی عبادت کا بے خوابی کے سوا کوئی اثر نہیں اور کتنے ہی ایسے روزے دار ہیں، جنھیں اپنے روزے سے پیاس کے سوا کچھ نہ ملے گا...

نہج البلاغہ میں ہے: بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنھیں روزوں کا ثمرہ بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا اور بہت سے عابد شب زندہ دار ایسے ہیں جنھیں عبادت کے نتیجہ میں جاگنے اور زحمت اٹھانے کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ زیرک و دانا لوگوں کا سونا اور روزہ نہ رکھنا بھی قابل ستائش ہے۔

روایات اہل سنت:

۱ ـ حدثنا عمرو بن رافع، حدثنا عبدالله بن المبارك، عن أسامة بن زيد، عن سعيد المقبري، عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله (ص): «رُبَّ صائم ليس له من صيامه إلاّ الجوع، وربَّ قائم ليس له من قيامه إلاّ السهر»۴. ورواه الحاكم، عن أبي بكر

المروزي عن أبي الموجّه، عن قتيبة بن سعيد، عن اسماعيل بن جعفر، عن عمرو بن أبي عمرو، عن سعيد مثله۵.

۱۔ .... ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا: بہت سے روزے دار ایسے ہیں جنھیں روزے کا ثمرہ بھوک کے سوا کچھ نہیں ملتا اور بہت سے عابد شب زندہ دار ایسے ہیں، جنھیں عبادت کے ثمرہ میں بے خوابی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ....

سب وشتم، فحش گوئی اور بے ہودہ باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ في المجالس، عن أحمد بن هارون الفامي، عن محمد بن عبدالله بن جعفر، عن أبيه عن بنان بن محمد بن عيسى، عن أبيه، عن عبدالله بن المغيرة، عن اسماعيل بن مسلم السكوني، عن الصادق جعفر بن محمد(ع)، عن أبيه(ع)، قال: قال رسول الله(ص): «ما من عبد يصبح صائماً فيشتم، فيقول: إني صائم سلام عليك، إلاّ قال الربُّ تبارك وتعالى: استجار عبدي بالصوم من عبدي أجيروه من ناري وأدخلوه جنتي»۶. ونحوه مارواه في الكافي، عن علي بن ابراهيم، عن هارون بن مسلم، عن مسعدة بن صدقة، عن أبي عبدالله۷. ونقله في البحار، عن الأمالي بالسند المتقدم ذكره في المجالس ونقله عن ثواب الأعمال، عن أبي، عن الحميري، عن بنان مثله، ونقل نحوه، عن نوادر الراوندي بسنده الى الإمام موسى بن جعفر عليهما السّلام۸. ومثله عن الجعفريات، عن محمد، عن موسى، عن أبيه، عن جده، عن الصادق(ع)۹. وأرسله الصدوق، عن النبي(ص)۱۰.

۱۔ .... امام جعفر صادقؑ اپنے پدر بزرگوار سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے: جب کسی روزے دار بندے کو گالی دی جاتی ہے اور وہ کہتا ہے تم سلامت رہو میں روزے سے ہوں تو اس وقت خداوند تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔ میرے ایک بندے نے دوسرے

بندے سے روزہ کے ذریعے پناہ چاہی ہے، اسے میرے جہنم سے پناہ دو اور میری جنت میں داخل کردو . . . .

۲ ـ محمد بن يعقوب، عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد، عن الحسين بن موسى، عن غياث، عن اسحاق بن عمار، عن أبي عبدالله (ع)، قال: قال رسول الله (ص): «إنَّ الله كره لي ست خصال، ثم كرههن للأوصياء من ولدي وأتباعهم من بعدي، الرفث في الصوم»[۱۱]. ونقله في البحار، عن الخصال، عن العطار، عن سعد، عن الخشّاب، عن غياث بن ابراهيم، عن اسحاق بن عمار، عن أبي عبدالله مثله. ونقله عن الأمالي، عن ابن الوليد، عن الصفار، عن ابن عيسى، عن الحسين بن موسى، عن غياث، عن الصادق (ع) مثله. ونقله عن المحاسن، عن أبي، عن محمد بن سليمان، عن أبيه، عن أبي عبدالله نحوه[۱۲]. وأرسله الصدوق، عن النبي (ص)[۱۳].

۲ـ . . . . اسحاق بن عمار امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا: خداوند عالم نے میرے لئے چھ خصلتوں کو ناپسند فرمایا ہے۔ پھر میں نے اپنے بعد انھیں اپنے اوصیاء کے لئے جو میری اولاد سے ہوں گے اور ان کے پیرو کاروں کے لئے ناپسند قرار دیا ہے ان ناپسند خصلتوں میں سے ایک حالت روزہ میں فحش گوئی . . . .

۳ ـ محمد بن الحسن بإسناده، عن علي بن مهزيار، عن الحسن، عن القاسم، عن علي، عن أبي بصير، قال: قال أبو عبدالله (ع): «الصيام ليس من الطعام والشراب، والإنسان ينبغي أن يحفظ لسانه من اللغو والباطل في رمضان وغيره»[۱۴].

۳ـ . . . . ابو بصیر کا بیان ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا: روزہ صرف کھانے پینے سے اجتناب کا نام نہیں بلکہ انسان کو چاہئے کہ رمضان و غیر رمضان میں لغو و بے ہودہ باتوں سے اپنی زبان کو محفوظ بھی رکھے۔

روایات اہل سنّت:

۱ ـ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ وأبو محمد عبدالله بن يوسف الأصبهاني، قالا:

انبأ أبو عبدالله محمد بن يعقوب بن يوسف الشيباني الحافظ، حدثنا أبراهيم عن عبدالله السعدي، أنبأ روح بن عبادة، حدثنا ابن جريح، أخبرني عطاء، عن أبي صالح الزيات، أنه سمع أبا هريرة يقول: قال رسول الله (ص): «كل عمل ابن آدم له، إلاّ الصيام، فإنه لي، وأنا أجزي به. الصوم جنة، فإذا كان يوم صوم أحدكم، فلا يرفث يومئذ ولايسخب، فإنْ سابه أحد أوقاتله فليقل إني آمرو صائم، والذي نفس محمد بيده لخلوف فم الصائم أطيب عند الله يوم القيامة من ريح المسك. وللصائم فرحتان يفرح بها: إذا أفطر فرح بفطره، وإذا لقي ربه فرح بصومه»[١٥]. ونحوه ما رواه مسلم، عن حرملة بن يحيى، عن ابن وهب، عن يونس، عن ابن شهاب، عن ابن سعيد، عن أبي هريرة. ورواه مسلم أيضاً، عن محمد بن رافع، عن عبدالرزاق، عن ابن جريح مثله[١٦]. وروى عبدالرزاق نحوه، عن معمر، عن الزهري، عن ابن المسيب، عن ابن جريح مثله[١٨]. وأخرج ابن ماجة نحوه، عن أبن أبي شيبة، عن معاوية ووكيع، عن الأعمش، عن أبي صالح ١٩. وروى نحوه ابن ماجة وذكرناه، فراجع. ونحوه بنقيصة في أوله وآخره، عن محمد بن يزيد، عن معن، عن خارجة بن سليمان، عن يزيد بن رومان، عن عروة، عن عائشة[٢٠]. وأخرج أبو داود نحوه، عن عبدالله بن مسلمة القعنبي، عن مالك، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة[٢١]. وأخرج البزار نحوه، عن حمزة بن مالك، عن سفيان بن حمزة، عن كثير، عن الوليد وعن المطلب، عن أبي هريرة[٢٢].

۱. .... ابوہریرہ کی روایت ہے کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا: بنی آدم کے تمام اعمال خود ان کے اپنے لئے ہیں سوائے روزہ کے کہ وہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا روزہ سپر ہے چنانچہ جب کبھی تم میں سے کوئی شخص روزہ رکھے تو نہ گندی گفتگو کرے اور نہ شور و غل مچائے اگر کوئی اس سے بدکلامی یا لڑائی جھگڑا کرے تو اسے کہدینا چاہیئے کہ میں روزے دار ہوں، قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے۔ روز قیامت خداوند عالم کے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسندیدہ ہوگی۔ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہوتی ہیں اور وہ ان سے محفوظ ہوتا ہے: جب وہ روزہ کھولتا ہے تو افطار سے محفوظ ہوتا ہے اور جب اپنے پروردگار سے ملاقات کرتا ہے تو اپنے روزہ سے لطف اندوز ہوتا ہے ....

٢ ـ أخبرنا أبو زكريا بن أبي اسحاق، أنبأ أبوسهل أحمد بن محمد بن عبدالله بن زياد القطان، حدثنا أحمد بن محمد بن عيسى القاضي، حدثنا القعنبي، عن مالك (ح

وأخبرنا) أبو عبدالله الحافظ، حدثنا أبو النضر الفقيه، حدثنا عثمان بن سعيد، حدثنا القعنبي فيا قرأ على مالك، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة أن رسول الله (ص) قال: «الصيام جنة، فإذا كان أحدكم صائماً فلا يرفث ولايجهل، فإنْ امرؤ قاتله أو شاتمه فليقل إني صائم» ٢٣. ومثله ما أخرجه مسلم، عن زهير بن حرب، عن سفيان، عن أبي الزناد مثله ٢٤. و رواه عبدالرزاق، عن معمر، عن همام، عن أبي هريرة مثله ٢٥. وأخرجه البخاري، عن عبدالله بن مسلمة، عن مالك مثله ٢٦. وأخرج ابن ماجة نحوه، عن محمد بن الصباح، عن جرير، عن الأعمش، عن أبي صالح، عن أبي هريرة ٢٧. وأخرج النسائي نحوه عن ابراهيم بن الحسن، عن حجاج، عن ابن جريج، عن عطاء، عن أبي صالح، عن أبي هريرة ٢٨. وأيضاً نحوه، عن محمد بن حاتم، عن سويد، عن عبدالله، عن ابن جريج مثل السابق. وروى الحميدي، عن سفيان، كمسلم ٢٩.

۲۔ .... ابوہریرہ سے روایت ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: روزہ سپر ہے، چنانچہ اگر تم میں سے کوئی روزہ رکھے تو اسے چاہئے کہ گندی اور جاہلانہ گفتگو سے پرہیز کرے اور اگر کوئی شخص اسے گالی دے یا لڑائی جھگڑا کرے تو اسے کہدینا چاہئے کہ میں روزہ سے ہوں ....

٣ ــ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ وأبو بكر بن الحسن القاضي وأبو زكريا بن أبي اسحاق المزكي، قالوا: حدثنا أبوالعباس محمد بن يعقوب، حدثنا بحر بن نصر، قال: قُرِئَ على ابن وهب، أخبرك انس بن عياض الليثي، عن الحارث بن عبدالرحمن، عن عمه، عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله (ص): «ليس الصيام من الأكل والشرب فقط إنما الصيام من اللغو والرفث، فإن سابك أحد أو جهل عليك فقل إني صائم» ٣٠. ونحوه مارواه مسلم، عن زهير بن حرب، عن ابن عيينة، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة ٣١. وأخرجه الحاكم، عن أبي بكر الفقيه، عن موسى بن اسحاق، عن أبي، عن أنس مثله ٣٢.

۳۔ .... ابوہریرہ کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا روزہ صرف کھانے پینے سے اجتناب کا نام نہیں ہے، بلکہ روزہ فحش گوئی اور بے ہودہ باتوں سے اجتناب سے عبارت ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص تم سے بدکلامی کرے یا جاہلانہ روش اختیار کرے تو کہدو میں روزے سے ہوں...

خوشبو لگانا مستحب ہے

روایات اہل بیتؑ :

۱ ـ عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد بن خالد، عن أبيه عن عبدالله بن الفضل النوفلي، عن الحسن بن راشد، قال: كان أبو عبدالله(ع) إذا صام تطيّب بالطيب، ويقول: «الطيب تحفة الصائم»۳۳. رواه الصدوق بسنده، عن الحسن بن راشد مثله۳۴.

۱۔ .... حسن بن راشد کہتے ہیں امام صادقؑ جب روزہ رکھتے تھے تو خوشبو لگاتے تھے اور فرماتے تھے، خوشبو روزہ دار کا تحفہ ہے ....

۲ ـ البحار، عن الخصال، عن أبي عن السعدآبادي، عن البرقي، عن الكوفي عن محمد بن سنان، عن عبدالله بن أيوب، عن عبدالسلام الإسكاف، عن عمير بن مأمون، عن الحسن بن علي(ع)، قال: «تحفة الصائم أن يدهن لحيته ويجمر ثوبه»۳۵.

۲۔ ...... عمیر بن مامون کا بیان ہے کہ امام حسنؑ نے فرمایا: روزے دار کا تحفہ یہ ہے کہ اپنی داڑھی میں تیل لگائے اور کپڑوں کو معطر کرے۔

روایت اہل سنت :

۱ ـ حدثنا أحمد بن منيع، حدثنا أبو معاوية، عن سعد بن طريف، عن عمير بن مأمون، عن الحسن بن علي(ع)، قال: قال رسول الله(ص): «تحفة الصائم الدهن والمجمر»۳۶.

۱۔ ...... عمیر بن مامون امام حسنؑ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا نے فرمایا: روزہ دار کا تحفہ تیل اور خوشبو ہے۔

سحر کھانا مستحب ہے۔

روایاتِ اہل بیتؑ:

١ ــ وعنه ــ علي بن محمد ــ عن أبيه، عن النوفلي، عن السكوني، عن جعفر(ع)، عن آبائه عليهم السلام، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم «السحور بركة»٣٧.

أقول: ظاهر الوسائل أن الضمير يرجع الى ــ علي بن محمد ــ ولكن في الكافي أن الراوي هو علي بن ابراهيم، ويمكن حمل الضمير في (عنه) عليه٣٨. ونقل الحديث في البحار، عن كتاب الإمامة والتبصرة، عن أحمد بن علي، عن محمد بن الحسن، عن الصفار، عن ابراهيم بن هاشم مثله٣٩. وأرسله الفقيه٤٠.

١. .... سکونی کا بیان ہے: امام جعفر صادقؑ اپنے آباء و اجداد سے روایت ہیں کہ رسول اللہ کا ارشاد ہے: سحر کھانے میں برکت ہے........

٢ ــ أخبرنا محمد، حدثني موسى، حدثنا أبي، عن أبيه، عن جده جعفر بن محمد(ع) عن أبيه(ع)، عن جده علي بن الحسين(ع)، عن أبيه(ع)، عن علي(ع) قال قال رسول الله (ص): «إنّ الله وملائكته يصلّون على المتسحرين»٤١.

٢- .... حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: خدا اور اس کے سحر کھانے والوں پر درود بھیجتے ہیں۔

روایات اہل سنت:

١ ــ أخبرنا أبوطاهر الفقيه وأبومحمد عبدالله بن يوسف، قالا: أنبأ أبوبكر محمد بن الحسين القطان، حدثنا ابراهيم بن الحارث البغدادي، حدثنا يحيى بن أبي بكير حدثنا شعبة، عن (ح وأخبرنا) أبوعبدالله الحافظ، أخبرني عبدالرحمن بن الحسن

القاضي، حدثنا ابراهيم بن الحسن، حدثنا آدم، حدثنا شعبة، حدثنا عبدالعزيزبن صهيب، قال: سمعت أنس بن مالك يقول: قال رسول الله صل الله عليه وسلم: «تسحّروا، فإنّ في السحوربركة». رواه بأسانيد متعددة[42]. ورواه مسلم، عن يحيى بن يحيى، عن هشيم، عن أبن صهيب وعن أبن أبي شيبة وابن حرب، عن ابن عُليّة، عن ابن صهيب مثله، وعن قتيبة مثل الترمذي[44]. ورواه عبدالرزاق، عن معمر، عن عبدالعزيز مثله ورواه أيضاً، عن الثوري، عن أبن أبي ليلى، عن عطاء، عن أبي هريرة[45]. وأخرجه البخاري، عن آدم مثله[46]. وأخرجه ابن ماجة، عن أحمدبن عبدة، عن حمادبن زيد، عن عبدالعزيزبن صهيب مثله[47]. وأخرجه النسائي، عن عبيدالله وعن محمدبن بشار، عن عبدالرحمن مثله[48]. وأخرج حديث البيهق عن قتيبة مثله. وأخرجه بأسانيده المتعددة، عن أبي هريرة، فراجع[49]. وأخرجه أبو داود الطيالسي، عن أبي عوانة، عن قتادة، عن أنس[50]. وأخرجه الدارمي، عن سعيدبن عامر، عن شعبة مثله[51]. وأخرجه البزار، عن محمدبن أبي صفوان، عن أبي داود، عن محمدبن ثابت البنانى، عن أبيه، عن أنس[51].

۱۔ .... انس بن مالک راوی ہیں کہ رسول خدا نے فرمایا: سحر کھاؤ کیونکہ سحر میں برکت ہے ....

۲ ـ وعن ابن عمر، قال رسول الله (ص): «إنّ الله وملائكته يصلّون على المتسحرين»[53]. وأخرج البزار، عن ميمون بن الأصبغ النصيبي، عن عبدالله بن صالح، عن الليث بن سعد، عن هشام بن سعد، عن حاتم بن أبي نصر، عن عبادة بن نسي، عن صحابي: أن النبي (ص) صلّى على المتسحرين[54].

۲۔ ابن عمر کہتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا: خدا اور اس کے فرشتے سحر کھانے والوں پر درود بھیجتے ہیں ....عبادہ بن نسی ایک صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر نے سحر کھانے والوں پر درود بھیجی ہے۔

سحر میں کھجور کھانا مستحب ہے:

روایت اہل بیتؑ:

۱ ــ عن محمدبن الحسن، عن الحسن بن علي بن يوسف، عن عبدالله بن سالم، عن سيف بن عميرة، عن عمرو بن شمر، عن جابر، قال: سمعت أبا جعفر(ع)، يقول: «كان رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يفطر على الأسودين، قلت: يرحمك الله وما ألاسودان، قال: التمروالماء والزبيب والماء ويتسحربها»۵۵.

أقول: وهذا الحديث ينفع في الباب الآتي.

۱۔ .... جابر کا بیان ہے کہ میں نے امام باقرؑ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: رسول اللہؐ دو سیاہ چیزوں سے افطار فرماتے تھے۔ میں نے عرض کیا خدا آپ پر رحمت نازل کرے۔ وہ دونوں سیاہ چیزیں کیا ہیں؟ حضرتؑ نے فرمایا ایک کھجور اور پانی، دوسرے کشمش اور پانی، نیز سحر میں بھی یہی تناول فرماتے تھے۔

روایت اہل سنّت:

۱ ــ أخبرنا أبوالحسن المقري، أنبأ الحسن بن محمدبن اسحاق، حدثنا يوسف بن يعقوب، حدثنا محمدبن أبي، حدثنا ابن أبي الوزير هوأبو المطرف، حدثنا محمدبن الموسى المدني، عن المقبري، عن أبي هريرة، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: «نعم سحور المؤمن التمر»۵۶. ونقله الهيثمي، عن البزار، عن جابر، وقال: ان رجاله رجال الصحيح۵۷. وأخرجه البزار، عن رجاء بن محمد السقطي ومحمدبن معمر البحراني، عن أبي عامر عبدالملك، عن زمعة، عن عمرو بن دينار، عن جابر۵۸.

۱۔ .... ابوہریرہ کہتے ہیں رسولؐ خدا نے فرمایا: مومن کے لئے بہترین سحری کھجور ہے۔

....

حواشی:

١ ـ البحار، ج ٩٣ (ط.ح) ص ٢٩٥.
٢ ـ البحار، ج ٩٣ (ط.ح) ص ٢٩٤.
٣ ـ نهج البلاغة (ج ٤، ص ٣٥).
٤ ـ ابن ماجة (ج ١، ص ٥٣٩).
٥ ـ المستدرك (ج ١، ص ٤٣١).
٦ ـ الوسائل (ج ٧، ص ١٢١). ونقله عن البرقي في المحاسن.
٧ ـ الكافي (ج ٤، ص ٨٨).
٨ ـ البحار (ج ٩٣، ط.ح، ص ٢٨٨) والبحار أيضاً، ص ٢٩٣.
٩ ـ الجعفريات، ص ٦٠.
١٠ ـ الفقيه (ج ٢، ص ٦٨).
١١ ـ الوسائل (ج ٧، ص ١٢٢). أقول: والخمسة الباقية في غير الصوم. كما في حاشية الكافي نقلاً عن المروية في الخصال، فراجع الكافي (ج ٤، ص ٨٩).
١٢ ـ البحار (ج ٩٣، ط.ح) ص ٢٩٨.
١٣ ـ الفقيه (ج ٢، ص ٦٧).
١٤ ـ الوسائل (ج ٧، ص ١١٧).
١٥ ـ البيهقي (ج ٤، ص ٢٧).
١٦ ـ مسلم (ج ٣، ص ١٥٧).
١٧ ـ مصنف عبدالرزاق (ج ٤، ص ٣٠٦) وليس فيه: (الصيام جنة الى فليقل اني صائم) وليس فيه (القسم) وليس فيه (للصائم فرحتان).. إلخ.
١٨ ـ البخاري (ج ٣، ص ٣٢) فيه اختلاف يسير في الألفاظ.
١٩ ـ ابن ماجة (ج ١، ص ٥٢٥).
٢٠ ـ النسائي (ج ٤، ص ١٦٧) وأوله: (الصيام جنة). وليس في آخره (للصائم فرحتان... إلخ).
٢١ ـ أبو داود (ج ٢، ص ٣٠٧) بداية الحديث: (الصوم جنة)، ونهايته: (إني صائم) مكررة.
٢٢ ـ كشف الأستار (ج ١، ص ٤٥٩).
٢٣ ـ البيهقي (ج ٤، ص ٢٦٩) وموطأ مالك (ج ١، ص ٢٨٧).
٢٤ ـ مسلم (ج ٣، ص ١٥٧) وليس في أوله: (الصيام جنة).

٢٥ ـ مصنف عبدالرزاق (ج ٤، ص ١٩١) وفيه زيادة:.(يوماً) بعد صائم ونقيصة: (أوشاتمه) بعد قاتله.
٢٦ ـ البخاري (ج ٣، ص ٣٠) وليس فيه: (فإذا كان أحدكم صائماً) وفي آخر زيادة.
٢٧ ـ ابن ماجة (ج ١، ص ٥٣٩) وليس فيه: (الصيام جنة) وفيه اختلاف باللفظ.
٢٨ ـ النسائي (ج ٤، ص ١٦٣) وفيها زيادة في أولها وزيادة في آخرهما.
٢٩ ـ الحميدي (ج ٢، ص ٤٤٢) ورواه أيضاً عن سفيان، عن ابن عجلان، عن سعيد المقبري، عن أبي هريرة.
٣٠ ـ البيهقي (ج ٤، ص ٢٧٠).
٣١ ـ مسلم (ج ٣، ص ١٥٧).
٣٢ ـ المستدرك (ج ١، ص ٤٣٠).
٣٣ ـ الكافي (ج ٤، ص ١١٣) والوسائل (ج ٧، ص ٩٤).
٣٤ ـ الفقيه (ج ٢، ص ٧٠).
٣٥ ـ البحار (ج ٩٣، ط. ح، ص ٢٨٩) والوسائل (ج ٧، ص ٦٧).
٣٦ ـ الترمذي (ج ٣، ص ١٦٤)
٣٧ و٣٨ ـ الوسائل (ج ٧، ص ١٠٣) والكافي (ج ٤، ص ٩٤).
٣٩ ـ البحار (ج ٩٣، ط. ح، ص ٣١٢).
٤٠ ـ الفقيه (ج ٢، ص ٨٦).
٤١ ـ الجعفريات (ص ٦٣).
٤٢ ـ البيهقي (ج ٤، ص ٢٣٦). راجع مجمع الزوائد (ج ٣، ص ١٥١).
٤٣ ـ الترمذي (ج ٣، ص ٨٨).
٤٤ ـ مسلم (ج ٣، ص ١٣٠).
٤٥ ـ مصنف عبدالرزاق (ج ٤، ص ٢٢٨ و٢٢٧).
٤٦ ـ البخاري (ج ٣، ص ٣٦).
٤٧ ـ ابن ماجة (ج ١، ص ٥٤٠).
٤٨ ـ النسائي (ج ٤، ص ١٤٠ و١٤١) وفي الأول اختلاط في اللفظ على عبيدالله.
٤٩ ـ النسائي (ج ٤، ص ١٤١).
٥٠ ـ منحة المعبود (ج ١، ص ١٨٥).
٥١ ـ الدارمي (ج ٢، ص ٦).
٥٢ ـ كشف الأستار (ج ١، ص ٤٦٤).
٥٣ ـ مجمع الزوائد (ج ٣، ص ١٥٠) ونقله عن الطبراني في الأوسط.
٥٤ ـ كشف الأستار (ج ١، ص ٤٦٣)
٥٥ ـ الوسائل (ج ٧، ص ١٠٥).
٥٦ ـ البيهقي (ج ٤، ص ٢٣٦).
٥٧ ـ مجمع الزوائد (ج ٣، ص ١٥١).
٥٨ ـ كشف الأستار (ج ١، ص ٤٦٥) وليس فيه: (المؤمن).

جناب ڈاکٹر مصطفیٰ اولیائی
ترجمہ: سید حسین مہدی حسینی

علم حدیث کا ارتقاء
(۲)

علم درایت کی داغ بیل کب اور کیسے؟

ارشادات نبوی کے آراستہ و پیراستہ چمن میں جس وقت جعلی و فرضی حدیث کی آمیزش کی جانے لگی اور اس کی منظم کیاریوں اور روشوں میں اگتے ہوئے خود رو پودے شاخ گل کے دوش بہ دوش لہلہاتے ہوئے نظر آنے لگے تو باغبانوں کو خطرہ ہوا کہیں ایسا نہ ہو کہ آب دھی سے لہلہاتا ہوا بوستانِ حدیث اچانک خزاں رسیدہ ہو جائے اگرچہ پودے خود رو تھے لیکن اس طرح جڑیں بنالی تھیں کہ باغبان کے لئے اس کا جدا کرنا مشکل ہو چکا تھا، لیکن اسے چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ ان کی موجودگی سے نہ صرف گلوں کی آزادی کو دھچکا پہنچ رہا تھا بلکہ دنیائے رنگ و بو کو بھی خطرہ درپیش ہو چکا تھا، لہٰذا سخن رسالت کے باغبانوں اور خوشہ چینوں نے تدبیر کی قینچی سے خود رو پودوں اور جھاڑ جھنکار کو کاٹنا شروع کیا تاکہ چمن کی شادابی بھی بحال رہے اور مزید خود روئیدگی کا دروازہ بھی ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔

جہاں تک ممکن تھا باغبان خود رو پودوں کا قلع قمع کرتے رہے لیکن جس کی جڑیں گہرائی میں اتر چکی تھیں اس کی بیخ کنی کے لئے "تیشۂ قلم" کا سہارا لیا۔

اگرچہ صدیوں سے باغبان، گلشنِ رسالت کی صفائی اور ستھرائی میں لگے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود آج بھی جا بجا "جھاڑ جھنکار" نظر آ جاتی ہے۔ بوستانِ حدیث میں خود رو پودوں کی تخم پاشی کب اور کیسے ہوئی اس کے چند نمونے نہایت اختصار سے پیش کر رہا ہوں۔

(۱) بوستانِ حدیث میں خود رو پودوں کو اگانے، اور اسے شاداب کرنے کا سب سے پہلے جن لوگوں نے بیڑہ اٹھایا وہ — بنی امیہ کے طرفدار، اور اسلام دشمن افراد تھے جنہوں نے وقت کے تیز دھارے سے مرعوب ہو کر اپنے چہروں پر اسلام کی نقاب ڈالی تھی۔ اس کی مثال سیوطی کی کتاب التدریب الراوی کے جدید

ایڈیشن کے مقدمہ میں دیکھی جا سکتی ہے ـــــ وہ لکھتے ہیں :۔

"معاویہ کے حکم سے آیۂ قرآنیہ "ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ" کی توجیہ و تفسیر میں ایک روایت گڑھی گئی جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ یہ آیت ابن ملجم ملعون کے حق میں نازل ہوئی ہے کیونکہ اس نے حضرت امیر المؤمنینؑ کو شہید کر کے اپنے کو ہلاکت میں ڈال دیا ـــ جبکہ ایسا نہیں، یہ آیت صرف اور صرف حضرت امیرؑ کے جذبہ فداکاری و اسلام دوستی کی توصیف کر رہی ہے جس کا مظاہرہ حضرت نے شب ہجرت بستر رسولؐ پر سو کر کیا تھا[1]"

(۲) جعلی و فرضی احادیث کے فروغ کا دوسرا سبب اسلام کے اندر رونما ہونے والی پھوٹ تھی جس نے مختلف فرقے جنم دئے۔ ہر فرقہ اپنے مذہب کی حقانیت کے اثبات اور اپنے حریف کو زک دینے کے لئے طبع زاد حدیثوں سے سہارا لے رہا تھا۔ ان ہی طبع زاد حدیثوں کا معمولی نمونہ احمد بن نصر کی زبانی سنئے ـــــ وہ کہتا ہے :۔

"خواب میں پیغمبر اسلامؐ نے مجھے حکم دیا ہے کہ ـــ شافعی فرقہ کی اتباع کروں کیونکہ شافعی مجھ سے ہے، خدا شافعی اور اس کی اتباع کرنے والوں سے راضی ہے۔[2]"

(۳) تیسری جماعت جس نے طبع زاد حدیثوں کے ایجاد کی ضرورت محسوس کی وہ سادہ لوح و دین دار و مومن مسلمان تھے، جنہوں نے عوام کو دیندار و مذہبی بنانے کی غرض سے طبع زاد حدیثوں کی فیکٹری قائم کی، اس کی ایک مثال دائرۃ المعارف اسلامی سے پیش کر رہا ہوں :

"ابو عصمہ نوح بن مریم مسلمانوں کے جذبۂ تلاوت قرآن کو بڑھانے کے لئے ہر سورہ کے فضائل میں حدیثیں گڑھ کر سناتا تھا، جس وقت اس سے پوچھا گیا تم نے یہ حدیثیں کہاں سے نقل کی ہیں تو اس نے جواب دیا، جب میں نے دیکھا کہ لوگوں کا رجحان ابوحنیفہ کی فقہ اور محمد ابن اسحاق کی تاریخ کی طرف زیادہ بڑھ رہا ہے تو خدا کی خوشنودی

---

[1] علم حدیث ص۶۱

[2] علم حدیث ص۶۹، فجر الاسلام احمد امین ص۲۵۵، مقدمہ محقق التدریب الراوی سیوطی۔

کی خاطر اپنی طرف سے ایسی حدیثیں ترتیب دے لی ہیں۔"[1]

(۴) طبع زاد حدیثوں کی پیدائش کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ اس وقت کے عوام میں حضرات انبیاء کے قصوں، اور معجزوں کے سننے کا اشتیاق تھا، افسانوں اور کہانیوں کے سننے اور سنانے سے دلچسپی تھی اس دلچسپی سے استفادہ کرتے ہوئے یہودیوں نے بے سروپا طبع زاد باتیں حدیث کے نام سے ذخیرۂ ارشادات نبوی میں شامل کر دیں جیسا کہ طبری نے وہب بن منبہ سے روایت کی ہے ۔ وہ کہتا ہے :-

"قصہ ابلیس و آدم سے پہلے سانپ چوپایوں کی طرح ہاتھ پیر رکھتا تھا، جس وقت ابلیس کو جنت تک پہنچانے میں مدد کی خدا نے اس کی سزا میں اس سے ہاتھ پیر چھین لئے۔"[2]

(۵) قبائلی تعصب و تنگ نظری بھی جھوٹی اور فرضی حدیثوں کے وجود میں آنے کا سبب ہوئی، کیونکہ ہر قبیلہ اپنی برتری و فضیلت منوانے کے لئے طبع زاد (من گھڑت) حدیثوں سے اثبات مدعا کرتا تھا۔ مثلاً وہ حدیثیں جس میں بعض شہروں کی فضیلت کا تذکرہ ملتا ہے، وہ انہی جعلی و فرضی حدیثوں کی ایک کڑی ہے۔

(۶) بے جا عزت و افتخار کی ہوس، اور زمرہ محدثین کی فرد کہے جانے کی طمع میں من گھڑت حدیثیں ترتیب دی گئیں۔

(۷) اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے حصول اور خلفاء کی چاپلوسی و خوشنودی کی خاطر بھی حدیثیں گڑھی گئیں۔ صاحب فجر الاسلام لکھتے ہیں۔

غیاث بن ابراہیم خلیفہ منصور کے یہاں باریاب ہوا، دیکھا منصور کبوتر بازی میں مشغول ہے، منصور نے اسے خوش کرنے کے لئے پیغمبر اسلامؐ کی طرف منسوب کرتے ہوئے ایک حدیث گڑھ کر سنادی جس کا مفہوم یہ تھا۔ گھوڑ دوڑ اور کبوتر بازی سے عمدہ کوئی شوق نہیں۔ اسی طرح کسی موقع پر معاویہ کے سامنے ابوہریرہ نے شہر عسکا کی پیاز کی فضیلت میں ایک حدیث پیش کی،

---

[1] فجر الاسلام ص ۲۵۶، پرتو اسلام ترجمہ فجر الاسلام ص ۲۵۸، دائرہ المعارف ص ۲۴-۲۵، بزبان انگریزی۔
[2] پرتو اسلام ج ۲ ص ۲۵۶-۵۸

جب معاویہ نے ابوہریرہ سے پوچھا پیغمبر کی یہ حدیث کہاں ہے؟ تو اس نے جواب دیا ۔ اسی جگہ سے جہاں یہ حدیث ہے کہ معاویہ "خال المومنین" ہے۔"

(۸) فقہاء اسلام کے نظریاتی اختلاف نے بھی جھوٹی حدیثوں کی پیدائش کے امکانات فراہم کر دیئے۔ ہر فقیہ اپنے نظریات کو مضبوط کرنے کے لیے اپنی دل پسند حدیثیں سناتا رہتا تھا۔

(۹) قصہ کہانی کہنے والوں نے بھی حدیث سازی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ابن جوزی کا بیان ہے:۔

احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین مسجد رصافہ میں مصروف نماز تھے کہ اسی اثناء قصہ گو وارد مسجد ہوا۔ حاضرین کا حلقہ بنا کر حدیث سنانے لگا۔ سناتے سناتے یہاں تک پہنچا کہ۔
احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے فلاں سے اور فلاں نے فلاں سے اور انہوں نے مرسل اعظمؐ کو فرماتے ہوئے سنا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: جس کسی نے "لا الٰہ الا اللہ" کہا خدا اسے ایک ایسا پرندہ عطا کرے گا جس کی منقار (چونچ) سونے کی ہوگی، پر مرجان کے ہوں گے۔ پھر نہ پوچھئے کلمہ "لا الٰہ" کی فضیلت میں زمین و آسمان کے قلابے ایک کرنے عوام نے بھی خوش ہو کر انعامات کے ڈھیر لگا دئے۔ احمد و یحییٰ اس منظر کو دیکھ رہے تھے، اشاروں اشاروں میں ایک نے دوسرے سے کچھ کہا۔
قصہ گو جب سب کچھ سنا چکا تھا تو احمد ابن حنبل نے اسے اپنے پاس بلایا اور پوچھا۔

یہ حدیث تم نے کس سے سنی ہے؟

"احمد حنبل اور یحییٰ ابن معین سے"

قصہ گو نے جواب دیا۔

احمد ابن حنبل نے کہا۔

میں احمد ہوں اور یہ یحییٰ بن معین۔ ہم دونوں نے تو یہ حدیث بیان نہیں کی ہے۔
"کیا اس نام کے صرف تم ہی دو ہو؟ نہ معلوم دنیا میں اس نام کے کتنے ہیں۔"
قصہ گو یہ کہتے ہوئے۔ بہت دور جا چکا تھا۔[1]

---

[1] علم الحدیث ص۷۵-۷۴ بحوالہ علوم الحدیث ص۲۸۹

بطور نمونہ چند واقعے پیش کر دیئے ورنہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ اسباب تھے جس کے پیش نظر حدیث پر نقد و نظر کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ لہٰذا حدیث سے باخبر افراد نے صحیح و جعلی حدیثوں کی شناسائی کے لئے ایک اصول مرتب کیا جس کا نام ـــ درایت الحدیث ـــ رکھا۔

"نہایۃ الدرایہ" میں علم درایہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"علم درایہ وہ علم ہے جس میں حدیث کے سلسلہ سند، متن و مصداق، انداز نقل اور موضوع پر بحث کی جاتی ہے تاکہ صحیح و غلط احادیث کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکے۔"

علم درایت الحدیث ـــ دنیائے حدیث میں ایک نئے علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ علم صحیح و غلط حدیثوں کی شناخت کے لئے اپنے اندر مختلف شعبے اور اصول و ضوابط رکھتا ہے۔ ان ہی اصول و ضوابط کے مجموعہ کا نام ـــ مصطلح الحدیث ـــ ہے۔

حدیث کی دشواریوں اور پیچیدگیوں کی مزید چھان پھٹک کے لئے محدث کو علم رجال، نحو و صرف، معانی و بیان، ناسخ و منسوخ، الفاظ کی اصل، اس کے استعمال، تاریخ اسلام اور فرق اسلامی کے عقاید و نظریات سے بھی آشنائی پیدا کرنی ضروری و لازم ہے۔ صاحب کشف الظنون نے علم درایہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:-

علم درایہ :-

عربی قاعدوں، اور شرعی ضابطوں کے سہارے ترتیب دیا ہوا وہ علم ہے جس میں الفاظ حدیث کے مفہوم و معنی و مصداق اور مرسل اعظم کے حالات زندگی سے متعلق اخبار و واقعات کی تحقیق و تصحیح کی جاتی ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ "علم درایہ" وہ علم ہے جس میں راویان حدیث کے اسماء، حسب و نسب، قد و عمر، وقت وفات اور نقل روایت میں راوی کے انداز و آداب روایت سے بحث کی جاتی ہے تاکہ ان باریکیوں کے ذریعہ صحیح و غلط حدیثوں کو پہچانا جا سکے۔

علم رجال :-

علم رجال کا تذکرہ کرتے ہوئے مناسب سمجھتا ہوں کہ آیۂ "نباء" کو اپنی بحث کا عنوان قرار دوں کیونکہ

بقول علامہ بزرگوار استاد نوری، یہی وہ آیت ہے جس نے محدثین کو راویان حدیث کے حالات وکیفیات کے معلوم کرنے پر آمادہ کیا۔

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ سب سے پہلا شخص کون تھا جس نے علم رجال میں کتاب لکھی۔؟ اس سوال کے جواب میں بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس علم میں بھی شیعوں کو سنیوں پر سبقت حاصل ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے جس نے علم رجال میں کتاب لکھی وہ ـــ ابو محمد عبد اللہ جبلہ بن حیان الیحر کنانی[1] ہیں۔ اگرچہ جلال الدین سیوطی نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ ان کے نزدیک علم رجال کے مؤسس و موجد شعبہ، متوفی سنہ ۲۶۰ھ ہیں۔

واضح ہے سیوطی کا نظریہ تاریخ سے ہم آہنگ نہیں۔ عبد اللہ بن جبلہ شعبہ سے اکتالیس سال قبل فوت ہوئے اگر عبد اللہ بن جبلہ نے شعبہ سے پہلے علم رجال پر کتاب نہیں بھی لکھی تو متاخر نہیں مانا جا سکتا بلکہ ایک دوسرے کا معاصر کہا جا سکتا ہے۔

شاید اس کا تذکرہ بھی بے جا نہ ہوگا کہ شیعوں میں" رجال نویسی " کا سلسلہ آغاز اسلام سے شروع ہو چکا تھا یہ اور بات ہے کہ رائج اسلوب و انداز کے بجائے، بزرگوں کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے راویان حدیث کے حالات قلم بند کرتے تھے۔ اگر اس طرح کی کتابوں کو بھی شمار کیا جائے تو سب سے پہلے جس نے علم رجال میں کتاب لکھی وہ ابو رافع اور ان کے فرزند ہیں۔

کچھ کتابیں تو ایسی ہیں جن میں صرف راویوں کے حالات کا تذکرہ کیا، سن وفات کو ذکر نہ کیا، جیسے تاریخ ابن جریر، مروج الذہب مسعودی ـ کچھ میں سن وفات تو ہے۔ لیکن زندگی کے حوادث و حالات نہیں ہیں ـــ اور کچھ ہر اعتبار سے کامل ہیں راویوں کے حالات اور سن وفات کا بھی تذکرہ کیا ہے ـــ مثلاً ابو الفرج جوزی، و ذہبی کی کتابیں۔

شیعہ رجال کی پانچ اہم کتابیں:

پہلی کتاب پانچویں صدی ہجر کے عالم ابو العباس احمد بن علی متوفی سنہ ۴۵۰ھ کی تصنیف ہے جس کا نام "رجال نجاشی" ـــ ہے اس کتاب نے کچھ اتنی شہرت پائی کہ خود مصنف بھی نجاشی ہی کے نام سے پکارے

---

[1] متوفی سنہ ۲۱۹ھ تاسیس الشیعہ ص ۲۳۳ ـ رجال نجاشی

جانے لگے۔ اس کتاب میں ان راویان حدیث کے حالات ذکر کئے گئے ہیں جو صاحب تالیف تھے دوسرے راویوں کی طرف کم توجہ کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب حروف تہجی کے اعتبار سے لکھی گئی لیکن اس طرح نہ ہو سکی جس طرح ہونا چاہئے تھی، تقریباً پانچ صدیاں گذرنے کے بعد خادم انصاری متوفی سنہ ۱۰۰۶ھ، ملا عنایت اللہ قہپائی متوفی سنہ ۱۰۱۶ ھجری (صاحب مجمع الرجال) اور شیخ داؤد بن حسن بحرینی متوفی سنہ ۱۱۰۴ھ نے اس کی خامیوں کی بہت حد تک اصلاح کی۔

دوسری کتاب "فہرست طوسی" ہے اس کے مصنف جناب شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسیؒ ہیں، اس کی تدوین میں بھی حروف تہجی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کتاب پر بھی ارباب قلم نے کافی تحقیقی اضافے کئے ہیں۔ علم رجال کی تیسری کتاب بھی جناب شیخ الطائفہ ہی کی ہے اس کتاب میں جناب شیخؒ نے ہر امام کے عہد میں پائے جانے والے راویوں کے اسماء جمع کئے ہیں۔

چوتھی کتاب — رجال کشی جس کا صحیح نام "اختیار الرجال" ہے۔

پانچویں کتاب پانچویں صدی ہجری کے صاحب فکر و دانش جناب ابن غضائری احمد بن حسین کی — "الضعفاء" ہے۔

رجال اہلسنت میں لکھی گئی کتابوں میں بھی چار کتابیں ان کی دوسری کتابوں کی بہ نسبت نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کتاب ابو عبد اللہ محمد بن یحییٰ متوفی سنہ ۳۰۱ھ کی کتاب ابن مندہ ہے۔

دوسرے نمبر پر ابو نعیم اصفہانی متوفی سنہ ۴۳۰ھ کی "حلیۃ الاولیا" کا نام لیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کی تیسری کڑی کتاب "ابو موسیٰ اصفہانی" محمد بن ابی بکر ہے۔ درحقیقت اس کتاب کو ابن مندہ کی کتاب کا تکملہ کہنا چاہئے۔

چوتھی کتاب — "ابن عبد البر" کی "استیعاب فی معرفۃ الاصحاب" ہے —— ان چار کتابوں کے بعد جتنی کتابیں لکھی گئیں ان ہی کتابوں کی بنیاد پر لکھی گئیں۔

ابن اثیر جزری متوفی سنہ ۶۳۰ھ نے انہیں چار کتابوں کو "اسد الغابہ" میں یکجا کیا۔ ذہبی متوفی سنہ ۷۴۸ھ نے جزری کی "اسد الغابہ" کا خلاصہ "تجرید اسماء الصحابہ" کے نام سے کیا اور مزید "فٹ نوٹ" بھی لگائے — ذہبی کے بعد بدر الدین محمد قدسی، اور محمد بن محمد کاشغری نے بھی اپنے اپنے اسلوب و نہج کے اعتبار سے اسد الغابہ کی تلخیص کی۔

صاحب الذریعہ کے بیان کے مطابق پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے ماہر علمائے رجال نے ان کتابوں کو جن میں صرف شیعہ راویوں کے حالات لکھے تھے "رجال" کے نام سے موسوم کیا اور جن میں شیعہ و سنی دونوں فرقوں کے راویوں کے حالات درج تھے انہیں تاریخ کا نام دیا۔

جن افراد نے رجال کی تدوین و ترتیب میں حصے لئے ان میں سے حسب ذیل افراد قابل ذکر ہیں، میں نے یہ سارے نام تہران یونیورسٹی کے کتب خانہ کی فہرست سے حاصل کئے ہیں۔

لائبریری کی فہرست میں جن حوالوں سے راویوں کے اسماء اکٹھا کئے گئے ہیں۔ میں نے حتیٰ الامکان خود ان حوالوں سے تطبیق کر لی تاکہ اشتباہ کا امکان باقی نہ رہ سکے۔

مثلاً لائبریری کی فہرست میں رجال نجاشی کے حوالہ سے جن افراد کے نام لکھے گئے تھے، میں نے ان اسماء کی مطابقت نجاشی کی "معرفۃ الرجال" سے کر دی ہے۔ لائبریری کے کیٹلاگ میں معرفۃ رجال کا یہ نمبر ہے: ۱۰۱۲-۱-د

یا مثلاً جو اسماء فہرست طوسی یا کتاب "الذریعہ" کے حوالوں سے لکھے گئے تھے میں نے ان اسماء کی بھی مطابقت "ذریعہ اور فہرست طوسی" سے کر دی ہے۔

یہ واضح رہے درج اسماء میں بغیر کسی تفریق کے ان علماء کے نام دئے جارہے ہیں، جنھوں نے "تاریخ و رجال" پر کتابیں لکھی ہیں خواہ اس کی تصنیف سے ان کا مقصد تاریخ نویسی رہا ہو یا اصلاح حدیث:۔

۱۔ عبداللہ بن رافع ــــ بحوالہ فہرست طوسی ص۱۰۷ ۲۔ ابن اسحاق محمد نواده یسار متوفی ۱۵۱ھ ان کی کتاب کا نام مدرک استیعاب ہے۔

۳۔ طبری ابوجعفر ۳۱۰ ان کی کتاب کا نام بھی استیعاب ہے۔

۴۔ عبداللہ بن جبلہ بن حنان متوفی ۲۱۹ھ، نجاشی کا بیان ہے رجال میں کتاب رکھتے تھے۔ نجاشی ص۲۳۵

۵۔ یقطینی محمد بن عیسیٰ بن عبید بن یقطین، نجاشی کا بیان ہے رجال میں کتاب رکھتے تھے۔ نجاشی ص۲۳۵

۶ ــــ محمد بن احمد بن نعیم پسر شاذان نیشاپوری نے التراجم تحریر کیا۔

۷ ــــ حسن بن محبوب متوفی ۲۲۴ھ کتاب المشیخہ تحریر کی فہرست طوسی ص۴۷، صاحب توضیح المقال نے ص۶۵ پر "معرفۃ رواۃ الاخبار" نام کی کتاب کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

۸ ــــ احمد بن حسین بن عبدالملک ازدی (اودی) نے "مشیخہ" کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا۔

۹ ــــ محاربی ابوعبداللہ محمد بن حسن بھی کتاب رجال کے مصنف تھے

۱۰ ــــ جزاونی علی ابن عباس "الممدوحین والمذمومین" کے نام کی کتاب کے مصنف تھے۔

۱۱ ــــ حسن بن علی بن فضال فطحی، متوفی ۲۲۴ھ، کتاب رجال رکھتے تھے۔

۱۲ ــــ ابن سعد محمد ازہری بصری کاتب واقدی، متوفی ۲۳۰ھ۔ ان کی طبقات پندرہ جلدوں میں شائع

ہوئی ہے اور سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، نے اس کی تلخیص کی ہے۔

۱۳۔ واقدی محمد بن عمر استاد ابن سعد، ان کی کتاب کا نام "مدرک استیعاب" ہے۔

۱۴۔ ابن المدینی علی، متوفی ۲۳۴ھ، دس جلدوں میں تاریخ لکھی ہے۔

۱۵۔ علی ابن حسن بن علی بن فضال فطحی، کتاب رجال رکھتے تھے۔

۱۶۔ خلیفہ ابن الخیاط، متوفی ۲۴۰ھ، ان کی کتاب "مدرک استیعاب" ہے۔

۱۷۔ بخاری محمد بن اسماعیل بن مغیرہ، متوفی ۲۵۶ھ، نے تین کتابیں لکھی ہیں۔

۱۸۔ مسلم بن حجاج، متوفی ۲۶۱ھ، بھی طبقات کے مصنف ہیں۔

۱۹۔ برقی احمد بن محمد بن خالد، متوفی ۲۷۴ھ نے طبقات الرجال لکھی ہے۔

۲۰۔ عیاشی سمرقندی محمد بن مسعود نے "معرفۃ الناقلین" لکھی ہے (نجاشی ص ۲۴۸)

۲۱۔ رواجنی ـ عباد بن یعقوب "المعرفۃ فی معرفۃ الصحابہ" ان ہی کی ہے۔ (فہرست طوسی ص ۱۱۹)

۲۲۔ نرماشیری یحیی بن زکریا "منازل الصحابہ" ان ہی کی ہے (نجاشی ص ۳۰۹)

۲۳۔ ابو الفرج قنانی کاتب پسر محمد بن یعقوب نے "معجم رجال ابی مفضل" لکھی ہے (نجاشی ص ۲۸۳)

۲۴۔ دیلمی محمد بن وہبان نے "من روی عن امیر المومنین" تحریر کی ہے۔ (نجاشی ص ۲۸۲)

۲۵۔ ابو القاسم بلخی نے "معرفۃ الناقلین" اور "فرق الشیعہ" لکھی ہے۔ (نجاشی ص ۳۰۲)

۲۶۔ احمد بن عبد الواحد نے "فہرست الرجال" لکھی ہے۔ (توضیح المقال ص ۶۵)

۲۷۔ ابن ابی خیثمہ احمد بن زہیر، متوفی ۲۷۹ھ، ان کی کتاب کا نام "مدرک استیعاب" ہے۔

۲۸۔ عقیقی احمد بن علی، متوفی ۲۸۰ھ، نے تاریخ الرجال لکھی ہے (نجاشی ص ۵۹)

۲۹۔ مطین محمد بن عبد اللہ بن سلیمان حضرمی، (۲۹۷-۲۰۲ھ)، نے "مدرک اصابہ" لکھی ہے۔

۳۰۔ ابن حرم ہروی، متوفی ۳۰۱ھ،

۳۱۔ ابن مندہ ابو عبد اللہ محمد بن یحیی، متوفی ۳۰۱ھ۔

۳۲۔ حمید نینوائی دہقان، متوفی ۳۱۰ھ۔

۳۳۔ دولابی (۲۲۴-۳۱۰ھ)

۳۴۔ عبد العزیز بن اسحق۔

۳۵۔ محمد بن یعقوب کلینی، متوفی ۳۲۹ھ، نے کتاب رجال لکھی ہے۔ (نجاشی ص ۲۶۷)

۳۶۔ جلودی، متوفی ۳۳۲ھ۔

۳۷۔ مسعودی علی بن حسین، متوفی ۳۳۳ھ۔

۳۸۔ عیسیٰ بن مہران (فہرست طوسی ص ۱۱۶)

۳۹۔ ابن بطہ محمد بن جعفر مودب قمی۔

۴۰۔ محمد بن عبد اللہ۔

۴۱۔ ابن عقدہ ہمدانی (۲۴۹ - ۳۳۳) موصوف نے چار ہزار افراد کے حالات تحریر کئے ہیں۔ (ذ(
کتب دانشگاہ تہران بہ نقل از ص ۵ مشیخہ صاحب ذریعہ)، فہرست طوسی ص ۲۸ و نجاشی ص ۶۸-۶۹
کہا جاتا ہے کہ ان کی کتاب کے کچھ حصے یمن کے بادشاہی کتب خانہ میں ابھی بھی موجود ہیں۔

۴۲۔ ابو سلیمان محمد بن عبد اللہ، متوفی ۳۲۸ھ۔

۴۳۔ محمد بن احمد اشعری۔

۴۴۔ سعد بن عبد اللہ اشعری (فہرست طوسی ص ۵) و (نجاشی ص ۱۳۶)

۴۵۔ طبرانی (۲۶۰ - ۳۲۰ھ)

۴۶۔ ابن ولید قمی، متوفی ۳۴۳ھ، (نجاشی ص ۲۳)

۴۷۔ احمد بن محمد بن عمار کوفی (متوفی ۳۴۶ھ)

۴۸۔ علی ابن محمد بن زبیر قرشی، متوفی ۳۴۸ھ۔

۴۹۔ ابن سکن سعید بن عثمان، متوفی ۳۵۳ھ۔

۵۰۔ ابن حبان، متوفی ۳۵۴ھ۔

۵۱۔ قاضی جعابی محمد بن عمر، متوفی ۳۵۵ھ۔

۵۲۔ کشی ــ ابو عمرو محمد بن عمر عبد العزیز نے "معرفۃ الناقلین" لکھی ہے۔ شیخ طوسی، متوفی ۴۶۰ھ
اس کی تلخیص کرکے "اختیار الرجال" نام رکھا ہے۔

۵۳۔ محمد بن احمد بن دواد قمی، متوفی ۳۶۸ھ۔

۵۴۔ ابو غالب زراری احمد بن احمد، متوفی ۳۶۸ھ

۵۵۔ شیخ صدوق (متوفی ۳۸۱، نے "المصابیح" لکھی ہے (نجاشی ص ۲۸۶ و ص ۲۵۸)

۵۶۔ ابن شاہین (۲۹۱-۳۸۵ھ)

۵۷۔ ابن ندیم محمد بن اسحٰق (۳۹۰) نے الفہرست لکھی ہے۔
۵۸۔ ابن عبدون معروف بہ ابن حاشر، متوفی ۴۲۳ھ۔
۵۹۔ ابونعیم اصفہانی، متوفی ۴۳۰ھ۔
۶۰۔ محمد بن ابو قرہ استاد نجاشی (متوفی ۴۵۰ھ ق) نے (نجاشی ص۲۸۳) معجم رجال ابی مفضل لکھی ہے۔
۶۱۔ ابوالعباس سیرانی احمد استاد نجاشی نے "المصابیح" لکھی ہے۔ (نجاشی ص۶۳ فہرست طوسی ص۳۷)
۶۲۔ ابن غضائری احمد بن حسین نے "الرجال الضعفاء" لکھی ہے۔
۶۳۔ ابو یعلی خلیلی (متوفی ۴۴۶ھ)
۶۴۔ نجاشی ابوالعباس احمد بن علی (متوفی ۴۵۰ھ) نے کتاب معرفة الرجال نجاشی لکھی ہے۔
۶۵۔ شیخ طوسی محمد بن حسن (متوفی ۴۶۰ھ)۔
۶۶۔ کتانی (متوفی ۴۶۶ھ)
۶۷۔ عبد بن جارود۔
۶۸۔ عقیلی
۶۹۔ ابن ابی حاتم۔
۷۰۔ الازرق۔
۷۱۔ ابن عبدالبر (متوفی ۴۶۳ھ)
۷۲۔ خطیب بغدادی احمد بن علی (متولد ۳۹۲ھ ۔متوفی ۴۶۳ھ)۔
۷۳۔ ابن فتحون ابوبکر
۷۴۔ شہاب الدین احمد بن یوسف۔
۷۵۔ اکفانی (متوفی ۴۶۶ھ) ہبتہ اللہ بن احمد۔
۷۶۔ سمعانی (۵۰۶ھ ۔۵۶۲ھ) عبد الکریم۔
۷۷۔ ابوموسی (۵۰۱ھ ۔۵۸۱ھ) محمد ابن ابوبکر۔
۷۸۔ منتجب الدین علی بن عبید اللہ بابویہ (متوفی بعد از ۵۸۵ھ) کتاب "الفہرست" وتاریخ علمای شیعہ لکھی ہے اور علامہ مجلسی نے بحار کی پچیسویں جلد میں اسے شامل کیا ہے۔
۷۹۔ ابن شہر آشوب محمد بن علی (متوفی ۵۸۸ھ) نے فہرست طوسی کا تکملہ لکھا ہے۔
۸۰۔ ابوالفرج بن جوزی عبد الرحمٰن بن علی (متوفی ۵۹۷ھ)
۸۱۔ مقدسی علی بن مفضل (متوفی ۶۱۱ھ)
۸۲۔ ابن بطریق یحیی بن حسن (متوفی ۶۰۰ھ) نے کتاب رجال الشیعہ لکھی ہے (ذریعہ ج ۳ ص۲۲۲)
۸۳۔ ابن اثیر جزری (متوفی ۶۳۰ھ) نے اسد الغابہ لکھی ہے۔

۸۴۔ ابن ابی طی یحیٰی بن حمید حلبی (متوفی ۶۳۰ھ) نے استیعاب کو منظم کیا ہے۔
۸۵۔ قریش بن سبیع (متوفی ۶۶۴ھ) نے استیعاب وطبقات ابن سعد کی تلخیص کی ہے۔
۸۶۔ عبد العظیم بن عبد القوی منذری (متوفی ۶۵۶ھ)
۸۷۔ ابن طاؤس احمد بن موسیٰ بن جعفر حلی (متوفی ۶۷۳ھ) نے ۶۴۴ھ میں "حل الاشکال" لکھی اور اس میں پانچوں کتاب (کشی۔ نجاشی۔ فہرست۔ رجال طوسی۔ ضعفا ابن غضایری) کے مندرجات کو جمع کردیا ہے (ذریعہ جلد ۷، ص ۶۴)
۸۸۔ عزالدین احمد بن محمد (متوفی ۶۵۶ھ)
۸۹۔ محقق حلی جعفر ابن حسن (متوفی ۶۷۶ھ) نے فہرست طوسی کی تلخیص کی ہے۔
۹۰۔ ابن طاؤس، عبد الکریم بن احمد بن موسیٰ بن جعفر (۶۴۷ھ۔ ۶۹۳ھ)
۹۱۔ ابن داؤد حسن بن علی بن داود متولد ۶۴۷ھ
۹۲۔ علامہ حلی، حسن بن یوسف (متوفی ۷۲۶) نے خلاصۃ الاقوال و ایضاح الاشتباہ وکشف الاشتباہ لکھی۔
۹۳۔ برزالی، قاسم بن محمد دمشقی (متوفی ۷۳۸ھ)
۹۴۔ ذہبی، شمس الدین، ابوعبداللہ، محمد بن احمد بن عثمان (متوفی ۷۴۸ھ) نے اسد الغابہ کی تلخیص کی ہے۔
۹۵۔ ابن ایبک دمیاطی، احمد۔
۹۶۔ ابن رافع، تقی الدین نے تاریخ برزالی کا تکملہ لکھا۔
۹۷۔ ابن کثیر دمشقی (متوفی ۷۷۴ھ) نے چند کتابیں رجال میں لکھیں۔
۹۸۔ ابن معیہ دیباجی، محمد بن قاسم بن حسین بن قاسم حلی (متوفی ۷۷۶ھ)
۹۹۔ ابن الملقن، عمر (متوفی ۸۰۴ھ) نے طبقات المحدثین لکھی۔
۱۰۰۔ زین الدین عراقی، عبد الرحیم (متوفی ۸۰۶ھ) نے کتاب ابن ایبک دمیاطی کا تکملہ لکھا۔
۱۰۱۔ بہاء الدین علی نیلی حلی بن عبد الکریم (متوفی ۸۴۱ھ) نے کتاب الرجال لکھی۔
۱۰۲۔ ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی (متوفی ۸۵۲ھ) نے کتاب الاصابہ لکھی ہے۔
۱۰۳۔ سیوطی جلال الدین (متوفی ۹۱۱ھ) نے الاصابہ کی تلخیص کی ہے اور عین الاصابہ کے نام سے موسوم کیا۔

۱۰۴- صاحب معالم حسن بن زین الدین شہید ثانی (۹۵۹ - ۱۰۱۱ھ) نے تحریر طاوسی و ترتیب مشیخہ من لا یحضرہ الفقیہ لکھی۔

۱۰۵- ملا مصطفیٰ نے سلطان احمد عثمانی کے حکم سے استیعاب کو حرف حا تک ترکی میں ترجمہ کیا۔

۱۰۶- عاشق کبریٰ زادہ، کمال الدین محمد (متوفی ۹۶۲ھ) نے ملا مصطفیٰ کے ترجمہ کو حرف راء تک پہنچایا۔

۱۰۷- یوسف بن محمد حسینی عاملی (متوفی ۹۸۲ھ) جامع الاقوال لکھی اور رجال کشی کو مرتب کیا۔

۱۰۸- عبداللطیف بن علی بن شیخ احمد عاملی، شاگرد صاحب معالم (متوفی ۱۰۱۱ھ) و بہائی (متوفی ۱۰۳۱ھ) نے چار کتابوں (کافی، من لا یحضرہ الفقیہ، تہذیب، استبصار) کے رجال کی فہرست، ان کے طبقہ کے ذکر کے ساتھ تیار کی۔

۱۰۹- ملا عنایت اللہ قہپائی بن شرف الدین علی۔ انہوں نے بھی (۱۰۱۶ھ) میں ابن طاؤس کی طرح کتاب (کشی، نجاشی۔ ابن غضائری۔ رجال۔ فہرست) کو حروف تہجی کی ترتیب سے ایک جگہ پر جمع کیا اور مجمع الرجال کے نام سے موسوم کیا۔

۱۱۰- قاضی نور اللہ شوشتری (مقتول ۱۰۱۹ھ) نے مجالس المومنین لکھی۔

۱۱۱- ملا عبداللہ شوشتری (متوفی ۱۰۲۱ھ) نے کتاب الضعفاء ابن غضائری کو جو کتاب حل الاشکال ابن طاؤس میں شامل تھی اس سے علیحدہ کیا۔

۱۱۲- ملا عبدالنبی جزائری بن سعد (متوفی ۱۰۲۱ھ) نے حاوی الاقوال تحریر کی۔

۱۱۳- میرزا محمد استرآبادی (متوفی ۱۰۲۱ھ) نے تین کتابیں لکھیں، ان میں سب سے اہم منہج المقال ہے۔

۱۱۴- خداوردی افشار (متوفی ۱۰۲۱ھ)

۱۱۵- میرزا فیض اللہ تفرشی (متوفی ۱۰۲۵ھ)

۱۱۶- میر مصطفیٰ تفرشی (متوفی ۱۰۳۱ھ)

۱۱۷- نظام الدین قرشی (متوفی ۱۰۳۱ھ)

۱۱۸- شیخ محمد نجفی (متوفی ۱۰۸۵ھ)

۱۱۹- قطب الدین اشکوری (متوفی [illegible])

۱۲۰- میر داماد محمد باقر بن محمد استرآبادی حسینی اصفہانی (متوفی ۱۰۴۰)

۱۲۱- محمد تقی مجلسی اول ابن مقصود علی (متوفی ۱۰۷۰ھ) نے مشیخہ کتاب من لا یحضرہ الفقیہ لکھی ہے۔

۱۲۲- طریحی (متوفی ۱۰۸۵ھ)۔

۱۲۳- محمد امین کاظمی (متوفی ۱۰۸۵ھ)

۱۲۴۔ آقا رضی قزوینی (متوفی ۱۰۹۶ھ)
۱۲۵۔ کمال الدین حسینی، شیخ حسن بن علی عاملی۔
۱۲۶۔ شیخ حر عاملی محمد بن حسن (متوفی ۱۱۰۴ھ) نے امل الامل و تذکرۃ العلماء المتأخرین لکھی ہے۔
۱۲۷۔ ملا فرج اللہ حویزی۔
۱۲۸۔ ملا حیدر علی قمی۔
۱۲۹۔ محدث توبلی (متوفی ۱۱۰۷ھ)
۱۳۰۔ محمد صالح خاتون آبادی اصفہانی (۱۰۵۸ھ۔ ۱۱۱۶ھ) علامہ مجلسی کے بھانجے ہیں۔
۱۳۱۔ سید علی خان مدنی (متوفی ۱۱۲۰ھ)
۱۳۲۔ ملا عبد اللہ افندی (۱۰۶۶ھ۔ ۱۱۳۱ھ)
۱۳۳۔ ملا محمد اردبیلی (متوفی ۱۱۱۱ھ)
۱۳۴۔ شیخ سلیمان ماخوری (۱۰۷۵ھ۔ ۱۱۲۱ھ)
۱۳۵۔ ملا محمد جعفر خراسانی (متولد ۱۰۸۰ھ)
۱۳۶۔ آقا حسین خوانساری (متوفی ۱۱۲۸)
۱۳۷۔ علی بن عبد اللہ بحرینی (متوفی ۱۱۲۷ھ)
۱۳۸۔ میرزا محمد اخباری (متوفی ۱۱۳۲ھ)
۱۳۹۔ عبد اللہ سماہیجی (متوفی ۱۱۳۵ھ)
۱۴۰۔ شیخ یاسین بحرینی (متوفی ۱۱۴۵ھ)
۱۴۱۔ میر محمد ابراہیم ابن میر معصوم قزوینی (متوفی ۱۱۴۵ھ)
۱۴۲۔ رضی الدین بن سید محمد عاملی موسوی (۱۱۰۳ھ۔ ۱۱۶۸ھ) نے "اتحاف ذوی الالباب" نامی کتاب یادنسبتی پر منتہی ہونے والے القاب کے بارے میں لکھی ہے اور اسے کتاب ابن اثیر نیز سیوطی کی "اللباب" کا تکملہ قرار دیا ہے۔
۱۴۳۔ محمد بن علی بلادی (متوفی ۱۱۸۶ھ)
۱۴۴۔ شیخ یوسف (متوفی ۱۱۸۶ھ) نے "لؤلؤۃ البحرین" نامی اجازہ لکھا ہے۔

۱۴۵- سید حسین قزوینی (متوفی ۱۲۰۸ھ)
۱۴۶- عبدالنبی بن محمد (متوفی ۱۱۹۱ھ)
۱۴۷- سید مہدی بحرالعلوم بروجردی نجفی (متوفی ۱۲۱۲ھ)
۱۴۸- ابوعلی محمد بن اسماعیل (۱۱۵۹ھ - ۱۲۱۵ھ)
۱۴۹- سید احمد کاظمی۔
۱۵۰- داؤد ابن حسن جزائری نے اختیار الرجال کشی و رجال نجاشی کو مرتب کیا ہے۔
۱۵۱- محمد طاہر بن محمد طالب حسینی اردبیلی۔
۱۵۲- شیخ یحیٰی مفتی بحرین۔
۱۵۳- ملا درویش علی حائری۔
۱۵۴- سید محسن اعرجی کاظمینی (۱۱۳۰ھ - ۱۲۲۷ھ)
۱۵۵- سید عبداللہ شبر بن محمد رضا (متوفی ۱۲۴۲ھ)
۱۵۶- محمد علی ابن قاسم آل شکول حائری (متوفی ۱۲۴۵ھ)
۱۵۷- سید محمد باقر حجۃ الاسلام شفتی (۱۱۷۵ - ۱۲۶۰)
۱۵۸- شیخ عبدالنبی کاظمی (متوفی ۱۲۵۶ھ)
۱۵۹- شیخ مرتضیٰ انصاری (متوفی ۱۲۸۱ھ)
۱۶۰- ملا علی کنی تہرانی (۱۲۲۰ھ - ۱۳۰۶ھ)
۱۶۱- ابراہیم ابن حسین ابن علی۔
۱۶۲- حاجی نوری حسین ابن محمد تقی۔
۱۶۳- محمد طٰہٰ نجف (۱۲۴۱ھ - ۱۳۲۳ھ) ابن مہدی ابن محمد رضا تبریزی نجفی نے کتاب بنام "اتقان المقال" لکھی ہے اور اس میں راویوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔
۱۶۴- مامقانی۔ شیخ عبداللہ (متوفی ۱۳۵۱ھ) ابن شیخ حسن۔
۱۶۵- سید محسن عاملی (متوفی ۱۳۷۱ھ) نے اعیان الشیعہ لکھی ہے۔ اس کی ۳۴ جلد شام سے چھپ چکی ہیں۔

۱۶۶ ۔آقا بزرگ تہرانی، مصنف الذریعہ۔

درس: آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ: جناب ممتاز علی

معرفتِ خدا

فقیہ عالیقدر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ منتظری مدظلہ نے کچھ عرصہ سے نوجوان نسل کے لئے بعض اہم موضوعات پر مشتمل نہج البلاغہ کے شہ پاروں کی تشریح و توضیح کا نہایت مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ پیش نظر مقالہ "معرفت الہی" کے موضوع پر آپ کے درس کا ترجمہ ہے جس میں مولائے کائنات کے خطبہ ۱۸۶ کی تشریح کی گئی ہے۔

ادارہ

صفات خداوند عالم:

خداوند عالم کی صفتیں تین طرح کی ہیں:۔

۱۔ صفات حقیقیہ: جیسے علم، قدرت، حیات اور ارادہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو حقیقی ہیں، ان کو صفات کمال بھی کہتے ہیں۔

۲۔ صفات اضافیہ: جیسے خالقیت رازقیت۔

امر مکرّر کو اضافہ کہتے ہیں لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا رازق ہے، خالق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مخلوق بھی ہے جس کو اس نے خلق کیا ہے جس کو وہ رزق دیتا ہے۔

ان صفات کو صفاتِ اضافیہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا دوسرا سرا خود ہم ہیں ۔ ہم کو رزق ملتا ہے تو آخر یہ رزق کون دیتا ہے ؟ ۔ ظاہر ہے کہ ہمارا رازق خدا ہے ۔ اس صفت رازقیت کو صفت اضافیہ کہتے ہیں ، اسی طرح دوسرے موارد بھی ہیں ۔

۳۔ **صفات سلبیہ** : یہ وہ صفتیں ہیں جو خدا کے لئے نقص اور عیب ہیں ۔ اس لئے ہم ان صفتوں سے خدا کی نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا مرکب نہیں ہے ، جسم نہیں ہے ، عاجز نہیں ہے ، جوہر نہیں ہے ، عرض نہیں ہے ......

بہر حال ہم خدا کو ان ہی اضافی صفات اور صفات سلبیہ کے ذریعہ پہچانتے ہیں ۔ صفات حقیقیہ ، جو صفات کمال ہیں ہم ان کو نہیں پہچان سکتے ۔ اس لئے کہ ہم خود ناقص اور محدود ہیں اور ناقص کامل کا سراغ نہیں لگا سکتا ۔ محدود ، لامحدود کا احاطہ نہیں کر سکتا ۔

علم ، قدرت ، حیات اور ارادہ خدا وہ صفات ثبوتیہ ہیں جو حقیقی ہیں یہ صفتیں عین ذات خدا ہیں ۔ یعنی علم خدا وہ علم ہے جو لامتناہی ہے ، قدرت خدا وہ قدرت ہے جو لامحدود ہے ۔ حیاتِ پروردگارِ عالم وہ حیات ہے جو غیر متناہی ہے ۔ اسی طرح ذات باری تعالیٰ بھی غیر متناہی ہے وہ ہم انسانوں کی طرح نہیں ہے ۔ ہمارا علم اور ہماری قدرت زائد بر ذات ہیں ۔ اس لئے کہ ہم دراصل عالم نہیں ہیں ، پڑھنے لکھنے کے بعد تھوڑا سا علم حاصل ہو جاتا ہے ۔ دراصل ہمارے پاس قدرت نہیں ہے ۔ رفتہ رفتہ ہم کو قدرت اور توانائی حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن چونکہ خدا کا علم اور اس کی قدرت ذات خدا کی طرح لامتناہی ہیں ، کوئی صفت اس کی ذات سے جدا نہیں ہے ، اس لئے ہم اس کی ذات و صفت کو کما حقہ نہیں سمجھ پاتے ۔

ہم ایک بار پھر اس بات کو بیان کر دیں کہ ہمارے لئے خدا کی معرفت صرف صفات اضافیہ اور صفات سلبیہ کے ذریعہ ممکن ہے ۔ چونکہ " صفات اضافیہ " میں ہم خود طرف اضافت (دوسرا سرا) ہیں اس لئے کہتے ہیں کہ ہم حادث ہیں ۔ ہر حادث کو ایک محدث کی ضرورت ہے ۔ ہم کو رزق دیا جاتا ہے لہٰذا ہمیں ایک رازق کی ضرورت ہے ۔

صفات سلبیہ کے ذریعہ خدا کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ ۔ چونکہ ہم اپنی کمی اور نقص و عیب کو درک کر سکتے ہیں جیسے عاجزی ، احتیاج ، مرکب ہونا ، یا جسم والا ہونا وغیرہ ۔ اس لئے ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ خدا میں یہ کمی نہیں ہونی چاہئے ۔

لیکن صفات حقیقیہ، ذات خدا کی طرح ہیں وہ ہمارے فہم کی دسترس سے باہر ہیں۔ ہم ان کی کنہ تک نہیں پہونچ سکتے اس لئے کہ ہم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔
جن لوگوں نے خدا کی صفات حقیقیہ کی توضیح کی کوشش کی ہے۔ وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر بھٹک گئے ہیں یا ان سے بہت ہی فاش غلطی سرزد ہوئی ہے۔

صفات خدا کے بارے میں اشاعرہ کا عقیدہ:

اشاعرہ کا کہنا ہے کہ خدا کے صفات حقیقیہ حقیقت رکھتے ہیں وہ زائد بر ذات ہیں، یعنی خدا الگ ہے اور اس کا علم ایک الگ موجود ہے جو اس کی ذات کے علاوہ ہے اسی طرح قدرت، حیات، وغیرہ غرض کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کی سات حقیقی صفتیں، ذات خدا سے الگ موجودات ہیں اور وہ بھی قدیم ہیں۔ اس طرح وہ درحقیقت آٹھ قدیم کے قائل ہوگئے اور انہیں، اشاعرہ "قدمائے ثمانیہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔
متکلمین کی اس جماعت یعنی اشاعرہ پر اعتراض کیا گیا ہے کہ اگر عیسائی اقانیم ثلاثہ (باپ، بیٹا روح القدس) کے قائل ہونے کی وجہ سے مشرک ہوگئے تو اشاعرہ آٹھ قدیم ماننے کے بعد کیوں کر نہ مشرک ہوں گے۔ یہ بھی شرک ہی کی ایک قسم ہے۔

صفات خدا کے بارے میں معتزلہ کا عقیدہ:

معتزلہ اس عقیدہ سے دور رہنا چاہتے تھے اور چونکہ وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ صفات، عین ذات ہیں اس لئے انہوں نے کہا کہ "قدیم تو ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ خدا ہے۔ وہ علم، قدرت اور حیات وغیرہ نہیں رکھتا، ہاں اس کی ذات ہی اس کے صفات کی نائب ہے۔ یعنی خدا کی ذات صفت کی جگہ لے سکتی ہے۔ لہٰذا علم نہ رکھنے کے باوجود علم والے کام اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ قدرت نہ ہونے کے باوجود قدرت سے متعلق امور اس سے انجام پاتے ہیں۔

الٰہی فلسفیوں کا عقیدہ:

الٰہی فلسفیوں نے قرآن اور وحی الٰہی سے کسب فیض کیا ہے۔ انہوں نے نہ تو اشاعرہ کے عقیدہ

کو قبول کیا ہے نہ معتزلہ کے عقیدہ کو۔ ان کا کہنا ہے کہ خداوند عالم "حقیقی صفات" رکھتا ہے لیکن ہماری طرح سے اس کی صفات زائد بر ذات نہیں ہیں بلکہ عین ذات ہیں۔ خدا علم، قدرت، حیات وغیرہ رکھتا ہے اور جس طرح اس کی ذات لامتناہی ہے ویسے ہی اس کا علم اس کی حیات سب لامتناہی ہیں ۔ بعض فلسفیوں کی تعبیر کے مطابق حقیقت ہستی ۔عین علم، عین قدرت، عین ادراک اور عین حیات ہے ۔لہٰذا خدا یہ سب صفتیں رکھتا ہے لیکن یہ صفتیں زائد بر ذات نہیں بلکہ عین ذات ہیں۔

حاج ملا ہادی سبزواری مرحوم فرماتے ہیں:

والاشعری بازدیاد قائلۃ وقال بالنیابۃ المعتزلۃ

اشاعرہ زائد بر ذات صفات کے قائل ہیں اور معتزلہ ذات کو نائب صفات مانتے ہیں۔

بہر حال، وجود وہستی تمام کمالات کے ساتھ ساتھ ہے اور چونکہ ذات خدا لامتناہی ہے اس میں نیستی کا کہیں گذر نہیں ہے اس لئے علم بھی لامتناہی ہے ۔اس میں جہل کی کوئی گنجائش نہیں ۔ اسی طرح حیات اور قدرت وغیرہ بھی لامتناہی ہیں۔

چونکہ یہ صفات عین ذات پروردگار عالم ہیں اس لئے ہم انہیں درک نہیں کر سکتے۔ انسان ارتقا کی چاہے کتنی ہی بلند منزل پر کیوں نہ پہونچ جائے چاہے وہ خاتم الانبیاء ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن وہ ذات حق تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتا ۔اس لئے کہ ترقی کی اعلیٰ منزل کے بعد بھی وہ اس کی مخلوق اور ممکن الوجود رہے گا اور ممکن الوجود، ذات واجب الوجود کو بعینہ درک نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ معصومین علیہم السلام نے فرمایا: "ماعرفناک حق معرفتک" اے میرے معبود جو کمال اور حق معرفت ہے وہ ہم ادا نہیں کر سکتے۔

اس مختصر سی گفتگو کے بعد اب ہم مقدمہ کو تمام کرتے ہیں اور اصل خطبہ سے گفتگو شروع کرتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: "ما وحّدہ من کیّفہ" وہ موحّد نہیں ہے جو خدا کے لئے کیفیت کا قائل ہو جائے اس لئے کہ کیف اعراض میں سے ہے اور خدا نہ جسم ہے نہ عرض۔

مقولات عشر:

فلاسفہ کہتے ہیں کہ اس عالم کے تمام موجودات دس مقولوں پر منقسم ہیں۔ ان میں سے ایک مقولہ جوہر ہے۔

جوہر ذات اشیاء ہے اور دوسرے متولات اعراض ہیں "کیفیت" ان ہی اعراض میں سے ایک عرض ہے۔ جس کا مطلب ہے "کیفیت و احوال اشیاء"

دوسرا مقولہ "کم" ہے "کم" کا مطلب چیزوں کی مقدار اور اندازہ ہے جیسے خط، سطح، جسم و اعداد دوسرے سات مقولات کو اعراض نسبیہ کہتے ہیں مثلاً اشیاء کی نسبت جب زمانہ سے دی جاتی ہے تو اس کو "متیٰ" اور مکان سے نسبت دی جاتی ہے تو "این" کہتے ہیں۔[1]

اقسام کیف:

فلاسفہ کیف[2] کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ **کیفیات محسوسہ:** وہ کیفیتیں جو حواس پنجگانہ (ذائقہ، سامعہ، لامسہ، باصرہ اور شامہ) کے ذریعہ محسوس کی جاتی ہیں جیسے رنگ جو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ یا کسی چیز کی نرمی، سختی یا حرارت و برودت ہاتھوں کے ذریعہ محسوس ہوتی ہے۔

۲۔ **کیفیات استعدادیہ:** وہ چیزیں جن میں متاثر و منفعل ہونے کی قوت ہو یا نہ ہو مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں شئے نرم ہے وہ دب سکتی ہے، یا فلاں چیز سخت ہے نہیں دب سکتی۔ یا یہ کہتے ہیں کہ فلاں ضعیف المزاج ہے۔ بیمار ہونے کی استعداد اس میں موجود ہے یا یہ کہتے ہیں کہ فلاں قوی المزاج ہے اس میں جراثیم اور حوادثات

---

[1] مقولات عشر سے مراد ایک تو جوہر ہے اور نو مقولہ عرض ہیں۔ کم، کیف، وضع، این، اضافہ، متیٰ، ملک، فعل و انفعال مقولہ عرض ہیں ارسطو کا کہنا ہے کہ دنیا کے تمام موجودات انہیں دس مقولوں پر منحصر ہیں۔ بعض فلاسفہ پانچ ہی مقولات کے قائل ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ بنیادی مقولات چار ہیں (جوہر، کم، کیف اور نسبت) یہ حضرات نسبت کو "این" اور زمان سے نسبت کو "متی" سمجھتے ہیں۔

[2] "کیف" سے مراد وہ عرض ہے جس کا تصور خود اس کے علاوہ کسی دوسرے پر موقوف نہ ہو (انها هيئة قارة لا يوجب تصورها تصور شئي خارج عنها و عن حاملها) خواجہ نصیر الدین طوسی اساس الاقتباس میں فرماتے ہیں کہ: "کیف ہر اس ہیئت کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے موضوع پر موقوف نہ ہو اور اس کے تصور میں خود اس کے علاوہ کسی دوسرے نسبت کے تصور کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سے بچنے کی قوت پائی جاتی ہے ۔ ان ساری باتوں کو کیفیاتِ استعدادیہ کہتے ہیں ۔

۳ ۔ **کیفیات نفسانیہ** : وہ صفتیں جو نفس انسان میں پیدا ہوتی ہیں جیسے آدمی عالم نہیں ہوتا بعد میں علم حاصل کرتا ہے یا قدرت نہیں رکھتا، بعد میں صاحب قدرت بنتا ہے ۔ یہ قدرت وعلم وغیرہ جو انسان کے نفس میں پیدا ہوجاتے ہیں انہیں کیفیات نفسانیہ کہتے ہیں ۔

۴ ۔ **وہ کیفیات جو "کمیات" سے مخصوص ہیں :**

یہ وہ کیفیتیں ہیں جو مقدار پر عارض ہوتی ہیں جیسے خط سطح اور جسم تعلیمی "یہ کم" ہیں لیکن ان میں ایک کیفیت پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے ۔ ان کیفیتوں کو "کم" سے مختص کیفیت کہتے ہیں مثلاً ایک جسم جو "مثلث ہے"، ممکن ہے کہ وہ "مربع" یا "ذوزنقہ" ہوجائے ۔ یا جسم تعلیمی کی سطح جو کبھی مثلث اور کبھی مربع ہوجاتی ہے ۔ یہ وہ کیفیات ہیں جو کمیات سے مخصوص ہیں ۔

لہٰذا ان کیفیتوں کو جو عوارض اور زائد بر ذات ہیں، اگر خدا سے نسبت دی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ چیزیں اس کے پاس نہیں تھیں، کسی دوسرے نے یہ ساری چیزیں اسے عطا کی ہیں ۔ ایسی صورت میں ایک ایسے ایجاد کرنے والے کی ضرورت ہوگی جو ان صفتوں کو اس خدا کو عطا کرے !! اور کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان باتوں کا قائل ہو یا اس کا دعویٰ کرے ۔

یا یہ کہا جائے کہ یہ کیفیتیں زائد بر ذات ہیں اور خدا خود اپنی ذات پر ان کیفیتوں کو عارض کرتا ہے ایسی صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ خدا ازل سے ان کیفیتوں کا حامل ہے ۔ پھر تو یہ وہی بات ہوگی جو اشاعرہ کہتے ہیں ۔ اشاعرہ "قدمائے ثمانیہ" کے قائل ہیں اور یہ شرک ہے ۔

اسی وجہ سے امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "ما وحده من كيفه" یعنی وہ مشرک ہوجائے گا جو خدا کے لئے کیفیتوں کا قائل ہوجائے اس لئے کہ کیف عرض ہے اور اعراض زائد بر ذات ہیں ۔ اگر کوئی خدا کے لئے کیف کا قائل ہوجائے اور کیف کو ذات کی طرح قدیم جانتا ہو تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ایک "ذات قدیم" ہو اور ایک "کیفیت قدیم" اس طرح پلٹ کر اشاعرہ ہی کی بات آتی ہے جو خلاف توحید ہے ۔

اس نکتہ کو حضرتؑ نے اپنے پہلے خطبہ میں بیان فرمایا ہے ۔ آپ فرماتے ہیں کہ "فمن وصف الله فقد قرنه" جو خدا کے لئے ایسی صفت کا قائل ہو جیسی صفت ہمارے اندر پائی جاتی ہے، جیسے علم ،

قدرت، کیف (سفیدی، سیاہی، درازی، کوتاہی وغیرہ) تو یہ صفتیں ہماری ذات پر زائد ہیں ایسی صفتوں کا خدا کی ذات میں قائل ہونا خدا کی ذات میں الگ سے ان صفتوں کا لانا ہے اور اس طرح تعبیر کرنا ہے کہ ایک تو خدا کا وجود ہے۔ اور الگ سے اس میں علم بھی ہے!

"ومن قرنہ فقد ثناہ" اور اگر ایسی چیزوں کو خدا کا قرین قرار دیا تو دوگانگی کے قائل ہوگئے اور یہ شرک ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح عیسائی اقانیم ثلاثہ (باپ، بیٹا، روح القدس) کے قائل ہیں۔ یا اشاعرہ "قدماء ثمانیہ" کے قائل ہیں۔

"لشہادۃ کل صفۃ انہا غیر الموصوف وشہادۃ کل موصوف انہ غیر الصفۃ" اس لئے کہ ہر صفت گواہی دیتی ہے کہ وہ موصوف سے الگ ایک چیز ہے اور ہر موصوف شہادت دیتا ہے کہ وہ صفت کا غیر ہے۔ لہٰذا اگر کوئی علم، قدرت، حیات کو زائد بر ذات مانے تو یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ درحقیقت صفات خدا عین ذات ہیں یعنی وہی ذات عین علم و قدرت و حیات ہے۔

ہم اس مقام پر مذکورہ بالا گفتگو کی مناسبت سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث نقل کر رہے ہیں تاکہ مطلب واضح ہو جائے۔

ابوالفضل شیبانی اس حدیث کو نقل کرتے ہوئے اس کی سند ابن عباس تک لے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "قدم یہودی علی رسول اللہ" ایک یہودی پیغمبر کی خدمت میں آیا "فقال یا محمد! انی سائلک عن اشیاء تلجلج فی صدری منذ حین" اور اس نے کہا کہ میرے دل میں ایک بات ہے جو بہت دنوں سے کھٹک رہی ہے وہ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ "فان انت اجبتنی عنہا اسلمت علی یدک" اگر آپ اس کا جواب دیدیں تو میں آپ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کر لوں گا۔

حضرت نے فرمایا: "اسأل یا ابا عمارۃ" اے ابوعمارہ پوچھو۔ "فقال یا محمد صف لی ربک" اس نے کہا کہ آپ ہمارے لئے اپنے رب کی توصیف بیان کریں۔

آپ نے فرمایا " ان الخالق لا یوصف الا بما وصف بہ نفسہ" وہ خدا جو تمام موجودات کا پروردگار ہے قابل توصیف نہیں ہے، مگر ان چیزوں کے ذریعہ، جن سے خود اس نے اپنی توصیف کی ہے (وہ صفات، صفات کمال ہیں اور صفات کمال عین ذات ہیں)

اس مقام پر اہل فن کے لئے ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ فلاسفہ ——

حکمت متعالیہ ــ کی بحث میں کہتے ہیں کہ:

"عالم میں حقیقت وجود کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تمام ماہیتیں امور اعتباری ہیں عدم تو کچھ ہے ہی نہیں۔ لہٰذا حقیقت بس ہستی ہے اس لئے صفات کمال جو حقیقت ہیں انکی بازگشت حقیقت ہستی کی طرف ہوتی ہے۔"

یہ درحقیقت مذکورہ بالا مطلب کی دلیل ہے۔ اور وہ اس طرح کہ حقیقت ہستی و وجود، تمام حقائق کمالیہ کی بہ نسبت مساوی ہے۔ حقیقت ہستی میں علم و قدرت وحیات ہے اس لئے جو صفات، صفات کمالیہ ہیں ان کی بازگشت حقیقت ہستی کی طرف ہوتی ہے۔ خدا ان تمام صفتوں کا حامل ہے اور یہ تمام صفتیں عین ذات ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی خدا کی ذات پر زائد صفت کا قائل ہو تو وہ مشرک ہے۔

پیغمبر ختمی مرتبت نے خداوند عالم کے بارے میں جو ارشاد فرمایا ہے، روایت اسے یوں بیان کرتی ہے:

وکیف یوصف الخالق الذی یعجز الحواس ان تدرکہ والاوھام ان تنالہ والخطرات ان تحدہ

اس خالق کی توصیف انسان کیسے بیان کرسکتا ہے جو اس اور اوھام جسے درک کرنے سے عاجز اور دل میں آنے والے خیالات پروردگار عالم کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔

دریا کوزہ میں نہیں سمویا جاسکتا۔ بس اسی طرح لامحدود خدا، ہماری محدود فکر میں (جو خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہے)، نہیں آسکتا ــــ "والابصار عن الاحاطہ بہ" آنکھیں اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اور بات تو دراصل یہ ہے کہ خدا جسم ہی نہیں ہے جسے آنکھیں دیکھ سکیں۔

"جل عما یصفہ الواصفون" خدا توصیف کرنے والوں کی توصیف سے منزہ ہے۔

صفات ثبوتیہ کو کمال وجمال اور صفات سلبیہ کو صفات جلال کہتے ہیں ــ صفات جلال کا مطلب یہ ہے کہ خدا ان صفتوں سے منزہ ہے۔

"نأی فی قربہ" خدا نزدیک ہونے کے بعد دور ہے۔ قرآن میں اس نے خود ہی کہا ہے کہ:

نحن اقرب الیہ من حبل الورید (سورہ ق/۱۶)

میں شہ رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ لیکن اتنی قربت کے بعد بھی وہ دور ہے

ں لئے کہ ہم میں سے کوئی بھی اتنی قربت کے باوجود اس کو درک نہیں کر سکتا۔ "وقرب فی نأیہ" اور
ور ہونے کے باوجود قریب ہے "وھو معکم اینما کنتم" تم جہاں کہیں بھی رہو وہ تمہارے ساتھ
ہے۔ تمہارا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ہاں تم اس کا درک نہیں کر سکتے۔

"کیف الکیفیۃ" یہ کیفیتیں اپنی مختلف قسموں کے ساتھ اسی کی پروردہ ہیں اور خدا ان کیفیتوں
کا خالق اور ایجاد کرنے والا ہے۔ "فلا یقال لہ کیف" لہٰذا اس کے لئے "کیف" کی لفظ
نہیں بولی جا سکتی۔ کیفیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ کیسا ہے اور خدا جسم نہیں ہے کہ پوچھا جائے کہ کیسا ہے۔

"واین الاین" مکان تو مخلوق خدا ہے "فلا یقال لہ این" لہٰذا یہ بھی نہیں کہا
جا سکتا کہ خدا کہاں ہے؟ وہ زمان و مکان کا خالق ہے لہٰذا زمان سے بالاتر ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا
جا سکتا کہ وہ کہاں ہے؟! کیسا ہے؟!

"وھو منقطع الکیفوفیۃ والاینونیۃ" وہ "کیف" اور "این" سے جدا ہے۔

"فھو الاحد الصمد[1]" وہ یگانہ ہے کسی قسم کا کوئی نقص اس کی ذات میں نہیں ہے۔ "کما
وصف نفسہ" جیسا کہ اس نے خود ہی اپنا وصف قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔

"والواصفون لایبلغون نعتہ" توصیف کرنے والے اس کی کنہ صفات تک نہیں پہونچ
سکتے۔ "لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد" نہ تو اس کا کوئی بیٹا ہے
ور نہ کسی نے اس کو پیدا کیا ہے اور نہ کوئی اس کا کفو ہے۔

جب یہودی نے ان باتوں کو سنا تو کہنے لگا "صَدَقتَ یا محمدؐ" آپ نے صحیح فرمایا پھر اس نے
پوچھا کہ "اخبرنی عن قولک انہ واحد لاشبیہ لہ، الیس اللہ واحد
والانسان واحد؟ فوحدانیتہ اشتبھت وحدانیۃ الانسان" آپ جو یہ فرماتے
ہیں کہ خدا واحد ہے تو انسان بھی تو واحد ہے؟ لہٰذا خدا کی وحدانیت انسان کی وحدانیت کی شبیہ ہوگی،

---

[1] صمد کے مختلف معانی علماء نے ذکر کئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ "صمد مقصود موجودات کو کہتے ہیں۔ یعنی تمام
موجودات اپنے کمال کے سلسلہ میں اسی کے محتاج ہیں۔ ایک معنی یہ بھی ہے کہ ذات حق تعالیٰ میں کوئی خلاء نہیں ہے۔
وہ ہر نقص و عیب سے پاک ہے۔

پیغمبرؐ نے فرمایا تو واحد کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کر رہا ہے۔ خدا کی وحدانیت کی حقیقت ہماری اور تمہاری وحدانیت کی حقیقت سے جدا ہے۔ انسان واحد ہے یعنی نوع واحد ہے۔ اور "خدا واحد ہے" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی حقیقت ہے جس کے بارے میں شبیہ اور مثل کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ذات احدی ہے یعنی اس کی ذات بسیط ہے مرکب نہیں ہے۔ فقال: "اللہ واحد واحدی المعنیٰ والانسان واحد ثنوی المعنیٰ" وہ واحد ہے اس کی ذات، ذات احدی ہے یعنی وہ مرکب نہیں بلکہ بسیط ہے اور انسان واحدِ دوگانہ ہے یعنی عدد کے اعتبار سے واحد ہے لیکن مختلف عنوان سے اسمیں دوئی پائی جاتی ہے۔

"جسمٌ و عرضٌ و بدنٌ و روحٌ" انسان جسم و عرض و بدن و روح سے مرکب ہے لہٰذا انسان کی ذات میں ترکیب اور دوئی پائی جاتی ہے لیکن خدا کی ذات میں کسی قسم کی ترکیب اور دوئی کا وجود نہیں ہے "فانما التشبیہ فی المعانی" لہٰذا مفہوم وحدت معنائے ذہنی کے اعتبار سے دونوں پر منطبق ہوتا ہے اور کسی دوسرے اعتبار سے منطبق نہیں ہوتا۔

"قال صَدَقتَ یا محمدؐ" اس یہودی نے کہا آپ صحیح فرماتے ہیں۔[1]

---

[1] بحار الانوار ج ۳ ص ۲۰۴ منقولہ از کفایۃ النصوص

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ
ترجمہ: جناب محمد تقی رحیمیان
جناب منظور محسن رضوی

زیرِ نظر کتاب کا موضوع "فطرت" ہے۔ "فطرت" ایک جہت سے فلسفی بحث ہے۔ کیونکہ فلسفہ کے اہم موضوعات تین ہیں (۱) خدا (۲) جہان (۳) انسان۔ زیرِ بحث موضوع کے ایک حصہ کا تعلق انسان سے ہے اور دوسرے کا خدا سے۔ اور دوسری جہت سے قرآن و سنت میں فطرت کے مسئلہ پر بہت زور دیا گیا ہے اور یہ بات انسان کے بارے میں ایک خصوصی نقطۂ فکر کی نشان دہی کرتی ہے یعنی قرآن انسان کے لئے "فطرت" کا قائل ہے۔

اب ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ فطرت کیا ہے؟ کیا قرآن مجید سے پہلے بھی کسی نے اس فطرت کا استعمال انسان سے وابستگی کے ساتھ کیا ہے۔ جو دلائل ہم مضمون کے ضمن میں بیان کرنے والے ہیں ان سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ فطرت کا استعمال قرآن مجید سے پہلے کسی نے انسان کے متعلق نہیں کیا ہے۔

دوسرے اس امر کی طرف بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا اساسی طور پر انسان "فطریات" کا حامل ہے، یا نہیں؟

ہماری تیسری بحث اس مسئلہ میں ہوگی کہ دین فطری ہے یا نہیں؟ کیونکہ قرآن مجید نے وضاحت کے ساتھ تصریح کی ہے کہ دین فطری ہے۔ اس لئے ہمیں خود انسان کے بارے میں بحث کرنا ہوگی۔ یہ مسئلہ (انسان) بہت پہلو دار ہوگا۔ ان پہلوؤں میں سے ایک "مسئلہ تعلیم و تربیت" ہے بذاتِ خود ایک وسیع موضوع بھی ہے۔

تربیت کا فطرت سے گہرا تعلق :

اگر انسان "فطریت" رکھتا ہے تو اس کی تربیت کے لئے فطریات کو سامنے رکھنا ہوگا ۔ خود تربیت کی لفظ شعوری یا غیر شعوری طور پر جب بھی استعمال ہوتی ہے تو اس کی بنیاد یہی ہے ۔ چونکہ تربیت یعنی رہنمائی اور پرورش سے پہلے دین میں ایک استعداد مسلم ہوتی ہے جسے آج کی زبان میں انسانی خصوصیات کہتے ہیں اور یہ بات اس بنیاد پر ہے کہ انسان کے متعلق کچھ فطری تقاضے مان لیے گئے ہیں چنانچہ تربیت اور صنعت میں فرق ہی یہ ہے کہ صنعت میں صرف اشیاء کو بنایا اور سنوارا جاتا ہے ۔ یعنی جب انسان مقصد کے حصول کی کوشش کرتا ہے تو مقصد برآری کے لئے کچھ مواد اکٹھا کرتا ہے اور پھر اسے اپنے مقصد میں استعمال کرتا ہے ۔ یعنی اس کی توجہ اس طرف بالکل نہیں ہوتی کہ اس کے استعمال سے خود مادہ ناقص ہو جاتا ہے یا کامل بنا رہتا ہے ۔ بلکہ اس کی پوری توجہ مقصد برآری کی طرف ہوتی ہے ۔ جیسے ایک معمار جب عمارت بنانا چاہتا ہے تو اس کی توجہ عمارت سازی کی طرف ہوتی ہے اور وہ چونا، مٹی، لوہا اور سیمنٹ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کہ وہ انھیں بذات خود تیار کر رہا ہے ۔ یا خراب کر رہا ہے بلکہ کبھی کبھی تو اپنے مقصد کے حصول کے لئے مادہ بھی توڑ پھوڑ کر کے اسے خراب کر دیتا ہے ۔ اس کے برخلاف ایک باغبان اپنے پیش نظر نافع رکھتا ہے ۔ وہ پھول پودوں کو ان کی صلاحیت کے مطابق دیکھ بھال کرتا ہے ۔ وہ پھول پودوں کی طبعی صلاحیتوں اور ان کے نشو و نما کے متعلق طبعی کمال سے واقف ہوتا ہے ۔ اور ان کی طبعی اور فطری تقاضوں کے مطابق دیکھ بھال کرتا اور ان کی فطرت سے طبیعی رفتار سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔

انسان کی پرورش دو طرح سے ممکن ہے ۔ ایک پرورش تو وہ ہے جیسے ہم چیزوں کو بناتے ہیں ۔ یعنی بنانے والا چیز کو صرف اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے تاکہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرے ۔ خواہ اس شئ کو ناقص کر کے اپنا مقصد حاصل کرے یا اس شئی کو کامل کر کے اپنا مقصد پورا کرے مثلاً ایک دنبہ کو لیجیے کبھی تو دنبہ کی پرورش خود دنبہ کے مفاد میں ہوتی ہے اور کبھی اپنے مفاد میں ۔ اگر دنبہ کے مفاد کے پیش نظر اسے آختہ کریں تو کیا یہ فعل دنبہ کے مفاد میں ہوگا؟ نہیں کبھی نہیں ۔ کیونکہ پہلے تو ہم نے اس کو اپنے عمل سے سخت اذیت پہنچائی اور پھر اس میں نقص

پیدا کر دیا۔ طبیعی آلات میں سے ایک ــ جو اس کے لیے لازمی بھی تھا اور کمال بھی، اس سے محروم کر دیا۔ مگر جب اسے ہم اپنے مفاد کے لئے پالتے ہیں تو ہمیں اس کے طبیعی انتظامات کی شکست و ریخت سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ اس لئے کہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ خوب موٹا تازہ رہے اور اسی واسطے ہم اسے آختہ کر دیتے ہیں۔ انسان کے لئے بھی سوشلزم کی طرف سے کچھ ایسا ہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو اجتماعیت پسند انسان کو ایسے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے طبقہ حکام کے مقاصد اچھی طرح پورے ہو سکیں یا پھر بقول انہیں لوگوں کے انسان اس طرح معاشرہ کے لئے مفید بن سکے، یہ لوگ کبھی یہ کہتے ہیں کہ معاشرے کے لئے کچھ ایسے فوجی افراد کی ضرورت ہے جو اس طرح منظم کئے جائیں کہ افسران بالا کے احکام آنکھیں بند کر کے بے چون و چرا انجام دے سکیں۔ ان کے مقابلہ میں اگر کوئی ایسا باہمت انسان ہے جو عقل و ارادہ میں مستقل رہتے ہوئے یا انسانی جذبات و رجحانات کا لحاظ رکھتے ہوئے اقدام کرتا ہے تو ایسا انسان ان اجتماعیت پسند لوگوں کے لئے ناکارہ، بیکار اور معاشرہ کے لئے غیر مفید ہوتا ہے۔ دراصل ان کی نظر میں ایسے ہی لوگ مفید اور کارآمد ہیں جو فکر و احساس سے عاری اور جذبات و رجحانات سے خالی ہوں۔ اور مفید وہ انسان ہوتا ہے کہ اگر مثلاً اسے ایک بم دیا جائے، اور کہا جائے کہ جاؤ فلاں شہر کے لوگوں پر گرا آؤ تو وہ یہ سوچے کہ آخر اس شہر کے لوگوں نے کیا غلطی کی ہے بلکہ آنکھ بند کر کے بلا سوچے سمجھے لوگوں کو تباہ و برباد کر دے۔!!!

تربیت و پرورش کا صحیح مفہوم:

جس طرح سے کسی بھیڑ کو آختہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ خوب کھائے پیئے اور تندرست و توانا ہو جائے۔ اسی طرح سے یہ لوگ انسان کے جذبات و احساسات کو اس کے وجود میں مردہ بنا دینا چاہتے ہیں اور ایک ایسی حالت اس میں پیدا کر دینا چاہتے ہیں کہ اس سے اس کی حریت اور آزادی فکر جاتی رہے۔ درحقیقت ایسی ہی صورت میں انسان ان کے لئے مفید و کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ طریقہ صحیح مفہوم تربیت کی بنیاد پر قائم نہیں ہے بلکہ صحیح تربیت کا مفہوم تو

یہ ہے کہ انسان کی اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پرورش کی جائے۔ اگر اس میں سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت موجود ہے تو اسے مزید بڑھایا جائے نہ یہ کہ اسے ختم کر دیا جائے اس لئے کہ فطرت اور تربیت میں زبردست ہم آہنگی ہوتی ہے جسے عملی تسلسل قوت دیتی ہے۔

دوسرا مسئلہ جو فطرت کے موضوع سے مرتبط ہے تاریخ اور ارتقاء تاریخ ہے یہ موضوع انسانی فلسفۂ حیات اور معاشرہ میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یعنی اگر ہم انسان کے لئے فطرت کے قائل ہوں تو ہمیں ارتقائی تاریخ کے موضوع کو ایک خاص طریقہ سے جاننا ہوگا اور اگر ہم انسان کے لئے فطرت کے قائل نہیں، جیسا کہ موجودہ دور کے بہت سے مکاتب فکر فطرت کو بالکل نہیں مانتے تو ایسی صورت میں ہمیں تاریخی ارتقاء کو دوسری طرح پیش کرنا ہوگا۔

فطرت کے لغوی معنی:

لفظ فطرت جو قرآن مجید میں آئی ہے، اس کے کیا معنی ہیں؟ قرآن مجید میں لفظ فطرت صرف ایک مقام پر اور اس کے مشتقات متعدد آیات میں موجود ہیں۔ مثلاً: فطرهن[1] — فطر السموات والارض[2] — واذا السماء انفطرت[3] — والسماء منفطر به وکان وعده مفعولاً[4]۔ ان میں سے ہر ایک کے مفہوم سے مراد تخلیق نو ہے۔ لفظ فطرت قرآن مجید میں صرف ایک آیت میں آئی ہے:

فاقم وجهك للدين حنيفا "فطرت" الله التى فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله۔

عربی زبان میں فِعلہ' کا وزن نوعیت کو بتاتا ہے۔ یعنی ایک خاص طرز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جیسے جَلس کے معنی بیٹھنے کے ہیں مگر کبھی کبھی اسی جَلَسَ کو ہم جِلسَۃ کہتے ہیں یعنی ایک خاص ڈھب سے بیٹھنا۔ مثلاً ہم اس طرح کہیں: جَلَستُ جِلسَۃَ زَیدٍ، کہ میں زید کے بیٹھنے کی طرح بیٹھا۔ لہٰذا "فطرت" کا استعمال انسان کے حوالے سے موجود ہے اور اسے دینی

---

[1] سورہ روم/۳۰ [2] انعام/۷۹ [3] انفطار/۱ [4] مزمل/۱۸

جوڑا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ (فطرت اللہ التی فطر اللہ) ایک خاص نوعیت سے ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اگر ہم انسان کی اصل خلقت میں کچھ ذاتی خصوصیات کے قائل ہوں تو یہ ذاتی خصوصیات وہی فطرت انسانی ہوں گی۔

قرآن مجید اور حدیث کے بارے میں جو لغات اور خاص کر حدیث سے متعلق جو معتبر کتب تصنیف ہوئیں ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور و معروف کتاب "نہایہ" ہے۔ جس طرح مفردات راغب" میں کلمات قرآن کی اچھی تشریح ملتی ہے۔ اسی طرح نہایہ میں لغات حدیث کی اچھی تشریح کی گئی ہے۔ چنانچہ ابن اثیر اس حدیث کے ذیل میں:

کل مولود یولد علی الفطرۃ

ہر نوزاد ابتدائ اصول فطرت ہی پر پیدا ہوتا ہے، جسے بیرونی اسباب فطرت کے راستہ سے دور کر دیتے ہیں، یعنی اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔

ابن اثیر کلمۂ فطرت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الفطرۃ الابتداء والاختراع والفطرۃ الحالۃ منھا"

فطرت کا مفہوم ابتداء اور اختراع ہے یعنی آغاز تخلیق جسے ابداع کے نام سے بھی جانا ہے مزید وضاحت کے لئے یوں سمجھئے کہ فطرت یعنی ایسی اختراع یا ایجاد جو نقل و تقلید کے بالمقابل ہو۔ دراصل خدا کا کام بغیر کسی کی پیروی کئے کار تخلیق انجام دینا ہے جبکہ انسان کی تخلیق کا عمل عموماً نقالی اور پیروی کا رہین منت ہوا کرتا ہے یہاں تک کہ انسان جس کام کو اپنی اختراع، ایجاد و ابتکار کہتا ہے۔ اس میں بھی در پردہ تقلید ہی کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ انسان نیچر کو نمونہ اور آئیڈیل بناتا ہے۔ اور اسی نیچر کو سے کر نقاشی، صنعت گری اور مجسمہ سازی کرتا ہے۔ اور کبھی کبھی جو اختراع و ایجاد کرتا ہے (جس پر وہ قادر بھی ہے) وہ بھی نیچر سے ہی ماخوذ ہوتا ہے۔

اسلامی علوم کے مآخذ، نہج البلاغہ جیسی کتابوں میں اس موضوع پر کافی زور دیا گیا ہے کہ افعال خداوند عالم کسی دوسرے کی صنعت گری کی نقل و تقلید نہیں ہیں اور جس قدر بھی کار تخلیق ہے۔ وہ بس اسی کی صنعت اور کاریگری کا نتیجہ ہے اور اس کی صناعی پر دنیا کی کوئی صنعت مقدم نہیں ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ "فطر" کے معنی عمل غیر تقلیدی کے ہیں۔
ابن اثیر کا بیان ہے: الفطرۃ الحالۃ منہ کالجلسۃ والرکبۃ ایک خاص نوعیت سے بیٹھنا اور اٹھنا والمعنی انہ یولد علیٰ نوع من الجبلۃ و الطبع المتھیئۃ لقبول الدین فلو ترک علیہا لاستمر علیٰ لزومھا یعنی انسان ایک خاص سرشت کے ساتھ پیدا ہوا ہے جس میں دین قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے یعنی اگر انسان کو اس کی طبعی حالت پر زندگی گزارنے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو وہ دین ہی کے فطری راستہ کو اختیار کرے گا۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ خارجی اثرات اسے فطرت کے راستے سے منحرف کر دیتے ہیں۔
ابن اثیر کا کہنا یہ بھی ہے کہ حدیث شریف میں فطرت کے الفاظ بار ہا آئے ہیں۔ مثلاً ارشادِ پیغمبر ہے:
"اگر کوئی انسان خلاف شرع ارتکاب کرے" (یہاں حدیث کا صرف ایک ہی جزو بیان کیا گیا ہے) تو یقیناً وہ فطرتِ محمدیؐ پر نہ ہوگا۔ یعنی وہ دین محمدؐ پر نہ ہوگا۔
اس حدیث میں فطرت کو دین کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک جگہ ابن اثیر حضرت علیؑ سے حدیث نقل کرتے ہیں:
وجبار القلوب علیٰ فطراتھا۔
یعنی خدائے بزرگ و برتر نے دلوں کو فطرت کی بنیاد پر پیدا کیا۔
مذکورہ حدیث میں فطرت کو جمع کی صورت میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہیں سے ہم اس بات پر دلیل قائم کر سکتے ہیں کہ علوم و اصطلاحات اسلامی کے لحاظ سے انسان "فطریات" کا حامل ہے۔
ایک حدیث ابن عباس سے مروی ہے جس کی رو سے پتہ چلتا ہے کہ فطرت کی لفظ سب سے پہلے قرآن مجید نے انسان کے بارے میں استعمال کی ہے۔
خود ابن عباس قریش کے ایک مشہور دانشمند عرب ہیں۔ لہٰذا وہ عربی زبان و ادب سے پوری طرح باخبر بھی ہیں۔ ان کا بیان ہے:

"ماکنت ادری ما فاطر السمٰوات والارض حتی التحتکم علیہ اعرابیان"

یعنی میں فاطر کی لفظ کو جو قرآن مجید میں آئی ہے نہ سمجھ سکا۔ یہاں تک کہ جب دو بادیہ نشین جو ایک کنویں کی ملکیت پر جھگڑتے ہوئے میرے پاس آئے اور ان میں سے ایک نے کہا: "انا فطرتھا" میں نے اسے کھودا ہے (ہوتا یہ ہے کہ کنواں کھودنے کے بعد جو پانی نکلتا ہے وہ کچھ دنوں کے بعد پھر زمین کے اندر چلا جاتا ہے تو دوبارہ اسے تھوڑا سا کھودا جاتا ہے یہاں تک کہ پانی اچھی طرح نکلنا شروع کر دیتا ہے) عرب کہنا یہ چاہتا تھا کہ پہلی بار میں نے اسے کھودا تھا۔ ابن عباس کا کہنا ہے کہ بدو عرب کے بیان سے قرآن میں آئے ہوئے مذکورہ لفظ فطرت کے معنی کو سمجھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ لغت فطرت بہ معنی خلقت صرف انسان کے لئے قرآن مجید میں استعمال کی گئی ہے۔

عربی زبان و محاورہ میں "فطر" کا ابتداء کے معنی میں استعمال موجود ہے۔ مثلاً کسی عرب کا قول: فطرناب البعیر فطراً اذا شق اللحم وطلع۔ اونٹ کے دانت جب پیدا ہونا شروع ہوتے ہیں تو اس وقت اس لفظ کا برمحل استعمال ہے۔ اور پہلی بار جب پستان سے دودھ نکلتا ہے تو اس وقت بھی اسے فطر کہتے ہیں۔ راغب اصفہانی نے بھی وہی معنی بتائے ہیں جسے ہم نے ابن اثیر کے ذیل میں نقل کیا۔

مرحوم شیخ عباس قمی نے اپنی کتاب "سفینۃ البحار" جس میں علامہ مجلسیؒ کی بحار الانوار سے لغات حدیث کے معانی بیان کئے ہیں۔

یہ کتاب لغات کی ایک فہرست ہے لہٰذا اس میں تقریباً نہایۃ ابن اثیر کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے دونوں میں فرق یہ ہے کہ ابن اثیر نے کلمات کے لغوی معانی و استعمال پر اور عباس قمی نے احادیث پر زیادہ توجہ دی ہے۔ شیخ نے مترزی سے نقل کیا ہے کہ "فطر" کے معنی خلقت کے ہیں اور لکھا ہے: "کل مولود یولد علی فطرۃ" مرحوم شیخ عباس قمی نے ایک اور حدیث لغت فطر کی مناسبت سے نقل کیا ہے۔ ابو بصیر کا کہنا ہے کہ وہ "ایک دن حضرت امام صادقؑ

کی خدمت میں موجود تھے کہ کھانا لایا گیا جسمیں اونٹ کا گوشت تھا۔ ہم نے اسے کھایا، پھر تھوڑا دودھ لایا گیا جسے امام نے نوش کیا اور مجھ سے پینے کے لیے کہا چنانچہ میں نے پیا۔ پھر میں نے اس کے ذائقہ کو دیکھتے ہوئے امامؑ سے دریافت کیا۔ کہ یہ کیا ہے۔ تو امامؑ نے جواب دیا کہ یہ بالکل تازہ دودھ کا جھاگ ہے (جو تازہ زائیدہ جانور سے دوہا گیا ہے)۔ یہاں بھی "فطر" بالکل ابتدائی منزل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

صبغہ اور حنیف کی تشریح:

دین کے متعلق قرآن مجید جو معنی و مفہوم پیش کرتا ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید میں تین الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، جس کا ایک ہی معنی و مصداق ہے۔ یعنی "فطرت"، "صبغہ" اور "حنیف"۔ یعنی دین کے مفہوم میں فطرت اللہ ــ صبغۃ اللہ اور للدین الحنیف استعمال ہوا ہے۔

اب ہماری بحث آئندہ صفحات میں صبغہ اور حنیف کے بارے میں ہوگی جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے:

صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ (سورۂ بقرہ/۱۳۸)

رنگ آمیزی اور خدا سے بہتر کس کی رنگ آمیزی ہے۔

یہاں صِبْغَہ فِعْلہ کے وزن پر ہے۔ اس کا مادہ صبغ ہے۔ صبغ یعنی رنگنا۔ صاغ یعنی رنگنے والا اور صبغہ، ایک خاص نوعیت سے رنگنا۔ صبغۃ اللہ سے مراد ایک رنگ ہے جسے قادر مطلق نے موجودات عالم کی ذات میں بھر دیا ہے۔ یہ لفظ دین کے سلسلہ میں استعمال کیا گیا ہے۔ راغب اور دیگر مفسرین نے کہا ہے۔ قرآن مجید میں یہ تعبیر اشارہ ہے مسیحیوں کے غسلِ تعمید کی طرف۔ یعنی ہوتا یہ تھا کہ جب مسیحی کسی کو اپنے دین میں داخل کرنا چاہتے۔ یا جب کوئی بچہ پیدا ہوتا، تو اسے غسل دیتے ہیں۔ تاکہ اس میں مسیحیت کا رنگ داخل ہو جائے اور جو پانی اس کے سر پر ڈالتے اسے رنگ مسیحیت کے نام سے یاد کرتے۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ رنگ تو حقیقت میں وہی رنگ ہے جسے خدا نے اپنی خلقت میں بھر دیا ہو۔

اسی طرح ارشاد اقدس الہٰی ہے،

وما کان ابراھیم یھودیاً ولا نصرانیاً بل کان حنیفاً مسلماً۔ (آل عمران/ ۹۷)

ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے بلکہ وہ تو مسلمان تھے۔

یعنی انسان ایک فطرت رکھتا ہے اور وہ فطرت دین ہے اور دین بھی دین اسلام ہے جو حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ تک ایک حقیقت کا نام رہی ہے۔

قرآن مجید ادیان کا قائل نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک دین کا قائل ہے۔ اسی واسطے قرآن مجید واحادیث میں دین کی بصورت جمع نہیں آیا ہے۔ کیونکہ دین ایک فطری راستہ ہے اور ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جو انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ انسانوں کی تخلیق کئی طرح نہیں ہوئی ہے۔ تمام انبیاء کے قوانین انسانوں کی فطری صلاحیتوں کو زندہ کرنے اور پرورش دینے کی بنیاد پر بنے ہیں۔ اور جو کچھ انبیاءؑ پیش کرتے ہیں۔ انسانی فطرت بھی اسی کی متقاضی ہوتی ہے۔ اسی لئے جو کچھ نوحؑ ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دیگر پیغمبر علیہم السلام نے ارشاد فرمایا ہے۔ قرآن مجید نے اسے دین سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس کا نام اسلام رکھا ہے۔ اسلام کے بعد جو نام بہ نام دین استعمال ہوئے ہیں وہ دین فطرت سے انحراف کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ اسی لئے قرآن مجید نے ارشاد فرمایا:

وما کان ابراھیم یھودیاً ولا نصرانیاً بل کان حنیفاً مسلماً (آل عمران/۹۷)

حضرت ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ صرف مسلمان تھے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ آنحضرتؐ کی امت میں سے ایک فرد کی طرح مسلمان رہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت اسلام سے انحراف ہے۔ سچا راستہ اور اسلام ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

مذکورہ آیت قرآنیہ "صبغۃ اللہ" میں ارشاد پروردگار ہے کہ رنگ مسیحی میں نہلانے کا کیا فائدہ ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جو شخص فطرتاً مسیحی نہیں ہے اسے صرف اور صرف نہلا دینے سے عیسائی بنایا جا سکتا ہے۔ رنگ آمیزی تو درحقیقت وہ رنگ آمیزی ہے جس میں دست قدرت نے وقتِ تخلیق ہی رنگ بھر دیا ہو۔

راغب کہتا ہے کہ صبغۃ اللہ سے اس عقل کی طرف اشارہ ہے جو خداوند عالم نے انسانوں میں ودیعت فرمائی ہے اور جس کے ذریعہ انسان حیوان سے ممتاز ہوتا ہے۔

حنیف کے معنی :

حدیث میں آیا ہے: الدّین الحنیف، الفطرۃ، صبغۃ اللّٰہ .... التعریف فی المیثاق ۔ یعنی دین حنیف، فطرت، یا صبغۃ اللہ کا مفہوم عالم ذر میں خدا کو پہچاننے کا میثاق ہے۔

یہاں میثاق سے عالم ذر کی طرف اشارہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ زرارہ نے امام محمد باقرؑ سے حنفاء للہ کے بارے میں سوال کیا۔ امام علیہ السلام نے جواب دیا: الفطرۃ حنیف یعنی فطرت حنیف ہے۔ اس جواب سے امام نے ایک امر تکوینی اور طبیعی کی طرف اشارہ فرمایا۔

شیخ صدوق اپنی نفیس کتاب "توحید" میں زرارہ سے روایت کرتے ہیں کہ امام محمد باقرؑ سے سوال کیا گیا کہ حنفاء غیر مشرکین بہ اور حنیفہ کے کیا معنی ہیں؟ امام نے جواب دیا:

ھی الفطرۃ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللّٰہ قال[۱] فطرھم اللّٰہ علی المعرفۃ

امام نے فرمایا کہ اس کے معنی فطرت کے ہیں، جس پر خداوند عالم نے لوگوں کو خلق فرمایا ہے۔ پھر امام نے جواب دیا کہ خداوند عالم نے ان کو اپنی معرفت کی فطرت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

اسی طرح امامؑ نے عالم ذر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ پیغمبرؐ کی حدیث ہے کہ کلّ مولود یولد علی الفطرۃ ۔ علی المعرفۃ، ان اللّٰہ عزوجل خالقہ

یعنی ہر شخص کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ خدا ہی اس کا خالق ہے۔

ایک دوسری حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے عروۃ اللّٰہ الوثقی ۔ التوحید، والصبغۃ الاسلام، یعنی خدا کی مضبوط رسی سے مراد اس کی توحید ہے اور فطرت اسلام ہے۔

توحید ۲۷

ابن اثیر نے بھی فطرت کو انہیں معنوں میں بتایا ہے اور کہا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے انسانوں کو تمام گناہوں سے پاک پیدا کیا ہے۔

خلقت العبادی الحنفاء الطاهر الاعضاء من المعاصی وقیل اراد انه خلقهم حنفاء المومنین لما اخذ علیهم المیثاق الست بربکم۔ قالوا بلی۔ فلا یوجد احداً الا وهو مقر بان له ربا بان اشرك به واختلفوا فیه۔ والحنفاء جمع الحنیف وهو المائل الی الاسلام الثابت علیه والحنیف عند العرب من کان علی دین ابراهیم واصل الحنیف المیل۔

میں نے اپنے بندوں کو حنیف یعنی گناہوں سے پاک پیدا کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ خداوند عالم نے بندوں کو حنیف یعنی مومن خلق فرمایا، اور یہ اس وقت ہوا جب عالم ذر میں اس سے میثاق لیا گیا تھا۔ اور مومنین نے میثاق کے سوال پر اس کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا چنانچہ کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی ربوبیت اور نفی شرک کا مقر نہ ہوا ہو۔

علماء نے عالم ذر کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ حنفا حنیف کی جمع ہے اور حنیف اس شخص کو کہتے ہیں، جو اسلام کی طرف حقیقی رجحان رکھتا ہو اور اس پر قائم بھی ہو۔ عربوں کے نزدیک حنیف اس شخص کو کہتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے دین پر ہو۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حنیف کے معنی رجحان کے ہیں اور حنیف کے معنی حقیقت پسندی کے ہیں۔ چنانچہ اگر ہم حنیف کے لغوی معنی کی تفسیر کرنا چاہیں تو ہمیں اس طرح کہنا چاہئے کہ حنیف کے معنی حقیقت پسندی، خدا شناسی اور توحید پرستی کے ہیں اور انسان کی فطرت میں حنیفیت رچی بسی ہوئی ہے۔

اب تک ہم نے فطرت کے لغوی معنی کا قرآن و احادیث کی روشنی میں تجزیہ کیا ہے تاکہ ہم

یہ دیکھ سکیں کہ آیا قرآن و احادیث میں بھی اس لفظ کی کوئی حقیقت ہے؟ یا نہیں؟ اسی بنیاد پر ہم چند الفاظ کی آئندہ تشریح کریں گے:

شہید ڈاکٹر محمد جواد باہنر
ترجمہ : جناب سید مہدی سرباز

اسلام کا تصور کائنات

شعور اور ذمہ داری

انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوات والارض والجبال فابین
ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوماً
جہولاً (احزاب/۷۲)

ہم نے اپنی امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑ کے سامنے پیش کیا، مگر انہوں نے اس بار کو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اسے اٹھالیا۔ بیشک انسان بڑا ظالم اور نادان ہے۔

اگر ہم اس آیۂ کریمہ میں امانت سے مراد ایک طرح کی ذمہ داری اور شعور کو لیں تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے انسان کی برتری و شرف کے ایک بڑے سبب کو پالیں گے۔ ایسی کرامت و برتری جو آسمان و زمین پہاڑ غرض سب سے بالاتر ہے۔ چونکہ ان کی ساخت، خمیر اور فطرت کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ عقل و شعور، تدبیر و آزادی اور ذمہ داری کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ صرف انسان کی ذات ہے جسمیں یہ ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔ البتہ انسان کی عقل و خرد اور ہوش و تدبر اس کو یہ موقعہ فراہم کرتا ہے، کہ کائنات کی حقیقتوں کے بارے میں سوچے، سمجھے اور استدلال کرے۔ نیز مشکلوں کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ اور فیصلے کرے اسی لئے انسان ذمہ دار ہے۔ چونکہ تشخیص و تمیز کی قوت اس میں پائی جاتی ہے، اور اسے ارادہ و اختیار بھی حاصل ہے۔ تاکہ یہ امور انجام دے سکے۔ اسی اعتبار سے انسان کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے جو انسان کی قدر و قیمت کی دلیل ہے۔ کیونکہ جو نا سمجھ اور فیصلے کا اہل نہ ہو اسے ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی تصور کائنات میں انسان کو مسئول و ذمہ دار سمجھا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے:

وقفوھم انھم مسئولون (صافات/۲۸)

انہیں ٹھہراؤ ان سے کچھ پوچھنا ہے (یعنی یہ لوگ ذمہ دار اور جواب دہ ہیں)

لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون (انبیاء/۲۳)

جو کچھ اللہ تعالیٰ انجام دیتا ہے اس کے بارے میں سوال نہیں کیا جاسکتا حالانکہ انسان اپنے کاموں کا ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔

کل نفس بما کسبت رھینۃ (مدثر/۳۸)

ہر شخص اپنے انجام دئیے ہوئے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

اس طرح کی قرآنی آیات سے انسان کے ذمہ دار اور جواب دہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ ذمہ داری کے سلسلہ میں دو طرح بحث کی جاسکتی ہے۔ ایک یہ کہ چونکہ انسان ذمہ دار ہے اس لئے اسے اپنے اعمال و کردار میں احتیاط برتنی چاہئے کہ خطا و گناہ سے آلودہ نہ ہو کیونکہ گناہ سزا کا موجب ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی کو ذمہ دار قرار دینا اس کی قابلیت و صلاحیت کی دلیل ہے۔ کسی کو ذمہ داری و اختیارات اتنے ہی دیئے جاتے ہیں جتنی اس میں استعداد و صلاحیت ہوتی ہے ــــ چنانچہ بعض جدید فلسفوں میں انسان کی ذمہ داری سے متعلق بحث کو انسان کی آزادی اور اس کی قدر و قیمت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، جس کے بارے میں اسلام نے خاص توجہ دی ہے کہ انسان ذمّہ دار ہے، اور انسان کو ذمّہ دار ٹھہرانا صرف اسی وقت منصفانہ ہوسکتا ہے کہ جب وہ تشخیص، آزادی اور طاقت کا حامل ہو۔ تاکہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھا سکے۔ لہٰذا مسئولیت و ذمہ داری کو "قدروں" کے لحاظ سے بھی موضوع بحث بنایا جاسکتا ہے البتہ یہ وہی بار سنگین ہے جن کو اٹھانے سے آسمان و زمین نے انکار کیا تھا۔ لیکن انسان نے اس کو قبول کرلیا۔ چنانچہ آیت میں یوں ارشاد ہوا ہے:

انہ کان ظلوماً جھولاً

بے شک انسان بڑا ظالم و نادان ہے۔

گذشتہ مقالہ میں ہم بیان کرچکے ہیں کہ انسان کا خمیر بشری خاکی اور ملکوتی خصلتوں سے تیار ہوا ہے۔

اور قرآن مجید کا اصرار ہے کہ انسان کو تصویر کا دونوں رخ دکھا دیا جائے تاکہ غرور اور مایوسی کا شکار نہ ہو۔ مذکورہ آیت میں انسان کو برتری عطا کی گئی ہے اور اس کو آسمان و زمین سے بھی بالاتر قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا امانت سے پیدا ہونے والے خطرات کی جانب متوجہ کر دینا بھی ضروری تھا تاکہ ایسا نہ ہو کہ یہ قیمتی ہیرا آلودہ ہو جائے یا بغیر استفادہ رہ جائے۔

ظلم اس وقت ظہور پذیر ہوتا ہے، جب انسان اپنی آزادی اور اختیارات سے غلط فائدہ اٹھاتا ہے۔ کسی کا حق پامال کرتا ہے۔ کسی پر ظلم کرتا ہے اور کسی حق کو باطل کی صورت میں ظاہر کرتا ہے اور یہی ذمہ داری کی آفت ہے۔

لہٰذا انسان کو بیدار رہنا چاہیے۔ تاکہ جو حیثیت اسے دی گئی ہے۔ اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائے اور ظلم سے آلودہ نہ ہو، جہالت بھی اس وقت ہے ؟

جب انسان اپنی عقل و شعور کی طاقت کو ترقی نہ دے اور اپنے اندر علم، فکر، تدبیر جیسی صلاحیتوں کو پروان نہ چڑھائے۔ پس شعور کے لیے جہالت کا خطرہ ہے اور مسئولیت و ذمہ داری کے لئے ظلم کا خطرہ ہے لہٰذا انسان کو اپنی قدر و قیمت پہچان لینی چاہئے، اور جو عقل و آزادی اس کو عطا ہوئی ہے اس سے صحیح فائدہ اٹھانا چاہئے اور علم و بصیرت کی راہ میں موثر اقدامات کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے۔

انسان کی تخلیق کا مقصد :۔

انسان کے سلسلہ میں آخری بحث اس کی تخلیق کے مقصد کے بارے میں ہے، وضاحت کے لیے چند قرآنی آیات پیش کرتے ہیں :

۱۔ وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون (ذاریات/۵۶)

میں نے جن و انس کو خلق نہیں کیا مگر اپنی عبادت کے لئے

بندگی کے چند درجے ہیں : معرفت، طلب، تقرب، تعظیم، تعریف اور اطاعت چونکہ خداوند عالم تمام کمالات کا مبداء اور حق مطلق ہے۔ لہٰذا وسیع معنوں میں خدا کی عبادت سے مراد معرفت، طلب اور حق کے آگے سر تسلیم خم کرنا۔ نیز باطل، جبر، ظلم، بت، نفسانی خواہشات شیطان اور طاغوت

کی اطاعت سے انکار ہے۔ مختصر یہ کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے توحید و عبادت اپنے وسیع مفاہیم کے ساتھ اس
مقصد میں موجود ہے۔ دوسری طرف اسلامی عبادت سے مراد وہ تمام اعمال و فرائض ہیں جو قرب الٰہی کی
خاطر انجام پائیں، بلکہ وہ تمام فرائض جن پر فروع دین کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، خمس، زکواۃ
حج، جہاد، امر بالمعروف اور نہی از منکر سبھی شامل ہیں۔ اس لحاظ سے انسان کی خلقت کا مقصد ان تمام
فرائض کی ادائیگی ہے۔ عبادت سے صرف نماز و ذکر ہی مقصود نہیں ہے۔

۲۔ الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً

وہ ذات جس نے موت و حیات کو خلق کیا۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ تم میں سے کون بہتر
عمل کرنے والا ہے۔

اس کائنات میں انسان کی آمد و رفت اور موت و حیات مستقبل کی تمہید ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے
کہ کون بہتر عمل بجالانے والا ہے۔ بعض روایات میں "احسن عملاً" کی تفسیر "احسن عقلاً" سے کی گئی ہے۔
یعنی تم میں سے کس کی عقل بہتر ہے۔ البتہ بہتر عمل بہتر عقل کی دلیل ہے۔ بہر حال اس آیہ کریمہ سے تخلیق انسان
کا ایک اہم مقصد واضح ہو جاتا ہے۔

عمل، خلقت انسانی کا مقصد ہے۔ جدوجہد اور کوشش و تحرک انسان کی تخلیق کے منشا کو پورا کرتا
ہے، البتہ ہر عمل اور ہر جدوجہد مقصد خلقت نہیں، صرف اچھے اعمال اور اچھی کوششیں بلکہ بہتر سے بہتر
عمل مقصود ہے، یعنی غرض خلقت بہتر سے بہتر کی تلاش ہے، اور یہ خوبیوں کی جانب رواں دواں ترقی
پذیر سلسلہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

۳۔ واللہ اخرجکم من بطون امہاتکم لاتعلمون شیئاً وجعل لکم السمع
والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون (نحل/۷۸)

خداوند عالم نے تمہیں ماں کے شکم سے باہر نکالا جب تم بالکل ناسمجھ تھے، تمہیں آنکھ
کان اور دل عطا کئے تاکہ تم نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔

شکر نعمت یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے اسے خلق کیا گیا ہے۔ اسی راہ میں صرف کی جائے۔ آنکھ،
کان، اور فکر کا شکر یہ ہے کہ ان کو کام میں لایا جائے اور ان کے اندر علمی و فکری ترقی پیدا ہو جائے۔
پس مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے۔ کہ تم لوگ جب دنیا میں آئے تھے تو کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ مگر

ہم نے علم و ادراک کے ذرائع عطا کئے۔ تاکہ تم جان سکو اور تمہارا شعور ترقی کرے۔
ان تین آیتوں اور ان جیسی دوسری آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مقصد خلقت: علم، عمل صالح اور حق پرستی ہے۔ یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ ان تینوں مقاصد میں واقع پسندی، معرفت کائنات، علمی کوششیں، مفید و مثمر ثمر سماجی جدوجہد اور خدا و حق کی مکمل اطاعت مضمر ہے

وحی و نبوّت:

ہم یہاں خدائے واحد کی بندگی اور کائنات و انسان کے بارے میں بحث کے بعد نبوت کے بارے میں گفتگو شروع کرتے ہیں۔ اور اس بارے میں اسلامی نقطہ نظر کو اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔ سورہ بقرہ کی دو سو تیرھویں آیت میں ارشاد الٰہی ہے:

کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ وما اختلف فیہ الا الذین اوتوہ من بعد ما جاءتھم البینات بغیا بینھم۔

لوگ ایک امت تھے (جو آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے بچھڑتے چلے گئے) پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ جو خوشخبری دیا کرتے تھے اور ڈرایا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ برحق کتاب بھی نازل کی۔ تاکہ اختلافی مسائل کا فیصلہ کریں۔ مگر اس کتاب سے متعلق ان لوگوں کے سوا کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ جن پر کتاب نازل کی گئی تھی جبکہ ان پر روشن دلیلیں آچکی تھیں اور اس اختلاف کی وجہ ان کی آپس کی شرارت و سرکشی تھی۔

اس آیہ شریفہ کی ایک تفسیر سے ہم یہ مطلب نکال سکتے ہیں کہ شروع شروع میں لوگ ایک ہی گروہ میں شامل تھے۔ وہ زندگی بہت سادہ تھی اور عقل و خرد سے کماحقہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔ لوگ حیوانوں کی طرح فطری کشمکشوں کے ہمراہ زندگی گذار رہے تھے۔ لیکن جب فکریں کام کرنے لگیں اور انسان اپنے ارد گرد پائی جانے والی اشیاء نیز اپنی احتیاجات اور انکی فراہمی کے بارے میں سوچنے لگا، تو آہستہ آہستہ اختلافات ظاہر ہونے لگے۔ یہ اختلافات بھی دو طرح کے تھے۔ ایک اختلاف خالق کائنات و ناظم کائنات کے بارے میں مختلف نظریات و افکار کی صورت میں ظاہر ہوا دوسرا اختلاف مفادات کے

بارے میں تھا۔ ان لوگوں کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ زیادہ مقدار میں آب و غذا اپنے لئے مخصوص کر سکتے ہیں۔ اس طرح زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی لئے، طاقت، مکاری اور تدبیروں کے ساتھ زیادہ مال جمع کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایسے میں خداوند عالم نے انسانوں ہی کے درمیان سے انبیاء کو مبعوث فرمایا جو اپنے ساتھ قانون اور کتاب لے کر آئے۔ لوگوں کے لیے حقوق و حدود معین کئے۔ ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت اور دینی نظام کی پیروی کے نتیجے میں ملنے والی سعادتوں سے متعلق خوشخبری دی.... اختلافات و حق کشی کے خطرناک نتائج سے ڈرایا۔ اس طرح وقتی طور پر اختلافات ختم ہوگئے۔ اور انبیاء علیہم السلام کے ہدایات کے سایہ میں زندگی کے راستے کھل گئے۔

کچھ عرصہ بعد مذہبی رہنماؤں نے جو خود قانون الٰہی کے علمبردار تھے، نئے اختلافات کھڑے کر دیے دین کی تفسیر و تشریح۔ احکام کی نشر و اشاعت، حصول اقتدار کی خواہش، دینی و اجتماعی تعصبات اور عوام کی قیادت کے سلسلہ میں اختلافات بڑھنے لگے۔ اختلافات کی وہی بنیادیں جو انبیاءؑ سے قبل مفاد پرستی اور فکری گمراہی کی صورت میں موجود تھیں۔ بار دیگر ایک دوسری شکل میں ظاہر ہونے لگیں چنانچہ راستے واضح ہونے کے باوجود خودسری اور سرکشی اجازت نہیں دیتی تھی کہ صحیح راستے پر قدم بڑھائیں۔ جس کے نتیجے میں واقعیات برعکس نظر آتے تھے۔ ایسے میں گمراہی کے خاتمے کے لیے دوسرا نبی آتا ہے تاکہ گمراہی، مفاد پرستی، زر اندوزی کے دبیز پردوں کو ہٹا کر راستے کو واضح کیا جاسکے۔

خاتمیت سے متعلق بحث اگرچہ بہت ہی اہم اور مستقل بحث ہے لیکن ہم اجمالاً صرف اشارہ کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلام جب تشریف لائے تو آپ نے جامع و کامل احکام الٰہی لوگوں تک پہنچایا اور ماضی کی غلط روش کا قلع قمع کر دیا اور پھر دین کا اصلی مأخذ و سرچشمہ یعنی قرآن مجید ہر قسم کی تحریف و تغییر کے بغیر سالم و کامل لوگوں کے درمیان باقی رہ گیا۔ اس کے علاوہ دین کے دوسرے مصادر بھی موجود ہیں اس طرح سے ہر نئی بدعت اور خرافات و گمراہی کے علاج کے لئے چارہ کار موجود ہے لہٰذا کسی نئی رسالت کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

اس مختصر گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد انسان کی اجتماعی و فکری ہدایت اور اختلافات و حق کشی کی بیخ کنی ہے۔

وحی:

انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہیں۔ یعنی یہ پاک و پاکیزہ، شائستہ، ایثار گر اور خدمت گذار افراد ہیں، جن کو خداوند قدوس نے لوگوں کے درمیان سے منتخب کیا ہے اور ان پر وحی نازل فرمائی ہے تاکہ احکام خداوندی انسانوں تک پہنچادیں اور لوگوں کی ہدایت کریں۔

وحی ایک طرح کے شعور و بصیرت کا نام ہے جو تمام معمولی بصیرتوں کے مافوق ہے۔ معمولی تعلیم و تعلم، عقل و خرد، کشف و اشراق اور ہوش و فراست سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ایک پاک و پاکیزہ معرفت ہے۔ جو ہر طرح کی غلطی و خطا سے منزہ ہے اور ادراک حقیقت کا ایسا مستقیم اور اصلی ذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے معدودے چند افراد کو عطا ہوتا ہے اور یہی مخصوص معرفت عالم غیب کا راستہ ہے۔ یعنی جن چیزوں کے ادراک سے عام بشر کی عقل و فکر اور تجربہ و مشاہدہ عاجز ہے۔ انبیاء علیہم السلام خداوند عالم سے اپنے اس علمی و غیبی رابطہ کو ثابت کرنے کے لئے کچھ ایسے معجزات کے حامل ہوتے ہیں۔ جو عام لوگوں کے بس سے باہر ہوتا ہے اور اس طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں اور خالق نے انہیں رہبری و پیامبری کے عہدے پر فائز فرمایا ہے۔

انبیاء کی دعوتوں کے دوران مشکلات:

یاایھا الذین آمنوا ان کثیراً من الاحبار والرھبان لیاکلون

من اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ (سورۂ توبہ/۳۴)

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو۔ بیشک اہل کتاب کے بہت سے مذہبی دانشور اور زہد مآب رہنما لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور راہ خدا پر چلنے سے روکتے ہیں۔

مذہبی پیشوا حضرات انبیاء علیہم السلام کے مشن کو آگے بڑھاتے ہیں اور وہی لوگ دعوت و جہاد کی خاطر کتاب الٰہی کے حامل ہیں۔ ان کی تبلیغ کا منشاء و مقصد بھی وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کا تھا۔ جس طرح ان کی پاکیزگی و تقویٰ دعوت حق کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ اسی طرح ان کی مفاد پرستی اور بے راہ روی اس مشن کو بھاری نقصانات سے دوچار اور مشکلات پیدا

کر سکتی ہے۔

(۱) یہ آیت یہودی پیشواؤں اور عیسائی راہبوں سے متعلق ہے اور اس میں بہت سوں پر تنقید کی گئی ہے کہ الف۔ یہ لوگ خود کو اللہ کا جانشین اور ملکوتی حرم کا حاجب کہلاتے ہیں، لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں۔ خدا اور عوام کے مال پر ناجائز قبضہ کر لیتے ہیں، اس سے دین اور معاشرے کے مفاد میں کام کام نہیں لیتے، بلکہ عیش و عشرت ریاکاری اور خودنمائی و استبداد میں زندگی گذارتے ہیں۔

(ب) راہ خدا میں رکاوٹ بنتے ہیں، یعنی نہ صرف یہ کہ خود عمل نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے لئے بھی گمراہیاں پیدا کر کے انھیں اطاعت الٰہی سے روکتے ہیں۔ دین کا صحیح تصور انسان کو آزاد، حق بین اور متحرک بناتا ہے، اور یہ مفاد پرست، خودسر، اور مذہبی قیادت کے جھوٹے دعویداروں کے حق میں مفید نہیں ہے۔ مذکورہ آیت میں "احبار" اور "رہبان" کی دو اصطلاحوں کے استعمال سے ہم یہ سمجھتے ہیں، کہ یہ لوگ دو چیزوں کے ذریعہ گمراہی و ضلالت کے باعث بنتے تھے ایک علم فروشی (احبار یعنی دانشوران) دوسرے زہد مآبی (رہبان یعنی خداترسی، گوشہ نشینی، ترک دنیا) ایسے رہنما نہ صرف بت پرستی اور برائیوں کے خلاف جدوجہد نہیں کرتے بلکہ خود ہی بت و بت تراش بن بیٹھتے ہیں۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللّٰہ (توبہ/۳۱)

وہ لوگ اپنے مذہبی رہنماؤں اور دانشوروں نیز راہبوں کو اپنا خدا مان کر خدائے حقیقی سے منہ موڑ چکے ہیں۔

عدی ابن حاتم نے رسالتمآبؐ سے جو روایت نقل کی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خدا بنانے سے مراد مروجہ عبادت نہیں ہے بلکہ مقصود ان کی اندھی تقلید اور سوچے سمجھے بغیر ان کی ہر بات کو مان لینا ہے۔ یہ احبار و رہبان بعض چیزوں کو اپنی مرضی سے حرام قرار دیتے ہیں اور وہ لوگ بلاچون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں۔

بہرحال چونکہ انبیاء علیہم السلام کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور انبیاء معصوم ہیں۔ لہٰذا ان کے سلسلہ میں کسی طرح کی غلطی یا خیانت کا تصور نہیں کیا جاسکتا، لیکن دوسرے رہنماؤں کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ وہ خود بھی اپنی نگرانی کریں اور معاشرہ بھی ان پر پوری توجہ رکھے تاکہ جس عظیم راستے پر وہ گامزن ہوئے ہیں۔ اس کے لیے ضروری صلاحیت حاصل کریں۔ اور قاطعیت

وپاکیزگی کے ساتھ سنگین ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے کوشش کریں۔

حضرت علی علیہ السلام نے قبول خلافت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کچھ دلیلیں دی ہیں۔ جن میں آپ ارشاد فرماتے ہیں؛ کہ اگر ذات خداوندی نے علما اور دانشوروں سے یہ عہد نہ لیا ہوتا کہ ظالموں کی پرخوری اور مظلوموں کی بھوک مری کے سلسلہ میں خاموش نہ رہیں تو میں خلافت کی مہار کو چھوڑ دیتا۔

چنانچہ یہ آگاہ وبیدار مذہبی رہنماؤں کی ذمہ داری ہے کہ ظلم وستم اور محرومیتوں کو دیکھ کر خاموش نہ رہیں بلکہ ان کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کریں۔

چنانچہ سورۂ مائدہ میں ارشاد الٰہی ہے:

لولا ینھٰھم الرّبّانیون والاحبار عن قولھم الاثم واکلھم السحت لبئس ما کانوا یصنعون (مائدہ/۶۳)

اللہ والے اور علما ان لوگوں کو جھوٹ بولنے، حرام خوری سے کیوں نہیں روکتے۔ یہ علما کس قدر برا کرتے ہیں۔ یہ آیت بھی یہودی رہنماؤں کے بارے میں ہے جنہیں بڑی شدت کے ساتھ ان پر عتاب ہوا ہے کہ وہ دو طرح کے گناہوں کے خلاف جدوجہد کیوں نہیں کرتے ایک یہ کہ لوگ دین میں بدعتیں ایجاد کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر تہمتیں لگاتے ہیں دوسرے یہ کہ بیت المال پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور دوسروں کا مال ناحق کھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجتماعی برائیوں کی جڑ یہی دونوں عمل ہیں جس میں سے پہلا گمراہی کا تو دوسرا محرومیت کا باعث ہے۔

اس طرح دعوت حق کی بقا کے بارے میں اسلام کا نظریہ ہے کہ یہ عظیم ذمہ داری آگاہ، روشن فکر نیز دینی تعلیمات سے بہرہ مند افراد کی ہے جبکہ اس راہ میں رکاوٹ بھی ایسے ہی لوگ بنتے ہیں جو مفاد پرستی اور خود خواہی کے شکار ہو جاتے ہیں۔

انبیاء کی دعوتوں کا مقصد :

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت (نحل/۳۶)

ہم نے ہر امت میں رسول بھیجے تاکہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی پیروی سے بچو۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط ۔ (حدید/۲۵)

ہم نے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب و میزان بھی تاکہ لوگ عدل و انصاف برقرار کریں۔

وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون

(سبا / ۳۴)

ہم نے کسی بھی سرزمین میں ڈرانے والے نبی کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے زر اندوز اور بڑے لوگ یہ ضرور بول اٹھے کہ جو احکام دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم ان کو نہیں مانتے۔

مذکورہ آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاؑ کی تشریف آوری کا مقصد معاشرے میں خدا پرستی کا قیام نیز طاغوت اور زر اندوزوں سے مقابلہ کرنا۔ خدا پرستی کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ وہ اسلام کے اجتماعی و اعتقادی نظام کی بنیاد ہے۔ اور یہ عقیدہ آزادی، مساوات، انسانی ہمبستگی، صفا، اخلاص جدو جہد، فضیلت اور دوستی کا سرچشمہ ہے جبکہ شرک، تفرقہ، ذلت، ظلم، برائیوں اور غلامی کا باعث ہے۔ اسی طرح عدل و قسط سے مراد ہر چیز میں مکمل توازن اور اس کو اپنی جگہ قرار دینا۔ ہر چیز میں اعتدال سے کام لینا افراط و تفریط سے بچنا اور دوسروں کے حقوق کی رعایت کرنا ہے اسمیں عدالت اجتماعی بھی اپنے وسیع معانی کے ہمراہ شامل ہے بلکہ اقتصاد، قانون اور قضاوت کا عدل بھی موجود ہے۔ چنانچہ آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں مختلف انقلابات اور جدو جہد مبارزات اسی عدالت و آزادی کے حصول کی خاطر ہیں۔۔ اور اس کے مقابل ظالم و ستمگر افراد کا مقصد عدل و انصاف کے سوتے کو خشک کر کے دوسروں کا استحصال اور زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا ہے۔

انبیاؑ علیہم السلام دو قسم کا جہاد کرتے ہیں اوّل: طاغوت یعنی ہر قسم کے بت اور خود سری و سرکشی کے خلاف جہاد، کیونکہ یہی چیزیں خدا کے مقابلہ میں آکر ظلم و ستم اور حق کشی و استبداد کا سرچشمہ ہیں۔ دوّم: ان زر اندوز، افزوں طلب مفاد پرستوں کے خلاف جو اپنی اجارہ داری قائم کر کے لوٹ کھسوٹ اور دوسروں کا استحصال کرتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا انجام:

ارشاد الٰہی ہے:۔

ثم ننجّی رسلنا والذین آمنوا کذالک حقاً علینا ننجی المومنین

(یونس/ ۱۰۳)

آخر کار ہم پیغمبروں اور صاحبان ایمان کو نجات بخشتے ہیں، ہمارے لئے یقینی، و مسلم ہو چکا ہے کہ صاحبان ایمان کو نجات دیں۔

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آخر کار پیغمبروں، مومنوں، اور پرہیزگاروں کو کامیابی نصیب ہوگی۔ اور زمین پر حکومت و اقتدار انہی کے قبضے میں ہوگا۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۹، انعام/ ۱۲۵، انبیاء/ ۱۰۵، حج/ ۴۰، نور/ ۵۵ ملاحظہ کریں۔ اس طرح کی آیات کے بارے میں یہ کہنا چاہئے کہ ان میں ذکر شدہ کامیابیاں، حاکمیت اور پیش قدمی کا تعلق صرف آخرت سے نہیں بلکہ ان آیات کا اطلاق دنیا و آخرت دونوں پر ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ بعض آیتوں میں خاص طور پر دنیا کی کامیابیوں کا واضح ذکر کیا گیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انبیاءؑ کو اپنے زمانے میں اپنی مأموریت کے علاقوں میں محدود کامیابیاں حاصل ہی ہیں۔ چونکہ ہم انبیاء کی تاریخ میں یہ پاتے ہیں کہ ان کے دشمنوں اور مخالفوں کی جانب سے تیار کردہ تمام سازشوں اور مخالفانہ اقدامات کے باوجود انبیاء علیہم السلام کی استقامت اور ایمان کے نتیجہ میں ان کا مشن آگے بڑھتا گیا اور انبیاء کے لئے ماحول سازگار بنتا گیا۔

لیکن بعض آیات کا افق اس سے بھی روشن ہے، جس میں انبیاء کے مقصد و مکتب فکر کی مکمل اور برق رفتار کامیابی کا تذکرہ ہوا ہے۔ البتہ کہیں کہیں تاریخی پیش گوئی کی حیثیت رکھتی ہے جس کی تائید بشریت کا مستقبل کرے گا کہ ایسے ایام آنے والے ہیں۔ خاص طور پر اسلامی روایات میں یہ تصریح ملتی ہے کہ ایسا مستقبل ظہور امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا ہوگا۔ اس زمانے میں مکتب انبیاء پھر سے جی اٹھے گا اور پوری دنیا پر حق چھا جائے گا۔

اور کہیں کہیں پر اللہ تعالیٰ کی معین کردہ سماج کے قطعی قوانین و سنت کے اعتبار سے مذکور ہوئی

ہیں، یعنی ایمان، عمل صالح، تقویٰ اور پاکیزگی و شائستگی کامیابی کا ذریعہ ہے۔
اگر کوئی انسان اعلیٰ انسانی اصولوں پر جو انہی الہٰی سنتوں کا آخری مرحلہ ہے ایمان رکھتا ہو یعنی دل کی گہرائیوں سے اس اصول کی برقراری کے لئے کوشش کرتا ہے، اس پر ایمان رکھتا ہے۔ ان اصولوں کے ساتھ کامل روحانی رشتہ برقرار کرتا ہے، اپنے امور اچھی طرح انجام دیتا ہے تو اس کی کامیابی یقینی ہے۔
آپ جانتے ہیں کہ ایمان و عمل صالح کا مفہوم وسیع و عمیق ہے۔ خاص طور سے ان توضیحات کی روشنی میں جو ہم نے توحید کی بحث میں دی ہیں۔ ایک معاشرے کی ترقی و کمال کے لئے اعلیٰ ترین اور پاکیزہ اصول ہوسکتا ہے۔ عمل صالح سے مراد بہترین عمل اور وہ بھی بہترین روشوں کے ساتھ ہے۔ جو تدبیر، پیش بینی، تعاون، ہر قسم کے عیوب سے مبرا، کمزوری و سستی سے منزہ مستقل کوشش کے ساتھ کام بہ حسن انجام پاتا ہے۔ ظاہر ہے، اس طرح کے ایمان و عمل کے نتیجے میں بہت ہی مفید نتیجہ نکل سکتا ہے۔ سورہ نور کی آیت ۵۵ میں تفصیل کے ساتھ صاحبان ایمان کے لئے حکومت، قدرت، اثر و رسوخ، دین کی ترقی، امن و امان کا قیام اور ہر طرح کے شرک کے خاتمے کا وعدہ کیا گیا ہے جس کی ابتدا یوں ہے۔

وعد اللہ الذین آمنوا منکم و عملوا الصالحات .....

تم میں سے جو ایمان لے آئے اور اچھے اعمال انجام دئے ہیں
ان سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے .....

صاف واضح ہے کہ یہ وعدہ ان لوگوں سے نہیں ہے جو نام کے مسلمان اور صرف اسلامی ملک میں رہتے ہیں بلکہ کامیابیوں کا وعدہ ان سے ہے جو ایمان و عمل سے وابستہ ہیں۔ اس آیت کریمہ میں لفظ "منکم" یعنی تم میں سے بعض اس آیت کا ایک شاہکار ہے۔ اس لحاظ سے یہ ترقی اور تابناک مستقبل کا تعلق حقیقتوں سے ہے نہ کہ فقط نام سے۔
اس کامیابی کے بارے میں دوسری بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ انسانی معاشرہ مجموعی طور پر کمال کی جانب گامزن ہے۔ یعنی فکر و نظر، تہذیب و تمدن اور صنعتوں کے لحاظ سے واضح طور پر ترقی کر رہا ہے۔ البتہ یہ تفاوت بشریت کے لئے مجموعی طور پر ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی خاص معاشرہ اپنی زندگی میں انحطاط و زوال سے دوچار ہو جائے۔

یا مثلاً ممکن ہے کہ صنعت اور ٹکنولوجی میں ترقی ہو لیکن اخلاقی قدریں پامال ہوں۔ حق کشی، جنگ فسادات اور بلوے مشاہدے میں آئیں۔ لیکن مجموعی طور پر انسانی معاشرہ ترقی کر رہا ہے۔ یہ ارتقائی سفر جو پوری کائنات میں موجود ہے۔ انسانی معاشرہ بھی اس سے محروم نہیں ہے۔ اسی لئے وحدت، نسلی امتیازات کے خاتمہ، عام و مشترکہ حقوق اور مکمل اجتماعی عدالت کے اصول کا تصور آہستہ آہستہ لوگوں میں راسخ ہو رہا ہے۔ ایسے مسائل کے وجود اور ان کو پانے کے لئے جاری جدوجہد سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آخر کار لوگوں کے اجتماعی فکر و شعور کی ترقی اس منزل پر پہنچ جائے گی کہ افراط و تفریط سے دور معاشرے میں معتدل و متوازن راہ ایجاد ہو جائے گی اور یہی اسلام کا واضح راستہ ہے۔ البتہ حقیقی معنوں میں نہ کہ وہ اسلام جس کا پرتو اس زمانے میں بعض مسلمانوں کے اعمال و کردار میں موجود ہے۔

معاد:

معاد کے بارے میں اسلام نے تمام ادیان عالم سے زیادہ بحث کی ہے۔ اگرچہ حیات بعد موت اور اعمال کی جزا و سزا کا عقیدہ تمام آسمانی ادیان میں موجود ہے، پھر بھی معاد کے بارے میں ان ادیان کے مصادر اور اسلام کے نظریات کا تجزیہ کیا جائے تو بلا خوف و تردید کہہ سکتے ہیں، کہ بہت سے دوسرے مسائل کی طرح اسلام نے اس مسئلے کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے بہت کم سورے ایسے ہوں گے جن میں کسی نہ کسی طرح سے معاد کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔

دراصل معاد کا عقیدہ اسلام کے تصور کائنات میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اسلام کی تعلیمات اور نظام میں اس کے اثرات واضح ہیں۔ یہ عقیدہ ضروری اور ناقابل تردید ہے۔

ربنا انک جامع الناس لیوم لاریب فیہ ان اللہ لایخلف المیعاد (آل عمران/۹)

پروردگارا! تو لوگوں کو ایک دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں، بے شک خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

وقال الذین کفروا لاتاتینا الساعۃ قل بلیٰ وربی لتاتینکم

کافروں کا کہنا ہے کہ ہمارے لئے قیامت پیش نہیں آئے گی۔ کہدو ہاں خدا کی قسم تمہارے لئے قیامت پیش آئے گی۔ (سبا/۳)

ہم نے قیامت کے عقیدے کو وحی کی دلیل سے قبول کیا ہے۔ کیونکہ ہمارے لئے یہ ثابت ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالی کی طرف سے آیا ہے اور جو کچھ اس میں ہے حق ہے۔ اسی لئے معاد بھی حق ہے۔ اس دلیل کے علاوہ علمی، فلسفی، فکری اور عقلی راہیں موجود ہیں۔ جو ہمارے لئے معاد کو ثابت کرتی ہیں۔ یعنی یہ امر خلاف علم و منطق نہیں ہے بلکہ ممکن اور قابل توجیہ ہے۔

قرآن میں معاد کی تشریح اور انسانی ذہن کو اس کے امکان سے آگاہ کرنے کے لئے آیتیں موجود ہیں جو مجموعی طور پر تجدید طبیعت اور مادی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے ذریعہ اس امر پر استدلال کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے آغاز خلقت و پیدائش کو نئی زندگی کے امکان پر دلیل بنایا ہے۔

قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم

(یونس/۷۹)

کہدو ان ہڈیوں کو وہ خدا زندہ کرے گا جس نے پہلے اس کو خلق کیا ہے اور خداوند عالم ہر تخلیق کا علم رکھنے والا ہے۔

اولیس الذی خلق السموات والارض بقادر علی ان یخلق مثلھم بلی وھو الخلاق العلیم۔ (یونس/۸۱)

جس نے زمین و آسمان کو خلق کیا ہے کیا وہ ان کے مانند خلق کرنے کی قدرت نہیں رکھتا، البتہ وہ خلق کرنے والا اور علیم ہے۔

فانظر الی اثار رحمۃ اللہ کیف یحیی الارض بعد موتھا ان ذالک لمحی الموتی وھو علی کل شیء قدیر (روم/۵۰)

رحمت خداوندی کے اثرات تو دیکھو کس طرح مردہ زمین کو زندگی دیتا ہے۔ بے شک خدا مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آخرت کی دنیا حساب و کتاب اور عمل سے استفادہ کا دن ہے۔ اگر ہماری موجودہ زندگی

جدوجہد کے لئے ہے تو وہ زندگی نتائج کے پانے کی ہے۔

ؤفیت کل نفس ماکسبت وھم لا یظلمون (آل عمران/ ۲۵)

ہر کوئی جو کچھ اپنے لئے تلاش کرتا ہے پالیتا ہے۔

فینبئہم بما عملوا احصٰہ اللہ ونسوہ (مجادلہ/ ۶)

خداوند عالم اس کی خبر دے گا جو انجام دے چکے ہیں۔ خدا توان کا حساب کر چکا ہے۔ اور گن چکا ہے، جبکہ وہی لوگ فراموش کر بیٹھے ہیں۔

یہ حساب بڑی دقت کے ساتھ عدالت کی بنیاد پر ہوا ہے۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ (زلزال/ ۶)

جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کا کام کیا ہے وہ اسے دیکھے گا اور اسی طرح جس نے ذرہ برابر برائی کی ہے۔ اسے بھی دیکھے گا۔

ہر انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ رنگ ونسل رشتہ داری یا دوسرے تعلقات کسی مشکل کو حل نہیں کرتے، بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ اٹھانا ہے۔

ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ (فاطر/ ۱۸)

کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فعلیھا (فصلت/ ۴۶)

جو کوئی اچھا عمل بجا لاتا ہے۔ اس کے اپنے لئے ہے اسی طرح جب کوئی برا کام کرتا ہے تو وہ اسی کے لئے نقصان دہ ہے۔

حیات اخروی میں آج کل کی زندگی کے اعمال اور عادتیں کافی وسعتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ یہاں کی خصلتیں، اور روشیں سب ابن آدم کے ساتھ ہیں اور

یوم تجد کل نفس ماعملت من خیر محضرا وما عملت من سوء (ال عمران/ ۳۰)

جس دن انسان اپنے اچھے برے اعمال کو اپنے سامنے پائے گا۔

وحصّل مافی الصدور (عادیات ۱۰)
جو کچھ سینوں میں پوشیدہ ہے سامنے آجائے گا۔

اس لحاظ سے بہشت و جہنم انسان کی خصلتوں اور اعمال کا براہ راست ردعمل اور نتیجہ ہے بلکہ بعینہ وہی ہے جو اپنی حقیقی صورت میں بہت وسیع پیمانوں میں ظاہر ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں یا بہشت کی تعمیر کرتے ہیں اور یا جہنم کی آگ میں اضافہ کرتے ہیں۔ قیامت میں اچھوں اور بروں کی صفیں ایک دوسرے سے جدا ہوں گی۔ لیکن ان دونوں صفوں میں موجود افراد بھی ایک ہی درجے میں نہیں ہوتے۔ بلکہ نیکیوں، خدمتوں اور کمالات نیز برائیوں، خیانتوں اور اخلاقی رذائل کے لحاظ سے مختلف درجوں میں بٹے ہوئے ہوں گے۔

ولکل درجات مما عملوا ولیوفیہم اعمالھم (احقاف/۱۹)
ہر شخص کا اپنے عمل کے مطابق ایک درجہ ہے تاکہ خداوند عالم ان کے اعمال ان تک پہنچا دے۔

قیامت کی زندگی صرف ایک روحانی اور معنوی حیات نہیں۔ بلکہ ایسی زندگی ہے جسمیں انسانی زندگی کی تمام قدریں موجود ہوں گی۔ یعنی اگر خداوند عالم نے انسانی جسم کو روحانی، مادی، معنوی، انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کے ساتھ خلق فرمایا ہے تو قیامت میں انہی تمام صفات کے ساتھ محشور کیا جائے گا۔

البتہ اس سے کہیں زیادہ وسیع انداز میں۔

جناب محمد تقی فلسفی

ترجمہ: جناب سید محمد ظفر حسینی

امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی میں اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت

بنی امیہ اور آل مروان کے دوران حکومت مسلمان انتہائی جبر و تشدد اور بے حد گھٹن کی زندگی بسر کر رہے تھے، خلفا اور ان کے جرائم پیشہ کارپردازوں کے مظالم نے لوگوں پر عرصۂ حیات اس قدر تنگ کر رکھا تھا کہ وہ ہر وقت پریشان حال رہتے اور خود کو قطعاً غیر محفوظ پاتے۔ جان و مال، عزت و آبرو، حیثیت و شرافت اور ناموس و اولاد غرضکہ وہ اپنا سب کچھ ہمیشہ معرض خطر میں محسوس کرتے۔ ان حکمرانوں میں بعض ایسے بھی گذرے جنھوں نے الٰہی تعلیمات اور اسلامی عدل و انصاف کو بری طرح پامال کیا اور ظلم و بربریت کو اپنی معراج کمال تک پہنچایا،

«قَالَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ: لَوْ جَاءَتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِخَبِيثِهَا وَ جِئْنَا بِالْحَجَّاجِ لَغَلَبْنَاهُمْ».

عمر بن عبد العزیز کہا کرتے تھے کہ اگر سب امتیں اپنے خبیث ترین انسان کو لائیں اور ہم (ان کے مقابلے میں) حجاج کو لائیں تو ہمارا پلہ بھاری ہوگا۔

بنی امیہ اور آل مروان کی حکومت کا سلسلہ لگ بھگ سو سال تک قائم رہا۔ اس اثنا میں بنی امیہ لوگوں کا بغض و عناد جتنا زیادہ بڑھتا جاتا اتنا ہی زیادہ ائمہ معصومین علیہم السلام سے ان کی محبت و الفت میں اضافہ بھی ہوتا جاتا اور رسول اکرمؐ کے اہلبیتؑ اطہار کی مودت ان کے دلوں میں اتنی ہی زیادہ جاگزین ہوتی جاتی۔ آل رسولؐ سے لوگوں کی یہ عقیدت اور لگاؤ بنی امیہ کی آنکھوں میں خار کی مانند کھٹکتا اور انہیں مسلسل رنج و غم میں مبتلا رکھتا۔ چنانچہ وہ اس درد کے درماں اور اس مسئلے کے حل کی خاطر شیعوں کی بے عزتی اور اہانت کیا کرتے، انہیں طرح طرح سے آزار پہنچاتے، اور اگر انہیں ایسے افراد نظر آتے جو عوام میں صاحب اثر و رسوخ اور مسموع الکلام ہوتے تو انہیں حکومت مخالف عناصر کا ساتھی ظاہر کر کے، یا ایسے ہی دوسرے اتہامات زبردستی عائد کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔

ائمہ طاہرین علیہم السلام پر بھی کڑی نگرانی رکھی جاتی، لوگوں کو آزادانہ طور پر ان سے ملنے بھی نہیں دیا جاتا، مقصد یہ ہوتا کہ لوگ آہستہ آہستہ انہیں فراموش کر دیں اور وہ معاشرے کے ذہن سے اوجھل ہو جائیں لیکن جب وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو پاتے تو ائمہ طاہرینؑ کو زہر دغا سے شہید کرتے اور اس طرح ان کی پاکیزہ شمع حیات کو گل کر دیتے۔

ان ظالمانہ حرکتوں سے نہ صرف یہ کہ اہلبیتؑ کی محبوبیت کچھ کم نہیں ہوئی بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا یہاں تک کہ بنی عباس نے اپنے انقلاب کے دوران آل رسولؐ کی محبوبیت سے کافی فائدہ اٹھایا، بنی امیہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے اپنے کو ائمہ معصومینؑ کے طرفدار کی حیثیت سے پہچنوایا اور اس طرح سے لوگوں کے اذہان کو اپنے انقلاب کی جانب متوجہ کیا اور اہلبیتؑ کے شیعوں اور چاہنے والوں کی حمایت حاصل کی۔ لیکن جب ان کا انقلاب کامیاب ہو گیا اور اپنے تمام مقاصد حاصل کر لئے تو انہوں نے بھی وہی بنی امیہ کا طرز عمل اختیار کر لیا اور خانوادۂ پیغمبر اسلامؐ اور ان کے شیعوں کے ساتھ بدسلوکی اور تند خوئی کا آغاز کر دیا۔

عوام کو حضرت امام صادق علیہ السلام سے دور کرنے کے لیے منصور دوانیقی نے آپ کے عصمت کدہ اور آس پاس کے گلی کوچوں کی نگرانی کے لئے جاسوس معین کر دیئے کسی کو بھی ان اطراف میں آنے جانے کی ہمت نہ تھی سختیوں کی انتہا یہ تھی کہ آپ کے دوست دار چاہنے والے

دینی مسائل دریافت کرنے کے لیے پھیری والوں کے لباس میں چیزیں فروخت کرنے کے بہانے آپ کے بیت الشرف تک جاتے، آپ سے مسائل دریافت کرتے، لیکن اس کے باوجود ان کی گرفتاری کا ہر آن خدشہ پایا جاتا تھا۔

کچھ دنوں بعد منصور کی سیاست نے نئی کروٹ لی اور اس نے طے کیا کہ امام کے بارے میں اپنا رویہ بدلنا چاہئے اور دوست کے بھیس میں آپ کے سامنے آنا چاہئے تاکہ محل میں آپ کی آمد و رفت کے لیے راستہ ہموار ہو جائے اور پھر اس طرح آپ سے شیعوں کے ایک گروہ کی عقیدت و محبت کو کافی حد تک کم کیا جا سکے اور وہ بدگمان ہو کر سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے محترم فرزند نے اپنی روش تبدیل کر دی ہے اور منصور کی ظالم و جابر حکومت کے ساتھ تعاون کو کس لئے گوارا فرمایا ہے؟؟ نیز دوسرے گروہ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جائے کہ منصور کی حکومت برحق اور مرضئ خدا کے عین مطابق ہے کیونکہ، اگر ایسا نہ ہوتا تو اسے کبھی بھی امام معصومؑ کی حمایت حاصل نہیں ہو سکتی تھی اور امامؑ ہرگز ہرگز اسے قبول کرنے کی تلقین نہیں فرما سکتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر یہ دونوں ہی باتیں عباسی حکومت کے حق میں مفید ثابت ہوں گی۔

«فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ لِمَ لَا تَغْشَانَا كَمَا يَغْشَانَا سَائِرُ النَّاسِ»؟

چنانچہ اس نے امامؑ عالیمقام کی بارگاہ میں پیغام بھیجا کہ آپ دوسرے لوگوں کی مانند میرے دربار میں آمد و رفت کیوں نہیں رکھتے؟ امام نے جواب میں فرمایا:

«مَا عِنْدَنَا مِنَ الدُّنْيَا مَا نَخَافُكَ عَلَيْهِ وَلَا عِنْدَكَ مِنَ الْآخِرَةِ مَا نَرْجُوكَ لَهُ وَلَا أَنْتَ فِي نِعْمَةٍ فَنُهَنِّئَكَ عَلَيْهَا وَلَا تَعُدُّهَا نِقْمَةً فَنُعَزِّيَكَ عَلَيْهَا فَلِمَ نَغْشَاكَ؟

ہمارے پاس از قسم دنیا ایسی کوئی بھی چیز نہیں ہے جس کے بارے میں ہم تجھ سے خوفزدہ ہوں نہ تیرے پاس از قسم آخرت کوئی شئے ہے جسے حاصل کرنے کے لئے ہم تجھ سے امید لگائیں، نہ نعمتوں میں زندگی بسر کر رہا ہے کہ ہم تجھے مبارکباد پیش کریں اور نہ ہی اپنے موجودہ حالات

وکیفیات کو مصیبت و بلا تصور کرتا ہے کہ ہم تجھے اس کی تعزیت دیں، پھر کس واسطے تیرے دربار میں آمد و رفت رکھیں؟

امام علیہ السلام کا یہ جواب اگرچہ منصور کے لیے بے حد دنداں شکن تھا لیکن آپ کی معنوی قدر و منزلت اور معاشرے میں آپ کے گہرے اثر و رسوخ سے واقفیت کی بنا پر اس نے آپ کے اس جواب کو نظر انداز کیا اور آپ کی حمایت حاصل کرنے کی امید میں ایک دوسرا پیغام اس طرح ارسال کیا:

«اِنَّكَ تَصْحَبُنَا لِتَنْصَحَنَا»

آپ وعظ و نصیحت کے خیال سے ہماری مصاحبت فرمائیں۔!

امامؑ نے جواب ارسال فرمایا:

«مَنْ أَرَادَ الدُّنْيَا فَلَا يَنْصَحُكَ وَ مَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ فَلَا يَصْحَبُكَ .

جس کا مقصد دنیا ہے وہ تجھے کبھی وعظ و نصیحت نہیں کرے گا اور جو آخرت کا خواہاں ہے وہ کبھی بھی تیری ہمنشینی اور مصاحبت پسند نہیں کرے گا۔

منصور دوانیقی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مایوس ہوگیا اور اس نے سمجھ لیا کہ آپ اس کی دعوت کو قبول نہیں فرمائیں گے، اس سے دوستانہ تعلقات قائم نہیں کریں گے اور دربار خلافت میں کسی قیمت پر بھی آمد و رفت کا آغاز نہیں فرمائیں گے۔ لہٰذا اس نے اپنی سختیوں میں اضافہ کر دیا اور امامؑ عالیمقام نیز آپ کے شیعوں پر طرح طرح کے مصائب و آلام توڑنا شروع کر دیئے یہاں تک کہ زہر دغا کے ذریعہ آپ کی شمع حیات کو گل کر دیا، پھر ہارون رشید نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ بھی اسی ظالمانہ برتاؤ کو روا رکھا، آپ کو قید کر دیا اور بالآخر زہر کے ذریعہ آپ کی حیات طیبہ کا خاتمہ کر دیا۔

جب مامون رشید تخت خلافت پر بیٹھا اور حکومت کی کرسی اس کے زیر نگیں آئی تو اس نے مصمم ارادہ کیا کہ منصور دوانیقی جس منصوبے کو حضرت امام جعفر صادقؑ کے سلسلے میں عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا، لیکن کامیاب نہیں ہو سکا، اسی کو حضرت امام رضاؑ کے بارے میں عملی جامہ پہنائے۔ آپ کو دربار خلافت تک مجبور کرکے لائے اور پھر حکومت کے کسی اہم عہدے پر فائز ہونے کے لیے

مجبور کرے، اس مقصد میں کامیابی کے لئے پہلے تو درخواست اور گذارش سے کام لیا جائے اور اصرار کیا جائے لیکن اگر امامؑ قبول نہ فرمائیں تو پھر ڈرا دھمکا کے بات منوالنے کی کوشش کی کیجائے اور اگر پھر بھی کوئی نتیجہ نہ حاصل ہو تو امامؑ سے صاف طور پر یہ کہدیا جائے کہ آپ کو دو چیزوں کے درمیان اختیار ہے یا عہدہ قبول فرمائیں اور یا جام شہادت نوش فرمائیں۔

یہ طے کرتے ہی اس نے تمام منصوبے تیار کئے اور حکم جاری کیا کہ حضرت امام رضا علیہ السلام کو مدینہ سے خراسان لایا جائے، اس حکم کے ضمن میں اس نے سیاسی مصالح کے پیش نظر، سفر کی کیفیات، راستہ اور عبور کئے جانے والے شہروں تک کی حد بندی کر دی، امام با دل ناخواستہ بہ جبر و اکراہ اس سفر پر آمادہ ہوئے، حضرت رسول اکرمؐ اور دیگر مشاہد مقدسہ کی زیارت سے فراغت کے بعد اپنے اہل خاندان سے رخصت ہوئے اور خراسان کیطرف روانہ ہوگئے۔ منزلوں پر منزلیں طے کرتے اور مختلف شہروں سے گذرتے ہوئے خراسان تشریف لائے، مامون نے خود کو امامؑ سے گفتگو اور تبادلہ خیال کے لیے آمادہ کیا اور ملاقات کا وقت معین ہوگیا۔ اس ملاقات میں جو باتیں زیر بحث آئیں ان کی تفصیل یہ ہے:

«عَنْ أَبِي الصَّلْتِ الْهَرَوِيّ اِنَّ الْمَأْمُونَ قَالَ لِلرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ يَابْنَ رَسُولِ اللّٰهِ قَدْ عَرَفْتُ عِلْمَكَ وَ فَضْلَكَ وَ زُهْدَكَ وَ وَرَعَكَ وَ عِبَادَتَكَ وَ أَرَاكَ أَحَقَّ بِالْخِلَافَةِ مِنِّي. فَقَالَ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالْعُبُودِيَّةِ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ أَفْتَخِرُ وَ بِالزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا أَرْجُو النَّجَاةَ مِنْ شَرِّ الدُّنْيَا وَ بِالْوَرَعِ عَنِ الْمَحَارِمِ أَرْجُو الْفَوْزَ بِالْمَغَانِمِ وَ بِالتَّوَاضُعِ فِي الدُّنْيَا أَرْجُو الرِّفْعَةَ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ».

ابو صلت ہروی ناقل ہیں کہ مامون نے امامؑ سے کہا:

اے فرزند رسولؐ! میں آپ کے علمی مراتب، فضائل و کمالات، زہد و تقویٰ اور آپ کی عبادتوں سے بخوبی واقف ہوں، اور آپ کو اپنے سے زیادہ خلافت کے لئے موزوں پاتا ہوں، قبل اس کے کہ مامون اپنی بات پوری کرے اور امامؑ کے لیے کوئی مشکل لا کھڑی کرے۔ آپ نے فوراً جواب ارشاد فرمایا: مجھے خدا کی بندگی پر فخر ہے، دنیا سے زہد و کنارہ کشی کے ذریعہ میں دنیا کے شر سے محفوظ رہنا چاہتا ہوں، ورع و تقویٰ اور گناہوں سے پرہیزگاری کے ذریعہ میں ان سے حاصل ہونے والے

فوائد کا متمنی ہوں اور دنیا میں خاکساری و منکسر مزاجی کے ذریعہ میں بارگاہ الوہیت میں بلندی درجات کا خواہاں ہوں۔

«فَقَالَ لَهُ الْمَأْمُونُ فَإِنِّي قَدْ رَأَيْتُ أَنْ أَعْزِلَ نَفْسِي عَنِ الْخِلافَةِ وَ أَجْعَلَهَا لَكَ وَ أُبَايِعَكَ فَقَالَ لَهُ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلامُ إِنْ كَانَتْ هٰذِهِ الْخِلافَةُ لَكَ وَاللّٰهُ جَعَلَهَا لَكَ فَلا يَجُوزُ لَكَ أَنْ تَخْلَعَ لِبَاساً أَلْبَسَكَ اللّٰهُ وَ تَجْعَلَهُ لِغَيْرِكَ وَ إِنْ كَانَتِ الْخِلافَةُ لَيْسَ لَكَ فَلا يَجُوزُ لَكَ أَنْ تَجْعَلَ لِي مَا لَيْسَ لَكَ».

پھر مامون نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ میں خود کو خلافت سے معزول کر کے اس منصب پر آپ کو فائز کردوں اور میں خود بھی آپ کی بیعت کروں۔ امام نے جواب میں ارشاد فرمایا: کہ اگر خلافت تیرا حق ہے اور اس منصب کو خدا نے تجھ سے مخصوص کیا ہے تو تیرے لیے جائز نہیں ہے کہ خدا نے جس لباس سے تجھے آراستہ کیا ہے وہ کسی اور کو پہنا دے اور اگر خلافت تیرا حق نہیں ہے تو تجھے یہ حق بھی نہیں حاصل ہے کہ جس چیز کا تجھ سے تعلق ہی نہیں اسے کسی اور کے حوالے کرے۔

«فَقَالَ لَهُ الْمَأْمُونُ يَابْنَ رَسُولِ اللّٰهِ فَلابُدَّ لَكَ مِنْ قَبُولِ هٰذَا الأَمْرِ فَقَالَ لَسْتُ أَفْعَلُ ذٰلِكَ طَائِعاً أَبَداً فَمَا زَالَ يَجْهَدُ بِهِ أَيَّاماً حَتّٰى يَئِسَ مِنْ قَبُولِهِ فَقَالَ لَهُ فَإِنْ لَمْ تَقْبَلِ الْخِلافَةَ وَلَمْ تُحِبْ مُبَايِعَتِي لَكَ فَكُنْ وَلِيَّ عَهْدِي لِتَكُونَ لَكَ الْخِلافَةُ بَعْدِي».

مامون نے کہا: آپ کے لیے خلافت کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ امام نے فرمایا کہ میں قطعاً مائل نہیں ہوں اور اسے ہرگز قبول نہیں کروں گا، مامون کئی دنوں تک مسلسل اصرار کرتا رہا اور امامؑ اپنے انکار پر باقی رہے اور ہمیشہ منفی جواب دیتے رہے، جب مامون مایوس ہوگیا تو اس نے امامؑ عالی مقام کی بارگاہ میں عرض کی کہ اگر آپ خلافت قبول نہیں فرماتے ہیں اور میرے ہاتھ کی بیعت آپ کو منظور نہیں ہے تو میری ولیعہدی ہی قبول فرمائیے

توحید ۹۶

تاکہ میرے بعد منصب خلافت پر آپ فائز ہوں۔

«فَقالَ الرِّضا عَلَيْهِ السَّلامُ وَاللّٰهِ لَقَدْ حَدَّثَني أبي عَنْ آبائِهِ عَنْ أميرِالْمُؤْمِنينَ عَلَيْهِمُ السَّلامُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ: إنّي أخْرُجُ مِنَ الدُّنْيا قَبْلَكَ مَسْمُوماً مَقْتُولاً بِالسَّمِّ مَظْلُوماً تَبْكي عَلَيَّ مَلائِكَةُ السَّماءِ وَ مَلائِكَةُ الأرْضِ، وَأُدْفَنُ في أرْضِ غُرْبَةٍ إلىٰ جَنْبِ هارُونَ الرَّشيدِ فَبَكَى الْمَأْمُونُ ثُمَّ قالَ لَهُ يَابْنَ رَسُولِ اللّٰهِ وَ مَنْ ذَاالَّذي يَقْتُلُكَ أوْ يَقْدِرُ عَلَى الإسائَةِ إلَيْكَ وَ أنَا حَيٌّ؟ فَقالَ الرِّضا عَلَيْهِ السَّلامُ: أما إنّي لَوْ أشاءُ أنْ أقُولَ لَقُلْتُ مَنْ ذَاالَّذي يَقْتُلُني.

حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا: قسم خدائے وحدہٗ لاشریک کی، میرے پدر بزرگوار نے اپنے آبائے طاہرین علیہم السلام اور انھوں نے حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام سے اور انھوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث نقل کی ہے کہ میں تیری موت سے پہلے ہی زہر سے شہید کر دیا جاؤنگا اور نہایت مظلومیت کیساتھ دنیا سے اٹھونگا۔ زمین و آسمان کے تمام فرشتے مجھ پر گریہ کریں گے اور میں دیار غربت میں ہارون رشید کے پہلو میں دفن کیا جاؤنگا۔ آپ کی یہ گفتگو سن کر مامون رو دیا اور کہنے لگا کہ میرے جیتے جی کون ہے جو آپ کو شہید یا آپ کے ساتھ برے سلوک کر سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو بتا سکتا ہوں کہ میرا قاتل کون ہے؟

«فَقالَ الْمَأْمُونُ يَابْنَ رَسُولِ اللّٰهِ إنَّما تُريدُ بِقَوْلِكَ التَّخْفيفَ عَنْ نَفْسِكَ وَ دَفْعَ هٰذَا الأمْرِ عَنْكَ لِيَقُولَ النّاسُ إنَّكَ زاهِدٌ في الدُّنْيا فَقالَ الرِّضا عَلَيْهِ السَّلامُ: وَاللّٰهِ ما كَذِبْتُ مُنْذُ خَلَقَني رَبّي عَزَّوَجَلَّ وَما زَهِدْتُ فِي الدُّنْيا لِلدُّنْيا وَ إنّي لَأعْلَمُ ما تُريدُ فَقالَ الْمَأْمُونُ وَما أُريدُ؟ قالَ الأمانَ عَلَى الصِّدْقِ قالَ لَكَ الأمانُ قالَ تُريدُ بِذٰلِكَ أنْ يَقُولَ النّاسُ إنَّ عَلِيَّ بْنَ مُوسَى الرِّضا لَمْ يَزْهَدْ فِي الدُّنْيا بَلْ زَهِدَتِ الدُّنْيا فيهِ ألا تَرَوْنَ كَيْفَ قَبِلَ وِلايَةَ الْعَهْدِ طَمَعاً فِي الْخِلافَةِ.

مامون نے کہا: فرزند رسولؐ! آپ کا مقصد ان ارشادات سے یہ ہے کہ آپ اس ذمہ داری کو قبول نہ فرمائیں اور اس منصب سے خود کو دور رکھیں تاکہ لوگ سمجھیں کہ آپ زاہد و متقی اور دنیا سے بے پروا ہیں۔ امام نے فرمایا: قسم خدائے وحدہ لاشریک کی جب سے اس نے مجھے خلق کیا ہے کبھی بھی کوئی بات جھوٹ نہیں کہی، (تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ) میرا یہ زہد اور دنیا سے بے پروائی دنیوی اصول کے تحت دنیا طلبی کے لئے نہیں ہے، اور میں تیرے اس اصرار بلیغ کا مطلب بخوبی سمجھتا ہوں، مامون نے کہا کہ میرا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اگر میں کہدوں تو کیا امان میں ہونگا؟ اس نے کہا: ہاں! آپ کے لئے امان ہے: امامؑ نے فرمایا کہ تیرا مقصد یہ ہے کہ لوگ میرے بارے میں یہ کہنے لگیں کہ علیؑ بن موسیٰؑ رضا کو دنیا سے پرہیز و اجتناب نہیں تھا بلکہ خود دنیا ان کی دسترس میں نہ تھی، کیا نہیں دیکھتے! کہ اب دنیا ان کے لیے سازگار ہوگئی ہے تو انھوں نے خلافت کی طمع میں کس طرح ولی عہدی کو قبول کرلیا ہے؟

«فَغَضِبَ الْمَأْمُونُ ثُمَّ قَالَ إِنَّكَ تَتَلَقَّانِي أَبَداً بِمَا أَكْرَهُهُ وَ قَدْ أَمِنْتَ سَطْوَتِي فَبِاللّٰهِ أُقْسِمُ لَئِنْ قَبِلْتَ وِلَايَةَ الْعَهْدِ وَ إِلَّا أَجْبَرْتُكَ عَلٰى ذٰلِكَ فَإِنْ فَعَلْتَ وَإِلَّا ضَرَبْتُ عُنُقَكَ فَقَالَ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ قَدْ نَهَانِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى أَنْ أُلْقِيَ بِيَدِي إِلَى التَّهْلُكَةِ فَإِنْ كَانَ الْأَمْرُ عَلٰى هٰذَا فَافْعَلْ مَا بَدَا لَكَ وَ أَنَا أَقْبَلُ ذٰلِكَ عَلٰى أَنْ لَا أُوَلِّيَ أَحَداً وَلَا أَعْزِلَ أَحَداً وَلَا أَنْقُضَ رَسْماً وَلَا سُنَّةً وَ أَكُونَ فِي الْأَمْرِ مِنْ بَعِيدٍ مُشِيراً فَرَضِيَ مِنْهُ بِذٰلِكَ وَ جَعَلَهُ وَلِيَّ عَهْدِهِ عَلٰى كَرَاهَةٍ مِنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِذٰلِكَ.[1]

حضرت امام رضا علیہ السلام کی یہ گفتگو سن کر مامون غصہ سے بھر گیا اور بولا کہ اب آج کے بعد سے آپ سے میرے رویے کا انداز اس طرح کا ہوا کرے گا جسے میں خود بھی پسند نہیں کرتا، آپ نے خود کو میرے قہر و غلبہ سے محفوظ محسوس کرلیا ہے، قسم خدا کی آپ کو ولی عہدی قبول کرنا پڑے گی، اگر قبول نہیں کیا تو مجبور کیا جائے گا اور اگر پھر بھی قبول کرنے سے انکار کیا تو میں آپ کو قتل کر ڈالوں گا۔ امام نے فرمایا کہ خدا نے مجھے منع کیا ہے اس بات سے کہ میں

خود کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت میں ڈالوں، اب اگر بات اسی پر ٹھہری ہے تو مجھے مجبوراً ولی عہدی قبول کرنا ہی پڑے گی لیکن شرط یہ ہے کہ نہ تو میں کسی کو عہدے پر مقرر کرونگا اور نہ کسی کو اس کے عہدے سے معزول کروں گا اور نہ موجودہ و رائج رسم و قوانین کو ختم کروں گا بس دور ہی دور رہ کر امور میں مشورے دیدیا کروں گا۔ مامون نے آپ کی ان شرطوں کو قبول کر لیا اور پھر امامؑ کو بادل ناخواستہ ولی عہدی کی منظوری دینا پڑی۔

جب حضرت امام رضا علیہ السلام نے ان پرخطر حالات میں اپنے شرعی فریضہ کے مطابق مامون کی ولی عہدی کو قبول فرما لیا تو لوگوں نے اس کا سبب جاننا چاہا چنانچہ امام علیہ السلام جواب کے پردے میں انھیں کسی نہ کسی طرح قتل کی دھمکی کے بارے میں سمجھایا کرتے تھے:

«عَنْ مَحَمَّدِبْنِ عَرَفَةِ قَالَ قُلْتُ لِلرِّضٰا عَلَيْهِ السَّلاٰمُ يَابْنَ رَسُولِ اللّٰهِ مٰا حَمَلَكَ عَلَى الدُّخُولِ فِي وِلاٰيَةِ الْعَهْدِ؟ فَقٰالَ مٰا حَمَلَ جَدِّي أَمِيرِالْمُؤْمِنِينَ عَلَى الدُّخُولِ فِي الشُّورٰى»۔

محمد بن عرفہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے عرض کی وہ کون سا سبب ہے، جس نے آپ کو ولی عہدی قبول کرنے پر مجبور کیا؟ تو امامؑ نے فرمایا کہ جس شئی نے میرے جد بزرگوار حضرت علی علیہ السلام کو شوریٰ میں شرکت پر مجبور کیا تھا۔ یعنی قتل کی دھمکی ــــ!

خراسان کا علاقہ مامون کے زمانے میں طاقتور اسلامی ملک کا مرکز تھا اور سیاسی اعتبار سے اس وقت کی دنیا میں بے پناہ اہمیت کا حامل تھا۔ دنیا کے گوشہ گوشہ سے دانشمند افراد اور سیاسی شخصیتیں وہاں آیا کرتی تھیں، جو بہت سے امور کا جائزہ لیتیں اور مختلف مسائل پر تحقیقات کرتیں ملک کے معاملات میں دخل نہ دینے کی شرط کے ساتھ ولی عہدی قبول کرنے کی بنا پر امام کے پاس مناسب موقع اور وقت میں نسبتاً زیادہ گنجائش موجود تھی اس لئے آپ مختلف شعبوں سے متعلق دنیا کے دانشوروں کے سوالات کے جوابات با اطمینان دے سکتے تھے اور اسی صورت علم طور پر دیگر مذاہب کے علماً اور خاص طور پر علمائے اسلام کے سوالات کے جوابات سے بھی آپ بہرہ مند فرما سکتے تھے۔ چنانچہ یہ سلسلہ اکثر اوقات جاری رہتا یہاں تک کہ امام علیہ السلام کے

بیانات سے بہت سے نامعلوم حقائق و معارف آشکار ہوئے جن کا کچھ حصہ کتابوں میں محفوظ ہو سکا ہے اور آج بھی صاحبان مطالعہ کی دسترس میں ہے۔

خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کے دور میں جو مسائل مذہبی اور سیاسی اعتبارات سے بہت زیادہ اہمیت کے حامل تھے ان میں ایک یہ مسئلہ بھی تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کی جانشینی کی کیا شرطیں ہیں؟ اور وہ کون لوگ ہیں جو آپؐ کے بعد مسلمانوں کے رہنما اور پیشوا بن سکتے ہیں؟ تمام ائمہ طاہرینؑ منجملہ حضرت امام رضا علیہ السلام اپنے اپنے ادوار میں مسئلہ امامت اور شرائط امام وغیرہ کے متعلق قرآن مجید اور احادیث پیغمبرؐ کی روشنی میں جس قدر بھی ممکن ہوا برابر لوگوں کو آگاہ کرتے رہے۔ ان کے تمام ارشادات اس حقیقت کے غماز تھے کہ خلفائے بنی امیہ و بنی عباس پیغمبر اسلامؐ کی جانشینی کے لائق ہرگز نہیں۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کے سلسلے میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ آپ ولی عہدی قبول کرنے کے بعد بھی بالکل پہلے ہی کی طرح صاف اور صریحی گفتگو فرمایا کرتے تھے اور آپؑ نے اپنی روش میں معمولی سی بھی تبدیلی نہ آنے دی تھی۔ آپ شرائط و صفات امام بیان کرتے وقت مامون کی موجودگی و عدم موجودگی دونوں میں نہایت بے پروائی کے ساتھ تمام قابل ذکر باتوں کو بیان فرمادیا کرتے تھے اور اس سبب سے کہ یہ باتیں خلیفہ کے مزاج پر گراں گزریں گی کبھی کوئی رعایت نہ فرماتے تھے۔

جس وقت امامؑ مدینہ سے خراسان تشریف لیجارہے تھے، جب نیشاپور پہنچے تو راویان حدیث نے آپؑ سے کوئی حدیث بیان فرمانے کی درخواست کی۔ چنانچہ آپؑ نے ایک روایت جسے آپؑ کے آبائے طاہرینؑ نے رسول خداؐ سے اور انھوں نے جبرئیل سے اور انھوں نے بارگاہ الوہیت سے کلمہ وحدانیت کے بارے میں نقل کی تھی، بیان فرمائی:

«لٰا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حِصْنِی فَمَنْ دَخَلَ حِصْنِی أَمِنَ مِنْ عَذٰابِي»

کلمۂ توحید میرا قلعہ ہے جو کوئی اس قلعہ میں داخل ہو جائے گا میرے عذاب سے محفوظ رہے گا۔

«فَلَمّٰا مَرَّتِ الرّٰاحِلَةُ نٰادیٰ بِشُرُوطِهٰا وَ اَنَا مِنْ شُرُوطِهٰا.»

توحید ۱۰۰

جب آپکی سواری کچھ آگے بڑھی تو آپ نے پھر فرمایا کہ کلمۂ توحید کی کچھ شرطیں ہیں اور اس کی ایک شرط خود میں ہوں، یعنی کلمۂ توحید اس وقت سبب امان اور سرمایۂ نجات بنے گا جب اس کی تمام شرطیں پوری کی گئیں ہوں، منصب امامت پر فائز الٰہی نمائندے کلمۂ توحید کی جملہ شرطوں میں سے ایک شرط ہیں اور میں ان ہی کی ایک فرد ہوں۔

حضرت امام رضا علیہ السلام بخوبی واقف تھے کہ اتنے بڑے مجمع میں آپ کا یہ بیان ہرگز مخفی نہیں رہے گا اس کی اطلاع مامون کے کانوں تک بہرحال پہنچے گی لیکن پھر بھی آپ نے بے جھجک ہو کر سب کچھ بیان فرمادیا اور لوگوں کی توجہ معرفت امام کی ضرورت اور منصب امامت کی اہمیت کی جانب بخوبی مبذول فرمادی۔

آپ نے نہ صرف نیشاپور میں اتنے صاف طور پر "دین میں امام کی اہمیت" کے موضوع پر گفتگو فرمائی بلکہ مامون سے آمنا سامنا ہونے اور ولی عہدی کے لیے مجبور کئے جانے کے بعد بھی اس روش کو برقرار رکھا اور ہر جگہ نہایت واضح اور صریحی انداز میں امامت کے مسئلے کو برابر اجاگر فرماتے رہے، ذیل میں (نمونہ کے طور پر) ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

«رُوِیَ اَنَّ اَلْمَأْمُونَ بَعَثَ اَلْفَضْلَ بْنَ سَهْلٍ ذَاالرِّیَاسَتَیْنِ إِلَی الرِّضَا عَلَیْهِ السَّلاٰمُ فَقَالَ لَهُ: إِنِّی أُحِبُّ أَنْ تَجْمَعَ لِیَ مِنَ اَلْحَلاٰلِ وَالْحَرَامِ وَالْفَرَائِضِ وَالسُّنَنِ فَإِنَّكَ حُجَّةُ اللّٰهِ عَلیٰ خَلْقِهِ وَمَعْدِنُ الْعِلْمِ.

فَدَعَا الرِّضَا عَلَیْهِ السَّلاٰمُ بِدَوَاةٍ وَقِرْطَاسٍ وَقَالَ لِلْفَضْلِ اُكْتُبْ.

مامون نے فضل ابن سہل ذوالریاستین کو حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت بابرکت میں بھیجا اور پیغام کہلوایا کہ میرے لئے دین کے حلال و حرام اور واجبات و مستحبات پر مشتمل ایک رسالہ تیار فرمادیں اس لئے کہ آپ لوگوں پر اللہ کی حجت اور علم و آگہی کا خزانہ ہیں۔ آپ نے دوات اور کاغذ کا حکم دیا جب حاضر کیا گیا تو آپ نے فضل سے فرمایا کہ لکھو!

امام کی گفتگو کا آغاز خدائے متعال کے نام سے ہوا، پھر کلمۂ توحید اس کے بعد صفات

باری تعالیٰ بیان ہوئے، پھر آپؑ نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی گواہی دی اور آنحضرتؐ کے ختم المرسلین ہونے کا تذکرہ کیا، اس کے بعد قرآن کے تمام مطالب و مفاہیم، محکمات و متشابہات خاص و عام، وعدہ وعید اور ناسخ و منسوخ آیات کی تصدیق واجب قرار دی اور پھر مسئلہ امامت اور اس کی اہمیت واضح فرمائی نیز امیرالمومنین حضرت علیؑ بن ابیطالب اور حسنین علیہم السلام کے اسمائے گرامی صریحی طور پر ذکر فرمائے اور اس کے بعد ائمہ طاہرینؑ کا تذکرہ بطور اجمال فرمایا، خط کے آخر میں آپؑ نے عبادات وغیرہ سے متعلق اسلام کے کچھ فروعی احکام بیان فرمائے ہیں حتیٰ کہ عورتوں کے کچھ مخصوص مسائل بھی اس رسالے میں موجود ہیں، اپنے ارشادات کے دوران آپؑ نے چند جملے امام کے مدارج و مراتب اور اس کی اہمیت و قدر و منزلت کے بارے میں ارشاد فرمائے ہیں، چونکہ ہمارے موضوع سے متعلق ہیں لہٰذا انھیں بعینہ نقل کیا جاتا ہے۔

«وَ إِنَّهُمُ الْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى وَ أَئِمَّةُ الْهُدٰى وَالْحُجَّةُ عَلٰى أَهْلِ الدُّنْيٰا حَتّٰى يَرِثَ اللّٰهُ الْأَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهٰا وَهُوَ خَيْرُالْوٰارِثِينَ وَ اَنَّ كُلَّ مَنْ خٰالَفَهُمْ ضٰالٌّ وَ مُضِلٌّ تارِكٌ لِلْحَقِّ وَالْهُدٰى وَ إِنَّهُمُ الْمُعَبِّرُونَ عَنِ الْقُرآنِ النّٰاطِقُونَ عَنِ الرَّسُولِ بِالْبَيٰانِ مَنْ مٰاتَ لٰا يَعْرِفُهُمْ وَلٰا يَتَوَلّٰاهُمْ بِأَسْمٰائِهِمْ وَأَسْمٰاءِ آبٰائِهِمْ مٰاتَ مَيْتَةً جٰاهِلِيَّةً».

ائمہ طاہرین علیہم السلام (عروۃ الوثقیٰ) رشد و ہدایت کے رہنما اور اہل دنیا پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہیں تاوقتیکہ دنیا فنا ہو جائے اور خدا جو بہترین وارث ہے زمین و موجودات زمین کا وارث ہو، وہ شخص جو ان اماموں کا مخالف ہو خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہی میں ڈالنے والا نیز حق و ہدایت سے منحرف ہے، ائمہ معصومین علیہم السلام قرآن کے مفسر اور رسولؐ خدا کے ارشادات کے شارح ہیں چنانچہ جو اس عالم میں دنیا سے اٹھ جائے کہ ان کا دوست دار ہو، نیز ان کے اور ان کے آبائے طاہرین کے اسمائے سے ناواقف ہو اور ان کی معرفت نہ رکھتا ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

«عَنْ عَبْدِالْعَزِيزِبْنِ مُسْلِمٍ قٰالَ: كُنّٰا مَعَ الرِّضٰا عَلَيْهِ السَّلٰامُ بِمَرْوَ

توحید ۱۰۲

فَاجْتَمَعْنا فِي الْجامِعِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فِی بَدْءِ مَقْدَمِنا فَأَدارُوا أَمْرَ الْإِمامَةِ وَذَكَرُوا كَثْرَةَ اخْتِلافِ النّاسِ فِيها فَدَخَلْتُ عَلىٰ سَيِّدِي(ع) فَأَعْلَمْتُهُ خَوضَ النّاسِ فِيهِ فَتَبَسَّمَ عَلَيْهِ السَّلامُ ثُمَّ قالَ..... إنَّ الإمامَةَ أَجَلُّ قَدراً وَ أَعْظَمُ شَأناً وَ أَعلىٰ مَكاناً وَ أَمنَعُ جانِباً وَأَبْعَدُ غَوراً مِنْ أَنْ يَبْلُغَها النّاسُ بِعُقُولِهِمْ اَوْ يَنالُوها بِآرائِهِمْ أوْ يُقِيمُوا إماماً بِاخْتِيارِهِمْ. إنَّ الإمامَةَ خَصَّ اللّهُ عَزَّ وَجَلَّ بِها إبْراهِيمَ الْخَلِيلَ عَلَيْهِ السَّلامُ بَعْدَ النُّبُوَّةِ وَالْخُلَّةِ مَرْتَبَةً ثالِثَةً و فَضِيلَةً شَرَّفَهُ بِها وَ أشادَ بِها ذِكْرَهُ فَقالَ: «إنِّي جاعِلُكَ لِلنّاسِ إماماً» فَقالَ الْخَلِيلُ(ع) سُرُوراً بِها «وَ مِنْ ذُرِّيَّتِي» قالَ اللّهُ تَبارَكَ وَ تَعالىٰ «وَلا يَنالُ عَهْدِي الظّالِمِينَ» فَأَبْطَلَتْ هٰذِهِ الآيَةُ إمامَةَ كُلِّ ظالِمٍ الىٰ يَوْمِ الْقِيامَةِ.

عبد العزیز بن مسلم ناقل ہے: ہم حضرت امام رضا علیہ السلام کے ہمراہ مرو میں تھے، وہاں پہنچنے کے ابتدائی ایام میں کسی جمعہ کو جامع مسجد گئے، جو لوگ مسجد میں موجود تھے انھوں نے امامت کے مسئلے میں گفتگو کرنا چاہی اور کہنے لگے کہ امامت کے مسئلے میں لوگ بہت زیادہ اختلافات کے شکار ہیں اور مختلف نظریات رکھتے ہیں، بعد میں جب میں امام علیہ السلام کی بارگاہ میں شرفیاب ہوا تو پورا واقعہ اور امامت کے مسئلے میں لوگوں کی گفتگو کو حضرت کی خدمت بابرکت میں نقل کیا، آپ نے تبسم فرمایا، پھر گفتگو کا آغاز کیا اور صفات امام اور منصب امامت کے بارے میں نہایت تفصیل سے گفتگو فرمائی، یہاں پر اس کے بعض حصے نقل کئے جاتے ہیں:

امام کے مراتب و مدارج اور اسکی عظمت و شان و شوکت لوگوں کی عقلوں کی گرفت سے بہت دور اور ان کے طائر ادراک کی پہنچ سے بعید پرے ہے وہ اس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتے وہ اپنی ذاتی رائے اور نظریات کے سہارے اسے درک نہیں کرسکتے اور نہ انھیں حق حاصل ہے کہ اپنی مرضی سے امام کا انتخاب کریں اور کسی کو مسند امامت پر جلوہ افروز کریں۔ امامت اس تیسرے منصب کا نام ہے جسے خدا نے نبوت اور خلّت کے بعد حضرت ابراہیم سے مخصوص فرمایا

تھا، یہ وہ مرتبہ ہے جس کے ذریعہ خدا نے ان کا سر افتخار بلند کیا، انکو عظمتیں اور بلندیاں عطا کیں اور پھر فرمایا کہ میں نے تمہیں لوگوں کا امام قرار دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرط مسرت و شادمانی میں بارگاہ ربوبیت میں درخواست کی میری ذریت کو بھی یہ افتخار حاصل ہو، تو جواب ملا کہ میرے منصب کے مستحق ظالم نہیں ہوسکتے۔ اس آیۂ کریمہ نے قیامت تک پیدا ہونے والے تمام ظالموں کے دعوائے امامت کو باطل کرکے رکھدیا ہے

اس کے بعد امام علیہ السلام نے قرآن مجید کی چند آتیں ذکر فرمائیں اور حضرت ابراہیمؑ کے ان نیک اور صالح فرزندوں کا تذکرہ فرمایا جنھیں خداوند عالم نے امام اور لوگوں کا پیشوا قرار دیا ہے جو بحکم الٰہی لوگوں کی ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں، اس کے بعد آپ نے فرمایا:

«فَلَمْ تَزَلْ فِي ذُرِّيَّتِهِ يَرِثُهَا بَعْضٌ عَنْ بَعْضٍ قَرْناً فَقَرْناً حَتّٰى وَرَّثَهَا اللّٰهُ تَعَالٰى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ فَقَالَ جَلَّ وَ تَعَالٰى إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَ هٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ» فَكَانَتْ لَهُ خَاصَّةً...» .

حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں صدیوں تک امامت کا سلسلہ قائم رہا۔ صالح افراد منصب امامت پر فائز ہوتے رہے یہاں تک کہ خداوند عالم نے اس پاکیزہ میراث کا وارث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرار دیا اور اس سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ جناب ابراہیمؑ کے سب سے زیادہ حقدار اور ان کے بارے میں اولویت رکھنے والے ان کے پیروکار اور پیغمبر اسلامؐ نیز سچے مومنین ہیں اور خدا مومنین کا سرپرست ہے۔ غرضکہ یہ منصب پہلے پیغمبر اکرمؐ کی ذات گرامی سے مخصوص ہوا، پھر آنحضرتؐ نے اسے حضرت علی علیہ السلام کے حوالے کیا اس کے بعد یہ منصب سنت الٰہیہ کے مطابق ان ہی کی پاکیزہ نسل اور ذریت طیبہ میں جو خدا کے لطف وعنایات سے گنجینۂ علم اور مرکز ایمان ہیں، آج بھی موجود ہے اور اس کا سلسلہ قیامت تک ان ہی کی نسل میں قائم رہے گا، اس لئے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی مبعوث نہیں ہوگا کہ امامت کا یہ سلسلہ ادھر منتقل ہوجائے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ یہ احمق لوگ کہاں سے، کن معیاروں پر اور کن اغراض کے تحت امام منتخب کرتے رہتے ہیں،

امامت تو اس منصب اور مرتبہ کا نام ہے جو مخصوص انبیاء کے لئے ہے اور پھر ان کے بعد ان کے اوصیاء کی میراث ہے امامت

الٰہی خلافت، رسول اکرمؐ کی جانشینی، حضرت امیر المومنینؑ علیہ السلام کے منصب اور حضرت امام حسنؑ و حضرت حسین علیہما السلام کی میراث کو کہتے ہیں :

«اَلاِمامُ واحِدُ دَهرِهِ لا يُدانيهِ أحَدٌ وَلا يُعادِلُهُ عالِمٌ وَلا يُوجَدُ مِنهُ بَدَلٌ وَلاَلَهُ مِثلٌ وَلا نَظيرٌ مَخصُوصٌ بِالفَضلِ كُلِّهِ مِن غَيرِ طَلَبٍ مِنهُ لَهُ وَلا اكتِسابٍ بَلِ اختِصاصٌ مِنَ المُفَضِّلِ الوَهّابِ» .

امام اپنے زمانے کی فرد فرید کو کہتے ہیں، فضائل و کمالات کے اعتبار سے کوئی بھی اس کا قرین و ہم پلہ نہیں ہوتا ہے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا عالم بھی علم میں اس کا ہمپایہ نہیں ہو سکتا (دنیا میں) کوئی بھی شخص ایسا نہیں مل سکتا جو اس کی جگہ کو پر کر سکے اور اس کا بدل بن سکے اور نہ فرش گیتی پر اس کا کوئی مثل و نظیر ہی پیدا ہوتا ہے، وہ تمام فضائل و کمالات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اسے تحصیل علم اور حقائق و معارف سے آشنائی کے لیے کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ یہ کہا جائے کہ یہ اللہ کی وہ مخصوص عظیم نعمت ہے جس کو اس نے امام کی ذات سے وابستہ کیا ہے اور تنہا اسی کے وجود کو اس سے نواز اہے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام نے اس حدیث میں امام کے مدارج و مراتب کے بارے میں، بہت کچھ ارشاد فرمایا ہے اور ہر بات پر بعنوان شاہد قرآنی آیتیں پیش کی ہیں نیز اپنے بیانات کے اختتام پر یوں ارشاد فرمایا ہے :

«إنَّ العَبدَ إذا اختارَهُ اللّهُ عَزَّ وَجَلَّ لِأُمورِ عِبادِهِ شَرَحَ صَدرَهُ لِذٰلِكَ وَاَودَعَ قَلبَهُ يَنابيعَ الحِكمَةِ وَاَلهَمَهُ العِلمَ إلهاماً فَلَم يَعْيَ بَعدَهُ بِجَوابٍ وَلا يَحيرُ فيهِ عَنِ الصَّوابِ فَهُوَ مَعصُومٌ مُؤَيَّدٌ مُوَفَّقٌ مُسَدَّدٌ قَد أمِنَ مِنَ الخَطايا وَالزَّلَلِ وَالعِثارِ، يَخُصُّهُ اللّهُ بِذٰلِكَ لِيَكونَ حُجَّتَهُ عَلىٰ عِبادِهِ و شاهِدَهُ عَلىٰ خَلقِهِ وَ ذٰلِكَ فَضلُ اللّهِ يُؤتيهِ مَن يَشاءُ واللّهُ ذُوالفَضلِ العَظيمِ فَهَل يَقدِرُونَ عَلىٰ مِثلِ هٰذا فَيَختارُونَهُ أو يَكُونَ مُختارُهُم بِهٰذِهِ الصِّفَةِ فَيُقَدِّمُونَهُ» .

جب خدائے عزوجل کسی فرد کو اپنے بندوں کے امور کے نظم و ضبط کے لیے منتخب فرماتا ہے تو انشراح صدر عطا فرماتا ہے (یعنی علم سے اس کے سینہ کو کشادہ کرتا ہے) اس کے قلب کو حکمتوں کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور الہامی طور پر اسے زیور علم سے آراستہ کرتا ہے۔ معبود کے ان الطاف و عنایات کی بنا پر وہ کبھی کسی سوال کے جواب سے عاجز نہیں رہتا ہے، حق و معرفت کے راستہ سے کبھی بھی منحرف نہیں ہوتا ہے۔ وہ صاحب عصمت ہوتا ہے۔ الٰہی تائیدات و توفیقات ہمیشہ اس کے شامل حال رہتی ہیں، ہر طرح کی غلطی اور لغزش و خطا سے محفوظ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ذات سے ان اوصاف کو مخصوص کر دیتا ہے تا کہ وہ بندوں پر اس کی حجت اور گواہ رہے، یہ وہ نعمت ہے جسے خدا جس کو چاہے عطا کرتا ہے کیونکہ وہ صاحب جود و عطا اور عظیم نعمتوں والا ہے۔ کیا یہ بات لوگوں کے بس میں ہے کہ وہ اپنے منتخب کیے ہوئے نمائندوں کو ایسے اوصاف و کمالات سے آراستہ کر سکیں یا یہ ممکن ہے کہ ان کا منتخب کیا ہوا نمائندہ ایسے اوصاف و خصوصیات کا پہلے سے حامل ہو تا کہ وہ اسے اپنا امام اور رہنما مقرر کر سکیں۔

غرضکہ اس حدیث میں حضرت امام رضا علیہ السلام نے مرو جیسی جگہ پر جو مامون کی حکومت اور طاقت کا مرکز تھا مسئلہ امامت اور مراتب امام کے متعلق بے حد تفصیل کے ساتھ بحث فرمائی ہے اور آیات قرآنی نیز احادیث پیغمبرؐ کی روشنی میں اس عظیم منصب کی اہمیت کو پوری توضیح کے ساتھ اجاگر فرمایا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امام رضا علیہ السلام ایک مرتبہ مرو میں مامون کے دربار میں تشریف فرما تھے، وہاں علمائے عراق و خراسان کا بھی ایک گروہ موجود تھا، اس نشست میں مسئلہ امامت سے متعلق حضرت امام رضا علیہ السلام، مامون رشید اور وہاں موجود تمام علماء کے درمیان گفتگو کا آغاز ہوا، جس کا ایک مختصر سا اقتباس ہم یہاں پر پیش کرتے ہیں۔

فَقَالَ الْمَأْمُونُ أَخْبِرُونِي عَنْ هٰذِهِ الْآيَةِ «ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا»[1]. «فَقَالَتِ الْعُلَمَاءُ أَرَادَ اللّٰهُ بِذٰلِكَ الْأُمَّةَ كُلَّهَا فَقَالَ الْمَأْمُونُ مَا تَقُولُ يَا أَبَا الْحَسَنِ فَقَالَ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ لَا أَقُولُ كَمَا

قَالُوا وَلٰكِنِّي أَقُولُ أَرَادَاللّٰهُ بِذٰلِكَ الْعِتْرَةَ الطَّاهِرَةَ فَقَالَ الْمَأْمُونُ وَ كَيْفَ عَنَى الْعِتْرَةَ الطَّاهِرَةَ مِنْ دُونِ الأُمَّةِ فَقَالَ لَهُ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ إِنَّهُ لَوْأَرَادَ الأُمَّةَ لَكَانَتْ بِأَجْمَعِهَا فِي الْجَنَّةِ».[۲]

مامون نے دربار میں موجود علماء سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ کے منتخب بندوں سے وہ کون لوگ مراد ہیں جنہیں اس نے قرآن مجید کا وارث قرار دیا ہے؟ علماء نے جواب دیا کہ اس سے پوری امت مسلمہ مراد ہے۔ پھر مامون امام علیہ السلام کی جانب متوجہ ہوا اور عرض کی کہ آپ اس مسئلے میں کیا فرماتے ہیں؟ آپ کا ارشاد ہوا کہ میرا جواب ان لوگوں کے جواب سے مختلف ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کی مراد اس آیہ میں اہلبیت طاہرین علیہم السلام ہیں۔ مامون نے پوچھا کہ کیسے اہلبیتؑ مراد ہیں اور امت مراد نہیں ہے؟ آپؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اگر امت مراد ہوگی تو ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ پوری امت جنتی ہے۔ اس لئے کہ بعد کی آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ تمام وارثان کتاب جنت میں جائیں گے "جنات عدن یدخلونها..."[۲] معلوم ہوا کہ قرآن کے وارث پیغمبرؐ کی عترت اور ان کے اہلبیت ہیں نہ کہ دوسرے لوگ۔

«فَقَالَ الْمَأْمُونُ مَنِ الْعِتْرَةُ الطَّاهِرةُ؟ فَقَالَ الرِّضَا عَلَيْهِ السَّلَامُ اَلَّذِينَ وَصَفَهُمُ اللّٰهُ فِي كِتَابِهِ فَقَالَ عَزَّ وَجَلَّ. «إِنَّمَا يُرِيدُاللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيراً»[۱] وَهُمُ الَّذِينَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ إِنِّي مُخْلِفٌ فِيكُمُ الثِّقْلَيْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي أَلاَ وَ إِنَّهُمَا لَنْ يَفْتَرِقَا حَتَّى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ فَانْظُرُوا كَيْفَ تَخْلُفُونِ فِيهِمَا أَيُّهَا النَّاسُ لاَ تُعَلِّمُوهُمْ فَإِنَّهُمْ أَعْلَمُ مِنكُمْ».

مامون نے دریافت کیا کہ عترتؑ واہل بیتؑ سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپؑ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں، جن کی اللہ تعالیٰ نے آیۂ تطہیر میں تعریف و توصیف کی ہے، جن کے بارے میں رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ اے لوگو! میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں

ایک کتاب خدا اور دوسرے میری عترت جو میرے اہل بیتؑ ہیں، یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ بروز قیامت میرے پاس حوض کوثر پر نہ پہنچ جائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میرے بعد تم لوگ ان سے کیسا برتاؤ کرتے ہو۔ اے لوگو! انھیں تعلیم دینے کی کوشش نہ کرنا اس لئے کہ وہ تم سب سے کہیں زیادہ عالم و دانا ہیں۔

نتیجہ یہ کہ حضرت امام رضا علیہ السلام نے مامون کے شدید دباؤ اور اصرار کی بنا پر ولی عہدی کو قبول تو کر لیا لیکن اس منظوری کے بعد آپؑ نے اسلامی حقائق و معارف کی نشر و اشاعت اور اہلبیت علیہم السلام کے حقوق کی نشاندہی میں نہ صرف یہ کہ کوئی تخفیف نہیں کی بلکہ آپؑ کے لئے ایسے حالات سازگار ہو گئے، جن میں آپؑ کو پہلے سے بہت زیادہ وسیع اور بلند پیمانے پر علمائے اسلام اور دوسرے مذاہب کے علماء سے گفتگو اور اظہار خیال کا موقع ملا، ان کے سوالات کے جوابات دیئے اور حقائق کو آشکار فرمایا، نیز یہ امر بھی امکان پذیر ہوا کہ آپؑ نے قرآن مجید اور احادیث پیغمبرؐ کے سہارے اہلبیتؑ اطہار کے حقوق کا دفاع کیا اور خلیفۂ وقت کی سیاسی مصلحتوں کے خلاف مسئلہ امامت پر بغیر کسی تقیہ کے کھل کر بحث فرمائی۔

لطف کی بات تو یہ ہے کہ اکثر جب لوگ آپؑ سے کوئی شرعی مسئلہ دریافت کرتے تو آپ فقہ اہل بیت علیہم السلام کے مطابق ان کو سوالات کے جوابات دیتے اور ہرگز یہ پروا نہ ہوتی کہ کہیں کوئی جواب خود سوال کرنے والے یا خلیفہ سے وابستہ افراد پر گراں نہ گذرے:

«عَنْ أَبي سَعيدِ الْخُراسانِي قالَ دَخَلَ رَجُلانِ عَلىٰ أَبِي الْحَسَنِ الرِّضا بِخُراسانِ فَسَئَلاهُ عَنِ التَّقصيرِ فَقالَ لِأَحَدِهِما وَجَبَ عَلَيْكَ التَّقصيرُ لِأَنَّكَ قَصَدْتَني وَ قالَ لِلْآخَرِ وَجَبَ عَلَيْكَ التَّمامُ لِأَنَّكَ قَصَدْتَ السُّلْطانَ»[1].

ابو سعید خراسانی کا بیان ہے کہ: دو شخص حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت بابرکت میں خراسان آئے اور انہوں نے قصر نماز سے متعلق مسئلہ دریافت کیا تو آپؑ نے ان میں سے ایک کے جواب میں فرمایا کہ تیری نماز قصر ہے، اس لئے کہ اس سفر میں تیرا مقصد میری ملاقات تھی اور

[1] توحید ۱۰۸

دوسرے سے فرمایا کہ تجھ پر واجب ہے کہ نماز پوری بجالائے اس لئے کہ تیرے سفر کا مقصد بادشاہ وقت مامون کی ملاقات تھی یعنی تیری نیت معصیت کی تھی اور تیرا سفر، سفر معصیت تھا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حضرت امام رضا علیہ الصلوٰۃ والسلام مامون کی ولی عہدی کے باوجود تمام ضروری حقائق و معارف بلا جھجک صریحی طور پر بیان کر دیتے تھے اور اس طرح حقیقت کی نقاب کشائی ہمیشہ ہوتی رہتی تھی۔ ایک عرصہ تک تو حالات اسی نہج پر باقی رہے، یہاں تک کہ مامون کے سامنے یہ نتیجہ کھل کے آہی گیا کہ اس نے آپ سے دھمکی اور اصرار بلیغ کے ذریعہ ولی عہدی کی منظوری تو لے لی ہے لیکن اب تک اس کو اپنے مقصد میں ذرا بھی کامیابی نہیں مل سکتی ہے اور اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکا ہے کیونکہ وہ اس تقرری کے ذریعہ اپنی خلافت کو لوگوں کی نظر میں جائز اور حق بجانب ثابت نہیں کر سکا۔ اس کے بارے میں ان کے نظریات تبدیل نہیں ہوئے اور وہ انکی حمائت حاصل کرنے سے قاصر رہا، نیز اس کے لئے یہ بھی امکان پذیر نہو اکہ حضرت امام رضا علیہ السلام کی محبوبیت و مقبولیت کو کچھ کم کر سکتا اور شیعیان اہلبیتؑ کو بنی عباس کی حکومت پر نکتہ چینی سے روک سکتا اور انھیں بدگمانی سے باز رکھ سکتا، للہذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ امامؑ کو زہر دغا کے ذریعہ شہید کر دیا جائے تاکہ مذہب تشیع کی نشر و اشاعت اور محبان و دوستداران اہل بیتؑ علیہم السلام کی تعداد میں روز افزوں ترقی کا سد باب ہو سکے چنانچہ اس نے نہایت خفیہ طور پر اس ناپاک منصوبے کو عملی جامہ پہنایا اور ایسے عظیم المرتبت امامؑ کی شمع حیات کو گل کر کے رکھدیا۔

جناب ابراہیم امینی
ترجمہ: جناب سید علی الحسن رضوی

دین اور سیاست

اسلام کا مقدس قانون اعتقادی احکام ہوں یا تعبدی، اخلاقی مسائل ہوں یا سیاسی، اقتصادی امور ہوں یا فوجی، اجتماعی باتیں ہوں یا انفرادی ـــ ہر جہت سے ایک مکمل نظام کا حامل ہے۔ اس کے پاس ایسا کامل ضابطۂ حیات ہے جو دنیا و آخرت دونوں جہان کی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے، یہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں میں دخیل ہے اور اصولی طور پر اخروی زندگی کو دنیوی زندگی سے جدا تصوّر نہیں کرتا۔ جہاد اور دفاع، مسلمانوں کے باہمی روابط اور کفار و اجانب سے تعلقات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، قضاوت و عدالت، حدود و قصاص اور تعزیرات، ظلم و ستم سے نبرد آزما ہونے کی تفصیلات، کاشتکاری اور گلہ بانی کے طریقے، صحت و تندرستی اور علاج و معالجہ کے اصول نیز دسیوں دوسرے اجتماعی منصوبے ایسے ہیں جو سب کے سب مل کر اسلام کا ایک بڑا اور اہم حصہ تشکیل دیتے ہیں۔ سیکڑوں آیتیں اور ہزاروں حدیثیں ان مسائل کے ذیل میں موجود ہیں جو اسلام کی فقہی اور علمی کتابوں میں مورد بحث و تحقیق قرار دی گئی ہیں۔

مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے: ـ

وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ (سورۂ توبہ ۴۱/)

اپنی جان و مال کے ذریعہ راہ خدا میں جہاد کرو۔

یا ایّھا النبیّ جاھد الکفّار والمنٰفقین واغلظ علیھم ط (سورۂ تحریم ۹/)

اے ہمارے نبیؐ! کفار و منافقین سے جنگ کیجئے اور ان کے ساتھ سختی برتئے۔

واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم واخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ یعلمھم (سورۂ انفال ۶۰/)

(مسلمانو!) دشمنوں سے (مقابلہ) کے لئے جس حد تک بھی تم سے ممکن ہو اپنی قوت (بازو) سے (سامان حرب) اور تربیت یافتہ گھوڑے مہیا کرو، اس کے ذریعہ تم اپنے اور اپنے خدا کے دشمنوں پر دھاک بٹھالوگے اور انہیں کے مثل ایک اور گروہ پر جن کو تم نہیں پہچانتے مگر خدا تو ان کو خوب پہچانتا ہے۔

... فقاتلوا ائمۃ الکفر انھم لا ایمان لھم لعلھم ینتھون (سورۂ توبہ ۱۲/)

پس سربراہان کفر سے جنگ کرو، ان سے کوئی عہد و پیمان نہیں، ممکن ہے یہ لوگ (اپنی شرارتوں سے) باز آجائیں۔

وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ (سورہ توبہ ۳۶/)

اور مشرکین سے (وقت جنگ) صف باندھ کر لڑائی کرو جس طرح کہ وہ (تمہارے خلاف) صف باندھ کر لڑتے ہیں۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الکفرین اولیاءَ (سورۂ نساء ۱۴۴/۴)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! (مومنین کے بجائے) کفار کو اپنا ولی اور مددگار قرار نہ دو۔

یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود والنصٰریٰ اولیاء (سورۂ مائدہ ۵۱/)

اے ایمان لانے والو! یہود و نصاری کو اپنا ولی اور مددگار نہ بناؤ۔

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدٰھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتی تفیٓء الی امر اللہ فان فاءت فاصلحوا بینھما بالعدل ... (سورۂ حجرات ۹/)

اور اگر مومنین میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم مومنین کو چاہئے کہ ان کے درمیان صلح و صفائی کرادو (پھر بھی) اگر ایک فریق دوسرے پر ظلم و زیادتی کرے تو ظالم کے خلاف تم بھی

جنگ کرو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوجائے (اور ظلم کو ترک کردے) پس جب خدا کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کردے تو عدل و انصاف سے کام لے کر فریقین کے درمیان صلح کرادو۔

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (سورہ فتح/۲۹)

محمدؐ خدا کے رسول ہیں اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں کفار کے مقابلہ میں سخت گیر اور آپس میں شفیق و مہربان ہیں۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر۔ (سورۂ آل عمران/۱۰۴)

اور چاہیئے کہ تمہارے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جو نیکی کی دعوت دیں اچھائی کی طرف بلائیں اور برائی سے روکیں۔ اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔

وما لکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا۔ (سورہ نساء/۷۵)

تم کو کیا ہوگیا ہے کہ خدا کی راہ میں ان کمزور و بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کو (ستمگروں کے پنجے سے نجات دلانے کے لئے) جنگ نہیں کرتے جو (حالت مجبوری میں) ہم سے فریاد کرتے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے ہمیں (ستمگروں کی) اس بستی سے باہر نکال دے (تاکہ ان کے شر سے نجات پاجائیں)

فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھویٰ (سورہ ص/۲۶)

لوگوں کے درمیان حق و انصاف سے فیصلہ کیا کرو خواہشات نفسانی کی پیروی نہ کرو۔

یاایھا الذین آمنوا کتب علیکم القصاص فی القتلیٰ (سورہ بقرہ/۱۷۸)

اے ایمان لانے والو! جو لوگ (ناحق) مار ڈالے جائیں ان کے بدلہ میں تم کو جان کے بدلے جان لینے کا حکم دیا جاتا ہے۔

الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ (سورہ نور/۲)
زنا کا ارتکاب کرنے والے مرد و عورت دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ۔
اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا و ان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر (سورہ حج/۳۹)
وہ لوگ جن پر جنگ مسلط کر دی گئی ہو ان کو جہاد کی اجازت حاصل ہے اس لئے کہ ان پر ظلم و ستم کیا گیا ہے اور خدا تو ان لوگوں کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔
خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا وصل علیھم
(سورہ توبہ/۱۰۳)
(اے رسولؐ) ان کے اموال سے صدقہ (زکوٰۃ) لے لیجئے اور اس کے ذریعہ ان کو (گناہوں سے) پاک کر دیجئے اور ان کے واسطے دعا خیر کیجئے۔
واعلموا انما غنمتم من شیءٍ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل (سورہ انفال/۴۱)
اور جان لو جو غنیمت (نفع) تم کو حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ خدا اور رسولؐ اور (رسولؐ کے) قرابت داروں اور یتیموں، مسکینوں اور (پردیسی) مسافرین کا ہے۔
یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم
(سورہ نساء/۵۹)
اے ایمان دارو! خدا کی اطاعت کرو، اور اس کے رسول اور جو تم میں سے (رسول ہی کی طرح) صاحبان امر ہوں ان کی اطاعت کرو۔

اسی قسم کی آیات و روایات جن کے نمونے کثرت سے پائے جاتے ہیں واضح طور پر اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ اسلام کا مقدس آئین رہبانیت پسند سنیاسیوں کا دین نہیں ہے جو اجتماعی مسائل میں دخل نہ رکھتا ہو بلکہ یہ ایک مکمل معاشرتی دین ہے جس کو عمل میں لانے کے لئے رہبر و حاکم کے ساتھ ساتھ ایک وسیع انتظامی عملہ منضبط دستور اور پروگرام بھی پیش کرتا ہے۔ یہ کہنا قطعی درست نہ ہوگا کہ اسلامی شریعت میں سیاسی انتظامی اور اجتماعی قوانین و دستور تو موجود ہیں لیکن خود شارع مقدس علیہ السلام نے حکومت و عدلیہ و مجریہ کے بارہ میں خاموشی اختیار کر لی ہے ـــ اصل میں حکومت و قیادت اور امامت و سیاست دین سے

قطعی جدا نہیں کئے جاسکتے یہ دین و دیانت کا ایک اہم ترین شعبہ ہے اور الٰہی قوانین کے نفاذ و حفاظت نیز اس کے دفاع کا بہترین ضامن ہے۔

اور سیاست کے معنی بھی یہی ہیں کیونکہ سیاست مخصوص اصول وضوابط کے تحت اجتماعی یا ملکی نظام کے چلانے کو ہی کہتے ہیں۔ حکومت اسلامی کی سیاست کا مفہوم بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے معاشرتی مسائل شرعی قوانین کے حدود میں رہ کر حل کرے۔ سیاست کا مطلب دھوکا دھڑی، جھوٹ، فریب یا ظلم وستم ہرگز نہیں ہے کہ یہ کہا جائے:

"دین اسلام کی شان سیاست سے بالاتر ہے۔"

چنانچہ نہ صرف یہ کہ سیاست دین سے جدا نہیں ہے بلکہ یہ دین کا حساس ترین شعبہ ہے۔ خود پیغمبر اسلامؐ سب سے پہلے اسلامی فرمانروا ہیں جنھوں نے اسلام کے سیاسی و اجتماعی قوانین کو مسلمانوں کے درمیان رائج و نافذ کیا ہے۔ رسول خدا صلعم کا وحی کی ترجمانی اور تبلیغ و ہدایت کے ساتھ ساتھ یہ بھی اہم فریضہ تھا کہ اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرتؐ دعوت اسلام کے آغاز سے ہی حکومت اسلامی کے قیام کا نقشہ مرتب کررہے تھے۔ آپؐ نے اس کے مقدماتی ابواب مکہ میں ہی ترتیب دے دیے تھے۔ چنانچہ عقبہ کے مقام پر اہل مدینہ (یثرب) سے آپؐ نے اپنی حمایت کا پیمان لیا تھا۔ اور جب مدینہ تشریف لائے تو:

اپنے ساتھیوں کے درمیان رشتہ مواخات قائم کیا۔

دفاع اور جہاد کے لئے "عمومی سطح پر تیاری" کا اعلان فرمایا۔

اسلامی سپاہ کے لئے اسلحہ اور رسد مہیا کیا نیز سپہ سالار مقرر کئے، مدینہ نیز دیگر اسلامی علاقوں کیلئے گورنر اور حاکم مقرر کئے۔

لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے اور اختلافات رفع کرنے کے لئے قاضیوں کا تقرر کیا۔

صلح کی قرارداد پر دستخط فرمائی۔

دیگر ممالک کے فرماں رواؤں کے نام خطوط لکھے اور سفیر روانہ کئے۔

کیا حکومت وسیاست ان امور کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے؟؟! حقیقت تو یہ ہے کہ رسول اسلامؐ بیک وقت دو اہم ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے۔ ایک طرف تو وحی کے ذریعہ الٰہی قوانین و احکام خداوند عالم سے حاصل کرکے عوام تک پہونچا رہے تھے جس میں کسی قسم کی خطا و لغزش یا اشتباہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ظاہر ہے کہ آپ تمام تر گناہوں سے پاک ومنزہ اور معصوم تھے۔ اور ——

دوسری طرف آپ اسلامی معاشرہ کی قیادت و رہبری کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے ۔ گویا آپ شریعت اسلامی کے تحت سیاسی و اجتماعی قوانین کے دائرہ میں رہتے ہوئے وہ اختیارات جو ولایت و رہبری سے مربوط ہیں اسلامی معاشرہ میں رائج و نافذ فرما رہے تھے ۔

آپ بیک وقت علم و دانش کا مرکز معنوی رہبریت کے حامل نیز حکومت اسلامی کے قائد و رہبر اور الٰہی دستور و قوانین کے نگراں اور محافظ تھے ۔ پیغمبر اسلام کی حکومت، دین اور قوانین الٰہی کی حکومت تھی ۔ یہ کوئی مطلق العنان آزاد استبدادی حکومت نہیں تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مسلمانوں پر آپ کی اطاعت و فرمانبرداری واجب و لازم قرار دیدی گئی ؛

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم

(سورہ احزاب/٦)

لیکن پیغمبر اسلام شریعت اسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے سیاسی معاملات مسلمانوں کے مسائل نیز اپنے فیصلوں اور منصوبوں کو بروئے کار لانے میں مکمل آزادی اور اختیار رکھتے تھے حتیٰ کہ آپ کو مومنین کی جانوں پر خود ان سے زیادہ اختیار حاصل تھا اور آپ اولیٰ بالتصرف تھے :

النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم (سورہ احزاب/٦)

اسلام کے تمام احکام و قوانین چاہے تعبدی ہوں یا سیاسی، اجتماعی ہوں یا نظامی (فوجی) اقتصادی ہوں یا معاشرتی مکمل طور پر ایک دوسرے سے وابستہ اور ہم آہنگ ہیں ۔ یہ ایک ایسا واحد نظام تشکیل دیتے ہیں جو انسانیت کو تکامل و ارتقا سے ہمکنار کرنے، نیز خدا تک رسائی حاصل کرنے کا سیدھا راستہ ہے ۔ دین اور دنیا یا مذہب اور سیاست کے درمیان کوئی فصل یا حدبندی قائم کرنا درست نہیں ہے اور ایک ایسے ہی توحیدی نظام کی ذمہ داری اور اس کی قیادت کا انتظام پیغمبر اسلام کے سپرد کیا گیا تھا چنانچہ امامت و رہبری کا مسئلہ کچھ ایسی ہی اہمیت کا حامل تھا کہ بانیٔ اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خود اپنی حیات طیبہ میں اسلامی معاشرہ کے مستقبل کے لئے ضروری اقدامات فرمائے تھے ۔

غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا اسلامی معاشرہ کے لئے حکومت و قیادت رسول اکرمؐ کی زندگی تک محدود تھی اور آپ کے بعد اسلام کے اجتماعی سیاسی اور انتظامی قوانین قابل عمل نہیں رہ گئے ؟ کیا اسلامی حکومت کے قیام کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ؟ اور زندگی کے اتنے اہم مسئلہ میں مسلمانوں کی کوئی مسئولیت و ذمہ داری

نہیں ہے ؟؟

کیا سچے مسلمانوں کا حکومت وسیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے کو محض عبادت اور اخلاقی فرائض کی ادائگی تک محدود کر لینا درست ہے ؟ اور کیا یہ تصور کہ "دین سیاست سے جدا ہے"، صحیح ہے ؟!

اسلامی دستور و قوانین کے اصل متون کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے احتمالات اصلاً اسلام کی نظر میں قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ اسلامی شریعت و احکام اور اس کے اصول وضوابط دائمی معتبر اور ناقابل تغیر ہیں۔ ان کو عہد پیغمبرؐ سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی نظام توحید کے لئے جس طرح زمانۂ پیغمبر میں ایک قائد و رہبر اور اس کا اجراء و نفاذ کرنے والے کی ضرورت تھی آپؐ کے بعد بھی ہر عہد اور زمانہ کے لئے اس کی بدرجہ اولیٰ ضرورت ہے۔ قرآن اسی چیز کی طرف متوجہ کرتا ہوا کہتا ہے:-

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم .... (سورۂ آل عمران / ۱۴۴)

محمدؐ تو فقط اور فقط رسولؐ ہیں، ان سے قبل بھی بہت سے رسولؑ گذر چکے ہیں۔ آیا اگر وہ اپنی موت مر جائیں یا انہیں قتل کر دیا جائے تو کیا تم لوگ اپنی پچھلی (کفر و جاہلیت کی) زندگی کی طرف الٹے پاؤں واپس چلے جاؤ گے ـــــ ؟

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد کسی صحابی نے خلیفہ و امام کی ضرورت سے انکار نہیں کیا حتیٰ کہ کسی ایک فرد نے بھی یہ نہیں کہا کہ "خلیفہ کی ضرورت کیا ہے ؟" اور اگر کچھ اختلاف تھا بھی تو خلیفہ کے شرائط وصفات نیز استحقاق خلافت کے سلسلہ میں تھا۔

ظاہر ہے محض اچھے قوانین کا موجود ہونا ہی سعادت بشری کے لئے کافی نہیں ہے، قانون کے لئے ایک اجراء کرنے والی شخصیت اور طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ اسلامی قوانین وضوابط ایک ایسا متحد و مربوط نظام تشکیل دیتے ہیں جو دائمی ہیں اس میں کسی قسم کی کتر بیونت یا تحریف و تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کو اس کی تمام تر خصوصیات کے ساتھ ہر رخ سے اپنی زندگی میں رچا بسا لیں۔ قوانین اسلام کے اجراء اور نفاذ کے لئے حکومت اسلامی کی تشکیل و ثبت میں ہمہ تن کوشاں رہیں قرآن کا خطاب عمومیت رکھتا ہے اور تمام مسلمان اس میں شامل ہیں چنانچہ ملت کی ہر فرد اس سلسلہ میں اپنی اپنی جگہ پر مسئولیت و ذمہ داری رکھتی ہے۔

چونکہ اسلام دین استقلال و آزادی ہے اور یہ عدل و انصاف کا علمبردار آمریت پسند استعماری طاقتوں کا دشمن، جہاد کا دلدادہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حامی ہے لہٰذا ایسے اصول و قوانین کے اجراء کے لئے ایک طاقتور اسلامی حکومت کی سخت ضرورت ہے۔ ملت اسلام کی بدنصیبی اور اضمحلال کا دور اس وقت شروع ہوا جب مسلمانوں نے سیاست میں دخل اندازی اور حکومت اسلامی کے قیام کی کوشش سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ مسلمان ممالک کی باگ ڈور اسلامی قوانین و احکام سے نابلد اسلامی اصول و قواعد کی پابندی سے آزاد اور مطلق العنان برعہد سیاست مداروں کے ہاتھوں میں آگئی۔

چنانچہ جب غاصب حکومتوں نے امور مسلمین کی زمام پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تو اسلام اور اسلام کی حمایت کرنے والے افراد کو سیاسی و اجتماعی میدان سے بالکل خارج کر کے انہیں گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ بہ بانگ دھل نعرہ لگانا شروع کردیا کہ "اسلام میں حکومت و سیاست نام کی کوئی چیز سرے سے وجود ہی نہیں رکھتی" اور اس طرح علماء و فقہاء دینی مدرسوں اور مسجدوں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ رفتہ رفتہ اسلامی احکام و قوانین اور اس کے سیاسی و اجتماعی دستور و ضوابط محدود و مفقود ہوتے چلے گئے۔ حد ہو گئی کہ ان کو بحث و نظر میں بھی ناقابل اعتناء بنا دیا گیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ حکومت سے متعلق قوانین کا اسلام سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ اسلام جو ایک انقلاب آفریں حریت پسند، متحرک دین ہے۔ ایک ساکت و جامد، غیر ترقی یافتہ، ذمہ داریوں سے عاری مذہب بنا کر پیش کیا گیا۔

دنیا کی وہ تمام بڑی جرائم پیشہ استعماری طاقتیں جو اپنی راہ میں اسلام کو سب سے بڑی رکاوٹ خیال کرتی ہیں اس سلسلہ میں اپنے زرخرید ایجنٹوں کی مدد سے کوشاں رہی ہیں کہ فعال و متحرک اسلام میں تحریف کر کے اس کو میدان سے خارج کردیں اور اس کی جگہ ایک جمود پسند غیر ذمہ دارانہ آور دین کی حیثیت سے اس کو لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ چنانچہ انہوں نے پوری امت مسلمہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم کردیا اور مسلمان قوموں کے درمیان نفرت و عداوت کے بیج بو کر خود کو ان کا بہترین دوست اور مددگار باور کرا کے ان پر تسلط حاصل کرلیا اور اس طرح ان کے تمام امور حتیٰ کہ ان کے افکار و نظریات اور تہذیب و ثقافت پر بھی قبضہ جمالیا۔ اور پھر نہ صرف ان کی گاڑھی کمائی بلکہ قدرتی وسائل اور ذخیروں کو بھی غارت کرنے کی غرض سے ان پر مسلط ہو گئے۔ جس کے نتیجہ میں مسلمان ممالک کی وہ افسوسناک صورت حال ہو گئی جس کا ہم اور آپ آج مشاہدہ کررہے ہیں۔

مسلمان حکومتیں ایک دوسرے کی طرف سے بدگمانی کا شکار ہو کر دشمنی پر کمربستہ ہو گئیں باہمی اختلاف وانتشار کے سبب انہوں نے مشرق ومغرب یعنی اسلام دشمن استعماری طاقتوں سے وابستگی اختیار کر لی۔ یہ لوگ قدرتی سرچشموں، الٰہی عنایتوں اور اپنی محروم وستم کشیدہ ملت کی محنتوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ نہایت ہی کم قیمت پر استعماری طاقتوں کے حوالہ کر دیتے ہیں اور پھر بے شرمی کے ساتھ ان ہی لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کر کے ذلت وخواری کا سامان فراہم کرتے رہتے ہیں ــــ اسلام کے حیات بخش وحیات آفریں توحیدی دستور وضوابط کو فراموش کر کے مشرق ومغرب کی گندی بیہودہ اور شرک آمیز استعماری تہذیب کی پیروی کی جا رہی ہے اسلامی عزت ووقار اور استقلال وآزادی سے رشتہ توڑ کے مشرق ومغرب سے ناتہ جوڑ کر ظالم وجابر استکباری طاقتوں کی غلامی میں فخر محسوس کیا جا رہا ہے۔ اپنوں سے کٹ کر غیروں سے وابستگی اختیار کرنا موجودہ سیاست کا بہترین امتیاز ہے۔ آج کا مسلمان اسی قسم کی دسیوں بلکہ سیکڑوں خون کے آنسو رلا دینے والی دردناک صورت حال سے دوچار ہے۔ کیا خداوند عالم اور اس کا رسولؐ مسلمان قوموں کی اس بدحالی کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں ــ تو پھر اس سے نجات کا کیا راستہ ہے!؟

اس کا واحد علاج اپنی اپنی جگہ پر اسلامی انقلاب برپا کرنا اور حکومت اسلامی کی تشکیل ہے مسلمانوں کو چاہیئے کہ خواب جہالت سے بیدار ہوں استعماریت کا جادو سروں سے اتار کر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے انقلاب آفریں دین "اسلام" کی طرف دوبارہ واپس آئیں اور اپنے ملکوں سے تمام کفر نواز استعماری جڑوں کو اکھاڑ پھینکیں: "فقاتلوا ائمة الکفر انھم لا ایمان لھم لعلھم ینتھون"[1] اپنے تمام امور کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھوں میں لے کر زمانۂ پیغمبر اسلامؐ کی طرح ہر ہر رخ سے نظام اسلام کو رائج ونافذ کریں اور اسلام کے حیات بخش قوانین ودستور حیات کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک جامع اسلامی حکومت قائم کریں۔ ایسی حکومت جو پیغمبر اکرمؐ کی الٰہی حکومت کی آئینہ دار ہو نہ یہ کہ نام تو اسلامی حکومت کا ہو اور جب اسلامی قوانین کے اجراء کی منزل آئے تو بدعہدی اور بے وفائی کا ثبوت دیا جائے۔

ایک جامع اسلامی حکومت کی تشکیل کے سلسلہ میں دنیا کے تمام مسلمان ذمہ دار ہیں۔ ان کا فریضہ ہے کہ میدان میں آئیں خصوصی طور پر ہمارے علماء وفقہا پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے انہیں چاہیئے کہ اس الٰہی تحریک اور انقلاب کی رہبری کریں۔ علماء وفقہا پیغمبر اسلامؐ کے نائب ہیں اور اسلام کا دفاع کرنا ان کی ذمہ داری اور فرائض

[1] سورہ توبہ/۱۲

میں داخل ہے، چونکہ وہ اسلام کو سمجھتے ہیں لہذا اسلامی قوانین واحکام کا اجراء کر سکتے ہیں۔ علماء وفقہا اس پیغمبرؐ کی نیابت کرتے ہیں جس کی ذمہ داریوں میں سے ایک بڑی ذمہ داری قوم کی رہبری اور اسلامی دستور وضوابط کا معاشرہ میں اجراء کرنا تھا۔

مولائے کائنات امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہا السلام سے روایت ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:۔

اللّٰھم ارحم خلفائی ۔ ثلاث مرات ۔ فقیل لہ یا رسول اللہ ؛ ومن خلفاؤک ؟ قال الذین یاتون من بعدی ویروون عنی احادیثی وسنتی فیعلمو نھا الناس من بعدی ۔ (وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۶۴ ح ۵۳)

یعنی خداوندا! میرے خلفاء پر رحم فرما ۔ اور یہ فقرہ تین مرتبہ دہرایا ۔ اس وقت پیغمبرؐ سے سوال کیا گیا یارسول اللہ! آپ کے خلفاء کون لوگ ہیں؟ حضرتؐ نے جواب دیا وہ لوگ ہیں جو میرے بعد آنے والے ہیں جو میری حدیث وسنت کو نقل کریں گے اور عوام الناس کو ان سے باخبر اور آگاہ کریں گے۔

وہ فقہا جو اسلام شناس ہیں پیغمبر اسلام کی حدیثوں اور سنتوں کی عوام کو تعلیم دیتے ہیں پیغمبرؐ کے خلفاء قرار دیئے گئے ہیں ۔ یعنی وہ پیغمبرؐ کی طرح سے ہی علمی ودینی مسائل میں مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں، درجہ رہبری وولایت پر فائز ہوتے ہیں اور احکام وقوانین الہٰی کے نفاذ واجراء کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے کیونکہ پیغمبر اسلامؐ کا بھی یہی کام تھا۔

پیغمبر اسلامؐ ارشاد فرماتے ہیں:۔

الفقھاء امناء الرسل مالم یدخلوا فی الدنیا قیل یارسول اللہ ومادخولھم فی الدنیا قال اتباع السلطان، فاذا فعلوا ذٰلک فاحذروھم علیٰ دینکم ۔ (کافی طبع بیروت ج ۱ کتاب فضل العلم ص ۴۶ ح ۵)

یعنی فقہا انبیاء کے امین ہیں مگر یہ کہ دنیا میں گرفتار اور وابستہ نہ ہو گئے ہوں۔ سوال کیا گیا یارسول اللہ! ان کی دنیا سے وابستگی کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے جواب دیا: یعنی جب وہ حاکم (جور) کے مطیع وفرمانبردار ہو جائیں۔ اور جب وہ ایسے حکام کے پیرو ہو جائیں تو ان سے دوری اختیار کر لینا تاکہ تمہارا دین محفوظ رہے۔

دراصل تمام انبیاء علیہم السلام کی دو اہم ذمہ داریاں تھیں۔ الٰہی قوانین و دستور اور نظام زندگی خدا سے حاصل کر کے عوام تک پہونچانا نیز تمام سیاسی و اجتماعی قوانین کا اجرا اور اس کی حفاظت کرنا یعنی احکام دین اور معارف الٰہیہ کی تبلیغ و اشاعت کے ساتھ ساتھ قوم کی رہبری اور حکومت کی ذمہ داری بھی ان کے سپرد کی گئی تھی۔ لہٰذا علماء و فقہا ان دونوں عظیم ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں انبیاء کے امانت دار ہیں۔ وہ مرجعیت علمی اور تبلیغ دینی کے بھی امانت دار ہیں، نیز قوم کی رہبری اور قوانین اسلامی کے اجراء کے بھی امانت دار ہیں —
حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :-

"العلماء حکام علی الناس" علماء عوام کے حاکم ہیں۔ (غرر الحکم)

البتہ ملت کی رہبری اور قوانین اسلام کا اجراء اسی وقت ممکن ہے جب انسان اسلامی قوانین کا علم رکھتا ہو اور اس کے اجراء پر قدرت و اختیار بھی رکھتا ہو۔ امیرالمومنین فرماتے ہیں :-

ان احق الناس بھٰذا الامر اقواھم علیہ، واعلمھم بامر اللہ فیہ

(نہج البلاغہ فیض خطبہ ۱۷۲ ص ۵۵۸)

لوگوں میں (خلافت کے لئے) سزاوار ترین وہ فرد ہے جو اس امر میں سب سے زیادہ قدرت وطاقت رکھتا ہو نیز احکام الٰہی کا سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک متقی و پرہیزگار، مدبر و مفکر فقیہ علم دوسروں کی بہ نسبت بہتر انداز میں اسلامی انقلاب و تحریک نیز ملت کی رہبری اور الٰہی قوانین و دستور کا اجراء کر سکتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ ارشاد فرماتے ہیں :-

ماولّت امۃ قط امرھا رجلا وفیھم اعلم منہ الا لم یزل امرھم یذھب سفالاحتی یرجعوا الیٰ ماترکوا۔ (کتاب سلیم بن قیس)

کسی امت نے کبھی کسی کو اپنا حاکم و امیر مقرر نہیں کیا حالانکہ ان کے درمیان اس سے زیادہ عالم و دانا شخص موجود تھا مگر یہ کہ وہ امت رو بہ زوال نہ ہو گئی ہو اور پستی و تباہی اس کا مقدر نہ بن گیا ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کئے ہوئے اقدام کی تلافی کرے (اور اسی شخص کو اپنا امیر و حاکم منتخب کرے جس کو پہلے نظر انداز کر دیا تھا)

کیا علماء و فقہائے اسلام کو زیب دیتا ہے کہ مستکبرین عالم کے مقابلہ میں جنھوں نے ملت اسلام کو یہ

سیاہ دن دیکھنے پر مجبور کیا ہے، چپ سادھے بیٹھے رہیں اور ستم زدہ، مظلوم و محروم اقوام کے قیام اور اعلان حق و عدالت کے سلسلہ میں ان کی قیادت و رہبری سے کنارہ کش رہیں؟ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔

اما والذی خلق الحبة و برأ النسمة لولا حضور الحاضر و قیام الحجة بوجود الناصر و ما اخذ اللہ علی العلماء ان لا یقاروا علی کظة ظالم و لا سغب مظلوم لا لقیت حبلها علی غاربها۔ (نہج البلاغہ، فیض الاسلام خطبہ ۳ ص۵۲)

یاد رکھو میں اس پروردگار کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس نے ایک معمولی سے دانہ کو شگافتہ کیا اور انسانوں کو خلق کیا، اگر یہ کثیر جمعیت میرے پاس بیعت کے لئے حاضر نہ ہوتی اور ان کی مدد کے وعدے سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوتی اور خداوند تعالیٰ کا وہ عہد سامنے نہ ہوتا جو اس نے علماء اور دانا افراد سے لیا ہے کہ وہ ظالموں کے شکم پری اور مظلوم و محروم کے بھوک سے بلبلانے پر راضی نہ رہیں تو میں یقیناً شتر خلافت کی مہار اس کے کوہان پر ڈھیلی چھوڑ دیتا (کہ وہ جہاں چاہے خلافت کی زمام لے جائے)

اس سلسلہ میں سرکار سید الشہداء امام حسین علیہ السلام پیغمبر اسلام سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرتؐ نے فرمایا:۔

من رأیٰ سلطاناً جائراً مستحلاً لحرام اللہ، ناکثاً لعهد اللہ، مخالفاً لسنة رسول اللہ صلی اللہ علیه وآله وسلم، یعمل فی عباد اللہ بالاثم والعدوان فلم یغیر ما علیه بفعل ولا قول کان حقاً علی اللہ ان یدخله مدخله۔

جس کا بھی ایسے ظالم و ستمگر سلطان سے سابقہ پڑے جو حلال خدا کو حرام قرار دے رہا ہو، خدا کے عہد کو توڑ کر پیغمبر اسلام کی سنت اور قانون اسلام کی مخالفت کرتے ہوئے بندگان خدا کے درمیان گناہ و معصیت کو رواج دے رہا ہو اور پھر بھی اپنے قول و عمل کے ذریعہ ایسے ستم پیشہ ظالم کی مخالفت نہ کرے تو خداوند عالم کا فریضہ ہے کہ اس جمود پسند بے حس انسان کا ٹھکانہ بھی اسی منزل (جہنم) کو قرار دے جہاں وہ ستمگر ظالم کو داخل کرے گا۔

اور پھر حضرت فرماتے ہیں:

ذالک بان مجاری الامور والاحکام علیٰ ایدی العلماء باللّٰہ الامناء علیٰ حلالہ وحرامہ فانتم المسلوبون تلک المنزلۃ وما سلبتم ذالک الا بتفرقکم عن الحق واختلافکم فی السنۃ بعد البینۃ الواضحۃ ولو صبرتم علی الاذیٰ وتحملتم المؤونۃ فی ذات اللّٰہ کانت امور اللّٰہ علیکم ترد وعنکم تصدر والیکم ترجع ولکنکم مکنتم الظلمۃ من منزلتکم واستسلمتم امور اللّٰہ فی ایدیھم، یعملون بالشبہات ویسیرون فی الشھوات، سلطھم علیٰ ذالک فرارکم من الموت واعجابکم بالحیاۃ التی ھی مفارقتکم، فاسلمتم الضعفاء فی ایدیھم فمن بین مستعبد مقھور وبین مستضعف علیٰ معیشتہ مغلوب، یتقلبون فی الملک بآرائھم ویستشعرون الخزی باھوائھم، اقتداء بالاشرار وجراۃ علی الجبار۔

(تحف العقول، ص ۲۴۳ - یہ حدیث حضرت علی سے بھی نقل کی گئی ہے)

یہ اس لئے ہے کہ احکام و قوانین اسلام کا اجراء کرنا، علماء الٰہی کا فریضہ ہے، وہ اس کے حلال و حرام کے سلسلے میں خدا کے امین ہیں۔ اور یہ تمہاری کارستانیوں کا نتیجہ ہے کہ یہ عزت و فضیلت تم سے سلب کر لی گئی ہے۔ تم کو اس فضیلت سے محروم نہ کیا جاتا اگر تم نے حق سے دوری اختیار کر کے پیغمبر کی سنت میں اختلاف پیدا نہ کیا ہوتا جبکہ روشن دلیلیں تمہارے سامنے موجود ہیں، اور اگر تم اذیتوں اور تکلیفوں پر صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے راہ خدا میں استقامت و جواں مردی کا ثبوت دو گے تو امور خداوندی کی باگ ڈور تمہارے ہاتھوں میں آجائے گی، تمہارے اشاروں پر تمام امور انجام پائیں گے لوگ تمہاری طرف رجوع کریں گے۔ لیکن تم نے تو ستمگروں کو تقویت بخشی اور انھیں حکومت الٰہیہ کے تمام امور کا مختار بنا دیا کہ وہ حلال و حرام کو مخلوط کر کے ناقابل شناخت بنا دیں اور اپنی خواہشات نفسانی کے تحت تمام امور انجام دیں۔ چنانچہ خداوند عالم نے انھیں تمہارے اوپر مسلط کر دیا

کیونکہ تم موت سے بھاگتے تھے اور دنیوی زندگی میں مگن تھے۔ حالانکہ یہ دنیوی زندگی ایک دن بہرحال تمہارا ساتھ چھوڑ دیگی۔ تم نے کمزور و ناتواں افراد کو ان کے حوالے کر دیا جن میں سے کچھ کو انہوں نے اپنا غلام اور پابند بنا لیا اور کچھ کو روٹی کے ایک ٹکڑے کا بھی محتاج بنا دیا یہ لوگ مملکت کو اپنی مرضی سے الٹ پلٹ کرتے رہتے ہیں۔ اشرار کی پیروی نیز خدا کے مقابلہ میں بغاوت سے کام لے کر اپنے حق میں رسوائی اور ہوس رانی کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔

اسلامی انقلاب برپا کرنے اور پیغمبر اسلام کی تحریک کو زندہ کرنے کے سلسلہ میں دوسری تمام چیزوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ حساس قیادت و رہبری کا مسئلہ ہے۔

ایران کی مجاہد شہید پرور مسلمان ملت نے اپنے کامیاب اسلامی انقلاب میں روحانیت و فقاہت کے دلاورانہ نقوش اور رہبری و قیادت کی تاثیر کو خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ ہمارے انقلاب کی حیرت انگیز کامیابی فقیہ عصر مرجع کبیر اسلام آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی مدظلہ العالی جیسے وسیع النظر اور سریع الفیصلہ رہبر کی عالمانہ قیادت کا ہی نتیجہ ہے۔ آپ ہی کی وہ ذات ہے جس نے عوام کو حقائق سے آشنا کیا ان کے اندر ایمان و جہاد کی قوت پیدا کر کے وہ جرأت مردانہ عطا کی کہ وہ تمام بڑی استعماری طاقتوں کے مقابلہ میں ڈٹ گئے اور سامراجی ہتھکنڈوں کو ملک بدر کرنے کے سلسلہ میں رکاوٹ بننے والی کسی بھی طاقت سے خوفزدہ نہیں ہوئے۔ یہ آپ ہی کی مدبرانہ صلاحیتوں کا صدقہ ہے کہ شروع سے آخر تک اس انقلابی تحریک کو اسلام کی راہ سے ہٹنے نہیں دیا اور اسلام سے انحراف یا رخنہ اندازی کی کوشش کرنے والوں کو بروقت کچل دیا اور ببانگ دہل اعلان کر دیا کہ: "ہم جمہوری اسلامی" کے حق میں رائے دیتے ہیں نہ ایک جملہ کم کیا جاسکتا ہے نہ زیادہ۔ آپ نے اس نورانی منصوبہ کو عمل میں لانے کے سلسلہ میں پوری نگرانی کی چنانچہ جب تک اسلامی نظام مکمل طور پر نافذ نہیں ہو جاتا آپ قیادت و رہبری کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔

خداوند عالم وہ دن جلد لائے جب ہر ملک و قوم کے مسلمان علماً و فقہا اس الٰہی ذمہ داری کو محسوس کریں اور اپنی اپنی ملتوں کو بیدار کر کے استعماری چنگلوں سے نجات دلائیں تاکہ تمام مسلمان اس تحریک محمدی کو زندگی عطا کریں۔ اسلام کے حیات بخش نظام کو رائج کر کے اسلامی حکومتیں قائم کرنے اور بڑی استعماری طاقتوں کے ایجنٹوں کو نکال باہر کرنے کے لئے اسلام کے سپاہی بن کر میدان میں آجائیں ــــ انشاء اللہ ــــ

جناب سید احمد فہری
ترجمہ: جناب سید حسین مہدی الحسینی

علم و تعلیم ـــ امام خمینی اور شہید ثانی کی نظر میں

مراتب اخلاص

کتاب "آداب الصلوٰۃ" میں امام خمینی دام ظلہ نے اخلاص کے کچھ مراتب کا تذکرہ فرمایا ہے، میں نے ضروری سمجھا کہ اس کا تذکرہ کردوں۔ لیکن پھر خیال آیا چونکہ یہ کتابچہ اپنے نوجوانوں اور مومنین کے لیے لکھ رہا ہوں لہٰذا ممکن ہے ان میں کچھ ایسے افراد بھی ہوں جن کا مَبلغِ علم اتنا نہ ہو کہ امام امت دام ظلہ کے علمی و عرفانی فقروں اور جملوں کو بآسانی سمجھ سکیں لہٰذا میں نے اسی خیال سے بریکٹ[ا] کے درمیان ایسی مشکل جگہوں کی وضاحت کردی ہے تاکہ اہل ذوق کے کام و دھن بھی حلاوتِ بیان کی چاشنی کا احساس کرسکیں۔ حافظؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہزار نقش بر آید ز کلک صنع ولی
بہ دلپذیری نقش نگار ما نرسد

۱۔ مراتب اخلاص کا تذکرہ کرتے ہوئے امام خمینی دام ظلہ فرماتے ہیں کہ اخلاص کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے عمل کو صرف اور صرف خدا کے لیے انجام دے۔ خواہ اس کے عمل کا تعلق قلب سے ہو جیسے "ایمان" یا اعضاؤ جوارح سے جیسے "نماز"۔ اگر خدانخواستہ کہیں عمل کرتے وقت یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اس عمل کی وجہ سے لوگ ہماری تعریف و توصیف کریں گے، یا میں ان کی توجہ کا مرکز بنوں گا، یا اس عمل کے

[ا] میں نے ترجمہ کی سادگی کو برقرار رکھنے کے لئے اس بریکٹ کو جزو تحریر امام دام ظلہ قرار دیا ہے ـــ مترجم۔

ذریعہ دنیاوی فائدہ حاصل ہوگا ۔۔۔ تو ان تصورات کے بعد انجام پانے والے عمل باطل ہیں اور زبانِ مذہب میں اسی کو "ریا" کہتے ہیں۔

اس قسم کی "ریا" سے متعلق ہماری فقہی کتابوں میں علمائے اعلام نے یہی سوال اٹھایا ہے کہ۔ اگر کسی نے عوام کو دکھانے کے لئے نماز پڑھی تو کیا اس شخص کی نماز صحیح ہے یا باطل، نماز گذار کو نماز کا اعادہ کرنا ہوگا یا نہیں۔؟ ظاہر ہے ایسی نمازیں باطل ہیں اور اس قسم کی ریا بھی اقسام ریا میں سب سے زیادہ پست و بےحقیقت ہے اور ریاکار بھی ریاکاروں کے زمرہ میں سب سے زیادہ ذلیل و رذیل ہے۔

۲۔ اخلاص عمل کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان جو عمل انجام دے رہا ہے فانی دنیا اور چند روزہ زندگی کے فائدوں کی خاطر نہ ہو اگر اس کے عمل کا محرک اس قسم کے دنیاوی مقاصد و منافع ہوں مثلاً نماز شب اس لئے پڑھ رہا ہو کہ رزق میں وسعت ہو، یا اول ماہ کی نماز اس لئے انجام دی تاکہ اس ماہ کی آفتوں اور بیماریوں سے محفوظ رہے، یا صدقہ اس لئے نکالے تاکہ اس دن کی سلامتی اس کے حصہ میں آئے تو بعض فقہا کے نزدیک یہ اعمال باطل ہیں کیونکہ ان کے نزدیک وہ عمل قبولیت کے لائق ہے جو ہر قسم کی دنیاوی غرض اور لالچ سے خالی ہو ۔ لہٰذا اگر کسی شخص نے نماز شب وسعت رزق کی خاطر پڑھی یا نماز اول ماہ اس لئے ادا کی تاکہ اس ماہ کی نحوستوں سے محفوظ رہے تو چونکہ یہ مقاصد اس کی نیت کا جزء بن گئے لہٰذا اس کے اعمال و عبادت باطل ہیں۔

مگر میری نظر میں فقہی اصولوں کے پیش نظر اگر نماز شب کسی نے وسعت رزق کے لیے پڑھی تو ان تصورات و تمناؤں کے ساتھ پڑھی جانے والی نمازیں باطل نہیں ہوں گی یہ اور بات ہے کہ اہل معرفت کے نزدیک ان نمازوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں، ان کے خیال میں ایسی نمازیں زندگی کے دوسرے حلال ذریعۂ معاش و معاملہ کی طرح ہیں جہاں انسان جب کسی کو کوئی چیز دیتا ہے تو اس سے اس کے عوض میں کوئی چیز لیتا ہے بلکہ ممکن ہے کہ یہ نمازیں دنیاوی معاملہ سے بھی زیادہ کم حیثیت رکھتی ہوں کیونکہ دنیاوی معاملہ میں جنس و قیمت دونوں اسی دنیا کی چیزیں ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں قیمت میں عبادت جیسی بیش بہا و گراں بہا شئ کو دے رہا ہے در آں حالیکہ اگر ساری دنیا کو اس کا عوض قرار دیا جائے تو بھی گھاٹا ہی رہے گا۔ لہٰذا دنیاوی مقاصد کے پیش نظر نماز و روزہ بجا لانے والے خاصان خدا کے نزدیک نادانستہ طور سے عبادت کی توہین کرتے رہتے ہیں۔

۳ اخلاص عمل کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ انسان کا عمل ان تصوّرات کے زیر سایہ نہ انجام پا رہا ہو کہ عمل کی جزا میں داخل بہشت کیا جائے گا اور اس کی نعمتوں سے بہرہ مند ہوگا، حوریں اس کی مونس و جلیس ہوں گی۔ ان آرزوؤں کے ساتھ بجالانے والی عبادت قابل تحسین و تعریف نہیں۔ اہل معرفت کی نگاہوں میں یہ بھی ایک قسم کی تجارت ہے، فرق اتنا ہے کہ اس کی اجرت و منفعت کچھ زیادہ ہے۔ اسی لئے احادیث میں عبادت گذاروں کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

(الف): کچھ افراد وہ ہوں گے جو خدا کا سجدہ جہنم کے خوف سے کر رہے ہوں گے، ان کی عبادتیں ان غلاموں کے افعال سے مشابہہ ہیں جو آقا کی سختیوں سے ڈرتے ہوئے کام کیا کرتے ہیں۔

ب: کچھ لوگ سجدے اس لئے کر رہے ہوں گے تاکہ معبود انہیں اس کے صلہ میں جنت اور نعمات جنت سے سرفراز فرمائے۔ ایسی عبادتوں کا انداز ان مزدوروں اور کارمندوں کا سا ہے جو اجرت کی طمع میں کام کیا کرتے ہیں۔

ج: تیسرا گروہ ان افراد کا ہے جن کے سجدے نہ جنت کی طمع میں ہوتے ہیں اور نہ جہنم کے خوف سے بلکہ خدا کو لائق طاعت و بندگی سمجھا ہے لہٰذا اس کی بندگی کرتے ہیں۔ ان ہی جیسوں کی عبادت شرافتمندانہ و آزادانہ عبادت کہے جانے کی مستحق ہے۔

۴ اخلاص کا چوتھا درجہ یہ ہے کہ انسان کی عبادت عذاب قیامت کے خوف سے نہ ہو کیونکہ اس قسم کی اطاعت و بندگی میں بھی غلاموں کے عمل کی شباہت پائی جاتی ہے جس کا تذکرہ گذشتہ صفحات پر کر چکا ہوں۔ عذاب قیامت سے ڈرتے ہوئے کی جانے والی طاعت و بندگی بھی خاصان خدا کے نزدیک بے حقیقت ہے اور بندگی کی کسوٹی پر پرکھے جانے کے لائق نہیں، کیونکہ خاصان خدا کا خیال ہے عذاب قیامت سے ڈر کر کی جانے والی عبادت بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شرعی حدود و تعزیرات (اسلامی سزاؤں) سے ڈر کر عبادت کرے۔

لہٰذا خواہ دنیاوی سزاؤں سے بچنے یا اخروی عذاب سے بچنے کے لئے طاعت و بندگی کی جائے۔ وزن کے اعتبار سے ایک ہی جیسی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ یہ عبادتیں اگرچہ خالص خدا کے لئے نہیں انجام دی گئیں تاہم فقہی اصولوں کے اعتبار سے باطل نہیں کہی جا سکتیں کیونکہ عمل کا محرک اگرچہ خوف جہنم ہے لیکن خود عمل خدا کی خوشنودی

کے لئے کیا گیا ہے۔

۵ و ۶ اخلاص کا پانچواں درجہ یہ ہے کہ انسان وقت عمل خوشنودیٔ خدا کے علاوہ کوئی اور تصوّر وجذبہ اپنے دل میں نہ رکھتا ہو لہٰذا اگر وقت عمل کہیں اس کی یہ خواہش ہو کہ وہ اپنے عمل کے ذریعہ روحانی لذت اور بشری سعادت و خوش بختی سے ہمکنار ہو، یا عمل کی پاکیزگی و طہارت کے ذریعہ ملائکہ و کروبین کے درجہ تک پہنچ جائے تو یہ عمل بھی خدا رسیدہ حضرات کی نگاہوں میں محترم نہیں کیونکہ ان تصورات کے ساتھ انجام دی جانے والی طاعت و بندگی میں تاجرانہ فکر کارفرما ہے۔ اگر حکما و محققین نے ایسی عبادتوں کو بے حد اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے، کیونکہ ایسی عبادت ایک اعلیٰ مقصد کی حامل ہے۔

اسی کے مقابلہ میں اخلاص کا چھٹا درجہ ہے، اگر کسی نے نعمت آخرت و سعادت کی محرومی کے خوف سے طاعت و بندگی کی تو اگرچہ یہ بھی بہت بلند درجہ ہے اور اس کی توصیف احاطۂ قلم میں لائی نہیں جا سکتی لیکن اس کے باوجود صاحبانِ معرفت کی نظر میں یہ عمل بھی محترم و مکرم نہیں کیونکہ اس جگہ بھی غلامانہ ذہنیت کارفرما ہے۔

۷ عمل کو خالص للہ و فی اللہ بنانے کے لیے ساتویں چیز جس کی رعایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے عمل کے ذریعہ جلال و جمال الٰہی کی لذت و حلاوت سے لطف اندوزی کا تصور، ذات اقدس الٰہی کے نور ناپیدا کنار تک پہنچنے کی تمنا رکھتا ہو۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن میں یہ جذبے پائے جائیں خاصان خدا کے نزدیک یہ جذبے بے حد اہمیت و وقعت رکھتے ہیں اکا دکا ہی ایسے ہوں گے جو "لقاء الٰہی" کی اس اہم منزل پر فائز ہوں اور خال خال ہی ایسے ہوں گے جن میں خاصان خدا کے دلوں میں پایا جانے والا والہانہ عشق الٰہی ضوبار ہو۔ لیکن ان ساری عظمتوں کے باوجود ایسی طاعت و بندگی بھی "خاصان خدا" و "اولیاء اللہ" کے نزدیک بندگی کا آخری درجہ نہیں بلکہ اس عشق الٰہی کے مقابلہ میں جو خاصان خدا کے دلوں میں تجلّی ریز ہے، ایک معمولی درجہ ہے، جس کی ہلکی سی جھلک "مناجات شعبانیہ" میں امیر المومنینؑ اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کی زبانی دیکھنے میں آتی ہے۔

حضرتؑ فرماتے ہیں:-

الٰہی ھب لی کمال الانقطاع الیک وانر ابصار

قلوبنا بضیاء نظرھا الیک حتیٰ تخرق ابصار

القلوب حجب النور فتصل الیٰ معدن العظمة
وتصیر ارواحنا معلقة بعز قدسك ۔ الٰهی
واجعلنی ممن نادیته فاجابك ولاحظته فصعق
لجلالك"

میرے معبود! مجھے صرف اور صرف اپنی ذات سے لو لگانے والا قرار دے
میرے دیدۂ دل کو وہ توانائی عطا فرما جس سے ہم تری ہستیِ نور کا مشاہدہ کر سکیں
اور تیری عطا کردہ توانائی کے سہارے ہماری نگاہیں نورانی حجابات کو چیرتی ہوئی
تیری نورانی ذات تک پہنچ جائیں اور ہماری روحیں تیری ہستیٔ باعزت و شرف
میں جذب ہو جائیں۔

معبود! ہمیں ان لوگوں میں قرار دے جسے تو نے جب پکارا تو انہوں نے تیری
ندا پر لبیک کہا۔

۸ اخلاص عمل کا آٹھواں درجہ اسی ساتویں درجہ کا عکس ہے ساتویں درجہ میں انسان نے اس لئے
عمل کیا تاکہ عارفان حق کے اعلیٰ و ارفع درجہ پر فائز ہو کر "لقاء الٰہی" سے سرفراز ہو اور اگر کہیں
عمل اسی عظیم نعمت سے محرومی کے تصور میں پیدا ہو تو صاحبان حق و حقیقت کے نزدیک یہ عمل بھی
محترم نہیں کیونکہ دراصل عمل کا محرک خطرہ سے بچاؤ تھا۔ وحدہ لاشریک کے لئے کی جانے والی طاعت
و بندگی اس قسم کی دوئی سے بھی خالی ہونی چاہیئے۔ حضرت امیرالمومنین ؑ اور آپ کی اولاد طاہرین ؑ
کے ارشاد:۔

کیف اصبر علیٰ فراقك

"معبود تری جدائی پر کیونکر صبر کروں گا" میں درجات عشق الٰہی کے ایک معمولی
درجہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بہرحال ہماری بندگی و طاعت "لقاء الٰہی" کے اشتیاق و محرومی
کے نتیجہ میں نہیں ہونی چاہیئے۔ اس آمیزش کا مطلب یہ ہے کہ عمل نفسانی جذبے سے خالی نہ رہ سکا۔
"کمال اخلاص" کے اور بھی دوسرے درجات ہیں لیکن اس کا تذکرہ یہاں اس لئے مناسب نہیں
کہ وہ توحید و حاکمیت حضرت اقدس الٰہی کے ضمن میں آتے ہیں۔

برادران عزیز! مرتبہ اخلاص و بلندیِ عبادت سے بہر حال آپ کسی حد تک آشنا ہوئے آپ آپ کا فریضہ ہے کہ اخلاص کے ان درجوں کو حاصل کرنے کے لئے اپنے کو آمادہ کریں کیونکہ علم بغیر عمل لائق تعریف نہیں۔ مگر ہائے افسوس ہم لوگ خاصان خدا کی معنوی و روحی عظمت و رفعت اور معارف الٰہیہ سے یکسر محروم ہیں۔ ہم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو "خاصان خدا" کے کمالات و درجات کے بالکل منکر ہیں ان کی نگاہوں میں ایسے افراد لغو و لاطائل ہیں اگر ان کے سامنے خاصان خدا کے مراتب کا تذکرہ ہوتا ہے تو وہ ان کی اتباع کو جہالت اور ان کے تذکرہ کو ناقابل ذکر و بیان خیال کرتے ہیں۔ ایسے افراد کے لئے توقع نہیں کہ لاعلمی و بے خبری کی گہری نیند سے بیدار کیا جا سکے۔ ان ہی کے لئے ارشاد حضرت احدیت ہے۔

انک لاتھدی من احببت

اے رسول! آپ چاہتے ہیں منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔

یا سورہ فاطر میں ارشاد ہے:۔

ما انت بمسمع من فی القبور

اے نبی! جو قبروں میں پڑے سو رہے ہیں آپ انہیں نہیں سنا سکتے۔

ان آیات کے مصداق وہی لوگ ہیں جو میری طرح حق و حقیقت سے بے خبر ہیں جن کے دل عشق الٰہی سے خالی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا لباس، بوسیدہ قبریں ہیں ان کی مادی کثافتوں اور آلودگیوں نے انھیں عالم الوا کی نورانیت و معنویت سے بالکل بے بہرہ بنا رکھا ہے۔

قرآن نے ان ہی لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فمالہ من نور

جسے خدا ہی نے روشنی عطا نہ کی ہو پھر اس کے لئے کہیں کوئی روشنی نہیں۔

یہ وہ افراد ہیں اگر ان کے سامنے عشق الٰہی اور خدا کی خالص و بے لوث محبت و مودت سے متعلق جس قدر آیتیں اور حدیثیں پڑھی جاتی ہیں تو اسے اپنے انداز و افکار کے اعتبار سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان سبھی آیات کو جن میں عشق الٰہی اور محبت و مودت معبود کا تذکرہ کیا گیا ہے ایسے جنت کی زیبائی و خوشنمائی اور حوروں کے حسن و جمال سے تعبیر کرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا

کہ یہ لوگ "مناجات شعبانیہ" کے ان جملوں کی توجیہ و تفسیر کیا کریں گے جس میں معصومؑ فرماتے ہیں:

میرے معبود! مجھے صرف اور صرف اپنی ذات سے لو لگانے والا قرار دے دیدۂ دل کو وہ توانائی عطا فرما جس سے ہم تیری ہستی نور کا مشاہدہ کر سکیں اور تیری عطا کردہ توانائی کے سہارے ہماری نگاہیں نورانی پردوں کو چیرتی ہوئی معدن عظمت تک پہنچ جائیں اور ہماری روحیں تیری ہستی باعزت و شرف میں جذب ہو جائیں۔

کلام معصومؑ میں حجاب نور سے کیا مراد ہے؟

- کیا نور الٰہی کے مشاہدہ سے مراد، بہشت کے لذیذ میوے ہیں؟
- کیا معدن عظمت سے مراد، جنت کے شیش محل ہیں؟
- کیا ذات باری تعالیٰ میں جذب و ضم ہونے کی تمنا سے مراد، حوروں کی مرمریں باہوں میں باہیں ڈالنا اور ان کے کیف آگیں وجود سے لطف اندوز ہونا مقصود ہے؟
- کیا حالت نماز میں پیغمبر اسلامؐ کو جو کیف و جذب و سرور اور استغراق پیدا ہوتا تھا وہ صرف جنت کی حسین و جمیل حوروں اور شمس و قمر سے کچھ سوا نورانیت کی تمنا میں تھا؟
- کیا "الامن اتی اللہ بقلب سلیم" کی تشریح و تفسیر میں حضرات معصومینؑ نے جو یہ فرمایا ہے کہ قلب سلیم رکھنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا سے ملاقات کرتے وقت غیر خدا کی یاد اپنے دلوں میں نہ رکھتے ہوں۔ تو کیا یہاں غیر خدا کی یاد نہ رکھتے ہوں سے مراد سیب اور سنترہ کے غیر کی یاد سے دل کا خالی ہونا ہے؟

ہائے افسوس اشہب قلم ہمارے ہاتھوں میں مہمیز ہے بے سوچے سمجھے جو چاہتے ہیں لکھ رہے ہیں جان عزیز کی قسم ـــ حضرات معصومینؑ کے فقرات و جملات کا مقصد مومنین خصوصاً حضرات اہل علم کو متوجہ و متنبہ کرنا تھا کہ خاصان خدا کے درجات کے منکر نہ ہوں کیونکہ یہ انکار ہر قسم کی بدبختی و بدقسمتی کا سرچشمہ ہے۔

اس کی طرف بھی متوجہ رہیں کہ میری بحث کا موضوع اس جگہ یہ نہیں ہے کہ وہ خاصان خدا کون ہیں؟ بہرحال وہ حضرات جو بھی ہوں ـــ ان کے بلند درجات سے انکار نہیں کرنا چاہئے

خاصان خدا کون ہیں ؟ اس کا علم صرف خدا کو ہے یہ ایک ایسا راز ہے جسے بجز خدا کوئی اور نہیں جانتا۔

اسی جگہ مجھے کچھ ایسے نظر آتے ہیں جو خاصان خدا کے مخالف تو نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی بلندی درجات کے منکر ہیں لیکن دنیا کی چہل پہل میں محو اور اس کی چند روزہ لذتوں میں ایسا کھو چکے ہیں کہ ان میں اب وہ ذوق باقی ہی نہیں رہا جس سے خاصان خدا کے طور طریقہ کو اپنا سکتے۔ ان افراد کی حیثیت اس مریض کی سی ہے جس نے اپنے مرض کی تشخیص تو کرلی ہے لیکن اپنی شکم پرستی کے سبب "پرہیز" اور کڑوی دواؤں کے استعمال کا عادی نہیں — گویا یہ وہ افراد ہیں جو مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود مرض کی تشخیص نہ کرسکے۔

کچھ افراد وہ ہیں جنھوں نے خاصان خدا کے درجات کو معلوم کرنے کی کوشش کی اور اس کی عظمتوں کو معلوم بھی کیا لیکن اس حقیقت کو حسین و جاذب جملوں اور دل کو بھاجانے والے لفظوں کے قالب میں پیش کرتے رہے اور اس کے ذریعہ بھولے بھالے عوام کو لفظوں کی زنجیر میں جکڑے ہوئے عمل سے بے بہرہ بنائے رکھے۔

انہیں میں ایک گروہ وہ ہے جو اپنی حقیقت سے آگاہ ہے لیکن سیدھے سادے عوام سے اپنی بالادستی و بالاتری منوانے کے لئے انھیں "خاصان خدا" کی اصطلاحوں میں الجھا کر اپنے حلوے مانڈے کی راہیں ہموار کئے ہوئے ہے۔ یہ افراد انسانوں کے لباس میں ابلیس سے زیادہ خطرناک کام انجام دے رہے ہیں۔ ان کے پھندوں میں پڑے ہوئے بھولے بھالے عوام کو کیا معلوم کہ "انسانی دل" صرف حق کی منزل و قرار گاہ ہے کسی کو اس دل پر قبضہ کرنے کا حق نہیں — جو لوگ سادہ ذہن عوام کو اپنی لچھے دار باتوں میں الجھائے ہوئے ہیں وہ درحقیقت الٰہی ٹھکانوں کے غاصب ہیں، اور کعبۂ حقیقی کے منہدم کرنے والے، ان افراد نے ان غریبوں کے دل کو جو حق کا کعبہ بلکہ بیت المعمور تھا بت خانہ بنا دیا ہے۔ یہ لوگ مسیحا کے لباس میں وبا اور امراض کے پھیلانے والے ہیں۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ ایسے لوگ ناداروں اور غریبوں سے زیادہ سرمایہ داروں اور نمایاں افراد کی اصلاح و تنبیہ کیا کرتے ہیں ان کے اکثر حلقہ بگوش سرمایہ دار ہی ہوتے ہیں اگرچہ یہ لوگ خود بھی انہیں کی فرد ہیں۔ دنیاوی آلودگی میں ڈوبے

ہونے کے باوجود ایسی پارسائی کی گفتگو کریں گے تاکہ ان کے مرید و حلقہ بگوش "ولی اللہ" سمجھتے رہیں
یہ بے خرد حلقہ بگوش بھی ہزاروں لغزشوں، کثافتوں کو دیکھنے کے باوجود ان کی عیارانہ گفتگو میں محو و مسحور
ہیں۔

ان میں وہ افراد جو عیاریوں، اور مکاریوں کے ذریعہ اپنے "خاصان خدا" ہونے کا اظہار
نہیں کرتے بلکہ صحیح معنوں میں "خاصان خدا" کے درجات و کمالات کو حاصل کرنے کے آرزومند ہیں
کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ابلیس انہیں فکر کے چار سو پر اغوا کر دیتا ہے اور ان کے دلوں میں ایسے
وسوسہ ڈالتا ہے جس کے بعد یہ طالبان راہ حق و عشق الٰہی اور درجات خاصان خدا کو "علمی اصطلاحوں"
میں محصور سمجھنے لگتے ہیں، جسے انھوں نے خود ہی گڑھا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے افراد
خاصان خدا کے درجات عالیہ تک تو نہیں پہنچ پاتے، ہاں اس علم میں نت نئی اصطلاحوں اور کتابوں
کی بھرمار اور بہتات کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال تفسیر لکھنے والے ان علماء کی سی ہے جن کے
استفادات قرآنی کا دائرہ صرف جمع قرآن، اختلاف قراءت، معانی و بیان، بندش الفاظ، صوری
و معنوی محاسن اور اعجازی پہلو ہوا کرتا ہے، ایسے افراد کو قرآن کے روحی و معنوی پیغام سے
قطعاً سروکار نہیں جس کی طرف قرآن آواز دے رہا ہے۔ ان لوگوں کی مثال بھی ان مریضوں جیسی
ہے جو طبیب کی طرف تو رجوع کرتے ہیں لیکن نسخہ پر عمل کرنے کے بجائے دواؤں کی ترکیبات
اور اس کی حفاظت پر زیادہ زور دیتے ہیں، ایسے افراد شدت مرض سے ہلاک ہو جائیں گے انہیں
نہ نسخۂ طبیب ہلاکت سے بچا سکتا ہے اور نہ ترکیب استعمال سے آگہی۔

عزیزو! ہر علم عمل کا محتاج ہے۔ خود علم توحید اس سے خالی نہیں، علم توحید میں کچھ
اعمال کا تعلق قلب سے ہے اور کچھ کا اعضاء و جوارح سے ـــ آپ کو معلوم ہے عربی قاعدہ کے
اعتبار سے توحید، تفعیل کے وزن پر ہے جس کے معنی کثرت کو وحدت میں منحصر کرنے کے ہیں
اور کثرت کو وحدت میں سمونا دل کے افعال میں ہے۔

عزیزو! جب تک تم نے اس رنگارنگ دنیا اور طرح طرح کی مصنوعات و مخلوقات
کو دیکھنے کے بعد اس کے سبب حقیقی کو پہچاننے کے لیے دیدۂ حق شناس پیدا نہ کیا، اور خود اپنے
وجود کی صنعت و کاریگری کو دیکھ کر خدا کو نہیں پہچانا اور یہ تسلیم نہیں کیا کہ شش جہت فانی ہے

اس کا سرچشمہ، ذات اقدس الٰہی ہے اس دنیا کی پیدائش میں کوئی اس کا شریک اور ساتھی نہیں، اس کی قدرت ابدی اور اس کا اختیار ازلی ہے۔ اس وقت تک پورے طور سے اخلاص سے بے بہرہ مغائبا طن سے ناآشنا، اور توحید سے محروم و مہجور رہو گے۔

یہ یاد رکھو ۔۔ انسان افعال و نیت میں ریا اسی وقت کرتا ہے جب کامل طور سے توحید افعالی کی معرفت نہ رکھتا ہو گا۔

عزیزو! جو لوگ خاصان خدا کا لبادہ پہن کر بھولے بھالے عوام کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے ہیں اور انہیں مملکت الٰہیہ کا کارساز تصور کرتے ہیں ان سے یہ امید کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ عوامی توجہ کی پرواہ کئے بغیر صرف خدا کے لیے کوئی عمل کریں گے؟ یہ ایک مسلمہ ہے کہ جو دہانۂ آب، خاک آلود ہوتا ہے اس سے بہنے والا پانی بھی خاک آلود ہی ہو گا۔ اگر تمہارا عقیدہ ہے کہ قلب انسانی پر خدا کا تصرف و اختیار ہے، جیسا کہ دعا کا فقرہ ہے "یا مقلب القلوب" تو اس حقیقت سے اپنے فکر و شعور کو مانوس کرو۔ اور عوامی قلوب کو اپنا گرویدہ بنانے کی بھاگ دوڑ نہ کرو۔ اگر تم نے اپنے قلب کو یہ باور کرا دیا کہ ۔۔ بیدہ ملکوت کل شئی و له الملك و بیده الملك ۔۔ ہر شی خدا کے دست اختیار میں ہے، ساری کائنات اس کی ہے اور اس پر اسی کا حکم چل رہا ہے تو پھر عوامی مقبولیت و محبوبیت سے بے پرواہ ہو جاؤ گے۔ اور عوام کی توجہ نظر کی خواہش پیدا نہ ہو گی۔ عوامی قلوب کو گرویدہ بنانے کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اپنے کو کسی شئے کا ضرورت مند پایا اور اس ضرورت کو برطرف کرنے کے لئے عوام کو کارساز سمجھا اور نتیجہ میں کوشش یہ کی کہ انہیں اپنا گرویدہ بنا سکو لہٰذا ریا کا لبادہ اوڑھ کر انہیں اپنے سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ اگر خدا کو کارساز سمجھتے ہوتے تو اس شرک میں مبتلا نہ ہوتے۔

اے توحید کا دعوا کرنے والے مشرکو، اے نسل آدم کے ابلیسو! یہ ریا و خود نمائی کا ترکہ تمہیں شیطان سے ملا ہے کیونکہ اسی نے لاغوینھم ۔۔ (میں ضرور انسانوں کو گمراہ کر دوں گا) کے ذریعہ اظہار خود نمائی کیا تھا، ابلیس خود نمائی و شرک کے گہرے پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ یہ یاد رکھو جو لوگ اپنے کو عالم و بے نیاز مختار اور آزاد تصور کرتے ہیں ابلیسی جادہ پر گامزن ہیں۔

خواب خرگوش سے بیدار ہو اور اپنے دلوں کو کتاب الٰہی و صحیفہ نور کی تلاوت سے نورانی

کرو۔ یہ قرآن ہمیں بیدار کرنے ہی کے لئے نازل کیا گیا تھا لیکن ہم نے اس کے معارف کو پس پشت ڈال دیا تمام تر توجہ اس کی جلد و طباعت اور قرأت میں منحصر کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان ہمارا حاکم بن گیا اور ہم اس کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنے لگے۔

فوری طور سے اس موضوع کو اسی جگہ تمام کرتا ہوں انشاء اللہ بقیہ پھر کسی مناسب موقع پر تحریر کروں گا۔

جناب سید محمد جواد ہادی

نہج البلاغہ منارۂ ہدایت

جس طرح قرآن کریم خزانۂ علوم و فنون اور تمام جوانب حیات بشری پر محیط ہے اس طرح نہج البلاغہ جو "فوق کلام البشر و دون کلام اللہ" کا مصداق ہے، ایک مجموعۂ گراں بہا ہے جو اپنے دامن میں انسان کی حیات دنیوی و اخروی کے لئے عظیم سرمایہ سمیٹے ہوئے ہے۔ لیکن اس کلام عظیم اور سرمایۂ بے نظیر سے عملی زندگی میں جو فائدہ اٹھانا چاہئے تھا مسلمان کما حقہ وہ فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ کم و بیش وہی سلوک نہج البلاغہ کے ساتھ بھی ہو رہا ہے جو کچھ کلام اللہ مجید کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ مسلمان قرآن کو کلام اللہ سمجھ کر وہ تمام احترامات جس کا وہ لائق ہے، قرآن کے حضور بجا لاتے ہیں، قرآن کے مفاہیم کی تشریح میں درجنوں تفسیریں لکھی گئیں، مگر عملی زندگی سے قرآن غائب ہے، وہ جس توجہ کا استحقاق رکھتا ہے مسلمانوں نے کبھی بھی وہ توجہ اس کی طرف نہیں دی، نہج البلاغہ جو حیات بشری کی سعادت کا مکمل ضامن ہے، علمی و فنی لحاظ سے اگرچہ کم و بیش مورد توجہ رہا ہے اور علماء و محققین نے مفاہیم نہج البلاغہ کی تشریح و تفسیر میں قابل قدر اقدام کئے ہیں، مگر عملی زندگی میں نہج البلاغہ ویسا ہی مہجور واقع ہوا ہے، جس طرح کلام اللہ، درحالیکہ نہج البلاغہ میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کو کما حقہ اجاگر کیا گیا ہے اور انسانی معاشرہ کی سعادت کے لئے ہر میدان میں مکمل ضابطۂ حیات دیا ہے۔ انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی کے پیچیدہ ترین مسائل کا فطری حل اور عملی زندگی سے متعلق ہزاروں مشکلات کے علاج کے لئے نافع ترین نسخہ موجود ہے۔ لیکن نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ میدان عمل میں مسلمانوں نے قرآن کے مانند، نہج البلاغہ کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے اغیار کی طرف دست گدائی بڑھایا اور ایسے معاشرے کے مسائل کا حل جن کے افراد قرآن اور نہج البلاغہ کے روح پرور آیات اور خطبات سے مانوس اور اس کا نسخہ ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ قرآن و نہج البلاغہ سے حاصل کرنے کے بجائے ناتجانس قوانین سے لینا چاہا جو مسلمانوں کے درد کا خاتمہ کر

کرنے کے بجائے اضافہ کا باعث ہوتا رہا ہے۔ اس مقام پر مسلمانوں سے مولا علیؑ کی وہ وصیت یاد آرہی ہے جو آپؑ نے قرآن کی اہمیت اور عملی زندگی میں اس کی اہمیت کے بارے میں مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

الله الله فی القرآن لا یسبقکم بالعمل بہ غیرکم

خدارا خدارا قرآن کو نہ بھولیں، ایسا نہ ہو کہ عملی میدان میں اغیار تم سے زیادہ خدائی نسخے سے فائدہ اٹھائیں۔

جن خطرات کی جانب مولیٰ علیؑ نے اشارہ فرمایا ہے۔ آج بعینہ سامنے آچکے ہیں، قرآن کریم نے جو کچھ انسانیت کے لئے باعث رشد و ہدایت قرار دیا ہے آج مسلمانوں نے اسے نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن اغیار اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسی طرح نہج البلاغہ نے مسلمانوں کو سعادت و عزت سرفرازی و سربلندی کے لئے جو ہدایت دی ہیں، مسلمانوں کے بہ نسبت اغیار نے ان پر زیادہ کاربند رہنے کی کوشش کی ہے، مسلمانوں نے قرآن اور نہج البلاغہ کا دامن چھوڑنے کے نتیجے میں خسارہ کے سوا کچھ نہ پایا اور خسر الدنیا والآخرۃ ذالک ھو الخسران المبین کے مصداق قرار پائے۔ اس مقالہ میں کوشش کی جائے گی کہ اس بحر علوم و فنون اور صحیفۂ ہدایت و سعادت یعنی نہج البلاغہ سے وہ نور تلاش کریں، جس کی روشنی میں مسلم معاشرہ عملی زندگی میں پیدا ہونے والے مسائل کا صحیح حل تلاش کر سکے۔ ہماری کوشش ہے کہ نہج البلاغہ کا ایک تحقیقی موضوعاتی مطالعہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں

علم اور عالم نہج البلاغہ کی نظر میں

موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں معیار کی اہمیت اور ضرورت ہے اسی معیار کے پیش نظر سب سے پہلا موضوع "علم" انتخاب ہوا ہے۔ لہٰذا اس مقالے میں علم کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی جائے گی اس سلسلہ میں جن عناوین کو فوقیت حاصل ہے، وہ یہ ہیں:۔

۱۔ علم اور مؤمن ۲۔ فضیلت و منزلت علم ۳۔ علم اور عمل کا باہمی رابطہ
۴۔ علم اور جہل ۵۔ علم اور مال کا موازنہ ۶۔ اقسام علم
۷۔ علم اور تعقل و تفکر ۸۔ علم و حلم ۹۔ اہل علم کی ذمہ داری

۱۰۔ اہل علم و طالبان علم کے لئے راہنما اصول۔

۱۔ علم اور مومن :

علم کی اہمیت نہج البلاغہ کے نقطۂ نظر سے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مولا امیرالمؤمنینؑ کی فرمائشات پر غور کیا جائے جو آپ نے علم و حکمت کی تحصیل کے سلسلے میں اہل ایمان کو ترغیب دلانے کے لئے ارشاد فرمائے ہیں۔ امام عالیمقام اپنے گہربار کلمات قصار میں ارشاد فرماتے ہیں :

الحکمة ضالة المومن فخذ الحکمة ولو من اهل النفاق

(کلمات قصار ۸۰)

حضرتؑ علم و حکمت کو اہل ایمان کی عزیز ترین گمشدہ چیز سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اس تعبیر میں ایک خاص لطافت ہے جس کا احساس ان کلمات گہربار کے عمیق مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں کہ علم و حکمت درحقیقت مومن ہی کی ملکیت ہے۔ اگر مومن اور اہل ایمان کے بجائے اہل کفر و ضلالت کے پاس نظر آئے تو گویا وہ مومن ہی سے کسی طریقے سے چھینی گئی لہٰذا مومن کا فرض اولین ہے کہ اس قیمتی سرمایہ کو جسے مولا امیرالمومنینؑ نے ایک جگہ پر "الحکمة ودائعه کریمة" سے تعبیر فرمایا ہے فوراً واپس لینے کی کوشش کرے۔ حضرت فرماتے ہیں مومن کو چاہئے کہ اپنی اس عزیز تر گمشدہ کو جلد از جلد حاصل کرے اگرچہ یہ حکمت گمشدہ اس وقت اہل نفاق ہی کے پاس کیوں نہ پائی جائے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ جب کسی کی کوئی قیمتی چیز گم ہو جاتی ہے تو وہ کس بے قراری کے ساتھ صبح و شام اس کی تلاش میں رہتا ہے۔ اپنا آرام و آسائش، کھانا، پینا، سب کچھ چھوڑ کر اس گمشدہ کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ جہاں کہیں ملنے کا شائبہ بھی ہوتا ہے وہاں فوراً پہنچ جاتا ہے۔ سردی، گرمی، سفر کی سختیاں مال و دولت کی بربادی سب کچھ تحمل کر لیتا ہے صرف اس لئے کہ کہیں سے اور کسی طرح سے اپنی گمشدہ شئ عزیز کو حاصل کر سکے۔ جب اس گمشدہ چیز کا سراغ مل جاتا ہے تو جہاں اور جس کے پاس بھی ہو لے سے فوراً حاصل کر لیتا ہے پھر یہ نہیں دیکھتا کہ وہ جس کے پاس ہے وہ اہل ایمان ہے یا اہل نفاق، کہاں کا ہے اور کس قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ چیزیں نظر میں نہیں ہوتیں صرف ایک ہی چیز سامنے ہوتی ہے اور وہ اپنی گمشدہ شئ کا حصول ہے۔ جب کے پاس بھی

ہو اس سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ منت و سماجت سے ترغیب و تخویف سے پیار اور محبت سے ہر مناسب طریقہ استعمال کرتا ہے۔ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کی نگاہ میں مومن اور علم کا وہی رشتہ ہے جو کسی فرد کا اپنی عزیز ترین گمشدہ شئی کے ساتھ ہوتا ہے۔ مولا چاہتے ہیں کہ مومنین علم و حکمت کے لئے محنت و جانفشانی سے کام لیں۔ جہاں اور جس کے پاس ملے اسے حاصل کرلیں۔ اس لئے کہ علم و حکمت مومن کا زیور ہے۔ علم و حکمت وراثت کریمہ ہے۔ علم و حکمت گمشدۂ مومن ہے۔ مولا ایک دوسری جگہ پر ارشاد فرماتے ہیں کہ:

خذ الحکمۃ انّی کانت فانّ الحکمۃ تکون فی صدر المنافق فتلجلج فی صدرہ حتی تخرج فتسکن الی صواحبھا فی صدر المومن۔

حکمت جہاں ملے لو حکمت جب منافق کے سینہ میں ہوتی ہے تو بے قرار رہتی ہے یہاں تک کہ منافق کے سینے سے مومن کے سینے میں منتقل ہو جائے اس وقت اسے قرار ملتا ہے۔

مولا علیؑ کے ان کلمات سے واضح ہے کہ آپ علم و حکمت کے کس قدر گہرے تعلق کے قائل ہیں مولا کے ان جملات پر غور کرنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے امام اور پیشوا اپنے پیروکاروں کو علم و حکمت کی دولت سے مالامال ہونے کا کس قدر شوق دلاتے تھے۔ ہم جب خاصان خدا اور ائمہ معصومین ؑ کے کلمات پر غور کرتے ہیں تو یہ نکتہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کبھی طلبُ العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ کی صورت میں تحصیل علم کی طرف ترغیب دلاتے ہیں کبھی "اطلبوا العلم من المھد الی اللحد" کی صورت میں مسلمانوں کو "گہوارۃ تا گور دانش بجو" کی تلقین فرماتے ہیں اور کبھی "اطلبوا العلم ولو بالصین" کا دستور صادر کرکے دنیا کے دور ترین گوشوں تک تحصیل علم کی خاطر سفر کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اسی طرح طالب علم اور عالم کے مراتب و فضائل اور ان کے اجر اخروی کے ذکر اور انسانی معاشرے میں علماء صالح کے مثبت آثار و نتائج کے تذکرہ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو جہل و ظلمت کی تاریک وادیوں سے نکال کر علم و حکمت کے زیور سے آراستہ کرکے ان کو دنیا میں انسانی معاشرے کی ہدایت اور پیشوائی کا خلعت پہنا دیں مگر افسوس آج جب ہم مسلم معاشرے پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خداوند عالم، مرسل اعظمؐ اور ائمہ طاہرینؑ کے ارشادات کو پس پشت

ڈالدینے کے نتیجے میں آج مسلمان زندگی کے ہر شعبہ اور تمام علوم وفنون میں غیروں کے محتاج نظر آتے ہیں جبکہ یہی اسلام تھا جس نے جزیرۃ العرب کے وحشی ترین معاشرے کو تھوڑے ہی عرصے میں علم وحکمت کا گہوارہ بنادیا تھا جبکہ غیر مسلم بالخصوص اہل یورپ جہل وظلمت بھرے معاشروں میں حیراں وسرگرداں تھے اور مسلمانوں کی ترقی وکمالات کو لالچ بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ اہل یورپ مسلمانوں کے افکار اور علوم سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مسلمان دانشوروں کی تالیفات وتصنیفات کو صدیوں تک اپنی بڑی بڑی درس گاہوں میں پڑھاتے رہے، نتیجے میں وہ فرزندانِ اسلام کے افکار عالیہ اور ان کے علوم وفنون کی روشنی میں جہل وظلمت سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور خود مسلمان اسلام کی تعلیمات سے آہستہ آہستہ بیگانہ اور دور ہوتے چلے گئے۔ نتیجے میں ترقی وکمال کے منازل طے کرنے کے بجائے بڑی تیزی کے ساتھ انحطاط وزوال کے شکار ہونے لگے اور آج نتیجہ ہمارے سامنے ہے اگر ہم اسلام اور پیشوایان دین کی تعلیمات اور نصائح پر عمل کرتے ہوئے علم وحکمت کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے اور اپنے اسلاف کی میراث کی امانت داری سے حفاظت کرتے تو آج ہماری منزل بہت آگے ہوتی۔ آج بھی اگر مسلمان کو ہوش آجائے اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کریں علم وحکمت کو اپنی میراث اور عظمت وزینت سمجھ کر اسے حاصل کرنے کی مہم شروع کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان ایک عظیم قوت بن کر دنیا کو اپنی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور نہ کردیں۔

فضیلت ومنزلت علم :

علم ودانش جو انسانی معاشرہ کا سب سے عظیم سرمایہ ہے جس سے انسان کی سعادت دنیوی واخروی وابستہ ہے۔ اسلام نے اس علم کو فضائل وکمالات کے صحیفے میں سر فہرست رکھا ہے۔ جس قدر اسلام نے علم ودانش کی مدحت کی ہے اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب اور آئین میں نہیں مل سکتی اسلام نے علماء اور دانشوروں کو معاشرے میں جو عظمت اور برتری دی ہے، علم کی جو قدر کی ہے، طالب علم اور علماء کے لیے جو فضائل وکمالات بیان کئے ہیں کسی آئین میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مولا امیرالمومنینؑ جو میدان علم ودانش کے یکہ تاز شہسوار ہیں علم کی عظمت ومنزلت کو بیان فرماتے ہوئے یوں

ارشاد فرماتے ہیں:

كل وعاء يضيق بما جعل فيه الا وعاء العلم فانه يتسع به

(کلمات قصار ۲۰۵)

حضرتؑ یہاں علم کا ایک بہت لطیف موازنہ فرماتے ہیں۔ علم کا دوسری چیزوں کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر ظرف اپنے اندر ایک خاص مقدار تک گنجائش رکھتا ہے۔ اس مقدار معین کے بعد ہر ظرف لبریز ہو جاتا ہے اور اس سے زیادہ مقدار کو اپنے اندر سمونے کی گنجائش نہیں رکھتا، یہ فضیلت تو صرف علم ہی کو حاصل ہے کہ کبھی اس کی ظرفیت لبریز نہیں ہوتی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک خاص حد تک علم و دانش حاصل کرنے کے بعد مزید علم کی گنجائش نہ رہ گئی ہو۔ علم و دانش ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اگر بیک وقت کائنات کی پوری مخلوق اس میں تیرنا شروع کرے تب بھی اس کے کناروں کا پتہ نہ چل سکے گا۔

علم کی فضیلت بیان فرماتے ہوئے حضرت ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

قطع العلم عذر المتعللين ، (کلمات قصار ۲۸۴)

علم نے بہانے بازوں کے تمام بہانوں کے دروازے بند کر دیے ہیں اور اپنی ذمہ داری کو پورا نہ کرنے کی صورت میں اہل علم کا کوئی بھی قابل قبول نہ ہوگا۔ حضرت اس فرمائش میں اہل علم کو ان کی ذمہ داریوں کے بارے میں نہایت نازک اور لطیف انداز سے متنبہ فرماتے ہیں۔ ہم سب اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ معاشرے کے مختلف مسائل اور مشکلات چاہے وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اخلاقی ہوں یا سیاسی و معاشی ان کا صحیح اندازہ تعلیم یافتہ طبقہ ہی کر سکتا ہے۔ ان مسائل اور مشکلات کے مختلف پہلوؤں اور ان کے اصل اسباب و علل کا صحیح جائزہ اسی دانشور طبقہ کے امکان میں ہے۔ لہٰذا اگر ان مشکلات و مسائل کا صحیح حل کوئی پیش کر سکتا ہے تو وہ اہل علم و دانش ہی ہو سکتے ہیں اور اسی طبقے سے اس کی توقع بھی کی جا سکتی ہے بلکہ ان کے علمی مدارج کے پیش نظر یہ ان کا اخلاقی و اجتماعی فریضہ ہے کہ اپنے معاشرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر ان کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے میں اپنا پورا کردار ادا کریں اگر انہوں نے اپنے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی یا مختلف تاویلات اور عذر پیش کرنے کی کوشش کی تو ان کا یہ عذر اور درگاہ ایزدی نیز ضمیر کی عدالت میں مقبول نہ ہوگا۔

اگر ایک عام فرد علم و دانش سے بے بہرہ انسان اپنے فرائض کی ادائیگی میں پس و پیش کرے تو شاید اسے نظر انداز کیا جا سکے۔ لیکن اہل علم و دانش کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ فضیلت علم و علماء اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ بوجھ اٹھانے کے لئے آمادہ ہوں۔ اگر آج ہم اپنے معاشرے میں یہ دیکھتے ہیں کہ اہل علم و دانش کما حقہ اپنے فرائض کا احساس نہیں کرتے اور معاشرے کی بنیادی ضروریات اور مشکلات کو نظر انداز کرکے دوسرے چھوٹے موٹے کاموں میں مشغول رہ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا اور اس کو عذر و بہانہ بنا کر بنیادی مسائل کے حل میں حصہ لینے سے کتراتے ہیں یعنی مسلم معاشرے کی ثقافتی و تعلیمی پسماندگی، اخلاقی بدحالی، معاشی استحصال، سیاسی استعمار اور مسلمان معاشرہ پر اغیار کی سیاسی، فوجی، معاشی اور ثقافتی یلغار کو بھول کر صرف ایک دو چھوٹے موٹے مسائل میں اپنے کو مشغول کرکے اور پھر اسی کو عذر و بہانہ بنا کر اپنے حقیقی فرائض کی انجام دہی سے پہلو تہی کرتے ہیں، تو اس قسم کے افراد مولا امیر المومنینؑ کی نظر میں وظیفہ شناس افراد کے زمرہ سے خارج ہیں اور ان کا علم قیامت کے دن ان پر حجت رہے گا۔

اہل علم کی ذمہ داری دوسروں کی نسبت اس وجہ سے بھی زیادہ ہے کہ اہل علم، عالم اور دانشمند ہونے کی وجہ سے فضیلت و کمال کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہیں۔ اس فضیلت و مرتبہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی نسبت بہتر کردار ادا کریں۔ اس لیے کہ ان سے زیادہ توقعات وابستہ ہیں لہٰذا اگر ہم دیکھتے ہیں کہ روایات و احادیث میں اُن علماء کی مذمت کی گئی ہے جو اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں تو درحقیقت اس کی یہی وجہ ہے۔

اہل علم کے لئے جو فضائل و مراتب بیان ہوئے ہیں۔ وہ صرف اسی ادائیگی فرض کی خاطر ہے اسی وجہ سے مولا کا ارشاد ہے:

لا خیر فی علم لا ینفع (وصیت ملی مکتوب ۳۸)

جس علم کا کوئی عملی فائدہ نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔ وہ علم جس سے دوسروں کو فائدہ نہ پہنچے اس کی کوئی فضیلت نہیں۔

علم و عمل کا باہمی رابطہ

دین مقدس اسلام نے جو عظمت و منزلت علم کو دی ہے وہ کسی دوسری چیز کو نصیب نہیں ہوئی ہے اور نہ کسی دوسرے

نظام و آئین نے علم کو اس حد تک قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسلام نے علم کو یہ منزلت بطور مطلق اور ہر صورت میں نہیں بخشی ہے بلکہ شرط یہ ہے کہ علم کے ساتھ عمل بھی ہو اگر علم عمل سے جدا ہو تو نہ صرف یہ کہ وہ علم اسلام کی نظر میں بے وقعت ہے بلکہ ایسے علم اور ایسے اہل علم کی سخت مذمت بھی ہوئی ہے اسی نکتہ کو مزید واضح کرنے کے لئے مولا امیر المؤمنینؑ کے چند ارشادات خاص طور پر قابل غور ہیں۔

حضرت ارشاد فرماتے ہیں :

اوضع العلم ما وقف علی اللسان وارفعہ ما ظهر فی الجوارح والارکان - (کلمات قصار علی علیہ السلام ۹۲ نہج البلاغہ)

ترجمہ :

"پست ترین علم وہ ہے جو صرف زبان کی حد تک محدود ہو اور بلند مرتبہ ترین علم وہ ہے جو عملاً انسان کے اعضاء و جوارح سے ظاہر ہو۔"

مولا امیر المؤمنینؑ کے اس جملے سے بخوبی واضح ہے کہ آپ علم کو مطلق اور غیر مشروط طور پر لائق احترام نہیں سمجھتے بلکہ اس علم کے لئے عظمت کے قائل ہیں جس پر خود صاحب علم عملاً کاربند ہو اور جو صاحب علم میدان عمل میں اپنے علم و دانش پر کاربند نہ ہو اس کے علم کو حضرتؑ نے پست ترین علم قرار دیا ہے۔

حضرتؑ علم و عمل کا باہمی گہرا رابطہ بیان کرتے ہوئے ایک جگہ پر ارشاد فرماتے ہیں کہ :

العلم مقرون بالعمل والعلم یهتف بالعمل فان اجابہ والا ارتحل عنہ (کلمات قصار ۳۶۶)

علم عمل کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ پس جو عالم ہو وہ عمل بھی کرے کیونکہ علم ہمیشہ اپنے ساتھی عمل کو آواز دیتا ہے اگر جواب مثبت ملے تو ٹھیک ہے ورنہ علم بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔

جناب امیر علیہ السلام اپنے اس ارشاد میں علم و عمل کا دائمی رابطہ اور گہرا تعلق بیان فرماتے ہیں۔

حضرت کی نظر میں علم و عمل انسان کے دو بال اور دو پر ہیں کہ ان دونوں کی سلامتی کی صورت میں ہی انسان ترقی و کمال کی منازل طے کر سکتا ہے۔ اگر علم ہو لیکن علم و دانش کے مطابق عمل نہ ہو تو اس علم کا عملی زندگی میں کیا اثر ہو سکتا ہے؟ اس طرح اگر عمل بغیر علم و دانش کے ہو تو یہ نہ فرد

اور نہ معاشرہ کسی کے لئے بھی مفید نہیں ہو سکتا علم سے بہرہ صرف عمل ہی کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے اگر صاحب علم اپنی دانش کو بروئے کار نہ لائے تو نہ خود اس علم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور نہ معاشرے کو اس سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے آج ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سارے اعمال ایسے ہیں جس سے پورے معاشرے کو نقصان پہنچ رہا ہے یہ اعمال یا توان لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں جو علم و دانش کے اندھا دھند عمل کرتے ہیں یا پھر ان کے اعمال ان کے علم و دانش کے بالکل خلاف و متضاد ہوتے ہیں۔ مثلاً شراب نوشی، تمباکو نوشی کے مضرات کو طبیب اور ڈاکٹر حضرات سب سے زیادہ جانتے ہیں لیکن عملاً وہ اس کے مرتکب ہوتے ہیں یا دوسرے اخلاقی امراض جس کو اہل علم جاننے کے باوجود اس میں مبتلا رہتے ہیں تو ایسے علم کا عملی زندگی میں کوئی ثمرہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حضرتؑ ارشاد فرماتے ہیں۔

فانّ العامل بغیر علم کالسائر علیٰ غیر طریق فلا یزیدہ بعدہ عن الطریق الواضح الّا بعداً من حاجتہ۔ والعامل بالعلم کالسّائر علی الطریق الواضح فینظر ناظر اسائر ھوام راجع۔ خطبہ ۱۵۲

جو شخص علم کے بغیر عمل کرتا ہے وہ اس کے مانند ہوتا ہے جو اپنی منزل مقصود تک جانے والے راستے کے بجائے کسی اور راستے پر چل پڑے نتیجے میں وہ جوں جوں آگے بڑھے گا اپنی منزل سے دور ہوتا جائے گا لیکن جو شخص علم کی روشنی میں عمل کرے وہ ایسا ہوتا ہے جو مستقیم اور صاف ستھرے راستے پر منزل کی طرف جارہا ہو لہٰذا یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے یا پیچھے آنا چاہتا ہے۔

حضرتؑ کے ان حکمت بھرے کلمات پر غور کرنے سے علم و عمل کے باہمی پیوند کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہی ہے اور عملاً مشاہدے میں بھی یہی آیا ہے کہ اگر علم و تجربہ کے بغیر کوئی عمل کرنا چاہے تو اس کو کتنی مشکلات اور خسارے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا حضرتؑ کے ان کلمات کی روشنی میں ہر کام، ہر مشن اور ہر عمل کے لئے اس سے متعلق معلومات ضروری تربیت اور تجربہ حتمی طور پر حاصل کرنا چاہیے اگر ہم اپنی قوم و ملت کے لئے کسی بھی میدان میں کوئی بھی کام کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس کام سے متعلق مسائل اور امور میں آگاہ و دانا افراد کی دانش اور تجربے سے فائدہ اٹھائیں۔ بطور مثال اپنی ملت کو ظلم و طاغوت کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانا چاہتے ہیں

تاکہ وہ اپنے حقوق، استقلال اور آزادی کے لئے جد وجہد کرسکے تو اس کے لیے مرحلہ بہ مرحلہ قدم بقدم مضبوط منصوبے صحیح پروگرام علم و تجربے کی روشنی میں آگے بڑھنا ہوگا۔ اگر ہم نے یہ سب چیزیں نظر انداز کیں بلکہ ایک اندھی تحریک شروع کی تو یقیناً ہم حضرت امیر علیہ السلام کی اس فرمائش کے مطابق منزل مقصود تک پہنچنے کے بجائے آہستہ آہستہ منزل سے دور ہوتے جائیں گے اور ایک وقت جب دیکھیں گے تو منزل اور ہمارے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہوگا وقت گزر چکا ہوگا، ہم ہوں گے اور مسائل ومشکلات کا پہاڑ۔

مولا امیر المومنین علیہ السلام اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وان العالم العامل بغير علمه كالجاهل الحائر الذي لا يستفيق من جهله بل الحجة عليه اعظم والحسرة له الزم وهو عند الله الوم {خطبہ ۱۱۰}

وہ عالم جو اپنے علم و دانش کے مطابق عمل نہیں کرتا اور اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا وہ ایسے حیران وسرگردان جاہل کے مانند ہوتا ہے جو کبھی اپنی جہالت سے ہوش میں نہیں آتا ایسے عالم پر خدا کی حجت تمام ہے اور حسرت وپشیمانی اس کے لیے حتمی ہے۔ اور خدا کی بارگاہ میں وہ ملامت کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔

ان کلمات پر ذرا غور کریں کہ مولا کس تاکید سے اہل علم و دانش کو اپنے علم پر عمل کرنے اور اس سے نیک مقاصد کے لیے فائدہ اٹھانے کی تاکید فرماتے ہیں اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے انھیں کس طرح سے سرزنش کرتے ہیں ایسے افراد کو حضرت نے ایسے بے ہوش اور غافل سے تعبیر فرمایا ہے جو کبھی ہوش میں نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم مسلمان اپنے امام کے ان کلمات کو اپنے عمل کے لئے راہنما اصول کے طور پر قبول کریں اور ان کے بتائے ہوئے اصول پر سختی سے کاربند رہنے کا فیصلہ کریں تو مسلمانوں کی پسماندگی اور قافلہ تمدن و ترقی سے عقب ماندگی بہت جلد ختم ہوسکتی ہے۔

حضرت امیر علیہ السلام زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے علم سے فائدہ اٹھانے پر نہایت ہی پرزور الفاظ میں تاکید فرماتے ہیں اسی سلسلے میں حضرت کا یہ ارشاد قابل غور ہے:

یا جابر قوام الدين والدنيا باربعة عالم مستعمل علمه وجاهل لا يستنكف

ان یتعلّم وجواد لایبخل بمعروفہ وفقیر لایبیع آخرتہ بدنیاہ
فاذا ضیّع العالم علمہ استنکف الجاھل ان یتعلّم، واذا بخل
الغنی بمعروفہ باع الفقیر آخرتہ بدنیاہ (کلمات قصار ۳۷۲)

اے جابر! دین و دنیا کی بنیاد چار چیزوں پر ہے اول یہ کہ اہل علم اپنے علم کو استعمال کریں اور اس سے معاشرے کے مسائل اور مشکلات کے لیے فائدہ اٹھائیں دوسرے یہ کہ معاشرے میں موجود ناخواندہ طبقہ جہل اور ناخواندگی جیسے کمزوری کو دور کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔ تیسرے یہ کہ سخاوتمند اور مالدار حضرات بذل و بخشش میں بخل سے کام نہ لیں چوتھے یہ کہ فقیر اور غریب طبقہ مال و منازل دنیا تک پہنچنے کے لئے ایسے اعمال سے پرہیز کرے جس سے ان کی آخرت خراب ہو سکتی ہے۔

حضرتؑ نے دین و دنیا کی بنیاد چار چیزیں قرار دی ہیں جن میں سب سے پہلے وہ عالم ہے جو اپنے علم کو بروئے کار لائے اور اس سے فائدہ اٹھائے اگر ایسا نہ کرے تو بہت سارے نقصانات کے علاوہ ایک بڑا نقصان یہ ہوگا کہ معاشرے میں جہل وناخواندگی کا مرض پھیل جائے گا اور لوگ علم و معرفت کی نعمت سے محروم ہو جائیں گے۔

مولا امیرالمومنین علیہ السلام کے ساتھ عمل کا ہونا نہ صرف ضروری سمجھتے ہیں بلکہ عمل کے بغیر علم کو بے فائدہ اور بے ثمر سمجھتے ہیں:

الداعی بلا عمل کالرّامی بلا وتر
(کلمات قصار ۳۳۷)

جو شخص خود عمل نہیں کرتا لیکن دوسروں کو عمل کی دعوت دیتا ہے وہ ایسا ہے جیسے کوئی بغیر تیر کے نشانہ مارنا چاہتا ہو۔

حضرت کے ان ارشادات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی نظر میں علم و عمل کے اشتراک ہی سے معاشرے کی تقدیر بدل سکتی ہے ورنہ صرف علم و دانش انسانی مسائل کے حل میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتی۔

انشاء اللہ ہم مسلمان اپنے مولا کے ان ارشادات پر پیش از پیش توجہ دیں، ایک طرف سے

علمی میدان میں ترقی اور مسلمانوں کی علمی پسماندگی کو ختم کرنے کے منصوبے بنائیں دوسری طرف سے اپنے علم و دانش سے معاشرے کے مسائل کے حل کے لئے صحیح فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں تاکہ ہم حضرت کی اس ملامت اور سرزنش کے مستحق نہ ٹھہریں جہاں آپ فرماتے ہیں کہ:

جاھلکم مزداد وعالمکم مسوف" کہ تم کیسے لوگ ہو کہ تمہارا جاہل اور نادان طبقہ "عمل بغیر علم" میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے اور تم میں جو دانشور و عالم ہیں وہ عمل سے لاتعلق اور بیگانہ ہیں۔

(کلمات قصار / ۲۸۳)

یدجلال الدین مدنی
ستر باذ

اسلامی جمہوریہ ایران میں بنیادی حقوق

یران میں دستور اساسی کی مختصر تاریخ

یں تبدیلیوں پر ایک نظر :

ت دستور اساسی کے کلّیات اور مقدمات سے متعلق ہے۔ چونکہ متن قانون کو سمجھنے کے لئے ان
ں کی مختصر تاریخ جاننا ضروری ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایران میں ایک طویل مدت تک شاہوں
ا اور ملک کا نظم ونسق ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے چلتا رہا۔ چونکہ عوام پر مذہب کا گہرا اثر تھا لہٰذا شاہ نے
رید مضبوط کرنے کے لئے "ظل اللہ" کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ ہر چیز شاہ اور اس کے امیروں،
الم و ستمگار حکام کے ہاتھ میں تھی، جو طاقت کے بل بوتے پر معاشرے پر مسلط تھے، لوگ
مائیں دینے کے لئے جیتے تھے، کیونکہ اس کی رعیت تھے۔ شاہ اور اس کے اعوان وانصار
کتنے ہی احمقانہ کیوں نہ ہوں ان کا نافذ ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ وہی لوگ عوام اور ملک کے
ملکیوں کا اثر و رسوخ بھی ان ظالموں کی تائید کرتا تھا۔ اور یہی چیز قوم کی ذلت و خواری
بڑا سبب تھی۔ جس وقت دوسری قومیں تیزی سے ترقی کر رہی تھیں، ایران اسی تیزی
ی کی طرف جا رہا تھا، طاقتور غیر ملکی اس ملک میں کبھی تو ایسے امتیازات حاصل کر لیتے جو ملک
، شرمناک ہوتے۔

وطہ سے ۱۵ سال قبل ۱۳۰۹ھ ش میں ایران کی مسلم قوم، علمائے کرام خاص کر مرجع شیعیان

میرزائے شیرازی کی قیادت میں اپنی پہلی آزمائش میں پوری اتری اور تمباکو تحریک نامی جدوجہد کا آغاز کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

اس تحریک کے بعد انگریز سامراج نے عوام کو آمادہ کرنے کے سلسلے میں مذہب اور علماء کی طاقت کا اندازہ لگالیا چنانچہ اس عوامی تحریک میں سامراج اور استبداد کی پسپائی تحریک مشروطیت کے لئے زمینہ ساز بن گئی۔ اس محدود کامیابی کے برسوں بعد عوام ایک مرتبہ پھر بیدار ہوئے، ان میں اتحاد پیدا ہوا اور اسلامی تعلقات مستحکم ہوئے۔ کچھ لوگ مغرب سے متاثر ہو کر اس کے فریفتہ ہوگئے، ادھر آہستہ آہستہ بادشاہوں کے مظالم و جرائم واضح تر ہوتے گئے غیر ملکیوں کے اثر و رسوخ اور ان کی مداخلت کا خطرہ سبھی لوگ محسوس کرنے لگے۔ حکام کے ظلم و ستم میں اضافہ ہوتا رہا، عوام میں استقامت و آگاہی بھی بڑھتی گئی سیاسی اجتماعات ہونے لگے، مساجد کی سیاسی اور اجتماعی رونق میں اضافہ ہوا اسلام ایک بار پھر عوامی تحریک اور ان کی جدّ و جہد کی بنیاد کی حیثیت سے ابھرا اور انقلاب مشروطہ کامیابی سے ہمکنار رہا۔

اس وقت دستور اساسی کی منظوری کی شکل میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ملک پہلی بار آئین و قانون کا مالک ہوا تھا۔ یہ دستور اساسی ۱۲۸۵ھ ش مطابق ۱۳۲۴ ہجری قمری میں استبداد کی شکست کے چھ ماہ بعد مدوّن ہوا لیکن شاہی کی نفی نہیں ہوئی۔ بلکہ اسے باقی رکھا گیا بشرطیکہ شاہ قانون کا پابند رہے۔ دستور اساسی کی تدوین سے پہلے مظفر الدین شاہ کی جانب سے حکم مشروطہ کے صدور کی وجہ سے عوام میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ چونکہ شاہ نے حالات میں ردوبدل کو قبول کرلیا تھا۔ دستور کی تدوین کا کام ایک کمیٹی کے حوالے کیا گیا جس کے ممبران اعیان و اشراف تھے۔ اس زمانے میں پڑھے لکھے افراد ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے بھی بہترین افراد وہی مانے جاتے تھے جو "یورپ پلٹ" ہوتے تھے۔ اسی لئے دستور کی تدوین کے لئے یورپی مصادر کا سہارا لیا گیا۔ بلجیم، فرانس اور بلغارستان کے دستور اساسی کے ترجمے ہوئے اور ان ہی کو رہنما قرار دیا گیا۔

پہلی مرتبہ دستور اساسی اکیاون دفعات پر مشتمل مرتب ہوا جو مجلس کے افتتاح کے ۱۲ روز بعد وزیر اعظم کے ذریعے مجلس شورای ملی میں منظوری کی خاطر پیش ہوا۔ جہاں پہلی مرتبہ فکروں کا ٹکراؤ ہوا، چونکہ مسودۂ قانون تہیہ کرنے والے مغرب اور اس کے قوانین کے دلدادہ تھے۔ جبکہ دور اول میں مجلس کی نمایندوں کی اکثریت علماء اور عوامی نمایندوں پر مشتمل تھی۔ جو اسلام کی طرف زیادہ رغبت

رکھتے تھے۔ اسی لئے نمایندگان مجلس حکومت کی تجویزوں کو دستور اساسی کی حیثیت سے کافی نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس میں اصلاح کی۔ شاید اس وقت ان کی حیثیت ایسی نہ تھی یا متوجہ نہ تھے یا ممکن نہ تھا کہ حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتے۔ ایسے میں حکومت و دربار اور مجلس کے درمیان بعض مسائل میں اختلافات ظاہر ہوئے چونکہ مجلس دستور کی تدوین کو اپنا حق سمجھتی تھی (اس زمانے میں دستور اساسی کو نظام نامہ کہا جاتا تھا)۔ ان اختلافات کو حل کرنے کے لیے حکومت اور پارلیمنٹ کے پانچ منتخب ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اس طرح پہلے دستور اساسی کا پہلا قابل قبول مسودہ شاہ کے دستخط کے لیے دربار میں بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں دستور اساسی کی منظوری کے سلسلے میں سب سے اہم کام شاہ کا دستخط کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا یا ناممکن تھا۔ پھر بھی دستور اساسی کا متن ناقص تھا۔ بہت سے مسائل کے بارے میں سوچا نہیں گیا تھا۔ اسی لئے ایک دوسرے متن کو متمم (تکملہ) دستور اساسی کی حیثیت سے تیار کرنے کا فیصلہ ہوا جو آٹھ مہینوں میں مکمل ہوا۔ اسمیں بھی مغرب کی تقلید نمایاں تھی۔ اس طرح دور مشروطیت کے دستور اساسی کے متمم کا مسودہ ۱۰۷ دفعات پر مشتمل تیار ہوا۔ جو مورخہ ۲۹ ماہ شعبان سنہ ۱۳۲۵ قمری (۱۵ میزان ۱۲۸۶) کو محمد علی شاہ کے دستخط سے نافذ ہوگیا۔ مشروطیت کے دستور اور اس کے متمم کی عمر ۷۵ سال سے زیادہ نہ ہوسکی بسنہ ۱۳۵۷ء میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ لیکن اس عرصے میں کئی بار شاہ کی طاقت میں اضافہ کے لیے اسمیں تبدیلیاں کی گئیں۔

سنہ ۱۳۰۴ میں پہلی مرتبہ پہلی مجلس موسسان کے ذریعہ متمم قانون اساسی کے دفعات ۳۶، ۳۷ اور ۳۸ بدل دیے گئے اس طرح رضا خان حکومت پر قابض ہوا اور پہلوی خاندان قاچار خاندان کا جانشین ہوا اور حکومت رضا خان کے خاندان میں موروثی قرار پائی۔ بسنہ ۱۳۱۰ھ قمری میں ایک وضاحت کے ذریعے قانون اساسی کے دفعہ ۸۱، ۸۲ میں عدلیہ کو دی گئی آزادی مخدوش کردی گئی۔ اگر اصولی طور پر دیکھا جائے تو رضا خان کی حکومت میں افراد کی بنیادی آزادی سلب ہوگئی تھی۔ اگر مجلس شورا یا عدلیہ کا وجود تھا تو وہ ظالم اور غیر ذمہ دار حکومت کی خدمت کے لیے تھا۔ ظاہر ہے ایسے دور میں دستور بے معنی تھا۔ قانون کے دفعات ظالم و جابر حاکموں کے ہاتھوں میں موم کی حیثیت رکھتے تھے چنانچہ قانون کے دفعات کی حسب دلخواہ تغیر و تشریح ہوتی تھی ایسی تشریحوں کا ایک قابل توجہ نمونہ "ایرانی الاصل" ہونے سے متعلق ہے۔

دستور اساسی میں یہ بات موجود تھی کہ ولیعہد کی ماں ایرانی الاصل ہونی چاہیئے اور قاچار خاندان

کی نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن جب ۱۳۱۸ میں مصر کے شاہ فاروق کی بہن فوزیہ کو ولی عہد محمد رضا کے عقد میں لانا چاہا تو بڑی آسانی کے ساتھ مجلس شوریٰ نے یہ تشریح کردی کہ "ایرانی الاصل ہونا عام ہے چاہے وہ شخص ذاتاً ایرانی ہو یا فرمان ہمایونی کے تحت مجلس کی طرف سے کسی کو ایرانی الاصل ہونے کی صفت عطا کردی جائے" اس تشریح کی روشنی میں دنیا میں ہر کوئی ایرانی الاصل ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ملک کے دستور کا یوں مذاق اڑتا ہو، وہاں کے عوام کس مصیبت میں ہوں گے۔

شہریور ۱۳۲۰ھ ش کے بعد کئی سال تک ڈکٹیٹر شپ کے خاتمے، ایران پر اتحادیوں کے فوجی تسلط اور دوسری جنگ عظیم کے حالات کے باعث کبھی کبھی قانون اساسی کے حوالے دیئے جانے لگے۔ اور عوام کسی حد تک گھٹن کے ماحول سے باہر نکل آئے اور دستور اساسی کا سہارا لینے لگے۔ یہ صورت حال برطانوی سامراج کے خلاف ایک تبدیلی کا باعث بنی جس سے قومی تحریک زور پکڑ گئی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے بیرونی اثر و رسوخ نے شاہی دربار کو دوبارہ شہریور ۱۳۲۰ھ ش سے پہلے کی حالت میں لوٹانے کی کوشش شروع کردی۔ اساسی بنیاد پر دوسری مرتبہ "مجلس موسسان" کی تشکیل عمل میں آئی۔ چنانچہ ۱۳۲۸ھ ش میں مجلس موسسان کی تشکیل کے ذریعہ سلطنت کو طاقتور اور عوامی حقوق کو کمزور بنانے کی خاطر دستور اساسی میں تبدیلی عمل میں لائی گئی۔ اور دستور اساسی میں ترمیم کے سلسلہ میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ یہ طے پایا کہ دستور اساسی کے دفعات (۴، ۵، ۶، ۷، ۸) اور متمم قانون اساسی کی دفعہ ۴۹ پر ایوان بالا وزیریں کے ارکان کے مشترکہ اجلاس میں نظر ثانی کی جائے گی۔ یہ تبدیلیاں ۱۳۲۹ھ ش میں انجام پانے والی تھیں۔ لیکن اس وقت تک قومی تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ اور حکمرانوں کے لیے ماحول سازگار نہ تھا، لہٰذا یہ عمل رکا رہا۔ یہاں تک کہ اردی بہشت ۱۳۳۶ ہجری شمسی میں مذکورہ تجویز کا سہارا لیتے ہوئے ایک کانگریس تشکیل پائی اور یہ تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔

تیسری مجلس موسسان شہریور ماہ ۱۳۴۶ھ شمسی میں تشکیل ہوئی جبکہ تاج پوشی کے مشہور جشن منائے جانے والے تھے۔ چونکہ اس وقت شاہ اور ولی عہد کی تاج پوشی ہونے والی تھی۔ لہٰذا ملکہ کا بے تاج اور بغیر مقام سلطنت کے رہ جانا افسوس کی بات تھی ملکہ یا شہبانو کا لقب کافی نہ تھا اور چونکہ یہ نظرہ

بھی لاحق تھا کہ اگر شاہ مر جائے اور ولی عہد اس وقت تک سرکاری اعتبار سے حد بلوغ تک نہ پہنچا ہو تو ایسی صورت میں مملکت سربراہ کے بغیر ہو گی لہٰذا ایک مرتبہ پھر مجلس موسسان کے سہارے کی ضرورت پڑی جس نے متمم دستور اساسی کے دفعات ۳۸، ۴۱، اور ۴۲ میں تبدیلی کر دی اور ولی عہد کی ماں کو نائب السلطنۃ کا لقب دے دیا۔ اور قانون اساسی میں عجیب و غریب بار توں کا اضافہ کر کے قانونی اعتبار سے اطمینان حاصل کر لیا کہ مدیوں تک شاہی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا اور ایران ہمیشہ پہلوی خاندان کے ہاتھوں میں باقی رہے گا۔

یہ تھی انقلاب مشروطہ کے بعد دستور اساسی اور اس کے متمم کی سرنوشت۔ اس لحاظ سے ہمارا شمار ان ممالک میں نہیں ہوتا جو دستور اساسی کے سلسلے میں طویل عرصے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ہمارا تجربہ اسی ایک دستور کے بارے میں ہے جبکہ یہ دستور کبھی نافذ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا اور صرف قانون کے کالجوں میں زیر مطالعہ تھا۔ ہم اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ دوران مشروطہ کے بعض وزراء اعظم وزراء اور ممبران مجالس نے شاید ایک دفعہ بھی اس دستور کا مطالعہ نہیں کیا ہوگا اور بنیادی طور پر دستور اساسی کے معنی سے بے خبر تھے۔

دور مشروطہ کا قانون مختلف نظریات پر مشتمل تھا۔ اور ایران کے ماحول سے ہم آہنگ بھی نہ تھا۔ ان اصولوں کے درمیان اتنی مغائرت تھی کہ ایک ساتھ ان پر عمل ممکن نہ تھا۔ اس قانون میں ایک طرف دین اسلام اور مذہب جعفریہ اثنا عشریہ کو زمان حضرت حجۃ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ تک ناقابل تغیر قانونی اصل کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ متمم قانون کے دوسری دفعہ میں آیت اللہ شیخ فضل اللہ نوری کے اصرار پر مجتہدین عظام کو ویٹو کا حق دیا گیا تھا تاکہ کوئی قانون اسلام کے خلاف مجلس میں پاس نہ ہونے پائے۔ وزیروں کے لئے مسلمان ہونے کی شرط رکھی گئی تھی۔ مذہب کی ترویج کرنا شاہ اور ممبران مجلس کے لیے ضروری ذمہ داری قرار دی گئی تھی۔ اقلیتی نمایندوں (کلیمی، عیسائی، زرتشتی) کے سوا بقیہ تمام اراکین مجلس کے لیے دین اسلام پر عمل کرنا لازمی شرط تھی۔ دوسری طرف ایک شخص کو اعلیحضرت کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا تھا جو قوہ مقننہ کا ایک ستون تھا۔ اس کی یوں صراحت کی گئی تھی: (قوہ مقننہ اعلیٰ حضرت، مجلس شورای ملی اور سینٹ پر مشتمل ہوگی۔) اسی طرح شاہنشاہیت کو شاہ کے پاس قوم کی امانت تصور کیا گیا تھا جو نسلاً بعد نسل اس کی اولاد نرینہ میں باقی رہے گی۔ اس کے علاوہ ولیعہدی، انتقال سلطنت اور نائب السلطنۃ کے سلسلے میں

ایسے ہی دفعات موجود تھے۔ یہ دفعات اس طرح مرتب کئے گئے تھے کہ ان کے تحت شاہ یعنی ایک غیر ذمہ دار شخص کو یہ اختیار دیا گیا تھا، کہ وہ مملکت کے جملہ اختیارات کو حق و قانون کی پرواہ کئے بغیر اپنے قبضے میں کرے۔ ساتھ ہی فرانس کے آئین کی اقتداء کرتے ہوئے "ملت ایران کے حقوق" کے عنوان سے بعض دفعات بھی موجود تھے (یہ دفعات متمم قانون اساسی کے دفعہ نمبر ۸ سے ۲۴ تک میں) ان دفعات کے تحت حکومت کی طرف سے عوام کے حقوق کی حفاظت کی تاکید کی گئی تھی۔

دفعات کی ان ناہم آہنگیوں نے مشروطیت کے ۷۲ سالہ دور میں دستور اساسی کو مرکزی حیثیت حاصل نہ ہونے دی اور اس سے استفادہ نہیں کرنے دیا۔ یہاں تک کہ شاہوں کے خاندان کے آخری شاہ "محمد رضا" نے اپنے لیے نئی چیزیں پیش کیں اور ایک منشور مرتب کرکے عوام کو اس کی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ (شاہی نظام، دستور اساسی، شاہ اور عوام کا انقلاب) یہ ایک عجیب بات تھی کہ پہلوی دور کے آخری ایام میں یہ تصور تھا کہ نفاذ دستور اساسی پر صلح کر لی جائے کچھ لوگ واحد علاج یہ سمجھتے تھے کہ ولی عہد اسی دستور اساسی کے تحت صرف سلطنت سنبھالے اور حکومت سے سروکار نہ رکھے۔ بہت سے افراد اور گروہ دانستہ یا نادانستہ طور پر اس نظریے کو قبول کر رہے تھے لیکن امام اور ان کے سمجھدار پیروکاروں نے اس نظریے کے خلاف جدوجہد جاری رکھی یہاں تک کہ اسلامی انقلاب کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ انہوں نے بنیادوں کو بالکل نئی نہج پر استوار کیا۔ جن کا نچوڑ یہ دستور اساسی ہے جو ہماری بحث کا موضوع ہے۔

دستور اساسی کی منظوری کے مراحل

حکومت کے نام کی تجویز:

اسلامی جمہوریۂ ایران کے دستور اساسی نے تدوین سے منظوری تک کن مراحل کو طے کیا ہے؟

انقلاب اسلامی کی کامیابی کے پچاس دنوں کے بعد قوم سے پہلا استصواب رائے عمل میں آیا ۱۲ فروردین ۱۳۵۸ھ ش (یکم اپریل ۱۹۷۹ء) کو شہنشاہیت کے خاتمے کے بعد پہلی مرتبہ ایران کے مسلم عوام آئندہ حکومت کا ڈھانچہ معین کرنے کے لئے پولینگ میں شرکت کر رہے تھے۔ درحقیقت یہ عمل

تاریخ ایران میں پہلی مرتبہ انجام پا رہا تھا۔

مورخہ ۶ فروردین ۱۳۵۸ھ ش (۲۶ مارچ ۱۹۷۹ء) کو ووٹروں کی عمر سے متعلق شورای انقلاب نے ایک قانون پاس کیا، جس کے تحت ووٹروں کی کم سے کم عمر ۱۶ سال قرار دی گئی تھی۔ اس فیصلے سے انتخابات میں شرکت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ ووٹروں کی تعداد تقریباً ۲ کروڑ ایرانی مردوں اور عورتوں تک پہنچ گئی۔

ریفرنڈم :

اسلامی جمہوریہ نظام کے حق میں ۲، ۹۸ فی صد ووٹ پڑے۔ اس طرح ۱۲ فروردین کی تاریخ سرکاری تعطیلات کی فہرست میں شامل ہو گئی، کیونکہ یہ ایسا دن تھا جس میں نئی حکومت نے اپنے قانونی ڈھانچہ کا اعلان کیا تھا۔ ریفرنڈم کا طریقۂ کار یہ تھا کہ عوام سے معلوم کیا گیا تھا کہ آئندہ حکومت کے لئے اسلامی جمہوریت کا نظام منظور ہے یا نہیں؟ ہاں کی صورت میں موافق اور نہیں کی صورت میں مخالف سمجھا جائے گا۔ جو افراد اور گروہ اس قسم کے استصواب رائے کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کی دلیل یہ تھی کہ پہلی بات یہ کہ عوام کو معلوم ہی نہیں کہ اسلامی جمہوریہ کس قسم کی حکومت ہو گی تاکہ اس کے بارے میں رائے دی جا سکے۔ چونکہ پہلے کبھی اس قسم کی حکومت کا تجربہ نہیں تھا۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ممکن ہے ایسے افراد ہوں جو اسلامی جمہوریہ کے علاوہ کسی اور طرز حکومت کے حق میں ہوں، ان کو اپنے اس راستے کا انتخاب کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس سرزمین پر دین اسلام غیر معروف نہیں اور صدیوں سے عدل اسلامی کی حکومت کے قیام کے لیے شیعہ جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ اور دوسری قسم کی حکومتوں کو ظلم و استبداد کی حکومت جانتے رہے ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی جدوجہد اور مبارزہ کرے لیکن اس کے مقاصد سے بے خبر ہو۔ بہرحال اسلام اور اس کے مقاصد کے بارے میں قوم کی آگاہی دوسری تمام قسم کی حکومتوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

دوسرے اعتراض کا یہ جواب ہے کہ اولاً اسلامی جمہوریہ کے خلاف رائے دینے والوں کی تعداد کسی شمار و قطار میں نہیں۔ چنانچہ دوران انقلاب کے نعروں میں جو چیز چھائی ہوئی تھی وہ اسلامی جمہوریت کا نام تھا، کسی اور طرز حکومت کا نہیں۔ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ کے خلاف رائے دینے کا مطلب دوسری قسم کی جمہوریتوں کی حمایت ہے، اس طرح اگر زیادہ ووٹ پڑے تو ایک دوسرے ریفرنڈم کی ضرورت ہو گی۔ بہرحال اسلامی جمہوریہ کی مخالفت سے ہرگز شہنشاہیت کی تائید مراد نہیں

لی جا سکتی، لیکن مخالفین جن کے اخبارات و رسائل بھی زیادہ تھے۔ اختلافات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے اور مختلف نام مثلاً جمہوریہ ڈیموکریٹک، عوامی جمہوریہ یا صرف جمہوریہ یعنی لفظ اسلامی کے بغیر پیش کرتے تھے۔ مخالفین کے شدید پروپیگنڈے کے باوجود کلمہ "اسلامی" کے بارے میں امام امت کے دوٹوک اور واضح ارشادات انقلاب کے دوران موجود ہیں جن کا تذکرہ یہاں اس لئے ضروری ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ گذشتہ لمحات کیسے گذرے ہیں، اور دستورِ اساسی کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ نیز یہ کہ قدم قدم پر امام خمینی نے اسلام کی کس طرح حفاظت کی ہے۔ چنانچہ خرداد ماہ کی دوسری تاریخ ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۳ مئی ۱۹۷۹ء کو دانشکدہ ادبیات اہواز کے مسلم طلبہ جب امام سے ملاقات کے لئے گئے تو امام امت نے ان سے یوں خطاب فرمایا۔

"جو صرف جمہوریت پسند ہو وہ ہمارا دشمن ہے۔ جو کوئی اسلامی جمہوریہ کے ساتھ ڈیموکریٹک کا اضافہ کرنا چاہے وہ بھی ہمارا دشمن ہے (اس زمانے میں عبوری حکومت کے سربراہ کی یہ تجویز تھی کہ اسلامی جمہوریہ بھی ہونا چاہیئے اور اس کے ساتھ کلمہ ڈیموکریٹک بھی) ڈیموکریٹک جمہوریہ کی مانگ کرنے والے ہمارے دشمن ہیں اس لئے کہ یہ لوگ اسلام کو نہیں چاہتے، ہم نے اسلام کی خاطر خون دیا ہے، ہمارے جوانوں نے اسلام کی خاطر خون دیا ہے۔ جوانو! کیا آپ اس لئے یہاں تشریف لائے ہیں کہ ڈیموکریٹ شخص سے ملاقات کریں، کسی امریکا نواز سے ملیں۔ روس کے کسی طرفدار سے ملاقات کریں۔ یا آپ اس لئے تشریف لائے ہیں کہ ایک مسلمان سے ملاقات کریں۔ ایک ایسے شخص کو دیکھیں جو اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ کسی روسی یا برطانوی سے ملاقات کے لئے آپ لوگوں نے اتنی زحمتیں اٹھائی ہیں یا ایک مسلمان سے ملنے کے لئے تکلیفات برداشت کی ہیں؟ جو لوگ یہ نعرے لگا رہے ہیں کہ ڈیموکریسی ہونی چاہیئے وہ غلطی پر ہیں۔ یہ لوگ جو اسلام کا نام نہیں لیتے اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام کا نام نہ آنے پائے وہ اپنی زندگی میں بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی نہیں پڑھنا چاہتے (اس زمانے میں کچھ لوگ مصدق کے حامی تھے اور ان کی یہ کوشش تھی کہ اسے بڑھا چڑھا کر پیش کر کے انحراف کے لئے راستہ ہموار کریں اور قیادت کے عہدے کے لیے خود کو مصدق کا جانشین بنا کر پیش کریں۔ ایسے افراد کی بھی کمی نہ تھی جو عہدہ و مقام اور سیاسی شخصیت بننے کے منتظر تھے۔ اسی لئے ہر روز بیانات دیا کرتے تھے۔ لہٰذا امام خمینی اپنی اسی تقریر میں فرماتے ہیں) یہ لوگ اسلام نہیں چاہتے بلکہ اپنے مقاصد پر، جو ہمارے مقاصد کے برعکس ہیں، پردہ ڈالنے کے لئے ایک ایسے شخص کا نام لیتے ہیں جو قوم پرست

تھا۔۔ہماری تحریک صرف تیل کے لئے نہیں ہے، یہ صرف تیل کی صنعت کو قومیانے کی تحریک نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی ہے۔ ہم فقط اسلام کے خواہاں ہیں۔ جب اسلام آجائے تو تیل بھی اس کی ملکیت میں ہوگا۔ مقصد صرف تیل نہیں، اگر کسی ایک شخص نے تیل کو قومیالیا ہے (ان لوگوں کا دعویٰ تھا کہ مصدق نے تیل کو قومیایا ہے، ۲۵ سال تک اس کا پروپیگنڈا کیا گیا تھا، کتابیں لکھی گئی تھیں، پیرس میں امام کے ساتھ ہو لینے والے افراد انہی لوگوں میں شمار ہوتے تھے) تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسلام سے دست بردار ہو جائیں کیونکہ انھوں نے تیل کو قومیالیا ہے (امام لفظ "اگر" کا استعمال اس جملے میں بہت سوچ سمجھ کر کر رہے ہیں، چونکہ اچھی طرح جانتے تھے کہ تیل کو قومیانے کے حالات کیا تھے اور مصدق نے اس میں کیا کردار ادا کیا تھا) اپنے دشمنوں کو پہچان لیں۔ ہم سازش کو ناکام بنا دیں گے۔ میں ملت مسلمہ پر اپنی حجت تمام کر رہا ہوں۔"

ایسے زمانے میں امام نے یہ ارشادات فرمائے جب عبوری حکومت شروع میں کئے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کی مرتکب ہو چکی تھی۔ اور ملک کے بہت سے اہم عہدے ایسے گروہوں اور افراد کے سپرد کر چکی تھی جو اسلام کے بہی خواہ نہ تھے اور وہ لوگ اسلامی انقلاب کے طفیل میں ملنے والے عہدوں کی آڑ میں اسلام اور انقلاب کی جڑوں کو کاٹ رہے تھے اور تمام سعی و کوشش نیز پروپیگنڈوں کو اپنے سیاسی افکار اور مسموم عزائم کے لئے کام میں لا رہے تھے۔ یہاں تک کہ امام امت مدظلہ کی اسی تقریر کو بھی سنسر کر دیا (بعض حصے حذف کر دئے گئے) لیکن ان ہی حرکتوں نے عوامی قوت کو امور حکومت میں خفیہ ہاتھوں کے وجود سے آگاہ اور اس کے مقابلے پر آمادہ کر دیا اور مسلمان عوام کی دلی آرزوؤں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے امام امت کی تاکید و اصرار دوسرے خیالات و افکار پر غالب آگیا۔

دستور اساسی کی تدوین کے لئے مجلس کا اہتمام اور رہبریت کا کردار:

اسلامی جمہوریہ کا ٹائٹل منظور ہو چکا۔ یہ وہی نام تھا جو لاکھوں افراد پر مشتمل جلوسوں میں دہرایا جا رہا تھا۔ اب اسلامی جمہوریہ کو ایک منظم و مدون ڈھانچے کی ضرورت تھی، بنیادی قوانین مرتب ہونے تھے تاکہ منظوری کے بعد نافذ ہو سکیں اور ارباب حکومت دستور اساسی کے سایہ میں نظم و نسق چلانے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

دستور اساسی کی تدوین بہت مشکل کام تھا۔ امام امت کا نظریہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے جلد سے جلد ملک کے

حالات معمول پر آجائیں تاکہ انقلاب تعمیر و ترقی کی جانب اپنا اصلی راستہ طے کر سکے۔ مستقبل کے قوانین دستور اساسی کے مطابق مرتب ہو جائیں اور انقلاب کے بعد قوانین کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے تذبذب کا خاتمہ ہو۔ یہ سارے امور دستور اساسی کی منظوری سے وابستہ تھے۔ لیکن امام امت کی روش کے مقابلے میں جو پورے ملک کا شیوہ یہ تھا بعض دوسرے افکار بھی موجود تھے۔ بعض لوگ کچھ ایسے ممالک کے دستور اساسی کا نام لے رہے تھے جو ایران کے ماحول سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے تھے اور وہ حکومتیں اسلامی جمہوریہ ایران سے کوئی مشابہت نہ رکھتی تھیں۔
کچھ لوگ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اگرچہ ریفرنڈم میں اسلامی جمہوریہ کا نام منظور ہو چکا ہے لیکن اس کا عمل اسلامی نہ ہونا چاہئے۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ اسلامی ہونے کے بعد دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات مشکل ہو جائیں گے۔ لیکن امام امت کے پیروکار، اسلام، اسلامی حکومت اور اسلامی قواعد و ضوابط کی پوری قوت کے ساتھ حمایت کر رہے تھے۔
فروردین ۱۳۵۸ھ ش مطابق اپریل ۱۹۷۹ء میں ریفرنڈم کے بعد سے مرداد ماہ کے آخر (اگست) میں مجلس خبرگان کے افتتاح تک یہی بحث رہی کہ دستور اساسی کس طرح کا ہونا چاہئے؟ کیا یہ مناسب نہیں کہ حکومت کوئی مسودہ تیار کرے اور اس پر ریفرنڈم کرایا جائے۔ کیا دستور اساسی کی تدوین کے لیے مجلس موسسان مناسب نہیں؟ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ دستور اساسی کی تدوین میں تمام گروہ شریک ہوں؟ کیا یہ بہتر نہیں کہ مجلس موسسان کے ممبروں کی تعداد ایک لاکھ افراد پر ایک نمائندہ کے حساب سے ہو۔ یا ہر شہر سے دو ممبر لئے جائیں (وغیرہ)
کچھ لوگ جو انقلاب کے بعد کی فضا کو اپنے لئے ناسازگار سمجھتے تھے۔ وہ لوگ جنھیں ایک اسلامی حکومت کی توقع نہ تھی وہ لوگ جو آزادی کو آزادی مطلق کے معنوں میں لیتے تھے ایسے لوگوں سے مل گئے جو انقلاب سے نقصان اٹھا چکے تھے اور ان دنوں ایسی حرکتیں ان لوگوں سے سرزد ہوئیں جو ملت کے اتحاد کو مزید مستحکم بنانے کا باعث ہوئیں۔ ایسے میں مرداد ماہ کی تیسری تاریخ مطابق ۲۵ جولائی کو امام امت مدظلہ نے قم میں ملاقات کے لئے آنے والوں کے اجتماع میں مجلس خبرگان کے انتخابات کے بارے میں فرمایا:
"شیطانی منصوبے سرگرم عمل ہیں۔ ہمیں زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال نہ کریں کہ ہم نے اس دیوار کو گرا دیا ہے اور کام ختم ہو گیا ہے۔ یہ لوگ پھر سے آمادہ ہو رہے ہیں۔ ایسے افراد اور گروہ جو آپس میں کبھی دوست نہ تھے۔ جن کے درمیان کوئی رابطہ نہ تھا اب آپس میں مل چکے ہیں۔ آپ لوگ اخبارات کا مطالعہ کریں اور ہوشیار رہیں، کہ آپ کے نمایندے اسلامی ہوں۔ ہم ایک اسلامی ملک کی تشکیل چاہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا قانون بھی اسلامی ہونا چاہئے۔ چنانچہ جن لوگوں کو دستور اساسی کی تدوین کے لئے معین کر رہے ہیں، ان کو اسلام سے باخبر ہونا چاہئے۔ یہ جو ہمارے جوان سڑکوں پر نکل آئے اور

دشمن پر کامیابی حاصل کرلی اسلامی جذبے کا نتیجہ تھا۔ یہ اسلامی جذبہ تھا جس نے ہمیں کامیاب کیا۔ جب ہم یہاں تک آگے بڑھ چکے ہیں تو کیا اب ہم امریکی قانون بنائیں ـــ؟ یورپی یا مغربی قانون بنائیں؟ اور اپنے جوانوں کا خون ضائع کریں؟ یہ کام اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ قانون جسے عبوری حکومت نے پیش کیا تھا، صرف مسودہ ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ چنانچہ تجویزیں دیجئے، رائے پیش کیجئے اور اہم بات یہ ہے کہ خبرگان (جو دستور اساسی کی تدوین کے لئے انتخاب ہوں گے) امانت دار اور مسلمان ہوں، شرق و غرب کی طرف مائل نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ مارکسیزم یا اس طرح کے دوسرے نظریات کے زیر اثر ہوں۔ بلکہ احکام اسلام سے پورے طور پر باخبر، امانت دار، دلسوز اور زمانے کے حالات سے آگاہ افراد کا انتخاب کریں تا کہ تحقیق کرکے ایسا قانون مرتب کریں جو پوری طرح اسلامی اور ملت کی آرزوؤں کے مطابق ہو جس کو بعد میں عوام کے سامنے پیش کرکے رائے حاصل کریں تاکہ وہ دستور منظور ہو جائے۔

آپ کو معلوم ہے کہ دستور اساسی کی منظوری کے سلسلے میں کافی بحثیں موجود تھیں، ہر دستہ و گروہ نیز افراد نے اپنی اپنی تجویزیں پیش کی تھیں۔ اس طرح اس مجلس کی تشکیل کے بارے میں جو ان تجاویز کا جائزہ لیتی بہت سے نظریات موجود تھے۔ ایک طرف عوام کی عظیم اکثریت کی نگاہیں امام خمینی مدظلہ کے ارشادات پر تھیں چونکہ ان کا یہ خیال تھا، کہ آپ تمام اخبارات و اطلاعات اور تمام اختلافات کی جڑوں سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے آپ جو رائے دیتے ہیں وہ ان واقعات کے تمام پہلوؤں کے پیش نظر ہوتی ہے۔ امام خمینی کشتی کے ناخدا ہیں اور جس طرح آپ نے انقلاب کی راہنمائی فرمائی ہے۔ اسی طرح قانون اساسی کی ترتیب و تدوین کے بارے میں بھی بہتر رائے دے سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ حکومت میں عہدوں کے خواہاں تھے، یا جو لوگ قانون اساسی کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے تھے۔ نیز وہ لوگ جو عوام کی واضح اکثریت کے مفادات اور اپنے ذاتی مفادات کی راہوں کو جدا تصور کرتے تھے اور اسلام سے بھی خوش نہ تھے۔ چونکہ وہ لوگ اسلام کی پابندیوں کو عصر حاضر کے تمدن کے منافی سمجھتے تھے۔ لہٰذا اعتراضات کر رہے تھے۔ عوام کی مرضی اور خواہشات کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنالیا تھا اور نام لئے بغیر امام خمینی کے ہر فرمان پر اعتراض کیا کرتے تھے امام مدظلہ کے واضح، دو ٹوک اور محکم جملوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے ایسے جملوں کو نقل کرتے تھے جن سے ناجائز استفادہ کا امکان تھا اور خود کو امام کا پیرو کار ظاہر کرتے ہوئے اپنے مطالب بیان کرتے تھے، یہ طریقہ اس دور میں کافی دیکھنے میں آتا تھا۔ امام امت کی تصویروں کی آڑ میں افکار امام خمینی مدظلہ کے خلاف

استدلال کیا کرتے تھے۔ یہ مکاری عوام کو دھوکہ دینے کے لئے کی جاتی تھی۔ ایسے گروہوں کا رویہ جن میں سے بعض کے ساتھ "اسلامی" کا نام تک بھی لگا ہوا تھا۔ امام کی گہری نظروں سے پوشیدہ نہیں تھا۔ چنانچہ متعدد بار آپ نے ان کا انکشاف فرمایا۔ جب عبوری حکومت کی طرف سے دستور اساسی کا مسودہ شائع ہوا تو یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ اس کو امام امت منظور کر چکے ہیں تاکہ یہ کام ختم شدہ متصور ہو۔ یہ ظاہر کیا جا رہا تھا۔ کہ مجلس خبرگان کی تشکیل سے حکومت کا مقصد صرف دکھاوا ہے، حکومت ایسی مجلس چاہتی تھی جو چند جلسوں میں دستور اساسی کے مسودے کی تائید کر دے۔ اگر اس مسودے میں کوئی رد و بدل بھی کرنا ہو تو چند عبارتوں کی اصلاح اور چند ایک الفاظ کی تبدیلی سے تجاوز نہ کرے۔ عبوری حکومت کو یہ توقع تھی کہ منتخب نمائندے شورای انقلاب کے منظور کردہ قواعد و ضوابط کے تحت معینہ مدت کے اندر اسی مسودہ کو منظور شدہ اعلان کریں گے اور اسی پر ریفرنڈم کرائیں گے۔
جب ہم مسودۂ قانون کی اشاعت کے بعد کے نظریات کا مطالعہ کرتے ہیں، تو یوں لگتا ہے کہ اکثر سیاست دان نام نہاد روشن خیال، ماڈرن افراد، غرض وہ تمام لوگ جو اسلام کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، مسودہ کو پسند کرتے تھے البتہ ہر ایک اپنے گروہ کے مفاد میں کسی خاص اصول پر زیادہ تاکید کرتا تھا۔ لیکن جب ہم امام خمینی مدظلہ کی رائے کو دیکھتے ہیں جس کو عوام کی واضح اکثریت کی حمایت حاصل تھی تو یہ مسئلہ کچھ اور نظر آتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ امام کے نزدیک اس مسودے کی کوئی اہمیت نہیں، بلکہ آپ کھلے الفاظ میں فرماتے ہیں کہ "پیش نویس ہیچ نیست باید طرح بدحید" یعنی اپنے آپ کو اس مسودہ میں مقید نہ کریں۔ اس مسودے کے مقابلے میں ہر اقدام ممکن ہے۔ کام ابھی تمام نہیں ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مسودہ وہ چیز نہیں ہے جسے میں نے منظور کر لیا ہو اور ملت کے لئے مفید ہو۔ یہ مطلب ان دعووں کے خلاف تھا کہ امام نے مسودہ کو صحیح قرار دیا ہے۔ دوسری بات امام نہ شرقی و نہ غربی کی سادہ عبارت پر تاکید فرماتے تھے، اور ایسے قوانین کے خواہاں تھے، جو اسلام پر مشتمل ہو جس کے لئے جدو جہد کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے بھی مسودہ کو رد فرماتے تھے البتہ واضح طور پر رد کرنے کا کام منتخب ماہرین کے ذمے چھوڑتے ہیں جبکہ عوام سے تاکید کرتے ہیں کہ ایسے اسلامی ماہرین کا انتخاب کریں جو زمانے کے حالات سے آگاہ ہوں۔ امام کے ان نظریات سے صاف ظاہر تھا کہ حکومت کی جانب سے پیش کردہ مسودہ کا کیا انجام ہوگا!
تیسری بات یہ کہ امام کا نظریہ تھا کہ ۱۲ فروردین کے "ریفرنڈم" میں ملت ایران نے نظام کی بنیاد کو مشخص کر دیا ہے اب مجلس مؤسسان یا خبرگان کو عوام کے قبول کردہ اصل سے انحراف کا حق نہیں ہے۔ اسلام

ایک ایسا نظام ہے جو انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں خاص قواعد و ضوابط کا حامل ہے، لہٰذا دستور اساسی کو کلی طور پر روح اسلام سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔

مجلس خبرگان کی تشکیل اور انتخابات کے لئے شورای انقلاب سے منظور شدہ "قواعد و ضوابط"

مورخہ ۱۲، ۱۳، فروردین ۱۳۵۸ھ ش (۱، ۲، اپریل ۱۹۷۹ء) کو ریفرنڈم کا اعلان ہوا جس کے مطابق اسلامی جمہوریہ کی موافقت میں ۹۸ عشاریہ ۲ فی صد ووٹ پڑے۔ اس کے بعد مورخہ ۸ مرداد ماہ ۱۳۵۸ھ کو دستور اساسی کی تدوین کے لئے مجلس خبرگان کا افتتاح ہوا۔ اس ساڑھے چار ماہ کے عرصہ میں تمام گروہ اور افراد نے پوری آزادی کے ساتھ دستور اساسی کے بارے میں بحثیں کیں۔ اسی سلسلے میں مختلف سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ بہت سے مضامین چھپے خاص طور پر عبوری حکومت کی جانب سے مسودہ کی اشاعت کے بعد سیکڑوں اصلاحی اور تکمیلی تجویزیں پیش ہوئیں، جن کو قانونی طور پر آخری شکل دینے کے لئے مجلس خبرگان کے افتتاح سے قبل مجلس کا سیکریٹریٹ نظریات کی جمع آوری میں مشغول ہو گیا تاکہ تحقیقات کے دوران کیشنوں میں ان سے استفادہ کیا جا سکے۔

ایسے حالات میں جبکہ ایران کی ہر محفل و مجلس میں یہی بحث جاری تھی کہ دستور اساسی کی تدوین کے لئے مجلس کس طرح کی ہونی چاہئے جو موسم گرما کے اوائل میں مورخہ ۱۴، تیر ماہ ۱۳۵۸ھ ش مطابق ۵ جولائی ۱۹۷۹ء کو اسلامی جمہوریہ ایران کے دستور اساسی کی تدوین کرنے کے لئے مجلس خبرگان کے انتخابات سے متعلق قانون شورای انقلاب نے پاس کر دیا۔ یہ قانون آٹھ فصلوں اور اکتالیس دفعات پر مشتمل تھا جس کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) دستور اساسی کے بارے میں آخری فیصلہ دینے کی ذمہ دار مجلس کا نام "مجلس بررسی نہائی قانون اساسی جمہوری اسلامی ایران ہے"۔ یہ مجلس بعد میں مجلس خبرگان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس مجلس کے ۷۳ ممبر ہوں گے ہر ڈھائی لاکھ افراد کا ایک نمائندہ ہوگا۔ ان کے علاوہ مذہبی اقلیتوں، زرتشتی، کلیمی، مسیحی، آشوری (کلدانی) کی جانب سے ایک ایک نمائندہ لیا جائے گا۔

(۲) مجلس کے ۷۳ ممبروں کا انتخاب نسبی اکثریت سے خفیہ ووٹنگ کے ذریعے براہ راست عمل میں آئے گا

جس میں ہر سولہ سالہ یا اس سے زیادہ عمر کے ایرانی کو شرکت کا حق حاصل ہے۔ البتہ قوائے مسلح، فوج، پولیس اور اسلامی جمہوریہ کی ملیشیا کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔ یہ دوسرا موقعہ تھا جب انتخاب عمومی سطح پر ہو رہا تھا اور پہلے کے مقابلے میں کم عمر کے مرد و زن شریک ہو رہے تھے۔ ووٹنگ ایک دن کے اندر عمل میں آرہی تھی۔ انتخاب ہونے والوں کے لئے ایرانی ہونے کے علاوہ کم سے کم ۳۰ سال عمر اور اپنے حلقہ انتخاب میں معروف، نیز اجتماعی، اقتصادی، سیاسی، جغرافیائی اور علاقائی خصوصیات سے آگاہ اور صاحب بصیرت ہونا لازمی تھا کیونکہ دستور اساسی کے سلسلہ میں اظہار رائے کے لئے ان خصوصیات کی ضرورت تھی۔ مجلس خبرگان کے امیدواروں کے لئے اسلامی جمہوریہ نظام کو قبول کرنا بھی ضروری تھا، کیونکہ پہلے اس نظام سے متعلق ریفرنڈم ہو چکا تھا، اس پر مزید گفتگو کی گنجائش نہ تھی۔

مجلس خبرگان کی ممبری کے لئے مجوزین کے علاوہ دو گروہ منتخب نہیں ہو سکتے تھے۔ پہلا گروہ ان افراد کا تھا جو شاہی دور میں عہدہ و منصب پر قابض ہونے کی وجہ سے قابل اطمینان نہ تھے اور نظریہ یہ تھا کہ یہ لوگ اپنے سابقہ تجربات کی روشنی میں اسلامی جمہوریہ ایران کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ اس لئے مجلس خبرگان کی رکنیت کے لئے امیدوار نہیں بن سکتے۔ یہ افراد ۱۵ خرداد ۱۳۴۲ھ ش مطابق ۵ جون ۱۹۶۳ء سے لیکر ۲۲ بہمن ۱۳۵۷ھ (۱۱ فروری ۱۹۷۹ء) کے درمیانی عرصہ کے وزراء اعظم، وزراء، گورنر حضرات اور ان کے معاونین نیز سابقہ پارلمنٹوں کے اراکین، سفرا اور شاہی حکومت سے قریبی تعلق رکھنے والے تھے۔ پورے ملک میں ان لوگوں کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے بھی کم تھی۔ البتہ ان سب کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ یہاں تک کہ جو لوگ قیدخانوں میں تھے، ان میں سے بعض نے ووٹنگ میں حصہ بھی لیا ہے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو موجودہ ذمہ داریوں کی وجہ سے مجلس خبرگان کی ممبری کے لئے امیدوار نہیں ہو سکتے۔ یہ افراد وزیر اعظم، وزراء، ان کے معاونین، گورنر، کمشنر، جج، پراسیکیوٹر جنرل، میونسپلٹی کے چیرمین، سرکاری اداروں کے اعلیٰ عہدیدار، پولیس، فوج اور ملیشیا کے افسران اپنی ملازمتوں کے حلقے میں امیدوار نہیں بن سکتے۔ مذکورہ افراد میں سے اگر کوئی امیدوار ہونا چاہے تو انتخابات پر نگران کمیٹی کی تشکیل سے قبل اپنے عہدوں سے استعفیٰ دینا ہوگا۔ ان کے علاوہ تمام سرکاری و بلدیاتی ملازمین، نیز سرکاری کمپنیوں اور تنظیموں کے اراکین بھی خبرگان کی ممبری کے لئے امیدوار ہو سکتے تھے۔ ان کے انتخاب کی صورت میں انہیں اپنی ملازمتوں سے استعفیٰ دینا پڑتا۔ مقصد یہ تھا کہ انتخابات میں جانبداری سے کام نہ لیا جائے اور امیدواروں کے عہدے

انتخاب پر اثر انداز نہ ہوں۔ جو لوگ اہم عہدوں پر فائز ہیں وہ اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے ووٹ میں اضافہ نہ کر سکیں۔ اسی لئے یہ شرط تھی کہ اگر کوئی وزیر، جج یا گورنر مجلس خبرگان کا امیدوار ہونا چاہے تو نگران کمیٹی کی تشکیل سے قبل استعفا دینا ضروری ہے اور دوسرے یہ کہ مجلس خبرگان کی ذمہ داری مذکورہ سرکاری عہدوں کے فرائض کے ساتھ یکجا نہیں ہو سکتی۔ گو سرکاری ملازمین اس پوزیشن میں نہ تھے کہ اپنے عہدے کے ذریعہ انتخابات کو متاثر کر سکیں پھر بھی نمائندگی کے فرائض اور ملازمت جس کا تعلق قوہ مجریہ سے ہے۔ یہ دونوں فرائض ایک ساتھ انجام نہیں پا سکتے۔ اسی بنا پر یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ اگر کوئی ملازم منتخب ہو جائے تو عارضی طور پر اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو جائے اور فرائض نمائندگی کو انجام دے۔

شورای انقلاب کے اراکین کو مجلس خبرگان کی رکنیت سے منع نہیں کیا گیا تھا۔ اسی لئے ان میں سے کچھ افراد مجلس خبرگان کے لئے امیدوار ہوئے اور مجلس خبرگان کے رکن کی حیثیت سے منتخب ہو گئے، اور دستور اساسی کی تدوین کا کام مکمل ہونے تک شورای انقلاب کے رکن بھی تھے اور مجلس خبرگان کے ممبر بھی۔ اگرچہ یہ اراکین مجلس خبرگان کے موثر اور اہم ممبر تھے لیکن پھر بھی ان کی تعداد اتنی نہ تھی کہ مجلس خبرگان کو شورای انقلاب سے ہم آہنگ کر سکتے۔ بہرحال اعتراض کرنے والوں اور مجلس خبرگان کے انتخابات میں ناکام رہنے والوں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ شورای انقلاب کے بعض ارکان نے مجلس خبرگان کے انتخابات میں کیونکر شرکت کی۔ اور قانون انتخابات میں ان کو شرکت سے محروم کیوں نہ کیا گیا۔ اس طرح ایک وقت میں یہ دونوں کاموں کو کیونکر ممکن سمجھا گیا؟

(۳) ہم بتا چکے ہیں کہ پانچ لاکھ افراد پر ایک نمائندہ لینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ چونکہ اس تعداد کے لحاظ سے صحیح حلقہ کا تعین ممکن نہ تھا۔ اس لئے ملک کے صوبوں کی آبادی کے لحاظ سے اندازاً ہر صوبے سے ایک سے لے کر دس نمائندوں کا انتخاب کیا گیا۔ چنانچہ صوبہ تہران کی تقریباً ۵،۲۹۷،۳۲ کی آبادی پر دس نمائندے، خراسان اور آذربائیجان شرقی میں سے ہر ایک کی تیس تیس لاکھ سے زیادہ کی آبادی پر چھ چھ نمائندے لینے کا فیصلہ ہوا۔ اسی طرح مازندران کے لئے ۵ نمائندے۔ خوزستان، اصفہان اور فارس کے لئے جن میں سے ہر ایک کی آبادی تقریباً ۲۰ لاکھ سے زیادہ ہے چار چار نمائندے، آذربائیجان غربی، اردبیل اور گیلان دونوں کی آبادی پندرہ پندرہ لاکھ پر مشتمل ہے اسی لئے تین تین نمائندے۔ مرکز، کرمان، کرمانشاہ، باختران، ہمدان، زنجان، لرستان، کردستان، سیستان و بلوچستان میں سے ہر ایک کی آبادی دس لاکھ

کے لگ بھگ ہے۔ کردستان اور سیستان و بلوچستان کا رقبہ وسیع اور جغرافیائی اہمیت کا حامل ہے، اس لئے دو دو نمائندے لینے کا فیصلہ ہوا، سمنان، یزد، ہرمزگان، بوشہر، چہار محال بختیاری، ایلام، بویر احمد و کہکیلویہ کی آبادی شاید ۵ لاکھ سے کم ہے ہر ایک کے لئے ایک ایک نمائندہ، مذہبی اقلیتوں یہودی، عیسائی، زردشتی، آشوری (کلدانی) میں سے ہر ایک کی طرف سے ایک ایک نمائندہ لینے کا فیصلہ ہوا۔

(۴) مجلس خبرگان کے اراکین کا انتخاب وزارت داخلہ کے ذریعے ہیئت اجرائی اور مرکزی نگران انجمن نیز اس انجمن کی شاخ کے توسط سے انجام پائے گا۔

ہیئت اجرائی کمشنر، صوبائی عدالت کے چیف جسٹس، وزارت تعلیم کے ڈائریکٹر، ثبت احوال کے ڈائریکٹر، عائدین شہر اور علماء مجاہدین سے پانچ افراد پر مشتمل ہوگی۔ ان میں سے کوئی فرد اگر دو جلسوں میں غیر حاضر رہے تو اسے مستعفی سمجھا جائے گا اور کمشنر ان کی جگہ پر دوسرے افراد کو منصوب کرے گا۔ ہیئت اجرائی اصلی انجمن کو معین کرے گی۔ اس طرح کہ عوام کے مختلف طبقات میں سے ۳۵ افراد کو بلائے گی جن میں سے دو تہائی اکثریت کی حاضری کے بعد خفیہ ووٹنگ کے ذریعے اکثریت نسبی سے ، افراد نگران انجمن کے حقیقی ارکان کی حیثیت سے اور ۹ افراد کو ریزرو ممبروں کی حیثیت سے انتخاب کیا جائے گا۔

نگران انجمن کی شاخ کو کمشنر، عدالت، تعلیم اور ثبت احوال کے مقامی سربراہوں نیز تین مقامی عائدین و علماء کے تعاون سے تشکیل دے گا۔ اس سلسلے میں انیس مقامی افراد کو دعوت دی جائے گی جن میں سے دو تہائی اکثریت اپنے درمیان سے یا باہر سے پانچ افراد کو انجمن کے حقیقی ارکان کی حیثیت سے اور چھ افراد کو علی البدل رکن کی حیثیت سے انتخاب کیا جائے گا۔ مرکزی اور ضلعی انجمنوں کے ارکان، امیدواروں کے سببی یا نسبی رشتہ دار نہیں ہونے چاہئیں۔ دوسری صورت میں انہیں برطرف کردیا جائے گا۔ نگران انجمنوں کا طریق کار اس طرح معین کیا گیا ہے جس میں تاخیر و تعطیل کی راہیں مسدود کردی گئی ہیں۔ بہر حال چاہے افراد کو تبدیل کرنا پڑے مگر کام جاری رہے۔ علی البدل ارکان اس لئے زیادہ رکھے گئے تھے کہ اصلی ارکان کی غیر حاضری کی صورت میں انکی جگہ خالی نہ رہے۔ یا اگر انجمن کے اکثر اراکین، انجمن میں حاضری کے سلسلے میں پس و پیش کریں یا انتخابات کے بعد اعتبار نامہ دینے سے انکار کریں۔ ایسی صورت میں کمشنر ہیئت اجرائی انتخابات میں مسئلہ پیش کر کے ان کی منظوری کی صورت میں اعضاء علی البدل، ان کی جگہوں پر معین کرے گا۔ اور وہ لوگ انتخابات کے بارے میں فیصلہ دیں گے۔ اگر اعضاء علی البدل بھی حاضر نہ ہوئے تو ہیئت اجرا عائدین میں سے انجمن کو تشکیل دے گی۔

(۵) ووٹنگ اعلان کے بعد عمل میں آئے گی گشتی پولنگ اسٹیشن بھی ہوں گے۔ بیلٹ پیپر کے تین حصے ہوں گے پہلے اور دوسرے حصے میں ووٹر کے کوائف درج ہوں گے جبکہ تیسرے حصے پر پسندیدہ امیدوار کا نام لکھ کر بیلٹ بکس میں ڈالا جائے گا۔ پولنگ سے ایک روز پہلے پروپیگنڈے کی مہم ختم کردی جائے گی۔ ووٹنگ کا طریقہ ، ووٹوں کی کاؤنٹنگ ، انتخابات کا دستور العمل ، ملکی انتخابات کے مرکزی دفتر کے ذریعہ آمادہ اور وزیر داخلہ کی منظوری کے بعد تمام انتخابی حلقوں میں اعلان کیا جائے گا۔

(۶) انتخابات میں کامیاب امیدواروں کا اعتبار نامہ نگراں انجمن کے اراکین اور کمشنر کے دستخطوں سے تین نسخوں میں تیار ہوگا۔ اس پر فوٹو لگانے ، نگران انجمن اور کمشنری کی مہر لگنے کے بعد دو نسخے کامیاب امیدوار کو دئے جائیں گے۔ اعتبار نامہ دئے جانے سے پہلے شکایتوں کی تحقیق کے لئے مدت معین ہوگی۔ ہر شخص انتخابات سے متعلق شکایت کر سکتا ہے اور ہیئت اجرائی شکایات کے سلسلہ میں فیصلہ کرے گی اور شکایات و تحقیقات کی مدت ختم ہونے کے بعد انجمن کے توڑے جانے کا اعلان کردیا جائے گا۔

(۷) مجلس خبرگان کے افتتاح سے متعلق یہ طے کیا گیا تھا کہ وزارت داخلہ مجلس خبرگان کے لئے ایک سکریٹریٹ مہیا کرے تاکہ منتخب نمائندے اپنے اعتبار نامے اس کے حوالے کریں۔ اور دو تہائی اراکین کی تہران میں حاضری اور اعتبار نامے پیش کئے جانے کے بعد مجلس خبرگان کا افتتاح وزیر داخلہ کے اعلان کے بعد عبوری حکومت کے وزیر اعظم کے ہاتھوں ہوگا۔ اور اس مجلس کا طریق کار وزارت داخلہ کے معین کردہ اصول وقواعد کے تحت ہوگا جس کی منظوری شورای انقلاب اسلامی سے حاصل کرنی ہوگی یہ بھی طے پایا تھا کہ دستور اساسی کے سلسلہ میں تحقیق و تنظیم کا کام مجلس کے افتتاح سے ایک ماہ کی مدت میں انجام پانا چاہیئے نیز دستور اساسی کے اصولوں سے متعلق فیصلے اراکین کی دو تہائی اکثریت یعنی پچاس ممبروں کی رائے سے کئے جائیں گے۔

آئندہ صفحات میں آپ دیکھیں گے کہ افتتاح کے بعد مجلس خبرگان نے دوسروں کے منظور کردہ دستور العمل کے دائرے میں خود کو مقید نہیں کیا۔ حکومت کے پیش کردہ مسودے اور ایک ماہ کی مدت کی پابندی سے بھی خود کو الگ رکھا ، اور اپنے طریق کار کے بارے میں خود ہی دستور العمل تیار کیا اور اسی بنیاد پر تدوین و تحقیق کا کام انجام دیا۔

(۸) مذکورہ قانون کی ساتویں فصل "مجلس خبرگان کے انتخاب کا قانون" عدالتی کاروائیوں سے مخصوص تھی ، جسمیں ناجائز فائدہ اٹھانے ، دھاندلی ، جعل سازی اور جعلی کام انجام دینے کی صورت میں

سزائیں تجویز کی گئی تھیں۔ ووٹ کی خرید و فروخت، بیلٹ پیپر پر غلط اندراجات، جعل، ایک مرتبہ سے زیادہ ووٹ دینا، دوسرے کے شناختی کارڈ پر بیلٹ پیپر حاصل کرنا، کسی اور کے نام سے ووٹ دینا، جعلی شناختی کارڈ پر ووٹ دینا یا ووٹنگ کے وقت دھمکی اور لالچ دینا سب کے سب بلکہ ہر طرح کی جعلسازی، خیانت اور دھوکہ جرم سمجھا گیا ہے اور ان کے لئے جرم کے لحاظ سے مختلف سزائیں تجویز ہوئی ہیں۔ جن میں معاشرتی حقوق سے محرومی، (ایک دورہ انتخابات میں ووٹ دینے اور منتخب ہونے سے محرومی) ایکسٹھ روز سے ۳ سال تک کی قید اور پچاس ہزار ریال کا جرمانہ شامل ہے۔ اس طرح اس بات کی صراحت کر دی گئی ہے کہ اگر انتخابات سے متعلق کوئی ذمہ دار شخص یا امیدوار جرم کا مرتکب ہو جائے تو سخت ترین سزائیں دی جائیں گی۔ اس قانون کے آخر میں ایک علیحدہ فصل کے اندر دفعہ ۱۲۴ کے تحت وزارت داخلہ کو انتخابات کے قوانین کے اجرا پر اچھی طرح نگرانی کرنے اور دستور اساسی سے متعلق آخری تحقیقات پر نظر رکھنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔

وزارت داخلہ نے اس قانون کے مطابق انتخابات کرانے اور مجلس کے افتتاح کا انتظام کیا۔ عبوری حکومت کے وزیر اعظم اور وزیر داخلہ نے مجلس کے افتتاح کے موقعہ پر مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے خبرگان کو بعض مشورے دیے۔ لیکن مجلس کی اکثریت انقلابی افراد پر مشتمل تھی اور حکومت کے من پسند رویہ سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اسی لئے مجلس خبرگان کے امور پر نگرانی کی ذمہ داری وزارت داخلہ کے ہاتھ سے نکل گئی۔ البتہ مناسب بھی نہ تھا کہ کوئی مجلس جس کے اراکین عوام کے براہ راست ووٹ سے منتخب ہوئے ہوں وزارت داخلہ کی نگرانی میں کام کرے۔ یہ فطری عمل تھا کہ افتتاح کے بعد پوری آزادی کے ساتھ وزارت داخلہ کی نگرانی سے باہر رہ کر کام کرے۔

توحید ۱٦۷

اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

جلد ۲، شمارہ (۵) محرم و صفر ۱۴۰۷ھ / اکتوبر و نومبر ۱۹۸۶ء

مقاصد

کلمۃ التوحید
و
توحید الکلمہ

قرآن و سنت و سیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔

علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔

اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔

فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔

عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔

بدل اشتراک

ملک	فی مجلد
ایران	۱۵۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ
بنگلادیش	۱۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم
سعودی عرب	۸ ریال
قطر	۸ ریال
کویت	۶۵۰ فلس
افریقہ	۴ ڈالر
برطانیہ	۳ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر
کینیڈا	۴½ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

اکاؤنٹ نمبر ۹۰۰۳۵
سازمان تبلیغات اسلامی (مطبوعات خارجی)
بانک ملی ایران شعبہ خشایار ۵۴۴
خیابان طالقانی نبش فرصت
تہران - اسلامی جمہوریہ ایران

اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

جلد (۳) شمارہ (۵)

ترتیب

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس ۵۹۷

قم، جمہوری اسلامی ایران

فون : ۲۳۵۸۴

محرّم و صفر ۱۴۰۷ھ / اکتوبر و نومبر ۱۹۸۶ء

فکر و فلسفہ

فقہ و قانون

نوٹ:

- ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔
- مجلہ توحید سے مضامین اخذ کرنے کی اجازت ہے مگر حوالہ شرط ہے۔

انقلابِ حسین

اپنے نتائج کے آئینہ میں
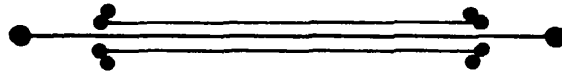
انسان نے اپنی طویل تاریخ میں بہت سے حوادث دیکھے ہیں، جاہ پسندی اور اقتدار کی ہوس نے کتنے ہی شرم انگیز المیوں کو جنم دیا ہے، پیغمبران الٰہی کی تاریخ، اقوام وملل سے ان کے سلوک اور سرکشوں سے ان کے مقابلے اس حقیقت کے گواہ ہیں ــــ قرآن مجید باوجودیکہ کتاب تاریخ نہیں، مگر عبرت ونصیحت کے لئے اس میں بھی اس قسم کے بہت سے واقعات موجود ہیں۔ سرکشوں کے قصے، جانبازوں کے تذکرے، ظالموں کے دلخراش مظالم کی داستانیں اور مظلوموں کی حیرت انگیز متضاد کی کہانیاں درس وعبرت حاصل کرنے کے لئے بیان ہوئی ہیں تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ قافلۂ بشریت کتنے کٹھن اور سخت مرحلوں سے گذر کر اس منزل تک پہنچا ہے اور منزلِ ارتقا طے کرنے کے لئے کن صبر آزما مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مطالعۂ تاریخ، فرد اور معاشرہ کی تعمیر کے لئے ضروری ہے۔

دامنِ تاریخ دلخراش تر واقعات سے لبریز ہے لیکن المیۂ کربلا ان سب میں منفرد ہے، ہر اعتبار سے منفرد، وہاں انسان حیوانوں سے پست تر بھی نظر آتا ہے اور ملائکہ سے برتر بھی، ظالم کا ظلم بھی انوکھا ہے اور مظلوموں کی استقامت و پائداری بھی انوکھی۔ المیۂ کربلا میں نور وظلمت، حق و باطل ایک دوسرے کے مقابلہ میں کھل کر سامنے آگئے ہیں، چہروں سے

نقاب اٹھ گئی ہے، حق و باطل کی پہچان آسان ہے، فتح و شکست کی تشخیص مشکل نہیں۔ انسان ذرا سے غور و فکر سے فیصلہ کر سکتا ہے کہ ہارا کون اور جیتا کون فتح کس کی ہوئی اور شکست کس کی؟ یہی تو وجہ ہے کہ جب بھی کسی انصاف پسند اور حقیقت بیں شخص نے کربلا کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہا تو اس نے بے ساختہ انقلاب حسینؑ کو کامیاب انقلاب کہا۔ انقلاب حسینؑ پر جتنے لوگوں نے بھی قلم اٹھایا تقریباً سبھی نے اعتراف کیا کہ یہ انقلاب نہ صرف یہ کہ شکست و ناکامی سے دوچار نہیں ہوا بلکہ اسے بے شمار کامیابیاں نصیب ہوئی ہیں۔ البتہ ہر شخص نے اپنے اپنے انداز اور اپنے اپنے مسلک و دبستان کے مطابق اس انقلاب کے کامیاب نتائج کو بیان کیا ہے۔

○

انقلاب حسینؑ کے کچھ نتائج تو فوراً ہی ظاہر ہو گئے اور بعض نتائج وقت کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے گئے، علماء و محققین نے ان نتائج پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے جو اس مختصر گفتگو کی حد سے باہر ہے۔ ہم یہاں صرف چند سبق آموز نتائج کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔

● انقلاب حسینؑ کا ایک اہم نتیجہ بنی امیہ کے خونی چنگل سے اسلام و مسلمین کی رہائی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بنی امیہ اور خاص کر یزید سے اسلام کو جو خطرہ لاحق تھا وہ کسی صاحب بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔ امام حسینؑ کا یہ تاریخی جملہ " وعلی الاسلام السلام اذ بلیت الامۃ براعٍ مثل یزید " اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے لیکن انقلاب کربلا نے اسلام کو اس خطرہ سے بچا لیا۔

● انقلاب حسینؑ نے مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار کر دیا۔ معاویہ اور اس کے کارندوں کے پروپیگنڈے سے، صحیح اسلامی تبلیغات پر پابندی اور علماء و صالحین امت کی گوشہ نشینی کی وجہ سے لوگوں کی فطری، روحانی و اخلاقی طاقت کمزور ہو چکی تھی۔ اکثر لوگ اپنے دین اور معاشرہ سے لاپرواہ ہو چکے تھے، جس حاکم کو ان پر مسلط کر دیا جاتا، اس کی بیعت کرنے کو تیار ہو جاتے، انھیں آنے اور جانے والے حاکموں کی خصوصیات سے کوئی سروکار نہ تھا لیکن سید الشہداءؑ کی شہادت نے انھیں خواب غفلت سے بیدار کر دیا، انھوں نے امام حسینؑ سے یہ سبق سیکھا کہ ستمگروں کے خلاف پامردی اور جہاد ممکن ہے، طاقت و حیلہ سے تخت حکومت پر قبضہ جما لینے والا ہر شخص واجب الطاعۃ نہیں ہو سکتا۔ حاکم کے لئے کچھ شرائط و صفات بھی ہیں، انقلاب حسینؑ نے غافل و بے خبر لوگوں کو بتا دیا کہ

بنی امیہ جیسی حکومت واجب الطاعۃ نہیں ہوسکتی، نہ صرف یہ کہ اس کی اطاعت واجب نہیں بلکہ ایسی حکومتوں کا تختہ پلٹ کر اسلامی حکومت کے قیام کے لئے سعی و کوشش اور جہاد ضروری ہے۔

● انقلاب حسینؑ کا ایک دوسرا اہم ثمرہ وہ انقلاب اور تحریکیں ہیں جو آپ کی شہادت کے بعد بنی امیہ اور ان جیسوں کی حکومتوں کا تختہ پلٹنے کے لئے دنیائے اسلام میں رونما ہوئیں۔ ان انقلابات اور تحریکوں میں عوام کو حرکت میں لانے کے لئے جس چیز نے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے وہ ذکر شہادت حسینؑ اور آپ کی تاسی کی دعوت ہے "نام حسینؑ" ایک ایسا حسین و دلکش نعرہ بن گیا کہ عوام ہر اس پرچم تلے جمع ہو جاتے جو اس نام پر بلند کیا جاتا، انقلاب توابینؒ جو "یالثارات الحسین" کے نعرے سے شروع ہوا، ان انقلابات کا ایک نمونہ ہے، کچھ پاک دل و پاکباز لوگوں نے نام حسینؑ پر تحریک شروع کی اور آخر کار انہی انقلابات کے نتیجے میں بنی امیہ کو حاکم اسلامی کے عنوان سے صفحۂ گیتی سے مٹا دیا گیا۔

انقلاب حسینؑ کی تاسی میں رونما ہونے والے انقلابات کا سلسلہ آج بھی جاری ہے جس کا ایک لازوال شاہکار انقلاب اسلامی ایران ہے جو آپؑ کے نام پر اور آپؑ کے یوم شہادت کے موقع پر شروع ہوا اور آج بھی جاری ہے۔ انقلاب ایران نے مادی وسائل کی کمی اور فقدان کے باوجود "رمز شہادت" کے ذریعہ عالمی طاقتوں کو حیرت و تعجب میں ڈال دیا ہے، ملت ایران نے درس شہادت، انقلاب حسینؑ سے لیا ہے۔ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے یہ بتایا ہے کہ الٰہی مقاصد کی خاطر عزیز سے عزیز شے کی بھی قربانی پیش کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ ایرانی مسلمان امام حسینؑ کو اپنا معصوم پیشوا مانتے ہوئے ان ہی راہوں پر گامزن ہیں جنھیں امام حسینؑ نے معین فرمایا ہے۔

انقلاب اسلامی ایران سے باخبر افراد جانتے ہیں کہ اس انقلاب کا آغاز عاشور کے دن امام حسینؑ کے نام سے ہوا اور قائد عظیم الشان امام خمینی نے اپنے انقلابی بیانات و پیغامات میں بارہا امام حسینؑ اور کربلا کے دل سوز و جاں گداز واقعہ کا ذکر اور اس کے ذریعہ لوگوں کو بیدار و آگاہ فرمایا ہے، اور آج بھی ملت ایران کا متحدہ نعرہ یہی ہے کہ: "نہضت ما حسینی است رہبر ما خمینی است"۔ امام خمینی کی قیادت کو انقلاب حسینؑ کا ہی پرتو سمجھتے ہیں اور دبستان حسینؑ سے سبق لیتے ہوئے فداکاری و جاں نثاری کے ایسے ایسے نمونے پیش کر رہے ہیں جس سے کربلا کی یاد دلوں میں تازہ ہو جاتی ہے۔ مشرق و مغرب کے عطا کردہ جدید ترین اسلحوں سے لیس صدامی فوج کے دانت کھٹے کرنے میں انقلاب حسینؑ کا بڑا ہاتھ

ہے۔ یہ نام حسینؑ کی تاثیر اور روضہ حسینؑ کی زیارت کی للک ہے جو غازیان اسلام کو دشمن کے مہلک ترین اسلحوں کی پرواہ کئے بغیر پیش قدمی پر آمادہ کرتی ہے۔ ہر حملہ سے پہلے مجاہدین اسلام کا ایمان افروز و ولولہ انگیز نوحہ ماتم، پیشانیوں پر "السلام علیک یا اباعبداللہ" کی سرخ پٹیاں، لباسوں پر "مسافر کربلا" کی تحریر صرف ان جاں بازوں ہی کو نہیں بلکہ تماشائیوں کو بھی حوصلہ عطا کرتی ہے، جسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں کچل سکتی۔

اگر انقلاب حسینؑ نہ ہوتا تو بھلا دنیا کی کس ماں کا جگر تھا کہ اپنے گیارہ بچوں کی قربانی پیش کرنے کے بعد اگر افسوس کرتی ہے تو اس بات کا کہ اب میرے پاس کوئی اور اولاد نہیں جسے اسلام کے لئے قربان کر سکوں۔ یہ سب حسینؑ اور ان کے باوفا ساتھیوں کی دین ہے کہ پیرو حسینؑ مسلمان اب اپنے کو ضعیف و ناتواں نہیں سمجھتا بلکہ ہر ظالم و جابر نظام کے مقابلہ میں استقامت و پامردی کو اپنا فریضہ سمجھ کر ہر طرح کی قربانی پیش کرنے کے لئے خود کو تیار پاتا ہے۔

انقلاب حسینؑ کے زیر اثر ایران کے اسلامی انقلاب کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ایک اسلامی ملک کو مشرق و مغرب کے استعماریوں کے چنگل سے آزاد کرا کے اسلام اور اسلامی قوانین کی بنیاد پر حکومت قائم کر دی۔ اس انقلاب نے مشرق و مغرب کی فاسد تہذیب و ثقافت کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ یہ طاقتیں ان کو حیوان کی شکل میں تبدیل کر دینا چاہتی تھیں۔ آج ایرانی جوان دین، خدا، اخلاق اور تزکیہ نفس کی جانب راغب ہیں، طاغوتی دور کے برخلاف الٰہی اقدار کے دلدادہ ہیں، اسلامی ایران کی موجودہ حالت یہ بتا رہی ہے کہ ایرانی مسلمانوں اور ان کی حکیمانہ قیادت کا عزم مصمم یہ ہے کہ وہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کی بالادستی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے اور ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں، نیز دنیا کے تمام مسلمانوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ آپس میں متحد ہو کر قرآنی تعلیمات کے زیر سایہ انقلاب حسینؑ سے سبق لیتے ہوئے مشرق و مغرب کے سامراجوں اور اسلامی ممالک میں حاکم ان کی کٹھ پتلیوں، نیز اسلام کے دیرینہ دشمن اسرائیل کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوں۔

انقلاب ایران کی یہ تمام کامیابیاں اور اثرات، انقلاب کربلا کے رہین منت اور حسینؑ اور ان کے اصحاب کی دین ہیں

السلام علی الحسینؑ و علی اولاد الحسینؑ و علی اصحاب الحسین
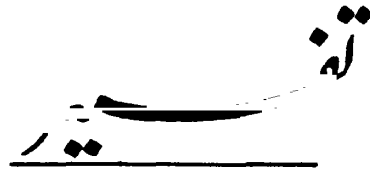
- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

تِلْكَ الرُّسُلُ
فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ
دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ
بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِن بَعْدِهِم
مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَٰكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُم
مَّنْ آمَنَ وَمِنْهُم مَّن كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَٰكِنَّ
اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿٢٥٣﴾

ترجمہ:

یہ سب رسول، ہم نے ان میں ایک کو دوسرے سے بڑھ کر فضل و شرف بخشا
ان میں کوئی ایسا ہوا جس سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجے بلند کئے،
اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلے معجزے دیے اور اس کی "روح القدس"
سے مدد کی اور اگر اللہ چاہتا تو رسولوں کے بعد لوگ نہ لڑتے، جبکہ وہ رسول
ان کے پاس واضح احکام لاچکے تھے۔ لیکن انھوں نے جھگڑے کئے۔ پھر ان میں سے
کچھ مومن ہوئے اور کچھ کافر اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے، مگر اللہ
جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ (۲۵۳)

تفسیر:

جن رسولوں کے نام اور کام اب تک لوگوں کو سنائے اور جو واقعات بتائے ان کا
مطلب ان سب کی تصدیق ہے۔ اسلام سب کو نبوت و رسالت میں مساوی مانتا ہے مگر کچھ

پیغمبر ایک قوم، ایک علاقے یا تھوڑے عرصے کے لیے تھے۔ بعض کو صحیفہ دیا گیا۔ بعض پر کتابیں نازل ہوئیں کسی سے براہ راست اللہ نے کلام کیا جیسے حضرت آدمؑ و موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بہت خاص معجزہ یہ دیا کہ مُردے کو زندہ کرتے، نابینا کو بینائی اور کوڑھی کو شفا دیتے تھے۔ انھیں "پاک روح" کے ذریعہ خاص کمک عطا کی اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن جیسی آخری کتاب اور آپ کی ذات وصفات کو تمام انبیاء و مرسلین پر برتری بخشی، اس لیے سب کو برابر نہ جاننا چاہیے اللہ نے ہدایت کا اہتمام فرمایا، مگر انھوں نے انکار کی ٹھانی اور خدا کی بات نہ مانی۔ ہر قوم میں اکثریت جھٹلانے والوں کی رہی۔ ایمان لانے والے تھوڑے۔ پھر جب نبی و رسول دنیا سے گئے تو ماننے والوں میں اختلاف پیدا کیے گئے۔ تعلیمات انبیا کو اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ اصل ڈھانچے میں توڑ پھوڑ ہوئی۔ گروہ بنے اور امت کے درمیان خونریزیاں ہونے لگیں۔ اس خلفشار میں اللہ کے ولی راہ راست دکھاتے اور حق و باطل میں فاصلہ سمجھاتے رہے۔ انھیں اس راہ میں جان بھی دینا پڑی۔ اللہ نے چونکہ مخلوق پر جبر کا نظام مسلط نہیں کیا لہٰذا۔ خدا چاہتا تو یہ نہ ہوتا۔ کہنا درست نہیں۔ خیر و شر میں ٹکر، حق و باطل میں تصادم ایک حکیمانہ عمل ہے جس کے نتیجے میں دین بڑھتا اور کفر مٹتا رہتا ہے اور اس کا سبب خود اہل باطل ہوتے ہیں۔ (دیکھیے آیت ۷، ۸ یہی سورہ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا
رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ
وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

ترجمہ:
اے ایمان لانے والو! جو روزی ہم نے تم کو دی ہے اس میں سے خرچ کرو، اس دن سے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی نہ دوستی و سفارش (کام آئے گی) اور منکرینِ احکامِ خدا ہی ظالم لوگ ہیں۔ (۲۵۴)

تفسیر:

راہ خدا میں جان دینے کا وقت آئے تو جان دو، مال متاع بچا کر رکھنا تو کوئی بہت اچھا کام ہے ہی نہیں، جو کچھ خدا سے ملے اس میں سے ایک حصہ بہرحال انسانوں کی خدمت، مسلمانوں کی ضرورت، اور حقوقِ ہمسایہ و قرابت داری کے لیے خرچ کرنا ہی چاہئے۔ سرمائے کا یہ خرچہ اللہ کے حساب میں لکھا جائے گا اور یہ قرضہ اللہ اس دن ادا کرے گا جس دن سود سے بازی اور سعی کا موقع نہ مل سکے گا، عدل الٰہی کی ترازو ہوگی اور بندے اپنے نامۂ اعمال لیے محل حساب میں ہوں گے۔ اللہ و رسول و امام کیا کریں گے؟ یہ ان کا کام ہے۔ ہمیں کیا کرنے کا حکم ہے؟ اس کا جواب ہمیں دینا اور جزا یا سزا کا انحصار ہمارا مسئلہ ہے۔ قرآن مجید میں جہاد کے ساتھ بھی انفاق کا حکم ہے اور نماز کے ساتھ بھی، یعنی مال کا راہِ خدا میں خرچ کرنا جہاد و نماز دونوں کے ہم وزن ہے۔ محبتِ رسولؐ و آلِ رسولؑ اور ان کی شفاعت کو ترکِ اطاعتِ خدا کا سبب جاننا اور اسے سرمایہ داری کے لیے بنیاد بنانا غلط ہے (دیکھیے یہی سورہ آیت ۴۸ ۔ و ۔ ۲۵۵)

کافروں نے خود اپنے اوپر ظلم ڈھایا وہ تو حقیقی ظالم ہیں جس کی وجہ سے نہ کسی کی محبت ان کے کام آئے گی نہ کسی کی شفاعت حاصل ہوگی۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ

اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا

بِاِذْنِہٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ

بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝

ترجمہ:

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے، سب کو برقرار رکھنے والا ہے۔ نہ اس کو اونگھ آتی ہے نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کر سکے؟ وہ ان کے تمام حاضر و غائب کو جانتا ہے اور لوگ اس کے علم کی کسی بات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ مگر (جسے) جتنا وہی چاہے (عطا کرے) اس کی کرسی (اقتدار) آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے اور ان کی نگرانی اس پر گراں نہیں ہے۔ وہ بلند و عظیم ہے (۲۵۵)

تفسیر:

کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت ۲۵۷ تک اور بعض سے ثابت ہوتا ہے کہ فقط آیت ۲۵۵ ہی آیت الکرسی ہے۔ فقہا نے تین آیتوں کو آیت الکرسی قرار دیتے ہوئے تحریر الوسیلہ جیسے کتب فتوٰی میں نماز ہدیۂ میت کے بیان میں لکھا ہے کہ آیۂ "ھم فیھا خالدون" تک آیت الکرسی کا پڑھنا احوط ہے۔ فوائد الفواد میں ہے کہ حسن سجزی کو خواجہ نظام الدین نے نماز اشراق میں آیت الکرسی "ھم فیھا خالدون" تک پڑھنے کا حکم دیا ہے (مجلس سی ویکم جلد اول)

اللہ : ذات یکتا، کمال و جمال کے تمام صفات عین ذات ہیں۔ وہ مرکب نہیں اس جیسی کوئی شئے نہیں۔ ماوراء ادراک ذات، معبود مطلق — الٰہ : مفروضہ معبود۔ پتھر کے ہوں یا کسی اور چیز کے، خواہشات جو معبود برحق کے مقابلے میں اپنی اطاعت کرائیں....

— ھو : ذات مطلق کے لیے تقریبی ضمیر۔

حی : شائبۂ فنا سے پاک، حقیقت علم و قدرت کی مالک ذات۔

اللہ۔

القیوم : موجودات اور ان کے نظام کا حافظ و قائم رکھنے والا ہر شئے کو اس کے حدود میں خلق کرنے اور اس کی زندگی و حرکت کو برقرار رکھنے والا "اعطٰی کل شئیٍ خلقہ ثم ھدیٰ"

اللہ وہ جس کے سوا نہ کوئی معبود ہے نہ کسی اور کو حیات حقیقی نصیب ہے، وہی حی و قیوم ہے۔ نہ اسے اونگھ آتی اور نہ اعصاب رکھنے والوں کی طرح تکان سے آرام طلبی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے نہ راحت کے لیے نیند جیسی حالت اس پر طاری ہوتی ہے کہ "قیومیت" کا مالک ہے اور نیند یا اونگھ اجسام و متحرکات کے عوارض ہیں۔ اس کے بارے میں تھکن اور راحت کی نسبت دینا حقیقت توحید کے خلاف ہے۔

۔ لہ ما فی السموات والارض: کائنات میں جو کچھ ہے اللہ اس کا حقیقی اور بلا شرکتِ غیر مالک و مختار ہے۔ جس کے پاس جو کچھ ہے وہ اعتباری اور فانی نسبت ہے۔ ملکیت الٰہی سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔

۔ من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ۔ آیت الکرسی، بیانِ توحید، بیان قیومیت اور مالکیت و حاکمیت اللہ کے مختلف جہات روشن کرتی ہے۔ اس کا پس منظر عرب و عجم کے معاصر مشرک اور ان کے رنگارنگ فلسفے تھے۔ اس کا پیش منظر وہ افکار ہیں جن کی رو سے انسان اللہ سے زیادہ کسی انسان پر نظر جما لیتا ہے کہ "کیا ہوا، ہماری نجات تو فلاں شخص کرا دے گا"! ۔ قرآن مجید خالق کل کا کلام ہے۔ دنیا میں جو بھی ہے یا ہوگا، سب اس کی مخلوق اور اس کی ملکیت ہے۔ مالک کو چھوڑ کر مملوک پر بھروسہ کرنا، مالک و خالق پر اعتماد و معرفت کی کمی ہے۔ اللہ، اللہ ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ رحیم ہے۔ وہ چاہے تو براہ راست کرم فرمائے اور جسے چاہے لب ہلانے اور ہاتھ اٹھانے سے روک دے۔ "لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمٰن و قال صوابا"۔ وہ آسمانوں اور زمین اور دونوں کے مابین جو کچھ ہے سب کا رب ہے۔ وہ رحمٰن ہے۔ اس سے بات کرنے کی کسی میں قدرت نہیں۔ جس دن روح اور ملائکہ صف میں کھڑے ہوں گے، اس وقت وہی بول سکے گا جسے رحمٰن (اللہ) اذن دے گا اور وہ بات بھی ٹھیک کہے گا۔ (سورۃ النازعات ۳۸)

"تنبیہ یہ ہے کہ حق شفاعت ہم نے ضرور دیا ہے، مگر وہ افراد ہماری رضا کے پابند ہیں۔ ان افراد نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ ہمیں مانو اور اللہ کی نافرمانی کرو۔ ان کی شفاعت ہماری

رحمت سے عبارت ہے۔ ہم جو چاہیں گے صاحبان حق شفاعت وہی کریں گے۔ (نیز دیکھئے اسی سورہ کے آیات ۸۰ و ۱۱۱)

کون شفاعت کرسکتا ہے؟ مسلمان رسولؐ اور اہل بیتؑ کی شفاعت پر متفق العقیدہ ہیں تفصیلی بحث آگے آئے گی۔ سورہ طٰہٰ کی تین آیتیں ملاحظہ ہوں "یومئذ لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمٰن ورضی لہ قولا۔ یعلم مابین ایدیھم وماخلفھم ولایحیطون بہ علما وعنت الوجوہ للحی القیوم وقد خاب من حمل ظلما۔ (۱۰۹ - ۱۱۱)

ـــ ولایحیطون بشیئ من علمہ۔ اگر وہ علم عطا نہ کرتا تو آدم و آدم زاد جاہل رہتے، اس نے جسے جتنا علم دیا ہے وہ اسی حد تک عالم ہے یہ اس کے دائرۂ علم کی بات ہی نہیں کہ اللہ کو اپنے علم سے گرفت میں لے لے۔

اس کی کرسی، علم و اقتدار کی وسعتیں امکان مخلوقات سے باہر ہیں۔ وہ علی و عظیم ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

ترجمہ:

دین میں زبردستی نہیں۔ ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے۔ اس کے بعد جس شخص نے گمراہ کرنے والوں کا انکار کر دیا (نہ ملنے) اور اللہ کو (عقلی طور پر) مان لیا، تو اس نے وہ سہارا (حلقہ) تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے (۲۵۶)

تفسیر:

حصین کے دو لڑکے تھے، مدینے میں آنے جانے والے کچھ عیسائی تاجروں نے دونوں کو عیسائی بنالیا۔ حصین کو بہت ناگوار گذرا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے درخواست کی حضور اجازت دیں کہ انھیں سختی کے ساتھ اسلام میں واپس آنے پر مجبور کروں؟ جواب میں آیت نازل ہوئی ۔ اسلام میں لانے اور مسلمان بنانے کے لیے زبردستی کی ضرورت نہیں۔ ہدایت و گمراہی کی راہیں خدا نے جدا کر دی ہیں۔

(الف) اسلام اپنے عقلی و مشاہداتی دلائل پر بھروسہ کرتا ہے، اس کا دستور نہیں کہ زبردستی اور جبر سے کام لے، باپ بھی اپنے بیٹے پر جبر نہیں کر سکتا۔ دلیل و برہان سے سمجھایا جائے، ماننے والے مانیں یا نہ مانیں۔

(ب) دین اعتقاد قلب و اطمینان فکر پر قائم ہوتا ہے۔ طاقت سے گردن تو جھکوائی جا سکتی ہے، دل نہیں موڑے جا سکتے۔

(ج) اسلام کا ہمہ جہاتی نظام فکر و عمل سب کو بتایا جا چکا، لوگوں کو بندوں کی بندگی سے آزادی اور اللہ کی اطاعت کے فوائد بتائے جا چکے یہ تعلیم کسی اور دین و فلسفہ میں نہیں ہے، کافروں کے عذر تمام اور اللہ کی حجت پوری ہو چکی، اب ارباب دانش و بینش پر جبر کی ضرورت نہیں وہ خود اللہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے، زبردستی مسلمان بنانے کی ضرورت کیا ہے " افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مؤمنین" (یونس/ ۹۹) اللہ کی حکمت تخلیقِ بشر اور تکوین کائنات کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کو آزاد چھوڑ کر آزمایا جائے۔ آیات جنگ و جہاد مثلاً "فقاتلوھم حتیٰ لاتکون فتنۃ" ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فساد ختم ہو جائے ۔ لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے تلوار چلانے کا حکم نہیں ہے جہاد، دشمنانِ اسلام کے جبر و فساد کا جواب ہے" اسلام جبر نہیں کرتا" کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام جبر سہنے کا پابند ہے۔ اسلام، صبر کا حامی ہے بشرطیکہ دشمن اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے، جب دشمن حملہ کرے گا تو جواب دیا جائے گا، جب اسلام کو نابود کرنا چاہے گا تو اسلام اپنی بقا کے لیے ہر مناسب اقدام کی اجازت دیتا ہے جس میں سے ایک طریقہ

اخلاقی و قانونی و اصولی و نظریاتی جنگ بھی ہے۔ کیونکہ ایک موقع بہرحال ایسا آجاتا ہے جہاں دشمن فقط تلوار کی زبان ہی سمجھ سکتا ہے اس مرحلے میں کمزوری مرگ مفاجات ہوتی ہے۔

۔"فمن یکفر بالطاغوت"۔ طاغوت کا استعمال۔ اللہ کے مقابل میں ہے ادھر کفر اور اس طرف ایمان کا قرینہ ہے۔ طاغوت : (اسم مبالغہ) حد سے آگے بڑھنے والا۔ ہر وہ چیز جو تجاوز کا وسیلہ ہو۔ شیطان۔ بت۔ وہ بندہ جو خداوندی کا دعویٰ کرنے لگے۔ حاکم دین دشمن، احکام الٰہی کو رد کرنے والا۔ اسلام" طاغوت کا انکار" کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ایمان باللہ کے ساتھ طاغوت کا انکار کرنے سے ایسا مضبوط سلسلہ ہاتھ آتا ہے جو ٹوٹ پھوٹ اور چھوٹ کے خطرے سے آزادی کی سند ہے۔ اسلام کا مضبوط حلقہ و سلسلہ۔ اس کے ساتھ حق آگاہ جاتا ہے کہ اللہ نیتوں کو جانتا اور گفتار کو سنتا ہے۔ یہ جملہ تشویق و تنبیہ ہونے کی حیثیت سے بڑا معنی خیز ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا
يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ
الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ ۗ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥٧﴾

ترجمہ :
اللہ ان لوگوں کا سربراہ ہے جو ایمان لائے، انھیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اور جو لوگ کافر ہیں ان کے حامی و قائد طاغوت ہیں وہی ان کو روشنی سے اندھیروں میں لے جاتے ہیں، یہی دوزخی لوگ ہیں جہاں یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۵۷﴾

تفسیر :

ولی : سربراہ۔ مالک۔ قائد۔ دوست مددگار، اس آیت میں ہے کہ "اللہ ولی" ہے اس کا کام ہے مومنوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لانا اور طاغوت بھی ولی ہے کافروں کا۔ اس لیے "ولی" کے معنی مددگار نا موزوں ہیں، اصل معنی سربراہ وقائد کے ہیں۔ ولی وولایت پر بحث آگے آئے گی انشاءاللہ تعالیٰ۔

مومنوں کا ولی، اللہ ہے اور کافروں کا ولی اسلام کا باغی جو اپنی ذہنی پستی کی بنا پر اپنے فرماں برداروں کو ایمان وعلم وآزادی وہدایت کی روشن راہ اور نور سے نکال کر حیات ونفس پرستی وحق دشمنی کی گمراہیوں اور تاریکیوں میں لے جاتے ہیں۔ اللہ، نور وہدایت کی دعوت دیتا ہے وہ اپنے ماننے والوں کو انبیاء کے ذریعہ روشنیوں اور بلندیوں میں لے جاتا ہے۔
اب فیصلہ عقل مند کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کی بندگی قبول کرے یا بندہ کی غلامی۔

نور، سرچشمۂ زندگی وحرکت ونشوونما اور نمود وظہور کا مرکز ہے۔ نور، ایک ہے اس میں یکسانیت ووحدت ہے۔

ظلمت کو قرآن عموماً جمع کے طور پر استعمال کرتا ہے، جس سے اشارہ گمراہیوں کی کثرت اور وحدت کے فقدان کی طرف ہے۔ ہر طاغوت کی راہ الگ اور ہر تاریکی کی بے نشان راہ جدا ہے۔ غیر اللہ کی ولایت نور سے ظلمتوں کی طرف سفر کا ارادہ ہے اور خداوندی کے مدعی اپنے ماننے والوں کو فکری توانائیوں اور ایمان کی روشنی سے غلامی وگمراہی کے اندھیروں میں کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ دنیا میں ان کا نصیبہ اندھیروں میں رہنا اور آخرت میں جہنم کا دائمی عذاب مقدر ہے۔ حدیث میں نور سے ائمہ معصومینؑ مراد بتائے گئے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ
فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ

يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ
يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ
الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

ترجمہ:

کیا تم نے اسے نہیں دیکھا؟ جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا ان کے پروردگار کے بارے میں، اس برتے پر کہ اللہ نے اسے ملک دیا تھا۔ جب ابراہیمؑ نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے۔ اس نے کہا، میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا: یقیناً، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال دے؟ اس پر وہ منکر حق حواس کھو بیٹھا (لاجواب ہوگیا) اور اللہ ظالموں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا (۲۵۸)

تفسیر:

جو لوگ اللہ کو اپنا ولی و مالک مانتے ہیں وہ کسی غیر کے سامنے نہیں جھکتے، اس سلسلے میں خلیل بت شکن کا واقعہ بار بار دیکھنے اور غور کرنے کے قابل ہے۔ نمرود جسے چند روزہ حکومت ملی۔ وہ حکومت بھی اللہ ہی کی دین تھی کہ امتحان لے وہ خدا بن بیٹھا اور سب کو اپنا بندہ سمجھنے لگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، عراقی عوام کو ان کی ذہنی پستی اور انسان کی غلامی سے نکالنے کی جدوجہد کر رہے تھے، وہ نبی تھے، توحید کی دعوت ان کا منصب تھا، نمرودی ان کے استدلال کے سامنے لاجواب تھے۔ آخر نمرود نے بھرے دربار میں انھیں طلب کیا۔ قرآن مجید کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ کہانی اور واقعہ نہیں بیان کرتا واقعہ کی جان اور ہدایت کی اساس بیان کرکے فکر کو زمان و مکان سے بلند کر دیتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کس شان سے پہنچے، سجدہ کرنے سے انکار کیا؟ وہ بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوئے، یا بیٹھے؟ زیر بحث نہیں۔ بات اہم یہ ہے کہ بادشاہ نے خلیل اللہ سے "رب" کے بارے

میں بحث کرنا چاہی، اس کا لہجہ شاہی غرور میں ڈوبا ہوا تھا ــــ خلیل اللہ نے فرمایا: جس رب کو میں مانتا ہوں وہ خالق موت و حیات ہے ۔ تمام نظام طبیعت، پوری خلقت کا اول و آخر اسی کے قبضہ قدرت میں ہے! بادشاہ نے ایک آنی و فانی اقتدار کے سہارے جواب دیا: یہ کام تو نمرود بھی کرسکتا ہے ۔ اس نے دو قیدیوں میں سے اس شخص کو قتل کردیا جس کی خطا ثابت نہ تھی، اور جسے قتل کی سزا ملنا تھی اسے معاف کردیا ۔ اگرچہ یہ جواب منطقی اور واقعی نہ تھا ۔ مگر حضرت ابراھیمؑ نے دوسری دلیل مشاہداتی پیش کردی ۔ میرا رب وہ ہے جو اس سورج کو ایک نظام کے ساتھ مشرق سے نکالتا ہے ۔ اگر تو رب ہے تو اسے مغرب سے ایک ہی مرتبہ نکال دے ۔ مشاہدے کا جواب مشاہدے سے اور قدرت کے فوری اظہار کے مطالبے نے نمرود کو حواس باختہ کردیا ۔ اس کے بعد اصولاً اسے اپنے دعوے سے دست بردار ہوجانا چاہیئے تھا مگر طاغوت و منکر حق کی فطرت راہِ ہدایت پر نہیں آیا کرتی چنانچہ نمرود انتقام پر آمادہ ہوگیا ۔

ذہنی طور پر کمزور افراد نے ہمیشہ مظاہر کی اہمیت کو "رب" کے تصور میں ڈھالا، اس کی تاویل کی اور کہا پانی زندگی کا سہارا ہے، اس لیے دیوتا ہے ۔ زمین اناج دیتی ہے، اس لیے دیوی ہے ۔ اسی طرح بتوں اور "رب النوع" کے غلط تصورات پھیلے، یہ لوگ، جب عقلی طور پر ان کا جواز نہ لاسکے تو "رب الارباب" کے نام سے اللہ کو مانا ۔

موجودہ دور میں حقوق العباد کے نام سے اسی قسم کا ایک مغالطہ پھیلا کر حکمران اپنے احکام کو الہٰی احکام کے مقابلے میں منواتے ہیں اور خود مذہبی حوالے سے تقدس حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں ۔ اس بارے میں انبیاء کے حوالے سے قرآن نے بیداریٔ فکر و آگاہی کی راہ روشن کی ہے ۔

جناب شیخ محمود قانصو

تقابلی مطالعہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

جن چیزوں سے افطار کرنا چاہیئے

روایات اہل بیتؑ

١ ــ علي بن موسى بن طاووس (في الإقبال) نقلاً عن كتاب الصيام لعلي بن الحسن بن فضال بإسناده، عن جابر، عن أبي جعفر(ع)، قال: «كان رسول الله (ص) يفطر على الأسودين. قلت: رحمك الله وما الأسودان؟ قال: التمر والماء والرطب والماء» ٥٩. ونحوه ما رواه في الكافي، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير بن مهزم، عن طلحة بن زيد، عن الصادق(ع) ان النبي(ص) كان يفطر على التمر في زمن التمر، وعلى الرطب في زمن الرطب. وروى مثله باختلاف يسير وزيادة (أول ما يفطر عليه)، عن ابن ابراهيم، عن أبيه، عن جعفر بن عبدالله الأشعري، عن ابن القداح، عن أبي عبدالله (ع). ٦٠. ونقل المتن الأخير في البحار، عن المحاسن، عن جعفر بن محمد الأشعري مثله. وعن أبي، عن ابن أبي عمير، عن ابراهيم بن مهزم، عن طلحة بن زيد مثله ٦١.

١ــ .... جابر، امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ: رسول خداؐ دو سیاہ چیزوں سے افطار فرماتے تھے۔ میں نے عرض کیا، خدا آپ پر رحمت نازل فرمائے وہ سیاہ چیزیں کیا ہیں؟ حضرتؑ نے فرمایا: "خرما اور پانی، کھجور اور پانی.........

...... طلحہ بن زید امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ: پیغمبرؐ خرما کے زمانے میں خرما سے اور کھجور کے زمانے میں کھجور سے افطار فرماتے تھے ....

٢ ـ محمد بن يعقوب عنه ـ علي بن ابراهيم ـ عن أبيه، عن النوفلي عن السكوني، عن جعفر، عن أبيه (ع)، قال: «كان رسول الله (ص) إذا صام فلم يجد الحلو، أفطر على الماء»[٦٢].

٢ـ .... سکونی امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ کے پدرؑ بزرگوار نے فرمایا: اگر رسول خداؐ کو روزے میں کوئی میٹھی چیز نہ ملتی تو آپؐ پانی سے افطار فرماتے تھے۔

روایات اہل سنّت

١ ـ وقد أخبرنا أبوبكربن فورك ، أنبأ عبدالله بن جعفر، حدثنا يونس بن حبيب، حدثنا أبو داود الطيالسي، حدثنا شعبة، عن عاصم، قال: سمعت حفصة بنت سيرين تحدّث عن الرباب، عن سلمان بن عامر، ان النبي (ص) قال: «إذا صام أحدكم فليفطر على التمر، فإن لم يجد فعلى الماء فانه طهور»[٦٣]. وروى الترمذي، عن محمد بن عمر بن علي المقدمي، عن سعيد بن عامر، عن شعبة، عن عبدالعزيز بن صهيب، عن أنس مثله. ونقل سنده أيضاً كما هو الموجود عند البيهقي[٦٤]. مما يعلم معه أن المتن واحد والإختلاف الموجود بينهما إنما هو من الرواة. وأخرجه ابن ماجة، عن عثمان بن أبي شيبة، عن عبدالرحيم بن سليمان ومحمد بن فضيل (ح)، وعن أبي بكر بن أبي شيبة، عن محمد بن فضيل، عن عاصم الأحول مثله[٦٥]. ورواه الحاكم، عن أبي العباس، عن محمد بن اسحاق، عن سعيد مثل الترمذي، وعن ابراهيم القاري، عن عثمان بن سعيد عن قيس بن حفص، عن عبدالواحد بن زياد، عن عاصم مثل البيهقي[٦٦]. ورواه أبو داود، عن مسدد، عن عبدالواحد، عن عاصم مثله[٦٧]. ورواه الحميدي، عن سفيان، عن عاصم[٦٨] ورواه الدارمي، عن أبي النعمان، عن ثابت بن يزيد، عن عاصم[٦٩].

١ـ .... سلمان بن عامر کا بیان ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی روزہ رکھے تو اسے چاہئے کہ خرما سے افطار کرے اور اگر خرما نہ ملے تو پانی سے کیونکہ یہ پاک و پاکیزہ ہے۔ ....

۲ ــ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ، حدثنا أبوالعباس محمدبن يعقوب، حدثنا محمدبن اسحاق الصغاني، حدثنا سعيدبن عامر، حدثنا شعبة، عن عبدالعزيزبن صهيب، عن أنس بن مالك قال: قال رسول الله (ص): «من وجد تمراً فليفطر عليه، ومن لا، فليفطر على الماء فإنه طهور»[۷۰]. وروى عبدالرزاق مثله باختلاف في اللفظ يسير، عن هشام بن حسان، عن حفصة بنت سيرين، عن الرباب، عن سلمان بن عامر، عن النبي (ص). ورواه أيضاً عن الثوري، عن عاصم، عن أم الهذيل، عن الرباب، عن سلمان مثله[۷۱]. وأخرجه الحاكم، عن أبي العباس مثله[۷۲]. وأخرجه الترمذي، عن محمدبن عمر المقدمي، عن سعيد مثله[۷۳].

۲۔ .... انس بن مالک کہتے ہیں رسول خدا کا ارشاد ہے: جس شخص کو خرما مل جائے اسے خرما سے افطار کرنا چاہیئے اور جسے خرما میسر نہ ہو اسے پانی سے افطار کرنا چاہیئے، کیونکہ یہ پاک و پاکیزہ ہے ....

دعائے افطار

روایات اہل بیت ؑ:

۱ ــ محمدبن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن النوفلي، عن السكوني، عن جعفر (ع)، عن آبائه (ع) ان رسول الله (ص) كان إذا أفطر، قال: اللّهم لَكَ صمنا، وعلى رِزقكَ أفطرنا، فتقبله منّا ذهب الظمأ، وابتلّت العروق، وبقي الأجر[۷۴]. ونقله في البحار، عن مكارم الأخلاق من مجموع أبي، عن الصادق (ع) مثله[۷۵]. ومثله في الجعفريات، عن محمد، عن موسى، عن أبيه، عن جده، عن الصادق (ع)[۷۶]. وأرسله الصدوق، عن النبي (ع) مثله[۷۷].

۱۔ .... سکونی کا بیان ہے کہ امام صادق ؑ نے اپنے آباؤ واجداد سے نقل فرمایا ہے کہ: رسول خدا وقت افطار فرماتے تھے: اللّهم لك صمنا وعلى رزقك افطرنا، فتقبل منّا ذهب الظماء وابتلّت العروق وبقي الاجر ....

۲ ــ محمدبن الحسن بإسناده، عن علي بن الحسين، عن محمدبن الحسن بن أبي الجهم، عن عبدالله بن ميمون القداح، عن أبي عبدالله، عن أبيه (ع) قال: جاء قنبر مولى علي (ع) بفطره اليه، قال: فجاء بجراب فيه سويق (إلى أن قال:) فلما أراد أن يشرب،

قال: بسم الله، اللهم لك صمنا، وعلى رزقك أفطرنا، فتقبل منّا إنكَ أنتَ السميعُ العليم٧٨. وروى في البحار، عن كتاب «فضائل الأشهر الثلاثة» عن محمد بن أبراهيم بن اسحاق، عن أحمد بن محمد الهمداني، عن علي بن الحسن بن علي بن فضال، عن أبيه، عن الرضا(ع): ان من قال نحوه عند الإفطار غُفرله٧٩.

۲۔ .... میمون قداح امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا: حضرت علیؑ کے غلام قنبر وقت افطار حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے ستو پیش کیا (یہاں تک فرمایا کہ) جب حضرت نے ستو پینا چاہا تو کہا:

بسم الله، اللّٰھم لك صمنا وعلی رزقك افطرنا فتقبل منا انك انت السمیع العلیم .... علی بن فضال اپنے والد سے روایت نقل کرتے ہیں کہ امام رضاؑ نے فرمایا: جو وقت افطار یہ (مذکور فوق) دعا پڑھے گا اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

روایات اہل سنت

١ ــ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ وأبو بكر القاضي، قالا: حدثنا أبوالعباس الأصم، حدثنا يحيى بن أبي طالب (ح وأبنأ) أبو عبدالله الحافظ، أبنأ أبوحامد أحمد بن محمد الخطيب بمرو، حدثنا ابراهيم بن هلال، قالا: حدثنا علي بن الحسن بن سقيف، أبنأ الحسين بن واقد، حدثنا مروان بن سالم المقفع، قال: رأيت ابن عمر، فذكر الحديث، قال: وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا أفطر قال: ذهب الظمأ، وآبتلت العروق، وثبت الأجر إن شاء الله تعالى.٨ و رواه الحاكم، عن أبي حامد مثله٨١. ورواه أبو داود، عن عبدالله بن محمد بن يحيى، عن علي بن الحسن٨٢. ورواه الدارقطني، عن الحسين بن اسماعيل، عن علي بن مسلم؛ عن علي بن الحسن٨٣.

۱۔ .... ابن عمر کا بیان ہے کہ رسول خداؐ، وقت افطار فرماتے تھے:

ذھب الظماء وابتلّت العروق، وثبت الاجر ان شاء الله تعالیٰ ....

۲ ـ أخبرنا أبوعلي الروذ باري، أبنأ أبوبكربن داسة، حدثنا أبو داود، حدثنا مسدد، حدثنا هشيم، عن حصين، عن معاذبن زهرة أنه بلغه أن النبي (ص) كان إذا أفطر، قال: «اللّهم لكَ صمتُ، وعلى رِزقكَ أفطرت» ۸۴. ونقل الهيثمي نحوه، عن أنس بن مالك وعن ابن عباس وفيه زيادة: «فتقبل مني إنكَ أنتَ السميعُ العليم». ونقله عن الطبراني في الكبير۸۵. ورواه الدارقطني، كما نقله الهيثمي، عن اسحاق بن محمد، عن يوسف بن موسى، عن عبدالملك بن هارون بن عنترة، عن أبيه عن جده، عن ابن عباس۸۶.

۲۔ .... معاذ بن زہرہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ پیغمبرؐ وقت افطار فرماتے تھے: اللّٰھم لک صمت وعلی رزقک افطرت .... ابن عباس سے منقولہ روایت میں اس جملہ کا اضافہ ہے: فتقبّل منّی انک انت السمیع العلیم.....

افطار کرانے والے سے کیا کہنا چاہیئے۔

روایت اہل بیتؑ

۱ ـ أخبرنا محمد، حدثني موسى، حدثنا أبي، عن أبيه، عن جده جعفربن محمد(ع)، عن أبيه(ع)، عن جده علي بن الحسن(ع)، عن أبيه(ع)، عن علي(ع)، قال «كان رسول الله (ص) إذا أفطر عند قوم، قال: أفطر عندكم الصائمون، وأكل طعامكم الأبرار، وصلّت عليكم الأخيار»۸۷.

۱۔ .... حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ رسول خداؐ جب کسی کے یہاں افطار کرتے تو فرماتے تھے: تمہارے یہاں روزے داروں نے افطار کیا، تمہارے کھانے کو خدا کے نیک بندوں نے تناول کیا اور اخیار نے تم پر درود بھیجا۔"

روایت اہل سنت

۱ ـ أخبرنا أبوزكريابن أبي أسحاق حدثنا أبوالعباس (هو الأصم) حدثنا

محمد بن عبید الله المنادي، حدثنا يزيد بن هارون، أبنأ هاشم الدستوائي، عن (ح
وأخبرنا) أبوالحسن علي بن محمد المقري، حدثنا الحسن بن محمد بن اسحاق، حدثنا
يوسف بن يعقوب، حدثنا مسلم بن ابراهيم الدستوائي، حدثنا يحيى بن أبي كثير، عن
أنس بن مالك، قال: كان رسول الله (ص) إذا أفطر عند قوم، قال لهم: أفطر عندكم
الصائمون، وأكل طعامكم الأبرار، وتنزّلت عليكم الملائكة٨٨. عبدالرزاق روى عن
معمر، عن ثابت، عن أنس، نحوه٨٩. و رواه الدارمي، عن يزيد بن هارون، عن هشام
مثله.٩٠.

۱۔ .... انس بن مالک کا بیان ہے کہ: رسول خداؐ جب کسی کے یہاں
کرتے تو فرماتے تھے: "تمہارے یہاں روزے داروں نے افطار کیا، تمہارے
کو خدا کے نیک بندوں نے تناول کیا اور ملائکہ تمہارے اوپر نازل ہوئے۔

روزے دار کو افطار کرانا مستحب ہے۔

روایات اہل بیتؑ

۱ ــ عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن سلمة، عن صاحب
الصابري، عن أبي الصباح الكناني، عن أبي عبدالله (ع)، قال: «من فطّر صائماً فله مثل
أجره»٩١. و رواه الصدوق بإسناده عن أبي الصباح٩٢.

۱۔ .... ابو صباح کنانی روایت کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے
جو روزہ دار کو افطار کرائے اسے روزے دار کے برابر ثواب ملے گا۔

٢ ــ محمد بن الحسن بإسناده، عن علي بن الحسن بن فضال، عن محمد بن حماد بن
يزيد [زيد]، عن أبيه، عن أبي عبدالله (ع)، عن أبيه (ع)، قال: قال رسول الله (ص):
«من فطّر صائماً كان له مثل أجره من غير أن ينقص منه شيئ وما عمل بقوة ذلك
الطعام من بر»٩٣. ونحوه ماروه في البحار في حديث عن دعائم الإسلام مرسلاً٩٤.

۲۔ .... حماد بن یزید (زید) اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ امام جعفر صادق ؑ نے اپنے پدرؑ بزرگوار سے یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول خدا ؐ کا ارشاد ہے: جو شخص روزہ دار کو افطار کرلے گا اسے روزہ دار کے برابر ثواب ملے گا جب کہ اس روزہ دار کے ثواب سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔

روایت اہل سنت

۱ ـ وأخبرنا علي بن أحمد بن عبدان، أنبأ أحمد بن عبيد الصفار، حدثنا جعفر بن محمد الفريابي، حدثنا أبوجعفر النفيلي، قال: قرأت على معقل بن عبدالله، عن عطاء، عن زيد بن خالد الجهني، قال: قال رسول الله(ص): «من فطّر صائماً كان له مثل أجره لاينقص من أجره شيئاً» (الحديث). وروى البيهقي هذا الحديث مع الإختلاف في بعض ألفاظه، عن زيد بن خالد الجهني بأربعة أسانيد٩٥. ورواه الترمذي عن هنّاد، عن عبدالرحيم، عن عبدالملك بن أبي سليمان، عن عطاء مثله٩٦. ورواه عبدالرزاق بزيادة (أطعمه وسقاه)، عن جعفر بن سليمان، عن ابن أبي ليلى، عن عطاء مثله. ونحوه أيضاً، عن ابن جريج، عن صالح، عن أبي هريرة٩٧. وأخرج ابن ماجة نحوه، عن علي بن محمد، عن وكيع، عن ابن أبي ليلى وخالي يعلى، عن عبدالملك وأبي معاوية، عن حجاج، كلهم عن عطاء٩٨. ونقل الهيثمي، عن عائشة نحوه نقلاً عن الطبراني في الأوسط، وعن ابن عباس نحوه نقلاً عن الطبراني في الكبير٩٩. ورواه الدارمي، عن يعلى، عن عبدالملك، عن عطاء١٠٠.

۱۔ .... زید بن خالد جہنی ناقل ہیں کہ رسول خدا ؐ نے فرمایا: جو شخص کسی روزہ دار کو افطار کرائے اسے روزہ دار کے برابر ثواب ملے گا اور روزہ دار کا ثواب کم نہ ہوگا۔

جب روزہ دار کھانا پیش کرتا ہے تو فرشتے اس پر صلوات بھیجتے ہیں

روایت اہل بیتؑ

١ ـ محمد بن علي بن الحسين، قال: قال رسول الله (ص): «ما من صائم يحضر قوماً يطعمون إلاّ سبَّحت له أعضاؤه، وكانت صلوات الملائكة عليه، وكانت صلواتهم استغفاراً». ورواه في ثواب الأعمال، عن أبيه، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن النوفلي، عن السكوني، عن أبي عبدالله(ع). ورواه في المجالس، عن أحمد بن زياد بن جعفر الهمداني عن علي بن ابراهيم مثله ١٠١. وكذا نقله في البحار، عن الأمالي وعن ثواب الأعمال ١٠٢.

١۔ .... جب کسی روزہ دار کے پاس کوئی قوم کھانا کھاتی ہے تو اس کے اعضاء اس کے لیے تسبیح پڑھتے ہیں اور ملائکہ اس پر صلوات بھیجتے ہیں اور ان کی صلوات استغفار ہے........

روایت اہل سنّت

١ ـ حدثنا أبومحمد عبدالله بن يوسف (إملاءً) وأبوطاهر الإمام (قراءةً) عليه، قالا: أنبأ ابوبكر محمد بن الحسين القطان، أنبأ ابراهيم بن الحارث البغدادي، حدثنا يحيى بن أبي بكر، حدثنا شعبة، عن حبيب بن زيد الأنصاري، قال: سمعت مولاة لنا يقال لها ليلي تحدث عن جدتي أم عمارة بنت كعب، أن رسول الله (ص) دخل عليها فدعت له بطعام، فقال لها: كلي فقالت: إني صائمة! فقال(ص): «إن الصائم إذا أكل عنده صلّت عليه الملائكة حتى يفرغوا (أوقال): حتى يقضوا أكلهم» ١٠٣. وروى الترمذي نحوه، عن علي بن حجر، عن شريك، عن حبيب، عن ليلى، عن مولاتها. وروى

مثله، عن محمود بن غيلان، عن أبي داود، عن شعبة وعن محمد بن بشار، عن محمد بن جعفر، عن شعبة مثله ۱۰۴. ورواه عبدالرزاق، عن سفيان، عن شعبة مثله ۱۰۵ و رواه ابن ماجة باختلاف يسير في كيفية تأدية المعنى فقط، عن أبي بكر بن أبي شيبة وعلي بن محمد وسهل، جميعاً عن وكيع، عن شعبة ۱۰۶. وأخرجه أبو داود الطيالسي، عن شعبة مثله ۱۰۷. ورواه الدارمي عن هاشم بن القاسم، عن شعبة ۱۰۸.

۱۔ . . . . ام عمارہ بنت کعب کہتی ہیں کہ رسول خدا ان کے یہاں تشریف لائے تو انھوں نے آپ کی خدمت میں کھانا پیش کیا، حضرت نے فرمایا تم بھی کھاؤ! ام عمارہ نے کہا میں روزہ سے ہوں، حضرت نے فرمایا: جب کسی روزہ دار کے یہاں کھانا کھایا جاتا ہے تو فرشتے اس پر درود بھیجتے ہیں یہاں تک کہ کھانے سے فراغت ہو جائے۔"....

جب کھانے کی دعوت دی جائے تو روزہ توڑ دینا مستحب ہے

روایت اہل بیتؑ

۱ ــ عن علي بن محمد، عن ابن جمهور، عن بعض أصحابه، عن علي بن حديد، عن عبدالله بن جندب قال: قلت لأبي الحسن الماضي (ع): «أدخل على القوم وهم يأكلون وقد صلّيت العصر وأنا صائم، فيقولون: أفطر. فقال: أفطر فإنه أفضل» ۱۰۹.

۱۔ . . . . عبداللہ بن جندب کہتے ہیں: میں نے ابوالحسنؑ سے عرض کیا: میں ایک قوم کے پاس گیا درحالیکہ وہ لوگ کھانے میں مشغول تھے، میں نماز عصر پڑھ چکا تھا اور روزہ سے بھی تھا، چنانچہ ان لوگوں نے روزہ توڑنے کے لئے کہا۔ حضرت نے فرمایا" روزہ توڑ دو کیونکہ یہ افضل ہے۔"

روایت اہل سنت

١ ــ أخبرنا أبونصر عمربن عبدالعزيزبن قتادة الأنصاري، أبنأ أبوحاتم بن أبي الفضل الهروي، حدثنا محمدبن عبدالرحمن السامي، أبنأ اسماعيل بن أبي أويس، عن محمدبن المنكدر، عن أبي سعيدالخدري، أنه قال: صنعت لرسول الله (ص) طعاماً، فأتاني هو وأصحابه، فلما وضِعَ الطعام، قال رجل من القوم: إني صائم. فقال رسول الله (ص): «دعاكم أخوكم، وتكلّف لكم، ثم قال له: أفطروصم مكانه يوماً إن شئت» .١١٠. ورواه الدار قطني، عن أحمدبن محمدبن يزيد، عن أحمدبن محمدبن سوادة، عن حمادبن خالد، عن محمدبن أبي حميد، عن ابراهيم بن عبيد، عن أبي سعيد مثله ١١١. ورواه أبوداود الطيالسي، عن ابن أبي حميد كالدار قطني ١١٢●

ا ــ .... ابوسعید خدری کہتے ہیں: میں نے رسول خدا ص کے لئے کھانا تیار کیا، چنانچہ آپؐ اپنے اصحاب کے ہمراہ تشریف لائے، جب کھانا پیش کیا گیا تو ایک صحابی نے کہا: میں روزے سے ہوں، اس وقت حضرتؐ نے فرمایا: تمہارے بھائی نے تمھیں دعوت دی ہے، تمھارے لئے انتظام کیا ہے، روزہ توڑ دو اگر چاہو تو اس کے بدلے میں پھر کسی دن رکھ لینا.......

٥٩ ــ الوسائل (ج ٧، ص ١١٥).
٦٠ ــ الكافي (ج ٤، ص ١٥٣).
٦١ ــ البحار (ج ٩٣، ط.ح، ص ٣١٤).
٦٢ ــ الوسائل (ج ٧، ص ١١٣) والكافي (ج ٤، ص ١٥٢).
٦٣ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٣٩) ومنحة المعبود (ج ١، ص ١٨٤).
٦٤ ــ الترمذي (ج ٣، ص ٧٧ و٧٨).
٦٥ ــ ابن ماجة (ج ١، ص ٥٤٢) وفيه اختلاف باللفظ.

٦٦ ـ المستدرك (ج ١، ص ٤٣١).
٦٧ ـ أبوداود (ج ٢، ص ٣٠٥).
٦٨ ـ مسند الحميدي (ج ٢، ص ٣٦٢).
٦٩ ـ الدارمي (ج ٢، ص ٧).
٧٠ ـ البيهقي (ج ٤، ص ٢٣٩).
٧١ ـ مصنف عبدالرزاق (ج ٤، ص ٢٢٤).
٧٢ ـ المستدرك (ج ١، ص ٤٣١).
٧٣ ـ الترمذي (ج ٣، ص ٧٧).
٧٤ ـ الوسائل (ج ٧، ص ١٠٦). والكافي (ج ٤، ص ٩٥).
٧٥ ـ البحار (ج ٩٣، ط. ح، ص ٣١٥).
٧٦ ـ الجعفريات (ص ٦٠).
٧٧ ـ الفقيه (ج ٢، ص ٦٦).
٧٨ ـ الوسائل (ج ٧، ص ١٠٦)
٧٩ ـ البحار (ج ٩٣، ط. ح، ص ٣١٢).
٨٠ ـ البيهقي (ج ٤، ص ٢٣٩).
٨١ ـ المستدرك (ج ١، ص ٤٢٢).
٨٢ ـ أبوداود (ج ٢، ص ٣٠٦).
٨٣ ـ الدارقطني (ج ٢، ص ١٨٥).
٨٤ ـ البيهقي (ج ٤، ص ٢٣٩) وأبوداود (ج ٢، ص ٣٠٦).
٨٥ ـ مجمع الزوائد (ج ٣، ص ١٥٦).
٨٦ ـ الدارقطني (ج ٢، ص ١٨٥).
٨٧ ـ الجعفريات (ص ٦٠).
٨٨ ـ البيهقي، (ج ٤، ص ٢٣٩).
٨٩ ـ مصنف عبدالرزاق (ج ٤، ص ٣١١).
٩٠ ـ الدارمي (ج ٢، ص ٢٥).
٩١ ـ الوسائل (ج ٧، ص ٩٩) الكافي (ج ٤، ص ٦٨).
٩٢ ـ الفقيه (ج ٢، ص ٨٥).
٩٣ ـ الوسائل (ج ٧، ص ١٠١).
٩٤ ـ البحار (ج ٩٣، ط. ح، ص ٣٤٢).
٩٥ ـ البيهقي (ج ٤، ص ٢٤٠).
٩٦ ـ الترمذي (ج ٣، ص ١٧١).
٩٧ ـ مصنف عبدالرزاق (ج ٤، ص ٣١١) وفيها اختلاف باللفظ فقط. ولم يذكر في الثاني: (لاينقص إلخ).

۹۸ ــ ابن‌ماجة (ج ۱، ص ۵۵۵).
۹۹ ــ مجمع الزوائد (ج ۳، ص ۱۵۷).
۱۰۰ ــ الدارمي (ج ۲، ص ۷).
۱۰۱ ــ الوسائل (ج ۷، ص ۱۱۲) وثواب الأعمال (ص ۲۹) والمجالس (ص ۳۵۰) كما في هامشه والفقيه (ج ۲، ص ۵۲).
۱۰۲ ــ البحار (ج ۹۳، ط. ح، ص ۲٤۷).
۱۰۳ ــ البيهقي (ج ٤، ص ۳۰۵).
۱۰٤ ــ الترمذي (ج ۳، ص ۱۵۳ و ۱۵٤).
۱۰۵ ــ مصنف عبدالرزاق (ج ٤، ص ۳۱۲) وقال: (سبحت) لا (صلّت) وفيه ايضاً: (أكلت) لا (أكل).
۱۰٦ ــ ابن ماجة (ج ۱، ص ۵۵٦).
۱۰۷ ــ منحة المعبود (ج ۱، ص ۱۸۵).
۱۰۸ ــ الدارمي (ج ۲، ص ۱۷).
۱۰۹ ــ الوسائل (ج ۷، ص ۱۱۰). وفي هذا المعنى أحاديث كثيرة (ص ۱۰۹ و ۱۱۰ و ۱۱۱) والكافي (ج ٤، ص ۱۵۱) لكن ليس فيه: (عبدالله بن جندب).
۱۱۰ ــ البيهقي (ج ٤، ص ۲۷۹).
۱۱۱ ــ الدارقطني (ج ۲، ص ۱۷۷) وليس فيه: (إن شئت).
۱۱۲ ــ منحة المعبود (ج ۱، ص ۱۹۱).

جناب ڈاکٹر مصطفیٰ ادلیائی

ترجمہ: جناب ممتاز علی

علم حدیث کا ارتقاء

علوم حدیث

علم حدیث اپنے ابتدائی مراحل میں خود اپنے وجود و عدم کے سلسلہ میں بزرگان دینی کے درمیان بحث و گفتگو کا موضوع بنا رہا حتیٰ کہ اس کے سلسلہ میں شیخین نے بھی نہایت ہی سردمہری کا ثبوت پیش کیا۔[1] اس کے باوجود یہ جس عظمت و اہمیت کا حامل تھا اس کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا اور تدریجی طور پر ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہوگیا۔ اس کو وہ مقام حاصل ہوا کہ علماء و دانشور اسلامی قوانین و احکام کو سمجھنے کے لئے قرآن کریم کے بعد اس کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوگئے۔ لہٰذا جیسے جیسے یہ آغاز تدوین سے دور ہوتا گیا اس کی وقعت و اہمیت بڑھتی گئی اور یہ آشکار سے آشکار تر ہوتا چلا گیا اور جس طرح ایک درخت نشو ونما کی منزل سے گذر کر جیسے جیسے بلند و توانا ہوتا جاتا ہے، اس کی شاخیں اطراف و جوانب میں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ علم حدیث سے بھی نئے نئے علوم شاخوں کی صورت میں پھوٹتے چلے گئے۔

سیوطی شافعی نے "التدریب الراوی" کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل میں علوم حدیث، علم تدوین حدیث، علم حدیث اور علم اصول حدیث تک محدود تھے

---

[1] فجر الاسلام ص۲۵۰

لیکن تیسری صدی ہجری میں ابن ملقن کے قول کے مطابق علوم حدیث کی تعداد دو سو سے بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ ابو حاتم نے ایک آسان ترتقسیم بندی کے ذریعہ علوم حدیث کو تقریباً پچاس علوم پر مشتمل کیا ہے۔ ابن حجر نے اپنے دور میں مروج علوم حدیث کا نام اس طرح بیان کیا ہے:
علم اصول حدیث، علوم حدیث، علم اصطلاحات حدیث، علم درایت حدیث (اور انہیں میں سے تاریخ رجال حدیث بھی ہے)[1]

احمد امین "فجر الاسلام" میں لکھتے ہیں:-

علوم حدیث کے قدم بہ قدم مندرجہ ذیل علوم بھی وجود میں آئے: تاریخ، مغازی، فضائل اشخاص اور فضائل اقوام اور پھر اس کے بعد تاریخ اپنے ایک نئے انداز میں وجود میں آئی جیسے سیرت ابن ہشام، ابن جریر، ابن اسحاق اور بلاذری سے روایت کی ہے کہ ان کا انداز حدیث کی روش و طریقہ پر ہی ہے اور انبیاء کے واقعات جن کا ذکر قرآن میں ہوا ہے اور حدیث نے جس کی تشریح و تفسیر پیش کی ہے، اس طرح داستانوں کو وسعت حاصل ہوئی اور داستان ہو گئی۔ اور علم حکم (عقل و حکمت کی باتیں) قواعد اخلاق اور یونان و ہند و ایران کے فلسفے حدیث کے ضمن میں قرار پائے اور ان کو عوام کے درمیان مقبولیت حاصل ہوئی، یہ دین و شرع کا اصل مصدر ہے سب سے بڑھ کر تمام دیوانی اور فوجداری کے مسائل جنکی فہرست کافی طولانی ہے، ان کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔ غرض یہ کہ حدیث نے علوم کو بہت وسعت عطا کی ہے[2]۔

سیوطی کہتے ہیں: حازمی نے علوم حدیث کو سو سے زائد علوم پر منقسم کیا ہے جبکہ ابن صلاح نے اس کی ۶۵ قسمیں بیان کی ہیں[3]۔

---

[1] مقدمہ التدریب الراوی

[2] فجر الاسلام احمد امین ص ۲۶۸

[3] التدریب الراوی ص ۱۴ و ص ۳

تاریخ ابن خلدون میں علوم حدیث کے ضمن میں مندرجہ ذیل علوم کا نام ذکر کیا گیا ہے:۔
علم ناسخ و منسوخ، علم رجال، علم اصطلاحات حدیث، علم متون حدیث ـــ جس کے ذیل میں حدیث کی غرابت وغیرہ کا علم آتا ہے، نقل حدیث کے شرائط کا علم ـــ اس کے ضمن میں محدث کی عدالت اور علم فقہ الحدیث وغیرہ آتے ہیں [1]

لیکن حاکم ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حافظ نیشاپوری نے اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں علوم حدیث کی مختلف قسموں میں سے باون ۵۲ علوم کا نام بنام ذکر کیا ہے چنانچہ ہم اس کی اہمیت کے پیش نظر مذکورہ علوم کا ایک مختصر خاکہ مذکورہ کتاب سے پیش کرتے ہیں:۔

(۱) حدیث عالی کا علم:

حاکم ص۵ پر رقم طراز ہیں کہ علوم حدیث کی قسموں میں سے ایک قسم حدیث کے عالی الاسناد ہونے کا علم بھی ہے۔ اس سلسلہ میں آئندہ صفحات پر تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حدیث عالی کے لئے کم سے کم درمیانی واسطوں کے ساتھ ہی ساتھ راویوں کا ثقہ ہونا بھی ضروری ہے۔

(۲) حدیث نازل کا علم:

صفحہ ۱۲ پر لکھتے ہیں کہ علوم حدیث کی قسموں میں سے ایک علم حدیث نازل کی واقفیت حاصل ہونا بھی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نازل، عالی کی ضد ہے، لیکن یہ تعریف کافی نہیں ہے بلکہ نازل مختلف مراتب کی حامل ہے جس کو اہل فن حضرات کے علاوہ کسی کا سمجھنا دشوار ہے۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو بہت زیادہ تبحر و دانش کی محتاج ہوتی ہیں۔

(۳) محدث کی صداقت کا علم:

صفحہ ۱۴ پر مصنف نے صادق القول محدث کی شناخت کو بھی علوم حدیث میں سے ایک علم شمار کیا ہے جس کے ذیل میں محدث کی عمر، اس کی سطح معلومات، ذمہ داری کا احساس، کوشش و جستجو کا معیار نیز اسی قسم کے دوسرے مسائل آتے ہیں۔

(۴) اسناد حدیث کا علم:

صفحہ ۱۵ پر مرقوم ہے کہ علوم حدیث میں سے ایک بہت ہی اہم علم اسناد حدیث سے

[1] تاریخ ابن خلدون ص۴۹۶ و ص۴۹۷

شناسائی بھی ہے، ائمہ مسلین کے درمیان غیر مستند ہونے کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی دلیلوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حدیث مسند وہ حدیث ہے جس کی سند مشہور صحابیوں کے ذریعہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہونچتی ہے۔

⑤ روایات موقوفہ کا علم :

ص۱۹ پر درج ہے کہ ان ہی میں سے ایک روایات موقوفہ کی معرفت بھی ہے جس کی بڑی تفصیل کے ساتھ تشریح پیش کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث موقوفہ اس حدیث کو کہتے ہیں جو کسی صحابی پر جا کے ختم ہوتی ہو۔

⑥ ان اسناد کا علم جس کی سند پیغمبر اسلامؐ سے ذکر نہ ہو :

صفحہ ص۲۱ پر اس علم کے سلسلہ میں بحث کی گئی ہے۔

⑦ صحابہ کے مراتب کا علم :

اس کے ذیل میں صحابی کے مہاجر یا انصار ہونے نیز ان کی حیثیت کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔

⑧ احادیث مرسلہ نیز ان کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی دلیلوں کی معرفت :

صفحہ ص۲۵ پر لکھا ہے کہ یہ علم، علم حدیث کے مشکل ترین علوم میں سے ایک علم ہے جس کے بارے میں متبحر افراد کے علاوہ کسی کا کام کرنا ممکن نہیں ہے۔ حدیث مرسل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو تابعین اقوال پیغمبرؐ سے نقل کرتے ہیں۔

⑨ حدیث منقطع کا علم :

صفحہ ۲۷ پر مرقوم ہے کہ حدیث منقطع حدیث مرسل سے جدا ایک علم ہے، یہ وہ حدیث ہے جو تابعین سے نقل کی گئی ہو اور اس کی تین قسمیں ہیں۔

⑩ اسناد مسلسل کا علم :

صفحہ ۲۹ پر لکھتے ہیں کہ علوم حدیث کی شناخت سے متعلق علموں میں سے سندوں کا تسلسل بھی ہے جو خود آٹھ قسموں پر مشتمل ہے۔

(۱۱) احادیث معنعن کا علم :

صفحہ ۳۴ پر لکھا ہے کہ علوم حدیث میں سے ایک احادیث معنعنہ کا علم بھی ہے تاکہ اسمیں تدلیس و فریب کاری کا دخل نہ رہے۔

(۱۲) روایات معضل کا علم :

حاکم نے اس کتاب کے صفحہ ۳۶ پر لکھا ہے کہ امام حدیث علی بن عبداللہ مدینی اور وہ افراد جو ان کے بعد کے ہیں کہتے ہیں کہ حدیث معضل وہ حدیث ہے جسکی سلسلہ سند میں دو یا اس سے زائد افراد کا نام حذف ہو گیا ہو۔

(۱۳) احادیث مدرج کی پہچان :

صفحہ ۳۹ پر فرماتے ہیں کہ وہ حدیث مدرج ہے جسمیں راوی اپنے کلام یا صحابی کے کلام یا دوسروں کے کلام کو متن حدیث میں درج کر دے۔

(۱۴) تابعین کی شناخت :

صفحہ ۴۱ پر لکھتے ہیں کہ علوم حدیث میں سے ایک علم تابعین کی شناخت بھی ہے جو خود بہت سے علوم کا مجموعہ ہے، ان میں سے ایک ترتیب کے سلسلہ میں طبقات کا علم بھی ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

(۱۵) اتباع تابعین کی معرفت :

صفحہ ۴۶ پر رقم طراز ہیں علوم حدیث میں سے ایک علم تابعین کے پیروؤں کی معرفت بھی ہے۔

(۱۶) اکابر و اصاغر کی معرفت :

صفحہ ۴۸ پر کہا ہے کہ علوم حدیث سے متعلق یہ بات بھی ہے کہ چھوٹوں میں سے بڑوں کو پہچان لیا جائے۔

(۱۷) اولاد اصحاب کی معرفت :

صفحہ ۴۹ پر کہتے ہیں کہ جو علوم حدیث کے اس حصہ سے ناواقف ہو۔ وہ بہت سی حدیثوں میں غلطی کریگا۔

(۱۸) علم جرح و تعدیل :
صفحہ ۵۲ پر فرمایا ہے کہ جرح و تعدیل دراصل دو قسمیں ہیں ۔
(۱۹) صحیح اور سقیم کی پہچان :
صفحہ ۵۸ پر فرماتے ہیں کہ صحیح اور سقیم کی معرفت اس جرح و تعدیل کے علاوہ ایک الگ علم ہے جس کا ذکر پہلے ہو لیا ہے ۔
(۲۰) فقہ الحدیث کا علم
(۲۱) ناسخ و منسوخ حدیث کا علم ۔
(۲۲) متن میں جو غریب (نامانوس) الفاظ استعمال ہوں ان کا علم ۔
صفحہ ۸۸ پر رقم طراز ہیں کہ یہ وہ علم ہے جس سے تابعین کے پیروؤں نے بحث کی ہے منجملہ ان کے مالک، ثوری، شعبہ اور وہ حضرات ہیں جو ان لوگوں کے بعد پیدا ہوئے تھے ۔ سب سے پہلے جس نے علم غریب الحدیث کو تصنیف کیا ہے وہ نضر ابن شمیل تھے ۔
(۲۳) احادیث مشہور کا علم :
صفحہ ۹۲ پر لکھا ہے کہ مشہور حدیثیں صحیح کے علاوہ ہیں اس لئے کہ بہت سی حدیثیں بڑی شہرت رکھتی ہیں مگر صحیح نہیں ہیں ۔
(۲۴) غریب اور نامانوس احادیث کا علم : صفحہ ۹۴ پر کہتے ہیں کہ شمارہ ۲۲ میں حدیث کی جس قسم کا ذکر کیا گیا ہے ، یہ قسم اس سے مخالف نہیں ہے اس لئے کہ حدیث کی مختلف قسمیں ہیں ۔
(۲۵) احادیث مفرد کی پہچان :
صفحہ ۹۶ سے لیکر بعد کے صفحات پر رقم طراز ہیں کہ احادیث مفرد کی تین قسمیں ہیں، پہلی قسم تو یہ ہے کہ اہل مدینہ میں سے کسی ایک نے نقل کی ہو یا اہل کوفہ میں سے ، دوسری قسم یہ ہے کہ اماموں میں سے کسی ایک نے نقل کیا ہو ۔ تیسری قسم یہ ہے کہ فقط ایک شخص نے اس حدیث کو نقل کیا ہو
(۲۶) ان لوگوں کی معرفت جو حدیث میں تدلیس کر دیتے ہیں ، یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ حدیث کا کون سا حصہ ان کا ہے اور کون سا حصہ روایت کا ہے ۔

(۲۷) حدیث کی علتوں کا پہچاننا :
صفحہ ۱۱۳ پر فرماتے ہیں کہ صحیح و سقیم، جرح و تعدیل کے علاوہ یہ ایک مستقل اور جداگانہ علم ہے۔
(۲۸) شاذ روایتوں کا علم :
ص ۱۱۹ پر فرماتے ہیں کہ روایت "شاذ" روایت "معلول" کے علاوہ ہے۔ شاذ وہ حدیث ہے جو صرف ایک موثق راوی سے نقل ہوئی ہو۔
(۲۹) پیغمبرؐ کی ان حدیثوں کا جاننا جو دوسری حدیثوں کی معارض ہوں اور اہل مذاہب ان میں سے کسی ایک سے احتجاج کرتے ہوں۔
(۳۰) ان حدیثوں کی معرفت جن کا کوئی کسی رخ سے معارض نہ ہو۔
(۳۱) احادیث میں الفاظ زائد کی معرفت۔
(۳۲) محدثین کے مذاہب کی اطلاع۔
(۳۳) متون کی تحریری غلطیوں سے آگاہی۔
(۳۴) مذاکرۂ حدیث کا جاننا اور مذاکرہ کرتے ہوئے راستگو کی معرفت۔
(۳۵) اسناد میں محدثین کی تحریری غلطیوں کی اطلاع۔
(۳۶) صحابہ، تابعین اور ان کے بھائیوں، بہنوں کی عصر حاضر تک معرفت :
ص ۱۵۲ پر فرماتے ہیں کہ یہ علم بذات خود ایک اہم علم ہے۔ اس سلسلہ میں ابوالعباس سراج نے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔
(۳۷) ان صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین کی معرفت، جن میں سے بس ایک راوی نے روایت کی ہو۔
(۳۸) اصحاب، تابعین اور ان کے پیرؤوں میں سے جو راوی ہیں، عصر حاضر تک ان کے قبائل کی معرفت۔
(۳۹) صحابہ سے عصر حاضر تک کے محدثین کے انساب کا علم : ص ۱۶۸ پر لکھتے ہیں کہ یہ وہی چیز ہے جس کا حکم پیغمبرؐ نے دیا ہے اور ص ۱۶۹ پر ایک حدیث ابوہریرہ سے نقل فرماتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے فرمایا : تعلموا انسابکم تصلوا ارحامکمؐ۔

ؐ شیعوں کے نزدیک یہ بات تحقیق طلب ہے۔

(۴۰) محدثین کے ناموں کا علم :
ص۱۸۱ پر لکھتے ہیں کہ ابو عبد اللہ محمد اسماعیل بخاری نے اس قسم کے سلسلہ میں اپنی تصنیف کے ذریعہ ہم کو بے نیاز کر دیا ہے اور وہی ہمارے لئے کافی ہے۔

(۴۱) صحابہ، تابعین اور عصر حاضر تک ان کے پیروؤں کی کنیت کا جاننا :
ص۱۸۳ پر رقم طراز ہیں "محدثین نے اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں تالیف کی ہیں۔

(۴۲) راویان احادیث کے وطن (کس جگہ کے رہنے والے تھے) کی پہچان :
ص۱۹۰ پر تحریر فرماتے ہیں کہ یہ وہی علم ہے جس پر بزرگ علماء کی ایک جماعت کام کر چکی ہے۔

(۴۳) صحابہ، تابعین اور اتباع تابعین کی اولاد اور ان کے غلاموں کی معرفت۔

(۴۴) محدثین کی عمر کی اطلاع ــ ولادت سے وفات تک۔

(۴۵) محدثین کے القاب کی معلومات۔

(۴۶) ان راویوں کی معرفت جو ایک دوسرے سے قریب ہیں :
ص۲۱۵ پر آپ نے فرمایا ہے کہ یہ علم اکابر و اصاغر کی معرفت سے الگ ایک علم ہے، اس میں ایک ہم نشیں اپنے دوسرے ہم نشیں سے روایت کرتا ہے۔

(۴۷) راویوں کے قبائل، وطن، نام، کنیت اور ان کے پیشوں میں متشابہات کی پہچان : اس جگہ آپ نے پانچ فروعی قسموں کا ذکر فرمایا ہے جیسے قبائل کا علم۔ ان کے شہروں کا علم وغیرہ۔

(۴۸) غزوات پیغمبرؐ، ان کے ان خطوط وغیرہ کا علم جو انہوں نے بادشاہوں کو تحریر فرمائے۔

(۴۹) تابعین اور اتباع تابعین میں سے ان ائمہ کے بارے میں اطلاعات جو مشہور اور موثق ہیں یا ان افراد کے بارے میں جاننا جنہوں نے تبرکاً حفاظت کے لئے یا شہرت کے لئے حدیثیں جمع کیں۔

(۵۰) اصحاب حدیث نے جن ابواب کو جمع کیا ہے ان کی معرفت اور اس بات کی جستجو کہ ان میں سے کون سا حصہ ضائع ہو گیا ہے۔

(۵۱) تابعین اور ان کے بعد کے راویوں کی جماعت کی معرفت جن سے لی جانے والی حدیث کی

صحت میں کوئی حجت نہیں لائی گئی ہو اور وہ حدیث ساقط بھی نہ ہوئی ہو۔

(۵۲) ان لوگوں کی معرفت جنہوں نے خط کے ذریعہ کسی عالم سے اجازہ حاصل کیا ہو یا نہیں دیکھا ہو یا ان سے حدیث سنی ہو یا ان کے سامنے حدیث پیش کی ہو یا ایک شہر سے دوسرے شہر خط لکھ کر اجازہ حاصل کیا ہو[۱] وغیرہ ـــــ جیسا کہ پہلے بھی اس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ صرف، نحو، لغت، معانی و بیان، اور وہ علوم جن کا ذکر "الاتقان" میں جلال الدین سیوطی نے فرمایا ہے جیسے لفظ کی ساخت کا علم، ترکیب، الفاظ اور رسم الخط کا اختلاف، ناسخ و منسوخ اور غریب[۲] (نامانوس) کی پہچان وغیرہ یہ سب علم حدیث سے متعلق علوم ہیں اور معرفت حدیث کے لئے انھیں لازم تصور کرنا چاہیئے۔

مندرجہ ذیل باتوں کا ذکر یہاں غیر مناسب اور موضوع سے بے ربط نہ ہوگا ـــــ ابن ندیم نے "فہرست" میں ابن اسحٰق اور دیگر علماء کے قول کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "نحو" کی ابتدا ابوالاسود دوئلی سے ہوئی اور انہوں نے امیرالمؤمنینؑ سے اس علم کو حاصل کیا[۳]۔ اس کے بعد اس گفتگو کا بقیہ حصہ ابو نصر سے نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ عبدالرحمٰن ابن ہرمز وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عربی کی بنیاد رکھی ہے اس کی تائید ابوسعید سیرانی نے کی ہے۔ ابن ندیم نحو کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابو الاسود نے امیرالمؤمنینؑ سے قوانین عربی میں حضرت کے کلام کے (نحو یعنی مانند) کچھ چیزیں ایجاد کرنے کی اجازت چاہی۔

جنہوں نے ابوالاسود دوئلی سے علم نحو سیکھا ہے ابن ندیم کے قول کے مطابق وہ یحیٰی ابن یعمر، عنبستہ ابن معدان ـ میمون بن اقران ہیں[۴]۔

"تاسیس الشیعہ" میں تدوین علم "درایت الحدیث" کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جس نے سب سے پہلے علم درایت حدیث کو تصنیف کیا وہ ابوعبداللہ حاکم نیشاپوری (متوفی ۴۰۵)

۱ـ مذکورہ علوم حدیث کی ۵۲ قسمیں کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" کا خلاصہ ہیں۔

۲ـ الاتقان ص۵

۳ـ فہرست ابن ندیم نسخۂ عربی ص۵۹ تا ص۶۲ ـ نسخۂ فارسی ص۶۹ تا ص۷۲

۴ـ فہرست ابن ندیم نسخہ عربی (۶۲) فارسی (۷۲)

ہیں جو شیعہ تھے۔ ان کے بعد ابن صلاح نے ان کی پیروی کی۔ لیکن سیوطی کتاب الوسائل فی الاوائل میں فرماتے ہیں کہ علم درایت کو مرتب کرنے والے پہلے شخص ابو عمرو عثمان ابن عبدالرحمٰن، شافعی مسلک اور دمشق کے رہنے والے ہیں (متوفی ۶۴۳) جو ابن صلاح کے نام سے مشہور ہیں[1]۔

یہ بات مسلّم ہے کہ سیوطی نے اس مقام پر ابو عبداللہ حاکم نیشاپوری کے کام پر توجہ نہیں دی اس لئے کہ ابو عبداللہ حاکم، ابن صلاح سے ڈھائی سو سال قبل موجود تھے۔

تاسیس الشیعہ میں فرقوں (ملل و نحل) کے علم کی تدوین کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ اس علم میں سب سے پہلے کتاب لکھنے والے حسن ابن موسیٰ نوبختی ہیں جو تیسری صدی کے بڑے دانشمند گذرے ہیں۔ یہ ابو منصور عبدالقادر ابن طاہر بغدادی (متوفی ۴۲۹)، ابوبکر باقلانی (متوفی ۴۰۳)، ابن حزم (متوفی ۴۵۶) اور شہرستانی (متوفی ۵۴۸) سے پہلے گذرے ہیں[2]

جو باتیں کتاب "الادب الفارسی" میں ہیں وہ اس کی تائید کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ صراحت کے ساتھ حسن بن موسیٰ نوبختی کا تذکرہ موجود ہے، اس کا ایک حصہ ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں:

ونبغ عدد من آل نوبخت فی العلوم الاسلامیة واصبحوا من علماء مذهب الشیعة الامامیة ومن اقدم متکلمیهم، وکان لهم فضل کبیر فی دعم هذا المذهب علیٰ اسس کلامیه، منهم ابو محمد الحسن بن موسیٰ النوبختی (المتوفی سنه ۳۰۰ او ۳۰۱) مؤلف کتاب فرق الشیعة وکتاب الآراء والدیانات وهو اول من الف کتابا فی الملل والنحل[3]۔

اصطلاحات حدیث کے سلسلہ میں "التدابیب السادیہ" میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے قاضی ابو محمد رامہرمزی نے اصطلاح میں اپنی تصنیف "محدث الفاضل" پیش کی۔ ان کے بعد حاکم ابوعبداللہ

---

[1] تاسیس الشیعہ ص ۲۹۴

[2] تاسیس الشیعہ ص ۳۳۴

[3] الادب الفارسی ص ۱۱۵ و ص ۱۱۶

نیشاپوری، ان کے بعد ابونعیم اصفہانی اور ان کے بعد خطیب بغدادی ہیں۔[1]

غزوات اور جنگوں کی معلومات کے بارے میں جو رجال کا ایک شعبہ ہے تاسیس الشیعہ میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے علم مغازی نبیؐ کو جس نے زیور وجود سے آراستہ کیا وہ محمد ابن اسحٰق مطلبی ہیں لیکن سیوطی کتاب "الاوائل" میں فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے غزوات کی معرفت کے بارے میں لکھنے والے عروہ ابن زبیر ہیں جن کی وفات ۹۴ ہجری میں ہوئی۔ پھر اسی کتاب تاسیس الشیعہ میں خلاصۃ الاقوال سے منقول ہے کہ عبیداللہ ابن ابی رافع، کاتب علیؑ نے پہلی بار مغازی کو تحریر کیا ہے۔[2]

البتہ کتاب رجال نجاشی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عبیداللہ ابن ابی رافع نے پہلی بار کتاب مغازی لکھی ہے۔[3]

تاریخ نویسی کے سلسلہ میں صاحب کشف الظنون فرماتے ہیں کہ محمد ابن اسحٰق نے جو رئیس اہل مغازی ہیں، تاریخ لکھی ہے آپ کا انتقال ۱۵۱ ہجری میں ہوا۔

سیوطی کا خیال ہے کہ سب سے پہلے ابو داؤد سلیمان ابن داؤد جارود طیالسی نے مسند لکھی ہے۔[4]

علم درایت کے بارے میں تاسیس الشیعہ میں لکھا ہے:

سب سے پہلے سید جمال الدین احمد ابن موسیٰ ابن طاؤس ابوالفضائل (متوفی ۶۷۳) نے علم درایت کی کتاب تصنیف کی ہے۔ یہ ابن مطہر حلی کے استاد ہیں۔ انہوں نے جدید شیعہ احادیث کی اصطلاح (صحیح و حسن و موثق و ضعیف) وضع کی۔[5]

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علم درایت حدیث کے بارے میں تھوڑی سی توضیح ہو جائے۔ کشف الظنون کے مطابق علم درایت الحدیث وہ علم ہے جس میں مفہوم و الفاظ و مراد حدیث سے

---

[1] التدریب الراوی ص ۱۳ — [2] تاسیس الشیعہ ص ۲۳۲ تا ص ۲۳۳

[3] رجال نجاشی ص ۳ تا ص ۵ — [4] التدریب الراوی ص ۱۰۲

[5] تاسیس الشیعہ ص ۲۹۵

بحث ہو اور وہ بحث قواعد عربی وضوابط شرعی اور اصول پیغمبرؐ پر مبنی ہوتی ہے۔ اس میں مبادی علوم عربی اور پیغمبرؐ سے متعلق قصص و اخبار بنیاد بنتے ہیں۔ اسمیں علم رجال، راویوں کے نام و نسب ان کی عمریں وقت وفات، ان کے وہ صفات و شرائط جو قبول روایت کے لئے ضروری ہیں، راویوں نے کس چیز پر استناد کیا ہے اور کیوں کر اس روایت کو قبول کیا ہے راویوں کے روشں کی تقسیم، راویوں کے لفظ کا علم، راویوں کے سنے ہوئے الفاظ پر خود انکا اعتراض، انہوں نے جس سے روایت لی ہے ان سے اتصال، حدیث کی نقل کا جواز اقسام حدیث کی اطلاع جیسے صحیح اور ضعیف وغیرہ جیسی باتیں بھی شامل ہیں[1]

حدیث کی قسمیں :

اہل سنت حضرات کے یہاں کل حدیثوں کی تقسیم تین قسموں پر ہوتی ہے ــ صحیح حسن اور ضعیف ــ شیعی نقطۂ نظر سے حدیثوں کی چار قسمیں ہیں۔ صحیح، حسن، موثق اور ضعیف شیعہ سنی دونوں ہی کے نزدیک ان میں سے ہر ایک کی مختلف قسمیں بنتی ہیں۔ ہم ان کا ذکر مندرجہ ذیل سطور میں کر رہے ہیں

(۱) ـ صحیح : وہ حدیث ہے جس کی سند عادل ضبط کرنے والے اور غیر شاذ راویوں سے متصل اور بے عیب ہو۔[2]

(۲) ـ حسن : وہ حدیث ہے جو جانی پہچانی ہو اس کے رجال اور اس کا مخرج مشہور ہو[3] لغت دہخدا میں حدیث حسن کے سلسلہ میں جرجانی کی تعریف کے فقرے ہیں :

الحسن من الحدیث ان یکون راویہ مشہور بالصدق والامانۃ غیر انہ لم یبلغ درجۃ الحدیث الصحیح[4] حدیث حسن وہ حدیث ہے، جسکا راوی صدق و امانت میں مشہور ہو مگر وہ حدیث، حدیث صحیح کے پایہ کی نہ ہو۔

---

[1] کشف الظنون قاہرہ ص۳۱۵ و ص۶۳۶ [2] التدریب الراوی ص۲۳ ـ لغتنامہ دہخدا ص۲۹۹ جلد ح

[3] التدریب الراوی ص۴۹

[4] لغتنامہ دھخدا ص۲۹۹ جلد ح

(۳) ۔ **ضعیف** : وہ حدیث ہے جس میں حدیث صحیح وحسن کے صفات نہ ہوں[1]۔
(۴) ۔ **مسند** : مسند اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند پیغمبرؐ تک پہونچتی ہو۔
(۵) ۔ **متصل** (موصول) وہ حدیث ہے جسمیں ہر راوی نے اپنے بعد والے راوی کا تذکرہ کیا ہو۔
(۶) ۔ **مرفوع** : وہ حدیث ہے جو معصوم تک پہونچے چاہے اس کا سلسلۂ سند درمیان سے منقطع ہو گیا ہو یا نہ ہوا ہو۔
(۷) ۔ **موقوف** : وہ حدیث ہے جو صحابہ تک پہونچے، چاہے اس کا سلسلۂ سند متصل ہو یا درمیان سے کٹ گیا ہو۔
(۸)۔(۹) ۔ **مقطوع ومنقطع** : یہ وہ حدیثیں ہیں جو تابعین سے نقل ہوئی ہوں۔
(۱۰) ۔ **مرسل** : وہ حدیث ہے جسے تابعین میں سے کوئی صحابی بیان کرے کہ رسول خداؐ نے یوں بیان کیا تھا۔
(۱۱) ۔ **معضل** : وہ حدیث ہے جس کے سلسلۂ رواۃ میں سے دو یا دو سے زیادہ افراد حذف کر دیئے گئے ہوں۔
(۱۲) ۔ **تدلیس** : کی دو قسمیں ہیں ۱۔ متن میں تدلیس (دھوکہ) ہو ۲۔ یا سند میں۔
(۱۳) ۔ **شاذ** : ثقہ راویوں میں سے کوئی راوی اس چیز کی روایت کرے جو دوسروں کے قول کے مخالف ہو تو اسے شاذ کہتے ہیں۔
(۱۴) ۔ **غریب** : اس کی تین قسمیں ہیں غریب الالفاظ، غریب المتن، غریب السند۔
الف : غریب الالفاظ : وہ حدیث ہے جس کے متن میں مشکل اور نامانوس الفاظ استعمال ہوں۔
(ب، د، ج) : غریب المتن : وہ حدیث ہے جسے پہلے طبقہ میں سے فقط ایک شخص نقل کرے اور اگر ایسا ہی متن دوسرے طریق سے مشہور ہو تو وہ غریب السند ہے۔
(۱۵) ۔ **معنعن** : وہ حدیث ہے جس کے تمام سلسلۂ سند میں عن فلاں، عن فلاں کے ذریعہ تصریح ہوئی ہو۔

---
[1] التدریب الراوی ص۱۰۵

(۱۶) ۔ معلق : جس حدیث کی سند کے شروع سے ایک یا زیادہ افراد حذف کر دیے گئے ہوں ۔

(۱۷) ۔ مفرد : وہ حدیث ہے جو ایک شخص یا ایک ہی مقام کے لوگوں سے نقل ہوئی ہو ۔

(۱۸) ۔ مدرج : متن حدیث میں راوی اپنا یا غیر کا کلام ملا دے، تو اس حدیث کو مدرج کہتے ہیں ۔

(۱۹) ۔ مشہور : وہ حدیث ہے جو محدثین کے نزدیک عام اور شہرت یافتہ ہو ۔

(۲۰) ۔ مصحف : وہ حدیث ہے جس کے بعض سند یا متن میں ۔ اسی جیسی حدیث کی بنا پر تبدیلی ہو گئی ہو ۔

(۲۱) ۔ عالی : وہ حدیث ہے جسمیں واسطے کم ہوں ۔

(۲۲) ۔ نازل : عالی کے برعکس جس میں واسطے زیادہ ہوں ۔

(۲۳) ۔ مسلسل : وہ حدیث ہے جس کے معصوم تک سلسلہ کے تمام افراد روایت کے وقت ان تمام خصوصیات کے حامل ہوں جن قولی اور فعلی خصوصیات کا راوی میں ہونا لازمی ہے ۔

(۲۴) ۔ معروف : وہ حدیث ہے جس کا مضمون راویوں کے درمیان مشہور ہو ۔

(۲۵) ۔ منکر : معروف کے برعکس اس حدیث کو کہتے ہیں جس کا مضمون راویوں کے درمیان مشہور نہ ہو ۔

(۲۶) ۔ مزید : وہ حدیث ہے جس کے سند یا متن میں اس جیسی حدیث کے متن و سند سے کچھ اضافہ ہو ۔

(۲۷) ۔ ناسخ : وہ حدیث ہے جو قرآن کے حکم یا دوسری حدیث کے حکم کو منسوخ کر رہی ہو ۔ ایسی حدیثیں صرف پیغمبرؐ سے مخصوص ہیں ۔

(۲۸) ۔ منسوخ : حدیث ناسخ کے برعکس ہوتی ہے ۔

(۲۹) ۔ مقبول : وہ حدیث ہے جس کا متن علماء کے درمیان مقبول ہو ۔

(۳۰) ۔ مشکل : وہ حدیث ہے جو مشکل الفاظ و معانی پر مشتمل ہو ۔

(۳۱)۔ مشترک: وہ حدیث ہے جس میں کوئی راوی ثقہ اور غیر ثقہ کے درمیان مشترک ہو۔ اس کی پہچان علم رجال سے ہوتی ہے۔

(۳۲)۔(۳۳) — موتلف و مختلف: وہ حدیث ہے جس کے سلسلۂ سند میں ایسے شخص کا ذکر ہو جو دو طرح پڑھا جائے دراں حالیکہ ایک ہی طرح سے لکھا جاتا ہو۔

(۳۴)۔ مطروح: وہ حدیث ہے جو دلیل قطعی کی مخالف اور ناقابل تاویل ہو۔

(۳۵)۔ متروک: وہ حدیث ہے جس کے سلسلۂ سند میں کوئی ایسا راوی ہو جو جھوٹ سے منسوب ہو۔

(۳۶)۔ مؤول: وہ حدیث ہے جو عقلی اور نقلی دلیل کے ذریعہ خلاف ظاہر پر محمول کی گئی ہو۔

(۳۷)۔ مبیّن: ایسی حدیث کو کہتے ہیں جس کے متن کے الفاظ ظاہر الدلالہ ہوں۔

(۳۸)۔ مجمل: حدیث مجمل مبین کے برعکس ہوتی ہے۔

(۳۹)۔ معلل: وہ حدیث ہے جس میں علت حکم بھی ہو۔

(۴۰)۔ مضطرب: وہ حدیث ہے جو سند یا متن کے اعتبار سے مختلف انداز میں نقل ہوئی ہو۔

(۴۱)۔ مہمل: جس حدیث کے بعض رجال کا نام کتب رجال میں موجود نہ ہو۔

(۴۲)۔ مجہول: وہ حدیث ہے جس میں ترتیب وار سلسلۂ سند ہو مگر اس کے رجال کا مذہب معلوم نہ ہو۔

(۴۳)۔ موضوع: وہ حدیث ہے جس کو راوی نے خود ہی گڑھ لیا ہو۔

(۴۴)۔ مقلوب: ایسی حدیث جو مشہور کی نوع سے ہو مگر رغبت کی بنا پر کوئی نفع بخش چیز اسمیں وضع کرلی گئی ہو۔

(۴۵)۔ حدیث ماثور: وہ حدیث ہے جس کو خلف نے سلف سے روایت کیا ہو۔

(۴۶)۔ حدیث قدسی: وہ کلام الٰہی جس کا نزول اعجاز کے لئے نہ ہو، برخلاف قرآن کے جو اعجاز بن کر نازل ہوا ہے (دوسری جگہوں پر بھی اس حدیث کے سلسلہ میں تذکرے موجود ہیں)

(۴۷)۔ عزیز: صحیح و حسن، حدیث کی تیرہ قسموں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

(۴۸) ۔ حدیث زائد الثقہ : صحیح اور حسن حدیثوں کی قسموں میں سے ایک قسم یہ بھی ہے۔[1]

(۴۹) ۔ موثق : جس کے رجال مورد اطمینان ہوں چاہے ان میں سے بعض شیعہ نہ ہوں۔

(۵۰) ۔ متواتر : وہ حدیث ہے جو اتنے مختلف افراد سے نقل ہوئی ہو جن کا اس حدیث کو وضع کرنا محال ہو ۔ متواتر کی دو قسمیں ہیں، لفظ کے اعتبار سے متواتر، معنی کے اعتبار سے متواتر، لیکن اگر لفظ میں تواتر ہو تو معنی ہونے کا خطرہ ہو سکتا ہے ۔

---

[1] حدیث کی قسموں کی معلومات کے لئے "التدریب الراوی" ص ۲۱ اور اس کے بعد کے صفحات، کتاب علوم الحدیث ص ۱۰۹ سے ص ۱۲۳ تک، دایرۃ المعارف اسلامی (انگلش) ص ۲۳ سے ص ۲۸ تک، لغتنامہ دھخدا جلد ح ص ۳۹۵ سے ص ۳۹۹ تک، نہایۃ الدرایۃ ص ۴ اور اس کے بعد کے صفحات ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

آیت اللہ شہید باقر الصدر
ترجمہ: جناب سید محمد ظفر حسینی

قرآن کا فلسفۂ تاریخ

اس عنوان کے تحت بحث کے لئے سب سے پہلے ہم جس موضوع کا انتخاب کر رہے ہیں وہ ہے "قرآن کریم میں تاریخ کے اصول و ضوابط"۔ اس سلسلے میں جو سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں، یوں ہیں: کیا قرآن کریم میں بشری تاریخ کے کچھ اصول و ضوابط پائے جاتے ہیں؟ ۔ کیا تاریخ انسانی کچھ ایسے قوانین کی حامل ہے جو اس کے ارتقائی سفر پر حاکم ہوں؟ ۔ وہ کون سے اصول و ضوابط ہیں بشری تاریخ جنکی گرفت میں ہے؟ ۔ تاریخ انسان کا آغاز کیونکر ہوا؟ ۔ اس کی نشو و نما کس طرح ہوئی؟ ۔ اس نے اپنا ارتقائی سفر کیسے طے کیا؟ نظریۂ تاریخ کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ ۔ عملیۂ تاریخ میں انسان کا کیا کردار ہے؟ ۔ عالم بشریت میں آسمانی نبوّت و رسالت کے کیا نقوش و اثرات ہیں؟ ۔ یہ وہ تمام سوالات ہیں جن سے مذکورہ بالا موضوع یعنی "قرآن میں تاریخ کے اصول و ضوابط" کے تحت ہمیں بحث کرنا ہے ۔ اور یہ قرآن کا وہ رخ ہے جو مختلف زاویوں اور عنوانات سے سہی لیکن قرآن کریم کے بیشتر حصوں میں زیر بحث آیا ہے، مثال کے طور پر انبیاء علیہم السلام کے قصوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو اس قرآنی پہلو کے عظیم جزو کی نمائندگی کرتے ہیں، انبیاء کرام کے قصے تاریخی نقطۂ نظر سے زیر بحث آئے ہیں، جن سے مؤرخین نے مکمل استفادہ کیا ہے اور ان تمام واقعات و حوادث سے متعرض ہوئے ہیں جنھیں قرآن کریم نے بیان کیا ہے اور جب انھوں نے کہیں پر کوئی ایسا خلا محسوس کیا ہے جسے قرآن نے پُر نہیں کیا ہے تو انھوں نے اسے روایات و احادیث کے ذریعہ پُر کرنے کی کوشش کی ہے یا جو کچھ گذشتہ مذاہب کی کتابوں میں نقل ہوا ہے اس سے خلا کو بھرنا چاہا ہے اور یا جھوٹی داستانوں اور خرافات کے ذریعہ اسے ختم کرنے کی سعی کی ہے جس کے نتیجہ میں اس قرآنی پہلو کے نظم و ترتیب کی غرض سے تاریخ سے متعلق دفتر کے دفتر معرض وجود میں آگئے ہیں۔

اسی صورت قرآن میں اس پہلو پر ایک اور زاویہ یعنی قرآن کے اسلوب داستان نگاری کے نقطۂ نظر سے بھی بحث ہوئی ہے، نیز یہ کہ یہ قرآنی اسلوب حقیقت و واقعیت، قدرت بیان اور ندرت کلام کے جوہروں سے کس حد تک آراستہ ہے، قرآنی قصے حیاتی پہلوؤں اور تحرک بخش و واقعات آفریں عناصر کی دولت سے کتنے زیادہ مالامال ہیں؟ ــــ یہ بھی چند ایسے گوشے ہیں جن پر گذشتہ موضوع کے تحت بحث ناگزیر ہے، نیز ان کے علاوہ بھی قابل بحث کچھ اور موضوعات ہیں، لیکن ہم فی الحال مذکورہ عنوان کے تحت جس زاویہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ــــ "اس گوشے سے تاریخ کے اصول و ضوابط پر کس حد تک روشنی پڑتی ہے" "تاریخی اصول و ضوابط سے ہماری مراد وہ قوانین و حدود ہیں جو حرکت تاریخ میں مکمل طور پر کار فرما ہیں بشرطیکہ قرآن نے اس طرح کے اصول و ضوابط اور قوانین و حدود کا کوئی تصور ہمیں عطا کیا ہو۔

دوسرے علوم و فنون کی مانند تاریخ کی دنیا میں بھی ہمیں کچھ موجودات و ظواہر نظر آتے ہیں جس طرح فلکیات و طبیعیات وغیرہ کے میدانوں میں کچھ ظواہر ملتے ہیں اسی صورت تاریخی میدان میں بھی ــ جس کی توضیح و تشریح مخصوص معنوں میں ہم عنقریب تاریخ ہی سے پیش کریں گے، موجودات و ظواہر کی ایک تعداد نظر آتی ہے اور جس طرح دیگر میدانوں میں ان موجودات و ظواہر کے لئے کچھ اصول و ضوابط اور قوانین و حدود معین ہیں اسی صورت ہمیں یہ دریافت کرنے کا حق حاصل ہے کہ تاریخی میدان میں پائے جانے والے ظواہر بھی کچھ اصول و ضوابط کے حامل ہیں یا نہیں؟ ان اصول و ضوابط اور قوانین و حدود کے بارے میں قرآن کریم کا موقف کیا ہے؟ اور قرآن نے ان کے متعلق مثبت یا منفی انداز میں، مجمل یا مفصل طور پر کس نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے؟؟

بعض لوگ اس وہم کے شکار ہیں کہ ہمیں ــــ یہ توقع وابستہ نہیں کرنا چاہئے کہ قرآن کریم میں "تاریخ کے اصول و ضوابط" جیسے موضوع پر کوئی بحث موجود ہوگی، کیونکہ طبیعیات، ایٹم اور نباتات وغیرہ کے قواعد و ضوابط کی مانند، تاریخ کے اصول و ضوابط کا مسئلہ بھی ایک علمی مسئلہ ہے اور قرآن اکتشافات و اختراعات کی کتاب کی حیثیت سے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی حیثیت کتاب رشد و ہدایت کی ہے۔ قرآن کسی درسی کتاب کی شکل میں نہیں آیا ہے اور رسول اللہ پر ایک معلم کے عنوان سے نہیں نازل ہوا ہے ان معنوں میں کہ جس طرح شاگرد کیلئے استاد کی باتیں لائق تقلید و عمل ہوتی

ہیں، اسی صورت قرآن کا وجود بھی ایک استادؔ کے لیے، تاکہ وہ اہلِ علوم اور متمدن و تہذیب یافتہ لوگوں کے ایک گروہ کا معلم و مربی ہو بلکہ یہ کتاب صرف اس لئے نازل ہوئی ہے کہ لوگوں کو گمراہی اور جاہلیت کے اندھیروں سے نکال کر رشد و ہدایت اور اسلام کے اجالوں میں لے آئے، لہٰذا اسے محض کتاب اصلاح و ہدایت کہا جا سکتا ہے نہ یہ کہ اکتشافات و اختراعات کی کتاب تصور کیا جائے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیں قطعاً یہ امید نہیں رکھنا چاہیئے کہ قرآن دیگر علوم و فنون سے متعلق کسی قسم کے حقائق و معارف اور ان کے بنیادی قواعد و ضوابط کے بارے میں کوئی نظریہ پیش کرے گا، یا طبیعیات، کیمیا اور نباتات و حیوانیات وغیرہ جیسے موضوعات پر کوئی بحث و تبصرہ کرے گا۔ البتہ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ان تمام علوم و فنون کی طرف قرآن میں اشارات ضرور موجود ہیں لیکن یہ اشارات بس اسی حد تک ملتے ہیں جس حد تک قرآن کے ان ہی پہلو (اثبات الوہیت کے مسئلے) پر روشنی پڑ سکے اور اس الٰہی کتاب کا ربانی رخ سامنے آ سکے۔ ایک ایسی کتاب۔ جو ماضی، حال اور مستقبل کے تمام حالات کا اپنے دامن میں احاطہ کئے ہوئے ہے جس کو گوناگوں علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں انسانی تجربات و انکشافات پر علمی حقائق و معارف اور بے شمار رازہائے سربستہ کے چہروں سے نقاب کشائی کے سلسلے میں صدیوں کی سبقت و اولیت حاصل ہے، لیکن یہ قرآنی اشارات و کنایات ان ہی علمی اغراض و مقاصد کے تحت ہیں جن کا ابھی تذکرہ ہوا ہے نہ یہ کہ ان کا مقصد فزیکس اور کیمسٹری وغیرہ کی تعلیم دینا ہو۔ قرآن، انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کی جگہ خود نہیں لینا چاہتا ہے اور نہ اس کی خداداد لیاقتوں اور صلاحیتوں کو تلاش اور ریسرچ سے ذرا بھی باز رکھنا چاہتا ہے خواہ وہ زندگی کے شعبوں میں سے کسی بھی شعبۂ حیات میں تلاش اور ریسرچ کا مسئلہ ہو، جس کا ایک جزء تجربات و مشاہدات اور موجودات سے آشنائی بھی ہے، چنانچہ قرآن نے کبھی بھی ان امور کی جگہ خود نہیں لینا چاہی ہے، بلکہ خود کو ایک ایسی روحانی اور معنوی طاقت کے عنوان سے پیش کیا ہے جس کا کام انسان کی ہدایت و رہنمائی، اس کی خوابیدہ طاقتوں کو بروئے کار لانا، زندگی کے سچے راستے پر اسے گامزن کرنا اور ولولہ و تحرک عطا کرنا ہے۔

غرضکہ یہ بات جب تسلیم شدہ ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کا فریضہ لوگوں کی ہدایت و رہنمائی ہے اور وہ اکتشافات و اختراعات کی کتاب نہیں ہے تو اب ہمارے لئے اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے کہ ہم یہ بیجا توقع رکھیں کہ قرآن ان تمام علوم و فنون سے متعرض ہو جن کے اصول و ضوابط کی تعیین و حد بندی اور قوانین و حدود طے کرنا انسانی فہم و دماغ کا کام ہے۔ ہم کیوں بلاوجہ منتظر رہیں کہ قرآن علوم و فنون کے بنیادی اصول کی نشاندہی کرے گا اور اس سلسلے میں اپنے نظریات بیان کرے گا؟ یا کائنات کے بے شمار شعبوں اور میدانوں میں سے صرف شعبۂ تاریخ میں اس کے اصول و ضوابط سے متعلق کوئی علمی مفہوم ہمارے سامنے پیش کرے گا؟؟

۔ جبکہ دیگر شعبوں میں قرآن نے اس طرح کی کوئی روش نہیں اپنائی ہے، اور اس سلسلے میں قرآن پر کوئی اعتراض بھی وارد نہیں ہوسکتا کہ وہ دیگر میدانوں میں اس قسم کے رویہ کا حامل کیوں نہیں ہے؟؟ ۔ کیونکہ اگر ان اصول وضوابط اور قواعد و قوانین کی نشاندہی اور حقائق و معارف کی نقاب کشائی کی ذمہ داری قرآن کے دوش پر ہوتی تو اس کتاب کی نوعیت بھی کچھ اور ہی ہوتی پھر یہ پوری دنیائے بشریت کے فائدے اور مقصد کی کتاب نہ رہ جاتا بلکہ علوم و فنون کے ماہر طبقہ کی مخصوص کتاب ہو جاتا جیسے ایک سی اور نصابی کتاب کے عنوان سے مخصوص گروہوں، شعبوں اور حلقوں میں پڑھایا جاتا۔

ہمارے اختیار کردہ موضوع سے متعلق بعض افراد کے یہ چند اعتراضات ہیں اور باوجودیکہ کسی حد تک یہ اعتراضات بجا اور درست ہیں یعنی قرآن اکتشافات و اختراعات کی کتاب نہیں ہے، وہ انسان کی ارتقائی طاقتوں، ایجاد و اختراع کی قوتوں اور تلاش اور ریسرچ کی صلاحیتوں کو زنگ آلود نہیں بنانا چاہتا ہے، بلکہ وہ رشد و ہدایت کی کتاب ہے، اس کے باوجود ہمیں تاریخ اور دنیا کے دیگر علوم و فنون کے درمیان ایک بنیادی فرق نظر آتا ہے اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو تاریخ پر حاکم اصول و ضوابط سے ایک ایسا مسئلہ وجود میں لاتا ہے جسے علوم کے دیگر شعبوں اور بشری معارف کے دیگر میدانوں کے برخلاف قرآنی فریضہ سے بے حد گہرا ربط اور زبردست لگاؤ ہے۔ (یعنی ہدایت ہی کی طرح وہ بھی قرآن کی اہم ترین ذمہ داری ہے) اور وہ یہ ہے کہ قرآن کتاب ہدایت ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاح بشری اور تغییر باطن کی کتاب بھی ہے "اور تغییر باطن" یہ قرآن کی وہی ذمہ داری ہے جس کو خود اس نے ظلمت سے نکال کر نور میں لانے" سے تعبیر کیا ہے، "یخرجھم من الظلمات الی النور"

"تغییر باطن" کا عمل دو بہلوؤں کا حامل ہے۔ اس کا اولین پہلو اس کے مضمون اور مطالب و مفاہیم کا ہے، جنکی بازگشت احکام الٰہی، ضوابط حیات اور قوانین زندگی کی جانب ہوتی ہے اور جنھیں ہم تشریعی امور کا نام دیتے ہیں عمل تغییر کا یہ الٰہی، ربانی اور آسمانی پہلو ہے، یہی پہلو اس شریعت الٰہیہ کی نمائندگی کرتا ہے جو نبی اکرمؐ پر نازل ہوئی اور جس کا نزول ہوتے ہی تمام تاریخوں میں اس کا چرچا ہوا، کیونکہ یہ شریعت اس ماحول کی وسعت سے جس میں نازل ہوئی تھی کہیں زیادہ بڑی اور اس فرد کے دائرۂ وجود سے جس کو اس کی تبلیغ و رسالت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، کہیں زیادہ وسیع تھی ۔ چنانچہ عمل تغییر کے اس پہلو کو مضمون اور مطالب و مفاہیم کے پہلو کا نام دیا جاسکتا ہے، نیز اسے تشریعی احکام اور ایسے قواعد و قوانین کے نام سے بھی یاد کرسکتے ہیں، عمل تغییر جن کی پابندی ہم پر لازم قرار دیتا ہے اور یہی اس کا الٰہی و ربانی پہلو بھی ہے۔ اس کے علاوہ عمل تغییر ایک اور پہلو کا حامل ہے جو نبی اکرمؐ اور اصحاب کرام کے ذریعہ بروئے کار آیا ہے، چنانچہ ہم جب سے ایک ایسے عمل کی شکل میں جو لوگوں کے ایک گروہ یعنی پیغمبر اکرمؐ اور اصحاب کرام کی ذوات مقدسہ میں مجسم ہو کر سامنے آیا ہے۔ ملاحظہ کرتے ہیں۔

اور ایسے ان افراد میں مجسم ایک اجتماعی عمل کے روپ میں دیکھتے ہیں نیز یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مختلف حالات و واقعات کے موڑ سے گذرا ہے اور جس نے متعدد اعتقادی، معاشرتی، سیاسی اور فوجی میدانوں میں اجتماعی بحث و نزاع کے مختلف مراحل سر کئے ہیں، (اسی صورت) جب ہم تغییر کے اس عمل کا اس حیثیت سے جائزہ لیتے ہیں کہ یہ عرصۂ تاریخ میں واقع ایک ایسا مجسم بشری کردار ہے جس کا (تاریخی دنیا کے علاوہ) دوسرے گروہوں اور دیگر حالات و واقعات سے بھی ایک ایسا تعلق ربط اور لگاؤ ہے، جو اس کی تائید و تردید دونوں کا مستحق بن سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جب عمل تغییر کا اس نقطۂ نظر سے ہم مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ انسانی جنبہ کے حامل ایک بشری کردار کی شکل میں سامنے آتا ہے اور یہ وہ افراد ہیں جن پر دوسرے لوگوں کی مانند تاریخی اصول و ضوابط بہت زیادہ حد تک حکم فرما ہوتے ہیں بالکل اسی صورت سے کہ جیسے دیگر طبقات اور گروہوں پر انکی فرماں روائی ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ عمل تغییر اس کد و کاوش کا نام ہے جو قرآن کریم اور پیغمبر اکرمؐ کی جانفشانیوں کا ثمرہ جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک قانون و شریعت اور دوسرا وحی و الہام، چنانچہ وہ ایک الٰہی و ربانی عمل اور بشری تاریخ کی سطح سے کہیں زیادہ بلند اور مافوق ہے، لیکن اس اعتبار سے کہ وہ ایک ایسا عمل ہے جسے تاریخ انسانیت کے میدان میں انجام دیا جا رہا ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ ایک ایسی بشری سعی و کوشش کا نام ہے جس کا براہ راست دوسری بشری کاوشوں اور کوششوں سے مقابلہ اور ٹکراؤ ہے۔ بہرحال اسے ایک ایسا تاریخی عمل تسلیم کرنا ہوگا جس پر تاریخی اصول و ضوابط بہرصورت حاکم ہوں گے، چنانچہ خداوند عالم نے موجودات عالم کے نظم و ضبط کی خاطر تاریخ کی دنیا میں جو قواعد و قوانین وضع فرمائے ہیں وہ اس پر حکم فرما ہیں، ـــ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ جب قرآن عمل تغییر کے اسی دوسرے پہلو یعنی بشری و انسانی جنبہ کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو اس کا محور محض ذات بشر ہوتی ہے، آسمانی پیغام اور وحی و الہام کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ انسان کے صرف بشری جنبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے گفتگو کرتا ہے اور ان انسانوں کا تذکرہ کرتا ہے جہاں وہ تمام تاریخی اصول و ضوابط حکم فرما ہوتے ہیں جو دوسرے افراد کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، مثال کے طور پر ہمیں یہ ملے گا کہ جب قرآن نے جنگ احد میں مسلمانوں کی فتح و کامیابی کے مسئلے پر روشنی ڈالنا چاہی، درصورتیکہ وہ جنگ بدر میں عظیم الشان نمایاں کامیابی حاصل کر چکے تھے لیکن اس کے بعد انہیں جنگ احد میں کافی نقصانات اٹھانے پڑے اور ابتدا میں شکست کا سامنا کرنا پڑا؟ تو جب قرآن نے اس نقصان اور شکست کا تذکرہ کیا تو کن الفاظ میں کیا؟ ـــ کیا یہ کہا کہ سماوی پیغام اور نبوت و رسالت کو نقصان و شکست کا سامنا کرنا پڑا؟!...

نہیں! یہ ہرگز نہیں کہا!!.... کیونکہ وحی الٰہی اور نبوت و رسالت کا مرتبہ دنیاوی معیاروں کے مطابق وضع کئے گئے فتح و شکست کے مفاہیم سے کہیں زیادہ برتر اور بلند ہے، الٰہی پیغام اور نبوت و رسالت کبھی شکست خوردہ

ہوئے ہیں اور نہ کبھی شکست کھا سکتے ہیں، ہاں: جسے شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے وہ صرف انسان ہے خواہ یہ وہی انسان کیوں نہ ہو جس کو الٰہی پیغام کی تبلیغ و رسالت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بہرحال تاریخی اصول و ضوابط کی گرفت میں ہوتا ہے، چنانچہ ہمیں اس سلسلے میں قرآن کا ارشاد یوں ملے گا: وتلک الایام نداولها بین الناس (آل عمران/۱۴۰) یعنی یہ (فتح و شکست کے) وہ دن ہیں جنھیں ہم لوگوں کو یکے بعد دیگرے دکھاتے رہتے ہیں۔ یہاں پر قرآن نے انسانوں کا ذکر بحیثیت انسان کے کیا ہے، چنانچہ مقصود قرآنی یہ ہے کہ اس واقعہ کا ربط دراصل تاریخی اصول و ضوابط سے ہے مسلمانوں کو جنگ بدر میں ایسی صورت حال میں کامیابی نصیب ہوئی جب تاریخی اصول و ضوابط کے مطابق اس وقت کے موجودہ حالات فتح و کامیابی کے متقاضی تھے اور معرکۂ احد میں انھیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا جب تاریخ کی رو سے اس وقت کی صورت حال شکست و ہزیمت ہی کی متقاضی تھی: ان یمسسکم قرح فقد مس القوم... الخ (آل عمران/۱۴۰) یعنی اگر تمہیں شکست اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑا ہے تو تمہارے دشمنوں پر بھی یہ افتاد پڑے گی، ہم نے فتح و شکست کے دنوں کو باری باری سب کے لئے قرار دیا ہے — قرآن کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم یہ تصور ہرگز نہ کرنا کہ فتح و کامیابی اللہ کا عطا کردہ تمہارا ذاتی حق ہے بلکہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ نصرت و کامیابی تمہارا فطری حق ہے، بشرطیکہ تم نے ان تاریخی اصول و قوانین کی روشنی میں اس کے اسباب و مقدمات خود فراہم کئے ہوں، جو حصول کامیابی کے لئے خداوند عالم کی جانب سے معین کئے گئے ہیں، چنانچہ جنگ احد میں تمہاری ناکامی کا یہی سبب ہوا، چونکہ تمہارے حالات فتح کے متقاضی نہیں تھے اس لئے شکست کا منہ دیکھنا پڑا — غرضکہ یہاں پر قرآن کا روئے سخن بشر کی طرف بعنوان بشر ہے۔ اس کی گفتگو کا محور بشری اعمال و افعال ہیں، یہاں پیغام سماوی اور منصب نبوت و رسالت سے کوئی بحث نہیں ہے اور صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں بلکہ قرآن اس مرحلے میں اور بھی آگے گیا ہے اور اس نے پردۂ تاریخ پر نقل و حرکت کرنے والی نہایت پاکیزہ و پارسا مخلوق یعنی دنیائے بشریت کو دھمکی تک دی ہے، چنانچہ خطاب کرکے کہا ہے کہ اگر تم اپنا تاریخی کردار صحیح معنوں میں ادا نہ کروگے اور خود کو اس بات کا اہل نہ بناؤ گے کہ الٰہی پیغام کی تبلیغی ذمہ داری اور منصب رسالت کا بار سنبھال سکو تو اس کا قطعاً یہ مطلب نہ ہوگا کہ وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو اور پیغمبری کا کام بند کر دیا جائے اور تاریخی اصول و قوانین نافذ نہ کئے جائیں، ایسا ہرگز نہ ہوگا، تم اگر اپنا فریضہ ادا نہ کروگے تو تمہاری جگہ پر دوسروں کو لایا جائے گا تاریخ تمہیں اپنے منصب سے معزول کرکے تمہارے بدلے یہ ذمہ داری دوسری امتوں کے حوالے کر دے گی، جو تمہارے مقابلے میں تم سے کہیں زیادہ بہتر اسباب و حالات فراہم کرنے کی اہل ہوں گی اور تم سے کہیں زیادہ بہتر انداز میں اپنے فرائض و کردار ادا کر سکیں گی، اور صرف یہی نہیں بلکہ ایسی صورت حال میں جب حالات اس امر کے متقاضی نہ ہوں گے کہ تم لوگوں پر گواہ بن سکو تو پھر وہ امتیں تم پر اور تمام لوگوں پر گواہ قرار دی جائیں گی۔ چنانچہ اس مطلب کی طرف یوں اشارہ کیا ہے: الا تنفروا یعذبکم...... الخ (توبہ/۳۹)

یعنی اگر تم نے خود کو جہاد کے لئے آمادہ نہ کیا تو دردناک عذاب میں مبتلا ہوگے، اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لائے گا، تم اسے کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکتے ہو وہ ہر امر پر قادر ہے۔ دوسری جگہ یوں ارشاد ہے:

یا ایها الذین آمنوا من یرتد منکم عن دینه ...... الخ (مائدہ/۵۴) یعنی اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی بھی اپنے دین سے منحرف اور مرتد ہوا تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض ایسے لوگوں کو وجود میں لائے گا جنہیں وہ خود دوست رکھتا ہوگا اور وہ بھی اسے دوست رکھتے ہوں گے، جو مومنین سے انکسار و خاکساری کے ساتھ پیش آئیں گے، کافروں سے شدت و سختی کا سلوک روا رکھیں گے، راہ خدا میں جہاد کریں گے اور انھیں ملامت کرنے والوں کی ملامت کا کوئی خوف و ہراس نہ ہوگا۔ یہ خدا کا لطف و کرم ہے وہ جسے چاہے نوازتا ہے اور وہ صاحب وسعت اور علیم و دانا ہے۔

معلوم ہوا کہ ان جگہوں پر قرآن کا موضوع بحث عمل تغییر کا دوسرا رخ بشری پہلو ہے اور انسان سے اس کی گفتگو اس کی کمزوری و ناتوانی، استقامت و پامردی، انحراف و گمراہی اور حالات کی فراہمی و عدم فراہمی اور سازگاری و ناسازگاری کے بارے میں ہے۔

چنانچہ یہ بات یہیں سے ثابت ہو جاتی ہے کہ تاریخ اور تاریخی اصول و ضوابط کے موضوع کا قرآن جیسی الٰہی کتاب سے جو اگرچہ رشد و ہدایت کی کتاب ہے اور لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور میں لانے کے لئے نازل ہوئی ہے ــ بے حد گہرا ربط اور اعضائے جسمانی کا سا شدید تعلق ہے، کیونکہ عمل تغییر کے عملی رخ یا یوں کہا جائے کہ اس کے بشری پہلو کا تسلیم ہمیشہ تاریخ کے قواعد و قوانین کے سامنے خم اور سدا تاریخ کے زیر اثر ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس سے مکمل استفادہ کریں اور قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہمیں ایسے نظریات و تصورات عطا کرے جن سے فلسفہ تاریخ اور تاریخی اصول و ضوابط کے موضوع پر اسلام و قرآن کے بنیادی افکار و نظریات کا ایک ڈھانچہ سامنے آسکے۔

اس بیان سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ فلسفہ تاریخ کی نوعیت فزکس، کیمسٹری اور علوم فلکیات و حیوانیات و نباتیات وغیرہ کی سی نہیں ہے، کیونکہ ان علوم اور ان کے اصول و ضوابط کا تاریخ سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہے، لیکن اس کے برعکس تاریخ اور تاریخی اصول و ضوابط کا براہ راست رابطہ عمل تغییر سے ہے، اسی لئے جب بھی عمل تغییر کا دوسرا رخ زیر بحث آئے تو ضروری ہے کہ فلسفہ تاریخ اور تاریخی اصول و ضوابط کی بھی توضیح و تشریح کی جائے اور اس سلسلہ میں ہمیں قرآن سے پوری توقع رکھنا چاہیئے کہ وہ ہمیں اس موضوع سے متعلق بنیادی قواعد و قوانین سے آگاہ کرے، البتہ ہماری یہ توقعات قطعاً بیجا ہوں گی کہ قرآن علم تاریخ اور اس کے قواعد و ضوابط کی

ایک درسی کتاب کا کردار ادا کرے یعنی اس کے دامن میں تاریخ سے متعلق تمام تفصیلات و جزئیات موجود ہوں حتیٰ کہ اس میں وہ تمام باتیں بھی بیان کی گئی ہوں جن کا تغیر کے اس عمل سے — جسے نبی اکرم کی ذات گرامی نے انجام دیا ہے۔ دور کا بھی واسطہ نہ ہو، کیونکہ قرآن بنیادی طور پر رشد و ہدایت کی کتاب ہے، اس نے کسی بھی مرحلے پر اپنے اس وصف و امتیاز کو کھویا نہیں ہے، وہ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لانے والی کتاب ہے، چنانچہ ہر منزل میں وہ اپنی اس حقیقی شان اور ذاتی خصوصیت کا محافظ رہا ہے۔ اس نے تاریخ و فلسفۂ تاریخ کے موضوع پر جو کچھ بھی بحث کی ہے ان ہی حدود میں باقی رہتے ہوئے کی ہے اور تاریخ کے قواعد و قوانین کے متعلق موشگافیاں بھی بس اسی حد تک کی ہیں جس حد تک عمل تغیر کے پہلوؤں پر روشنی پڑ سکے اور وہ بھی بس اسی دائرے میں رہتے ہوئے جس دائرے میں رہ کر نبی اکرم نے اس کو انجام دیا ہے اور جس حد تک تاریخ و قوانین تاریخ کی جانب بشر کی رہنمائی ہوتی ہے اور وہ رونما ہونے والے واقعات و حادثات اور سامنے آنے والے احوالات و کیفیات نیز زندگی کی صورت حال کے بارے میں صحیح رائے اور سچا نظریہ قائم کرسکنے کے قابل ہوتا ہے۔

قرآن کریم کے مطالعے سے یہ حقیقت کھل کے ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ تاریخ کے بھی کچھ اصول و ضوابط ہیں، جس طرح دیگر دنیاوی علوم و فنون کچھ قواعد و قوانین کے حامل ہوتے ہیں اسی طرح تاریخ کی دنیا میں بھی اس کے کچھ قواعد و ضوابط معین ہیں، قرآن کریم میں یہ حقیقت نہایت واضح اور آشکار ہے، متعدد آیتوں میں مختلف عنوانات سے مختلف اسلوب اور انداز میں اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ انتہائی واضح طور پر اس بنیادی مفہوم کو جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے کہ قرآنی نظریہ کے تحت بھی تاریخ کے کچھ اصول ہیں اور اس کے کچھ قواعد و قوانین معین ہیں۔

بعض دوسری آیتوں میں ان قوانین کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جو انسان کے سفر تاریخ پر حکم فرما ہیں نیز ان کی مثالیں نمونے اور مصادیق بھی بیان کر دیے گئے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے مقام پر اس نظریہ یعنی فلسفۂ تاریخ کے بنیادی مفہوم کو اس کے مصادیق اور عملی نمونوں کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ بعض دیگر آیات میں تو گذشتہ حالات و واقعات کے سبق اور نصیحت حاصل کرنے کی بے حد تاکید کی گئی ہے اور تاریخ بشریت کی چھان بین اور اس کی گہری تحقیقات پر انسانی ہمت کو بھرپور ابھارا گیا ہے۔

جیسا کہ سبھی سمجھتے ہیں کہ پیش آنے والے واقعات و حادثات کی تحقیق و دریافت اور چھان بین کا کام بذات خود ایک علمی کام ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخی اصول و ضوابط کا گہرا جائزہ لیا جائے اور اس کے قواعد و قوانین کا باقاعدہ تجزیہ کیا جائے ورنہ بغیر کسی قاعدے قانون کے تحقیق و تجزیہ اور چھان بین کا کوئی مفہوم نہیں۔

غرضکہ قرآن کریم نے مختلف آیتوں میں متعدد لب و لہجہ میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے اور تاریخ کے اصول و ضوابط کے موضوع پر سیر حاصل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ⁂ ⁂

درس: آیۃ اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ: جناب ممتاز علی

فقیہ عالی قدر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ منتظری مدظلہ نے کچھ عرصہ سے نوجوان نسل کے لئے بعض اہم موضوعات پر مشتمل نہج البلاغہ کے شہ پاروں کی تشریح و توضیح کا نہایت مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ پیش نظر مقالہ "معرفت الٰہی" کے موضوع پر آپ کے درس کا ترجمہ ہے، جس میں مولائے کائنات کے خطبہ ۱۸۶ کی تشریح کی گئی ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری قسط ملاحظہ فرمائیے۔

(ادارہ)

"ولا حقیقتہ اصاب من مثّلہ"

خدا کی حقیقت کو اس نے درک نہیں کیا جو اس کے لئے مثل اور نظیر کا قائل ہو گیا ۔۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے شارحین نہج البلاغہ نے جو مطالب بیان کئے ہیں ان کو سمجھنے کے لئے وجود و ہستی کی بحث دہرانا ضروری ہے اس لئے ہم مجبوراً بعض گذشتہ مطالب کو پھر سے بیان کرتے ہیں۔

اشیاء کا تحقق وجود کے ذریعہ :

جب یہ کہا جاتا ہے کہ انسان موجود ہے یا درخت موجود ہے وغیرہ .... تو ایک قضیہ

بتاہے، یعنی "الانسان موجود" ــــ انسان موجود ہے ــــ ایک قضیہ ہے۔
انسانیت وہ ماہیت ہے کہ جب ہم اس پر ایک مفہوم بنام "وجود" کو حمل کرتے ہیں تو "الانسان موجود" ایک قضیہ بنتا ہے۔ آپ اس پر غور فرمائیں کہ انسانیت "وجود" کے واسطے سے متحقق ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ہستی اور وجود کو انسانیت سے سلب کر لیا جائے تو پھر کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی۔
اسی وجہ سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ "انسان موجود ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان خارج میں ایک واقعیت رکھتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ جو چیز خارج میں پائی جاتی ہے اور واقعیت رکھتی ہے وہ شئے کی "ہستی" ہے۔ اسی لئے ہستی کو نور سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

ہستی کی نور سے تشبیہ :

نور کی تعریف میں کہا جاتا ہے : "الظاہر بذاتہ المظہر لغیرہ"
نور وہ شئے ہے جو خود بھی ظاہر ہے اور دوسری چیزوں کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ یعنی دوسری چیزیں بھی نور کے جلوہ اور اثر سے منور اور واضح ہوتی ہیں۔

وجود اور ہستی بھی کچھ اسی طرح ہے وجود اور ہستی اپنی جگہ پر ایک واقعیت کی حامل ہے اور یہی وجود، ماہیت کو بھی واقعیت بخشتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ انسان موجود ہے درخت موجود ہے، آسمان موجود ہے .... اگر اس "موجودیت" اور "ہستی" کو اشیاء سے جدا کر دیا جائے تو ساری چیزیں عدم محض کی آغوش میں نظر آئیں گی۔

لہٰذا جو چیز واقعیت کی حامل ہے وہ اشیاء کی "ہستی" ہے اور ہستی پر نور کی تعریف صادق آتی ہے اس لئے کہ ہستی خود بھی ظاہر ہے اور دوسری ماہیتوں کو بھی ظاہر کرتی ہے
قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے؛ اللہ نور السمٰوات والارض ــــ خدا زمین وآسمان کا نور ہے۔ یعنی خدا خود متحقق ہے۔ واقعیت رکھتا ہے اور دوسری چیزیں بھی خدا کی وجہ سے واقعیت اور تحقق پیدا کرتی ہیں۔

جب ہم نے نور کی مثال بیان کی ہے تو یہ بتانا بھی لازمی ہے کہ نور کے مراتب ہیں۔

مثلاً دس، بیس، سو، ہزار شمعوں یا اس سے زیادہ شمعوں والے فانوس کے نور میں آپس میں فرق ہوتا ہے۔ شمعیں جتنی زیادہ ہوتی جائیں گی نورانیت اتنا ہی زیادہ ہوگا اور نورانیت اتنی ہی بڑھتی چلی جائیگی ۔۔۔ اور اگر ایک غیر متناہی نور فرض کیا جائے تو وہ دو نہیں ہو سکتا۔
بات کو واضح کرنے کے لیے یوں عرض کروں کہ فانوس کی روشنی چاہے کتنی ہی کیوں نہ بڑھ جائے پھر بھی وہ نور محدود ہوگا اس لئے کہ اس فانوس کی دوسری جانب ظلمت کا ڈیرہ ہوگا۔ یعنی نور و ظلمت ایک دوسرے کے آس پاس جمع ہوں گے اندھیرا جتنا گھٹتا جائے گا نور اتنا ہی بڑھتا جائیگا ۔۔۔ لیکن لامتناہی نور حد و حدود میں گھرا ہوا نہیں ہوگا۔ اس وجہ سے اس کے لئے دوئی فرض نہیں کی جا سکتی کیونکہ اگر دو فرض کر لیا جائے تو وہ محدود ہوگا اور وہ اس طرح کہ دو میں ایک نور دوسرے نور کی خصوصیت کا حامل نہیں ہوگا۔ اسمیں اس کا کمال اور اس میں اس کا کمال نہیں پایا جائے گا، اس طرح دونوں محدود ہوں گے ۔۔۔ لیکن ہم نے فرض تو یہ کیا ہے کہ نور غیر متناہی ہے اور اس کی کوئی حد نہیں اس لئے قہری طور پر غیر متناہی نور ایک ہوگا۔ اسمیں دوئی نہیں ہوگی۔

ہستی کے جلوے :

بہر حال لامتناہی نور جو فقط نور ہے ظلمت کی حد بندیوں سے بالاتر اور واحد ہے جس کے لئے تعدد فرض نہیں کیا جا سکتا ۔۔۔ اس نور کا لازمہ یہ ہے کہ اس کا پرتو اور جلوہ ہو۔
آفتاب کے نور کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نور صحن خانہ کو بھی منور کرتا ہے اور کمرہ بھی اس سے روشن نظر آتا ہے۔ ہاں کمرہ میں پہونچنے والی روشنی آنگن کی روشنی سے کم ضرور ہوتی ہے جس طرح آفتاب کا نور صحن اور کمرہ کو منور کرتا ہے اسی طرح ایک کوٹھری کو بھی روشن کرتا ہے مگر کوٹھری کی روشنی بہت ہلکی ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ صحن خانہ اور مرکز نور سے بہت دور ہوتی ہے۔
لامتناہی ہستی میں مذکورہ مفہوم کو فرض کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اس واحد اور غیر متناہی ہستی کے بھی مختلف جلوے ہیں اور وہ سارے جلوے اسی ہستی سے وابستہ ہیں وہ غیر متناہی

نور کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ہستی محض ہے۔ ہاں اس کے جلوے اس کے محتاج ہیں۔ اس لئے کہ وہ جلوے اسی نور کے پرتو ہیں اور غیر متناہی نور بے نیاز ہے۔

ہستی بھی نور کی طرح ہے جس طرح نور خود ظاہر ہوتا ہے اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح ہستی بھی خود محقق ہے اور دوسری ماہتیں بھی اسی کے ذریعہ محقق ہوتی ہیں اس لئے اگر ایک ایسی ہستی ہو جو ہستی محض ہو اور اس میں نیستی کا کہیں سے کبھی گذر نہ ہو سکے تو اس ہستی کو ہستی غیر متناہی کہتے ہیں۔

ذات خدا ایک ایسی لا متناہی حقیقت اور وجود ہے جس کے لئے دوئی محال ہے اور جیسا کہ ہم نے نور کی مثال میں ذکر کیا ہے اس کے بھی جلووں کے مراتب ہیں۔ یعنی ذات باری تعالیٰ کے بھی پرتو اور جلوے ہیں اور ان جلووں میں مراتب بھی پائے جاتے ہیں یہ جلوے سرچشمۂ نور سے جتنے دور ہوتے ہیں اتنے ہی مدہم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

خدا کے جلوے

فلسفیوں کے قول کے مطابق، عالم ملائکہ و مقربین درگاہ خدا، عالم عقول ہے۔ یہ عالم وہ جلوۂ خداوندی ہے جو خدا سے بہت ہی قریب ہے۔ یہ جلوے جب عالم مادّہ اور عالم ناسوت تک پہونچتے ہیں تو گھٹتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ عوالم میں، یہ عالم (عالم مادہ و ناسوت) پست ترین مرتبہ کا حامل ہے۔ فلاسفہ اسے ادنیٰ ترین عالم وجود کہتے ہیں۔

چنانچہ معلوم ہوا کہ ایک وجود ایسا بھی ہے جو غیر متناہی وجود ہے اور وہ باری تعالیٰ کا وجود ہے، ایسا وجود جس کے جلوے عالم میں بکھرے ہوئے ہیں دنیا کے تمام موجودات، خداوند عالم کے جلوے اور سائے ہیں مگر یہ تمام جلوے اس کی ذات سے جدا اور مستقل حیثیت نہیں رکھتے بلکہ یہ سب اسی سے وابستہ ہیں۔ خدا کے مقابل میں ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے جیسا کہ نور کی مثال میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ جو نور کوٹھری کے اندر ہوتا ہے وہ باہر کے نور کا پرتو ہوتا ہے اس کی اپنی الگ کوئی مستقل حیثیت نہیں ہوتی۔

اسی طرح ہم موجودات کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی بھی مستقل کوئی حیثیت نہیں ہے

بلکہ تمام موجودات اسی ہستی سے وابستہ ہیں جو مستقل، قائم بالذات اور قیوم بالذات ہے اور وہ ہستی خداوند عالم کی ہستی ہے۔

حضرت امیر المؤمنینؑ نے اس خطبہ میں جو یہ فرمایا ہے کہ "ولا حقیقتہ اصاب من مثّلہ" حقیقت خدا کو اس نے درک نہیں کیا جس نے خدا کے لئے مثل و مانند فرض کر لیا ـــــ یہاں مثل کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزیں باہم مشترک بھی ہوں ایک ہی حقیقت کی مصداق بھی ہوں اور دونوں کی حیثیت مستقل بھی ہو۔ یہ فرض محال ہے اس لئے کہ اگر ایک جیسے دو ہوں گے تو محدود ہوں گے ایک میں دوسرے کے جیسا کمال نہیں ہوگا اس بنا پر دونوں متناہی ہوں گے، اور ذات باری تعالیٰ غیر متناہی ہے اس کی ذات میں نیستی کا گذر نہیں ہے وہ ایسی لامتناہی حقیقت ہے جو "اپنی ضد" سے مرکب نہیں ہے۔ ایسی حقیقت ایک ہی ہو سکتی ہے دو نہیں ہو سکتی لہٰذا جس نے خدا کے لئے کوئی مثل فرض کیا اس نے خدا کی غیر متناہی حقیقت کو درک نہیں کیا۔

خدا کی ذات مرکب نہیں ہے:

شارحین نہج البلاغہ کا اس سلسلہ میں دوسرا بیان ذرا سخت ہے۔ لہٰذا ہم اس کو مختصر طور پر بیان کریں گے ـــــ شارحین کا کہنا ہے کہ اگر خدا کا کوئی مثل ہوتا تو اس کی تین صورتیں فرض کی جا سکتی ہیں ایک تو یہ کہ دونوں کی ذات ماہیت میں ایک ہوتی لیکن عوارض میں فرق ہوتا جیسے ـــــ زید و عمرو ـــــ ان کی ذات ایک ہے یعنی انسانیت میں دونوں شریک ہیں لیکن عوارض میں اختلاف ہے اور وہ اس طرح کہ کوئی سیاہ ہے تو کوئی سفید۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں جزو ذات میں آپس میں شریک ہوں اور فصل میں ایک دوسرے سے جدا ہوں جیسے انسان اور گھوڑا حیوانیت میں (جو جزو ذات ہے) آپس میں شریک ہیں، لیکن انسان وہ حیوان ہے جو ناطق ہے اور گھوڑا وہ حیوان ہے جو صامت ہے (اس طرح دونوں فصل میں جدا ہو جاتے ہیں)

تیسری صورت یہ ہے کہ دونوں تمام ذات میں ایک دوسرے سے امتیاز رکھتے ہوں لیکن ایک عرض میں آپس میں شریک ہوں، جیسے برف باری میں گرنے والی برف اور منجمد برف۔

بہر حال ان تینوں صورتوں میں ذات باری تعالیٰ میں ترکیب لازم آتی ہے۔ درآں حالیکہ وہ بسیط ہے ترکیب کا اس کی ذات میں گذر نہیں ہے۔

"ولا ایاہ عنی من شبہہ"

جو اس کے لئے تشبیہ کا قائل ہو گیا اس نے اس کا (خدا کا) قصد نہیں کیا۔

یہ فقرہ بھی گذشتہ جملے کے انداز کا ہے۔ مولاؑ نے فرمایا کہ جو اس کے لئے تشبیہ فرض کرے اس نے اس کا قصد نہیں کیا، اس لئے کہ اس کی شبیہ فرض کر لینے کے بعد وہ دو ہو جائے گا اور دو ہونے کے بعد محدود ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ خدا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ خدا اس لامحدود ہستی کا نام ہے جسمیں دوئی کا کہیں سے تصور پایا ہی نہیں جاتا۔

تمثیل اور تشبیہ:

بعض بزرگ علماء نے ان دونوں جملوں میں فرق بیان کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ جب دو چیزیں ذات میں ایک طرح کی ہوں تو مثل کہتے ہیں جیسے۔ زید و عمرو۔ دونوں انسان ہیں اور ذات میں ایک ہیں۔ لیکن اگر کیفیت اور عوارض میں ایک جیسے ہوں تو کہا جاتا ہے یہ ایک دوسرے کی شبیہ ہیں جیسے ایک شئے کا قد اگر لمبا ہو اور دوسری چیز کا قد بھی اسی طرح لمبا ہو تو یہاں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کی شبیہ ہیں اس لئے کہ یہاں مقدار کے اعتبار سے (جو عوارض میں سے ہے) شباہت ہوتی ہے۔

لہٰذا "مثل" ذات میں ایک جیسا ہونے کی بنا پر اور "شبیہ" عوارض میں ایک طرح ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور یہ بات بعید بھی نہیں ہے۔

لہٰذا جو خدا کی تشبیہ کا قائل ہو گیا اس نے خدا کا قصد نہیں کیا اس لئے کہ خدا کے عوارض نہیں ہیں کوئی شئے اس کی ذات اقدس پر عارض نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اگر کوئی چیز عارض ہو گی تو حادث بھی ہو گی ایسی صورت میں خدا کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا اور محل حوادث ہو کے بعد وہ دوسرے کا محتاج ہو جائے گا۔ یا پھر یہ کہا جائے کہ وہ "عرض" ازل سے خدا کے ساتھ ہے ایسی صورت میں خدا بھی قدیم ہوگا اور وہ عرض اور صفت بھی قدیم ہو گی اور اس سے تعدد قدماء لازم آتا ہے (جو باطل ہے)۔

لہٰذا خدا کسی قسم کے عارض کا حامل نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ موجودات میں سے کسی موجود کے عوارض کی شبیہ ہو سکے۔ صفات خدا عین ذات ہیں، یعنی علم و قدرت زائد بر ذات خدا نہیں ہیں۔ خدا ایک غیر متناہی ہستی ہے اور وہی لامتناہی ہستی علم و قدرت و حیاتِ غیر متناہی بھی ہے۔

"لا صمدہ من اشار الیہ و توھمہ"

جو اس کو (خدا کو) اپنے تصور کا پابند بنائے یا اس کی طرف اشارہ کرے، اس نے خدا کا رخ نہیں کیا۔

اشارہ کی قسمیں :

اشارہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ اشارۂ حسی، جب ہاتھ یا جسم کے کسی حصہ سے اشارہ کیا جائے تو یہ اشارہ، اشارۂ حسی ہے۔

۲۔ اشارہ توہمی، دماغ میں جب کسی چیز کو جگہ دی جائے اور وہ ذہن کی پیداوار ہو تو یہ اشارہ، اشارۂ توہمی ہے۔

اشارۂ حسی تو بالکل واضح ہے کہ ہم خدا کو انگلیوں کے اشارہ سے نہیں بتا سکتے، اس لئے کہ وہ جسم نہیں ہے جس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جا سکے۔ اسی طرح اشارۂ توہمی اور اشارۂ عقلی کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ خدا غیر متناہی وجود ہے اور ہمارا ذہن محدود ہے محدود، غیر محدود کا احاطہ نہیں کر سکتا، مثلاً (بلا تشبیہ) اگر دریا کو کوزہ میں سمیٹنا چاہیں تو دریا کوزہ میں نہیں سمٹ سکتا۔

ذہن و دماغ میں آنیوالی چیز خود ہمارے ذہن کی پیداوار اور مخلوق ہوتی ہے، اور خالق، مخلوق نہیں ہو سکتا! —— ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ ہم خدا کو صرف "صفات اضافیہ" یا "صفات سلبیہ" کے ذریعہ ہی پہچان سکتے ہیں۔ اس لئے کہ صفات اضافیہ میں اضافت کا دوسرا سرا خود ہم ہیں اور صفات سلبیہ کے ذریعہ اس طرح کہ محدود جسم ہیں اور خدا

محدود نہیں ہے۔ لہٰذا جو چیز جسم سے متعلق ہے ہم خدا سے اس شئے کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن خدا کی حقیقتِ ذات کا وجود اور نور غیر متناہی ہے ذہن و دماغ میں آجانا محال ہے۔

روایت ہے کہ:

"کل ما میزتموہ باوھامکم فی ادق معانیہ فھو مخلوق لکم، ولعل النمل الصغار تتوھم ان اللّٰہ تعالیٰ زبانیتین"

جو چیز تمہارے اوہام میں آتی ہے وہ چاہے کتنی ہی دقت نظر کی حامل کیوں نہ ہو وہ تمہارے ذہن کی پیداوار ہے۔ شاید چھوٹی سی چیونٹی بھی یہ سمجھتی ہے کہ اللہ کے دو سینگیں ہیں!!

حضرت کا یہ فرمانا کہ "چیونٹی بھی شاید یہ سمجھتی ہے" یہ اس لئے ہے کہ چیونٹی دو سینگوں کو اپنا کمال سمجھتی ہے۔ وہ اپنی فکر اور نظریہ کے مطابق اپنے ذہن میں خدا کو ڈھال لیتی ہے حضرت موسیٰ کے زمانہ کا چرواہا بھی یہ خیال کر رہا تھا کہ خدا بھی ہماری ہی طرح ہوگا جو چیزیں ہم لوگ کھاتے ہیں، اگر خدا کی پذیرائی بھی اسی سے کی جائے تو وہ لطف اندوز ہوگا!! اور یہی سمجھ کر وہ خدا سے کہا کرتا تھا:

تو کجائی تا شوم من چاکرت ❊ چارقت دوزم کنم شانہ سرت

دستکت بوسم، بمالم پایکت ❊ وقت خواب آیم بروبم جایکت

وہ ایسی چیزوں کو اپنے لئے کمال سمجھتا تھا، لہٰذا اس نے خدا کے لئے بھی ایسی ہی باتیں فرض کرلیں اور اپنے چھوٹے سے ذہن میں بھی اس نے ایسے ہی خدا کا تصور کیا۔

بنا بریں کہا جا سکتا ہے کہ جس نے اپنے ہاتھوں سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے اس کا قصد نہیں کیا، اس لئے کہ خدا جسم نہیں ہے جس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کیا جاسکے اور جس نے اپنے خیالات اور تصور کے ذریعہ خدا کو اپنے دماغ میں جگہ دینے کی کوشش کی اس نے بھی خدا کا رخ نہیں کیا اس لئے کہ یہ ذہن و دماغ محدود ہیں اور خدا لامحدود ہے۔ ہمارے ذہن میں جو بات بھی آتی ہے وہ مخلوق اور ہمارے ذہن کی پیداوار ہے، چاہے وہ کتنی ہی باریک اور عمیق کیوں نہ ہو۔ اور خدا ہمارے ذہن و دماغ بلکہ تمام موجودات کا خالق ہے وہ نہ مخلوق ہے اور نہ مخلوق کے ذہن میں سما سکتا ہے۔

استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ترجمہ: جناب محمد تقی رحیمیان و جناب منظور محسن رضوی

انسان اور فطرت

طبیعت، غریزہ اور فطرت کی تشریح:

تین الفاظ ایسے ہیں جن کا ایک دوسرے سے فرق بیان کرنا ضروری ہے اور وہ طبیعت، غریزہ اور فطرت ہیں۔

طبیعت:

عام طور سے بے جان موجودات کے لئے لفظ طبیعت یا طبع کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ چاہیں کہ کسی بے جان موجود کی خاصیت بیان کریں تو ہم اسے یوں کہتے ہیں کہ اس کی طبیعت یا اسکی طبع کا تقاضہ یہ ہے، مثلاً کہیں گے کہ آکسیجن کی طبیعت کا تقاضہ جلنا ہے۔

اشیاء جو مختلف خواص کی حامل ہوتی ہیں، ان میں کچھ ذاتی خصوصیات ہوتی ہیں، جنھیں ہم ان اشیاء کی طبیعت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ چونکہ انسان ایک فلسفیانہ فکر رکھتا ہے۔ اس لئے وہ سوچتا ہے کہ وہ چیزیں جو ہر اعتبار سے برابر ہوں ان کی خاصیتیں بھی ایک طرح کی ہوں گی ان میں اختلاف ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا جب ان دو چیزوں کی خاصیتیں الگ الگ ہوں گی تو لامحالہ ان کے درمیان فرق و امتیاز بھی پایا جائے گا۔ تاہم چونکہ انسان نے اشیاء کو بعض جہات سے متساوی اور کچھ جہات سے، مختلف دیکھا ہے جیسے انسان نے دیکھا کہ وہ اشیاء جو جسم اور مادہ رکھتی ہیں یک گونہ یکسانیت کے باوجود ان کے خواص جدا گانہ ہوتے ہیں۔ مثلاً آگ

پانی، ہوا اور مٹی جسم اور مادہ رکھنے کے باوجود اپنے خواص میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اس سے انسان اس بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ بہرحال اس جسم میں ایک خاص قوت و توانائی پوشیدہ ہے، جو اس مخصوص خاصیت کا سبب ہے اور یہی قوت و توانائی جو اس خاصیت کا سبب بنی ہے اس جسم کی طبیعت ہے۔ جیسے کبھی ہم کہتے ہیں کہ نیم کے درخت کی طبیعت یہ ہے اور برگد کے درخت کی طبیعت ایسی ہے۔

کبھی کبھی طبیعت کی لفظ پیڑ پودوں کے علاوہ جاندار کے لئے جیسے حیوان اور انسان کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ طبیعت کی لفظ جاندار کے لئے صرف ان جہات میں استعمال کرتے ہیں جو جاندار اور بےجان میں مشترک ہیں۔

غریزہ:

عام طور سے اس لفظ کا استعمال حیوانات کے لئے ہوتا ہے اور انسان کے واسطے بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔ جماد و نبات کے لئے تو بالکل نہیں بولا جاتا۔

سچ یہ ہے کہ اب تک غریزہ کی حقیقت کا پتہ بھی نہیں چل سکا ہے۔ جو کچھ معلوم ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیوانات کچھ ایسی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، جو ان کی زندگی کے لئے رہنمائی کا کام انجام دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حیوانات میں ایک قسم کی نیم شعوری کیفیت موجود ہوتی ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اپنا چلنا پھرنا متعین کرتے ہیں۔ ان میں یہ خصوصیت اکتسابی نہیں ہوتی بلکہ از خود انکی سرشت میں موجود ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی جانور پیدا ہوتا ہے تو وہ بغیر سکھائے سارے کام اپنے آپ انجام دیتا ہے، جیسے ایک گھوڑے کا بچہ پیدا ہوتے ہی اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتا ہے، گرتا پڑتا اٹھ کھڑا ہوتا ہے تا اینکہ آخر کار خود سے چل کر اپنی ماں کے پاس دودھ پینے کے لئے پہونچ جاتا ہے۔ ماں کے سکھائے بغیر تھن ڈھونڈھتا ہے اور دودھ پینا شروع کر دیتا ہے۔

یہی وہ کیفیت ہے جو حیوانات میں حالت غریزہ کی نشاندہی کرتی ہے۔ حیوانات میں یہ قوت ایک دوسرے سے بہت مختلف انداز سے پائی جاتی ہے، جیسے چیونٹی میں غذا

حاصل کرنے کی ایک خاص قوت موجود ہوتی ہے جس سے وہ غیر معمولی کاموں تک کو انجام دے لیتی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر چیونٹیاں غیر معمولی و خارق عادت امور کیسے انجام دے لیتی ہیں۔ اس کی بنیاد کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک چیونٹی جب گیہوں کا دانہ اپنے سوراخ میں لے جاتی ہے، تو وہ اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ کیونکہ اگر گیہوں کا دانہ اپنی جگہ ثابت رہا تو کسی نہ کسی وقت اگ سکتا ہے۔ چیونٹیوں کا یہ غیر معمولی کام کس بنا پر ہوتا ہے؟ اسی کیفیت یا حالت کو قوت غریزہ کے نام سے پکارا جاتا ہے، جو ایک نیم شعوری حالت کا نام ہے اور جسے ہم شعوری حالت اور لاشعوری حالت دونوں سے تعبیر کر سکتے ہیں بہر صورت یہ ایک مبہم کیفیت ہوتی ہے۔

ہمچو میل کودکان با مادران ؛ سر میل خود نداند در لبان

حیوانات کی عادات دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں رجحان موجود ہے (رجحان ایک شعوری حالت کا نام ہے) مگر اسے خود اپنے رجحان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں اور اس راز سربستہ سے بالکل نابلد ہے۔ صرف اس قدر اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں مبہم طور پر رجحان پایا جاتا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ حاصل گفتگو یہ ہوا کہ غریزہ کی لفظ حیوانات کے لئے بولی جاتی ہے۔ مگر فطرت کی لفظ کا استعمال اس کے لئے نہیں ہوتا۔

فطرت :

فطرت کی لفظ انسان کے لئے مخصوص ہے۔ فطرت قوت غریزہ اور طبیعت کی طرح ایک تکوینی و قدرتی قوت ہے۔ جو سرشت انسان میں تو موجود ہوتی ہے مگر اکتسابی نہیں ہوتی ہے۔ یہ قوت، قوت غریزہ سے بالاتر اور زیادہ شعوری ہوتی ہے چنانچہ انسان جو کچھ معلومات رکھتا ہے وہ ان کا علم پیدا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ انسان کچھ فطریات کا حامل ہے اور وہ جانتا بھی ہے کہ وہ کیسی فطریات کا حامل ہے جبکہ اس کے برخلاف حیوانات قوت غریزہ رکھتے ہیں مگر اس کا علم نہیں رکھتے۔

دوسرا فرق فطرت اور غریزہ میں یہ ہے کہ غریزہ محدود مادّی امور سے تعلق ہوتا ہے۔ مگر فطرت کا رابطہ اور تعلق ان مسائل سے ہوتا ہے، جن کو ہم انسانی مسائل یا ماوراء حیوانات کا نام دیتے ہیں۔

ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ فطرت جو ایک ماوراء حیوانی مسئلہ ہے کیا واقعی یہ انسان کی سرشت و ذات میں داخل بھی ہے یا نہیں؟

کیا حقیقت اور حقیقت پسندی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ کیا حقیقت پسندی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو معاشرتی حالات نے انسان میں ایجاد کیا ہے؟ آیا سچ مچ انسان حقیقت خواہ ہے یا نہیں؟ ممکن ہے کوئی انسان کی حقیقت پسندی سے انکار کرے اور یہ کہے کہ انسان جو حقیقت پسند ہو گیا ہے، یہ دراصل اپنے ممکنہ منافع کی وجہ سے ہوا ہے۔ مثال کے طور پر علم ایک حقیقت ہے تو کیا انسان علم کو بحیثیت علم کے اہمیت دیتا ہے یا اسے اپنے ذاتی منافع کا ایک ذریعہ سمجھ کر اہمیت دیتا ہے؟

آیا حقیقت پسندی انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ یا معاشرہ اسے حقیقت پسندی پر مجبور کرتا ہے؟......

ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان حقیقت پسند پیدا کیا گیا ہے۔

لوگوں میں کچھ ایسے مفاہیم و معانی و اقدار موجود ہیں جن کو ہم اخلاقیات اور انسانیت کے نام سے پکارتے ہیں اور اس کے مقابل کے مفاہیم کو بُرے اخلاق کا نام دیتے ہیں. مثلاً سپاس گذاری اور تشکر۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو اس کے جواب میں دوسرا انسان اس کا سپاس گذار اور ممنون ہوتا ہے۔ احسان کا بدلہ احسان ہی ہے، اس کو آج سب ہی لوگ مانتے ہیں "ھل جزاء الاحسان الا الاحسان" (کیا نیکی کا بدلہ نیکی نہیں ہے؟) قرآن مجید کا یہ سوال دراصل فطرت انسانی سے ہے اور انسان اس کا اعتراف بھی کرتا ہے کہ ہاں احسان کا بدلہ احسان ہی ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس خیال کو انسان نے کہاں سے حاصل کیا۔ کیا یہ نظریہ انسان کے ذہن میں ڈالا گیا ہے یا معاشرے نے اس پر تھوپا ہے۔ جب معاشرے کے رسم و رواج بدل جائیں تو

یہ کلیہ بھی بدل جائے گا۔ دراصل یہ نقطۂ نظر اخلاقیات کے اضافی ہونے پر مبنی ہے۔ یا یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو انسان کے خمیر میں داخل ہے اور دین و عبادت بھی اسی سے مربوط ہیں، کیا دین انسان کی فطرت میں داخل ہے یا خارجی اور بیرونی عوامل کی پیدا کردہ چیز ہے؟

اسی لئے ہم انسانی فطریات کو یوں زیر بحث لاسکتے ہیں کہ بعض مسائل ایسے ہیں جن کو انسانیت کے نام سے پکارا جاتا ہے ۔ کوئی ایسا مکتب فکر نہیں ہے جو انسانی اقدار کا منکر ہو۔ انسان کبھی تو اپنے فائدہ کے پیچھے دوڑتا ہے اور یہ ایک حد تک معقول بھی ہے۔ اپنی قوت غریزہ کی وجہ سے وہ اپنی زندگی اور سامان زندگی پسند کرتا ہے اور جو چیز اس کی زندگی کی بقاء کے لئے ضروری ہوتی ہے اس میں وہ دلچسپی لیتا ہے۔ لہٰذا یہ بات طبیعی اور منطقی ہے کہ انسان اپنے مفاد کے پیچھے دوڑے۔

لیکن کچھ ایسے مسائل بھی ہیں، جن کو ہم انسانی اقدار کہتے ہیں اور وہ مفاد طلبی و مفاد پرستی کی میزان پر پورے نہیں اترے، جیسے ایثار و قربانی اور احسان وغیرہ کے جذبات و رجحانات۔

قدر اور ویلیو (VALUE) کا موازنہ :

انسانی اقدار کے مفاہیم کو ادا کرنے کے لئے (VALVE) "ویلیو" کی لفظ ناکافی ہے۔ کیونکہ (VALUE) "ویلیو" کا تعلق مفاد طلبی، قیمت، قیمتی وغیرہ سے ہوتا ہے اور انسانی اقدار کے مفاہیم اس سے بالاتر ہیں، مگر یورپی مفکرین نے اس لفظ کو انسانی اقدار کے لئے اسی محدود معنی میں استعمال کیا ہے۔ جو اصلاً مقصد و مقصود کی ترجمانی سے قاصر ہے۔

جن چیزوں کو ہم انسانی اقدار کا نام دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ فطرت انسانی میں موجود بھی ہیں یا نہیں؟ اگر موجود ہیں تو وہ کیا ہیں اور کس مقصد کے تحت فطرت انسانی میں ودیعت ہوئی ہیں۔

یقیناً اس میں بہت فرق ہے کہ کوئی چیز انسان کی فطرت میں داخل ہو اور اس چیز میں کہ جو خارج از انسان ہو اور اعتباری طور سے اس کے ساتھ منسلک ہو گئی ہو۔

شک نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی بنیاد انسان کے لئے کچھ فطریات کے مان لینے پر قائم ہے یعنی تمام وہ مسائل جنھیں ہم انسانی مسائل (مادہ اور حیوانات) اور اقدار انسانی کا نام دیتے ہیں معارف اسلامی کی نظر سے ان کی جڑیں انسان کی فطرت میں موجود ہیں۔

اس کا تذکرہ ہم بعد میں کریں گے کہ انسان کی اصلیت اور اس کی انسانیت، فطریات کے مان لینے کی بنیاد پر قائم ہے اور یہ نظریہ مہمل ہے کہ ہم ایک طرف تو انسان کی فطریات سے یکسر انکار کریں اور دوسری طرف آمانزم اور اصالت انسان[1] کا دم بھی بھریں۔

لہٰذا ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ فطریات انسانی اور اقدار انسانی کیا ہیں؟ اور کن دلائل سے یہ اقدار انسان کی فطریات میں داخل ہیں۔

سب سے زیادہ قابل تعارف مخلوق:

مخلوقات عالم میں کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جو انسان سے بڑھ کر تعارف کی محتاج ہو۔ جیسا کہ ہم نے ابتداء بیان کیا کہ فلسفہ میں جن موضوعات سے بحث کی جاتی ہے۔ وہ تین موضوعات خدا، کائنات اور انسان پر مشتمل ہیں۔ بعض فلسفوں میں زیادہ تر خدا، کو مورد بحث قرار دیا گیا ہے کچھ فلسفوں میں کائنات کے موضوع کو اپنایا گیا ہے اور کچھ فلسفوں میں انسان کو مورد بحث بنایا گیا ہے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ ہم کائنات کے ذیل میں انسان ہی کو زیادہ تر بلکہ جداگانہ زیر بحث کیوں لاتے ہیں اور انسان اور جہان کیوں کہتے ہیں۔ کیا انسان اس کائنات کا ایک جزو نہیں ہے؟ کیوں نہیں، یقیناً انسان اس جہان کا ایک جزو ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ دوسرے اجزاء جہان سے مختلف بھی ہے اور اپنے وجود میں دوسرے موجودات سے امتیازات اور خصوصیات بھی رکھتا ہے۔ اس لئے یہ دوسرے موجودات کی بہ نسبت زیادہ محتاج تعارف ہے۔ دوسری اشیاء مثلاً دھات، لوہا، فولاد، سونا، چاندی، کائنات کے اجزاء ہیں۔ لیکن یہ انسان

---

[1] انسان کی منزلت کے متعلق ایک افراطی نظریہ۔

کی طرح محتاج تعارف نہیں ان کے لئے مفروضات اور نظریات قائم کرنا ضروری نہیں چنانچہ اسی بنا پر لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان دوسرے موجودات کی نسبت ابھی تک کماحقہ متعارف نہیں ہو سکا ہے۔ چنانچہ آلکسیس کارل کی ایک کتاب " انسان ناشناختہ موجود " کے نام سے مشہور ہے۔

باوجود اس کے کہ انسان بہت سی چیزوں کا علم رکھتا ہے اور اپنے سے بعید ترین چیزوں کو جانتا ہے اور کبھی کبھی یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ دنیا کی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے وہ نہ جانتا ہو لیکن اس کے باوجود وہ اپنے سے قریب ترین چیز سے ناواقف ہے۔ چنانچہ ان ہی مجہولات میں سے جن کو وہ نہیں جانتا " فطریات " اور " غرائز " بھی ہیں۔ جن کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں جن میں سے ایک کا تعلق ... چاہنے سے ہے اور دوسرے کا جاننے سے ہے۔

کیا انسان فطریات رکھتا ہے؟

فطری معلومات کے سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کچھ فطری اور غیر اکتسابی معلومات رکھتا ہے یا نہیں؟ ہمارے ذہن میں انواع و اقسام کی معلومات موجود ہیں جو کل کی کل تقریباً اکتسابی ہیں۔

فطری معلومات اور مختلف نظریات:

پہلا نظریہ: یہ ہے کہ انسان کی تمام معلومات اکتسابی اور غیر فطری ہیں چنانچہ قرآن مجید کی آیت شریفہ واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئاً وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون (خدا نے تم کو تمہاری ماؤں کے بطن سے پیدا کیا تم کچھ نہیں جانتے تھے لہٰذا اس نے تمہارے لئے کان آنکھ اور عقل بنائے تاکہ تم شکر کرو) اس سے کچھ لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان کی تمام معلومات اکتسابی ہیں، فطری نہیں ہیں۔ جیسا کہ آیت مذکورہ سے ثبوت ملتا ہے کہ "تم کچھ نہیں جانتے تھے"۔ یعنی بالکل کورے تھے اور تمہارا لوح ضمیر بالکل صاف اور نقش و نگار سے عاری تھا۔ تو اس نے تختہ جسم کو

کان اور آنکھ سے سجایا تاکہ تم قلم عقل و دل سے لوح سادہ پر جو چاہو لکھو۔ انسانی معلومات کے بارے میں یہ پہلا نظریہ ہے۔

دوسرا نظریہ: دوسرا نظریہ پہلے نظریہ کے بالکل برعکس ہے۔ نظریہ یہ ہے کہ انسان تمام معلومات رکھتا ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو وہ نہ جانتا ہو۔ اس نظریہ کی بنیاد یہ ہے کہ انسان کی روح جسم انسانی میں آنے سے پہلے دوسری دنیا میں موجود تھی (نظریہ افلاطون) یعنی عالم مثل میں موجود تھی اور وہاں وہ موجودات عالم کے حقائق کا ادراک رکھتی تھی پھر جب وہی روح اس دنیائے فانی میں جسم انسانی میں داخل ہوتی ہے تو اس کے اور پرانی معلومات کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ جس طرح سے انسان بہت سی معلومات رکھتا ہے۔ مگر وقتی طور سے انہیں فراموش کر دیتا ہے اور ذرا سا یاد دلانے پر اسے یاد آجاتا ہے۔

یہ افلاطون سے منسوب نظریہ ہے کہ ہر انسان جب پیدا ہوتا ہے تمام چیزوں کا علم رکھتا ہے اور اس کے لئے تعلیم و تعلم صرف یاد آوری کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے لئے معلم صرف ایک یاد دلانے والی شخصیت ہے۔

تیسرا نظریہ:

تیسرے نظریہ میں یہ کہا گیا ہے کہ انسان صرف بعض چیزوں کو فطری طور سے جانتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ انسانی تفکر کے اصول فطری ہیں جو تمام انسانوں میں مشترک طور سے پائے جاتے ہیں۔ البتہ تفکرات کی فرعیں اکتسابی اور غیر فطری ہوتی ہیں۔

اصول تفکر جو فطری ہوتے ہیں وہ افلاطون کے نظریہ فطرت سے الگ اور جدا ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کہ ان کو انسان نے دوسری دنیا میں پہلے سے حاصل کر لیا ہو۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ انسان اس اصول تفکر سے اسی دنیا میں آگاہ ہوتا ہے لیکن اس آگہی کے لئے معلم کی ضرورت نہیں ہوتی یہاں انسان کو نتیجہ نکالنے کے لئے مقدمات مرتب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، جیسے کہ انسان اکتسابی معلومات کے لئے مقدمہ کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور نہ ہی یہاں کسی تجربہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یعنی انسان کے ذہن کی بناوٹ کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ اصول تفکر کو اپنی ہلکی سی توجہ سے خود بخود ادراک کر لیتا ہے۔ اسے تصدیق کے لئے کسی دلیل

اور برہان کی ضرورت نہیں پڑتی۔

عام طور سے یہ نظریہ حکما و فلاسفۂ اسلام پیش کرتے ہیں۔ بعض خصوصیات میں تھوڑے اختلاف کے ساتھ ارسطو بھی اسی نظریہ کا قائل ہے۔

موجودہ فلاسفہ میں فطری معلومات کے بارے میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ غالباً دورِ جدید میں افلاطون سے منسوب نظریۂ فطرت کا کوئی بھی قائل نہیں جدید دور میں کچھ فلاسفہ انسان کی بعض معلومات کو فطری اور پہلے سے موجود مانتے ہیں اور کچھ اکتسابی اور بر بنائے تجربہ جانتے ہیں۔

دورِ جدید میں مشہور و معروف فلسفی KANT، کانٹ انسان کے لئے پہلے سے موجود اور فطری معلومات کا قائل ہے یعنی وہ معلومات جو تجربہ سے نہیں حاصل ہوتیں بلکہ ذہن کی ساخت کا لازمہ اور پیداوار ہیں۔ جرمنی فلاسفہ میں یہ فکر اور نظریہ موجود رہا ہے۔ مگر انگریز فلاسفہ جو بیشتر حسی تھے جیسے جان لاک، ہیوم وغیرہ مذکورہ نظریہ کے برعکس نظریہ کے حامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے ضمیر میں معلومات پہلے سے وجود نہیں رکھتیں بلکہ ہر چیز انسان حاصل کرتا ہے سیکھتا اور اس کی تمام تر معلومات اکتسابی ہوتی ہیں۔

جس بات کی طرف میں نے اشارہ کیا اور "اصول فلسفہ" میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے وہ انتہائی اہم اور دقیق ہے۔ وہ اسلامی فلاسفہ کا نظریۂ فطرت ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ اصول تفکر، انسان کے لئے فطری ہیں، اکتسابی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کو انسانی ذہن کا لازمہ اور خاصہ نہیں مانتے۔ جیسے کہ افلاطون اور کانٹ اسے خاصۂ ذہن کہتے ہیں۔

اسلامی فلاسفہ کی وضاحت:

اسلامی فلاسفہ کا کہنا ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کا ذہن معلومات سے خالی ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اصول تفکر بھی نہیں رکھتا۔ لیکن بعد میں یہی اصول تفکر جب اس میں پیدا ہوتے ہیں تو اس وقت وہ کسی تجربہ، استدلال اور معلم کا محتاج نہیں ہوتا۔ بلکہ ذرا سی توجہ سے اصول تفکر کی بلا فاصلہ تصدیق کر لیتا ہے۔ مثلاً ہمارا یہ کہنا کہ کل جزو سے

بڑا ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ انسان اس مسئلہ کو دوسرے مسائل کی طرح پہلے سے جانتا تھا۔ کانٹ کہتا ہے کہ ہمارا ذہن اس مسئلہ میں کہ "کل جزو سے بڑا ہے" اس لئے صحیح نتیجہ تک پہونچ جاتا ہے کہ ذہن کے کچھ عناصر فطری ہیں جو ساخت میں دخل رکھتے ہیں اور کچھ باہر سے لئے گئے ہیں۔

مسلم فلاسفہ قائل ہیں کہ نوزاد بچہ کچھ نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ وہ اس امر بدیہی سے بھی واقف نہیں کہ "کل جزو سے بڑا ہے" کیونکہ اس کے خانۂ ذہن میں کل اور جزو کا تصور ہی نہیں ہے لیکن عمر کے ساتھ کل اور جزو کا تصور پیدا کرتے ہی دونوں کا موازنہ کرکے بغیر کسی سکھائے بتا دیتا ہے کہ کل جزو سے بڑا ہے۔

اس گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی معلومات کے بارے میں حکمائے اسلام اور افلاطون میں کس قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔

انسان کی معلومات کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد:

ایک طرف تو قرآن مجید کا یہ ارشاد ہے: واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لاتعلمون شیئاً وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ لعلکم تشکرون۔ اللہ نے تمہاری ماؤں کے پیٹ سے جب تم کو پیدا کیا اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ تو اس نے تمہارے (مفاد کے) لئے کان، آنکھ اور دل بنائے تاکہ تم اس کے شکر گذار بندے بن جاؤ۔

مقصود خالق یہ ہے کہ وقت خلقت انسان کا ذہن بالکل صاف ہوتا ہے۔ دوسری طرف قرآن مجید کچھ ایسے مسائل بھی پیش کرتا ہے جس کے لئے انسان کا ذہن استدلال کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہے۔

اس طرح بظاہر قرآن دو نظریات کا حامل نظر آتا ہے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے مثال کے طور پر قرآن مجید میں توحید کا مسئلہ ہے جو اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ مسئلہ توحید ایک فطری مسئلہ ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو خدا کی معرفت فطری ہونا اور دوسری طرف لا تعلمون شیئاً کہنا کہاں تک درست ہے؟ ان سب کا جواب قرآن میں موجود ہے۔

قرآن مجید میں ایک طرف افلاطون کا نظریہ شدت کے ساتھ رد کیا گیا ہے، سورہ نحل

کی آیت ۷۸ میں ارشاد ہے "لا تعلمون شیئاً" دوسری طرف "ذکر" اور "یاد آوری" کی بات بہت زیادہ کی گئی ہے۔ مثلاً پیغمبرؐ سے خطاب ہے۔ "فذکّر" یاد دلائیے" انما انت مذکّر" آپ ہی تو یاد دلانے والے ہیں۔ یہاں تک کہ خود قرآن مجید کا نام "ذکر" بتایا گیا ہے اور پیغمبر اکرمؐ کو مذکّر کہا گیا ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید کچھ ایسے مسائل کا قائل ہے جن کے لئے استدلال کی ضرورت نہیں ہے، صرف ان کی یاد دہانی کافی ہے۔ مثلاً ارشاد الٰہی ہے: "ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون"؟ (کیا عالم و جاہل برابر ہیں) قرآن مجید یہاں اپنے سوال کے ذریعہ ایک مفہوم کا اقرار اور اثبات کراتا ہے۔ چنانچہ سقراط کی تعلیم و تربیت کا انداز بھی کچھ اس طرح کا رہا ہے۔ سقراط جب کسی مفہوم کو اپنے مقابل کے لئے ثابت کرنا چاہتا تھا تو بحث کی ابتداء سوال کے ذریعہ کرتا تھا اور پوچھتا تھا کہ کیا یہ بات اس طرح ہے یا کسی اور طرح سے۔ مسئلہ واضح ہونے کی وجہ سے سقراط اندازہ کر لیتا تھا کہ مقابل کا ذہن کس رخ کو اختیار کرے گا۔ جب مقابل کے ذہن پر اپنی بات طاری کر دیتا تھا تو پہلے سوال سے ذرا مشکل سوال سابقہ انداز میں پوچھتا تھا کہ کیا یہ بات اس طرح سے ہے یا دوسری طرح سے اور پھر اس سے جان لیتا تھا کہ مقابل کا ذہنی رخ کس طرف ہے۔ اسی طرح وہ بڑی دیر تک سوال کرتا جاتا تھا اور جواب لیتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مخاطب متوجہ ہو جاتا کہ اس نے انجانے میں سقراط کے مدعا کا اعتراف کر لیا ہے اور سقراط کو مقابل سے زیادہ کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ پڑتی چونکہ سقراط ماہر فن اور ماہر نفسیات تھا لہٰذ جواب کو انسان کے ضمیر سے باہر کھینچ لیتا تھا۔

سقراط کی ماں دایہ تھی خود سقراط کا بیان ہے کہ میں اپنی ماں کی طرح دایہ کا کام انجام دیتا ہوں جو بچہ کو پیدا کرواتی ہے۔ درحقیقت یہ ماں ہے جو بچہ پیدا کرتی ہے۔ دایہ کا کام تو صرف ماں کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ تو میں بھی ایک دایہ کی طرح ایسا کام کرتا ہوں جس کی وجہ سے انسان کا ذہن فکر کو تخلیق کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ماں بچہ پیدا کرتی ہے۔ میں بھی تخلیق افکار میں ممد و معاون ہوتا ہوں تاکہ ذہن جدید افکار پیدا کر سکے۔

اسی طرح سے قرآن مجید کا انداز ایک خاص انداز ہے۔ جو سوال کی صورت میں مسائل پیش کرتا ہے۔ مثلاً ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (کیا پڑھے اور جاہل برابر ہیں)

جب ایمان اور نیک اعمال کی طرف بلانا چاہتا ہے تو کہتا ہے ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار ؟ (جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کئے کیا ہم انھیں زمین میں فساد پھیلانے والوں کے برابر قرار دے سکتے ہیں ؟ کیا ہم متقین کو فجار کے مساوی ٹھہرا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہے : انما یتذکر اولوا الالباب صرف عقل والے ہی یاد آوری کرتے ہیں۔

مذکورہ آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن مجید اس طرح کی فطریات کا قائل نہیں جیسا کہ افلاطون قائل تھا۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس طرح کے سوالات کا جواب دینے کی ہر شخص میں صلاحیت موجود ہوتی ہے : بچہ پیدا ہونے کے بعد جب غور و فکر کی عمر تک پہونچتا ہے تو اس نوعیت کے سوالات کے جوابات اسے اپنے آپ فطری طور سے مل جاتے ہیں۔ اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیات ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

چنانچہ باوجود اس کے کہ سورۂ نحل میں لاتعلمون شیئاً (کچھ بھی تو نہیں جانتے) کہا گیا ہے اور دوسری جگہ پر توحید کی معرفت فطری بتایا گیا ہے۔ دونوں میں منافات نہیں ہے کیونکہ فطری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو سکھانے اور ان کے لئے دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فطری ہونے کے معنی یہ نہیں کہ پیدائش سے پہلے ہی ان کو چیزوں کا علم تھا جیسا کہ افلاطون کا نظریہ تھا اور جس سے آیات میں منافات دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

جو لوگ انسانی فطریات کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان میں ایک ثابت و برقرار اصول تفکر نہیں ہے جو عقل کے طرز تفکر کا لازمہ ہو اور نہ وہ بات ہے جسے کانٹ کہتا ہے کہ یہ اصول خود عقل کی ساخت اور بناوٹ کا لازمہ یا نتیجہ ہیں۔ مثلاً قدیم فلاسفہ اصول تفکر کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ دو متضاد باتوں کا اجتماع محال ہے۔ یعنی یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک چیز ایک وقت میں موجود بھی ہو اور نہ بھی ہو۔ جیسے ایک فکر اور نظریہ کے لئے یہ محال ہے کہ ایک وقت میں مطابق واقع بھی ہو اور مخالف واقع بھی ہو۔ یا جیسے دو چیزیں جو تیسری چیز کے برابر ہوں آپس میں بھی ایک دوسرے کے مساوی ہوں گی۔ "کل اپنے جزو سے بڑا ہوتا ہے۔" "ترجیح بلا مرجح محال ہے" "ممکن نہیں کہ ایک شیئ ایک ہی وقت میں دو مکان میں ہو۔" یہ ایسی باتیں ہیں جن کے اثبات کے لئے دلیل نہیں

پیش کی جاسکتی، البتہ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ یہ چیزیں ناقابلِ اثبات مجہولات ہیں۔

جو لوگ فطری اصولِ تفکر کے قائل ہیں۔ وہ ان اصول کو ناقابلِ تغیر اور ناقابلِ خطا و اشتباہ جانتے ہیں۔ کیونکہ یہ اصول ایسے مضبوط اور محکم ہیں کہ چاہے ہم روئے زمین پر ہوں یا کرۂ سماوی میں، ان اصول تفکر میں ردوبدل کا امکان نہیں ۔ جیسے یہاں دو اور دو کا مجموعہ چار ہوگا اسی طرح سے آخرت میں بھی جوڑ آئیگا خواہ کروروں سال گذر جائیں تب بھی مجموعہ چار ہی رہے گا۔ جب تک ہم اس طرح کے لازوال فطری اصول تفکر کو نہیں مانیں گے دوسری مختلف معلومات کی کوئی وقعت نہ ہوگی کیونکہ فروع ان ہی اصولوں پر استوار ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ خود یہ اصول تفکر بھی اکتسابی و غیر فطری ہیں، یعنی ہم نے دوسروں سے سیکھ کر ان اصولوں کو مان لیا ہے۔ ہماری حیثیت اس آئینہ کی سی ہے جس کے سامنے مختلف صورتیں پیش آتی ہیں چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کل جزو سے بڑا ہے تو یہ بات ماحول کے تاثر سے ہوتی ہے۔ اگر ماحول بدل جائے تو ممکن ہے کہ اس بات کے خلاف و برعکس کے بھی قائل ہو جائیں یعنی یہ تسلیم کریں کہ جزو کل سے بڑا ہے۔

اگر کوئی اس نظریہ کا قائل ہو تو اس نظریہ کی بنیاد پر معلومات کی قدر و قیمت ختم ہو جائیگی جیسا کہ سب ہی جانتے ہیں کہ ریاضیات کی بنیاد چند معلوم ثابت اصول پر مبنی ہے۔ چنانچہ اگر یہ متعارف اصول بے بنیاد ہوتے تو ایسی صورت میں ریاضیات کی کوئی قدر و قیمت ہی نہ رہتی۔ یعنی ہم چونکہ روئے زمین پر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس لئے یہ بات کہہ رہے ہیں۔ بالفرض اگر ہم کسی دوسری جگہ مثلاً مریخ پر ہوتے تو اس کے بجائے دوسری بات کہتے۔ لامحالہ اس طرز تفکر کی بنیاد پر کسی فلسفہ کا کوئی بھروسہ نہیں رہے گا۔ حاصل بحث یہ ہے کہ جو لوگ فطری اصول تفکر کے منکر ہیں، یقیناً وہ لوگ فلسفہ یا کائنات کے بارے میں کوئی نظریہ نہیں رکھ سکتے کہ یقین کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ ہم نے کائنات کو سمجھ لیا ہے۔ فطری اصول تفکر کے منکرین اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہیں کہ ان کا قصہ ویسا ہی ہے جیسے کوئی آدمی پیڑ کی شاخ پر بیٹھا ہو اور اسی شاخ کو آری سے کاٹ بھی رہا ہو۔ اور اسے اس بات کا خیال تک نہ ہو کہ شاخ کے درخت سے کٹتے ہی وہ خود بھی زمین پر گر جائے گا۔ مادّی فلاسفہ کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ حسّی پسند ہوں اور ان کے لئے یہ بھی

ضروری ہے کہ تمام افکار انسانی کو بیرونی اور خارجی اثرات کا ردّ عمل سمجھیں۔ چنانچہ وہ لوگ ایسے ابتدائی قطعی اصول کے قائل نہیں ہیں جو تغیر و تبدل کے قابل نہ ہوں۔
چنانچہ خود ان کی تمام کی تمام باتیں اور معلومات بے بنیاد اصول پر مبنی ہوں گی۔ لہٰذا جو فلسفہ اس نظریہ کی بنیاد پر قائم ہوگا، اس کی قیمت بھی نہ ہوگی اور وہ قابل اعتبار نہ ہوگا۔ پھر سوائے شک کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا اور یہ بات علم اور فلسفہ سے انکار کے مترادف ہوگی۔

فطری معلومات کے متعلق حاصل گفتگو :

حاصل گفتگو یہ ہوا کہ ہماری بحث ابتک انسانی معلومات کے سلسلہ میں تھی چنانچہ فطری معلومات کے سلسلہ میں مختلف نظریات سامنے آئے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے مان لیا اور وہ یہ ہے کہ اصول "تفکر" فطری ہیں۔ البتہ یہ نظریہ اس نظریہ کے خلاف ہے جو افلاطون یا کانٹ نے پیش کیا ہے۔ یہاں فطری معلومات سے ہماری مراد پیدائشی معلومات نہیں ہیں۔
اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ انسان کی معلومات، افکار اور فلسفہ کی قدر و قیمت کے لئے واحد راستہ یہ ہے کہ ہم انسان کے لئے "تفکر" کے چند ابتدائی فطری اصول مان لیں۔ اگر بالفرض ہم نے ان ابتدائی فطری اصول کو تسلیم نہیں کیا تو ہمارے پاس سوائے شک کے اور کچھ نہ رہیگا۔
وہ لوگ جو ان ثابت اور فطری اصول کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اور پھر میٹریلزم ۔ (MATT-FRIALISM) ڈیالیٹک (DAYALITIC) کے فلسفہ کو تسلیم کرتے ہیں جو یہ کہتا ہے کہ دنیا سوائے مادّہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ جبکہ خود یہ نظریہ بھی "ایک فکر" ہے جس کی خود کوئی وقعت نہیں ہے۔ کیونکہ اس نظریہ کے ماننے والوں نے پہلے تو فطری اصول تفکر کا انکار کیا ہے، پھر اس انکار کے نتیجہ میں لاشعوری طور پر دوسری فروعات، معلومات اور نظریات کے منکر ہوگئے۔ اس طرح خود ان کے نظریہ مادّیت کی بھی تردید ہو جاتی ہے۔ ٭٭

جناب سید احمد فہری
ترجمہ: جناب سید حسین مہدی حسینی

علم و تعلیم امام خمینی اور شہید ثانی کی نظر میں

اخلاص عمل

شہید ثانی علیہ الرحمہ اپنی کتاب "منیۃ المرید" میں امام صادق علیہ السلام سے روایت نقل کرتے ہیں کہ:

اصحاب حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو دوسروں کی بہ نسبت حضرت موسیٰؑ سے بہت زیادہ عقیدت و محبت رکھتا تھا۔ جناب موسیٰؑ کی ہم نشینی کے سبب خاص معلومات و آگہی پیدا کرلی تھی، ایک دن اس نے جناب موسیٰؑ سے عرض کی کہ اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں تو میں جا کر اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کرآؤں جناب موسیٰ نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا:-

اعزاء کے حقوق ہوتے ہیں اس میں کوتاہی نہ ہو، ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ خبردار! اس سفر میں جب کہ مجھ سے بہت دور جارہے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس دنیا پر اعتماد کرتے ہوئے خدا سے غافل ہو جاؤ اور وہ علم و آگہی جو ہماری ہم نشینی سے تمھیں نصیب ہوئی ہے، ضائع ہو جائے۔

صحابی نے جواب دیا انشاء اللہ ایسا نہ ہوگا۔ یہ کہکر حضرت موسیٰ سے رخصت ہوا، ایک

مدت گذر گئی، اس کی خبر نہ مل سکی، حضرت موسیٰ نے جس کسی سے اس کے حالات معلوم کئے اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ آخر کار ایک دن حضرت جبرئیل سے پوچھا۔

جبرئیل! اگر ہمارے فلاں صحابی کی کچھ خبر رکھتے ہو تو بیان کرو ؟

جی ہاں، جانتا ہوں ــــ جبرئیل نے جواب دیا ــــ وہ اس وقت اپنے دروازہ پر بندر کی شکل میں کھڑا ہے اور زنجیر گلے میں لٹک رہی ہے۔

اس دردناک خبر کے سنتے ہی جناب موسیٰؑ محراب عبادت میں تشریف لائے اور حضرت احدیت سے دعا کی ــ معبود! میرے ساتھی کی فریاد رسی فرما ــــ خدا نے وحی بھیجی اور کہلایا، موسیٰ ــــ اگر محراب عبادت میں دعا کرتے کرتے تمہاری رگ گردن خشک بھی ہو جائے تو دعا قبول نہیں کروں گا، کیونکہ تمہارے ساتھی کو میں نے جو استعداد علمی عطا کی تھی اس نے اسے ضائع کر دیا اور میرے غیر سے لو لگالی۔

روایت معصوم کے الفاظ یہ ہیں :۔

«عن ابی عبدالله علیه السلام قالَ كانَ لِموسَى بنِ عِمران جَليساً مِنْ أصحابِهِ قَدوَعىٰ عِلماً كثيراً فَاسْتَأْذَنَ مُوسى في زِيارةِ أقارب لَهُ فقالَ لَهُ موسىٰ إنَّ لِصِلَةِ القَرابةِ لَحَقاً وَلكِنْ إيّاكَ أنْ تَرْكَنَ إلى الدُنيا فإنَّ اللهَ قد حَمَّلَكَ عِلماً فلا تُضيعْهُ وَتَرْكَن إلى غَيره فقالَ الرجلُ لايكونُ إلاّ خَيراً وَمَضىٰ نَحوَ أقارِبِهِ فَطالَتْ غَيْبَتُهُ فَسَئَلَ موسىٰ عَنه فَلَمْ يُخبِرهُ أحَدٌ بِحالِهِ فَسَئَلَ جَبرئيل عَنه فَقالَ لَه أخبِرني عَنْ جَليسِيْ فُلان ألَكَ بِهِ عِلْمٌ؟ قَالَ نَعَمْ هُوَذا عَلى البابِ قَد مُسِخَ قِرْداً في عُنُقِهِ سِلْسِلَةٌ فَفَزِعَ موسىٰ إلى رَبِّهِ وَقامَ إلى مُصَلاه يدعوالله وَيقول يا ربِّ صاحِبي و جليسي فاوحى الله اليه يا موسىٰ لَوْدَعَوْتَني حتّى تَنْقَطِعَ تَرقُوَتاكَ ما استَجَبْتُ لَكَ فيه إني كُنْتُ حَمَلْتُهُ عِلماً فَضَيَّعَهُ وَرَكَنَ إلى غيره.»

عزیزان گرامی ــــ اس روایت پر غور و فکر فرمایئے ــ جائے عبرت ہے کلیم اللہ کے حلقۂ درس کا ایک شاگرد صرف اس لئے حیوان کی شکل میں (تبدیل) مسخ ہو گیا کہ اس نے غیر خدا پر اعتماد اور بھروسہ کیا۔ زنجیر ہوی و ہوس ظاہر بہ ظاہر گلے کا پھندہ بن گئی، اور جناب موسیٰ کلیم اللہ جیسے کی شفاعت

وگریہ وزاری قبول نہ ہو سکی، وہ شاگرد اپنی شقاوت و بدبختی پر یوں ہی باقی رہ گیا۔ اگر پروردگار عالم نے حضرت خاتم الانبیاء علیہم السلام کے وجود مطہر کی برکت اور آنحضرت کے احترام میں ہم پر یہ فضل فرمایا ہے کہ ہمیں اس طرح کی ذلت ورسوائی سے محفوظ رکھا ہے تو ہمیں اس فضل خدا کے سبب خود فراموش نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر خدا پر تکیہ کرنے کی وجہ سے ہمارا باطن حیوان کی شکل میں تبدیل ہو جائے۔ احادیث حضرات ائمہ ہدیٰ علیہم السلام نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور صاحبان کشف و قلوب (خدا رسیدہ افراد) کی دور رس نگاہوں اور حقیقت فہم قلوب کے ادراکات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

خداوند کریم کا فضل ہے کہ اس نے ہمارے اعمال و افعال پر پردے ڈال دیئے ہیں اور آیۂ قرآنیہ "انّ اللہ لا یخلف المیعاد" کے ذریعہ مرسل اعظمؐ سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ انکی امت کو مسخ نہیں کرے گا اور ہمیں اس ذلت و رسوائی سے محفوظ رکھے گا۔ اگر مسخ ہونے کا سلسلہ خدانخواستہ چلتا رہتا یہاں تک کہ بساط کائنات لپیٹ دی جائے اور عالم ملکوت پر پڑے پردے اٹھا دیئے جائیں اس وقت احساس ہو گا کہ انسانی صفات و شمائل ہم بالکل کھو چکے ہیں، حیوانی شکل وصورت بلکہ اس سے بھی بدتر شکل اختیار کر لی ہے۔ اسی طرف احادیث میں اشارہ ہوا ہے، معصوم فرماتے ہیں کہ ـــــ ہماری امت میں بعض ایسی شکلوں میں محشور ہوں گے کہ کتے اور سور انکی صورتوں سے کہیں بہتر و زیبا تر ہوں گے۔

ہائے افسوس ـــ! اس دن ہمیں کس قدر حسرت وناکامی کا سامنا کرنا ہو گا، لیکن اس حسرت کا کیا فائدہ، وقت گذر چکا ہو گا۔ اسی دن سے ڈراتے ہوئے قرآن کریم فرماتا ہے۔

انذرھم یوم الحسرۃ اذ قضی الامر (سورۂ مریم/۳۹)

اے رسولؐ ان کو حسرت وافسوس کے دن سے ڈرائیں جب قطعی فیصلہ کر دیا جائیگا۔

شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی ... تا راہ رو نہ باشی کی راہ بر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق ... ہان اے پسر بکوش کہ روزی پدر شوی

گر نور عشق حق بہ دل و جانت اوفتد ... باللہ کز آفتاب فلک خوبتر شوی

وجہ خدا اگر شود ت منظر نظر — زان پس شکی نماند کہ صاحب نظر شوی

۲۔ عزیزان گرامی — اکمر ہمت کس لیں اور سعادت علم و عمل سے بہرہ مند ہوتے رہیں اپنے کو درس و تدریس کے فوائد سے محروم نہ فرمائیں کیونکہ انسان کی ملکوتی شکل و شمائل، اور اس کی عظمت وجلالت کا راز علم و عمل میں مضمر ہے جیسا کہ ارشاد ہے:۔

من علم و عمل عذ فی الملکوت عظیماً۔

جس نے علم کے بعد عمل بھی کیا، آسمانوں پر عزت واحترام سے یاد کیا جاتا ہے۔
جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ نے اس جگہ نہایت عمدہ بات کہی ہے۔ چونکہ ہمارے پڑھنے والوں کے لئے مفید ہے لہٰذا نہایت اختصار سے اس کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں:
وہ لکھتے ہیں — علم کی مثال درخت جیسی ہے اور عمل اس درخت کے لئے پھل کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر درخت پھل دار نہ ہو تو پھر اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں حکیم ناصر خسرو نے کیا خوب کہا ہے ؎

بسوزند چوب درختان بی بر — سزا خود ہمین است مر بی بری را

اگر درخت علم بھی عمل کے ثمر نہ لائے تو اس کی بھی کوئی حیثیت و منزلت نہیں۔ کیونکہ علوم کی صرف دو قسمیں ہیں:

۱۔ علم معاملہ (۲) علم معرفت۔

علم معاملہ سے مراد وہ علم ہے جس کے ذریعہ سے حلال و حرام کی شناخت یا ان جیسے احکام کی معرفت، اچھے اخلاق کی پہچان، برے اخلاق کے برطرف کرنے کا طریقہ اور اس کے بچنے کے اصول کو معلوم کیا جاتا ہے۔
علم معرفت سے مراد وہ علم ہے جس میں ذات حضرت احدیت کی معرفت، اس کے صفات و اسماء سے آگہی پیدا کی جاتی ہے — ان دو کے علاوہ دوسرے جتنے بھی علوم پائے جاتے ہیں وہ انہی دو علموں تک پہنچنے کا وسیلہ و ذریعہ ہیں یا مقدمہ عملی کی حیثیت رکھتے ہیں جو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔
علم معاملہ جیسا کہ تعریف سے واضح ہے صرف عمل کرنے کے لئے ہے اور اگر عمل کی

ضرورت نہ ہوتی تو درحقیقت علم معاملہ کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

اگر کسی نے علم دین یا اس جیسے علم کو حاصل کیا ہو اور پھر اس علم کے ذریعہ اپنے اعضاء و جوارح کو گناہوں کی آلودگی سے نہ بچاتا ہو اپنے کو طاعت و بندگی کا خوگر نہ بناتا ہو تاکہ واجبات سے مستحبات اور فرائض سے نوافل کا عادی ہو سکے، بلکہ ساری توجہ حصول علم پر ہو اور جس حد تک علم حاصل کر چکا ہو اسی کو اپنا مقصد و مطمع نظر تصور کرتے ہوئے مطمئن و مسرور ہو تو ایسا شخص دھوکے میں ہے اور اپنے دین سے بے خبر ہے۔ بتایا نہیں جا سکتا ہے ایسے شخص کا انجام کیا ہوگا۔

اس شخص کی مثال اس مریض سی ہے جو کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو جس کا علاج صرف ان دواؤں سے ممکن ہے جو متعدد جزء رکھتی ہوں اور ان اجزاء کو ترکیب دے کر دوا تیار کرنے کا تجربہ صرف حاذق و ماہر اطباء کو ہے اگر ایسا شخص اس مہلک مرض کا احساس کرنے کے بعد کسی حاذق طبیب کی تلاش میں بیرونی ملک کا سفر کرے اور بہم تگ و دو کے بعد اپنی منشا کے مطابق طبیب ڈھونڈ نکالے، اپنے مرض کی دوا معلوم کر لے، دوا کی مقدار، تیار کرنے کا طریقہ، دواؤں کی دستیابی کے مقامات معلوم کر لے۔ چھاننے، کوٹنے، اور باہم ترکیب دینے کے انداز کو سیکھے نہایت عمدہ خط میں اچھے کاغذ پر ان تمام باتوں کو لکھ کر وطن واپس ہو لیکن بجائے اس کے کہ دوا کا استعمال کرے صرف نسخہ پڑھتا رہے اور جب کبھی بیماری کا خیال آجائے تو نسخہ کو بار بار پڑھنے لگے اور دوسروں کو بھی یہی نسخہ دیتا رہے تو کیا اس انداز سے علاج ممکن ہو سکتا ہے؟ کیا ذرہ برابر اس کے مرض میں کمی آسکتی ہے؟ ہرگز نہیں — اگر اس اصل نسخہ کی ہزاروں ڈپلی کیٹ کاپیاں بنا کر ہزاروں مریضوں میں تقسیم کر دی جائیں اور دہ ہزار دن ان پر عمل کریں تو شفایاب ہوں گے لیکن خود اس شخص کو شفاء نہیں ہو سکتی، خواہ ہر شب ہزار بار اس نسخہ کا ورد بھی کیوں نہ کرتا ہو۔ شفا اس وقت ہو گی جب نسخہ پر لکھی ہوئی دوا کو فراہم کرے، اس کے اجزاء کو باہم مخلوط کرے، اس کی تلخی کو تحمل کرے، طبیب کے مقرر کردہ اوقات میں بتائے ہوئے غذا کے پرہیز پر کاربند رہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر قسم کی احتیاط کو بجا لائے پھر شفا ہو گی۔ بلکہ ان ساری احتیاط و پرہیز کے باوجود ممکن ہے کہ شفایاب نہ ہو۔ ممکن ہے دوا اس کے مرض کو پورے طور پر برطرف نہ کر سکے۔ جب دوا کھانے کے بعد مرض کے باقی رہنے کے امکانات ہیں تو دوا نہ کھانے کی صورت میں تو کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔

فقیہ کی مثال بھی ایسی ہی ہے ۔ اگر طاعت و بندگی کا علم حاصل کیا لیکن اس پر عمل نہ کیا، گناہان صغیرہ و کبیرہ سے باخبر ہوا لیکن اُس سے اجتناب نہ کیا، سبھی اچھے اخلاق کو پہچانا لیکن اپنے کو ان صفات کا اہل بنانے کی کوشش نہ کی، بُرے طور طریقے سے آگاہ ہوا لیکن اپنے نفس کو اس سے محفوظ نہ رکھا ـــــ تو ایسا شخص بھی دھوکے میں پڑا ہوا ہے اور اپنے دین میں حیلہ باز ہے۔ کیونکہ ارشاد اقدس الٰہی ہے ـــــ قد افلح من زکّٰھا ۔ فلاح و نجات اس نے پائی جس نے نفس کا تزکیہ و تطہیر کی ۔ قرآن نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ نجات اس نے پائی جس نے اصول تزکیہ نفس کو یاد کیا، اس فن میں کتاب لکھی اور دوسروں کو تعلیم دی۔

ممکن ہے کہ اس جگہ ابلیس دلوں میں وسوسہ پیدا کرے کہ مریض کی جو مثال تم سے پیش کی گئی ہے وہ تم جیسے عالم بے عمل پر صادق نہیں آتی، کیونکہ امراض جسمانی میں صحیح ہے کہ دواؤں سے آشنائی درد کا علاج نہیں ہوا کرتی لیکن تم جیسے عالم بے عمل جن کا مقصد و مطمح نظر خداوند کریم سے قربت، اس کے ثواب کی طمع ہے، عمل کے بغیر صرف علم کی بنیاد پر بھی حاصل ہو جایا کرتا ہے۔

اسی جگہ شیطان ان خیالات کے نفس میں پیدا کرنے کے بعد اس کی تائید میں ان روایات کو سنائے گا جو علم کی فضیلت میں نقل کی گئی ہیں۔ یہی جگہ ہے جہاں انسان اپنی عقل سے کام نہ لیتے ہوئے ابلیس کے ورغلانے اور نفس کے دھوکے میں آکر ان وسوسوں پر جو اس کی خواہشات نفسانی سے ہم آہنگ ہیں مطمئن ہو جاتا ہے اور عمل کو چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مرد باہوش و باخبر ہے تو ابلیس کے جواب میں کہتا ہے ـــــ تو علم کے فضائل میرے کانوں میں گنگنا رہا ہے ؟ اگر تیری نیت سالم ہے تو پھر کیوں نہیں وہ حدیثیں جو عالم بے عمل کی مذمت میں آئی ہیں مجھے یاد دلاتا ہے؟

علماء بے عمل کی مذمت میں قرآن نے بلعم بن باعور کا واقعہ پیش کیا ہے کہ بارہ ہزار شاگرد اس کے بیانات ضبط تحریر میں لاتے تھے، ان تمام شرافت و بزرگی کے ساتھ جو خدا نے اسے عطا کی تھی جب کبھی عرش خدا کی طرف متوجہ ہوتا تو اس کا مشاہدہ کرتا لیکن ان فضائل و خصوصیات کے باوجود جیسا کہ علماء و مفکرین نے لکھا ہے، خدا نے اسے سگ ناپاک سے

تشبیہ دی ہے۔ قرآن کہتا ہے: فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث (اعراف/۱۷۶)

اور عالم بے عمل کے متعلق ارشاد ہے:

مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفارا۔

اس سے بڑھ کر ان لوگوں کی ذلت و رسوائی اور کیا ہوگی کہ خدا نے کتے اور گدھے سے تشبیہ دی ہے۔

رسول اعظمؐ کا ارشاد ہے:۔

من ازداد علماً ولم یزدد ھدیً لم یزدد من اللہ الا بعداً

جس نے علم و آگہی میں اضافہ کیا لیکن اسی کے ساتھ رشد و ہدایت میں ترقی و اضافہ نہ کیا تو خدا سے دوری بڑھتی ہی جائے گی۔

دوسری جگہ ارشاد ہے — شر الناس العلماء السوء۔ لوگوں میں بدترین افراد وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں جو بدکردار ہیں۔

مزید فرمایا — ان اشد الناس عذاباً یوم القیامۃ عالم لم ینفعہ اللہ بعلمہ

قیامت کے دن جن لوگوں پر شدید عذاب کیے جائیں گے ان میں وہ اہل علم ہوں گے جنھوں نے اپنے علم کے مطابق عمل نہ کیا ہوگا۔

اس قسم کی روایتیں بہت زیادہ ہیں اور جس نے علم کی فضیلت کا تذکرہ کیا ہے اسی نے بے عملی کی مذمت کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے، معبود کے نزدیک بے عمل، بے خبر سے زیادہ نفرین و مذمت کا اہل ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے بیان کرنے والے کے بیان کے کچھ حصے کو تسلیم کرلیں اور کچھ کو ترک کردیں۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:۔

اَفتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض

(بقرہ/۸۵)

رہا سوال علم خداشناسی اور اس کے مقدمات کا، تو اگر کوئی شخص علم خداشناسی سے با خبر ہو لیکن الٰہی قوانین و حدود کو نظر انداز کرے اس کے احکام پر عمل پیرا نہ ہو تو خود فریبی اور ابلیس فریبی میں اس شخص کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی بادشاہ کی خدمت و ملازمت کا خواہشمند ہو، اور خدمت ہی کے لئے بادشاہ کے اخلاق و اوصاف شکل و شمائل، قدو قامت، انداز نشست و برخواست سے آگاہی و اطلاع پیدا کرے، لیکن ان باتوں کو جو اس کے لئے ناپسندیدگی و برہمی یا خوشی و مسرت کا سبب ہیں معلوم نہ کرے یا اگر معلوم بھی کرے تو ان ہی باتوں کو اپناتے ہوئے اس کی خدمت میں حاضر ہو جو اس کی ناراضگی کا سبب ہیں، یا رہن سہن اور رنگ و روپ کے اعتبار سے جو چیزیں اسے پسند ہوں اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس کے حضور میں باریاب ہو رہا ہو، گویا ہر اس چیز کو اپناتے ہوئے جو اس کی ناراضگی کا سبب ہیں اور اس چیز کو چھوڑتے ہوئے جو اس کی پسندیدگی کا ذریعہ ہیں ـــــ چاہتا ہے کہ اس کی بارگاہ میں مقرب ہو جائے اور اس کے خاص خدمت گذاروں میں شمار ہو، اس کے خیال میں تقرب کا انحصار صرف ان باتوں پر ہے کہ وہ بادشاہ کے نام و نسب، شکل و صورت، محل سکونت، ملازمین سے اس کے برتاؤ اور رعایا کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہے ـــــ کو معلوم کرے۔

یہ مثال "عالم باللہ" اور "عالم بہ احکام اللہ" (جو اپنے علم کے بقدر عمل نہ کرتا ہو) دونوں پر صادق آتی ہے۔ اگر ایک عالم و عارف ہر اس چیز کو جسے وہ جانتا ہے ترک کرتے ہوئے صرف معمولی و مختصر سی معرفت و آگہی کے مطابق عمل کرتے ہوئے اپنے فریضہ کو انجام دے اور جس چیز کو بادشاہ پسند کرتا ہے اس پر عمل کرے اور جس چیز کو پسند نہیں کرتا چھوڑ دے تو بہت جلد اس کی بارگاہ میں مقرب اور حلقہ خواص کی فرد بن جائیگا۔ بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ ـــ جو شخص عمل میں کوتاہی کرتا ہے اور اپنے نفس کے مطالبات کا پیرو ہے اس کا یہ عمل خود دلیل ہے کہ اسے خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوئی ہے، وہ صرف خدا کے نام سے آشنا ہوا ہے، اس کے معنی سے بے خبر ہے۔ کیونکہ اگر خدا کو اس طرح سے پہچانتا جو پہچاننے کا حق ہے تو ہر آن اور ہر لمحہ اس سے ڈرتا رہتا اور اس کی نافرمانی

سے بچنا جیسا کہ قرآن نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے: انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء ۔ اس کے بندوں میں خدا کا خوف کرنے والے تو بس علماء ہیں کیونکہ سوچا نہیں جا سکتا کہ کوئی باہوش شیر کو دیکھے، اسے پہچانے اور اس کے باوجود اس سے بچنے کی کوشش نہ کرے۔ ہاں! یہ ممکن ہے کہ اگر صرف شیر کی شکل، رنگ اور نام کو جانتا ہو تو ایسا شخص شیر سے خوف نہ کھائے۔ کیونکہ اگر حقیقت میں شیر کو پہچان لیا ہوتا تو ایسا نہ کرتا ـــ یہی وجہ ہے کہ زبور کا سرنامۂ آغاز اسی جملے سے ہوا ہے۔ "راس الحکمۃ خشیۃ اللہ" خدا سے خوف حکمت کا سرچشمہ ہے۔

فقیہ عالی قدر شہید ثانی قدس سرہ بیان کو مزید بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں ـــ کہ عالم کی زندگی کے چند رخ ہوتے ہیں کبھی ایسا ممکن ہے کہ نماز روزہ بجا لانے، احکام شرعیہ پر عمل کرنے اور دعا و تلاوت میں مشغول ہونے کے باوجود بے عملوں کے زمرہ میں شمار ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ چیزیں جو نماز سے واجب تر ہیں اس پر عمل نہ کرے، یہ خیال نہ کریں کہ نماز سے واجب تر بھی کوئی چیز ہے؟ نماز سے واجب تر بھی کچھ چیزیں ہیں مثلاً نفس کا اخلاقی پستی سے بچانا، غرور و حسد سے بچنا، یا اس قسم کی دوسری بری خصلتوں سے بچنا جو انسان کو ہلاک کر دیتی ہیں جس کا تذکرہ علم اخلاق کی کتابوں میں ملتا ہے، یا مثلاً غیبت سے پرہیز نہ کرنا، دوسروں کی نکتہ چینی کرنا، دو روئی برتنا، برادران مسلم کی عیب جوئی کرنا یا اسی طرح وہ گناہ جن کا تعلق زبان سے ہے یا دوسرے اعضاء و جوارح سے جس کے خود مخصوص احکام اور معین گناہ ہیں جس کی تفصیل کتابوں میں موجود ہے۔

ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ مذکورہ بری باتوں کو معلوم کرے اور اس کے بچنے کی کوشش بھی کرتا رہے۔ اس قسم کے گناہوں کو آپ ان کتابوں میں نہیں پا سکتے جو خرید و فروخت اور اجارہ وغیرہ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ بلکہ ان چیزوں کو با معرفت علماء سے دریافت کریں جو خود بھی عامل ہوں اور اس فن میں کتابیں بھی لکھی ہوں۔

شہید ثانی علیہ الرحمہ نے طہارت باطنی کے بغیر علم ظاہر مفید و موثر نہیں ہوتا کے موضوع پر تحریر کرتے ہوئے مزید فرمایا۔

"جو لوگ عالم بے عمل ہیں ان کی مثال اس اندھیرے گھر کی سی ہے جس کی چھت پر چراغ

روشن ہو جس سے گھر کے باہر تو روشنی ہو لیکن خود وہ گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہو۔ یا اس کنوئیں کی مثال ہے جس کے چبوترہ کو پختہ بنایا ہو اور اس کے اندر خوشگوار پانی کے بجائے بدبودار پانی موجود ہو ۔۔۔ یا اس قبر کی ہے جس کے اوپر بہترین قیمتی چادر اور زیورات سجا دئے گئے ہوں اور خود داخل قبر پراگندہ و بدبودار میت پڑی ہو ۔

ظاہرش چون گور کافر پر حُلَل ؛ باطنش قہر خدا عز وجل

شہید مزید متوجہ فرماتے ہیں کہ ۔۔۔ اصلاح نفس کا یہ طریقہ نہیں کہ انسان ہمہ تن ظاہر کو سنوارنے میں مصروف رہے بلکہ چاہیئے کہ باطن نفس کی اصلاح کرے کیونکہ انسان کا نفس ہی گناہوں کا سرچشمہ ہے ۔ اصلاح نفس کرتے ہوئے اس کسان کا سا عمل اختیار نہیں کرنا چاہیئے جو زراعت سے خود رو گھاس پھوس کو اوپر سے کاٹتا رہتا ہے ، لیکن اس کی جڑیں یوں ہی زمین میں باقی رہتی ہیں اور روز بروز وہ جڑیں بڑھتی رہتی ہیں ، خود رو گھاس سے نجات کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو جڑوں سے اکھیڑ پھینکے اور اس طرح گلوں اور سبزوں کو کھلی آزادی بخشے یا اس بیمار کی طرح نہ ہو جو کسی جلدی بیماری میں مبتلا ہو طبیب نے ایک دوا پینے کے لئے دی تھی تاکہ جڑ ختم ہو اور ایک دوا مالش کے لئے تاکہ آثار مرض بھی زائل ہو جائیں لیکن اس مریض نے صرف مالش کے تیل پر قناعت کی ، نہ صرف یہ کہ پینے والی دوا استعمال نہ کی بلکہ ایسی غذا بھی استعمال کی جس نے مرض کے جراثیم کو بڑھنے میں مدد دی ۔۔۔ ظاہر ہے کہ ایسا علاج کبھی بھی نتیجہ بخش نہیں ہو سکتا ۔

معبود سے التجا ہے کہ وہ ہماری اصلاح فرمائے اور ہماری چشم باطن کو ہمارے اندرونی معائب پر بینا و بصیر قرار دے اور جو علم ہم نے حاصل کیا ہے اسے ہمارے لئے مفید قرار دے لے ہمارے خلاف حجت قرار نہ دے کیونکہ وہ ارحم الراحمین ہے ۔

جناب ڈاکٹر مہدی گلشنی
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

اسلامی معاشرہ میں علم و صنعت کے نقوش

قرآن مبارک میں تقریباً سات سوا سی مقامات پر علم اور اس کے مشتقات کا استعمال ہوا ہے سب سے پہلی آیت جو پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی اس میں بھی انسان کو لکھنے پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کی طرف بنیادی طور پر ترغیب دلائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :۔

اقرأ باسم ربك الذی خلق ۔ خلق الانسان من علق ۔ اقرأ وربك الاکرم الذی علّم بالقلم ۔ علّم الانسان مالم یعلم ۔ (العلق / ۱-۵)

(اے رسول!) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا، اسی نے انسان کو جمے ہوئے مادے سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے، وہ خدا جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور انسان کو وہ باتیں بتائیں جن کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

اسی طرح قرآن میں جہاں حضرت آدمؑ کی خلقت کا ذکر ہے واضح طور پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ جب حضرت آدمؑ کو اسماء کی تعلیم دے دی گئی فرشتوں کو ان کی عظمت کے سامنے سجدہ ریز ہونا پڑا :۔

وعلّم آدم الاسماء کلها ثم عرضهم علی الملائکة فقال انبئونی باسماء هؤلاء ان کنتم صادقین ۔ قالوا سبحانك لا علم لنا الا ما علّمتنا انك انت العلیم الحکیم ۔ (البقرہ: ۳۱-۳۲)

اور (جب) آدمؑ کو تمام اسماء کی تعلیم دے دی پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تم لوگ سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ۔ انہوں نے (عاجزی کے ساتھ) کہا پروردگارا! تو (ہر عیب سے) پاک و پاکیزہ ہے ہم تو اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو کچھ تو نے ہم کو تعلیم دی ہے، بے شک تو بڑا جاننے والا اور مصلحتوں کا سمجھنے والا ہے۔

چنانچہ علم کی اہمیت کے پیش نظر قرآن میں خدا نے اعلان کر دیا کہ عالم اور جاہل برابر نہیں ہو سکتے:

".... قل هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون" (الزمر/۴۹)

کہدیجئے، کیا وہ لوگ جو پڑھے لکھے ہیں اور وہ لوگ جو ان پڑھ ہیں برابر ہو سکتے ہیں؟!

اور اسی طرح قرآن کی نظر میں ادراک کی صلاحیت بھی صرف علماء کے یہاں پائی جاتی ہے:۔

وتلك الامثال نضربها للناس وما يعقلها إلا العالمون (العنكبوت/۴۳)

اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے لئے پیش کر رہے ہیں مگر ان کو سوائے اہل علم حضرات کے کوئی سمجھ نہیں سکتا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ خدا کا خوف صرف علماء میں پایا جاتا ہے:۔

انما يخشى الله من عباده العلماء (فاطر/۲۸)

اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء خشیت الٰہی رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ احادیث و سنت میں بھی علم اور علماء سے متعلق بہت زیادہ بحث کی گئی ہے پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: "علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے"۔

"طلب العلم فريضة على كل مسلم"[1]

حضورؐ کا ہی ارشاد گرامی ہے: علم حاصل کرو چاہے چین ہی میں کیوں نہ ملے۔

"[2]اطلبوا العلم ولو كان بالصين"

[1] کلینی: اصول کافی (جلد ا صـ۳۰)، ابن ماجہ: سنن (مقدمہ باب ۱۷ حدیث صـ۲۲۴)
[2] غزالی: احیاء علوم (جلد ا صـ۱۴)، مجلسی: بحار الانوار (جلد ا۔ صـ۱۸۰)

نیز آپؐ نے فرمایا: گہوارہ سے آغوشِ قبر میں پہنچنے تک علم کی جستجو میں لگے رہو"

"اطلبوا العلم من المھد الی اللحد" [1]

اسی طرح نبی اکرمؐ سے مروی روایتوں میں علماء کو انبیاء علیہم السلام کے وارث کی حیثیت سے یاد کیا گیا ہے:۔

العلماء ورثۃ الانبیاء [2]

نیز علماء کے قلم کی روشنائی کو شہدائے راہ خدا کے خون پر فضیلت دی گئی ہے:۔

یوزن یوم القیٰمۃ مداد العلماء ودم الشھداء فیرجح مداد العلماء علیٰ دم الشھداء [3]

یعنی روزِ قیامت علماء کے قلم کی روشنائی اور شہداء کے خون کو ایک دوسرے کے ساتھ تولا جائے گا اس وقت علماء کے قلم کی روشنائی کو خونِ شہداء پر ترجیح حاصل ہوگی۔

ایک اہم مسئلہ جو زمانۂ قدیم میں بھی موضوعِ سخن رہا ہے یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں "علم" کہتے کسے ہیں؟ کیا کسی خاص علم یا کچھ مخصوص علوم سے اس کی مراد ہے یا اس سلسلہ میں اسلام کسی محدودیت کا قائل نہیں ہے؟ بعض علماء اسلام نے محض علوم معارفِ اسلامی کو ہی ممدوح سمجھا ہے اور دیگر علوم کا حصول صرف اس وقت ضروری جانا ہے جب اسلامی معاشرہ کو ان کی ضرورت ہو اور وہ بھی صرف اسی حد تک جس کے بغیر کام نہ چل سکتا ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کی نظر میں "علم" کسی خاص موضوع سے مخصوص ہوتا تو پیغمبر اسلامؐ اس کی تشریح ضرور کر دیتے اس کے علاوہ اگر خود قرآن و سنت سے استفادہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اسلام کی نظر میں

---

[1] سید حسن شیرازی، کلمۃ الرسول الاعظم ص۴۰۳۔ مجلسیؒ نے امام جعفر صادقؑ سے بھی نقل کیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: طلب العلم فریضۃ فی کل حال" علم کا حاصل کرنا ہر حالت میں واجب ہے (بحارالانوار جلد ۱ ص۳۲ ح ۲۶۸)

[2] کلینی: اصول کافی ج ۱ ص ۳۲، ترمذی، سنن (کتاب علم: باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ حدیث۔

[3] سیوطی، الجامع الصغیر (جز ثانی ص۶۵۷ طبع دمشق)۔ اسی مضمون کی ایک حدیث مجلسیؒ نے بحارالانوار جلد ۲ ص۱۶ پر اس طرح نقل کی ہے: اذا کان یوم القیٰمۃ وزن مداد العلماء بدماء الشھداء

لفظ "علم" کا دامن بڑی وسعتوں کا حامل ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس قول سے جو مفضل بن عمر سے خطاب فرماتے ہوئے نقل کیا گیا ہے اسلامی مملکت علم کی وسعتوں کا اندازہ بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

امام فرماتے ہیں :۔

"فکر یا مفضل، فیما اعطی الانسان علمہ وما منع فانہ اعطی علم جمیع ما فیہ صلاح دینہ ودنیاہ۔ فمما فیہ صلاح دینہ معرفۃ الخالق تبارک و تعالیٰ بالدلائل والشواہد القائمۃ فی الخلق، و معرفۃ الواجب علیہ من العدل علی الناس کافۃ وبر الوالدین وأداء الامانۃ ومؤاساۃ اہل الخلۃ وأشباہ ذلک مما قد توجد معرفتہ والاقرار والاعتراف بہ فی الطبع والفطرۃ، من کل امۃ موافقۃ او مخالفۃ وکذلک اعطی علم ما فیہ صلاح دنیاہ کالزراعۃ والغراس واستخراج الارضین واقتناء الاغنام والانعام واستنباط المیاہ ومعرفۃ العقاقیر التی یستشفی بہا من ضروب الاسقام والمعادن التی یستخرج منہا انواع الجواہر وركوب السفن والغوص فی البحر وضروب الحیل فی صید الوحش والطیر والحیتان والتصرف فی الصناعات ووجوہ المتاجر والمکاسب وغیر ذلک مما یطول شرحہ ویکثر تعدادہ، مما فیہ صلاح امرہ فی ہذہ الدار، فاعطی علم ما یصلح بہ دینہ ودنیاہ ومنع ما سوی ذلک مما لیس فی شأنہ ولا طاقتہ ان یعلم کعلم الغیب وما ہو کائن وبعض ما قد کان .. فانظر کیف اعطی الانسان علم جمیع ما یحتاج الیہ لدینہ ودنیاہ وحجب عنہ ما سوی ذلک، لیعرف قدرہ و نقصہ وکلا الامرین فیہما صلاحہ.."[1]

← ترجیح مداد العلماء علی دماء الشہداء

[1] مجلسی؛ بحار الانوار (ج ۳) ص ۸۲-۸۳

توحید ۹۲

"اے مفضل! ان چیزوں کو سمجھ لو جن چیزوں کے جاننے کے لئے پروردگار عالم نے انسان کے سامنے اسباب فراہم کر دئے ہیں اور جن چیزوں کا جاننا انسان کے لئے نامناسب سمجھا ہے۔ جن چیزوں کے جاننے میں انسان کے لئے دین و دنیا کی مصلحت پائی جاتی ہے اس کی راہیں کشادہ کردی گئی ہیں چنانچہ وہ چیزیں جن کے جاننے میں انسان کی دینی مصلحتیں مضمر ہیں ایک تو خود خلاق عالم کی معرفت ہے جس کی نشانیاں پروردگار عالم نے اپنی مخلوقات کے اندر دلیل و شاہد کے طور پر ظاہر کی ہیں۔ دوسرے ان چیزوں کی جانکاری حاصل کرنا ہے جن کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک کرتے ہیں جس میں ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، امانت کی ادائیگی کرنا، فقراء کا خیال رکھنا، نیز اسی قسم کی دوسری چیزیں آتی ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا سمجھنا اور اقرار و اعتراف کرنا بلا امتیاز کفر و اسلام ہر انسان کی فطرت و طبیعت میں داخل ہے۔ اسی طرح وہ چیزیں جن کا جاننا دنیوی مصلحت کے تحت لازمی و ضروری ہے اس کی جانکاری کی صلاحیت بھی انسان کو عطا کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر انسان مندرجہ ذیل امور کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ زراعت و درخت کاری، زمین شناسی و گلہ بانی، جڑی بوٹیوں کی شناخت تاکہ اس کے ذریعہ بیماریوں کا تدارک کیا جا سکے، کان کنی و معادن شناسی تاکہ مختلف قسم کے جواہرات کی تلاش کی جا سکے۔ جہاز رانی اور دریائی سفر کے طور طریقہ نیز غوطہ خوری کا ہنر سیکھنا، مختلف قسم کے جنگلی جانوروں، پرندوں اور مچھلیوں کے شکار کا طریقہ جاننا، طرح طرح کی صنعتی تدبیریں اختیار کرنا، تجارت و حرفت کے مختلف انداز و طریقے اپنانا نیز اسی طرح کی دوسری بہت سی چیزیں ہیں جن کی اس دنیا میں انسان کو ضرورت پڑتی ہے جنکی فہرست طولانی اور تشریح تفصیل طلب ہے بس مختصر طور پر (یوں سمجھ لو) کہ جن چیزوں کی معلومات میں انسان کے لئے دین و دنیا کی بھلائی مضمر ہے خداوند عالم نے ان کی جانکاری کی صلاحیت انسان کو ودیعت کی ہے البتہ جن چیزوں کا جاننا اس کے لئے مفید اور مناسب نہیں ہے یا اس کی طاقت سے ماوراء ہے ان سے انسان کو محروم رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ان ہی میں سے علم غیب یا ماضی و مستقبل کی جانکاری بھی ہے . . . . پس غور و فکر کا مقام ہے کہ خداوند عالم نے کس طرح ان تمام چیزوں کا علم انسان کو عطا کر دیا جو اس کی دینی اور دنیوی

زندگی کے لیے لازم تصور کئے جا سکتے ہیں اور کس طرح بعض دوسری چیزوں کے علوم پر پردہ ڈال دیا تاکہ انسان اپنی حقیقت کو سمجھ کر اپنی کمزوریوں کا ادراک کر سکے اور یہ دونوں باتیں بہرحال انسانی بھلائی کے لئے رکھی ہیں......"

معلوم ہوا کہ اسلام نے حصول علم کے سلسلہ میں جہاں حدبندیاں قائم کی ہیں یہ وہی مقامات ہیں جن کا علم مسلمانوں کے لیے مفید اور نفع بخش نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: "اللّٰھم انّی اعوذ بك من علم لاینفع....[1]" "پروردگارا! تجھ سے پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جس میں کوئی فائدہ نہ پایا جاتا ہو۔"

ہر وہ علم جو اس دنیا میں خلاق عالم کی معین کردہ راہوں کو طے کرنے میں مددگار ثابت ہو مفید اور منفعت بخش علوم کی فہرست میں شامل ہے ورنہ دوسری صورت میں اسے غیر مفید علوم میں شمار کیا جائے گا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل شدہ مندرجہ ذیل روایت کی بنیاد پر مفید و غیر مفید علوم بآسانی مشخص کئے جا سکتے ہیں۔ امامؑ فرماتے ہیں:۔

فکل ما یتعلّم العباد او یعلّمون غیرھم من صنوف الصناعات مثل الکتابۃ والحساب والتجارۃ والصیاغۃ والسراجۃ والبناء والحیاکۃ والقصارۃ والخیاطۃ وصنعۃ صنوف التصاویر۔ مالم یکن مثل الروحانی وانواع صنوف الآلات التی یحتاج الیھا العباد التی منھا منافعھم وبھا قوامھم وفیھا بلغۃ جمیع حوائجھم فحلال فعلہ وتعلیمہ والعمل بہ وفیہ لنفسہ او لغیرہ۔

وان کانت تلك الصناعۃ وتلك الآلۃ قد یستعان بھا علی وجوہ الفساد ووجوہ المعاصی ویکون معونۃ علی الحق والباطل۔ فلا بأس بصناعتہ وتعلیمہ، نظیر الکتابۃ التی ھی علی وجہ من وجوہ الفساد من تقویۃ معونۃ ولاۃ الجور۔

وکذلك السکین والسیف والرمح والقوس وغیر ذلك من وجوہ الآلۃ التی قد تصرف الی جہات الصلاح وجہات

[1] ابن ماجہ، سنن (مقدمہ، باب ۲۳، حدیث ۲۵) سیوطی: الجامع الصغیر (جزء اول ۱۸۵ و ۱۹۲ طبع دمشق)

الفساد وتکون الۃ ومعونۃ علیھا، فلا بأس بتعلیمہ وتعلّمہ واخذ الاجر علیہ وفیہ والعمل بہ وفیہ لمن کان لہ فیہ جھات الصلاح من جمیع الخلائق ومحرم علیھم فیہ تصریفہ الیٰ جھات الفساد والمضار، فلیس علیٰ العالم والمتعلم اثم ولا وزر لما فیہ من الرجحان فی منافع جھات صلاحھم وقوامھم وبقائھم بہ وانما الاثم والوزر علیٰ المتصرف بھا فی وجوہ الفساد والحرام وذلک انما حرّم اللّٰہ الفساد التی حرام ھی کلھا التی یجیٔ منھا الفساد محضا نظیر البرابط والمزامیر والشطرنج وکل ملھویہ والصلبان والاقسام وما اشبہ ذلک من صناعات الاشربۃ الحرام وما یکون منہ وفیہ الفساد محضاً ولا یکون فیہ ولا منہ شیٔ من وجوہ الصلاح فحرام تعلیمہ وتعلّمہ والعمل بہ واخذ الاجر علیہ وجمیع التقلب فیہ من جمیع وجوہ الحرکات کلّھا۔ الا ان تکون صناعۃ قد تتصرف الیٰ جھات الصنائع وان کان قد یتصرف بھا ویتناول بھا وجہ من وجوہ المعاصی. فلعلّۃ لما فیہ من الصلاح حلّ تعلمہ والعمل بہ، ویحرم علیٰ من صرفہ الیٰ غیر وجہ الحق والصلاح۔"[1]

ہر قسم کی صنعت وحرفت جو اللہ کے بندے سیکھتے یا دوسروں کو سکھاتے ہیں مثلاً فن تحریر وخطاطی، حساب کتاب (یا امور دفتری) تجارت وزرگری (سوناری) زین سازی، معماری کتائی بنائی، سلائی، کڑھائی، نقاشی ومصوری (غیر ذی روح چیزوں کی) نیز ایسے آلات اور ہتھیار کی ساخت جنکی انسان کو ضرورت پڑتی ہے اور جن کا بنانا انسان کے لئے

---

[1] حرانی، تحف العقول (۲×۹-۲۵۰ طبع قم)

مفید و منافع بخش ہے یا جو انسانی معاشرہ کو استحکام عطا کرتے ہیں اور زندگی کی ضرورتیں اس سے وابستہ ہوتی ہیں ان کا سیکھنا یا ان کو پیشہ قرار دینا، ان کی تعلیم دینا، عمل میں لانا یا ان امور میں دخیل ہونا چاہے وہ خود اپنی ذات کے لیۓ ہو یا دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیۓ ہو بہرحال حلال ہے حتیٰ اگر کسی صنعت اور آلات سازی سے تباہی و بربادی اور فساد و گناہ کے رواج پانے یا حق کے ساتھ ساتھ باطل کی بھی مدد کا ذریعہ بن جانے کا خدشہ ہو مثال کے طور پر تحریر و کتابت ممکن ہے کسی وقت فاسد امور کی تقویت کا سبب بن جائے یعنی اس سے ظالم حکومتوں کے کارندے فائدہ اٹھالیں پھر بھی اس کے سیکھنے یا تعلیم دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اسی کے مانند خنجر و شمشیر اور نیزہ و کمان یا اسی کے مثل دوسرے ہتھیار اور آلات کا بنانا بھی ہے کیونکہ یہ انسان کی صلاح و حفاظت کے لیۓ بھی کام میں لائے جاتے ہیں اگرچہ ان میں فساد کا بھی امکان موجود ہے چنانچہ یہ دونوں طرح کے امور میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اب ان کا سیکھنا اور سکھانا، اجرت طلب کرنا یا اس کو اپنا پیشہ اور مشغلہ قرار دینا اگر خلق خدا کی بہتری اور منفعت کی نیت سے ہو تو کوئی حرج نہیں ہے البتہ انھیں فاسد اور مضر امور میں استعمال کرنا حرام ہے۔ ایسے امور کا سیکھنا اور سکھانا استاد اور شاگرد دونوں کے لیے کسی گناہ کا باعث نہیں ہوتا کیونکہ ان آلات کی تعلیم کے پس پشت صلاح و فوائد کے پہلو زیادہ قوی ہوتے ہیں اور عوام الناس کو بقاء و استحکام عطا کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی اس کا غلط استعمال کرتا ہے اور فساد و حرام امور کا باعث بنتا ہے تو بہرحال گناہ گار ہوگا جس کی دلیل یہ ہے کہ خداوند عالم نے بعض صنعتیں مثلاً بربط و نئے (بانسری)، شطرنج کے وسائل نیز تمام لہو و لعب کے سامان، صلیب اور بت نیز حرام مشروبات کا بنانا حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ سب ہمہ جہت حرام ہیں اور محض تباہی و فساد کے پہلوؤں کی حامل ہیں۔

لھذا وہ چیزیں جو محض فساد کا ذریعہ ہوں یا جن میں فساد کے امکان پائے جاتے ہوں اور کسی طور پر سماج کے لیے مفید نہ ہوں نہ ہی کسی بھلائی کا امکان پایا جاتا ہو ان کا پڑھنا، پڑھانا مشغلہ بنانا، معاوضہ یا اجرت لینا مختصر یہ کہ ان سے کسی طرح کی بھی وابستگی

پیدا کرنا حرام ہے۔ ہاں اگر کوئی ایسی صنعت ہو جو دوسری صنعتوں کے لئے کار آمد ہو۔ لو اس سے بعض وقت معصیت کو فروغ دینے والے امور میں بھی استعمال کیا جاتا ہو، جہاں تک اس کے افادی پہلوؤں کا تعلق ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس فن میں مہارت پیدا کرنا یا اس کو مشغلہ بنانا حلال ہے البتہ اگر کوئی اس کا استعمال غلط غیر مفید اور باطل راہوں میں کرتا ہے تو اس کے لئے اس کا سیکھنا بہرحال حرام و ناجائز ہے۔

اسلام اور علوم طبیعی (NATURAL SCIENCES)

اب ہم اس بات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ علوم طبیعی اسلامی تصور کائنات میں کس نوعیت سے کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں نیز یہ کہ یہ کس حد تک ان نقوش پر پورے اترتے ہیں جن کا مذکورہ ممدوح علوم کے ذیل میں ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن و سنت کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان علوم میں دسترس حاصل کرنا دو جہتوں سے امت اسلامی کے لئے مفید و ضروری ہے۔

(۱) معرفت الٰہی میں ان علوم کی اہمیت۔

(۲) اسلامی معاشرہ کی برتری اور استحکام میں ان کا کردار

معرفت الٰہی میں علوم طبیعی کی اہمیت :

قرآن مجید میں علوم طبیعی کی مدد سے خدا کی معرفت حاصل کرنے کے ذیل میں تقریباً سات سو پچاس آیتیں موجود ہیں۔ ان آیات میں خداوند عالم نے طبیعی موجودات کو الٰہی نشانیوں کے عنوان سے پیش کیا ہے اور بندوں کو ان پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ان آیات کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :-

(۱) وہ آیات جن میں اشیاء عالم کے تخلیقی مادوں کا ذکر کیا گیا ہے یا کہ ان کے بارے میں تحقیق و معلومات کا حکم دیا گیا ہے۔

مثلاً :-

"فلینظر الانسان مم خلق" (الطارق: ۵)
پس انسان کو دیکھو کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔
"واللہ خلق کل دابۃ من ماء ۔۔۔۔" (النور: ۴۵)
خدا نے تمام چلنے پھرنے والی مخلوق کو پانی سے پیدا کیا ہے۔
انا خلقنا الانسان من نطفۃ امشاج نبتلیہ فجعلناہ سمیعا بصیرا" (الانسان (دھر)/۲)
ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا ہے تاکہ اس کو آزمائیں اور ہم نے اسکو سمیع وبصیر بنایا ہے۔

(۲) وہ آیات جن میں طریقۂ خلقت کا ذکر کیا گیا ہے یا یہ کہ طریقۂ پیدائش پر غور وفکر کا حکم دیا گیا ہے۔
مثال کے طور پر:۔
وھو الذی خلق السموٰت والارض فی ستۃ ایام وکان عرشہ علی الماء ۔۔۔" (ھود/ ۷)
اور خدا وہ ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ روز (چھ مراحل) میں پیدا کیا ہے اور اس کا عرش پانی پر تھا۔
ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین۔ ثم جعلناہ نطفۃ فی قرار مکین۔ ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ فخلقنا المضغۃ عظاماً فکسونا العظام لحماً ثم انشأناہ خلقاً آخر فتبارک اللہ احسن الخالقین۔" (المؤمنون/ ۱۲-۱۴)
اور ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے اس کو نطفہ بنا کر ایک محفوظ و مطمئن جگہ پر رکھا پھر ہم نے ہی نطفہ کو علقہ کی صورت میں تبدیل کیا اور پھر علقہ (منجمد خون) کو مضغہ (لوتھڑے) کی صورت دی پھر ہم نے ہی مضغہ کو ہڈیوں کی شکل عطا کی، اس وقت ہڈیوں پر گوشت چڑھایا اور اس کے بعد

(روح ڈال کر) ایک دوسری مخلوق کی صورت میں پیدا کیا، پس خدا کی ذات کتنی بابرکت ہے جو تمام بنانے والوں سے بہتر ہے۔

اولم یر الذین کفروا ان السمٰوات والارض کانتا رتقاً ففتقنا ھما (الانبیاء / ۳۰)

وہ لوگ جو کافر ہو بیٹھے انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان و زمین دونوں باہم پیوستہ تھے اور ہم نے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔

خلق السمٰوات بغیر عمد ترونھا والقیٰ فی الارض رواسی ان تمید بکم .... " (لقمان / ۱۰)

اس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے پیدا کیا جن کا تم ادراک کر سکو اور زمین میں بلند و استوار پہاڑ قائم کر دیئے تاکہ تم آرام سے رہ سکو ...."

"ثم استویٰ الی السماء وھی دخان ...." [حم السجدہ (فصلت / ۱۱)]

پھر آسمان کی خلقت کی طرف متوجہ ہوا اور وہ (اس وقت) دھواں سا تھا۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت۔

(الغاشیہ / ۱۷-۲۰)

آیا یہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کی طرف نہیں نظر اٹھاتے کہ اس کو کیسا بلند بنایا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف نظر نہیں ڈالتے کہ ان کو کیسی استقامت دی گئی ہے اور زمین کو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے کہ کس طرح مسطح بچھائی گئی ہے۔

(۳) وہ آیات جن میں مخلوقات کی پیدائش کے طریقے دریافت کرنے کا حکم دیا گیا ہے، مثلاً :-

قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدأ الخلق .... (العنکبوت / ۲۰)

کہہ دیجئے ذرا روئے زمین پر چل پھر کر دیکھو کہ خداوند عالم نے کس طرح خلقت کا آغاز کیا۔

"اولم یروا کیف یبدئ اللہ الخلق ثم یعیدہ....."
(العنکبوت / ۱۹)

کیا ان لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ خداوند عالم کس طرح پہلی دفعہ مخلوقات کو وجود عطا کرتا ہے پھر (اسی طرح) دوبارہ وجود عطا کرے گا۔

(۴) وہ آیات جن میں طبیعت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا مطالعہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے مثلاً:۔

"الم تر ان اللہ انزل من السماء ماء فسلکہ ینابیع فی الارض ثم یخرج بہ زرعاً مختلفاً الوانہ ثم یھیج فتریہ مصفراً ثم یجعلہ حطاماً ان فی ذالک لذکری لاولی الالباب" (زمر / ۲۱)

آیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ خدا ہی نے آسمان سے پانی برسایا اور پھر زمین پر نہریں جاری کیں پھر اس سے رنگ برنگ کے پیڑ پودے اگائے اور پھر خزاں آتی ہے تو تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو جاتے ہیں اور خداوند عالم ان کو چور چور (بھوسا) کر دیتا ہے۔ بہر طور اسمیں ارباب عقل و ہوش کے لئے عبرت و نصیحت ہے۔

اللہ الذی یرسل الریاح فتثیر سحاباً فیبسطہ فی السماء کیف یشاء و یجعلہ کسفا فتری الودق یخرج من خلالہ
(الروم / ۴۸)

خدا ہی وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پس وہ بادلوں کو اڑا لئے پھرتی ہیں پھر وہ بادل کو جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ پانی کی بوندیں بادلوں کے درمیان سے نکل پڑتی ہیں۔

ان فی خلق السموٰت والارض و اختلاف اللیل والنھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا و بث

فیھا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیات لقوم یعقلون"

(البقرۃ / ۱۶۴)

بے شک آسمان وزمین کی پیدائش دن اور رات کی آمد وشد اور وہ کشتیاں جو سمندروں میں لوگوں کے نفع کی چیزیں لے کر چلتی رہتی ہیں اور پانی جو خداوند عالم آسمان سے برساتا ہے اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندگی عطا کرتا ہے اور طرح طرح کے جانوروں کو ان میں پھیلا دیتا ہے اور ہواؤں کی راہیں بدلنے اور بادلوں میں جو آسمان وزمین کے درمیان مسخر رہتا ہے، ارباب عقل وہوش کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں موجود ہیں۔

وہ آیات ہیں جن میں طبیعی موجودات کی قسم کھائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر:۔

والشمس وضحیٰھا۔ والقمر اذا تلیٰھا۔ والنھار اذا جلیّٰھا۔ واللیل اذا یغشیٰھا۔ والسماء وما بنیٰھا۔ والارض وما طحیٰھا...."

(الشمس / ۱-۶)

سورج کی قسم اور اس کی تابانیوں کی اور چاند کی (قسم)، جب وہ سورج کی پشت سے برآمد ہو اور دن کی (قسم) جب وہ اسے چمک عطا کردے، شب کی (قسم) جب وہ عالم کو اپنی چادر ظلمت میں ڈھانپ لے اور آسمان کی (قسم) اور اس کی جس نے اسے بنایا، اور زمین کی (قسم) اور اس کی جس نے اس کا فرش بچھایا....

فلا اقسم بمواقع النجوم وانہ لقسم لو تعلمون عظیم...."

(الواقعہ / ۷۵-۷۶)

میں تاروں کے منازل کی قسم کھاتا ہوں اور اگر تم سمجھ سکو تو یہ قسم ایک بہت بڑی قسم ہے۔

والسماء والطارق۔ وما ادرٰیک ما الطارق۔ النجم الثاقب

(الطارق / ۱-۳)

آسمان اور رات کو ابھرنے والے تارے کی قسم اور تم کیا جانو کہ یہ ابھرنے والا تارہ کون سی چیز ہے۔ یہ چمکتا ہوا ستارہ ہے۔

والسماء ذات البروج (البروج/۱)

قسم آسمان کی جو برجوں کا حامل ہے۔

(۶) وہ آیات جن میں بعض طبعی مخلوقات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وقوع قیامت کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہے:۔

یا ایھا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقناکم من تراب ثم من نطفۃ ثم من علقۃ ثم من مضغۃ مخلقۃ وغیر مخلقۃ ... وتری الارض ھامدۃ فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت وربت وانبتت من کل زوج بھیج۔

(الحج/۵)

اے لوگو! اگر تم کو دوبارہ زندہ کئے جانے کے بارہ میں شک ہے تو (ذرا سوچو) کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا اس کے بعد نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون سے پھر اس لوتھڑے سے جو سڈول ہو یا ادھورا ہو۔ پیدا کیا ..... (دوسری جانب) تم زمین کو مردہ (بیکار، افتادہ) دیکھ رہے ہو (لیکن جب) ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو سبزوں سے لہلہانے لگتی ہے اور ہر طرح کی خوش رنگ وزیبا چیزیں اگاتی ہے۔

اولیس الذی خلق السمٰوٰت والارض بقادر علیٰ ان یخلق مثلھم بلیٰ وھو الخلاق العلیم" (یس/۸۱)

وہ خدا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، کیا ان ہی جیسا پھر پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتا؟ ہاں (اسکی قدرت سے یہ بات بعید نہیں ہے) کیونکہ وہ ایسا پیدا کرنے والا ہے جو دانا ہے۔

یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی ویحی الارض بعد موتھا وکذالک تخرجون۔ (الروم/۱۹)

ردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے پیدا کرتا ہے اور وہ مردہ زمین
ندہ کر دیتا ہے۔ اسی نوعیت سے (قیامت کے دن) تم لوگ بھی زمین سے نکالے

ت جن میں قوانین طبیعت میں ایک نظم اور الٰہی صنعت میں استحکام و استواری
ے متعلق گفتگو ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے:۔
الجبال تحسبها جامدۃً وھی تمرّ مرّ السّحاب صنع اللّٰہ الّذی
ٍ شیئٍ انہ خبیر بما تفعلون (النمل/۸۸)
و دیکھ کر انہیں مستحکم و ساکن تصور کرتے ہو حالانکہ یہ بادل کی طرح حرکت میں
خدا کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط و مستحکم بنایا ہے بے شک جو کچھ تم
اس سے خوب واقف ہے۔
ی خلق سبع سمٰوات طباقاً۔ ماتریٰ فی خلق الرحمٰن من تفٰوتٍ۔
ع البصر ھل تریٰ من فطورٍ۔ ثم ارجع البصر کرّتین ینقلب
۔ البصر خاسئاً وّھو حسیرٌ (الملک/۳-۴)
نے سات آسمان تلے اوپر منظم انداز میں بنائے۔ بھلا تم کو خدائے رحمان کی تخلیق
ر دکھی یا بے نظمی نظر آتی ہے۔ ذرا پھر آنکھ اٹھا کر دیدۂ عقل سے خدا کے نظام
یکھو کیا تم کو اس میں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ پھر نظر بصیرت سے کام لو، ہر بار
ر تھک ہار کر تمہاری طرف لوٹ آئے گی ۔ (اور کوئی عیب و خلل نکال نہ پاؤ گے)
ا فیھا من کلّ شیئٍ موزونٍ ۔ (الحجر/۱۹)
نے (اس زمین میں) ہر قسم کی مناسب و موزوں چیز اگائی۔
لق کلّ شیئٍ فقدّرہ تقدیراً۔ (الفرقان/۲)
ز کو اس نے پیدا کیا اور ان کے لیے ایک معین اندازہ مقرر کیا۔
سمٰوات والارض بالحق یکوّر اللیل علی النھار ویکوّر النھار
ل وسخّر الشمس والقمر کلّ یجری لاجلٍ مسمّیً۔۔۔
(الزمر/۵)

اس نے آسمانوں اور زمین کو بجا اور حق پیدا کیا اور وہی رات کو دن پر اور دن کو رات
تہ بہ تہ لپیٹتا ہے اور اسی نے آفتاب و ماہتاب کو مسخر کیا تاکہ یہ سب ایک مقررہ وقت
گردش کرتے رہیں۔

وماخلقنا السماء والارض ومابینهما لاعبین (الانبیاء : ۱۶)

اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، بے کار وا
پیدا نہیں کیا۔

وهوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعًا (البقرہ /۲۹)

وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے تمہارے فائدے کے لئے زمین کی تمام چیزوں کو
وسخرلکم مافی السموٰات ومافی الارض جمیعًا منه (الجاثیہ/

اور جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے تمہارے لئے مسخر کردیا ہے ۔

هوالذی جعل لکم الارض ذلولا فامشوفی مناکبها وکلوامن
رزقه ...." (الملک /۱۵)

وہی تو ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے نرم (ہموار) کردیا پس تم اس کے بلند و پست
اطراف و جوانب میں چلو پھرو اور اس کی (عطاکردہ) روزی سے پیٹ بھرو۔

والانعام خلقها لکم فیها دفءٌ ومنافع منها تاکلون (

اور اس نے تمہارے لئے چوپایوں کو پیدا کیا، اس طرح کہ تم ان کے ذریعے اپنے لئے
نیز دیگر فائدہ کی چیزیں حاصل کرو۔ اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے بھی ہو۔

وانزلنا الحدید فیه بأسٌ شدید ومنافع للناس (حدید/

اور لوہے کو نازل کیا جس کے اندر سختی بھی ہے اور لوگوں کے لئے بہت زیادہ فوائد

وهوالذی جعل لکم النجوم لتهتدوا بها فی ظلمات البرّ
والبحر. قد فصّلنا الایات لقوم یعلمون (انعام/۹۷)

اور وہی وہ خدا ہے جس نے تمہارے لئے ستارے قرار دیئے تاکہ تم خشکی اور سمن
کی گہری تاریکیوں میں ان کی مدد سے راہ معلوم کرو۔ اہل دانش و خرد کے لئے ہم نے ا

(قدرت) کی نشانیاں خوب تفصیل سے بیان کردی ہیں۔

قرآن کی ان آیات میں خداوند عالم نے بندوں کو فکر و نظر کی دعوت دی ہے کہ وہ آنکھیں کھول کر طبیعت کی تخلیق کا جائزہ لیں تاکہ انسان اس عجیب و غریب کارخانۂ قدرت میں کارفرما نظم و ہم آہنگی کا مشاہدہ کرنے کے بعد خدا کے وجود سے آگاہ ہو۔

ظاہر ہے ان آیات میں ذکر شدہ مسائل کا بھرپور ادراک کرنے اور بعض آیتوں میں اٹھائے گئے سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لئے علوم طبیعی کا جاننا بہت ضروری ہے اس لئے کہ سطحی مطالعہ کے ذریعہ تخلیق کی عظمتوں کا سمجھ لینا انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاطر کی ۲۷ ویں اور ۲۸ ویں آیات میں خداوند عالم نے اپنی قدرتی تخلیقات کا ایک سلسلہ پیش کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ہے :-

"انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" یعنی یہ صرف علماء ہی ہیں جو خدا کی عظمتوں کے عارف ہوتے ہیں اور ان ہی کے دلوں میں اس کے شایان شان خشیت پائی جاتی ہے۔

اسی طرح قرآن ایک دوسرے مقام پر اعلان کرتا ہے :-

بل ھو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم (العنکبوت / ۴۹)

بلکہ یہ (قرآن) خدا کی روشن نشانیوں میں سے ہے جو ان لوگوں کے سینوں میں اتر جاتا ہے، جن کے قلوب خدا کے عطا کردہ علم و دانش کی روشنی سے منور ہیں اور سرکشوں کے علاوہ کوئی ہماری نشانیوں سے انکار نہیں کرتا۔

البتہ موجودات عالم کی کیفیتوں سے آگاہی اور طبیعی مخلوقات میں موجود کاریگری سے آشنائی صرف صاحبان ایمان علماء کی نگاہوں میں خشیت الٰہی کا چراغ روشن کرتے ہیں ورنہ وہ لوگ جن کے قلوب ایمان کی روشنی سے ناآشنا ہیں علوم طبیعی میں جس قدر چاہیں دست رس حاصل کریں " انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" کا مصداق نہیں ہوسکتے۔ جیسا کہ قرآن خود اعلان کرتا ہے: قل انظروا ماذا فی السمٰوات والارض وما تغنی الآیات والنذر عن قوم لا یومنون۔ (یونس / ۱۰۱) ۔ کہہ دیجئے، جو کچھ آسمان و زمین کے درمیان ہے اس کا جائزہ لے لو لیکن یہ اللہ کی نشانیاں اور خوف طاری کردینے

والی علامتیں ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتیں جو ایمان نہیں رکھتے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا عالم طبیعت کا مطالعہ ایمان سے عاری افراد کے لئے تقرب الٰہی کا ذریعہ نہیں بن سکتا پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن سائنسی و تجربی علوم کی کوئی کتاب نہیں ہے چنانچہ اس کے اندر طبیعی موجودات کا ذکر اسی غرض سے کیا گیا ہے کہ :

اولاً دنیائے طبیعت کے مطالعہ کے ذریعہ نیز کائنات میں پائی جانے والی مخلوقات کے درمیان موجود نظم و ضبط کو دیکھ کر خداوند عالم پر ان کا ایمان قوی اور مستحکم ہو۔

ثانیاً یہ کہ اس عالم طبیعت میں اس کے لئے جو بے پناہ امکانات مہیا کئے گئے ہیں انسان اس سے آشنا ہو جائے اور اس طرح خدا کی معرفت میں مزید اضافہ پیدا ہو نیز ضمنی طور پر وہ ان تمام چیزوں سے صحیح طور پر فائدہ اٹھا کر خدا کا شکر بجا لائے۔

معرفت الٰہی کی بنیاد پر قرآن نے علوم تجربی کے حصول کو اہمیت دی ہے۔ وہی اسلامی علماء اور دانشوروں کی ان علوم میں دلچسپی کا اصل محرک ہے۔ اس تابناک و درخشاں اسلامی تہذیب کے وجود کو در اصل بڑی حد تک اسی کا مرہون منت سمجھنا چاہئے۔ اس خیال کی تائید غیر مسلم محققین نے بھی کی ہے اور خود ان مسلمان دانشوروں کی تحریروں میں بھی اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

لیوی (R. LEVY) اپنی کتاب "اسلام کا سماجی ڈھانچہ" میں کہتے ہیں کہ :

"ان چند مسلمان دانشوروں سے صرف نظر کرتے ہوئے جو یونانیوں سے زیادہ متأثر نظر آتے ہیں، جن مسلمانوں نے بھی سائنس میں تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے ان کا اصل مقصد یہی تھا کہ وہ عجائبات عالم میں الٰہی عظمت کے آثار کا مشاہدہ کریں"[1]

جارج سارٹن نے بھی اپنی کتاب "تاریخ علم کے دیباچہ" میں اسی خیال کی تائید کی ہے وہ لکھتے ہیں، "علمی میدان میں مسلمانوں کی سعی و کوشش کے اسباب کا اگر مکمل طور پر ادراک کرنا ہو تو اس کے لئے ان کی نگاہ میں قرآن کے بنیادی کردار کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے"[2]

---

[1] R. REVY, " THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM CAMBRIDGE ENGLAND - P. 400

[2] اگر گرایش دانش اسلامی را بہ سوی قرآن کاملاً درک نکنیم بار دیگر می پرسیم در آن صورت چہ گونہ می توانیم ←

ابوریحان بیرونی "تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن" کے مقدمہ میں کہتے ہیں،
"اگر کوئی حق و باطل میں امتیاز کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کیفیات عالم کی جستجو کو اپنا شغلہ بنالے یعنی وہ یہ دیکھے کہ آیا کائنات قدیم ہے یا حادث ہے اور اگر وہ خود کو اس جستجو سے بے نیاز تصور کرتا ہے تو (تلاش حق و باطل کے لئے) جو راہ اس نے منتخب کی ہے اس میں وہ اس بات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا کہ وہ کائنات اور اس کے مختلف ٹکڑوں کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی اور نظم و ضبط پر غور کرے تاکہ ان حقائق سے آگاہی حاصل کر سکے اور پھر اس طرح اس کائنات کے مدبر اور اس کے صفات کا عرفان حاصل کرے اور یہ تلاش و جستجو ان ہی بنیادوں پر مبنی ہے جسکی خداوند عالم نے اپنے ذی شعور بندوں سے خواہش کی ہے، جہاں اس نے کہاہے اور بالکل صحیح اور واضح طور پر کہا ہے:-

"ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض، ربنا ماخلقت ھٰذا باطلاً...." (آل عمران/ ۱۹۱)

اس آیت میں وہ تمام باتیں سمٹ کر پیش کر دی گئی ہیں جن کو ہم نے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور اگر آدمی اس راہ پر صحیح طور سے کام کرے تو تمام علوم و معرفت کے خزانے ہاتھ آجائیں گے۔[۲]

یہی بیرونی اپنی کتاب "الجماہر فی معرفۃ الجواہر" میں انسانی زندگی میں آنکھوں اور کانوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں: "انسان کو بینائی اس لئے دی گئی ہے کہ مخلوقات کے اندر پائی جانے والی حکمتوں کا مشاہدہ کر کے عبرت حاصل کرے نیز مصنوعات کو دیکھ کر وجود صانع پر دلیل قائم کرے۔[۳]

---

[۱] بہ درک درستی از آں نائل تو یم (مقدمہ بر تاریخ علم، ترجمہ فارسی "صدری افشار" جلد ۱ ص ۲۳)

[۲] بیرونی تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن (ترجمہ فارسی احمد آرام ص ۳-۴)

[۳] ابن ہیثم، اما لیعوفلا اعتبار بما یشاھد الحکم من المخلوقات والاستدلال علی الصانع من المصنوعات" (کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر ص ۵ طبع حیدر آباد ۱۹۳۵ء)

ابن ھیثم اپنی ڈائری میں ۴۱۷ھ سے متعلق یادداشت قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں "میں نے اپنے بچپن کے دنوں میں مختلف فرقوں اور ان کے عقائد کا مطالعہ کیا اور یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی کہ ہر فرقہ اپنے عقائد سے والہانہ لگاؤ کا اظہار کرتا ہے چنانچہ میں ان سب کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا کرتا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ حقیقت ایک سے زیادہ نہیں ہوسکتی اور یہ مختلف فرقوں کے درمیان پایا جانے والا اختلاف اسی حقیقت تک پہونچنے کی الگ الگ راہیں ہیں جب شعور وادراک بیدار ہوا اور عقل کی روشنی میں چیزوں کے پرکھنے کا سلیقہ پیدا ہوگیا تو میں نے اس حقیقت کی تلاش اور گمراہ کنندہ تشکیک وخرافات کو ختم کرنے والی بنیادوں کو سمجھنے کا عہد کرلیا۔ چنانچہ میں نے ٹھان لیا کہ اس چیز کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا جو مجھ کو خدا سے نزدیک کرتی جاتی ہے اور اس کے حضور تسلیم ورضا پر مجبور کرکے دل میں اس کا خوف جاگزیں کرتی ہے۔ اس وقت میری حالت اس شخص کے مانند تھی جس کی کیفیت کا جالینوس نے اپنی کتاب "حیلۃ البرء" کی ساتویں فصل میں اپنے شاگردوں سے خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ "مجھے نہیں معلوم وہ کون سی چیز سبب بنی تم اس کو اتفاق، الہام خداوندی، دیوانہ پن یا کوئی بھی دوسرا نام دے سکتے ہو۔ کہ میں اپنے بچپن کے زمانہ سے ہی علم لوگوں سے دور بھاگتا تھا، میں ان سب کو اپنے مقابلہ میں بہت چھوٹا تصور کرتا اور خاطر میں نہ لاتا صرف علم کی طلب اور حقیقت کی جستجو کا جذبہ میرے اندر موجزن تھا اور میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ خدا سے قریب ہونے کے لئے معرفت وحقیقت کی تلاش اور علم ودانش کے حصول سے زیادہ مناسب کوئی اور شئے نہیں ہے۔" اور بالآخر میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ حقیقت تک محض ایک ایسے ہی نظریہ کے سہارے پہونچا جاسکتا ہے جس کا مادہ امور حسی اور صورت امور عقلی ہو اور مجھے یہ چیز صرف ارسطو کی منطق اور طبیعات والہیات کی بحثوں میں نظر آئی جس کی بنیاد پر فلسفہ تشکیل پایا ہے۔

اور جب یہ بات اچھی طرح روشن ہوگئی (کہ ارسطو نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے) میں نے طے کیا کہ فلسفہ کی تعلیم لوں جس میں ریاضیات وطبیعیات والٰہیات شامل ہیں، چنانچہ ان تینوں علوم کے بنیادی اور مقدماتی اصولوں پر میں نے دسترس حاصل کی اور ان کے

تمام فروعاتی پہلوؤں پر تسلط حاصل کرلیا اور چونکہ میں نے دیکھا کہ انسانی طبیعت میں فساد پیدا ہونے کا امکان پایا جاتا ہے اور آخر فنا اس کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے، لہٰذا ان تینوں اصولی علوم کی بنیاد پر میری فکر کے اندر جو دریچہ کھلے ان کی احاطہ بندی کر کے تشریح و تلخیص اور مختصر کیا اور جن مشکل اور دقیق پہلوؤں کی وضاحت ضروری سمجھی اس کا اضافہ کیا اور یہ کام ذی الحجہ ۴۱۷ھ میں انجام پایا[1]

ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان دانشوروں نے علوم طبیعی میں اس لئے مہارت حاصل کی کہ یہ انسان کو خدا سے نزدیک کرنے کا ذریعہ ہے ان کی نظر اس بات پر تھی کہ اس طبیعی کائنات میں قدرت کی نشانیوں کا مطالعہ کریں تاکہ اس "وحدت" کا عرفان حاصل ہو سکے جس کا عکس اس آئینہ کثرت میں موجود ہے۔ انہوں نے طبیعت اور اس کے اجزاء کے اندر پائی جانے والی وحدت و ہم آہنگی کو خالق کائنات کی وحدت کا غماز تصور کیا۔

دیگر اقوام نے بھی علوم تجربی و عقلی کو اسی لئے سیکھا اور حاصل کیا کہ وہ بھی ان علوم کا مقصد، کائنات میں پائی جانے والی وحدت و ہم آہنگی کو نمایاں کرنا نیز وجود کے مختلف مراحل و مراتب اور ان کی ایک دوسرے سے وابستگی کو ظاہر کرنا سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ ان علوم کو اپنے مقصد میں معین و مددگار جانتے تھے۔ البتہ مسلمان دانشوروں نے ان علوم کو سیکھنے کے بعد ان کو اسلامی تصور کائنات کے جامہ میں ڈھال لیا۔ انہوں نے صرف اپنی عقلی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تجربی راہوں سے بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے علوم طبیعی کے سلسلہ میں یہ طرز فکر رفتہ رفتہ اسلامی دنیا سے مفقود ہوتی چلی گئی، مسلمانوں نے طبیعت شناسی نیز قدرتی امکانات سے استفادہ سے متعلق قرآن کی قیمتی آیات کو یکسر نظرانداز کر دیا اور یہ دوسری اقوام کے افراد تھے جنھوں نے ان موضوعات میں تحقیق و تدقیق سے کام لیا جس کے مطالعہ کی

---

[1] محمد لطفی جمعہ "تاریخ فلاسفۃ الاسلام" ص ۲۷، طبع مصر، ۱۳۴۵ ہجری قمری۔

قرآن کریم نے تشویق و رہنمائی کی تھی چنانچہ وہ دنیا پر مسلط ہو گئے اور اس کا نتیجہ عوامی زندگی میں دین و دنیا کے درمیان ایک گہری خلیج کی صورت میں ظہور پذیر ہوا مسلمان ممالک نے مغربی علوم و افکار کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و تمدن بھی اپنانا شروع کردیا اور آج وہ اس منزل پر پہونچ گئے ہیں جہاں ان کی مادی زندگی بھی خطرہ سے دوچار ہے اور معنوی و روحانی زندگی سے بھی ہاتھ دھو چکے ہیں۔ ❖ (باقی انشاء اللہ آئندہ)

جناب سید محمد جواد ہادی

نہج البلاغہ منارۂ ہدایت

(۲)

علم و جہل :

بادی النظر میں یہ بات عجیب لگتی ہے کہ علم و جہل ایک شخص میں یا ایک مقام پر جمع ہو سکتا ہے یا اگر ہم کہیں کہ فلاں عالم بڑا جاہل یا فلاں جاہل بڑا عالم ہے۔ لیکن مولا علیؑ کے فرمائشات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ علماء نہ صرف یہ کہ جاہل ہو سکتے ہیں بلکہ حضرت کے ارشاد کے مطابق بہت سے علماء ایسے ہیں کہ ان کی جہالت انھیں ہلاک کرتی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

رب عالم قد قتلہ جھلہ وعلمہ معہ لا ینفعہ (کلمات قصار/۱۰۷)

بہت سے علماء ایسے ہیں کہ جن کی جہالت انھیں ہلاک کرتی ہے اور ان کا علم انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

یہ حقیقت سمجھنے کے لئے کہ کوئی عالم کیسے جاہل بن سکتا ہے اور کسی عالم کو جہالت کس طرح ہلاک کر سکتی ہے ہمیں مولاؑ کے اس ارشاد پر غور کرنا ہوگا۔ حضرت فرماتے ہیں :۔

لا تجعلوا علمکم جھلاً و یقینکم شکاً اذا علمتم فاعملوا و اذا تیقنتم فاقدموا۔ (کلمات قصار/۲۷۴)

اپنے علم کو جہل میں تبدیل نہ کرنا اور اپنے یقین کو شک میں تبدیل نہ کرنا جب تمھیں کسی چیز کا علم حاصل ہو جائے تو اس کے مطابق عمل کرو۔ اور جب کسی بات پر یقین

حاصل ہو جائے تو فوراً اقدام کرو۔

حضرت کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب علم عمل سے جدا ہو جائے تو وہ علم، علم نہیں رہتا بلکہ وہ جہل بن جاتا ہے اور پھر علم کے ساتھ عمل کے نہ ہونے کی وجہ سے انسان ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔ واضح سی بات ہے کہ اگر کوئی بہت بڑا دانشور اور عالم ہے لیکن وہ اپنے علم و دانش سے استفادہ نہیں کرتا تو اس میں اور ایک عام جاہل انسان میں کوئی فرق نہیں۔ لہٰذا وہ اپنے علم سے چشم پوشی کر کے عمل کرنے کی صورت میں ہلاک بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے علماء کو اپنے علم سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے ؟

علم و مال :

اسلام کا ایک امتیاز یہ ہے کہ دنیا میں کسی بھی مکتب فکر نے علم و دانش کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی اسلام نے دی ہے جو مقام و مرتبہ اسلام نے علم و دانش کو عطا کیا ہے وہ اپنی جگہ پر بے مثال ہے، اس کا اندازہ اسلام کی مختلف تعلیمات اور احکام سے بخوبی ہوتا ہے خصوصاً تعلیم و تعلم کے سلسلے میں اسلام کی تاکید بہترین گواہ ہے۔ علم و دانش کی تحصیل و ترویج کے سلسلہ میں جس اجر و ثواب کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اس سے علم کے بارے میں اسلام کے موقف کا اندازہ ہوتا ہے۔

علم کے بارے میں اسلامی موقف کی صحیح ترجمانی حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے اس بیان میں کی ہے :۔

یا کمیل العلم خیر من المال العلم یحرسك وانت تحرس المال و المال تنقصه النفقة والعلم یزکو علی الانفاق ۔ وصنیع المال یزول بزواله ۔ یا کمیل بن زیاد معرفة العلم دین یدان به یکسب الانسان الطاعة فی حیاته وجمیل الاحدوثة بعد وفاته والعلم حاکمٌ والمال محکومٌ یا کمیل هلك خزّان الاموال وهم احیآءٌ والعلماء باقون مابقی الدهر اعیانهم مفقودة وامثالهم فی القلوب موجودة (کلمات قصار/۱۴۷)

اے کمیل علم مال سے بہتر ہے علم تمھاری حفاظت کرتا ہے جبکہ مال کی حفاظت تمھیں کرنی ہوتی ہے۔

مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے جبکہ علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ مال کے بندے مال کے ختم ہونے سے پہلے ختم ہوجاتے ہیں۔ اے کمیل بن زیاد! معرفت علم ایسا آئین ہے جس کی اقتدا کی جاتی ہے۔ اسی سے اپنی زندگی میں انسان دوسروں سے اپنی اطاعت کراتا ہے اور مرنے کے بعد نیک نامی حاصل کرتا ہے۔ علم حاکم ہے جبکہ مال محکوم ہے۔ اے کمیل: مال جمع کرنے والے زندہ ہوتے ہوئے بھی مرجاتے ہیں، جبکہ اہل علم رہتی دنیا تک زندہ ہیں وہ ظاہری طور پر موجود نہیں ہیں لیکن وہ دلوں میں ہمیشہ کے لئے باقی رہتے ہیں۔

...اور مقام پر مولاؑ ارشاد فرماتے ہیں:۔

لیس الخیر ان تکثر مالک و ولدک ولکن الخیر ان یکثر علمک (کلمات قصار/۹۴)

خیر و فضیلت یہ نہیں ہے کہ مال اور اولاد زیادہ ہو بلکہ خوش بختی و سعادت یہ ہے کہ علم زیادہ ہو۔

...ت حضرت نے ایک سائل کے جواب میں فرمائے ہیں جب اس نے پوچھا کہ مولا خوشی ...خوش بختی کس چیز میں ہے؟ اسی طرح حضرت ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ: لاشرف ...علم (کلمات قصار/۱۱۳) "علم کے برابر کوئی شرف و فضیلت نہیں"۔

بہرحال مولاؑ کی ان فرمائشات سے اسلام کی نظر میں علم کے بلند مرتبہ اور عظیم مقام کا صحیح اندازہ ...یا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ ایک نمونہ ہے ورنہ اگر ان احادیث و روایات کا جو اس سلسلے میں ...گرامی اور ائمہ ہدیٰ سے نقل ہوئے ہیں تفصیل سے جائزہ لیں تو "مثنوی ہفتاد من کاغذ ..." کا مصداق بن جائے گا۔

...ام علم:

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے علم کے لئے بڑے فضائل بیان کئے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں

کہ ہر علم اور ہر عالم و طالب علم ان فضائل کا مستحق ہو سکتا ہے بلکہ اس کے لئے کچھ شرائط بھی بیان ہوئے ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ جہاں اسلام کی نظر میں تحصیل علم واجب کفائی ہے اور کبھی واجب عینی بھی ہو سکتا ہے وہاں بعض علوم ایسے بھی ہیں جن کا پڑھنا پڑھانا حرام قرار پایا ہے۔ جہاں علماء کے لئے یہ سب فضائل بیان ہوئے ہیں اور ان کو انبیاء علیہم السلام کا وارث قرار دیا ہے وہاں بعض علماء کی سخت مذمت کی گئی ہے اور ان کو معاشرے کے لئے ناسور قرار دیا ہے۔

اگر موضوعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو علم کی بہت ساری قسمیں ہیں لیکن یہاں ہمارا مقصد اقسام علم سے موضوعات نہیں ہیں بلکہ اس اعتبار سے علم کے اقسام بیان کرنے ہیں کہ کس علم کو اسلام نے فضیلت دی ہے اور کون علم ہے جو عملی زندگی میں مقصد خلقت کے لئے مفید واقع ہوتا ہے؟ اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو علم کی صرف دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں علم نافع اور علم غیر نافع اب جتنے بھی علوم ہیں چاہے وہ جس موضوع سے بھی متعلق ہیں ان دو قسموں سے خارج نہیں ہیں یا وہ علم نافع ہے یا غیر نافع حضرتؑ، علم غیر نافع کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

لاخیر فی علم لاینفع ولاینتفع بعلم لایحق تعلمه

جس علم سے کوئی نفع نہیں پہنچتا اس میں کوئی خیر نہیں اور جس علم کا سیکھنا سزاوار نہیں اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ پس اس بیان کے پیش نظر علم نافع ہی علم کی بہترین قسم ہے لہٰذا یہ دیکھنا چاہیئے کہ کون سا علم ایسا ہے جو معاشرے کے لئے مفید اور ضروری ہے اس علم کو صرف اسی غرض سے حاصل کرنا چاہیئے اب دیکھنا یہ ہے کہ علم کس صورت میں نافع ہو سکتا ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے مولاؑ کے ان کلمات پر توجہ دینا چاہیئے۔ حضرت فرماتے ہیں:

العلم علمان مطبوع ومسموع ولاینفع المسموع اذا لم یکن المطبوع (کلمات قصار/۳۳۸)

علم دو قسم کا ہے، ایک وہ جو نفس میں رچ بس جائے اور ایک وہ جو صرف

سن لیا جائے، سنا سنایا علم فائدہ نہیں دیتا جب تک وہ دل میں راسخ نہ ہو۔
حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کی رعایت کی جائے تو معاشرے کے بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں اگر ہمارے معاشرے کے علماء اور دانشور حضرات اپنے علم و دانش کو انسان کے فطری تقاضوں سے ہم آہنگ بنائیں اور فطرت بشری کو مدنظر رکھتے ہوئے علم اور جدید ٹیکنالوجی کی روشنی میں معاشرے کے مسائل کے لئے جدوجہد کریں تو یہ علوم مفید واقع ہو سکتے ہیں، آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں رائج بہت سے علوم نہ صرف فطرت بشر سے ہم آہنگ نہیں بلکہ مروجہ طرز تعلیم سے ہماری نئی نسل کو جادہ حق و فطرت سے منحرف کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ہمارے معاشرے کے ذمہ دار افراد کو احساس ذمہ داری کرتے ہوئے اس سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم اٹھانا چاہیئے ورنہ اگر موجودہ صورت حال جاری رہی تو بعید نہیں کہ کچھ عرصہ بعد ہمارا معاشرہ اسلامی تہذیب اور افکار سے پورے طور پر بیگانہ ہو جائے۔
مولا امیر المؤمنینؑ کے فرمائشات کی روشنی میں علم کی وہی قسم اہمیت کی حامل ہے جو عمل کے ساتھ ہو اگر علم عمل سے جدا ہو تو حضرت نے اس علم کو پست ترین رتبہ دیا ہے فرماتے ہیں: اوضع العلم ما وقف علی اللسان و ارفعہ ما ظھر فی الجوارح والارکان (کلمات قصار/۹۲)
اسی طرح دوسرے مقام پر حضرت ارشاد فرماتے ہیں۔ الداعی بلا عمل کالرامی بلا وتر (کلمات قصار/۳۳۷)
ان بیانات سے اس علم نافع کو جس کو اسلام نے بلند رتبہ دیا ہے پہچانا جا سکتا ہے علم نافع صرف وہی علم ہے جو عمل کا قرین ہو اور جس سے عملی زندگی میں فائدہ اٹھایا جا رہا ہو۔

علم اور تفکّر و تعقّل:

حضرت امیر علیہ السلام نے علم کے ساتھ تفکّر و تعقّل پر بڑا زور دیا ہے۔ گویا حضرت کا مقصد یہ ہے کہ صرف علم کافی نہیں ہے بلکہ علم کے ساتھ غور و فکر کی بڑی ضرورت ہے۔

ارشاد فرماتے ہیں: لاعلم کالتفکر (کلمات قصار/۱۳۲) "تفکر کی طرح یا تفکر سے بہتر کوئی علم نہیں ہے۔ ویسے بھی تفکر فی الخلق اور تفکر فی الکائنات کے سلسلے میں احادیث روایات اور آیات قرآنی میں بڑی تاکید ہوئی ہے یہاں تک کہ ایک ساعت تفکر کو ستر سال کی عبادت سے افضل گردانا ہے تفکر سے انسانی سوچ کے دروازے کھل جاتے ہیں انسانی صلاحیتیں بڑھ جاتی ہیں اردگرد کے حالات انسان پر واضح ہو جاتے ہیں لھٰذا جب اہل علم و دانش سوچ سمجھ کر معاشرے کی اصلاح اور فائدے کے لئے کوئی قدم اٹھائیں تو اس کا فائدہ زیادہ اور اس میں غلطیوں کا امکان کم ہوگا۔ حضرت علم کے ساتھ تفکر و تعقل کو ضروری سمجھتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: اعقلوا الخبر اذا سمعتموہ عقل رعایۃ لاعقل روایۃ فان رواۃ العلم کثیر و رعاتہ قلیل (کلمات قصار/۹۸)

جب کوئی خبر سنو تو اس کے بارے میں غور و فکر کرو اور اسے عقل کے معیار پر پرکھ لو۔ البتہ یہ تفکر اور تعقل عمل کرنے کے لئے ہو، صرف روایات کے طور پر دوسروں کے لئے نقل کرنے کے لئے نہ ہو۔ اس لئے کہ روایت نقل کرنے والے زیادہ ہیں مگر ان پر عمل کرنے والے کم ہیں۔

علم اور حلم:

اسلامی نقطۂ نگاہ سے علم کے ساتھ حلم کا ہونا بہت ضروری ہے حلم و علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے حلم علم کی زینت ہے اہل علم و دانش اگر حلم کے اسلحہ سے مسلح ہوں تو وہ اپنے علم سے صحیح فائدہ اٹھا سکیں گے۔

حضرت امیر علیہ السلام خطبہ ہمام میں متقین کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ متقین کی ایک صفت یہ ہے کہ یمزج العلم بالحلم والقول بالعمل اہل تقویٰ علم کو حلم اور قول کو عمل سے آراستہ کرتے ہیں۔ یعنی وہ اہل علم ہونے کے ساتھ ساتھ اہل حلم اور اہل عمل بھی ہوتے ہیں، وہ غیظ و غضب پر مسلط ہو کر علم کو عملی طور پر پیش کرتے ہیں۔

حضرتؑ خطبہ ۲۳۹ میں جس میں آلِ محمدؐ کے فضائل کا تذکرہ ہے ارشاد فرماتے ہیں :-
ھم عیش العلم وموت الجھل یخبرکم حلمھم عن علمھم
وہ ہستیاں علم کو زندہ کرنے اور جہل کو تباہ کرنے والی ہیں ان کا حلم تمہیں ان کے علم سے آگاہ کرتا ہے۔
اسی طرح خطبہ ۱۹۳ میں ارشاد فرماتے ہیں :-
وحرصاً فی علم وعلماً فی حلم
متقین وہ ہیں جو علم کی تحصیل میں حریص ہیں اور ان کا علم حلم سے مزین ہے۔
ان کلمات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم کے ساتھ حلم کا ہونا نہایت ضروری ہے اگر عالم دین حلیم الطبع ہونے کے بجائے مغلوب الغضب اور سخت مزاج کا ہو تو یقیناً معاشرے میں اپنے مشن کے لیے اس خوش اسلوبی سے کام نہیں کر سکتا جو ایک بردبار طبیعت کا انسان کر سکتا ہے۔ قرآن کریم میں رب ذوالجلال اپنے حبیب کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے :-
لوکنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک...
اگر آپ تند مزاج ہوتے تو لوگ آپ کو چھوڑ کر چلے جاتے۔

اہل علم کی ذمہ داریاں :

ویسے تو اہل علم کی ذمہ داریاں بہت ہیں غالباً معاشرے سے متعلق کوئی بھی ایسا مسئلہ نہ ہوگا، جس کے سلسلے میں اہل علم کی کوئی ذمہ داری نہ ہو، لیکن یہاں ان تمام ذمہ داریوں کا تفصیل سے تذکرہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف ان ذمہ داریوں کا اختصار سے جائزہ لینا ہے، جسے حضرت امیر علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں اہل علم کے لئے بیان فرمایا ہے۔
اس سلسلے میں دو اہم ذمہ داری حضرت نے اہل علم کے لئے بیان فرمائی ہے، پہلی ذمہ داری معاشرے میں تعلیم کو عام کرنا اور جہل و ناخواندگی کے خاتمہ کے لئے جد و جہد کرنا ہے۔
دوسری ذمہ داری ظلم اور ظالموں کے خلاف جہاد، ظالموں کے خونیں پنجوں سے مظلومین کو

نجات دلانا اور اس مقصد کے لئے حکومت حقۂ الٰہی کو وجود میں لانا ارشاد ہوتا ہے۔

ما اخذ اللّٰہ علیٰ اھل الجھل ان یتعلموا حتیٰ اخذ علیٰ اھل العلم ان یعلموا (کلمات قصار ۴۷۸)

خدا نے جاہلوں سے علم حاصل کرنے کا عہد و پیمان نہیں لیا مگر یہ کہ پہلے اہل علم سے سکھانے اور تعلیم دینے کا عہد و پیمان لے لیا۔

حضرت ؑ کے اس بیان سے بخوبی واضح ہے کہ معاشرے میں تعلیم عام کرنے اور جہالت ختم کرنے کا اللہ تبارک و تعالیٰ نے علماء سے عہد لیا ہے لہٰذا یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ معاشرے میں علم و دانش کو عام کرنے کے لئے جدوجہد کریں اور اگر اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں اہل علم و دانش نے کوتاہی کی جس کے نتیجے میں معاشرہ علم و دانش سے محروم رہا معاشرے نے ترقی نہ کی تو اس کے لئے علماء خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

دوسری ذمہ داری کے سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں:

وما اخذ اللّٰہ علی العلماء الا یقاروا علیٰ کظۃ ظالم ولا سغب مظلوم لا لقیت حبلھا علیٰ غاربھا (خطبہ شقشقیہ)

اگر وہ عہد و پیمان نہ ہوتا جو خدائے تبارک و تعالیٰ نے ہر معاشرے کے علماء و اہل دانش سے لیا ہے کہ وہ ظالمین کی شکم پری اور مظلومین کی بھوک مری کو دیکھتے ہوئے سکوت اور خاموشی اختیار نہ کریں تو میں شتر خلافت کی مہار کو چھوڑ دیتا اور اسے نظر انداز کر دیتا۔۔۔

حضرت کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ علماء کی ذمہ داری معاشرے میں موجود ناانصافی اور ظلم و ستمگری کے سلسلے میں کتنی اہم ہے۔

حضرت ؑ نے اس فرمائش میں معاشرے میں ایک عادلانہ نظام کے قیام کے سلسلے میں علماء کی اہم ذمہ داری بیان فرمائی ہے کہ علماء کا فریضہ ہے کہ وہ ظالم اور مظلوم کے درمیان ہونے والی کشمکش میں مظلوموں کی جانبداری کرتے ہوئے ان کے حقوق واپس دلوانے کیلئے جدوجہد کریں۔

اور طالب علم کے لئے راہنما اصول :

انسانوں کے عظیم معلّم حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام نے اہل علم اور طالبان علم کے لئے کچھ اخلاقی اصول بیان فرمائے ہیں جن پر کاربند رہنے والے افراد یقیناً دنیوی و اخروی سعادتوں سے مند ہو سکتے ہیں۔ اہل علم اور طالبان علم کی تعلیمی میدان میں راہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ولا یستحین احدٌ منکم اذا سئل عمّا لا یعلم ان یقول لا اعلم

ولا یستحین احد اذا لم یعلم الشیٔ ان یتعلمہ (کلمات قصار/۸۲)

ان کلمات میں حضرتؑ نے زندگی کے پانچ راہنما اصول بتائے ہیں جن میں سے دو صرف اہل علم خصوص ہیں لہٰذا ہم نے صرف انھیں ہی نقل کیا ورنہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر بہت قیمتی حضرتؑ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی اس بات میں شرم و حیا محسوس نہ کرے کہ جب تم سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے جو تمھیں نہ آتا ہو تو پوچھنے والے سے صاف کہدے کہ مجھے اسکا علم نہیں نہیں جانتا اور تم میں سے کوئی بھی اس میں شرم محسوس نہ کرے کہ اگر کوئی مسئلہ نہیں معلوم کسی سے سیکھ لو

حضرتؑ نے یہ دو بہت قیمتی باتیں بتائی ہیں کہ اگر علماء اور طالب علم حضرات ان پر کاربند بائیں تو بہت ساری کمزوریوں اور غلطیوں کا سدّباب کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے حضرات یہ کمزوری ہوتی ہے کہ اگر کوئی مسئلہ ان کو نہ آتا ہو کسی چیز کے بارے میں نہ جانتے ہوں ن کے لیے یہ کہدینا کہ مجھے نہیں معلوم بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ یہ کہنے میں عار سمجھتے ہیں۔ لہٰذا یدھا جواب دیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اگر میرے غلط جواب سے کوئی گمراہ ہو جائے تو اس کا ناہ ہے اور کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح بہت سے افراد ایسے ملتے ہیں کہ وہ سیکھنا اور پوچھنا کسر شان سمجھتے ۔ کسی سے پوچھنے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ وہ جاہل رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے عار لت برداشت کرنا پسند کرتے ہیں لیکن کسی فرد سے اس وجہ سے کہ وہ مجھ سے چھوٹا ہے ر ساتھی اور ہم جماعت ہے یا کسی دوسری وجہ سے پوچھنے اور سیکھنے کے لئے تیار نہیں، دونوں باتیں بہت بڑی کمزوری ہیں جس سے بچنا ضروری ہے۔

حضرت امیرؑ اہل علم کی اخلاقی اصلاح کے لئے ایک جگہ فرماتے ہیں :

سَلْ تَفَقُّهاً وَلَا تَسْئَلْ تَعَنُّتاً فَاِنَّ الْجَاهِلَ الْمُتَعَلِّمَ شَبِيْهٌ بِالْعَالِمِ وَاِنَّ الْعَالِمَ الْمُتَعَسِّفَ شَبِيْهٌ بِالْجَاهِلِ الْمُتَعَنِّتِ

(کلمات قصار/۳۲۰)

سوال کرو سمجھنے کی غرض سے الجھنے کی غرض سے مت پوچھو چونکہ وہ جاہل جو جاننا چاہتا ہے عالم کی مانند ہے اور وہ عالم جو خلاف واقع بات کرتا رہتا ہے اس جاہل کے مانند ہوتا ہے جو بات بات پر الجھتا رہتا ہے۔

اخلاقی لحاظ سے یہ ایک برا مرض ہے کہ بعض حضرات صرف اس لئے مسائل چھیڑتے ہیں کہ مثلاً کسی کو لاجواب کر کے دوسرے لوگوں کے سامنے اسے ذلیل وخوار کیا جائے۔ حضرت نے اس عمل کی شدت سے ممانعت فرمائی ہے، اس سے بہت سارے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں ایسا کرنے والے افراد اگرچہ بڑے بڑے عالم اور دانشمند کیوں نہ ہوں حضرت کی نظر میں جاہل کے مانند ہوتے ہیں، یہ ایک اخلاقی کمزوری ہے جو کچھ لوگوں میں پائی جاتی ہے کہ بحث ومباحثہ صرف اپنی صلاحیتوں کو جتانے یا نام ونمود یا دوسروں کو نیچا دکھانے اور ذلیل وخوار کرنے کے لئے شروع کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی کمزوری ہے، اس سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ خداوند عالم ہم سب کو مولا امیر المؤمنینؑ کے بتلائے ہوئے ان راہنما اصولوں پر عمل کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

جناب مصطفیٰ محقق
ترجمہ : جناب سید احتشام عباس

مصادر فقہ

قرآن :

اللہ کی کتاب: قرآن مجید ان مسلّم فقہی مصادر میں سے ایک ہے جن سے کسی بھی اسلامی فرقہ یا مکتب فقہ کو انکار نہیں ہے۔ مسلمانوں کی مقدس کتاب اور پیغمبر اکرم کا زندۂ جاوید معجزہ ان آیات کا مجموعہ ہے جنھیں خداوند عالم نے بصورت وحی اپنے پیغمبرؐ پر بندوں کے لئے نازل فرمایا اور جو اس وقت موجودہ صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

چونکہ پیغمبر اسلامؐ خدا کے آخری پیغمبر ہیں، لہٰذا آپ کا معجزہ بھی آپ کی جاوداں رسالت کے مطابق قرار دیا گیا ہے۔ دیگر انبیاء کے معجزات کے برخلاف جو فقط حیرت انگیز اعمال اور اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے مخصوص تھے اور اس کے بعد تاریخی یادگار بن کر مذہبی اور تاریخی تحریروں میں ثبت ہو کر رہ گئے لیکن یہ ایک زندہ و پائندہ معجزہ ہے اور ایسی کتاب ہے جو ہمیشہ اور ہر زمانہ میں حکم خدا اور قوانین اسلامی کے حاصل کرنے کے لئے عظیم ترین مصدر ہے اور اجتہاد کی پر تقدس توانائی کے ذریعہ ہر طرح کی فردی و اجتماعی تقاضوں کی جواب گو ہے۔

کتاب خدا تدریجی طور پر ۲۳ سال اور چند ماہ کے عرصہ میں پیغمبرؐ کے اوپر نازل ہوئی ہے اور اس کا آدھے سے زیادہ حصہ مکہ میں ہجرت سے قبل اور بقیہ مدینہ میں نازل ہوا ہے۔ اسی لئے قرآنی سورے مکی اور مدنی دو حصوں میں منقسم ہیں۔ جن میں سے اکثر مکی ہیں۔ مکی سورے معمولاً چھوٹے اور اعتقادی امور خصوصاً توحید اور معاد وغیرہ سے مربوط ہیں، اور مدنی سورے طویل ہیں جن میں زیادہ تر شرعی اور قانونی مسائل زیر بحث آئے ہیں۔

دستورات قرآن بیشتر موقعوں پر تدریجی اور درجہ بندی کی شکل میں انجام پاتے تھے۔ زمانۂ نزول میں عرب معاشرہ پر حاکم تہذیب کی پوری رعایت کی جاتی تھی اور ان کے دیرینہ اجتماعی عادات و اطوار کے ترک کرنے کے سلسلے میں ان کی آمادگی ملحوظ خاطر رکھی جاتی تھی، مثلاً شراب خواری اور قمار بازی جو عرب کے رائج آداب و سنن میں سے تھی اور اکثر لوگ اس کے عادی تھے، یہ چیزیں ایک ہی مقام پر اور یکبارگی حرام نہیں ہوئی۔ اور شاید اگر ایسا ہوتا تو ان عادات میں مبتلا اور ان کا عادی اس وقت کا سماج عدم آمادگی کے سبب پورے طور سے قانون الٰہی کا منفی جواب دیتا اور حدود الٰہیہ کی بے حرمتی ہوتی۔ لہٰذا اکثر مفسرین نے نقل کیا ہے کہ شراب کی حرمت کے احکام تین مرحلوں میں نازل ہوئے۔

۱۔ نصیحت و ارشاد[1]   ۲۔ نماز کے موقع پر شراب کی حرمت[2]

۳۔ مکمل ممانعت[3]

قرآن کے سلسلہ میں جو بات مسلم ہے وہ یہ ہے کہ اس کا صدور قطعی اور یقینی ہے، کیونکہ کسی بھی اسلامی فرقہ یا گروہ نے قرآن کی کسی آیت یا کسی کلمہ کے بارے میں اختلاف یا انکار نہیں کیا ہے اور یہ امانت الٰہی تواتر کے طور پر نسلاً بعد نسلٍ ہمارے ہاتھوں تک پہنچی ہے۔ ہاں اگر کسی فکری یا نظریاتی اختلاف

---

[1] یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما۔ (بقرہ/۲۱۹)

ترجمہ:اے نبیؐ! یہ لوگ آپ سے شراب اور قمار بازی کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہدیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اگرچہ یہ لوگوں کے لئے خالی از نفع نہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدہ سے زیادہ ہے۔

[2] ولا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ (نساء/۴۳)

ترجمہ: مستی کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ۔

[3] انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ (مائدہ/۹۰)

یقیناً شراب، جوا، انصاب (بت) اور ازلام (جوے کے تیر) اعمال شیطان سے زیادہ کثیف تر اور گندے اعمال ہیں، بس ان سے دوری اختیار کرو۔

ا وجود ہے بھی تو وہ اس کی تفسیر یا آیات اور کلموں کی ترتیب وغیرہ سے متعلق ہے نہ کہ اس کی اصلیت میں۔

قرآن مجید کے سلسلہ میں ابتدائی ایام سے ہی مختلف مفسرین نے جو متفاوت نظریات کے حامل رہے ں، کام کیا ہے۔ مفسروں کا پہلا گروہ اصحاب پیغمبرؐ کی شکل میں تشکیل پاتا ہے جن میں مشہور ترین افراد سب ذیل ہیں:۔

حضرت علی ابن ابی طالبؑ، عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن مسعود۔

حکومت عباسی کے آغاز کے موقع پر علم تفسیر قرآن نے رواج پایا اور رفتہ رفتہ متعدد کتابیں س موضوع پر لکھی گئیں جنہیں اہم ترین یہ ہیں۔

- "جامع البیان فی تفسیر القرآن" جسے طبری نے تیس۳۰ جلدوں میں تالیف کیا ہے۔
- "تفسیر کشاف زمخشری" چار جلدوں میں۔
- "تفسیر ابن کثیر" "تفسیر کبیر" تالیف فخر الدین رازی، آٹھ جلدوں میں۔
- "تفسیر جلالین" جسے جلال الدین محلی، نے شروع کیا اور جلال الدین سیوطی نے مکمل کیا اسی لیے اسے "جلالین" کہتے ہیں۔

شیعوں کے یہاں بھی بہت سی عمیق اور پر مغز تفسیریں لکھی گئیں جن میں طبرسی کی تفسیر "مجمع البیان" اور شیخ طوسی کی تفسیر تبیان قابل ذکر ہیں۔

قرآن کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے مناسب ہے کہ اس ذیل میں کچھ تحقیقی مطالب بھی پیش کئے جائیں جن کا جاننا علوم اسلامی کے محققوں کے لئے مفید ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔ اس کے بعد اصول فقہ سے تعلق اس موضوع کے خاص مباحث بھی نظر سے گذریں گے۔

قرآن کریم کے عنوانات اور اسماء:۔

قرآن کریم متعدد عنوانات اور اسماء سے یاد کیا گیا ہے جن میں قرآن، فرقان، کتاب، ذکر اور تنزیل مشہور ترین ہیں۔

قرآن۔ کتاب خدا میں ۵۸ جگہوں پر یہ لفظ کلام الٰہی کے لیے مذکور ہے۔ لفظ قرآن اور اس کے مادہ اشتقاق کے بارے میں علماء میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ شافعی کا خیال ہے

کہ کلمۂ قرآن کسی بھی مادّہ سے مشتق نہیں ہے۔ زجاج، قرآن کو "قرء" یعنی جمع یا اکٹھا کرنا" سے مشتق جانتے ہیں۔ لحیانی نے قرآن کو "قرء" یعنی قرائت ..." اور پڑھنا کا مشتق قرار دیا ہے اور فرّاء بھی قرآن کو قرآئن جمع قرینہ سے مشتق مانتے ہیں۔

فرقان۔ قرآن میں سات مقامات پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے جن میں سے دو جگہ پر اس سے مراد قرآن ہے اور اس کی وجہ تسمیہ دو طرح سے بیان کی گئی ہے، ایک یہ کہ قرآن فارق حق و باطل ہے اور اس کے دوسرے معنی نجات دینا ہیں۔

کتاب ـ یہ لفظ دو سو چھتر جگہوں پر قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ جن میں سے اکثر مقامات پر اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسلام کے فقہی مصادر میں بھی قرآن کو کتاب کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ذکر ـ یہ لفظ بھی قرآن کی متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور بعض جگہوں پر اس سے مراد قرآن کریم ہے۔[1]

تنزیل ـ چونکہ لفظ تنزیل غالباً قرآن کے تدریجی نزول کی طرف اشارہ کرتا ہے اور قرآن میں کئی مرتبہ استعمال ہوا ہے۔[2] لہٰذا اس جہت سے کلام الٰہی کو تنزیل کا نام بھی دیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا مشہور اور معروف ترین اسماء اور عنوانات قرآن کے علاوہ دانشوروں کے ایک گروہ کی طرف سے دوسرے متعدد نام بھی ذکر ہوئے ہیں۔ منجملہ شیخ طاہر جزائری نے کتاب "التبیان" میں قرآن کے ناموں کی تعداد نوّے سے زیادہ تک پہنچادی ہے اور سیوطی نے بھی کتاب "البرہان" سے نقل کرتے ہوئے قرآن کے پچپن نام ذکر کئے ہیں۔

آیہ :-

لفظ آیہ لغت میں مختلف معانی کا حامل ہے جن میں سے چند یہ ہیں: علامت، نشانی، جماعت، کوئی تعجب خیز اور حیرت انگیز واقعہ۔ لیکن اصطلاح میں آیت، حروف، کلمات یا جملوں کے اس مجموعہ کو

---

[1] انا نحن نزّلنا الذکر وانّا لہ لحافظون (سورہ حجر/۹)

[2] وانہ لتنزیل رب العالمین - (سورۂ شعراء/۱۹۲)

کہتے ہیں، جن کی حد نقل اور روایات کے ذریعہ مشخص ہوئی ہو ۔ قرآن کے سوروں میں آیتوں کی ترتیب پیغمبر اسلامؐ کے ارشاد اور ان کی رہنمائی کے ذریعہ عمل میں آئی ہے اور مذکورہ ترتیب کے وجود میں لانے کے سلسلہ میں صحابہ کی رائے اور ان کے سلیقہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔[۱]

قرآن کی آیتوں کی تعداد اور اس کے مختلف دبستان :-

قرآن کی آیتوں کی تعداد کے بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں اور یہ نظریات قرآن کی آیتوں کی شمارش کے سلسلہ میں مختلف دبستانوں کے وجود میں آنے کا سبب بنے ہیں، جو یوں ذکر کئے جاتے ہیں : عدد اہل کوفہ یا عدد کوفی ، عدد مدنی ، عدد مکی ، عدد بصری ، اور عدد شامی ۔ بقول طبرسی :-

" آیات قرآن کی صحیح ترین تعداد جو اسناد کے اعتبار سے دوسری روایتوں سے زیادہ معتبر ہے وہ عدد کوفی ہے، اس لئے کہ یہ عدد امیر المومنینؑ سے ماخوذ ہے اور وہ روایت جو رسول خداؐ سے منقول ہے اس کی تائید کرتی ہے۔ رسول خداؐ نے فرمایا کہ قرآن میں ۶۲۳۶ آیتیں ہیں۔[۲] "

اور بقول ابوعمرو عثمان دانی " قرآن کی آیتوں کی تعداد ۶۲۰۰ آیتوں سے کم نہیں ہے ۔ تمام محققین اور محدثین اس میں اتفاق نظر رکھتے ہیں اور ان کا اختلاف اس سے زیادہ کی تعداد میں ہے کہ کچھ لوگوں نے اس تعداد پر کسی عدد کا اضافہ نہیں کیا اور کچھ محققین و محدثین نے اس پر اضافہ کیا ہے جو علی الترتیب حسب ذیل ہیں :"[۳]

عدد ۶۲۰۴ ، ۶۲۱۴ ، ۶۲۱۶ ، ۶۲۱۹ ، ۶۲۲۵ ، ۶۲۳۶

۱۔ صحیح بخاری " کتاب تفسیر القرآن " باب ۱۸ ، اور کتاب " الاحکام " باب ۹۷ ، اور الاتقان ج ۱ ص ۱۰۴ ـ ۱۰۷

۲۔ مجمع البیان ج ۱ ص ۴۰۳ ـ

۳۔ الاتقان ج ۱ ص ۱۶ ـ

سورہ :-

سورہ کے لغوی معنی - یہ کلمہ اپنے مادۂ اشتقاق کے اختلاف کی بنا پر مختلف معانی رکھتا ہے۔

(۱) کچھ لوگ اسے "سؤرہ" کا مخفف اور مہموز جانتے ہیں جس کے معنی نیم خوردہ اور ظرف میں پینے سے بچی ہوئی کوئی شئے ہے اور چونکہ سورۂ قرآن خود قرآن کا ایک حصہ اور جزء ہے اس لئے اسے سورہ کا نام دیتے ہیں۔

(۲) سورہ "سُور" سے ہے جس کا مطلب شہر کا حصار ہے۔ چونکہ قرآن کا سورہ آیتوں کے اطراف میں وجود پاتا ہے اور انھیں اکٹھا کر کے ایک صورت میں لاتا ہے لہٰذا اسے سورہ کہتے ہیں۔

(۳) سورہ "سوار" سے ہے۔ جو "دستوارہ یعنی دستبند (کڑا کنگن)" کا معرب ہے اور چونکہ قرآن کا سورہ ایک دستبند کی مانند آیتوں کو اپنے حصار میں لئے رہتا ہے، اسی لئے سورہ کہا جاتا ہے۔

(۴) سورہ کا ایک مطلب بلند مقام و منزلت بھی ہے۔

(۵) سورہ، "تَسَوُّر" سے ہے جس کے معنی تصاعد یعنی بلندی پانا اور ترکیب ہے۔

سورہ کے اصطلاحی معنی :- سورہ قرآن کی آیتوں کا ایک حصہ ہے جس میں ایک آغاز و انجام پایا جاتا ہے۔ کچھ دیگر افراد نے بھی سورہ کی تعریف میں کہا ہے کہ سورۂ قرآن کی آیتوں کا ایک ایسا حصہ ہے جو دو "بسم اللہ" کے درمیان قرار پائے، جبکہ اس بات کے پیش نظر قرآن میں استثنائی جگہیں بھی ہیں جہاں دو بسم اللہ نہیں ہیں منجملہ ان میں سے سورہ انفال اور سورۂ برائت (توبہ) کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں ہے۔ نیز موجودہ ترتیب میں سورۂ "الناس" بھی دو بسم اللہ کے درمیان نہیں ہے - مزید یہ کہ سورۂ نمل کی تیسویں آیہ میں "بسم اللہ" آیا ہے اور یہ دو سوروں کے درمیان کے فاصلہ کی نشاندہی نہیں کرتا -

ایک سورہ میں آیتوں کی سب سے کم تعداد تین آیت (سورۂ کوثر) اور سب سے زیادہ آیتوں کی تعداد ۲۸۶ آیتیں (سورۂ بقرہ) ہے۔ ابن حصار نے اپنے اشعار میں جو انھوں نے مکی اور مدنی سوروں

---

۱ الاتقان ج ۱ ص ۹۰

متعلق لکھے ہیں۔ اس میں انھوں نے بیس سوروں کو علماء کے اتفاق سے مدنی مانا ہے جبکہ بارہ سوروں کے سلسلہ میں اختلاف نظر کا اظہار کرتے ہوئے باقی سوروں کو مکی ذکر کیا ہے۔

قرآن کے سوروں کی تعداد :۔

قرآن ایک سو چودہ اور ایک دوسرے قول کی بنا پر ایک سو تیرہ سورے اپنے دامن میں رکھتا ہے۔

قرآنی سوروں کے مختلف حصوں کے نام :۔

رسول خداؐ نے فرمایا کہ خداوند عالم نے مجھے توراۃ کے بدلے میں "سبع طوال" زبور کی جگہ "مئین" اور انجیل کے عوض "مثانی" عطا فرمائے ہیں اور میں نے "مفصل" کے ذریعے امتیاز اور برتری پائی ہے۔[1]

سبع طوال :۔

قرآن کے سات طولانی سوروں کا نام ہے یعنی بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف اور سورۂ انفال مع سورۂ توبہ۔[2]

مئین (مائین) ان سوروں کا نام ہے جو سبع طوال کے بعد قرآن میں آئے ہیں اور ان میں کا ہر ایک سورہ سو یا اس سے کچھ کم یا زائد آیتوں پر مشتمل ہے۔ اس کے سات سوروں کے نام یہ ہیں: بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء، حج اور مومنون۔[3]

۱۔ مجمع البیان ج ۱ ص ۱۴، مقدمتان ص ۲۳۵، روض الجنان ابوالفتوح رازی ج ۱ ص ۱۱ الاتقان ج ۱ ص ۸۹، سفینۃ البحار ج ۲ ص ۴۲۲۔

۲۔ مجمع البیان ج ۱ ص ۱۴، الاتقان ج ۱ ص ۱۰۹، سفینۃ البحار ج ۲ ص ۴۲۲

۳۔ الاتقان ج ۱ ص ۱۰۹

مثانی : وہ سورے جو مئین کے بعد ذکر ہوئے ہیں۔[1]
مفصل : اس سے مراد وہ سورے ہیں جو "حٰم" والے ہیں اور قرآن کے چھوٹے سورے بھی اس میں شامل ہیں۔

مکی اور مدنی سوروں سے متعلق چند نکتے :۔

بقول سیوطی قرآن کی آیات اور سوروں کے مکی اور مدنی کی شناخت کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ انسان زمانہ کے لحاظ سے آیت یا آیتوں کے نزول اور ان کے تقدم و تأخر سے آگاہ ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں ناسخ یا منسوخ آیتوں کو پہچان لے گا، اس بنا پر حسب ذیل خصوصیتوں کو مکی اور مدنی سوروں سے متعلق ذکر کیا جا سکتا ہے۔

مکی آیتوں اور سوروں کی کلی اور قطعی خصوصیات ـــ مکی سوروں کو پہچاننے کی چھ قابل ذکر خصوصیتیں حسب ذیل ہیں :

۱۔ ہر وہ سورہ جس میں سجدہ ہو۔
۲۔ ہر وہ سورہ جس میں لفظ "کلّا" استعمال ہوا ہو۔
۳۔ ہر وہ سورہ جس میں "یا ایھا الناس" آیا ہو اور "یا ایھا الذین آمنوا" نہ آیا ہو۔
۴۔ سوائے سورۂ بقرہ کے ہر وہ سورہ جس میں گذشتہ انبیاء اور ملتوں کے قصے بیان ہوئے ہوں۔
۵۔ سوائے سورہ بقرہ کے ہر وہ سورہ جس میں آدم و ابلیس کی داستان پائی جاتی ہو۔
۶۔ ہر وہ سورہ جو حروف مقطعات مثلاً "الٓمٓ" و "الٓرٰ" سے شروع ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا خصوصیات کے علاوہ مکی سوروں کی پہچان کے چند دیگر امتیازات بھی ہیں جو کلیت نہیں رکھتے، حسب ذیل ہیں :

۱۔ آیتوں اور سوروں کا اختصار، انکا ایجاز، بیان کی گرمی، لہجہ کی شدت اور آیتوں میں صوتی تجنیس۔

---

[1] الاتقان ج ۱ ص ۱۰۹

۲۔ خدا اور روزِ قیامت پر ایمان کی بنیادوں اور اصول کی طرف دعوت، جہنم کی تصویر کشی اور جنت کی خوبیوں کا بیان۔

۳۔ نیکیوں اور پاکیزہ اخلاق کی طرف دعوت اور نیکیوں پر قائم رہنے کی تلقین۔

۴۔ مشرکین سے جدال اور ان کے اقدار کی تحقیر۔

۵۔ قسم کی کثرت۔

نزول کی ترتیب کے اعتبار سے مکی سورے حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ اقرأ باسم ربک (علق) ۲۔ ن والقلم ۳۔ مزمّل ۴۔ مدثّر ۵۔ تبّت
۶۔ تکویر ۷۔ سبح اسم ربک الاعلیٰ ۸۔ واللیل اذا یغشیٰ ۹ والفجر
۱۰۔ والضحیٰ ۱۱۔ انشراح ۱۲۔ والعصر ۱۳۔ والعادیات
۱۴۔ کوثر ۱۵۔ تکاثر ۱۶۔ ارأیت (ماعون) ۱۷۔ کافرون
۱۸۔ الم ترکیف (فیل) ۱۹۔ فلق ۲۰۔ ناس ۲۱۔ اخلاص ۲۲۔ والنجم
۲۳۔ عبس (اعمیٰ) ۲۴۔ قدر ۲۵۔ والشمس ۲۶۔ بروج
۲۷۔ والتین ۲۸۔ لایلاف قریش ۲۹۔ قارعۃ ۳۰۔ قیمۃ ۳۱۔ ھمزۃ
۳۲۔ والمرسلات ۳۳۔ ق ۳۴۔ لا اقسم بھذا البلد ۳۵۔ طارق
۳۶۔ قسم ۳۷۔ ص ۳۸۔ اعراف ۳۹۔ قل اوحیٰ (جن) ۴۰۔ یٰس
۴۱۔ فرقان ۴۲۔ ملائکۃ (فاطر) ۴۳۔ کہٰیٰعص (مریم) ۴۴۔ طٰہٰ
۴۵۔ واقعہ ۴۶۔ شعراء ۴۷۔ نمل ۴۸ قصص ۴۹۔ بنی اسرائیل
۵۰۔ یونس ۵۱۔ ھود ۵۲۔ یوسف ۵۳۔ حجر ۵۴۔ انعام۔
۵۵۔ صافات ۵۶۔ لقمان ۵۷۔ سبأ ۵۸۔ زمر ۵۹۔ حٰم المومن
(غافر) ۶۰۔ حٰم السجدہ (فصلت) ۶۱۔ حٰم عسق ۶۲۔ زخرف
۶۳۔ دخان ۶۴۔ جاثیۃ ۶۵۔ احقاف ۶۶۔ ذاریات
۶۷۔ غاشیۃ ۶۸۔ کہف ۶۹۔ نحل ۷۰۔ نوح ۷۱ ابراہیم ۷۲۔ انبیاء
۷۳۔ مومنون ۷۴۔ الم تنزیل ۷۵۔ طور ۷۶۔ ملک ۷۷۔ الحاقۃ ۷۸۔ ذوالمعارج
۷۹۔ عمّ یتساءلون ۸۰۔ نازعات ۸۱۔ انفطار ۸۲۔ انشقاق ۸۳۔ روم

۸۴۔عنکبوت ۸۵۔ مطففین

نزول کی ترتیب کے اعتبار سے مدنی سورے:۔

۸۶۔بقرہ ۸۷۔ انفال ۸۸۔آل عمران ۸۹۔ احزاب ۹۰۔ ممتحنہ
۹۱۔ نساء ۹۲۔ اذا زلزلت ۹۳۔حدید ۹۴۔ محمد ۹۵۔ رعد
۹۶۔الرحمٰن ۹۷۔ھل اتی ۹۸۔ طلاق ۹۹۔ لم یکن (بینہ)
۱۰۰۔ حشر ۱۰۱۔ اذا جاء نصر اللّٰہ ۱۰۲۔ نور ۱۰۳۔حج ۱۰۴۔منافقون
۱۰۵۔ مجادلہ ۱۰۶۔ حجرات ۱۰۷۔ تحریم ۱۰۸۔ جمعہ ۱۰۹۔تغابن
۱۱۰۔الصف ۱۱۱۔ الفتح۔ ۱۱۲۔ مائدۃ ۱۱۳۔ توبہ۔[1]

قرآن کے کلمات اور حروف کی تعداد:۔

"کلمہ" کے معنی میں اختلاف کی وجہ سے علوم قرآن کے دانشوروں نے کلمات قرآن کی مختلف تعداد ذکر کی ہے:۔

۷۶۴۴۰ ، ۷۷۲۷۷ ، ۷۷۴۳۷ ، ۷۷۴۳۹ ، ۷۷۹۳۴[2]

قرآن کے حروف کی تعداد کے بارے میں بھی اعداد قرآن سے مربوط مدارک اور حوالہ جات میں مختلف تعداد نظر آتی ہے:۔

۳۰۰۶۹۰ ، ۳۲۰۲۱۰ ، ۳۲۱۲۵۰ ، ۳۲۲۳۰۱۵ ، ۳۲۲۳۷۳ ، ۳۲۲۶۷۰ ، ۳۲۵۰۷۲ ، ۱۰۲۷۰۰۰[3]

قرآن کے مطالب و موضوعات:۔

قرآن کے مطالب و موضوعات کو کلی طور سے چار دستوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] مجمع البیان ج۱۰ ص ۴۰۵ سورۂ حمد کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔

[2] الاتقان ج۱ ص ۱۲۰ ، مقدمتان ص۲۳۵ ـ ۲۴۸ ، الکشکول ج۲ ص ۴۵۶۔

[3] الاتقان ج۱ ص ۱۱۵ و ۲۲۱

(الف) **عقائد:**

اثبات صانع اور وحدانیت خدا سے متعلق، اس کے صفات جمالیہ و کمالیہ نبوت عامّہ اور رسول گرامی اسلامؐ کی نبوت خاصہ، معاد اور قیامت کے حالات، جنت و جہنم، گنہگاروں کی سزا اور خدا کی مغفرت عامہ وغیرہ کا ذکر۔ نیز امامت و رہبری کی ضرورت اور اسلامی رہبروں کے صفات کا تذکرہ۔

(ب) **احکام و قوانین:** جس میں حسب ذیل مطالب شامل ہیں:۔

عبادات ۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، جہاد، امر بہ معروف، نہی از منکر، زکوٰۃ و خمس کے احکام۔

معاملات ۔ مثلاً بیع، رہن، اجارہ، نکاح، طلاق، صلح، دین، ارث و وصیت سے متعلق قوانین۔

کیفری امور ۔ مثلاً حدود، دیات اور قصاص کے احکام۔

سیاسی و اجتماعی امور ۔ مثلاً قضاوت، حکومت، اسلامی سماج پر حاکم قواعد و ضوابط اور دوسری امتوں اور ملتوں سے اس کے روابط کے اصول۔

(ج) **واقعات اور قصّے:** گذشتہ انبیاء اور امتوں کی عبرت انگیز داستانیں، اور اپنے زمانہ کے طاغوتوں اور ظالموں سے ان کے مبارزات مثلاً موسیٰ و فرعون، عیسیٰ و حواریّن ابراہیم و نمرود، یحییٰ اور ان کی سرگذشت۔

(د) **اخلاقی مطالب** ۔ انسان کی بلند قدر و منزلت اور اس کے معیار کا بیان۔

فقہ و اصول میں جس چیز سے بحث کی جاتی ہے اس کا تعلق بند "ب" یعنی شرایع و قوانین سے ہے کہ اصطلاحاً اسے "آیات احکام" کہتے ہیں اور تقریباً ایسی ۵۰۰ آیتیں ہیں جو قرآن کے ۱/۶ حصہ کو تشکیل دیتی ہیں اس قسم کی آیات کی شرح و تفسیر میں بہت سی کتابیں تالیف کی گئی ہیں جنمیں سے مشہور ترین مقدس اردبیلیؒ کی "زبدۃ البیان" اور شیخ احمد جزائری کی "قلائد الدرر" اور فاضل مقداد کی "کنز العرفان" ہیں۔

قرآن کریم کا جامۂ تحریر میں آنا:

نصوص قرآنی کی حفاظت کے پیش نظر پیغمبر اسلامؐ نے حکم فرمایا کہ قرآن کو تحریر کیا جائے۔ جو لوگ قرآن کے تحریر کرنے والے تھے، کاتبان وحی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ایسے لوگوں کی تعداد تینتالیس یا پینتالیس تک پہنچتی ہے جو زمانہ پیغمبرؐ میں وحی قرآن کو تحریر کرتے تھے۔ ان میں سے مشہور ترین خلفاء راشدین، زید بن ثابت، ابی بن کعب، زبیر بن عوام، معاویہ بن ابی سفیان، یزید بن ابی سفیان اور سعید بن عاص بن امیہ . . . . ہیں[1]

پہلا کاتب وحی:

محققین کا نظریہ یہ ہے کہ مکہ میں پہلے کاتب وحی عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح اور مدینہ میں ابی بن کعب تھے[2]۔ لیکن روایات کی بنیاد پر وہ شخص جو سب سے زیادہ وحی قرآن کو لکھنے میں کامیاب ہوا پہلے مرحلہ میں علی بن ابی طالبؑ اور ان کے بعد زید بن ثابت ہیں۔[3]

نوعیتِ خط جس میں قرآن لکھا گیا:۔

پیغمبر اسلامؐ کے زمانہ سے متعلق ایسے قطعی آثار نہیں ملتے جن سے اس زمانہ کے طرز تحریر پر کسی قاطع نظریہ کا اظہار کیا جا سکے۔ لیکن اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے کہ اہل عرب نسخ اور کوفی دو قسم کے خط سے آشنائی رکھتے تھے، لہٰذا زمانۂ پیغمبرؐ میں بھی معمولاً نامہ نگاری اور عادی یادداشتوں اور کبھی تحریر قرآن کے لیے خط نسخ سے استفادہ کیا جاتا تھا۔[4]

---

[1] تاریخ القرآن زنجانی ص ۴۲۔

[2] موقف القرآن من المشرکین بمکہ ص ۵۴، عمدۃ القاری سے نقل کرتے ہوئے ۲۰/۱۹

[3] تاریخ القرآن ڈاکٹر عبد الصبور ص ۱۶۴

[4] تاریخ القرآن زنجانی ص ۴۲۔

جمع قرآن اور اس کی تدوین :-

قرآن کی حفاظت و نگہداری اور اسے ہر طرح کے تغییر، تحریف اور اتلاف سے بچانے کے لئے سب سے پہلا قدم جو عہد رسالت میں اٹھایا گیا وہ قرآن کی آیات کو حفظ کرنا اور اسے یادداشت میں محفوظ کرنا تھا اور خدا نے خود بھی اس کی ضمانت لی ہے[1] اور دوسرا قدم اسے احاطۂ تحریر میں لانا تھا۔

حفاظ قرآن :

حافظان و قاریان قرآن میں سرفہرست خود رسول خدا تھے۔ آنحضرتؐ کے اصحاب میں سے قابل توجہ افراد نے بھی قرآن کو حفظ کیا جن کی تعداد ستر سے زائد ہے[2]

قاریان قرآن :

اصحاب آنحضرتؐ میں سے کچھ افراد قرائت قرآن اور اسی طرح حفظ قرآن میں ایک خاص شہرت کے حامل ہیں۔ یہ لوگ ان مختلف قرائتوں سے آشنائی رکھتے تھے جسے پیغمبرؐ کی تائید و تصدیق حاصل تھی زمانۂ پیغمبرؐ کے قراء جنہوں نے براہ راست مختلف قرائتوں کو آنحضرتؐ سے حاصل کیا تھا، کوشش کرتے تھے کہ اپنی معلومات و اطلاعات کو دوسروں کے سامنے پیش کریں۔ تابعین کے ایک گروہ نے قرائت کو اصحاب و انصار پیغمبرؐ سے اخذ کیا۔

صحابہ و تابعین کے دور میں سب سے پہلا شخص جس نے قرائت سے متعلق کوئی کتاب تدوین کی ابان بن تغلب، شاگرد امام زین العابدینؑ[3] (ع) اور اس کے بعد حمزہ بن حبیب زیات ہیں۔

قراء سبعہ : (سات قاری)

حسب ذیل قاری قراء سبعہ کے نام سے مشہور ہوئے ہیں :-

---

[1] انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون۔ سورۂ حجر آیہ/۹، ان علینا جمعہ و قرانہ، سورہ قیامت/۱۷

[2] الاتقان ج۱ ص ۱۲۲

[3] الفہرست ص ۳۰۸

(۱) ابوعبداللہ نافع ابن ابی نعیم مدنی (۲) عبداللہ بن کثیر مکی (۳) ابوبکر عاصم بن ابی النجود کوفی
(۴) ابوعمارہ حمزہ بن حبیب زیات کوفی (۵) ابوالحسن علی بن حمزہ کسائی (۶) ابوعمرو بن علاء[1]
(۷) عبداللہ بن عامر دمشقی[1]

قراء عشر:

سات قاریوں میں تین اور قاریوں کا اضافہ ہوا جو قراء عشر کے نام سے معروف ہوئے ہیں۔
(۸) خلف بن ہشام بن طالب (۹) یعقوب بن اسحاق (۱۰) ابوجعفر یزید بن قعقاع۔
اور ان دس قاریوں میں علوم قرآنی کے چار دانشوروں کا مزید اضافہ کیا گیا جن کی مجموعاً قرائتیں "قراءات اربعہ عشر" یعنی چودہ قرائتوں کے نام سے موسوم ہوئیں۔
(۱۱) حسن بصری (۱۲) ابن محیصن (۱۳) یحییٰ بن مبارک یزیدی (۱۴) محمد بن احمد بن ابراہیم بن یوسف بن عباس بن میمون ابوالفرج شنبوذی۔

معتبر قرائتوں کے بارے میں علماء کے فیصلے:۔

قاضی جلال الدین بلقینی قرائتوں کو متواتر، آماد اور شاذ میں اس ترتیب سے تقسیم کرتے ہیں کہ انہوں نے قراء سبعہ کی قرائتوں کو متواتر اور ان تین قاریوں کی قرائتوں کو جو قراءات سبعہ کی متمم ہیں (قراء عشر) آماد اور قراءات عشر کی متمم قرائتوں کو شاذ مانا ہے۔ لیکن سیوطی نے "معرفة المتواتر والمشهور والاحاد والشاذ والموضوع والمدرج" کے عنوان کے تحت قاضی جلال الدین کے قراءات سبعہ کے متواتر والے نظریہ کو رد کیا ہے۔ قراءات سبعہ کے تواتر کی رد کے سلسلہ میں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(۱) قراءات سبعہ بطریق آماد ہم تک پہنچی ہیں۔
(۲) قراءات سبعہ کے بعض راویوں اور ناقلین کا وثوق پایہ ثبوت تک نہیں پہنچا ہے۔

---

[1] قراء نمبر ۱، ۲، ۴، ۵، ۶ ایرانی الاصل تھے۔

۳، قراء سبعہ میں ہر قاری اپنی قرائت کو شخصی قرائت کے عنوان سے اور اپنے آپ سے منسوب کر کے دوسروں کے لئے نقل کرتا ہے اور یہی استدلال اس بات پر دلیل قاطع ہے کہ مذکورہ قرائتیں ان قاریوں کے اجتہاد اور ان کی شخصی آراء پر منحصر ہیں۔ اس لئے کہ اگر یہ قرائتیں متواتر اخبار کے ذریعہ خود پیغمبر سے ہم تک پہنچیں تو ان قرائتوں کی صحت کو ثابت کرنے کے لیے وہ استدلال کے محتاج نہ ہوتے۔

۴، قراء سبعہ کی قرائتوں کے کچھ طریقوں سے بعض محققین علوم قرآنی کا انکار۔

اسی طرح دوسرے محققوں اور دانشوروں نے بھی اپنے استدلال کے ضمن میں قراء سبعہ کی قرائتوں کے غیر متواتر ہونے کو ثابت کیا ہے اور اس کے مقابلے میں قرآت سبعہ کے تواتر کے عقیدہ کے طرفدار بھی اپنے نظریہ کے ثبوت کے لئے چند طریقوں سے استدلال کرتے ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱، قرائت سبعہ کے متواتر ہونے پر متقدمین و متأخرین کے اجماع کا دعویٰ۔

۲، قرآن کے سلسلہ میں صحابہ اور تابعین کی کوششیں قرائت کے تواتر کو ثابت کرتی ہیں۔

۳، اگر قرآت سبعہ متواتر نہ ہوںگی تو قرآن بھی متواتر نہ رہے گا۔

البتہ مندرجہ بالا دلائل قابل اعتماد نہیں ہیں اور اب مندرجہ بالا نظریات کو مدنظر رکھتے ہوئے حجیت قرآت کی بحث ذکر کی جاتی ہے۔

قرائتوں کی حجیت :۔

دانشوروں میں سے وہ لوگ جو قرآت سبعہ کے تواتر کا نظریہ رکھتے ہیں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قرآت سبعہ حجیت رکھتی ہیں اور قابل اعتبار ہیں لہٰذا انہوں نے تجویز کیا ہے کہ ان ہی قرائتوں کی بنیاد پر حکم شرعی کے سلسلہ میں استدلال و استناد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان دلائل کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو قرآت سبعہ کے تواتر کی رد میں آئی ہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی قرائتیں حجیت کے اعتبار سے بے قیمت ہیں لہٰذا ان کی بنیاد پر حکم شرعی صادر نہیں ہو سکتا۔

قرائتوں کی قسمیں:-

سیوطی نے قرائتوں کو قابل عمل ہونے کے اعتبار سے چھ قسموں میں تقسیم کیا ہے[1]۔

(۱) قرائت متواتر — ایسی قرائت جسے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے اس طرح روایت کیا ہو کہ ان جماعتوں کا کذب اور دروغ سازی پر اتفاق ناممکن اور غیر قابل قبول ہو۔

(۲) قرائت مشہور — ایسی قرائت جس کی سند صحیح ہو یعنی عادل و با ہوش شخص اپنے جیسے اشخاص سے اور اسی طرح پیغمبرؐ تک لوگوں نے اسے نقل کیا ہو[2]۔

(۳) قرائت غیر مجاز — تیسری قسم قرائت کی وہ ہے جس کی سند تو صحیح ہو لیکن عثمانی مصحفوں کے رسم الخط سے مخالف اور عربی زبان کے قواعد اور دستورات سے ہم آہنگ نہ ہو۔ اس طرح کی قرائت کو تلاوت قرآن، نماز یا کسی بھی موقع پر استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔

(۴) قرائت شاذ — وہ قرائت جس کی سند صحیح نہ ہو۔

(۵) قرائت موضوع و مجعول — وہ قرائت ہے جو فقط اس کے قاری سے منسوب ہے اور کوئی روایتی بنیاد نہیں رکھتی۔

(۶) قرائت شبیہ بہ حدیث مدرج — وہ قرائت جسے کسی کلمہ یا عبارت کی تفسیر و تشریح کے لیے معمول اور متداول قرائتوں پر اضافہ کیا گیا ہو۔

جمع و تدوین قرآن (پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد):

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد سب سے پہلے کس شخص نے قرآن کی جمع و تدوین اور اس کے سوروں

---

[1] الاتقان ج ۱ ص ۱۳۲

[2] متواتر اور مشہور قرائتوں سے واقف ہونے کے لیے دانی کی "التیسیر" اور ابن الجوزی کی "النشر" وکتاب "طیبۃ النشر فی القرات العشر" اہم ترین کتابیں ہیں۔

کی ترتیب کا اقدام کیا، اس بارے میں محققین اہل سنت میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ لیکن علمار شیعہ اور اہل سنت نے جس کا اظہار کیا ہے وہ یہ کہ حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرمؐ کی وصیت کے مطابق قرآن کی تدوین کا آغاز کیا۔ علماء اہل سنت برحسب اختلاف، قرآن کے پہلے جامع اور تدوین کنندہ کے نام سے چار افراد کا ذکر کرتے ہیں: علیؑ، ابوبکر، عمر، سالم (غلام حذیفہ)

مصحف امیرالمومنین علیؑ کی ترتیب کی کیفیت:

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ زمانہ کے لحاظ سے موجودہ قرآن کی ترتیب تقریباً اس کے نزول کے خلاف ہے۔ علامہ مجلسی کئی موارد کو "تالیف القرآن وانہ علی غیر ما انزل اللہ" کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں، منجملہ ان میں سے عدۂ وفات کے بارے میں کہ جاہلیت کے زمانہ میں عدۂ وفات کی مدت ایک سال تھی اور خداوند متعال نے پہلے اس مدت کو سورہ بقرہ کی ۲۴۰ ویں آیت میں درست قرار دیا ہے پھر اسی مدت کو سورہ بقرہ کی ہی ۲۳۴ ویں آیت میں نسخ کرکے چار ماہ دس روز تک گھٹایا ہے اور اسی طرح کے دوسرے موارد بھی .....

بہت سے شواہد و مدارک کے مطابق وہ قرآن جسے وفات پیغمبرؐ کے بعد حضرت علیؑ نے مرتب کیا تھا نزول کی ترتیب کے مطابق تھا۔[1]

عصر خلافت ابوبکر میں قرآن کی ترتیب و تحریر:-

جس وقت رسولؐ خدا نے رحلت فرمائی اور حضرت علیؑ قرآن کی جمع آوری میں مشغول تھے۔ ابوبکر بن ابی قحافہ نے خلیفہ پیغمبر اسلامؐ کے عنوان سے زمام امور اپنے ہاتھ میں لی اور اسی زمانہ میں جنگ یمامہ کا واقعہ بھی پیش آیا جس میں کئی حفاظ و قاری قرآن شہید ہو گئے۔ یہی امر سبب بنا کہ اس سے پہلے کہ تمام حفاظ و قراء ختم ہوں فوراً قرآن کی جمع آوری کا اقدام کیا جائے اور یہ کام زید بن ثابت کے حوالے کیا گیا۔ اگرچہ ابوبکر، زید بن ثابت اور اکثر صحابۂ رسول خدا بھی قرآن کی جمع آوری

---

[1] الاتقان ج ۱ ص ۱۰۰، تاریخ قرآن زنجانی ص ۵۸

کی جرأت و ہمت نہیں رکھتے تھے اور اسے ایک قسم کی بدعت و نوآوری سمجھتے تھے۔ لیکن آخر کار زید بن ثابت نے ابوبکر کے حکم اور عمر کی حوصلہ افزائی سے قرآن کی نگارش اور اس کی جمع آوری کے کام کا آغاز کیا اور مختلف منابع و مصادر سے استفادہ کیا جو سب کے سب ایک دوسرے کے مؤید ہیں۔ یہ مصادر حسب ذیل تھے:۔

(الف) زید بن ثابت خود کاتب وحی اور حافظ قرآن تھے، انہوں نے پہلے قرآن کی جمع آوری اور اس کی نگارش میں خود اپنے جمع کردہ مواد سے استفادہ کیا۔

(ب) لوگوں کے درمیان اعلان کیا گیا کہ قرآن کے محفوظات اور نوشتوں کو لے آئیں اور زید بن ثابت ان نوشتوں کو ایک یا دو گواہوں کی تائید سے صحیفوں میں لکھ لیتے تھے۔

(ج) بعض محققین کی تحریر کی بنیاد پر زید بن ثابت کی قرآن کی جمع آوری میں ایک اہم مصدر قرآن کا وہ نسخہ تھا جو پیغمبر کے گھر میں موجود تھا۔

عصر عثمان میں قرآن کی تدوین اور اس کی جمع آوری:

ابوبکر و عمر کے زمانہ میں قرآن کی قرائتوں کا اختلاف جو عثمان کے عہد میں بہت زیادہ شدید ہو گیا تھا، یہاں تک پہنچا کہ قرائتوں کے استاد اپنی اپنی طرز کی خاطر جن کے وہ پابند تھے آپس میں ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے۔ اور یہ چیز سبب ہوئی کہ عثمان نے زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن عاص اور عبدالرحمن بن حارث کو حکم دیا کہ وہ صحیفے جو ابوبکر کے حکم سے اکٹھا ہوئے تھے اور حفصہ بنت عمر کے پاس موجود تھے ان کو ایک مصحف میں لکھیں۔ اس کے بعد انہوں نے ہر گوشہ و اطراف میں ایک ایک مصحف بھیجے اور بقیہ صحیفوں کو جو قرآن کی حیثیت سے لکھے گئے تھے جلا دینے کا حکم دیا۔

ظواہر قرآن کی حجّیت:

قرآن سے استفادہ کے سلسلہ میں تاریخ اسلام میں عجیب افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ ایک گروہ مثلاً فرقۂ اسماعیلیہ نہ صرف یہ کہ قرآن کی ظاہری آیتوں کو سب کے لئے قابل درک و فہم

اور مفید سمجھتا تھا بلکہ "بطون قرآن" کے عنوان سے جو کچھ ان کے اغراض و مقاصد کے مطابق تھا قرآن کی طرف منسوب کرتے تھے۔ فرقہ متصوفہ کے افراد بھی اسی طرح کا اعتقاد رکھتے تھے۔

اس کے مقابل فرقہ امامیہ میں اخباریوں کا ایک گروہ ہے جس کے سربراہ مرحوم ملا امین استرآبادی تھے اور انہوں نے اپنے عقائد کو "فوائد المدنیہ" نامی کتاب میں ظاہر کیا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ظواہر قرآن بھی سب کے لئے مفید نہیں ہیں اور صرف نصوص قرآنی ہی سند کے قابل ہیں۔ نصوص سے مراد صریحی عبارت اور ظاہر سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ عبارت میں دوسرے معنی کا بھی احتمال پایا جاتا ہے لیکن اس کے لئے کوئی قرینہ کلام میں موجود ہونا چاہئے چونکہ فی الحال دوسرے معنی کے لئے کوئی قرینہ اس کلام میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اسی ظاہری معنی سے تمسک کرنا چاہئے۔

اخباریین کا کہنا تھا کہ قرآن کے معانی و مفاہیم صرف ائمہ اطہارؑ ہی بیان کر سکتے ہیں، ان کی دلیل وہ روایتیں تھیں جو تفسیر بالرای کو منع کرتی ہیں اور عادل افراد کو اس کام سے روکتی ہیں لیکن اجتہاد کے طرفدار ہیں، اس کے معتقد ہیں کہ ظواہر قرآن استناد اور دلیل کے قابل ہیں اور احکام کے لئے حجت ہیں۔ ارباب اجتہاد، اخباریوں کے جواب میں کہتے ہیں کہ ظواہر قرآن سے استفادہ تفسیر نہیں ہے، بلکہ بقول شیخ انصاری تفسیر سے مراد کشف قناع یعنی پردہ اٹھانا ہے۔ جبکہ ظاہری آیات کے سلسلہ میں کوئی پردہ نہیں ہے جو اٹھایا جائے۔ پردہ اٹھانا بطون قرآن کے سلسلہ میں صحیح ہے جو ظواہر کے خلاف ہے اور خود ائمہ اطہارؑ نے متعدد موقعوں پر ہم کو قرآن سے استفادہ کا شوق دلایا ہے۔

مرحوم انصاری قدس سرہ کتاب "فرائد الاصول" میں ایسی روایتوں کے نمونے نقل کرتے ہیں جن میں ائمہ اطہارؑ نے اپنے اصحاب کو قرآن سے استنباط کی طرف آمادہ کیا ہے اور قابل توجہ یہ ہے کہ بعض جگہوں پر جو کچھ امامؑ نے قرآن سے استنباط فرمایا ہے اور دوسروں کو اس قسم کے استنباط کا حکم دیا ہے وہ اتنے آسان بھی نہیں ہیں بلکہ صرف گہری فکر اور بلند درجہ کا اجتہاد ہی اس طرح کا استنباط کر سکتا ہے۔ ذیل میں ان روایات کے نمونوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ راویان حدیث میں سے ایک شخص بنام عبدالاعلیٰ غلام آل سام حضرت صادقؑ سے سوال کرتا ہے کہ میں زمین پر گر پڑا، میری انگلی ایک پتھر سے ٹکرا گئی اور اس کا ناخن اکھڑ گیا لہٰذا میں نے پاؤں کی اس انگلی پر کپڑا باندھ دیا ہے۔ اب پیر کا مسح کیسے کروں؟ حضرتؑ جواب میں

فرماتے ہیں کہ "یعرف ھذا و اشباھہ من کتاب اللّٰہ" اس کا اور اس جیسے سوالوں کے جوابات کتاب خدا سے معلوم کئے جا سکتے ہیں اور کوئی ضرورت نہیں ہے کہ مجھ سے سوال کرو۔ راوی نے دریافت کیا کہ کتاب خدا میں میرے سوال کا جواب کہاں آیا ہے تو حضرت نے فرمایا وہاں جہاں خدا فرماتا ہے: ماجعل علیکم فی الدین من حرج[1] یعنی خدا نے دین میں تمہارے لئے کوئی مشکل امر نہیں قرار دیا۔ پھر بلا فاصلہ حضرت نے وہ استنباط جو اس آیہ سے ہونا چاہیئے فرمایا: "امسح علی المرارۃ" یعنی اسی کپڑے پر مسح کرو۔

شیخ انصاری قدس سرہ اشارہ فرماتے ہیں کہ آیۃ مذکورہ سے اس نتیجہ کا حاصل کرنا چند مقدمات پر منحصر ہے جو اجتہاد کی قوت قدسیہ کے بغیر ممکن نہیں ہے جیسے کہ ظاہر ہے اس آیت کی نص میں یہ معنی ہرگز نظر نہیں آتا اور وہ مقدمات یہ ہیں۔ آیت بتاتی ہے کہ خداوند عالم نے کسی مشکل اور دشوار امر کو تم سے نہیں چاہا ہے۔ یہاں فقیہ کو غور کرنا چاہیئے کہ اس سلسلہ میں وہ امر دشوار کیا ہے جسے خداوند عالم نے مکلف سے اٹھا لیا ہے؟ مختلف احتمالات سامنے آتے ہیں: نماز، وضو، مسح یا؟ . . . . لیکن تھوڑی سی دقت نظر کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسی مشکل نہیں ہے جسے خدا معاف کر دے۔ یہاں ہم نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ جو کچھ دشواری اور مشکل ہے "مسح علی البشرۃ" یعنی کھال پر مسح ہے اور چونکہ اس عمل کے دو جزو ہیں ایک اصل مسح اور دوسرے یہ کہ مسح پاؤں کی کھال پر انجام دیا جائے۔ فقط وہ جو مشکل اور دشوار عمل کی دوسری قسم ہے نہ کہ پورا عمل لہٰذا خداوند عالم نے اس فریضہ کو معاف کر کے اس کے بجائے کپڑے کے اوپر مسح کو قبول کیا ہے۔ شیخ یہاں فرماتے ہیں کہ "ملاحظہ کیجئے امام ہم سے چاہتے ہیں کہ اس پر صحیح مسئلہ کا استنباط ہم خود کریں۔" نتیجہ یہ ہے کہ اگر اس طرح کی افادیت ممنوع ہوتی تو امام اپنے اصحاب کو اس کا حکم نہ دیتے۔[2]

۲۔ ہم جانتے ہیں کہ شیعہ وضو کی ترتیب میں اہل سنت سے بعض جہتوں میں دیرینہ اختلاف

---

[1] سورۂ حج آخری آیت

[2] فرائد الاصول شیخ انصاری قدس سرہ، بحث حجیت ظواہر کتاب۔

رکھتے ہیں جس کا سلسلہ صدر اسلام اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے دور پر ختم ہوتا ہے۔ منجملہ ان میں سر کے مسح کا مسئلہ جس میں شیعہ سر کے کچھ حصے پر اکتفا کرتے ہیں اور اہل سنت پورے سر کا مسح کرتے ہیں اس سلسلہ میں زرارہ بن اعین جو امام صادقؑ کے عظیم المرتبت صحابیوں اور حدیث کے محترم راویوں میں سے ہیں، موضوع سے استدلالی طور پر آگاہ ہونے کے لئے حضرت کی خدمت میں شرفیاب ہو کر معلوم کرتے ہیں کہ:

"من این علمت ان المسح ببعض الرأس"؟

آپ کو کہاں سے معلوم ہوا کہ مسح سر کے کچھ حصہ کا انجام دینا چاہیئے؟

حضرتؑ نے جواب میں فرمایا 'لمکان الباء" یعنی حرف "باء" کی دلیل سے، یہ وضو کی آیۂ شریفہ کی طرف اشارہ ہے جس میں خدا فرماتا ہے "وامسحوا برؤسکم" حضرت صادقؑ اس طرح سے زرارہ کو اجتہاد کی روش اور قرآن مجید کی تعلیم دے رہے ہیں اور جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا موضوع بھی بہت دقیق اور ظریف ہے۔ حضرت فرمانا چاہتے ہیں کہ قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ اپنے سر کا مسح کرو بلکہ کہا ہے اپنے سر پر مسح کرو یا سر کے بعض حصہ کا مسح کرو اور یہ واضح ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اپنا ہاتھ دیوار پر مس کرو تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تمام دیوار پر اپنا ہاتھ پھیرو بلکہ منظور اس کا کچھ حصہ ہے۔

چنانچہ اگر ائمہ کے اصحاب کے ذریعہ قرآن سے استفادہ ممنوع ہوتا تو زرارہ کیوں دریافت کرتے اور امام کیوں جواب دیتے۔

امامیہ مجتہدین اس طرح کی حدیثوں کو بیان کرنے کے علاوہ ایسی روایتوں سے بھی تمسک کرتے ہیں جن میں امام نے جعل سازوں کی گڑھی ہوئی حدیثوں سے بچنے کے لئے صحیح و جعلی روایت کو پرکھنے کا معیار بتایا ہے کہ ہمارے اقوال قرآن پر پرکھے جائیں اور جو بھی قرآن کے مطابق ہے لوگ اسے اخذ کریں اور جو قرآن سے ٹکراتے ہیں انھیں دیوار پہ دے ماریں اور یہ امر اس بات سے میل نہیں کھاتا کہ قرآن سے استفادہ ممنوع ہے۔ نیز متعدد روایتوں کے بہ موجب عقود سے متعلق شرطیں جب بھی کتاب یعنی قرآن کے مخالف ہوں گی عقد باطل ہے، جو بلا تردید اس بات کی نشانی ہے کہ اس کے موافق یا مخالف کتاب ہونے کی تشخیص کے لئے خود قرآن کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، ورنہ یہ کیسے معلوم ہو سکے گا کہ فلاں شرط مطابق قرآن ہے یا مخالف قرآن،

اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب قرآن کا سمجھنا ممکن اور اس سے استفادہ جائز ہو۔

البتہ یہ بات مسلم ہے کہ قرآن مجید سے استفادہ خصوصاً ان آیتوں سے جو قانونی اور شرعی احکام سے مربوط ہیں، اتنا آسان بھی نہیں کہ ہر شخص براہ راست بلا کسی تلاش و جستجو کے اسے مورد عمل قرار دے، بلکہ قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید، عام و خاص، مجمل و مبیّن کے وجود پر غور کرتے ہوئے فقط ان قوانین و ضوابط سے آگاہ اور اجتہاد کا ملکۂ قدسیہ رکھنے والے افراد ہی آیتوں سے استنباط کر سکتے ہیں۔

یہ بات تذکر کے قابل ہے کہ طول تاریخ میں اسلام پر اس جہت سے بہت زیادہ کاری ضربیں لگی ہیں کہ ایسے افراد جو اکثر علم کے کسی ایک رشتہ میں خود کو متخصص سمجھتے ہیں، اس باطل گمان اور تصور سے کہ ہم بھی قرآن میں شروع سے آخر تک اظہار نظر کر سکتے ہیں، انہوں نے آیتوں سے استنباط کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اکثر غیر اسلامی تہذیبوں کے زیر اثر ایسے عقائد اور آراء کو پیش کیا ہے جو کسی صورت سے بھی مکتب اسلام و قرآن مجید سے مطابقت نہیں رکھتے۔ لہٰذا لازم ہے کہ اس جہت میں پورے طور سے دقت نظر سے کام لیا جائے کہ کہیں قرآن مجید متروک اور طاقچوں اور کتابخانوں کے گوشہ میں پڑا نہ رہے اور ہر کس و ناکس کے ہاتھوں کا کھلونا بھی نہ بننے پائے۔

جناب ڈاکٹر ابو القاسم گرجی
ترجمہ: جناب خادم حسین

حکومت و قانون اسلامی جمہوریہ میں

اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے قانون و حکومت کے معنی بتا دینا مناسب ہوگا۔

قانون کیا ہے؟

لفظ قانون معرب ہے اور اصل میں یونانی لفظ (KANON)[1] یا سریانی[2] یا رومن[3] یا پھر فارسی[4] زبان سے عربی میں آیا ہے۔

لغت کی کتابوں میں لفظ قانون کے مختلف معنی درج ہوئے ہیں جیسے رسم و رواج، دستور و قاعدہ، یاسا (آئین و سزا)، مقیاس، سوال اور طرز وغیرہ[5]، دانشوروں کی اصطلاح میں قانون اس ضابطہ کلیہ کو کہتے ہیں جو کچھ افراد پر منطبق ہو اور اسی کے ذریعہ ان افراد پر عائد حکم معین و مشخص[6] ہو سکے۔

1۔ مرحوم ڈاکٹر معین، برھان قاطع (فٹ نوٹ) منقول دائرۃ المعارف اسلام۔

2۔ شرح مطالع اور منطق کی تعریف میں حاشیہ ملا عبداللہ یزدی۔

3۔ تاج العروس۔ المعجم الوسیط   4۔ تاج العروس۔ المعجم الوسیط۔

5۔ برھان قاطع، المعجم الوسیط، فرہنگ نفیسی، لغتنامہ دہخدا وغیرہ۔

6۔ تاج العروس، شرح مطالعہ۔

جس طرح یہ اصطلاح، اعتباری امور جیسے وضع کردہ قوانین کے بارے میں استعمال ہوتی ہے اسی طرح حقیقی و واقعی امور جیسے طبیعیات و ریاضیات کے مسائل میں بھی رائج ہے اور یہی وجہ ہے کہ قانون کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے[1]، (۱) فطری (۲) وضعی۔

یہاں قانون سے مراد وہی وضعی قانون ہے، جس کے لئے قانون داں، وکیل، قضاۃ اور سیاست سے آگاہ افراد وغیرہ لفظ قانون استعمال کرتے ہیں۔ لہٰذا اس کی تعریف یوں کرنا ہوگی:

قانون وہ جامع و کامل دستور العمل ہے جو معاشرے میں نظم و نسق برقرار کرنے کے لئے چند باصلاحیت افراد یا کسی گروہ کی طرف سے وضع کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرے کے لئے قانون وضع کیا جاتا ہے اگر کوئی رکاوٹ نہ ہو اور ماحول بھی سازگار ہو تو اس پر عمل درآمد ضروری ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وضع شدہ قوانین ہمیشہ تھوپے ہی جاتے ہیں، اس لئے کہ اگر معاشرے میں استبداد و ظلم حکم فرما ہو تبھی کہا جا سکتا ہے کہ قوانین ان احکامات کا نام ہے جو زبردستی تھوپے جاتے ہیں، لیکن آزاد معاشروں میں جہاں یہ خیال لوگوں کے اذہان پر حاکم ہوتا ہے، کہ قوانین کو معاشرے کے مزاج کے مطابق ہونا چاہئے یا اس معاشرے میں جہاں اسلامی احکام کارفرما ہوتے ہیں، جو انسانوں کے حقیقی و واقعی مصالح و مفاسد کے پیش نظر تیار ہوتے ہیں، شک نہیں کہ اس طرح کے معاشروں میں عقلمند، آگاہ اور متوازن افراد قوانین کو خود بخود فطری طور پر بغیر کسی دباؤ کے تسلیم کرتے ہیں اور انھیں نافذ کرنے کے لئے کسی دباؤ کی ضرورت نہیں رہتی۔

حکومت کیا ہے؟

لغت میں حکومت کے معنی فرماں روائی و قضاوت وغیرہ کے ہیں[2]، اگرچہ اصطلاح میں حکومت کا معنی لغوی معنی سے زیادہ دور نہیں تاہم وہ ایک اعتباری چیز ہے، ثابت و ناقابل تغییر حقیقت نہیں، عام اور وسیع معنوں کے لحاظ سے اس میں وہ ادارے بھی شامل ہوتے

[1] تاریخ حکومت و قانون - آغاز کتاب
[2] المعجم، لغتنامہ و فرہنگ

ہیں۔ جو کسی جماعت، پارٹی یا گروہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وجود میں آتے ہیں اس لئے کہ ان میں بھی آپسی تعلقات بنائے رکھنے کے لئے کچھ ضابطے ہوتے ہیں تاکہ ان میں کسی طرح کا خلل وارد نہ ہو۔ لیکن حکومت اپنے اصلی مفہوم کے اعتبار سے اس ادارہ کا نام ہے جسے ایک خاص علاقے کے لوگ اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کرنے اور دیگری وغیر سرکاری اداروں، جماعتوں، گروہوں اور عوام الناس کے حقوق و فرائض معین کرنے کے لئے قائم کرتے ہیں۔ یہ ادارہ، وضع کردہ قوانین و مقررات کی مدد سے اپنے عوام کی ضروریات پوری کرنے، مشکلوں کو حل کرنے، اختلاف کو دور کرنے اور عوام کے مفادات کی نگہبانی کی بھرپور کوشش کرتا ہے، نظام حاکم کو حکومت کہا جاتا ہے، حکومت چلانے والے حکمراں اور جن پر حکومت ہوتی ہے ملت کہلاتے ہیں۔

عوام، جن کے لئے حکومت قائم ہوتی ہے ان کی تعداد کم بھی ہوسکتی ہے اور زیادہ بھی ممکن ہے حکومت ایک پارٹی اور گروہ پر مشتمل ہو یا اس سے زیادہ، تمام افراد ایک مذہب کے ماننے والے ہوسکتے ہیں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے بھی، ایک رنگ کے بھی ہوسکتے ہیں اور کئی رنگوں کے بھی، ایک زبان بولنے والے بھی ہوسکتے ہیں اور مختلف زبانیں بولنے والے بھی، لہٰذا اختلاف پذیر مسائل جیسے سیاسی، ثقافتی اور دینی و مذہبی امور سے متعلق قوانین و مقررات وضع کرتے وقت اکثریت کے حقوق کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن جن مسائل میں اختلاف اور ٹکراؤ کا خدشہ نہیں جیسے مذہبی و قومی آداب و رسوم اور ذاتی معاملات ان میں ہر مذہب کے ماننے والوں کو آزادی دینے میں کوئی قباحت نہیں۔

حکومت خاص طور پر اپنے عام و وسیع معنی و مفہوم کے لحاظ سے کئی قسموں پر مشتمل ہے، یہاں تک کہ ملوک الطوائفی اور علاقائی حکومتیں بھی اس میں شامل ہیں، لیکن خاص اور رائج معنی کے اعتبار سے تین ہی طرح کی حکومت ہوتی ہے، استبدادی، آئینی سلطنت اور جمہوری، لیکن اس کی چوتھی قسم بھی ہوتی ہے جسے صرف مسلمان افراد ہی سمجھ سکتے ہیں ذیل میں اس کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

(۱) استبدادی حکومت:

ایسی حکومت کو کہتے ہیں جو کسی ایک شخص کے ارادے کی تابع ہوتی ہے، خواہ عوام کو

منظور ہو یا نہ ہو۔ ایسی حکومت میں پہلے سے بنے قانون نہیں ہوتے اور اگر بالفرض ہوتے بھی ہیں تو اسی حاکم کے ارادے کے تابع ہوتے ہیں۔ فیصلہ کرنا نہ کرنا اور اس میں تبدیلی لانے کا حق صرف اسی کو حاصل ہوتا ہے وہی قوانین کو نافذ اور چاہے تو منسوخ بھی کر سکتا ہے، غرض یہ کہ جو چاہے وہ کر سکتا ہے، ہمیشہ عوام کے مفادات کے بجائے صرف اپنے مفادات کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس طرح کی حکومت میں سوائے ظلم و ستم اور جبر و تشدد کے اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا، چاہے حاکم عوام کا خیر خواہ، ہمدرد اور ان کے مفاد کا خیال رکھنے والا ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اس کی حکومت صحیح بنیادوں پر استوار نہ ہو گی۔

ہماری نظر میں وہ حکومتیں جو پارٹی یا اقلیتوں کی بنیاد پر قائم ہیں خواہ وہ اپنا نام بدل لیں اور آزادی و ڈیموکریسی کا دعویٰ ہی کیوں نہ کریں جب تک کہ صرف پارٹی یا اقلیت کی خواہشات کی تابع ہیں اس وقت تک استبدادی حکومت کے دائرے سے باہر نہیں شمار ہوں گی، مگر یہ کہ پارٹی کو اتنی محبوبیت حاصل ہو کہ سبھی افراد اس میں شمولیت اختیار کریں اور یہ بات بعید نظر آتی ہے۔

(۲) آئینی سلطنت:

ایسی حکومت کو کہتے ہیں جو پہلے سے بنے قوانین و مقررات کی تابع ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر ان میں افراد، جماعتوں اور اداروں کے حقوق اور ذمہ داریوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہوتی ہے، لیکن سربراہ حکومت ایک ہی خاندان سے ہوتا ہے اور حکومت اسی خاندان کے افراد کے درمیان وراثت کے طور پر چلتی رہتی ہے، اس طرح کی حکومت اگرچہ ظاہری طور پر وضع شدہ قوانین و مقررات کی پیروی کرتی ہے لیکن درحقیقت ایک استبدادی حکومت ہے، کیونکہ وہ سلطنتی گھرانا جو مسند اقتدار پر ہوتا ہے اپنے مقام و رتبے کو محفوظ کرنے کی غرض سے بڑی طاقتوں کا سہارا لیتا ہے جس کے نتیجہ میں ان طاقتوں کی جانب سے تھوپے جانے والے سمجھوتوں اور معاہدوں کو مجبوراً قبول و نافذ کرنا پڑتا ہے ورنہ اس شاہی خاندان کو سنگین صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بدترین طریقے سے اسے ہلاک اور تختہ پلٹ دیا جائے،

لہٰذا یہ خاندان ملک کی تمام طاقت وقوت کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ بڑی طاقتوں کے احکام کو عملی جامہ پہنا سکے اور اپنی وفاداری کا ثبوت دے سکے، یہ نہ صرف وہی خامیاں اور خرابیاں ہیں جو استبدادی حکومت میں موجود تھیں بلکہ اس سے بھی بدتر ہیں اس لئے کہ وہ اپنے تمام خبیث اعمال کو قانون ساز ادارے کی مدد سے قانون کا نام دیتا ہے۔ اس طرح کی حکومت کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک ہی خاندان بلاوجہ اپنے مقرر کردہ ممبران پارلیمنٹ کی حمایت سے غریب و ناچار عوام پر حکومت جما کر فخر و مباہات کرتا رہتا ہے۔

۳۔ جمہوری حکومت:

جمہوری حکومت بھی اصول وقوانین کی پابند ہوتی ہے لیکن اس میں شاہنشاہی حکومت کی خامیاں نہیں ہوتیں، صدر مملکت یعنی صدر جمہوریہ کو عوام معینہ مدت کے لئے انتخاب کرتے ہیں اور کبھی کبھی برطرفی کے لئے بھی رائے عامہ کا سہارا لیا جاتا ہے، اس طرح کی حکومت کو ڈیموکریٹک کہتے ہیں یعنی وہ حکومت جس میں نہ صرف صدر جمہوریہ کو عوام انتخاب کرتے ہیں بلکہ پوری کابینہ کا انتخاب عوام کی بالواسطہ رائے پر منحصر ہوتا ہے۔ مذکورہ حکومتوں میں یہ حکومت سب سے بہتر ہے اور اسے عوام پر عوام کی حکومت کہا جا سکتا ہے۔

البتہ جمہوری حکومتوں میں کچھ ایسی حکومتیں بھی ہوتی ہیں جن میں صدر جمہوریہ عوام کے ذریعہ منتخب نہیں ہوتا بلکہ صاحب اثر و نفوذ افراد، سرمایہ داروں، کارخانہ داروں اور پارٹی سربراہوں کا آلۂ کار ہوتا ہے اور وہی لوگ اسے برسر اقتدار لاتے ہیں، اس طرح کی حکومت بھی بڑی طاقتوں کی آلۂ کار ہوتی ہے، اس لئے کہ اگرچہ اس میں صدارت، موروثی نہیں ہوتی لیکن مذکورہ خصوصیات کی بنا پر صدر جمہوریہ بڑی طاقتوں کے لیے قابل قبول و مورد حمایت ہوتا ہے، اس کی بقا کے لئے وہی قوتیں اسباب فراہم کرتی ہیں یہاں تک کہ کبھی عمر بھر کے لئے مسند اقتدار پر باقی رہتا ہے اور بسا اوقات ان ہی طاقتوں کی براہ راست یا بالواسطہ مداخلت کی بنا پر اپنے لئے جانشین بھی مقرر کر لیتا ہے، عام طور پر وہ جانشین بھی اسی قماش کا ہوتا ہے، لہٰذا غیر ملکی قوتوں کی نظر میں اس حکومت اور آئینی سلطنت

کے درمیان کوئی فرق نہیں وہ تمام برائیاں اور خامیاں جو آئینی سلطنت میں پائی جاتی ہیں وہ اس میں بھی موجود ہیں۔

پھر بھی اس طرح کی حکومتیں اور آئینی سلطنتیں ہمیشہ خود کو عوامی حکومت کے نام سے پہچنوانے کی کوشش کرتی ہیں اور اپنے وضع کردہ قوانین کو منصفانہ اور عوام کی خواہشات کے مطابق گردانتی ہیں، حالانکہ اس سلسلے میں کوئی خاص کامیابی بھی انہیں میسّر نہیں ہوتی۔

(۴) ایک طرح کی حکومت اور بھی ہے جس میں نہ کوئی فرد اور نہ ہی کوئی پارٹی عوام پر حاکم ہوتی ہے نہ وہ عوام پر عوام کی حکومت کہلائی جا سکتی ہے، بلکہ وہ بندوں پر خدا کی حکومت ہے اسے عوام پر قانون کی حکومت بھی کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس حکومت میں شارع مقدس اسلام نے کچھ قوانین و مقررات وضع فرمائے ہیں اور ایک ایسے فرد کو جو ہر طرح سے آگاہ، عادل، متقی، خبیر، زمانے کے حالات سے واقف اور مدبر و مدبّر ہے بالخصوص یا بالعموم معیّن کیا ہے تاکہ ان قوانین و مقررات کو جامۂ عمل پہنائے۔ غیر مسلم افراد اس قسم کی حکومت سے بے خبر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے، لیکن مسلمان افراد چونکہ خدا کو ظاہر و باطن کا عالم مانتے ہیں اور معتقد ہیں کہ وہ تمام کلیات و جزئیات اور انسانوں کی خوبی و بدی سے آگاہ ہے، جس طرح وہ تکوینی اعتبار سے موجودات کا خالق اور پیدا کرنے والا ہے اسی طرح تشریعی اعتبار سے بھی دین مبین اسلام کے احکام و قوانین وضع کرنے والا ہے۔ خداوند کریم نے جو احکام و قوانین وضع کیے ہیں وہ درحقیقت مصالح و مفاسد نوعی کے تابع اور انسانوں کی سعادت کے ضامن ہیں، قانون سازی کا حق صرف اللہ کو ہے، جو احکام و قوانین اس نے وضع کیے ہیں اس کا مقصد صرف وضع کرنا نہ تھا بلکہ اس نے اس لئے وضع کئے کہ معاشرے کے افراد اس پر عمل کریں، یہ دو عہدے یعنی اسلامی قوانین کا شارع و مقنن ہونا نیز حاکم اور ان قوانین کا نفاذ کرنے والا ہونا، حق قانون سازی، اس نے اپنے لئے مخصوص رکھا ہے اسی لئے اسے شارع کہتے ہیں، حکومت اور نفاذ قوانین کی ذمہ داری اس نے دوسروں کے سپرد کی ہے، کچھ حکمرانوں کو خاص طور پر انتخاب کیا ہے، جن میں پیغمبرؐ اور ان کے جانشین علیہم السلام شامل ہیں اور کچھ حکمراں بطور عام انتخاب ہوئے ہیں جن کے لئے بعض ضابطوں

کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ حکمران فقہائے جامع الشرائط ہیں۔
اس طرح کی حکومت سب سے بہترین حکومت ہے اور اسے اسلامی حکومت کہتے ہیں، اسلامی جمہوریہ ایران اسی طرح کی حکومت قائم کرنے کے لئے اقدامات کر رہی ہے۔ مذکورہ باتوں سے یہ اندازہ ہوگیا کہ اس حکومت کو عوام پر خدا کی حکومت یا عوام پر قانون کی حکومت کیوں کہتے ہیں۔
قانون وحکومت کی تعریف اور حکومت کی مذکورہ قسموں کی جانب اشارہ کرنے کے بعد مزید وضاحت کے طور پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ شرع مقدس اسلام کے احکام بھی دوسرے قوانین کے مانند دو مرحلوں پر مشتمل ہوتے ہیں، یعنی قانون سازی اور اس کا نفاذ۔ نفاذ کی دو قسمیں ہیں قضاوت اور حکومت۔ ہم تینوں کے بارے میں مختصر طور پر توضیح پیش کریں گے۔

۱ قانون سازی:

یہ مرحلہ کئی مدارج پر مشتمل ہے۔
پہلا درجہ: تشریع و قانون سازی جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے یہ خداوند کریم سے مخصوص ہے۔
ان الحکم الا للہ امران لاتعبدوا الا ایاہ (سورۂ یوسف/۴۰)
حکومت تو بس خدا ہی کے واسطے ہے اس نے تو حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔
باری تعالیٰ تکوینی اعتبار سے خالق اور تشریعی اعتبار سے شارع و قانون ساز ہے۔
"الا لہ الخلق والامر" (اعراف/۵۴)
دیکھو حکومت اور پیدا کرنا بس خاص اسی کے لئے ہے۔

دوسرا درجہ:
تبلیغ یا بشارت و انذار یہ درجہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخصوص ہے۔
"یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ" (مائدہ/۶۷)
اے رسول جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے پہنچادو

اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (سمجھ لو کہ) تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہنچایا۔
وما ارسلناک الا مبشرا ونذیرا (اسراء ۱۰۵/)
اور تم کو تو ہم نے (جنت کی) خوش خبری دینے والا اور (عذاب سے) ڈرانے والا (رسول) بنا کر بھیجا ہے۔

آنحضرت پر لفظ شارع کا اطلاق مجاز ہے کیونکہ وہ احکام الٰہی کے سب سے پہلے مبلغ و مبین احکام ہیں، ورنہ جیسا کہ پہلے بیان کر چکے ہیں حق تشریع خداوند کریم سے ہی مخصوص ہے۔

تیسرا درجہ:

احکام کتاب و سنت کی حفاظت اور اشاعت و توضیح۔ یہ ائمہ علیہم الصلوٰۃ والسلام سے مخصوص ہے اس سلسلے میں موجود روایات حد تواتر سے مافوق ہیں، ان روایتوں میں ائمہ علیہم السلام کے بارے میں حجت خدا، بندوں پر خدا کے شاہد، عوام کے رہنما، زمین پر خدا کے جانشین و خلیفہ، اس تک رسائی کے دروازے، احکام و معارف دین کے مبین و مفسر اور بہت سی ایسی ہی صفات و خصوصیات بیان ہوئی ہیں (اصول کافی جلد ۱)۔

چوتھا درجہ:

استنباط و صدور فتویٰ، یہ عادل و جامع الشرائط فقہاء سے مخصوص ہے اور اسمیں کسی قسم کا اختلاف بھی نہیں، ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داریاں ان دوسری ذمہ داریوں کی منافی نہیں جو پیغمبر اسلامؐ یا ائمہ علیہم السلام اور فقہاء کو سونپی گئی ہیں۔

۳ انصاف و قضاوت:

اس مسئلہ میں بھی کسی قسم کا اختلاف نہیں اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ منصب قضاوت خداوند متعال نے اپنے نبی کریمؐ کو عنایت فرمایا، انہوں نے ائمہ علیہم السلام اور ائمہؑ نے اپنے جانشینوں یعنی جامع الشرائط فقہاء کے حوالے کیا، اس سلسلے میں بے شمار آیات و روایات موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں۔

۳) عوام پر حکومت و فرمانروائی:

یہ مرحلہ بھی جو ہمارے موضوع بحث کا نہایت اہم مسئلہ ہے۔ گذشتہ مرحلے کے مانند اُنی آیات کی روسے پیغمبر اسلامؐ کو باری تعالیٰ کی جانب سے دیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم" (احزاب/٦)

نبی تو مؤمنین سے خود ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر حق رکھتے ہیں۔

ماکان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرة من امرھم" (احزاب/٣٦)

اور نہ کسی ایمان دار مرد کو یہ مناسب ہے اور نہ کسی ایمان دار عورت کو کہ جب خدا اور اس کا رسولؐ کسی کام کا حکم دیں تو ان کو اپنے اس کام (کے کرنے نہ کرنے) کا اختیار ہو۔

یہ عہدہ آنحضرتؐ کی جانب سے ائمہ علیہم السلام کو ملا ہے، غدیر خم کے موقع پر آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

"من کنت مولاہ فھذا علیٌ مولاہ" ان کی اطاعت و پیروی کے سلسلے میں بے شمار روایات موجود ہیں، اس کے علاوہ حدود و تعزیرات، قاصروں کے اموال میں تصرف اور دوسرے امور حسبیہ کے بارے میں رجوع کرنے سے متعلق یا ان کے اولی الامر اور بندوں پر خدا کی حجت ہونے سے متعلق بے شمار روایتیں موجود ہیں۔ (متاجر، ولایت فقیہ)

اس کے بعد یہ منصب ائمہ علیہم السلام کی جانب سے جامع الشرائط فقہا کے حوالے ہوا ہے:

"العلماء امناء الرسل"

علماء و فقہاء پیغمبران خدا کے امانتدار ہیں۔

"مجاری الامور بید العلماء باللہ الامناء علی حلالہ و حرامہ"

احکام کا جاری کرنا علماء و فقہا کے ہاتھ میں ہے وہ خدا کے امانتدار ہیں اس کے حرام و حلال کے بتلانے میں۔

"علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" ہماری امت کے علماء پیغمبران بنی اسرائیل کے مانند ہیں۔ "ھم حجتی علیکم" "وہ تم پر ہماری حجت ہیں"، اور بھی بہت سی روایات موجود ہیں۔ (مناجر، ولایت فقیہ)

لہٰذا مذکورہ روایات اور ان میں مذکور ضوابط کی رو سے ان تمام مناصب کے لئے جن کی طرف اشارہ کیا گیا جامع الشرایط فقیہ صاحب صلاحیت ہوگا خواہ عوام اسے انتخاب کریں یا نہ کریں، یہ بات ضرور ہے کہ مسلمان ایسے ہی فرد کو جس میں پوری خصوصیات پائی جاتی ہوں تسلیم کریں گے، اب اگر اس تسلیم کو مسلمانوں کا ووٹ سمجھ لیں تو یہ ووٹ منتخب شدہ فرد کی صلاحیت کا باعث نہیں بلکہ اس کی صلاحیت معینہ ضابطوں کے پائے جانے کے نتیجہ میں ہوتی ہے اور یہ آراء درحقیقت صلاحیت کی تابع ہوتی ہیں۔ البتہ بعض موقعوں پر آراء منصب حکومت کی تشکیل میں اہم ثابت ہوتی ہیں اور وہ اس طرح سے کہ:۔

۱۔ اگر منصب حکومت کے لئے صرف ایک ہی صاحب صلاحیت، امیدوار ہو تو یقیناً وہی اس منصب پر فائز ہوگا اور آراء کا کوئی اثر مرتب نہ ہوگا۔

۲۔ اگر کئی صاحب صلاحیت، امیدوار ہوں اور ان میں سے ایک کو فوقیت و ترجیح حاصل ہو۔ وہی مقدم رہے گا اور آراء کا کوئی اثر نہ ہوگا۔

۳۔ کئی صاحب صلاحیت، امیدوار ہونے کی صورت میں اگر کسی کو بھی فوقیت و ترجیح حاصل نہ ہو تو اکثریت کی آراء پر فیصلے کا انحصار ہوگا اور صاحب آراء اکثریت ہی صاحب صلاحیت مانا جائے گا۔

۴۔ گذشتہ مفروضہ کے تحت اگر آراء برابر ہوں اور تمام امیدوار کسی ایک کے حق میں عدل و تقویٰ کے پیش نظر دست بردار ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

۵۔ اور کسی کے حق میں امیدواروں کے دست بردار نہ ہونے کی صورت میں قیادت کی کمیٹی قائم کی جائے گی اور عدم وجود اکثریت آراء حکومت کے مسئلہ میں اثر انداز نہ ہوگی۔

۶۔ اگر اسی مفروضہ کے تحت تمام امیدوار جن کے ووٹ برابر ہیں یکجا جمع ہونے سے قاصر رہیں، تو دانشوروں کو چاہیئے کہ وہ کسی ایک باصلاحیت فرد کو حکومت کے لئے چن لیں

اسی بنا پر ہمارے آئین میں مجلس شورای اسلامی کے علاوہ مجلس خبرگان کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔

ولایت فقیہ کے مسئلہ سے متعلق جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں، ان کے ساتھ ہی اس نکتہ کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے دلائل اسی میں مضمر ہیں، اگر یہ بات قابل تسلیم ہے کہ اسلامی قوانین پیچیدہ ہیں اور ان کا نفاذ ضروری ہے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھیں نافذ کرنے کی صلاحیت فقیہ عادل کے سوا کسی اور میں نہیں ہو سکتی۔

مذکورہ باتوں کی بنا پر اگر یہ کہا جائے، ضروری ہے کہ ایک فرد (فقیہ جامع الشرائط) ہی تمام منصبوں پر فائز ہو، اور یہ ذمہ داریاں تقسیم کرنے والے اصول کے خلاف ہے۔ جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے: ویسے تمام منصبوں پر ایک فرد کے ہونے میں کوئی قباحت نہیں، خاص طور پر جبکہ اصلح و بے مثل ہو، لیکن چونکہ ایک فرد تمام منصبوں کی ذمہ داریاں نہیں سنبھال سکتا لہٰذا اسے صالح اور شائستہ افراد کی مدد سے کچھ ادارے قائم کرنے ہوں گے تاکہ اپنی نگرانی میں ان اداروں کے تعاون سے تمام امور انجام دے سکے اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں۔ جہاں تک ذمہ داریاں بانٹنے کا سوال ہے اگر وہ فرد مختلف منصبوں کی ذمہ داریاں محض اس لئے بانٹنا چاہتا ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو حتیٰ سطور بالا میں مذکور طریقہ سے بھی سنبھالنے سے قاصر ہے تو یہ بات ٹھیک نہیں لیکن اگر مقصد صرف یہ ہو کہ ایک ادارہ دوسرے ادارے کے کاموں میں دخل نہ دے تو صحیح ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں، لیکن اس کا کوئی تعلق سوال سے نہیں۔

مختصر طور پر چند مزید نکات کی جانب اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔

(۱) اگر کہا جائے، جب اسلامی جمہوریہ ایران کے تمام قوانین الٰہی قوانین ہیں تو مجلس شورای اسلامی کا کیا کام ہے؟ جواب میں کہا جا سکتا ہے:

مجلس شورای اسلامی بہت سے کام انجام دے سکتی ہے منجملہ درج ذیل امور:—

۱۔ اسلامی قوانین کو حسب ضرورت دفعات و تبصروں کے اعتبار سے مرتب کرنا اور اس کے ضوابط و شروط کو واضح طور پر ذکر کرنا۔

۲۔ چونکہ احکام و قوانین کے موضوعات زیادہ تر عرفی امور میں ہیں۔ لہٰذا ان کا مکمل

طور پر جائزہ لے کر اس کے حدود معیّن کرنا ۔

۳۔ جن امور سے متعلق شارع مقدس نے سکوت اختیار کیا ہے یا صرف بنیادی ضابطے پر اکتفا کی ہے یا فرضاً پورے طور پر ہمارے حوالے کر دیا ہے، مجلس شوریٰ مصلحت عامہ کے تقاضوں اور عدم منافات احکام تشریع کو مدنظر رکھتے ہوئے قانون کی تشخیص کر سکتی ہے، ظاہر ہے کہ احکام تشریع سے نفاذ کی صورت میں قوم کے باخبر و صالح افراد (شورائے نگہبان) ان امور کی نشاندہی کریں گے تاکہ اصلاح ہو جائے۔

۴۔ وہ احکام و قوانین وضع کرتی ہے جن کی مدد سے اسلامی احکام و قوانین کو بہتر طریقے سے نافذ کیا جا سکتا ہے ۔

۵۔ بوقت ضرورت، ولایت فقیہ کو مدنظر رکھتے ہوئے سماج اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے قوانین مرتب کرتی ہے ۔

۶۔ سامنے آنے والے نئے مسائل کا حل اسلامی اصول و ضوابط کی مدد سے پیش کر سکتی ہے۔

(۲) بنیادی طور پر اسلامی مسائل میں مشورت ممکن ہے ؟

جی ہاں قرآنی آیات و روایات کی رو سے شوریٰ نہ صرف جائز و مستحسن بلکہ بسا اوقات واجب ہے، آیۂ کریمہ "وشاورھم فی الامر" کی رو سے خود پیغمبر اسلامؐ کو مشاورت کی ہدایت کی گئی ۔ قانون سازی کے سوا بقیہ امور میں مشورت کا حکم دیا گیا، جیسے: احکام کو سمجھنے کا طریقہ، نفاذ قانون کا بہتر طریقہ اور مختلف منصبوں کے لئے افراد کا انتخاب ظاہر ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کا حق نافذ کرنے والے کو ہی ہوگا۔ ::

جناب ڈاکٹر جلال الدین مدنی
ترجمہ: سید مہدی سرباز

جمہوری اسلامی ایران میں بنیادی حقوق

مجلس خبرگان کی تشکیل اور امام خمینی کی قیادت

فروری ۱۹۷۹ء (بہمن ۱۳۵۷ھ ش) میں انقلاب اسلامی کامیابی کے بعد قوم کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ دستور اساسی کی تیاری کا تھا۔ ایک ایسا دستور اساسی جو ملت کے تمام مقاصد و خواہشات کا آئینہ دار، نیز اسلامی انقلاب کے تمام جہات کا پرتو ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں کوششیں ہوئیں لیکن آئین وقانون کے بارے میں ہمیں زیادہ تجربہ نہ تھا۔ ہم نے دستور اساسی کے بارے میں تجربات کا تذکرہ اس سلسلے کے تیسرے حصے میں کر دیا ہے جو دوران مشروطہ اور مشروطیت کے بعد کے زمانے سے متعلق تھا۔ یکم اپریل ۱۹۷۹ء (۱۲ فروردین ۱۳۵۸ھ ش) کو نظام حکومت کے بارے میں ریفرنڈم ہوا، ملت کی طرف سے "اسلامی جمہوریہ" کے اعلان کے بعد دستور اساسی کی تدوین ضروری ہو چکی تھی۔ یہ کام کس طرح انجام پائے؟ دستور اساسی کی تدوین و ترتیب میں کس طرح کے لوگ شریک ہوں؟ تمام نظریات کو کس طریقہ سے یکجا کیا جائے؟ بہترین دستور اساسی مرتب کرنے کا کیا طریقہ ہے۔

(۱۳۵۸ھ ش) ۱۹۷۹ء کے ابتدائی مہینوں کی سیاسی فضا کے بارے میں اگرچہ گفتگو زیادہ ہے۔ لیکن

لیکن موضوع سے مربوط رہنے کی خاطر اسے نظر انداز کرتے ہوئے صرف ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ایرانی مسلمانوں کی واضح اکثریت کسی سیاسی گروہ، تنظیم یا پارٹی میں شامل نہ تھی، تاہم ان میں ایسا اتحاد پایا جاتا تھا جس کی مثال نہیں ملتی۔ عام طور پر انقلابات میں یہ ہوتا ہے کہ جو پارٹیاں انقلاب لانے کے لئے جدوجہد کرتی ہیں حکومت انہی کے ہاتھ آجاتی ہے۔ لیکن ایران میں اسلامی انقلاب کی خاطر جدوجہد کرنے والوں میں لاکھوں افراد پر مشتمل قوم شامل تھی، جو امام خمینی مدظلہ کے ارشادات کے تحت عمل کرتی تھی۔ اس عوامی سیلاب کے سامنے کوئی بھی پارٹی یا گروہ اپنا وجود ثابت نہیں کرسکا تھا اور نہ ہی انقلاب پر اثر انداز ہوسکتا تھا۔

امام اور عوام کا تعلق ان تعلقات کی طرح نہیں تھا جو دوسرے ممالک کے اندر پارٹیوں اور گروہوں کے درمیان عام طور پر ہوا کرتا ہے، جس میں ممبر سازی وغیرہ ہوتی ہے اور پارٹی پروگرام کے تحت امور انجام پاتے ہیں، نیز ذمہ داریاں تقسیم ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں امام مدظلہ مرجع تقلید اور انقلاب اسلامی کے قائد تھے۔ تشیع سے ناآگاہ دنیا کے لئے ایران میں امام کے احکام کی پیروی حیرت انگیز تھی۔

چونکہ فروری ۱۹۷۸ء اور (۱۳۵۷ھ ش) سے قبل اگرچہ امام پیرس میں تھے لیکن ملک کا نظم و نسق انہی کے ہاتھ میں تھا اور پہلوی حکومت کے خاتمے کا سبب یہی تھا کہ سلطنت ایک شئی زائد اور ناقابل قبول ہوچکی تھی اور اس کے سامنے سرنگوتی کے سوا کوئی دوسرا راستہ موجود نہ تھا۔ ایسی فضا اور ماحول میں دستور اساسی کا ڈھانچہ بڑی سرعت اور آسانی کے ساتھ تیار ہوا۔

فرض کریں ایران کی قیادت اور قوم کا رابطہ (یہاں تک کہ مذہبی اقلیتوں کا) اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا جس کا ہم نے مشاہدہ کیا ہے، تو کیا یہ ممکن تھا کہ ایسی جگہ جہاں لاکھوں انسان مختلف نظریات کے ساتھ بستے ہوں (جبکہ دسیوں برس تک بیرونی دباؤ اور اندرونی بے چینیوں کا شکار رہی ہو) متفقہ طور پر کسی بنیادی اصول کو قبول کرلیں؟ اگر اس رابطہ پر اسلام سایہ فگن نہ ہوتا تو کبھی بھی مجلس خبرگان کے انتخابات اتنی خوبی کے ساتھ انجام نہ پاتے اور اگر اسلامی جمہوریت کی بنیاد اسلام پر نہ ہوتی تو پھر کونسا گروپ یا پارٹی کن اصولوں کے تحت اور کس قانونی سسٹم کی روشنی میں ایک ایسے انقلابی ملک کی مشکلات پر قابو پانے میں کامیابی حاصل کرلیتی جہاں کی صورت حال ایران جیسی ہو؟ دستور اساسی بھی بنالیں اور ایران کے خلاف ہونے والے تمام حملوں کے

د عوام کی واضح اکثریت کے اتحاد کو محفوظ رکھ سکیں ؛ بہرحال اسلامی جوہر اور منفرد قیادت
طرح بہت سے مشکلات کو حل کرنے میں کامیاب ہوگئی ۔ آخرکار دستور اساسی کی فراہمی میں
کامیاب ہوئی ۔ اس وقت ہماری بحث کا موضوع یہی ہے کہ کس طرح دستور اساسی مرتب
۔ کن کن تجویزوں سے استفادہ کیا گیا ؟ مجلس خبرگان کیسے بنی ۔ کن وسائل اور اصول وضوابط
ت یہ کام آگے بڑھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ۱۲ فروردین ۱۳۵۸ھ ش / یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو امام کی طرف سے مدوّن
ور اساسی قوم کے سامنے پیش کیا جاتا تو ملت کی ایسی واضح اکثریت کی رائے اس کے حق میں
، اور وہ قانون نافذ ہوجاتا ، یعنی ایک ایسی چیز ہوتی جو کہیں بھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ لیکن
یت کا اصرار تھا کہ عوام براہ راست اپنی خواہشات اور تمناؤں کو خود عملی جامہ پہنائیں۔ چنانچہ
سلسلہ میں دستور اساسی کی تدوین جن مراحل سے گذری ان میں سے بعض مراحل کو ہم بیان کریں گے۔
یہاں دستور اساسی کی تنظیم و ترتیب سے متعلق قواعد وضوابط کے سلسلہ میں ہماری گفتگو ہوگی
لئے قانون کے جزئیات پر مزید بحث ہوگی تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ موجودہ دستور اساسی نے
طویل سفر طے کیا ہے ۔ تین مرتبہ قوم نے استصواب رائے کے ذریعے اس دستور کی حمایت کی ہے۔
پریل ۱۹۷۹ء / ۱۲ فروردین ۱۳۵۸ھ ش کو نوع حکومت معین کرنے کے لئے انجام پانے والا
ینڈم دستور اساسی کے لئے تمہید کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ۳ اگست ۱۹۷۹ء / ۱۲ امرداد ۱۳۵۸ھ ش کو
برگان کے اراکین کا انتخاب ہوا پھر نومبر ۱۹۷۹ء / آبان ماہ ۱۳۵۸ھ کو دستور اساسی کی منظوری
لئے ریفرنڈم عمل میں آیا۔

س خبرگان کس طرح وجود میں آئی ؟

اپریل ۱۹۷۹ء / ۱۳۵۸ھ ش کے پہلے ہفتے میں قوم کی جانب سے اسلامی جمہوریہ کے اعلان
بعد ضروری تھا کہ دستور اساسی مدوّن ہو جائے ۔ چنانچہ دستور اساسی کا مسوّدہ عارضی
یت کی طرف سے شائع کیا گیا ۔ اس مسوّدے کی اشاعت کے بعد اسلامی اور غیر اسلامی
ہوں اور عوامی حلقوں میں مختلف ردّعمل کا اظہار ہوا ۔ بعض کے نزدیک یہ دستور

مجلس خبرگان کی تشکیل

مغرب نوازوں کی تمناؤں کا مظہر تھا۔ اور اسلام کے نام اور ٹائیٹل کے سوا اس میں کچھ نہ تھا۔ بعض لوگ اسے اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ اس میں اسلامی و شرعی اصطلاحیں استعمال ہوئی تھیں اگرچہ وہ بہت جزئی و معمولی تھیں۔

اکثر لوگ اس میں اصلاح کے خواہاں تھے اور اس کے بعض اصولوں پر تنقید کرتے تھے۔ بہرحال مسودہ قانون کی اشاعت نے یہ موقع فراہم کیا کہ ہر کوئی اپنے اپنے سیاسی و مذہبی نظریات کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔

اس وقت ملک کے اخبارات، جن کی تعداد و اشاعت بہت زیادہ تھی۔ دستور اساسی سے متعلق بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن نے اس بحث پر کافی وقت صرف کیا۔ بعض گروہوں کا یہ اصرار تھا کہ دستور اساسی کی تدوین کے لئے ایک ایسی مجلس مؤسسان کی ضرورت ہے، جو تین سو سے زائد ماہرین پر مشتمل ہو۔ جبکہ بعض کی نظر میں مجلس مؤسسان کی تشکیل کی قطعی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ بہتر یہ تھا کہ حکومت دستور اساسی کے مسودہ ہی پر ریفرنڈم کرالے۔

لیکن امام مدظلہ نے ہمیشہ کی طرح یہاں بھی دو ٹوک بات کی اور فرمایا:۔

ایک بڑی مجلس مؤسسان کے بجائے جو مہینوں ہمارا وقت لے لیگی اور انقلاب کے اہم اور نازک لمحات کو ضائع کرے گی، خبرگان کے نام سے ایک مجلس تشکیل دی جائے اور کچھ اسلام شناس علماء مسودہ قانون کا مطالعہ کریں اور تحقیقات و تنقیدات کے بعد آخری منظوری کے لئے ایرانی عوام کے سامنے پیش کیا جائے۔

امام خمینی مجلس خبرگان اور دستور اساسی کے بارے میں یوں تاکید فرماتے ہیں:۔

ہمارا دستور اساسی اسلامی ہونا چاہئے اور ایک حرف بھی غیر اسلامی اس میں نہیں ہونا چاہئے۔ اگر ایسا ہوا تو نہ میں اس کو منظور کروں گا اور نہ قوم ہی ایسے قانون کو تسلیم کرے گی۔ ہماری ملت ایسے افراد کا انتخاب کرے گی جو اسلام کے معتقد ہیں اور اسلام کو ترقی یافتہ دین سمجھتے ہیں۔

مجلس خبرگان کے انتخاب کا حکم:

۵ جولائی سنہ ۱۹۷۹ء / ۱۴ تیر ماہ سنہ ۱۳۵۸ ہ‍ ش کو وزیر اعظم نے وزیر داخلہ کے نام مجلس خبرگان کے

انتخابات کرانے کے لئے یوں حکم صادر کیا:۔

رہبر انقلاب اسلامی ایران امام خمینی کے حکم کے مطابق قانون اساسی کو آخری شکل دینے والی مجلس کے انتخابات اس مجلس کے انتخابات سے متعلق قانون کے تحت جو وزارت عظمیٰ کی طرف سے وزارت داخلہ کو سرکلر نمبر ۴۷ ۵ ط، الف مورخہ ۹/۴/۵۸ میں مندرج ہے، مورخہ ۱۲ مرداد ماہ ۱۳۵۸ء کو اس الیکشن کے انعقاد کا انتظام کیا جائے۔

"وزیر اعظم"

خبرگان کے انتخابات کا قانون:

مجلس خبرگان کے انتخابات کا قانون ۴۷ دفعات پر مشتمل تھا جس کے مطابق ہر علاقے میں پانچ افراد پر مشتمل اجرائی کمیٹی بنائی جانے والی تھی۔ ہر صوبے کے انتخابی حلقوں کے تمام کمشنروں کی ایک مقررہ وقت پر میٹنگ ہوتی اور پانچ افراد پر مشتمل انتخابی کمیٹی تشکیل دیتے، یہ پانچ افراد علاقے کے ایک مجاہد عالم، کسی یونیورسٹی، کالج یا تعلیمی اداروں کے اساتذہ میں سے ایک، ایک مجاہد و مبارز مزدور، ایک مجاہد اور باکردار تاجر اور ایک مجاہد کسان پر مشتمل تھے۔ یہ انتخابی کمیٹی باہمی مشورے سے علاقے کے ۲۵ منتخب افراد میں سے انتخابات کی مرکزی انجمن کے اراکین چن لیتی۔

وزارت داخلہ اس مجلس کے انتخاب کے لئے مقدمات فراہم کرتی۔ چنانچہ اس مجلس کی تشکیل کے لئے سابقہ سینٹ کی عمارت کا اعلان کیا گیا۔ پورے ملک میں اس انتخاب کے انعقاد کے لئے انتخابی قانون کے تحت پندرہ ہزار پولنگ اسٹیشن مقرر کئے گئے تھے۔ اور ۱۲ مرداد/۳ اگست کی تاریخ طے پاگئی تھی۔

اسلامی جمہوریہ میں پہلی بار اس انتخاب کے موقع پر مختلف سیاسی و مذہبی گروہ، نمائندوں کے انتخاب کے لئے ایک دوسرے کے مقابلے میں آگئے، ایسی پارٹیاں بھی رونما ہوئیں جن کے ممبر انگشت شمار تھے لیکن ان کے پاس ذرائع ابلاغ تھے اور مجلس خبرگان میں اپنا نمائندہ

بھیجنے کے لئے آس لگائے بیٹھے تھے۔ کچھ گٹھ جوڑ وجود میں آئے۔ ہم خیال گروہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تاکہ زیادہ ووٹ حاصل کر سکیں۔ اسلامی تنظیمیں جن کو عوام امام کا پیرو کار سمجھتے تھے، اپنے اتحاد اور علماء کرام کی حمایت سے کافی اعتماد حاصل کر چکی تھیں۔ چنانچہ ہر علاقے میں عوام کی بھاری اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ یہ بات بعض گروہوں کے لئے ناقابل یقین اور تلخ تھی۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے اپنے غم و غصّے کا اظہار کر رہے تھے بعض ایسے افراد بھی تھے جو شاہی دور کے آخری ایام میں حکومت وقت کے منشاء کے مطابق چند مضامین کچھ کھلے خطوط اور چند ایک مخالفانہ تقریروں کے ذریعہ خود کو مبارز و مجاہد ثابت کر کے حکومت پر قبضے کے لئے تیار ہو بیٹھے تھے۔ وہ سیاسی میدان میں عوام کی موجودگی سے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ وہ اس قوم کے ترجمان نہیں ہو سکتے تھے جو ان کے اقدامات کو پسند نہیں کرتی تھی۔ خاص طور پر امام خمینی مدظلہ پوری قوم کی بولتی ہوئی زبان کی حیثیت سے تمام حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے اور اچھی طرح سمجھتے تھے کہ مختلف حلقوں میں رونما ہونے والی تحریکیں اعتراضوں اور تنقیدوں کا سبب کیا ہے اور اس کا تعلق کس سے ہے اور ہر وقت خاص تعبیروں کے ذریعے عوام کو بیدار کرتے نیز اسلامی انقلاب کو خطروں سے بچاتے تھے۔

مجلس خبرگان کا نظام عمل :

۱۲ مرداد ماہ ۱۳۵۸ھ ۲ اگست ۱۹۷۹ء کے انتخاب کے بعد وزارت داخلہ نے شوریٰ انقلاب کے مشورہ سے مجلس خبرگان کے اندرونی قواعد و ضوابط اور طریقۂ کار کو پانچ فصلوں اور چوالیس دفعات پر مشتمل تیار کر لیا، جسمیں مجلس خبرگان کے افتتاح، عارضی ہیئت رئیسہ کے اقدامات، حلف برداری، دائمی ہیئت رئیسہ اور مختلف کمیشنوں کی تشکیل کے طریقے معین کئے گئے تھے، نیز تحقیقاتی کمیشنوں کی ذمہ داریاں اور ہیئت رئیسہ کے ذریعے مجلس خبرگان کا نظم و ضبط برقرار رکھنے کے اصول مندرج تھے۔

دائمی ہیئت رئیسہ کے انتخاب تک مجلس خبرگان نے اسی قانون کے تحت عمل کیا۔ لیکن

آگے چل کر اپنی مرضی کی راہ پر چل پڑی۔ چونکہ مجلس خبرگان اس نظریہ پر پہنچی تھی کہ مجلس قانون ساز ہے چاہے عام قانون ساز مجلس ہو یا مجلس مؤسس ہو اسے دوسروں کے نظریات کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے طریقۂ کار اور تحقیقات کے اصول وضوابط خود مقرر کرنا چاہیئے۔ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ عوام کے انتخاب کردہ نمائندے تحقیقات کے لئے معین شدہ کچھ خاص اصولوں کے پابند نہ ہوں؟

اس بنا پر ہم مجبور ہیں کہ عارضی حکومت اور شورائے انقلاب کی جانب سے مجلس خبرگان کے لیے وضع شدہ اصولوں کو پیش کریں اور ان ضوابط کو بھی بیان کریں جن کو مجلس خبرگان نے اپنے لئے خود وضع کیا اور اس پر عمل کیا۔

مجلس خبرگان کے افتتاح اور آغاز کار کے بارے میں فیصلے:

انتخابات سے متعلق مرکزی سیکریٹریٹ ہی وہ ادارہ تھا جو مجلس خبرگان کے افتتاح کے مقدمات کی فراہمی کے لئے پیش نظر رکھا گیا تھا، اس کمیٹی کی یہ ذمہ داری تھی کہ منتخب نمایندوں کی سند انتخاب وصول کرے اور جب یہ سندیں مجوزہ حد تک یعنی پچاس تک پہنچ جائیں تو ریڈیو، ٹیلویژن اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے مجلس کے افتتاح کی تاریخ سے عوام کو مطلع کرے۔ اس کمیٹی کی ذمہ داری تھی۔ "دفتر نمایندگان" کے نام سے ایک دفتر بنائے تاکہ منتخب نمائندے وہاں رجوع کریں۔ نمائندوں کی آمد اور ثبت نام کی ترتیب سے مجلس میں لوگوں کی نشست معین کرے نشست نمبر کا آغاز مجلس کی پہلی کرسی سے ہوگا اور کرسیوں کی تقسیم اور جگہ معین کرنے کا یہ عمل نمایندوں میں مساوی حقوق کی حفاظت اور امتیازات کی غلط فہمی سے بچنے کے لئے تھا۔ چنانچہ مجلس کے باقاعدہ اجلاس کے دوران نمائندے صرف اپنی معینہ کرسیوں پر ہی بیٹھ سکتے تھے۔

عارضی ہیئت رئیسہ پہلے اجلاس کے دوران جلسے کی صدارت کی ذمہ دار تھی جلسے میں موجود سب سے زیادہ عمر کے نمایندے کو اجلاس کی صدارت سونپی جاتی۔ صدر جلسہ کے بیٹھنے کے بعد دوسرے عمر رسیدہ ممبر کو ڈپٹی اسپیکر کی حیثیت سے نامزد کیا

جاتا اس کے بعد تین کم سن ترین نمایندوں میں سے دو کو محرر اور ایک کو سیکریٹری کی حیثیت سے اسٹیج پر عارضی رئیس کے پہلو میں بٹھایا جاتا۔ عمر کے اعتبار سے سب سے زیادہ یا سب سے کم عمر کا تعین انتخابات کے مرکزی سیکریٹریٹ کی فراہم کردہ مشخصات و کوائف کے لحاظ سے ہوتا جو نمایندوں کے دفتر میں درج ہوتے۔ عارضی ہیئت رئیسہ کے فرائض مستقل ہیئت رئیسہ کی طرح اجلاس کی صدارت تھی۔

عارضی ہیئت رئیسہ کے بیٹھنے کے بعد پہلی کاروائی حلف برداری کی رسم ادا کرنا تھی اور آخری کاروائی دائمی ہیئت رئیسہ نیز ڈائریکٹروں کی کیٹی کا خفیہ ووٹنگ کے ذریعہ اکثریت نسبی کے ساتھ انتخاب کرنا تھا۔ طریقہ یہ طے پایا تھا کہ پہلے عارضی صدر مجلس تکبیر کہہ کر کھڑے ہوجاتے اس کے ساتھ تمام نمایندے بھی کھڑے ہوجاتے اور خضوع کے ساتھ قرآن کریم کے سامنے قیام کرتے جبکہ مذہبی اقلیتی نمائندے بھی اپنی اپنی آسمانی کتابوں کے سامنے کھڑے ہوتے اس کے بعد عارضی صدر مجلس ٹھہر ٹھہر کر حلف نامے کی عبارت کو پڑھتے اور جلسے میں موجود نمایندے واضح اور ٹھہر ٹھہر کر اسے دھراتے۔ آخر میں سارے نمایندے تقریر کے اسٹیج پر جاکر حلف نامہ پر دستخط کرتے۔ حلف نامہ کی عبارت درج ذیل ہے :۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہم ایران کے فیور عوام، قرآن مجید اور دیگر آسمانی کتابوں کے سامنے خدای واحد کی قسم کھاتے ہیں کہ نظام جمہوری اسلامی کے دستور اساسی کی تحقیق و تدوین کے سلسلے میں حسب ذیل اصولوں پر عمل پیرا ہونے کا عہد کرتے ہیں۔

(۱) حکومت اسلامی جمہوریہ ایران، جسے عوام کی حمایت حاصل ہے، اس کے وفادار رہیں گے اور اس کے استحکام و دوام کے لئے کوشش کریں گے۔

(۲) خداوند عالم اور ملت مسلمہ ایران کے سامنے اپنی عظیم ذمہ داریوں اور تاریخی فرائض کی انجام دہی میں جو اس عظیم قوم نے ہمیں سونپی ہے، خاص توجہ دیں گے، دستور اساسی پر تجزیہ و تحقیق کے دوران گذشتہ پچیس صدیوں میں اس ملک پر ظالموں کے جابرانہ تسلط کے دوران اس ستم رسیدہ قوم کے پامال شدہ حقوق کی بازیابی اور مقدس اسلامی انقلاب کے مقاصد جو ایران کے قومی مفادات کے متضمن ہیں، پر توجہ دینے کو اپنا نصب العین قرار دیں گے۔

جو نمائندے ابتدائی اجلاس میں شریک نہ ہوں، ان کے لئے بعد کے اجلاسوں میں اپنی پہلی شرکت میں حلف اٹھانا ضروری تھا۔ مجلس کے کام کی مدت ایک ماہ طے پائی تھی۔ یعنی ایک مہینے کے اندر تحقیقات مکمل کر لینی تھی۔ ہر اجلاس میں کم از کم دو تہائی اراکین کی حاضری لازمی تھی۔ اسی لئے غیر حاضری کے سلسلہ میں کسی حد تک شدید پابندی لگائی گئی تھی۔ اجازت کے بغیر صرف ایک اجلاس میں غیر حاضری ممکن تھی۔ جبکہ صرف ایک اجلاس کی رخصت لی جا سکتی تھی۔ جب کوئی نمائندہ عام اجلاس یا کمیشنوں اور ڈائریکٹروں کے اجلاس میں شرکت نہ کرتا تو بعد والے اجلاس میں اس سے رائے دینے کا حق سلب ہو جاتا۔ عام اجلاس میں دو تہائی اراکین (سیاس) کی حاضری سے کورم پورا ہو جاتا تھا اور فیصلوں کے لئے اجلاس میں موجود ۵۱ فیصد اراکین کی اکثریت (یعنی ۳۸) کافی تھی۔ کمیشنوں اور ڈائریکٹروں کے اجلاس کے لیے اکثر اراکین کی حاضری ضروری تھی اور جلسہ میں موجود اراکین کی اکثریت کی رائے سے فیصلے ہو سکتے تھے۔ البتہ مذکورہ شرائط کا خبرگان کے فیصلوں میں خیال نہیں رکھا گیا۔ چونکہ دستور اساسی کے اہم دفعات کے بارے میں ۷۳ اراکین کی مجموعی تعداد میں سے ۳۸ اراکین کی رائے پر فیصلہ دینا قابل اعتراض تھا۔ اسی لئے عارضی حکومت کے تعین کردہ اصولوں کو بدلنے کے اسباب میں سے شاید ایک سبب یہ بھی تھا کہ خبرگان کے فیصلے زیادہ مستحکم بنیادوں پر استوار ہوں۔

اسی طرح اجلاس کی کاروائیوں پر نگرانی سے متعلق حد سے زیادہ وسیع النظری کا ثبوت دیا گیا تھا۔ چنانچہ دفعہ ۸ میں تھا:

"جلسے کی باقاعدہ کاروائی کے بعد نمایندوں کے جلسے سے باہر نکل جانے کے بعد بھی جب تک اکثریت مطلق (اکیاون فیصد) باقی ہو، بحث و تحقیق کا عمل جاری رہ سکتا ہے۔ البتہ اگر فیصلے اور رائے گیری کے موقع پر جو نمایندہ یا نمایندے اجلاس میں واپس نہ آئیں۔ تو ان کی رائے ممتنع تصور کی جائے گی۔"

اس دفعہ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مجلس خبرگان میں کاروائی جاری رکھنا اور مدت مقررہ میں کام نمٹانا اہم بات تھی نہ کہ بہترین فیصلہ کرنے کے لئے غور و فکر اور بحث و تمحیص۔ اس دفعہ کے تحت نمائندوں کے لئے صرف اجلاس کی کاروائی شروع کرنے کے لئے خود کو دکھانا ہوتا

تھا اور اجلاس کی کاروائی شروع ہونے کے بعد باہر چلے جائیں اور ایک اچھی خاصی تعداد میں نمائندوں کی عدم موجودگی میں بھی مذاکرات جاری رہ سکتے تھے۔ ایسی صورت میں مجلس پچاس نمائندوں پر دست رسی رکھ سکتی تھی اور اکثریت کی موجودگی میں بحث جاری رہتی اور رائے گیری عمل میں آجاتی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ غیر حاضر نمایندوں کی رائے ممتنع سمجھی جاتی، یعنی وہ اجلاس میں موجود تھے لیکن رائے نہیں دی۔

تیرہ کمیشن :

دستور اساسی پر آخری تحقیقاتی نظر ڈالنے والی مجلس کے لئے حکومت کی تجویز میں تیرہ کمیشن تشکیل دیئے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ہر کمیشن پانچ اراکین رئیس، نائب رئیس، سیکرٹری اور دو محرروں پر مشتمل ہوتا۔ اس دفعہ کے مطابق دستور اساسی کا مسودہ تحقیقات کے لئے مندرجہ ذیل کمیشنوں میں تقسیم کیا جاتا تھا:۔

کمیشن ۱ (دفعہ ۱ سے ۱۲ تک) بنیادی اور کلی دفعات کی تحقیق کا ذمہ دار تھا۔

کمیشن ۲ (دفعہ ۱۳ سے ۲۱ تک) سرکاری مذہب، قومی حاکمیت، پرچم اور زبان سے متعلق تحقیق کرنا۔

کمیشن ۳ (دفعہ ۲۲ سے ۳۴ تک) ملت کے حقوق سے متعلق دفعات پر نظر ڈالتا۔

کمیشن ۴ (دفعہ ۳۵ سے ۴۵ تک) ملت کے حقوق کے بارے میں تیرہ اصول کی تحقیقات کا ذمہ دار تھا

کمیشن ۵ (دفعہ ۴۶ سے ۵۴ تک) کی ذمہ داری مقننہ کے بارے میں بعض دفعات کی تحقیقات کرنا تھی

کمیشن ۶ (دفعہ ۵۵ سے ۶۵ تک) یہ کمیشن بھی مقننہ سے متعلق بعض دفعات کی تحقیق کا ذمہ دار تھا

کمیشن ۷ (دفعہ ۶۶ سے ۷۴ تک) یہ بھی قوہ مقننہ ہی کے بارے میں تھا۔

کمیشن ۸ (دفعہ ۷۵ سے ۸۸ تک) قوہ مجریہ سے متعلق بعض دفعات کی تحقیقات۔

کمیشن ۹ (دفعہ ۸۹ سے ۱۰۲ تک) یہ بھی قوہ مجریہ کے بارے میں تحقیقات کا ذمہ دار تھا

کمیشن ۱۰ (دفعہ ۱۰۳ سے ۱۱۲ تک) یہ کمیشن بھی قوہ مجریہ کے بعض دفعات سے متعلق تحقیقات کرتا۔

کمیشن ۱۱ (دفعہ ۱۱۴ سے ۱۲۵ تک) تو وہ مجریہ سے متعلق بقیہ دفعات کے بارے میں تحقیقات کا ذمہ دار تھا۔

کمیشن ۱۲ (دفعہ ۱۲۶ سے ۱۴۰ تک) تو وہ قضائیہ سے متعلق دفعات پر نظر ثانی و تحقیق کا ذمہ دار تھا۔

کمیشن ۱۳ (۱۴۱ سے ۱۵۱ تک) عدالت عالیہ اور شورای نگہبان سے متعلق دفعات کے بارے میں تحقیق کا ذمہ دار تھا۔

کمیشنوں کا انتخاب اراکین کی حاضری کے رجسٹر میں اندراج کی تاریخ کے پیش نظر انجام پاتا تھا۔ اس طرح کہ نمائندہ اندراجات کی تکمیل کے بعد کسی ایک کمیشن کا ممبر بن جاتا تھا۔ البتہ اس میں مہارت کا خیال رکھا جاتا تھا پھر بھی اگر کسی کمیشن کے پانچ اراکین منتخب ہو چکے ہوں تو بقیہ اراکین کو دوسرے کمیشن کی ممبری قبول کرنا پڑتی۔ چنانچہ ۶۵ اراکین سے کمیشن مکمل ہو جاتے تھے۔ مگر آٹھ اراکین پھر بھی باقی رہ جاتے تھے۔ یہ اراکین ان افراد کی جگہ پر کرتے جو مجلس یا شورای دبیران کی ہیئت رئیسہ کے لئے منتخب ہو جاتے چونکہ وہ اراکین اپنے فرائض کی وجہ سے کمیشنوں میں حاضر ہونے سے معذور ہوتے۔

شورای دبیران :

شورای دبیران تیرہ کمیشنوں کے دبیروں (سیکریٹریوں)، ایک رئیس و نائب رئیس ایک محرر (شورای دبیران کی ہیئت رئیسہ) اور ہیئت رئیسہ مجلس کی طرف سے ایک سیکریٹری پر مشتمل ہوتی۔ سترہ اراکین پر مشتمل یہ شوریٰ کمیشنوں کی رپورٹوں کو ہم آہنگ بنانے کی ذمہ دار تھی اور ضروری تجویزیں ہیئت رئیسہ تک پہنچا دیتی۔

اس کے علاوہ دستور کی دفعات کے سلسلہ بحث و گفتگو اور مشورت کے دو دور (پہلا دور دونیوں کے لئے اور دوسرا ایک دن کا) اسی شورای دبیران میں انجام پاتے۔

مشوروں کے تین دور :

عارضی حکومت کی تجویز کے مطابق دستور اساسی کے دفعات سے متعلق تحقیقات کے لئے

مشوروں کے تین دور سات مرحلوں پر ہوتے تھے۔

(۱) پہلا دور، تیرہ کمیشنوں میں چار دنوں کے مشورے ہوتے جیسا کہ پہلے ہر کمیشن کی ذمہ داری بتائی جا چکی ہے۔

(۲) کمیشنوں کی رپورٹ چار روز بعد شورای دبیران میں پہنچائی جاتی۔ یہاں دو دنوں تک ترتیب و تنظیم کا کام انجام پاتا۔

(۳) شورای دبیران کی رپورٹ مجلس کے باقاعدہ علانیہ اجلاس میں پیش ہوتی اور مجلس ہر کمیشن کے لئے ایک دن کے حساب سے تیرہ دنوں میں پہلے مرحلے کی بحث و گفتگو انجام دیتی۔

(۴) مجلس کی کاروائی کی رپورٹ ایک مرتبہ پھر مذکورہ تقسیم کے ساتھ کمیشنوں کو واپس بھیجدی جاتی جہاں تیرہ کمیشن دو دنوں میں اپنا کام مکمل کر لیتے۔

(۵) کمیشنوں کی مشورت کے دوسرے مرحلے کی رپورٹ شورای دبیران کو بھیجی جاتی جو ایک دن کے اندر اپنا کام انجام دیتی۔

(۶) مشورت کا دوسرا دور مجلس کے باقاعدہ علانیہ اجلاس میں چھ دنوں تک چلتا۔

(۷) مشورے کا تیسرا دور صرف مجلس کے علانیہ اجلاس میں رائے گیری کے لئے آخری مرتبہ دو دنوں میں انجام پاتا۔ مشوروں کا مقصد اسلامی اصول و احکام اور دوسروں کی طرف سے پیش کی جانے والی تجویزوں کی بنیادوں پر تحقیق و اصلاح اور اراکین مجلس کے نظریات کو شامل کرنا تھا۔ نظام الاوقات کے مطابق ضروری تھا کہ پہلے سے معینہ تاریخ کے اندر تحقیق کا کام مکمل ہو جائے۔

تقسیم کار اور نظام الاوقات:

عارضی حکومت کی تجویز میں یہ طے پایا تھا کہ مجلس خبرگان کے افتتاح ہوتے ہی پہلے دن ایک عارضی ہیئت رئیسہ تشکیل پاتی جو عمر کے لحاظ سے اسپیکر، ڈپٹی اسپیکر اور دو جوان اراکین محرر کی حیثیت سے نیز ایک سیکریٹری پر مشتمل ہوتی جو اجلاس کی کاروائی کی نگرانی کرتی، پھر خفیہ رائے گیری کے ذریعہ پانچ افراد پر مشتمل مستقل ہیئت رئیسہ تشکیل دی جاتی

اس تجویز میں تیرہ کمیشنوں کے انتخاب اور حلف برداری کا طریق کار بھی مندرج تھا۔ ہر کمیشن پانچ اراکین پر مشتمل ہوتا اور مسودہ قانون کے ۱۵۱ دفعات کمیشنوں میں تقسیم کئے جاتے ہر کمیشن ایک رئیس ایک نائب، دو محرر، اور ایک سیکریٹری پر مشتمل ہوتا۔ مسودہ قانون تین مرحلوں میں پیش ہوتا تھا۔ اس طرح کہ ہر کمیشن اپنے متعلقہ دفعات کے امور چار دنوں میں مکمل کرتا۔ اس کے بعد شورای دبیران جو تیرہ کمیشنوں کے دبیروں (سیکریٹریوں) پر مشتمل ہوتی۔ دو دنوں میں تحقیقات مکمل کر کے اسے منظم کر لیتی۔ پھر مجلس میں پہلا دور تیرہ دنوں میں مکمل ہوتا۔ روزانہ ایک کمیشن کی رپورٹ پر، جسے اس کمیشن کا سیکریٹری پیش کرتا، غور و خوض ہوتا۔ چنانچہ پہلا مرحلہ گذارنے کے بعد رپورٹ پھر کمیشنوں کو واپس بھیجی جاتی تاکہ دوبارہ دو دنوں تک غور و خوض کریں۔ اس کے بعد ایک دن شورای دبیران اس پر کام کرتی۔ دوسرا دور مجلس کے علانیہ اجلاس میں چھ دنوں میں انجام پاتا۔ تیسرا دور جو آخری دور ہوتا، مجموعی طور پر تمام مسائل دو دنوں میں پیش ہوتے اور خفیہ رائے گیری انجام پاتی۔ رائے گیری کے چار طریقے ہوتے (ہاتھ اٹھانا، کھڑے ہونا اور بیٹھ جانا، کاغذ پر علانیہ رائے دینا،) دو اجلاس میں غیر حاضری اگلے اجلاس میں حق رائے دہی سے محروم کر دیتی تھی۔ اجلاس روزانہ دس گھنٹے بغیر چھٹی کے جاری رہتا۔ ہر روز مجلس کے اوقات میں سے کچھ وقت تقریروں کے لئے مقرر تھا۔ جو نمائندہ کسی اہم نکتہ کا اظہار کرنا چاہتا اسے مجلس کی کاروائی سے متعلق ایجنڈے کے مطابق اپنا نام درج کرنا پڑتا، نیز اپنی تقریر کا ایک نسخہ پہلے سے تیار کر کے ہیئت رئیسہ کے حوالے کرتا۔ ہر نمائندہ ایجنڈے کے مطابق کاروائی شروع ہونے سے پہلے زیادہ سے زیادہ ۱۵ منٹ تک تقریر کے اسٹیج سے استفادہ کر سکتا تھا۔ نمایندوں کو اپنی کرسی پر بیٹھ کر گفتگو کی اجازت نہ تھی۔ ہر باقاعدہ اجلاس میں کاروائی سے قبل پانچ نمائندے تقریر کر سکتے تھے جنہوں نے خود نام درج کرایا ہو۔ اور رئیس باری باری اجازت دیتا۔ نمایندوں کو اجلاس کی کاروائی کے موضوع سے ہٹ کر بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ نمائندوں کی موضوع سے خارج گفتگو پر رئیس یاد دہانی کراتا، پھر اگر مقرر موضوع سے ہٹ کر گفتگو جاری رکھے تو رئیس اسے نوٹس دے دیتا۔ اگر نمائندہ اس نوٹس پر بھی توجہ نہ دے تو مقرر کو تقریر سے روک دیا جاتا۔ ایسی صورت

میں نمایندہ کو اسٹیج سے اتر جانا پڑتا۔ مقرر کی تقریر کو رد کرنے کے لئے اہانت، غیر مربوط اور بُرے الفاظ کا استعمال، ذاتی توضیحات، ہر طرح کی ایسی حرکتیں اور شور شرابا جو مجلس کے نظم و ضبط کو نقصان پہنچائے، ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس بارے میں بھی اسپیکر پہلے یاد دہانی کراتے، پھر تنبیہ کرتے پھر بھی باز نہ آتے تو ایسے نمایندے کو رئیس کی دوسری تنبیہ کے بعد مجلس کے باقاعدہ اجلاس سے باہر نکال دیا جاتا اور اس دن مجلس میں داخلے پر پابندی لگ جاتی۔ بحث کے دوران اگر کسی نمایندے کی طرف غلط نسبت دی جاتی یا اس کے بیان یا عقیدہ کو الٹ پھیر کر پیش کیا جاتا تو اس نمایندے کو یہ حق حاصل تھا کہ غلط فہمی کے ازالے کی خاطر گفتگو کی اجازت لے۔ چنانچہ باری کے بغیر پانچ منٹ بولنے کی اجازت مل جاتی۔ اجلاس کے دوران نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لئے جو طریقے وضع ہوئے تھے۔ ان میں، یاد دہانی، تنبیہ، سرزنش وغیرہ شامل تھی۔ اجلاس کے نظم و ضبط کا خیال نہ رکھنے پر (یعنی بغیر اجازت بولنا، تقریر کے دوران موضوع کا خیال نہ رکھنا اور تقریر کے وقت کی رعایت نہ کرنے پر) رئیس مجلس کی جانب سے یاد دہانی عمل میں آتی۔ اگر نمائندہ نے رئیس کی یاد دھانی پر توجہ نہ دی تو رئیس تنبیہ کرتا اسی طرح اگر رئیس کی دوبارہ ہدایت پر نمایندہ توجہ نہ دیتا تو وہ مجلس سے نکال دیا جاتا۔ کمیشنوں کے اجلاس کے نظم و ضبط کی ذمہ داری مجلس کے علانیہ و باقاعدہ اجلاسوں کی طرح کمیشن کے سربراہ کے ذمہ ہوتی۔

(عارضی) حکومت اور شورای انقلاب کے پاس کردہ بل میں تحقیقات کے دوران مجلس شورای دبیران اور کمیشنوں کے لئے مفصل طریق کار دفعات ۲۰ سے لے کر ۳۲ میں بیان کر دیا گیا تھا لیکن چونکہ ان میں سے عملی طور پر استفادہ نہ کیا گیا اور مجلس خبرگان نے ان سے روگردانی کرتے ہوئے اپنے لئے دوسرا طریقہ کار اپنایا۔ لہٰذا ہم ان دفعات کو درج کرتے ہوئے زیادہ بحث سے گریز کریں گے (چونکہ گذشتہ صفحات میں اس قانون کے مفید اور ضروری حصے بطور اختصار بیان ہو چکے ہیں، لہٰذا عدم افادیت کے پیش نظر پورے قانون کا ترجمہ پیش نہیں کیا جا رہا ہے) ×

توحید
اسلامی، علمی، فکری دو ماہی رسالہ

جلد (۳) شمارہ (٦)

ترتیب

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس ۵۹۷
قم، جمہوری اسلامی ایران
فون : ۲۴۵۸۴

ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ / نومبر و دسمبر ۱۹۸۶ء

تاریخ:

فکر و فلسفہ

فقہ و قانون

نوٹ:

- ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔
- مجلہ توحید سے مضامین اخذ کرنے کی اجازت ہے مگر حوالہ شرط ہے۔

شذرہ

وحدت اسلامی اور شیطانی زبان و قلم

رہبر انقلاب اسلامی امام خمینی مدظلہ کے بیش بہا ارشادات عام مسلمانوں نیز حکومت و مملکت کے ذمہ داروں کے لئے ہمیشہ چراغ راہ بنتے رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً آپ نے اس انقلابی تحریک کو مشخص و معین نیز اسلامی روش سے ہمکنار کرتے ہوئے "راہ" کو "چاہ" سے جدا کیا ہے۔ ظاہر ہے ایک صحیح اسلامی قیادت اور ذمہ دار ولایت و فقاہت سے اسی بات کی توقع بھی کی جاتی ہے۔ گذشتہ ۲۵ برسوں کا تجربہ چاہے وہ اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل کا زمانہ رہا ہو یا اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد کی منزل ہو۔ اس بات کی صاف نشاندہی کرتا ہے کہ رہبر امت نے حساس ترین لحظات میں بھی اپنی خداداد ذہانت اور تدبر و فراست کے ذریعہ صحیح اسلامی راہوں کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی کر کے ہر ہر منزل میں اسلامی تحریک کی حفاظت و تقویت کا سامان فراہم کیا ہے۔

موجودہ اسلامی معاشرہ کی مہلک ترین بیماری جو عالم اسلام میں تفرقہ اور اختلاف آرائی کی صورت میں پروان چڑھ رہی ہے درد آشنا افراد سے پوشیدہ نہیں ہے اور اس کا علاج بھی دیگر بیماریوں سے ذرا زیادہ پیچیدہ لیکن بہت ضروری نظر آتا ہے۔ پیچیدہ اس لئے کہ راہ اسلام اور اسوۂ محمدی تو معین و مشخص ہے اور وہ لوگ جو اسلام سے سروکار نہیں رکھتے یا اسلام کے کھلے ہوئے دشمن ہیں، ان کی راہیں بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں ان دونوں میں تمیز پیدا کر لینا آسان ہے ہر شخص اپنے لئے ایک راہ منتخب کر کے دوسری راہ کو مسترد کر سکتا ہے ایک ایسا معرکہ جہاں اسلام کا کفر، نفاق یا التقاط سے مقابلہ ہو ایک نہ ایک دن لوگوں پر حقیقت کھل کر سامنے آہی جاتی ہے اور آنکھوں سے جہل و نادانی کے دھندلکے خود بہ خود چھٹ جاتے ہیں لیکن حق و باطل کا امتیاز اس وقت دشوار ہو جاتا ہے جب معرکہ ایسی طاقتوں کے درمیان چھڑ جاتا ہے جو اپنے آپ کو اسلام کا وفادار

ظاہر کرتی ہیں یعنی جب ایک ہی کلمہ پڑھنے والے ایک دوسرے سے دست و گریبان نظر آنے لگتے ہیں۔ دراصل اسلام و کفر یا مذہب و لامذہبیت کا مقابلہ معاشرہ کو سستی اور کاہلی میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ تحرک و استقامت کا جذبہ بیدار کرتا ہے اس کے برخلاف خود مسلمانوں کے درمیان اختلاف و انتشار کا پیدا ہوجانا معاشرہ کی تباہی اور سستی و پسماندگی کا باعث بن جاتا ہے اسی لئے اس مرض کی پیچیدگی کے باوجود اس کا علاج نہایت ہی ضروری ہے۔ قرآن نے بھی اس موذی مرض سے مسلمانوں کو ہوشیار کیا ہے: "واطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذہب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین" (انفال/۴۶) یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپسی اختلافات سے پرہیز کرو (ورنہ اگر ایسا نہ کیا) تو سستی میں مبتلا ہوجاؤ گے، تمہاری دھاک اور قوت تم سے رخصت ہوجائیگی، صبر کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یہ آیت عین اس آیت کے بعد نظر آتی ہے جس میں مسلمانوں کو یہ بات یاد دلائی گئی ہے کہ جب مومنین اپنے کسی مشترکہ دشمن سے مقابل ہوتے ہیں تو استقامت و جواں مردی کا ثبوت پیش کرتے ہیں اور اپنے خدا کو یاد کرتے رہتے ہیں تاکہ کامیاب و رستگار ہوں — "یا ایہا الذین آمنوا اذا لقیتم فئۃ فاثبتوا واذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون"

چنانچہ ان آیات سے نکلنے والے نتائج نہ صرف یہ کہ دلچسپی سے خالی نہیں ہیں بلکہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان میں مسلمانوں کو اپنے مشترکہ دشمن کے مقابلہ میں نہ صرف یہ کہ استقامت و یاد الٰہی سے کام لینے بلکہ آپس میں ہر طرح کے اختلاف و انتشار سے مکمل طور پر پرہیز کرنے کی دعوت بھی دی گئی ہے، انھیں "ید واحدۃ" کے مانند دشمن پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دیا گیا ہے اور اگر ایسا نہ کیا تو سستی و کمزوری میں مبتلا ہوکر شکست اسلام کا باعث بنتے نیز باطل کی کامیابی کی راہیں ہموار کرنے کا مرتکب قرار دیا گیا ہے۔

رہبر انقلاب اسلامی امام خمینی مدظلہ نے بھی اسی نکتہ کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا ہے، آپ نے فرمایا: "ہم اور آپ، اگر صحیح طور پر اپنی اسلامی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں تو سب کو ایک دوسرے کے ہمراہ قدم سے قدم ملاکر چلنا چاہئے . . . جس وقت تمام مسلمان متحد ہوجائیں گے ان کے اندر وہ قدرت و طاقت پیدا ہوجائے گی کہ ہر ہر منزل میں کامیابی ان کے قدم چومے گی اور بڑی سے بڑی دشواری کے مقابلہ کے لئے آمادہ و ایستادہ رہیں گے۔"

●

وہ افراد جو شیرازۂ وحدت کو پارہ پارہ کردینا چاہتے ہیں یقیناً اسلام دوست نہیں کہے جاسکتے نہ تو انھیں اسلام سے محبت ہے اور نہ ہی مسلمانوں کے موجودہ مسائل سے انھیں کوئی خلوص اور لگاؤ ہے۔ مسلمانوں پر مسلط استعماری ایجنٹ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا ہو اس لئے کہ مسلمانوں کا اتحاد، اسلامی ممالک سے ان کا

اور ان کے آقاؤں کا جنازہ نکال دے گا۔ امریکہ اور اسرائیل کے نمک خواروں کو نہ تو قبلۂ اول سے کوئی محبت ہے نہ فلسطینی اور لبنانی مسلمانوں کے مسئلہ سے انھیں کوئی دلچسپی ہے نہ تو انھیں افغانستان میں روسی جارحیت سے کوئی سروکار ہے نہ ہی بعثی حکومت کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بننے والے عراقی مسلمانوں سے انھیں کوئی ہمدردی ہے۔!!
یاد رکھئے اگر ہم ان مسائل کا کوئی مثبت حل چاہتے ہیں تو اس کے لئے "اسلامی وحدت" نہایت ہی ضروری ہے۔ وحدت اسلامی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے اور اختلاف و انتشار کو ہوا دینے والی زبانوں کو امام خمینی نے "شیطان کی زبان" سے تعبیر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: "آج اسلام کے دشمن ہر طرف مایوسی کا شکار ہیں،.... البتہ وہ اس بات سے مایوس نہیں ہیں کہ خود مسلمانوں کے اندر اختلافات پیدا کریں۔ یاد رکھئے یہ اختلاف جس کسی کی بھی زبان سے ظاہر ہو، اس کی زبان شیطان کی زبان ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی مقدس زبان کیوں نہ ہو، کسی نماز گزار یا معمر و بزرگ شخصیت کی زبان کیوں نہ ہو، یہ زبان بہرحال شیطان کی زبان ہے۔"
پتہ چلتا ہے کہ اختلاف و انتشار پیدا کرنے والے افراد خود مسلمانوں کے اندر موجود ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی مرد مقدس اور عابد شب زندہ دار کے بھیس میں مسلمانوں کے درمیان نفوذ پیدا کرنے کی کوشش کریں اور کر رہے ہوں۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف کو ہوا دینے والوں کی فریب کاریوں سے محفوظ رہیں۔ ان کو پہچانیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو ایسی زبانوں کو قطع کرنے سے بھی گریز نہ کریں۔ تفرقہ آرائی کرنے والا کوئی بھی ہو کسی بھی بھیس اور لباس میں کیوں نہ ہو، کیسے ہی عہدہ و منصب پر فائز کیوں نہ ہو بہرحال اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہے وہ جب بھی بولے گا شیطان کی زبان سے بولے گا لہٰذا ایسی زبانوں کو قطع کر دینا ہی مناسب بلکہ ضروری ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ شیطانی زبانوں کو پہچانیں اور ان کی زہر افشانیوں سے محفوظ رہیں۔

●

شیطان کی زبان سے بھی زیادہ خطرناک شیطان کا قلم ہوتا ہے چنانچہ جب کسی شیطان کا قلم زہر اگلنے لگتا ہے تو اس کا اثر نسلوں کی تباہی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں اجتماعی اور بین الاقوامی روابط کو استوار یا ناہموار کرنے میں قلم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کبھی کبھی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر بھی قلم وہ کام انجام دے ڈالتا ہے جو بڑے بڑے اجتماعات میں دھواں دھار تقریروں سے بھی نہیں ہو پاتا۔ قلم جو کچھ بھی چاہتا ہے صفحۂ قرطاس پر نقش کر دیتا ہے چونکہ اس کا مخاطب سامنے موجود نہیں ہوتا لہٰذا اس کے یہاں شرم حضوری بھی نہیں پائی جاتی۔ کسی کے روکنے ٹوکنے کا خوف نہیں ہوتا، بے باکی کے ساتھ جو چاہتا ہے لکھ ڈالتا ہے۔ اسی لئے لوگ قلم کو زبان سے زیادہ خطرناک خیال کرتے ہیں بلکہ اس کے خطرہ سے محفوظ رہنے کے لئے اکثر افراد بڑی بڑی قیمت دیکر اس کو خرید بھی لیا کرتے ہیں زبان کو کم سے کم مخاطب کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور اس کے سامنے اخلاقی بندش عارض رہتی ہے بولنے والے کو اپنی زبان کنٹرول میں رکھنی پڑتی ہے، ہر بات زبان پر جاری نہیں کی جا سکتی۔ اس کے برخلاف خریدا ہوا قلم نہایت ہی بے شرم اور بے حیا ہو جاتا ہے۔ قلم کو قابو میں رکھنا ذرا مشکل کام ہے یہی وجہ ہے کہ قلم سے لغزشیں بھی نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں — اگر قلم سے حمایت حق کا کام

لیا جائے تو یہی قلم اس قابل ہو جاتا ہے کہ خداوند عالم اس کی قسم کھاتا نظر آتا ہے۔ "ن، والقلم وما یسطرون" وہ قلم جو دین کی نصرت کرتا ہے اور صراط حق سے منحرف نہیں ہوتا اس کی عظمت "شہداء کے خون" سے بھی فزوں تر ہوتی ہے اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اور یہ اسی لئے ہے کہ قلم کو قابو میں رکھنا آسان نہیں ہے۔ یہ قلم جب عنان سے باہر ہوتا ہے تو اس کی مثال ایک سرکش گھوڑے کی مانند ہو جاتی ہے۔ ارادۂ انسانی سے خارج ہو کر شیطان کے قبضہ میں چلا جاتا ہے شیطان کے اشاروں پر حرکت کرتا ہے اور وقت کے شیطانوں کا زر خرید ملازم بن جاتا ہے۔ بظاہر مسلمان کے ہاتھ میں ہوتا ہے لیکن کام دشمنان اسلام کا انجام دیتا ہے جس پیغمبرؐ کا کلمہ پڑھتا ہے اسی کے جشن ولادت کو بدعت قرار دیدیتا ہے جس کی محبت کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے اسی کے مقاصد کو پامال کر دینا چاہتا ہے۔

●

زبان و قلم کی بہترین خدمت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ قوموں میں اتحاد و یگانگت کا ماحول پیدا کیا جائے۔ شیرازہ بندی سے نجات دلائی جائے۔ ایک خدا اور ایک رسولؐ کا کلمہ پڑھنے والوں کے درمیان وحدت کی فضا ہموار کی جائے۔ وہ صاحبان زبان و قلم، جو اختلاف و انتشار کے بیج بوتے ہیں انھیں خالق زبان و قلم کے سامنے جواب دینا ہوگا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حق کو اشخاص کے ذریعہ تشخیص دینے کی روش کو ترک کریں اور اشخاص کو ان کی تحریر و تقریر کے آئینہ میں پرکھیں اور ان کے بارہ میں فیصلہ کریں۔ امیرالمومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے: "اعرف الحق تعرف اھلہ" پہلے حق کی معرفت حاصل کرو پھر یہ فیصلہ کرو کہ کون واقعی حق پر ہے۔ لھٰذا ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ کون اتحاد و وحدت کی بات کر رہا ہے اور کون تفرقہ اندازی کے بیج بو رہا ہے، خود بخود فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ زبان و قلم رحمانی ہے یا شیطانی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص زبان و قلم سے کام لیتے وقت اس بات کی طرف خود بھی متوجہ نہ ہو کہ وہ کس رخ پر کارفرما ہے ہو سکتا ہے کہ ایک غلط کام صحیح سمجھ کر انجام دے رہا ہو ایسی صورت میں ہمارا فرض ہے کہ افہام و تفہیم سے کام لیں غلطی کی طرف متوجہ کریں کیونکہ اصلاح اختلاف سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اور حفظ وحدت بہرحال ہر چیز پر مقدم ہے اس لئے کہ حفظ اسلام کے لئے حفظ وحدت ضروری ہے ؛؛

- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

۔ مرتضیٰ حسین ۔

اَوْ کَالَّذِیْ
مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ وَّھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ
اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ قَالَ کَمْ
لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَۃَ
عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَشَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّہْ وَانْظُرْ
اِلٰی حِمَارِکَ وَلِنَجْعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ
کَیْفَ نُنْشِزُھَا ثُمَّ نَکْسُوْھَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗ قَالَ اَعْلَمُ
اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

ترجمہ:

یا اس شخص کی طرح جو ایک بستی سے گذرا، اور وہ بستی جس کے مکان اپنی چھتوں پر گر چکے تھے، اس بندۂ خدا نے کہا: اس بستی کو فنا ہونے کے بعد کیوں کر زندہ کرے گا؟ اس پر اللہ نے اسے سو برس تک مردہ رکھا۔ پھر اس نے اس کو زندگی بخشی۔ کہا: تم یہاں کتنی مدت رہے؟ اس نے کہا: ایک دن رہا ہوں گا یا ایک دن سے کم! اللہ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم سو برس اس حالت میں رہے ہو۔ اب ذرا اپنے کھانے پینے کے سامان کو تو دیکھو، وہ نہیں سڑا ہے۔ اور (اپنی سواری) گدھے کو دیکھو (خاک کا ڈھیر بن چکا ہے) اور ہم نے لوگوں کے لئے تمھیں نمونہ قرار دینا چاہا ہے۔ اور (گدھے کی) ہڈیوں کو دیکھو، ہم انھیں کس طرح اٹھا کر ترکیب دیتے اور پھر ان کو گوشت کا لباس پہناتے ہیں۔ پھر جب یہ حال ظاہر ہوا (تو انھوں نے کہا: میں یقین (کامل) رکھتا ہوں۔ بلا شبہ اللہ ہر چیز پر

پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔ (۲۵۹)

تفسیر:

ابراہیم علیہ السلام کی دلیل صحیح تھی، یہ بات بالکل درست ہے کہ اللہ، مردے کو زندہ کر سکتا ہے۔ اس دنیا کو مکمل فنا کے بعد دوبارہ زندہ کرنا، حشر و نشر ہے۔ مگر اس سے پہلے بھی یہ واقعہ قابل توجہ ہے کہ عزیر نبی، بیت المقدس (یا کسی اور آبادی) کی طرف سے ہو کر گذرے۔ عزیر نبی نے شہر کے کھنڈر دیکھ کر قدرت کا مظاہرہ دیکھنا چاہا، ان کی نیت نیک تھی۔ وہ اثبات توحید کے لیے ایک شاہدہ کے طلب گار ہوے۔ اللہ نے چاہا کہ یہ حالت خود ان پر گذر جائے کہ وہ برگزیدۂ رب تھے چنانچہ انھیں موت نے سلا دیا۔ سو برس بعد اللہ نے انھیں دوبارہ زندگی بخشی، پھر ان کے سامنے دو حقیقتیں موجود تھیں، ان کا گدھا جس پر وہ سفر کر رہے تھے۔ اور کھانا پانی جو ان کے ساتھ تھا، ایک سڑ گل کر مٹی کا ڈھیر تھا، دوسری چیزیں اسی طرح تازہ بحکم خدا سے ہڈیاں جڑیں، ڈھانچہ کھڑا ہوا۔ گوشت پوست کا وہی جسم تیار ہو کر زندہ ہو گیا۔ اس مشاہدے سے حضرت عزیر کا علم عقیدۂ غیب مشاہدۂ حضور کے مطابق ہو گیا۔ اور قرآن کے اس بیان کے بعد ان متقین کے لیے بھی خدا کی قدرت کا ظہور، ایمان بالغیب کے استحکام کا باعث ہے۔

اس واقعہ سے "قیامت" اور حشر و نشر و رجعت پر استدلال کیا جاتا ہے۔

چوں کہ قرآن کا مقصد ہدایت ہے اس لیے وہ نام اور تاریخ کے جزئیات سے بحث نہیں کرتا۔ اہل تفسیر کہتے ہیں کہ "بخت نصر" بابل کا بادشاہ تھا، اس نے یہودیوں کو تہہ تیغ کر کے یروشلم کو تباہ کر دیا تھا، شاید اسی عہد میں کسی شہر (بیت المقدس) پر خدا نے کوئی طوفان یا عذاب مسلط کیا، جس سے شہر کے سب باشندے مر گئے، مکان گر گئے، چھتیں بیٹھ گئیں، اور بستی سو برس تک ویران رہی۔ عزیر نبی نے اسی بستی کو ایک صدی بعد آباد دیکھا۔ بخت نصر شاہ بابل نے فلسطین فتح کیا تو یہود کو تباہ کر دیا، اس کے بعد گشتاسپ نے وہ علاقہ فتح کیا اور یہودیوں کو امن و امان ملی، انھوں نے حضرت عزیر کی بدولت چلی ہوئی اور گم شدہ تورات جمع کی۔

درس یہ ہے کہ مردوں کو زندہ کرنا اللہ کے لیے دشوار و محال نہیں ہے۔

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیۡ كَيۡفَ تُحۡىِ الۡمَوۡتٰى‌ؕ قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ‌ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰـكِنۡ لِّيَطۡمَئِنَّ قَلۡبِىۡ‌ؕ قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّيۡرِ فَصُرۡهُنَّ اِلَيۡكَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُهُنَّ يَاۡتِيۡنَكَ سَعۡيًا‌ؕ وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۶۰﴾

ترجمہ:

اور جب ابراہیمؑ نے کہا: پروردگار (رب) مجھے (یہ) دکھادے کہ تو مردے کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ اللہ نے فرمایا: کیا تمھیں اس کا یقین نہیں ہے؟ انھوں نے کہا بالکل ہے، لیکن اپنے دل کی تسکین چاہتا ہوں۔ (اللہ نے) حکم دیا، پھر چار پرندے لو انھیں مانوس کر لو، اس کے بعد ہر پہاڑی پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو۔ پھر ان کو بلاؤ وہ تمہارے پاس تیزی سے (اڑکر) آئیں گے اور یہ سمجھ لو کہ اللہ بہت با اقتدار اور حکیم ہے (۲۶۰)

تفسیر:

عزیز نبی نے ویران بستی کو دیکھ کر مردوں کے زندہ ہونے کی آرزو کی تھی، اللہ نے ان کو موت کی نیند سلا کر، مدت کے بعد زندہ کر کے، ناشتے اور کھانے پینے کا سامان اور سواری کا جانور اور دونوں کی حالت دکھا کر ان کے عقیدے کو مشاہدے کے مطابق کر دکھایا۔ عزیزؑ ہی کے لئے یہ قدرت نمائی نہیں ہوئی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ بھی اس منزل سے شرفیاب ہوئے۔

حضرت ابراہیم بت شکن تھے۔ نمرود سے وہ اللہ کے محی و ممیت ہونے کو ثبوت توحید میں پیش کر چکے۔ ان کے عقائد کی استواری شروع سے آخر تک قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اس لئے ان کا قیاس عام فکر و نظر کے آدمی پر کرنا غلطی ہے۔ قرآن میں کوئی اشارہ ایسا نہیں جس سے خلیل اللہ کے کسی نقص

علم وعقیدہ پر ذہن جا سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ۔

جناب ابراہیمؑ نے اپنے ایمان کامل کو مشاہداتی علم و یقین سے آراستہ کرنے کی تمنا کا اظہار کیا تھا اور اللہ نے کسی ناپسندیدگی کے بغیر خود ان کے ہاتھوں یہ تجربہ کروایا حکم دیا کہ چار پرندے لو، انھیں اپنے آپ سے مانوس کرلو، پھر انھیں ٹکڑے کردو اور ان کے اجزا پہاڑوں پر رکھ دو۔ احادیث اہل بیتؑ کے مطابق جناب ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا، دس پہاڑیوں پر ان پرندوں کے اجزا رکھدیے اور چاروں کی چونچیں اپنے ہاتھ میں رکھیں اس کے بعد ایک ایک کو صدا دی، وہی آواز جس سے وہ مانوس تھے۔ ہر پرندے کے اجزاء اڑتے ہوئے اپنے سر سے مل کر زندہ ہو گئے۔ یوں جناب ابراہیمؑ نے اپنے رب کی لاجواب قدرت جس کا یقین تھا اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اور اللہ نے عام تک کرنے والوں سے کہا کہ میں "عزیز" ہوں میرے اقتدار کی کوئی حد نہیں۔ اور چار پرندوں کے ٹکڑوں کا دس پہاڑوں پر رکھا جانا اللہ کے حکیم ہونے کا ثبوت ہے یعنی اس کا علم وحکیمانہ معاملات عام ادراک بشر سے ماوراء ہیں، اسے صاحب عین الیقین ہی جانتے ہیں۔ جیسے وجود مکہ کا علم تو ہر شخص کو ہے لیکن جس نے حج کیا ہے بلا تشبیہ اس کا علم ایک اور کیفیت رکھتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ: مثال ان کی جو اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں، اس دانے کی مثال ہے جو سات بالیاں نکالے، ہر بالی میں سو دانے ہوں، اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے۔ اور اللہ وسعتوں والا بہت علم والا ہے (۲۶۱)

تفسیر:

یہاں سے تقریباً بیس آتیں "سرمایہ" کے بارے میں ہیں۔ آیت نمبر دو سو چوالیس میں بھی دولت کے استعمال کا ایک تذکرہ گذر چکا ہے۔

دولت ۔ سرمایہ ۔ انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت بھی ہے اور بنیاد تباہی بھی۔ کسی کے پاس زندگی گذارنے اور فراغت حاصل کرنے کے لیے پیسہ نہ ہو تو اس کی زندگی وبال ہے اور کسی کے پاس دولت رکھنے کا ٹھکانا نہ ہو اس کی دولت بھی فساد ہے۔ اس مشکل کا ایک حل یہ تھا کہ تمام دولت ایک کمیٹی یا حکومت ضبط کر لے اور وہی تمام افراد کو حصہ رسدی تقسیم کرے؟ ایک حل یہ ہے کہ ہر شخص اپنی کد و کاوش سے با اصول و قواعد جو کچھ کمائے وہ اس کی ملکیت ہے۔

اس سے ٹیکس وصول کیے جائیں، رفاہی کاموں کی سفارش کی جائے یہ دونوں تجربے ناکام ہو چکے کیونکہ ان کی اساس غلط تھی۔

قرآن مجید نے ہدایت کی ہے کہ تمام معاملات کی بنیاد ایمان باللہ اور تقویٰ پر رکھو، سعی و کوشش کرو۔ نیکی کرو، قیامت آئے گی اور وہاں یہ دولت وبال ثابت ہو گی۔ یعنی اسلام نے ارتکاز دولت کو قابلِ مذمت اور خلاف تقویٰ قرار دے کر اس کے استعمال و خرچ پر زور دیا۔ مال کا راہ خدا میں خرچ کرنا۔ گویا خدا کو قرض دینا ہے اور خدا اس دولت کو کئی گنا کر کے واپس کرے گا۔ اب جو شخص یا معاشرہ، خدا، رسول، امام، کتاب، حشر و نشر کو نہیں مانتا وہ تجربہ در تجربہ کر کے دیکھ لے، نظامِ زر پر قابو حاصل نہ کر سکے گا۔

آیتِ زیرِ نظر میں، اللہ نے اپنے ماننے والوں سے دولت خرچ کرنے کی بات کی ہے اور جو لوگ، انسان کو محتاج سمجھ کر نہیں بلکہ خدا کی رضا کی خاطر دولت دیتے ہیں، جو فلاح بشر کا کام جہاد فی سبیل اللہ سمجھ کر انجام دیتے ہیں وہ ایسا بیج بن جاتے ہیں، جس سے سات بالیاں ہزار ہا سے سو دانے نکلیں۔ پھر اللہ جتنا چاہے اضافہ بھی کر دے۔ گویا راہ خدا میں دولت خرچ کرنے والا۔ حیات آفریں پودا ہے جو خود نشو و نما پاتا ہے اور دوسروں کو پھل دیتا ہے، وہ تخم ثمر آفریں ہے کہ خود فنا ہو جاتا ہے مگر اپنے جیسے اور پیدا کر جاتا ہے۔ بشرطیکہ:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ

اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ
رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ
وَّمَغْفِرَۃٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَۃٍ یَّتْبَعُھَآ اَذًی وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ۝

ترجمہ:

جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر جو کچھ خرچ کر چکے، نہ احسان جتاتے ہیں نہ دکھ دیتے ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر (صلہ) ہے اور ان کو نہ خوف ہوگا، اور نہ وہ لوگ غمگین ہوں گے (۲۶۲) نرم بات اور درگذر اس داد و دہش سے بہتر ہے جس کے بعد ستانا ہو، اور اللہ بے نیاز، بردبار ہے۔ (۲۶۳)

تفسیر:

راہ خدا میں مال کا خرچ کرنا مسلمانوں کی صفت ہے یہ خصوصیت اسلامی معاشرے کی خصوصیت ہونا چاہئے اور جس کام یا جس شخص سے حسن سلوک کیا جائے چونکہ فی اللہ اور للہ ہے لہٰذا احسان جتانا، بڑائی ظاہر کرنا، لینے والے کو سبک و حقیر سمجھنا خلاف ضابطہ بات ہے۔ خدا کے لیے مال دینے اور لوگوں کو ممنون نہ سمجھنے والے، قیامت کے دن عذاب سے بے خوف اور غضب رب کے غم میں مبتلا نہ ہوں گے۔

۲۶۳۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَۃٌ خَیْرٌ.......

کچھ دے کر احسان جتانے اور نفسیاتی دکھ پہنچانے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی شیریں زبانی اور تحمل کے ساتھ حاجت مند کو رخصت کر دے ۔ اللہ بے نیاز اور حلیم ہے ۔ اسے اپنی مخلوق کی توہین مخلوق کے ہاتھ پسند نہیں ہے ۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی
کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٢٦٤﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِنْ لَمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾

ترجمہ:

ایمان لانے والو! راہ خدا میں اپنے دیے ہوئے مال کو احسان جتانے اور اذیت دینے سے ضائع نہ کرو۔ جیسے وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ قیامت پر۔ اس کی مثال، اس چٹان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی ہو۔ پھر اس پر زور کا مینہ پڑے اور اسے صفاچٹ چھوڑ جائے (ان لوگوں نے) جو کچھ کیا اس کا (ثواب) حاصل نہ کر سکیں گے (اور اللہ کافروں کی رہنمائی نہیں فرماتا (۲۶۴) اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال کو خدا کی خوشنودی اور اپنے عقیدہ و فکر) کو استوار کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں، ایسی ہے جیسے بلندی پر کوئی باغ ہو اس پر زور کا پانی برسا تو اپنے دوگنے پھل لایا۔ اور اگر زور کا پانی نہ بھی پڑا تو پھوار ہی کافی ہوئی۔ اور اللہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے (۲۶۵)

تفسیر:

مومن و غیر مومن کے عمل میں فرق ہونا چاہیے۔ غیر مومن دکھاوے کے لیے عمل کرتا۔ ریا تو شرک ہے۔ اور دکھاوے کی بھلائی اور خیرات کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چٹان پر مٹی کی تہہ دیکھ کر بیج ڈال دے کہ پانی برسے گا تو اکھوا پھوٹے گا، مگر جب پانی برسا تو بیج بہہ گیا، مٹی دھل گئی

شاں چمکنے لگی۔ جب دانہ ہی نہ رہا تو حاصل کیا ہو۔ جو اللہ کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے تو اس کی ہدایت ان تک کیا پہنچے۔

۲۶۵۔ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ ...

جو لوگ قربۃً الی اللہ، اور اس کے احکام کے مطابق اپنا مال صرف کرتے اور لوگوں کو دیتے ہیں، وہ اپنی خالص نیت پر قائم رہتے ہیں۔ وہ اس باغ کی طرح ہیں جو عمدہ زمین اور بلند جگہ پر اگا ہو، سورج کی براہ راست حرارت حاصل کرتا ہو، زور کا پانی برسے تو زمین کی قوتیں ابھر کر پھلوں کو دوگنا کر دیں۔ زیادہ پانی نہ بھی برسے جب بھی فصل اچھی دیتا ہے۔

واقعہ ہے کہ جو لوگ نمود و نمائش کے لیے کام کرتے ہیں نہ خدا ان سے خوش ہوتا ہے نہ بندے اس سے راضی ہوتے ہیں اور اس کا کیا دھرا اکارت ہو جاتا ہے اور جو لوگ خدا کے لیے دولت صرف کرتے ہیں ان کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے، کوئی داد نہ دے تو اچھا، ہاتھ کی ہاتھ کو خبر نہ ہو تو بہتر ہے کیونکہ دیکھنے والا تو دیکھ رہا۔ اسلام ایسے ہی مخیر افراد دیکھنا چاہتا ہے جو اپنے نام اور اپنے سرمایے پر، اللہ کی مرضی کو ترجیح دیں۔ ایسے افراد نہال ہوتے اور اللہ کے یہاں پھل پاتے ہیں اور ان کے بے لوث کردار سے دوسرے صالح افراد پیدا ہوتے ہیں۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ
أَن تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ
ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ
كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾

ترجمہ:
بھلا تم میں کوئی بھی یہ پسند کرے گا کہ اس کی ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں کا باغ

ہو، ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔ اس کے لیے باغ میں طرح طرح کے میوے ہوں۔
اور اس پر بڑھاپا آچکا ہو، اور اس کی تنگ حال (یا کم سن) اولاد ہو۔ استنے میں باغ
پر ایسا بگولا آپڑا جس میں آگ تھی کہ وہ باغ جل گیا۔ اس طرح اپنی آیتیں واضح کرتا ہے کہ
تم سوچ سمجھ سے کام لو (۲۶۶)

تفسیر:

دکھاوے کے لیے دولت کا غربا کو دینا یا کسی کی امداد کر کے احسان جتانا اور دکھ پہنچانا ایسا ہے، جیسے کوئی شخص جوانی میں بڑے ذوق شوق سے باغ لگائے، بڑھاپے میں جب اس کے پھل کھانے کا وقت آئے اور چھوٹے بڑے ضرورت مند بچے اس کی آمدنی کی آس لگائیں۔ اچانک باد سموم کا بگولہ درختوں کو جلا دے اور بیلوں کو تہ و بالا کر دے۔

ہر عقل مند یہ چاہے گا کہ زندگی آسودگی سے گذارے۔ خود بھی کھائے اور بعد میں اولاد بھی نفع کمائے۔ راہ خدا میں فقط اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے والا ایسا باغ لگاتا ہے جس کے پھل وقت حساب کتاب اسے بھی ملتے ہیں اور اس کے صدقہ جاریہ کو برقرار رکھنے کے صلے میں اس کی اولاد بھی بخشی جاتی ہے۔ اور دنیا کا مال آخرت میں کام آتا ہے۔ لیکن اگر یہی باغ لگایا اور دولت کے بیج غریبوں میں بوئے، مگر نیت بری اور کردار اذیت رساں ہو تو لگا لگایا باغ ریا کی آندھی اور اذیت رسانی کی آگ سے خود ہی نذر آتش کر دیا۔

یہ مثالیں، یا یہ احکام و ہدایات ایسے ہیں جن پر آدمی کو سوچنا چاہیے اس سے تقوے اور نیت خالص کے دروازے کھلتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا
أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ
تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ ۚ وَاعْلَمُوا
أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۞ الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ

وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِّنْهُ
وَفَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ يُؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ
وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ
اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

ترجمہ:

ایمان لانے والو! اپنی طیّب (حلال) کمائی میں سے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیداوار دی ہے اس میں سے (راہِ خدا میں) خرچ کرو۔ اور (راہِ خدا میں) خرچ کرنے کے لیے ناجائز آمدنی کا قصد نہ کرو جبکہ ایسا مال تم خود لینے کے روادار نہیں ہو اور بات ہے کہ تم اس میں چشم پوشی کر جاؤ۔ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز، قابلِ حمد ہے (۲۶۷) شیطان تم کو وعدہ (وعید) دیتا ہے تنگدستی کا اور تم کو حکم دیتا ہے بے حیائی کا۔ اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی بخشش اور فضل کا۔ اور اللہ بڑی وسعتوں کا مالک ہے۔ سب کچھ جانتا ہے (۲۶۸) وہ جس کو چاہے حکمت عطا فرماتا ہے۔ اور جسے حکمت ملی اسے خیرِ کثیر دی گئی۔ اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (۲۶۹)

۲۶۷۔ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا....

ایک مرتبہ پھر اہلِ تقویٰ پر تاکید ہے کہ "انفاق" کریں، امید یہی ہے کہ ان کی کمائی طیب ہوگی۔ دستکاری یا تجارت، مزدوری یا کاروبار۔ کاشتکاری ہو یا باغبانی۔ جو چیز اپنے بھائی کو دو تو ایسی دو جو تم اپنے لیے پسند کرو۔ طیب اور عمدہ۔

امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا کہ عہدِ سرورِ کائنات ؐ میں لوگ اپنے باغوں کے گھٹیا خرمے اور کھجوریں غربا کو دیا کرتے تھے۔ آج بھی دکان دار اور باغبان یہی کرتے ہیں۔ آیت میں ان لوگوں کو چشم نمائی کی گئی ہے۔

ہدایت یہی ہے کہ، انفاق میں جسے کچھ دو طیّب، پاک، حلال اور عمدہ ہو۔
تمہارے "انفاق" سے تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اللہ تو بے نیاز ہے، وہ تو حمید ہے سب اس کی حمد و ثنا کرتے ہی ہیں۔

تمہارے "انفاق" سے تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اللہ تو بے نیاز ہے، وہ تو حمید ہے سب اس کی حمد و ثنا کرتے ہی ہیں۔

۲۶۸۔ اَلشَّیْطَانُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ ۔۔۔۔

سرمایہ دار "انفاق فی سبیل اللہ" سے بچتا ہے کہ دولت ختم ہو جائے گی۔ یہ سرمایہ بڑی مشکل سے جمع کیا ہے۔ کہیں ہاتھ سے جاتا نہ رہے۔ ادھر سینما، جوا اور بے شمار بے ہودہ و مہمل مشغلوں میں اس سے زیادہ لٹا دیتا ہے۔ وہ شیطان کی باتیں تھیں جن پر عمل کیا اور یہ نہ سوچا کہ سچے وعدے والا اللہ مغفرت و فضل کا وعدہ فرماتا ہے۔ اس غنی کا حکم مانو وہ تمہارے دل غنی کر دے گا، اس معبود و محمود کی رضا حاصل کرو، قیامت کے دن شکر گذار بندوں میں شمار ہو گے۔

۲۶۹۔ یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۔۔۔۔

انفاق کی طرح "حکمت" بھی قرآن مجید کی اصطلاح ہے اور اس لفظ کا قرآنی استعمال عموماً "الکتاب" کے ساتھ ہے۔ تقریباً بیس مرتبہ "حکمت" کا تذکرہ ہے اور مجموعی مفہوم ہے "وہ قوت ادراک حق و باطل میں امتیاز کرتی ہے۔" احکام خدا، دریافت رضائے الٰہی۔ دانش اور سمجھ۔ حدیث میں ہے:۔ "انا دار الحکمۃ و علی بابھا" میں حکمت کا شہر اور علی اس شہر کا دروازہ ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ صادق آل محمدؑ نے فرمایا "حکمت، معرفت و فقہ دین کا نام ہے" کافی کی صحیح روایت ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا: "اطاعت الٰہی و معرفت امام" حکمت ہے۔

"من یشاء" جسے چاہے کا مطلب یہ ہے کہ جو بندے صفائے خاطر، توجہ الی اللہ، اور احکام قرآن سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ ان کی استعداد ملاحظہ فرما کر اپنی حکمت سے انھیں حکمت دیتا ہے اور جسے خدا کی طرف سے حکمت مل جائے اسے بے حساب برکت علم و عمل مل جاتی ہے۔

یہ آیت بطور کلیہ ہے۔ اس سلسلے میں توجہ دلاتی ہے کہ انفاق طیّب اور اللہ کے وعدے

پر یقین رکھ کر فقر و افلاس کا تصور چھوڑ دینا اور راہ خدا میں مال صرف کرنا حکمت ہے اور یہ نکتہ وہی سمجھ سکتے ہیں جن کی عقل اور ادراک اہل ایمان کی عقل ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

ترجمہ:

جو چیز تم خرچ (انفاق) کرتے یا جس چیز کی تم نذر کرتے ہو۔ اللہ اسے جانتا ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں (۲۷۰)

تفسیر:

مومن اپنے مال میں سے جو بھی راہ خدا میں دیتا ہے اللہ اسے جانتا ہے۔ اس لیے روپیہ پیسہ ہو یا غلہ اناج، مویشی ہوں یا لباس یوں ہی دینا ہو یا نذر، ہمیشہ اچھا مال اور طیب و حلال چیز دو۔ جو لوگ غلط چیزیں، حرام و خبیث مال دیتے یا غربا کو محروم رکھتے ہیں انھیں یقین رکھنا چاہئے کہ وہ لوگ اس دن مددگار و امداد سے محروم رہیں گے جس دن سب کو نصرت درکار ہوگی ۔۔ شریعت میں نذر کی شرط یہ ہے کہ قربۃً الی اللہ اور جائز ہو اور کہا جائے "للہ علیّ" میں یہ کروں گا یا نہیں کروں گا"۔ شفا پا گیا تو للہ علیّ (اللہ کے لیے مجھ پر لازم ہے) کہ دسترخوان کروں گا۔ مثلاً۔ جو نذر خدا کے لیے کی جائے اس کا ثواب کسی کو بھی ہدیہ کیا جا سکتا ہے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

ترجمہ:

اگر خیر خیرات ظاہر کر کے دو، تو اچھا ہے اور اگر اس کو چھپا کر اور حاجت مندوں

کو پہنچاؤ تو وہ تمہارے حق میں بہتر ہے، اور اللہ تمہارے گناہوں کے ایک حصے کا عوض
کردے گا (بخشش دے گا) اور تم جو بھی کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے (۲۷۱)

تفسیر:

انفاق فی سبیل اللہ، بجائے خود ایک اچھا عمل ہے، یہ عمل سب کے سامنے ہو تو بہتر ہے اس سے
معاشرے میں بھلائی کی تشویق ہوتی ہے۔ علانیہ نہ ہو تاکہ محتاج کی آنکھ نیچی نہ ہو اس سے تمہاری برائی
ثابت ہوگی۔ بہرحال داد و دہش گناہوں کا کفارہ ہے۔ مگر نیت اللہ کے لیے ہو۔ اللہ سے
کوئی چیز چھپی نہیں ہے۔

تقابلی مطالعہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

فصل ششم

احکام قضاء

گیارہ باب :

ا۔ روزوں کی قضا کے درمیان وقفہ جائز ہے۔
ب۔ اگر کسی نے غروب آفتاب کا گمان کر کے روزہ کھول لیا تو اس روزہ کی قضا واجب ہے۔
ج۔ اگر کسی نے غروب آفتاب کا گمان کر کے روزہ کھول لیا تو اس روزہ کی قضا واجب نہیں ہے۔
د۔ حائض پر روزہ کی قضا واجب ہے لیکن نماز کی نہیں۔
ھ۔ مستحب روزہ کو توڑنے والا اس کی قضا کرے گا۔
و۔ جس نے قضاء رمضان میں اتنی تاخیر کی کہ دوسرا ماہ رمضان آگیا تو اس پر قضا و اطعام دونوں واجب ہے۔
ز۔ جو شخص دوسرا ماہ رمضان آنے تک قضا رکھنے سے معذور ہو اس پر صرف اطعام واجب ہے قضا نہیں۔

ح۔ مردے کی قضا اس کے وارث کے ذمہ ہے۔
ط۔ ذی الحجہ کے دس دنوں میں قضا روزے رکھنا مکروہ ہے۔
ی۔ قضا کو ادا کرنے سے پہلے مستحبی روزے رکھنا منع ہے۔
ک۔ اگر مضمضہ کرتے وقت پانی حلق میں پہنچ جائے تو اس کی قضا واجب نہیں بشرطیکہ وہ مضمضہ واجب وضو کے لئے ہو ورنہ قضا واجب ہے۔

قضا میں وقفہ جائز ہے

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ محمد بن يعقوب، عن عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد، عن عثمان بن عيسى، عن سماعة، قال: سألته عمَّن يقضي شهر رمضان منقطعاً. قال: إذا حفظ أيامه فلا بأس[1].

١۔ .... سماعہ کہتے ہیں میں نے آپؑ سے دریافت کیا: کیا ماہ رمضان کے روزوں کی قضا کے درمیان وقفہ جائز ہے؟ آپ نے فرمایا، اگر دن یاد ہوں تو کوئی حرج نہیں۔

٢ ــ محمد بن الحسن بإسناده عن الحسين بن سعيد، عن حماد، عن عبدالله بن المغيرة، عن ابن سنان (يعني عبدالله) عن أبي عبدالله(ع) قال: من أفطر شيئاً من شهر رمضان في عذر، فإنْ قضاه متتابعاً فهو (كان) أفضل وإنْ قضاه متفرقاً فحسن. وروي في الكافي مثله باختلاف يسير في الألفاظ، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن حماد مثله[2].

٢۔ .... ابن سنان امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا: اگر کسی شخص نے ماہ رمضان میں کسی عذر سے روزے نہ رکھے تو ان روزوں کی قضا پے در پے افضل ہے۔ اور اگر وقفہ وقفہ سے رکھے تو حسن ہے۔ ....

....

روایت اہل سنت:

١ ــ أخبرنا أبوبكربن الحسن القاضي وأبوزكريابن أبي اسحاق قالا: حدثنا أبوالعباس محمدبن يعقوب، حدثنا بحربن نصر، قال: قرئ على عبدالله بن وهب أخبرك أبوحسين رجل من أهل الكوفة، قال: سمعت موسى بن عقبة يحدث عن صالح بن كيسان، قال: قيل يا رسول الله رجل كان عليه قضاء من رمضان فقضى يوماً أو يومين منقطعين أيجزئ عنه؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أرايت لوكان عليه دين فقضاه درهماً ودرهمين حتى يقضي دينه أترون ذمته برئت. قال: نعم. قال: يقضي عنه۳. وروى الدارقطني نحوه بإسنادين، وذكر في جواز التقطيع أحاديث۴.

۱ ...... صالح بن کیسان کا بیان ہے کہ: رسول خداؐ کی خدمت میں عرض کیا گیا: یارسول اللہ! ایک شخص پر ماہ رمضان کی قضا تھی چنانچہ اس نے ایک دو دن کے وقفہ سے قضا روزے رکھے، کیا اس کے روزے صحیح ہیں؟ رسول خداؐ نے فرمایا: اگر کوئی شخص مقروض ہو اور ایک ایک دو دو درہم کرکے قرض ادا کرے تو تمہارے خیال میں وہ بار قرض سے سبک دوش ہو گا یا نہیں؟ عرض کیا: ہاں! حضرتؐ نے فرمایا: اس کے روزے بھی ادا ہو جائیں گے ....

جس نے غروب آفتاب کا گمان کرکے افطار کر لیا اس دن کی قضا کرے گا

روایت اہل بیتؑ:

١ ــ محمدبن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن محمدبن عيسى بن عبيد، عن يونس، عن أبي بصير وسماعة، عن أبي عبدالله(ع) في قوم صاموا شهر رمضان فغشيهم سحاب أسود عند غروب الشمس فرأوا أنه الليل فأفطر بعضهم ثم ان السحاب انجلى فإذا الشمس، فقال: على الذي أفطر صيام ذلك. ان الله عزوجل يقول: «وأتموا الصيام الى الليل»، فمن أكل قبل أن يدخل الليل فعلية قضاؤه نه أكل متعمداً. ونقل الاستبصار هذا الحديث عن الكافي، ونحوه مارواه في الكافي، عن محمدبن يحيى، عن أحمدبن محمد، عن عثمان بن عيسى، عن سماعة. ونقله في البحار، عن العياشي، عن أبي بصير۵.

۱۔ . . . . ابو بصیر و سماعہ امام صادقؑ سے اس قوم کے سلسلہ میں روایت کرتے ہیں جس نے ماہ رمضان میں روزہ رکھا اور غروب آفتاب کے وقت کالے بادل چھا گئے۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ رات ہو گئی ہے، افطار کر لیا، لیکن جب بادل چھٹا تو دیکھا کہ سورج موجود ہے، چنانچہ امام صادقؑ نے فرمایا: جس نے افطار کیا ہے اس پر اس دن کی قضا واجب ہے کیونکہ خداوند عالم کا حکم ہے "رات تک روزہ پورا کرو" پس جس شخص نے رات سے پہلے افطار کر لیا اس پر اس دن کی قضاء واجب ہو گی کیونکہ اس نے عمداً کھایا ہے . . . .

روایات اہل سنت:

١ ــ وأخبرنا ابوالحسين بن الفضل القطّان، أبنأ عبدالله بن جعفر، حدثنا يعقوب بن سفيان، حدثنا آدم، حدثنا شعبة، عن جبلة بن سحيم، قال: سمعت علي بن حنظلة يحدّث عن أبيه، و كان أبوه صديقاً لعمر، قال: كنت عند عمر في رمضان، فأفطر وأفطر الناس، فصعد المؤذن ليؤذن فقال: يا أيها الناس هذه الشمس لم تغرب. فقال عمر رضي الله عنه: كفانا الله شرك إنّا لم نبعثك راعياً، ثم قال عمر رضي الله عنه: من كان أفطر فليصم يوماً مكانه[٤]. أقول: ولا يخفى أن الرواية ليست صريحة في أن الافطار كنان بسبب الغيم أو موجب آخر للإشتباه، إلا أن وجود مطلق سبب أمر مقطوع به عادة. وأخرجه عبدالرزاق، عن جبلة مثله[٧].

۱۔ . . . . علی بن حنظلہ اپنے والد سے جو عمر کے دوست تھے روایت کرتے ہیں کہ: میں ماہ رمضان میں عمر کے پاس تھا، چنانچہ انھوں نے افطار کیا اور لوگوں نے بھی افطار کر لیا، جب مؤذن اذان دینے کے لئے اوپر گیا تو اس نے کہا: ایھا الناس! ابھی سورج نہیں ڈوبا ہے، اس وقت عمرؓ نے کہا: خدا ہمیں تمہارے شر سے محفوظ رکھے، ہم نے تمہیں نگہبانی کے لئے نہیں بھیجا ہے۔ پھر عمرؓ نے کہا: جس جس نے روزہ کھول لیا ہے اس پر ایک دن کی قضا واجب ہے۔

٢ ــ أخبرنا أبوالحسين بن الفضل، أبنأ عبدالله بن جعفر، حدثنا يعقوب بن سفيان، حدثنا عبدالله بن رجاء، أنبأ اسرائيل عن زياد (يعني ابن علاقة) عن بشر بن قيس، عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه، قال: كنت عنده عشية في رمضان وكان يوم

غيم فظنّ أن الشمس قد غابت فشرب عمر وسقاني ثم نظروا إليها على سفح الجبل، فقال عمر: لانبالي والله نقضي يوماً مكانه[۸]. أقول: لم أجد في الباب حديثاً عن النبي من طرق أهل السنة.

۲۔ . . . . بشر بن قیس کہتے ہیں کہ میں ماہ رمضان کی ایک شب میں عمرؓ کے پاس تھا، اس دن فضا ابر آلود تھی، عمر کو یہ گمان ہوا کہ سورج ڈوب گیا ہے چنانچہ عمرؓ نے پیا اور مجھے بھی پلایا۔ چند لمحوں کے بعد لوگوں نے سورج کو پہاڑ کے دامن پر دیکھا۔ اس وقت عمرؓ نے کہا خدا کی قسم کوئی پرواہ نہیں۔ اس روزہ کی قضا کرلیں گے . . . .

جس نے غروب آفتاب کا گمان کر کے افطار کرلیا اس پر قضا واجب نہیں

روایات اہل بیتؑ:

۱ ـ وبإسناده، عن أحمد بن محمد، عن الحسين (يعني ابن سعيد) عن فضالة، عن أبان، عن زرارة، عن أبي جعفر(ع) (في حديث) أنه قال لرجل ظنّ أن الشمس قد غابت فافطر ثم أبصر الشمس بعد ذلك، قال: ليس عليه قضاء. ونحوه مارواه الشيخ (ره) عن الشيخ، عن أحمد بن محمد، عن أبيه، عن الحسين بن الحسن بن أبان، عن الحسين بن سعيد، عن محمد بن الفضل، عن أبي الصباح الكناني، قال: سألت أبا عبدالله(ع). وساق نحوه إلاّ أنه ذكر أن في السماء علة، وكذا ماوراه عن أحمد بن عبدون، عن علي بن محمد بن الزبير، عن علي بن الحسن بن فضال، عن محمد بن عبدالحميد، عن أبي جيلة، عن زيد الشحام، عن أبي عبدالله(ع). وساق نحوه وذكر أن فيو السماء سحاباً[۹]. وروي الصدوق نحوه بإسناده، عن محمد بن الفضيل، عن أبي الصباح الكناني كرواية الشيخ[۱۰].

۱۔ . . . . زرارہ ایک حدیث کے ذیل میں امام صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آپ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس نے غروب آفتاب کا گمان کر کے روزہ کھول لیا پھر چند لمحوں کے بعد سے سورج نظر آیا، حضرت نے فرمایا: اس پر قضا نہیں

ہے..

۲ ــ وبإسناده ــ محمد بن الحسن ــ عن الحسين بن سعيد، عن محمد بن الفضيل، عن أبي الصباح الكناني، قال: سألت أبا عبدالله (ع) عن رجل صام ثم ظنّ أن الشمس قد غابت وفي السماء غيم فأفطر ثم إن السحاب انجلى فإذا الشمس لم تغب. فقال: تمّ صومه ولايقضيه[۱۱].

۲۔ .... ابو صباح کنانی کہتے ہیں کہ میں نے امام صادقؑ سے اس روزے دار کے بارے میں دریافت کیا جس نے گمان کیا کہ سورج ڈوب گیا درحالیکہ آسمان ابر آلود تھا چنانچہ اس نے افطار کر لیا پھر جب بادل چھٹا تو سورج موجود تھا، حضرت نے فرمایا اس کا روزہ تمام ہے اور قضا واجب نہیں ہے۔

روایت اہل سنت:

۱ ــ أخبرنا ابوالحسن بن الفضل القطان، أنبأ عبدالله بن جعفر، حدثنا يعقوب بن سفيان، حدثنا عبيدالله بن موس، عن شيبان، عن الأعمش، عن المسيب بن رافع عن زيد بن وهب، قال: بينا نحن جلوس في مسجد المدينة في رمضان والسماء متغيمة، فرأينا أن الشمس قد غابت، وأنا قد أمسينا، فأخرجت لنا عساس من لبن من بيت حفصة، فشرب عمر وشربنا، فلم نلبث أن ذهب السحاب وبدت الشمس فجعل بعضنا يقول لبعض: نقضي يومنا هذا؟ فسمع ذلك عمر فقال: والله لانقضيه وما تجانفنا لإثم[۱۲].

وقد حمل البيهقي هذه الرواية على الخطأ لأنها خلاف الروايات الكثيرة عن عمر التي يصرح فيها بلزوم القضاء في هذه الحال. ولكن يمكن الجمع بين الروايات بحمل لزوم القضاء على ما لوكان الغيم موجباً لمجرد الإحتمال وعدم لزوم القضاء على ما لوكان الغيم موجباً للإطمئنان بغروب الشمس ولعلّ ملاحظة الروايات تساعد على ذلك، فلا يقال إنه جمع تبرعي... فتدبّر.

۱۔ .... زید بن وہب کہتے ہیں ہم لوگ ماہ رمضان میں مسجد مدینہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آسمان ابر آلود تھا۔ جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ سورج ڈوب چکا ہے اور

شب ہو چکی ہے تو حفصہ کے یہاں سے ہمارے لئے بڑے پیالوں میں دودھ آیا چنانچہ ہم نے اور عمرؓ نے پیا، ابھی تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ بادل چھٹ گئے اور سورج نکل آیا۔ یہ دیکھ کر ہم ایک دوسرے سے کہنے لگے کیا اس دن کی قضا دی جائے گی؟ یہ بات عمرؓ کے کانوں تک پہنچی انہوں نے کہا خدا کی قسم ہم قضا نہیں کریں گے اور نہ ہی ہم گناہ کی طرف مائل ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔

. . . .

حائض پر روزہ کی قضا واجب ہے، نماز کی نہیں

روایت اہل بیتؑ:

۱ ـ محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن الحسن بن راشد قال: قلت لأبي عبدالله (ع): الحائض تقضي الصلاة؟ قال: لا. قلت: تقضي الصوم؟ قال: نعم. قلت: من أين جاء ذا؟ قال: إنَّ أول من قاس إبليس. (الحديث)۱۳۰

۱۔ . . . . حسن بن راشد کا بیان ہے کہ میں نے امام صادقؑ سے دریافت کیا: حائض پر نماز کی قضا واجب ہے؟ حضرت نے فرمایا: نہیں۔ میں نے عرض کیا: اور روزہ کی قضا؟ حضرت نے فرمایا: واجب ہے۔ میں نے عرض کیا یہ کیسے؟ حضرت نے فرمایا: پہلا شخص جس نے قیاس کیا وہ ابلیس تھا۔

روایت اہل سنّت:

۱ ـ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ، حدثنا أبو عبدالله محمد بن يعقوب، حدثنا ابراهيم بن محمد (يعني الصيدلاني) وجعفر بن أحمد (يعني الحافظ)، قالا: حدثنا محمد بن رافع، حدثنا عبدالرزاق (ح و أنبأ) أبوالفضل بن ابراهيم المزكي، حدثنا أحمد بن سلمة، حدثنا اسحاق بن ابراهيم، أخبرنا عبدالرزاق، أنبأ معمر عن عاصم الأحول، عن معاذة

العدوية، ان آمرأة سألت عائشة (رض): مابال الحائض تقضي الصوم ولا تقضي الصلاة؟ فقالت لها: أحرورية أنت؟ فقالت: لست بحرورية، ولكني أسال. فقالت: كان يصيبنا ذلك على عهد رسول الله (ص) فنؤمر بقضاء الوم ولانؤمر بقضاء الصلاة ١٤. وروى الترمذي عن علي بن حجر، عن علي بن مسهر، عن عبيدة، عن ابراهيم، عن الأسود، عن عائشة نحوه، إلاّ أنها ذكرت أن الآمر هو رسول الله (ص) ١٥. وروى النسائي نحوه، عن علي بن حجر، عن علي بن مسهر، عن سعيد، عن قتادة، عن معاذ مثله ١٦.

١۔ . . . . عاصم احول، معاذۃ عدویہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نے عائشہؓ سے سوال کیا: یہ کیا وجہ ہے کہ حائض پر روزہ کی قضا واجب ہے لیکن نماز کی نہیں، عائشہؓ نے اسے جواب دیا: کیا تو حروریہ ہے؟ اس نے کہا: نہیں میں حروریہ تو نہیں ہوں لیکن جاننا چاہتی ہوں۔ عائشہؓ نے کہا یہ چیز ہمیں عہد رسول اللہ میں پیش آتی تھی۔ چنانچہ آپ ہم لوگوں کو روزہ کی قضا کا حکم دیتے تھے لیکن نماز کی قضا کا نہیں . . . .

مستحبی روزہ کو توڑنے والا اس کی قضا کریگا

روایت اہل بیتؑ:

١ ـ محمد بن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن حماد بن عثمان، عن الحلبي، عن أبي عبدالله (ع)، قال: سألته عن الرجل يصبح وهو يريد الصيام ثم يبدو له فيفطر؟ قال: هو بالخيار مابينه وبين نصف النهار. قلت: هل يقضيه إذا أفطر؟ قال: نعم، لأنها حسنة أراد أن يعملها فليتمها. قلت: فإن رجلاً أراد أن يصوم ارتفاع النهار، أيصوم؟ قال: نعم ١٧. أقول: وعبارة (حسنة أراد أن يعملها) تبعد حمل الصوم على القضاء بل يحمل على كراهة الصوم بعد الزوال.

لہ خوارج کو حروری و حروریہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ . . . . حلبی کہتے ہیں کہ میں نے امام صادقؑ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جو صبح کو روزہ کی نیت کرتا ہے اس کے بعد ارادہ بدل جاتا ہے اور روزہ کو توڑ دیتا ہے؟ حضرت نے فرمایا اسے زوال سے پہلے اختیار ہے میں نے عرض کیا: روزہ توڑنے کی صورت میں اس کی قضاء رکھے گا؟ حضرت نے فرمایا ہاں کیونکہ اس نے ایک نیک عمل کا ارادہ کیا تھا لہٰذا چاہیئے کہ اسے مکمل کرے، میں نے عرض کیا ایک شخص کو زوال کے بعد روزہ رکھنے کا خیال آیا کیا وہ روزہ رکھ سکتا ہے؛ حضرت نے فرمایا ہاں . . . .

روایت اہل سنت:

١ ــ أخبرناه محمدبن عبدالله الحافظ ومحمدبن موسى بن الفضل، قالا: حدثنا أبوالعباس محمدبن يعقوب، حدثنا الربيع بن سليمان، حدثنا عبدالله بن وهب، أخبرني حياة وعمربن مالك، عن ابن الهاد، قال: حدثني زميل مولى عروة، عن عروةبن الزبير، عن عائشة، أنها قالت: أهدي لي ولحفصة طعام وكنا صائمتين فقالت إحدانا لصاحبتها هل لك أن تفطري؟ قالت: نعم. فأفطرنا ثم دخل رسول الله (ص) فقلت له: يا رسول الله انا أهدي لنا هدية فاشتيناها فأفطرنا. فقال: لاعليكما، صوما يوماً آخر مكانه[١٨].
أقول: وقد يدعى كون صيامها قضاء، وليس في الحديث اطلاق لاختصاص الحديث بواقعة معهودة. نعم في هذه الرواية بسند آخر ما يمكن حمله على صوم التطوع إما بالإنصراف او الاطلاق ففيه: «فقالت يا رسول الله أصبحنا صائمتين فأُهدي لنا طعام فأكلنا منه، فتبسم النبي(ص)، وقال: صوما يومًا مكانه» فتأمل[١٩].
وروى الترمذي نحوه عن أحمدبن منيع، عن كثيربن هشام، عن جعفربن برقان، عن الزهري، عن عروة، عن عائشة. ونقل أنه رواه صالح بن أبي أخضر ومحمدبن أبي حفصة، عن الزهري مثله[٢٠]. وكذا أنه رواه البعض عن الزهري، عن عائشة مرسلاً[٢١].
وروى أبو داود نحوه عن أحمدبن صالح، عن عبدالله بن وهب، عن حياةبن شريح، عن ابن الهاد، عن زميل مولى عروة، عن عروة بن الزبير، عن عائشة[٢٢]. وروى مالة نحوه، عن ابن شهاب، عن عائشة[٢٣].

۱۔ . . . . عائشہ کہتی ہیں: میرے اور حفصہ کے لیے کھانا (تحفہ میں) آیا درحالیکہ ہم دونوں روزہ سے تھے، ہم نے ایک دوسرے سے کہا: روزہ توڑو گی؟

کہا: ہاں، چنانچہ ہم لوگوں نے روزہ توڑ لیا۔ کچھ دیر بعد رسول خدا تشریف لائے، میں نے حضرت سے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے پاس ایک ہدیہ آیا، ہمیں کھانے کی خواہش ہوئی اور ہم نے روزہ توڑ لیا؟ حضرت نے فرمایا کوئی حرج نہیں اس کے بدلے میں پھر کبھی روزہ رکھ لینا . . . .

حواشی:

١ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٢٤٨) وفي الكافي (ج ٤، ص ١٢٠) وليس فيه: عن عدة من أصحابنا بل يبتدي بـ «أحمدبن محمد».

٢ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٢٤٩) والكافي (ج ٤، ص ١٢٠) وفي الاستبصار (ج ٢، ص ١١٧).

٣ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٥٩) ونحوه عن موسى بن عقبة عن محمدبن المنكدر عن النبي (ص) مرسلاً.

٤ ــ الدارقطني (ج ٢، ص ١٩٢ و ١٩٣ و ١٩٤).

٥ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٨٧) والكافي (ج ٤، ص ١٠٠) والاستبصار (ج٢، ص ١١٥) والبحار (ج ٩٣، ط.ج، ص ٢٧٨).

٦ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢١٧).

٧ ــ مصنّف عبدالرزاق (ج ٤، ص ١٧٨) وفيه تغييرات لفظية وزيادات. ٨ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢١٧).

٩ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٨٨)، الإستبصار (ج ٢، ص ١١٥). ١٠ ــ الفقيه (ج ٢، ص ٧٥).

١١ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٨٨). ١٢ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢١٧).

١٣ ــ الوسائل (ج ٧، ص ٢٣) وفي الكافي (ج ٤، ص ١٣٥) لكن ليس في اسناده (ابن ابي عمير) كما أن في متنه تغييراً بتقديم السؤال عن قضاء الصوم على السؤال عن قضاء الصلاة. والاستبصار (ج ٢، ص ٩٣) نقلاً عن الكافي. ١٤ ــ البيهقي (ج٤، ص ٢٣٦). ١٥ ــ الترمذي (ج ٣، ص ١٥٤).

١٦ ــ النسائي (ج ٤، ص ١٩١) ولم يذكر فيه في السؤال أنها لانقضي الصوم لكن بقية الحديث قرينة عليه. ١٧ ــ الوسائل (ج ٧، ص١١) والكافي (ج ٤ ص ١٢١).

١٨ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٨١) ورواه البيهقي بأسانيد متعددة.

١٩ ــ البيهقي (ج ٤، ص ٢٨٠) ووجه التأمل في الاطلاق. أن عليه يكون الضمير في (مكانه) له معنيان: الأول مكان اليوم المقضي إنْ كان الصوم قضاء، والثاني مكان اليوم المتطوع إنْ كان الصوم تطوعاً. و إنْ قيل الضمير يرجع الى اليوم المفطر فيه على الصورتين لزم قضاء يومين فيما لو أفطر في الصوم القضائي وهذا ما لايقول به أحد.

٢٠ و ٢١ ــ الترمذي (ج ٣، ص ١١٢).

٢٢ ــ أبو داود (ج ٢، ص ٣٣٠).

٢٣ ــ موطأ مالك (ج ١، ص ٢٨٤).

تہید آیت اللہ باقر الصدر
ترجمہ: جناب سید محمد ظفر حسینی

قرآن کا فلسفہ تاریخ

گذشتہ قسط میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ فلسفہ تاریخ اور تاریخی اصول و ضوابط کے بارے میں قرآنی افکار و نظریات کی جھلکیاں بہت ساری آیتوں میں موجود ہیں اور ان پر مختلف عنوانات سے متعدد لب و لہجہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

بعض آیات میں اس فکر کو ایک بنیادی قانون کی شکل میں بیان کیا گیا ہے اور بعض آیتوں میں اس کے نمونے اور مصادیق بیان کئے گئے ہیں اور بعض دیگر مقامات پر تاریخ کی تحقیق و تجزیہ پر آمادہ کیا گیا ہے اور تحقیقی چھان بین کی تاکید کی گئی ہے تاکہ فلسفۂ تاریخ اور اس کے اصول و ضوابط کی تہ تک بخوبی پہنچا جا سکے۔

اس سلسلے میں ہمیں آیات کی اچھی خاصی تعداد نظر آئے گی جن میں اس نظریہ کو مختلف عنوانات سے موضوع بحث قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ہم نمونے کے طور پر کچھ آیتیں جلد ہی پیش کریں گے۔ ان میں بعض آیتیں تو وہ ہیں جو مطلوب پر نہایت واضح اور صریحی انداز میں دلالت کرتی ہیں اور بعض ایسی آیات ہیں جن کی دلالت کے عنوانات مختلف ہیں لیکن ان سے بنیادی طور پر قرآن کے اس نظریہ کی بھرپور تائید ہوتی ہے۔

پہلے ہم ان آیات کو پیش کرنا چاہتے ہیں جنہیں بنیادی اعتبار سے یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ قرآنی نقطہ نظر سے بھی تاریخ کا ایک فلسفہ اور اس کے کچھ اصول و ضوابط معین ہیں چنانچہ وہ آیتیں یہ ہیں:

لکلّ امۃ اَجلٌ اذا جاء ...... الخ (یونس/۴۹)

ولکلّ امۃ اجلٌ فاذا جاء ..... الخ (اعراف/۳۴)

ان دونوں آیتوں میں ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ "اجل" (جس کے معنی مدت اور موت کے ہیں) کی نسبت انفرادی طور پر کسی شخص یا فرد کی جانب نہیں دی گئی ہے بلکہ اجتماعی طور پر پوری ایک امت، ایک قوم اور لوگوں کے اجتماعی وجود کی جانب اسے منسوب کیا گیا ہے، جس سے یہ بات صاف پتہ چلتی ہے کہ انسان کے انفرادی وجود کی معینہ یقینی مدت اور مقررہ اجل کے علاوہ ایک اور "اجل" ہے جسے افراد بشر کے اجتماعی وجود کے لئے معین کیا گیا ہے، یعنی انفرادی طور پر جس طرح ہر ایک انسان کے لئے اس کی ایک اجل ہے اسی صورت اجتماعی طور پر تمام اقوام و امم اور بشری معاشروں کی بھی مدت داخل ہے۔

معاشرہ سے ہماری مراد وہ انسانی اجتماع اور لوگوں کا باہمی ارتباط ہے جو ان کے خاص افکار و نظریات اور مخصوص اصولوں کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے جس کا دار و مدار ان کی باہمی طاقتوں قوتوں اور اجتماعی صلاحیتوں پر ہوتا ہے چنانچہ قرآن کی زبان میں اسی اجتماع و معاشرہ کو "امت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس امت کی زندگی کی بھی ایک مدت معین ہے، اس میں حس و حرکت بھی پائی جاتی ہے اور اسے حیات و موت کی منزلوں سے بھی گذرنا ہوتا ہے، بالکل اسی صورت جیسے ایک فرد بشر میں حس و حرکت ہوتی ہے اور اسے پہلے زندگی ملتی ہے پھر وہ موت سے ہمکنار ہوتا ہے، اسی طرح امتوں کو بھی پہلے حیات کی نعمت عطا ہوتی ہے پھر موت کی آغوش میں وہ ابدی نیند سو جاتی ہیں، غرضیکہ جس طرح ایک فرد کی حیات و موت کا ایک وقت معین ہے اور وہ ایک قانون ایک نظام اور ایک طرح کے اصول و ضوابط کی پابند ہوا کرتی ہے بالکل وہی صورت حال امتوں کی ہے، ان کی حیات و موت کے بھی کچھ اصول و ضوابط ہیں، ان کی بھی مدتیں اور وقت مقرر ہیں اور ان کی زندگی بھی کچھ اصول و قوانین کی پابند ہوتی ہے۔

اس طرح ہم مذکورہ دو آیتوں سے نہایت واضح طور پر یہ بنیادی نظریہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تاریخ بشریت بہر حال کچھ اصول و ضوابط کی پابند ہے اور یہ اصول و ضوابط ان اصول و قوانین کے علاوہ ہیں جو شخصی و انفرادی طور پر بشری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور جداگانہ حیثیت سے افراد بشر پر حاکم ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

وما اھلکنا من قریۃ الا ولھا کتاب معلوم .... الخ (حجر/۴و۵)

یعنی ہم نے کسی بھی قریہ یا آبادی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ ان کی ایک مدت معین تھی جس سے
نہ وہ (اہل قریہ) آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ پیچھے رہ سکتے ہیں۔
دوسری آیت بعینہٖ اسی مضمون کی سورۂ مومنون میں نظر آتی ہے:

ما تسبق من کل امۃ اجلہا وما یستاخرون (مومنون/۴۳)

یعنی کسی بھی امت کی مدت نہ آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔
سورۂ اعراف کی ایک اور آیت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوات والارض وما خلق اللہ من شئی وان
عسی ان یکون قد اقترب اجلہم فبای حدیث بعدہ یومنون۔ (اعراف/۱۸۵)

یعنی وہ لوگ ملکوت سماوات اور زمین کی جانب کیوں نہیں دیکھتے کیا بعید ہے کہ
ان کی اجل آپہنچی ہو، قرآن کے بعد وہ کس شے پر ایمان لائیں گے؟

اس آیۂ کریمہ کا ظاہر صاف بتا رہا ہے کہ جس "اجل" کے نزدیک ہونے کی نشاندہی کی گئی ہے یا اس کے نزدیک ہونے کی دھمکی دی گئی ہے اس سے وہی "اجتماعی اجل" مراد ہے نہ کہ "انفرادی اجل"۔ کیونکہ عام طور پر کوئی قوم پوری کی پوری ایک وقت میں اکٹھا نہیں مرجاتی ہے بلکہ وہ انسان کا اجتماعی وجود ہے، معنوی اعتبار سے بنیادی طور پر جس کے فنا و زوال کا وقت قریب ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ غرضیکہ یہاں پر اجل سے مراد وہ حالت و کیفیت ہے جس کا وجود وانحصار گروہ، قوم اور جماعت پر ہوتا ہے نہ کہ فلاں انسان اور فلاں فرد کی ذات پر۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ہم انفرادی نقطۂ نظر سے لوگوں کی مدت حیات و موت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ہر فرد کی مدت و اجل دوسرے سے مختلف اور جداگانہ نظر آتی ہے لیکن جب ہم اس کا اجتماعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں یعنی یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کا ایک گروہ ہے جس میں ان کا ظلم و عدل اور سختی و آرام و آسائش وغیرہ کے مسائل میں ایک دوسرے بیحد گہرا ربط اور انتہائی موثر تعلق ہے تو ایسی صورت میں ہمیں ان کی مدت حیات و موت ایک ہی نظر آتی ہے، اور یہی وہ مدت ہے جسے قرآن میں "امتوں کی اجل" سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ گذشتہ آیتوں کی مانند اس آیۂ کریمہ میں بھی اسی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے:

وربک الغفور ذوالرحمۃ لو یؤاخذہم بما کسبوا لعجل لہم العذاب

بل لهم موعد لن يجدوا من دونه موئلاً و تلك القرى اهلكناهم لما ظلموا وجعلنا لمهلكهم موعداً (کہف/۵۸ و ۵۹)

یعنی تمہارا پالنے والا بیحد غفور و رحیم ہے، وہ اگر لوگوں کو ان کی بداعمالی کی سزا دینا چاہے تو فوری طور پر ان پر عذاب نازل ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ ان کا ایک وقت مقرر ہے جس سے وہ ہرگز گریز نہیں کر سکتے ہیں چنانچہ ہم نے اس سرزمین کے بسنے والوں کو ان کے ظلم و تشدد کے جرم میں ہلاک کیا اور ان کی ہلاکت کے لئے ایک وقت مقرر کیا۔

دوسری جگہ پر ایک اور آیت میں یوں ارشاد ہے:

ولو يؤاخذ الله الناس بما كسبوا ما ترك على ظهرها من دابة ولكن يؤخرهم الى اجل مسمى فاذا جاء اجلهم فان الله كان بعباده بصيراً۔ (فاطر/۴۵)

یعنی خدا جس وقت بھی لوگوں کو ان کی بداعمالی کی سزا دینا چاہتا، روئے زمین پر کوئی بھی ذی روح باقی نہیں بچ سکتا تھا، لیکن اس نے انھیں ایک مقررہ مدت تک کے لئے مہلت دے رکھی ہے، جب وہ وقت آجائے گا تو وہ اپنے بندوں کے انجام سے آگاہ اور باخبر ہے۔

ان دو آیتوں میں قرآن نے یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ اگر خدا انسانوں کو ان کے ظلم و جور اور ان کی بداعمالیوں کی سزا دینا چاہے تو روئے زمین پر کسی بھی ذی روح کو باقی نہ چھوڑے یعنی تمام انسانوں کو آن کے آن میں ہلاک کر ڈالے۔

یہ ایک ایسا قرآنی مفہوم ہے جسے سمجھنے میں لوگوں کو کافی دقتیں پیش آئی ہیں کیونکہ یہ بات عام طور پر کیسے ممکن ہے کہ تمام انسان سب کے سب ظالم ہو جائیں، اس لئے کہ ان میں انبیائے کرام بھی ہوتے ہیں، اوصیا اور مومنین بھی ہوتے ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ دوسرے لوگوں کی مانند وہ بھی معرض ہلاکت میں قرار پائیں؟؟۔

یہ ایک ایسا پیچیدہ مفہوم ہے کہ بعض لوگوں نے ان دونوں آیتوں کو عصمت انبیاء کے انکار کے سلسلے میں اپنے دعوے کی دلیل تک قرار دیا ہے، درآنحالیکہ فی الحقیقت ان دو نوا

آیتوں کا موضوع بحث دنیوی عذاب ہے، آخرت کے عذاب سے ان میں کوئی بحث نہیں کی گئی ہے، یہ آیتیں اصل میں ان فطری نتائج کو بیان کر رہی ہیں جنہیں ظلم و زیادتی اور طغیانی و سرکشی کے بدلے میں کوئی قوم خود حاصل کرتی ہے، چنانچہ ان فطری نتائج و اثرات کا تعلق معاشرے کے صرف ظالم و جابر افراد سے نہیں ہوتا ہے بلکہ شخصیات کے جداگانہ اور ذاتی حالات و کیفیات اور راستوں کے مختلف ہونے کے باوجود قوم کے تمام افراد انکی زد پہ آجاتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہمیں نظر آئے گا کہ جب بنی اسرائیل کے ظلم و ستم طغیانی و سرکشی اور اکڑفوں کے نتیجے میں دشت نوردی اور بادیہ پیمائی ان کا مقدر بنی تو صرف ان کے ظالم و جفاکار ہی افراد اس کی زد میں نہیں آئے بلکہ یہ حکم جناب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے نیک، صالح، پاک و پارسا اور ایسے شجاع افراد کے شامل حال بھی ہوا جنھوں نے ظالموں اور طاغوتوں کے خلاف نبرد آزمائی کی تھی یہ حکم ان کے اور جناب موسیٰ کے شامل حال اس لئے ہوا کہ وہ اسی قوم کی ایک فرد اور اسی امت کا ایک جز تھے، اگرچہ دراصل یہ الہٰی عقاب قوم کے ان لوگوں پر نازل ہوا تھا جنھیں اپنے ظلم و تشدد کے نتیجہ میں چالیس دنوں تک صحرانوردی کرنا تھی۔

دوسری مثال یہ ملے گی کہ مسلمانوں پر ان کی بے راہروی اور انحراف و گمراہی کے نتیجہ میں جب بلائے سماوی اور الٰہی عذاب نازل ہوا تو یزید بن معاویہ ان پر حاکم و خلیفہ کی حیثیت سے مسلط ہوا، ان کی جان، مال، آبرو حتیٰ کہ عقائد تک کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ رہی، سبھی چیزیں اس کے لئے مباح اور اس کے زیرنگین تھیں، چنانچہ جب اس الٰہی امتحان و آزمائش کا مرحلہ آیا تو اسلامی معاشرے کے صرف ظالم و جابر ہی افراد اس کی زد میں نہیں آئے بلکہ مومنین کا وہ گروہ بھی معرض ابتلا میں آیا جس میں فرزند رسولؐ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام جیسی پاکیزہ ترین، صالح ترین، پارسا ترین اور عادل ترین ہستی بھی موجود تھی، امام معصومؑ کو بھی آزمائش و ابتلا کے اس عظیم مرحلے سے گذرنا پڑا اور نتیجہ کے طور پر واقعات کربلا کا دردناک المیہ پیش آیا اور آپؑ اعوانؑ و انصارؑ اور اہل بیتؑ سمیت درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

غرضکہ اس طرح کے جو بھی واقعات و حالات پیش آتے، فلسفۂ تاریخ کی رو سے تاریخی اصول و ضوابط کے مطابق پیش آئے، اور یہ ایک بنیادی قانون ہے کہ جب بھی تاریخی اصول

وضوابط کے مطابق ابتلاء و آزمائش کا کوئی مرحلہ پیش آئے یا کوئی الٰہی عذاب نازل ہو تو اس کا تعلق معاشرے کے صرف ظالم وجابر اور خطاکار افراد سے نہیں ہوگا بلکہ وہ سب کے شامل حال ہوکے رہے گا چنانچہ اس مفہوم کو قرآن نے ایک دوسری آیت میں یوں واضح کیا ہے:

واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة واعلموا ان الله شديد العقاب۔ (انفال/۲۵)

یعنی اس ابتلاء و آزمائش سے ڈرو جو محض ظالموں سے مخصوص نہ ہوگی، تمہیں جان لینا چاہئے کہ اللہ کا عقاب بیحد شدید ہے۔

قرآن کا ایک طرف یہ ارشاد ہے اور دوسری طرف یہ کہتا ہے کہ:

لا تزر وازرة وزر اخرى (فاطر/۱۸)

یعنی کوئی شخص کسی دوسرے کا بار نہیں اٹھائے گا اور کوئی بھی انسان کسی دوسرے کے کرتوتوں کا خمیازہ نہیں بھگتے گا۔

اس آیت سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہے کہ آخرت کے عذاب کا تعلق صرف اس شخص کی ذات سے ہوگا جس نے عذاب والا عمل انجام دیا ہے۔ لیکن اس کے برعکس دنیوی عقاب اور آزمائش وابتلا کا دائرہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہے۔

اس طرح یہ بات یہیں سے واضح ہوجاتی ہے کہ اول الذکر دونوں آیتوں میں تاریخی اصول وضوابط بیان کئے گئے ہیں اور عذاب آخرت یا روز قیامت کے معیاروں کے مطابق عذاب وعقاب کا مسئلہ ان کا موضوع بحث نہیں ہے بلکہ ان کا محور گفتگو محض تاریخی اصول وضوابط اور وہ فطری نتائج ہیں جو کسی قوم یا کسی امت کے اعمال وافعال، سعی وکوشش اور جدوجہد کے عوض سے دنیا ہی میں حاصل ہوجاتے ہیں اور اسے قہری طور پر اپنے کرتوتوں کا خمیازہ بھگتنا ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں ہم ایک اور آیت نمونے کے طور پر پیش کرسکتے ہیں:

وان كادوا ليستفزونك من الارض ليخرجوك منها واذاً لا يلبثون خلافك الا قليلاً سنة من قد ارسلنا قبلك من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحويلا۔ (اسراء/۷۶ و ۷۷)

یعنی اے پیغمبر! اگر وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کو اس سرزمین پر مصائب اور مشقتوں میں مبتلا کریں اور آپ کو اس سے باہر چلے جانے پر مجبور کر دیں تو وہ خود بھی ایسی صورت میں وہاں زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتے ہیں، یہ ہمارا وہ قانون ہے جو آپ سے قبل دیگر انبیاء کے بارے میں بھی رہا ہے اور ہمارے قوانین میں تبدیلی نہیں آتی۔

اس آیۂ کریمہ میں بھی اسی بنیادی مفہوم یعنی قواعد وضوابط کے مسئلے پر زور دیا گیا ہے اور صریحی طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ قوانین الٰہی میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی، آج سے قبل دیگر انبیاءؑ کے ساتھ بھی جاری یہی روش اور یہی اصول رہا ہے، جو اب بھی جاری رہے گا اور اس میں ہرگز ہرگز کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اہل مکہ کی یقیناً یہ کوشش ہے کہ وہ آپ کو زحمتوں میں مبتلا کریں اور آپ کو اس بابرکت سرزمین سے چلے جانے پر مجبور کر دیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آپ کی شمع حیات کو گل کرنے سے عاجز رہے ہیں، آپ کی آواز کو بند نہیں کر سکے ہیں، آپ کی دعوت حق اور مشن کو فنا کے گھاٹ اتار نہیں سکے ہیں اس لئے اب ان کے سامنے تنہا چارۂ کار یہی ہے کہ وہ آپ کو مکہ سے ہجرت کر جانے پر مجبور کریں۔

تاریخی اصول وضوابط میں سے یہ بھی ایک تاریخی اصول ہے جس کی توضیح وتشریح جلدی ہی آئے گی اس تاریخی اصول میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب پیغمبرؐ سے اہل مکہ کا ٹکراؤ اس حد تک پہنچ گیا کہ آپؐ کو اس بابرکت سرزمین سے ہجرت کرنا پڑی جبکہ وہ پیغمبرؐ کے خلاف اپنی دیگر کوششوں اور کاوشوں میں ناکام ہو چکے تھے، تو ایسی صورت میں اس کے نتیجہ کے طور پر انھیں یہ خمیازہ بھگتنا تھا کہ وہ بھی اب وہاں زیادہ دنوں تک نہیں رہ پائیں گے۔ لیکن "زیادہ دنوں تک وہاں ان کے نہ رہ سکنے" سے یہ مراد نہیں کہ عنقریب آسمان سے ان پر کوئی الٰہی عذاب نازل ہوگا اور وہ فنا ہو جائیں گے۔ کیونکہ اہل مکہ نے اس سورہ کے نزول کے بعد پیغمبرؐ کو ہجرت پر مجبور کیا ہے، البتہ انھوں نے آپ کو اذیتوں اور زحمتوں میں ضرور مبتلا کیا اور آپؐ کے لئے ایسا خوف ودہشت کا ماحول پیدا کیا کہ آپؐ کو مجبور ہو کر مکہ کو خیرباد کہنا پڑا اس لئے کہ آپؐ کے لئے کوئی پناہ گاہ اور جائے امن وامان باقی نہ بچی تھی نتیجہ کے طور پر مکہ سے مدینہ ہجرت کرنا پڑی لیکن اس کے باوجود بھی اہل مکہ پر کوئی الٰہی عذاب نازل نہیں ہوا۔

اسی سے یہ بات واضح ہے کہ سرزمین مکہ پر "زیادہ دنوں تک ان کے باقی نہ رہ سکنے" سے کسی الٰہی عذاب کا نزول مراد نہیں ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کے بعد اہل مکہ ایک

مستحکم، مضبوط اور نبرد آزما قوم کی مانند اجتماعی شکل میں زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکیں گے نہ یہ کہ اور بشری کی شکل میں باقی نہ رہیں گے، نہیں! بلکہ وہ اپنی نبرد آزمائی والی شخصیت، اجتماعی شان اور طاقت کو عنقریب کھو بیٹھیں گے اور تباہ و پراکندہ ہو کے رہ جائیں گے، کیونکہ وہ نبوت جسے یہ لوگ دینے سے عاجز رہے تھے عنقریب وہ ان کی جنگ و جدال کی بنیادیں بھی متزلزل کرنے والی تھی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، سرکار مرسل اعظم جب مکہ سے ہجرت فرما گئے تو اہل مکہ اپنی گذشتہ روش سابق صورتحال پر تھوڑے ہی عرصہ تک باقی رہ سکے، وہ اپنی نبرد آزمائی کی تمام طاقتیں کھو بیٹھے، ان کی یکجہتی اور پائیداری جاتی رہی، نتیجہ کے طور پر کچھ ہی برسوں کے اندر شہر مکہ ان کے ہاتھوں سے مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا اور بلاد اسلامی میں شامل ہو گیا۔

اس طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ اس آیہ کریمہ میں تاریخی اصول و ضوابط بیان کئے گئے ہیں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ الٰہی قواعد و قوانین میں کبھی بھی کسی قسم کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو

تجد لسنتنا تحویلا۔

اس کے علاوہ ہمیں اور بھی دوسری بہت سی آیتیں قرآن میں نظر آئیں گی جنہیں تاریخی اصول و سے بحث کی گئی ہے، جیسا کہ اس آیت میں بھی ارشاد ہوتا ہے۔

قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین

(آل عمران/۱۳۷)

یعنی تم سے پہلے بھی کچھ قوانین اور اصول و ضوابط پائے جاتے تھے، ذرا دنیا کے گوشے گوشے میں جاؤ، سیر و سیاحت کرو، پھر تمہیں معلوم ہو گا کہ جھٹلانے والوں کا انجام اور ان کا حشر کیا ہوا۔؟

اس آیہ کریمہ میں تاریخی قواعد و قوانین اور اصول و ضوابط کا مسئلہ پر زور انداز بحث آیا ہے، آیت نے حق کے اتباع اور تاریخی واقعات و حوادث کے بارے میں را اور تحقیق کے موضوع پر بیحد زور دیا ہے تاکہ انسان تاریخی اصول و ضوابط کی تہہ فلسفۂ تاریخ کی گہرائیوں تک پہنچ سکے اور پھر ان سے عبرت و نصیحت حاصل کرے۔

ایک اور مقام پر قرآن میں یوں ارشاد ہوا ہے:

ولقد کذبت رسل من قبلک فصبروا علی ما کذبوا واوذوا حتی اتیھم نصرنا ولا مبدل لکلمات اللہ ولقد جاءک من نباء المرسلین ۔ (انعام/۳۴)

یعنی، آپ سے پہلے بھی انبیاء و مرسلین کو جھٹلایا گیا ہے، چنانچہ انھوں نے اپنے جھٹلائے جانے اور ستائے جانے پر صبر و تحمل سے کام لیا، یہاں تک کہ ہماری نصرت ان کے شامل حال ہوئی، کس کی طاقت ہے کہ وہ الٰہی قانون میں رد و بدل کر سکے؟ بیشک انبیاء کے واقعات آپ سے بیان کئے جا چکے ہیں۔

اس آیہ کریمہ میں پیغمبر اکرم کی تسکین خاطر کا اہتمام کیا گیا ہے، انبیائے ماسبق کے تجربات بیان کئے گئے ہیں، آپ کے تجربات کو گذشتہ انبیا کے تجربات کی مانند اور انھیں اصول و ضوابط سے مربوط بتایا گیا ہے اور مکمل طور پر یہ وضاحت کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں جو اصول و ضوابط اور قواعد و قوانین معین ہیں وہ نبی کریم اور دیگر تمام انبیا و پر برابر سے نافذ ہیں، چنانچہ اس قانون کے بموجب جو انبیائے ماسلف کے سلسلے میں تجربہ کی منزل میں آ چکا ہے، آپ بھی جلد ہی کامیابیوں سے ہمکنار ہوں گے اور الٰہی نصرت آپ کے شامل حال ہوگی، لیکن شرط یہ ہے کہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، ثبات قدم میں کوئی تزلزل پیدا نہ ہو، کیونکہ نصرت و کامیابی کے حصول کا واحد راستہ یہی ہے کہ تمام شرائط مکمل ہوں، اسی لئے یہ ارشاد ہوا ہے کہ:

فصبروا علی ما کذبوا واوذوا حتی اتاھم نصرنا ولا مبدل لکلمات اللہ

یعنی گذشتہ انبیا نے تکذیب اور ایذا رسانی کے مقابلہ میں صبر و تحمل سے کام لیا یہاں تک کہ ہماری مدد ان کے شامل حال ہوئی اور اللہ کے قانون کو کوئی بھی بدل نہیں سکتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ تاریخ کے پورے عرصہ میں الٰہی کلمات و قوانین میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور یہ کلمات جو کسی آن بھی قابل تغییر نہیں ہیں، ان سے وہ باہمی ربط مراد ہے جو نصرت و کامیابی اور شرائط کی تکمیل نیز حالات و واقعات اور اوصاف و خصوصیات کی مجموعی ہیئت کے مابین پایا جاتا ہے، جس کی توضیح قرآن کریم کی متفرق آیتوں میں موجود ہے اور ہم اجمالی طور پر اسے یہاں پر بیان کر رہے ہیں۔

یہ درمیانی کڑی اور باہمی ربط کوئی اور شے نہیں بلکہ وہی تاریخی اصول ہے، پتہ چلا کہ قرآن نے تاریخ

کے کچھ اصول وضوابط معین کئے ہیں جو ناقابل ترمیم ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فلما جاءھم نذیر ما زادھم الا نفورا استکبارا فی الارض ومکر السیئ ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ فھل ینظرون الا سنۃ الاولین فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللہ تحویلا (فاطر/۴۲)

یعنی جب انھیں ڈرانے دھمکانے کے لئے کوئی نبی آیا تو اس کا آنا ان کے لئے سوائے نفرت ومخالفت میں اضافہ کے کسی اور امر کا باعث نہیں بنا، کیونکہ وہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ روئے زمین پر کبر وغرور اور خود خواہی و خود پرستی کے عالم میں زندگی بسر کریں اور اپنے باطل افکار وخیالات کو روبکار لائیں درآنحالیکہ غلط افکار وخیالات خود اپنے حامل ہی کو ہلاک کرتے ہیں، یہ لوگ کیا ان قوانین و اصول وضوابط کے علاوہ جو ان سے اسلاف پر فائز ہوئے (یعنی وہ ہلاک ہو کے رہ گئے) کسی دوسرے قانون کے نفاذ کے منتظر ہیں؟ الٰہی قانون کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتا ہے اور کہیں بھی اس میں ترمیم وتنسیخ واقع نہیں ہوتی ہے۔

سورۂ فتح میں ارشاد ہوتا ہے:

ولو قاتلکم الذین کفروا لولوا الادبار ثم لا یجدون ولیا ولا نصیرا سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ (فتح/۲۳)

یعنی اگر کفار آپ سے جنگ کریں گے تو انھیں پیٹھ دکھاتے ہوئے بھاگنا پڑے گا پھر ان کا کوئی بھی ناصر ومددگار نہ ہوگا، یہ اللہ کا وہ قانون ہے جو اس سے قبل بھی نافذ رہا ہے اور اس کے قوانین کبھی بھی بدلا نہیں کرتے۔

قرآن کریم میں ہمیں بعض ایسی بھی آیتیں نظر آئیں گی جن میں تاریخی اصول وضوابط کے کچھ نمونے بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ اس آیۂ کریمہ میں ارشاد ہو رہا ہے:

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم (رعد/۱۱)

یعنی اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے باطن میں

تبدیلی نہ لائیں۔

آیت کے نقطۂ نظر سے انسان کے باطن، نفس اور اس کی روح کی حیثیت عمارت کی بنیاد کی ہے اور اس کی قومی اور اجتماعی شخصیت کی مثال عمارت کی ہے، چنانچہ اس عمارت میں اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں آسکتی جبتک اس کی بنیاد میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔ اس کی توضیح وتشریح انشاء اللہ بعد میں آئے گی۔ بہر کیف اس آیۂ کریمہ میں بنیاد اور عمارت کے باہمی ربط اور تعلق کو بیان کیا گیا ہے، یعنی انسان کے نفس، روح، اس کے افکار ونظریات اور اس کی قومی واجتماعی شخصیت کے باہمی تعلق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ انسان کے باطن اور اس کے ظاہر کے گہرے لگاؤ کا ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ انسان کا ظاہری وجود ہمیشہ اس کے نفس اور باطنی وجود کی آرائش سے سنورتا ہے اس لئے کہ دونوں کا ایک دوسرے سے بے حد گہرا ربط ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنے نفس اور باطن کی اصلاح کرلیتی ہے تو اس کے حالات وکیفیات خود بخود تبدیل ہوجاتے ہیں، اس کے آپسی تعلقات استوار ہوجاتے ہیں اور باہمی روابط بہتر سے بہتر ہوجاتے ہیں۔

غرضکہ یہ تاریخ کے اصول وضوابط میں سے ایک تاریخی اصول ہے جو بنیاد اور عمارت کے درمیان باہمی ربط کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لئے ایک اور آیت میں یوں ارشاد ہوا ہے:-

ذالك بانّ الله لم يك مغيّرا نعمة انعمها على قوم حتّى يغيّروا ما بانفسهم۔ (انفال/۵۳)

یعنی، اللہ ان نعمتوں میں، جو کسی قوم پر نازل کی ہیں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خود اپنے نفس کو نہ بدل ڈالیں اور اپنے باطن کو آلائشوں سے آلودہ نہ کریں۔

یہ وہ الٰہی قوانین اور تاریخی اصول وضوابط ہیں جن سے کسی بھی قوم یا امت کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے، چنانچہ اس مطلب کی جانب ایک آیت میں یوں اشارہ موجود ہے:

ام حسبتم ان تدخلوا الجنّة ولمّا يأتكم مثل الذين خلوا من قبلكم مسّتهم البأساء والضرّاء وزلزلوا حتّى يقول الرّسول والّذين آمنوا معه متى نصر الله الا انّ نصر الله قريب (بقرہ/۲۱۴)

یعنی، کیا تم لوگ اس وہم وگمان میں ہو کہ جنت میں سختی ومصیبت اور شدائد

و آلام کی ان منزلوں سے گذرے بغیر چلے جاؤ گے جن سے تمہارے اسلاف کو گذرنا پڑا اور طرح طرح کے مصائب جھیلنے پڑے، یہاں تک کہ پیغمبرؐ اور مومنین کو کہنا پڑا کہ خدا کی مدد کب ہمارے شامل حال ہو گی؟ معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کی نصرت و مدد بہت قریب ہے۔

اس آیہ کریمہ میں لوگوں کی اس توقع کو پامال کر دیا گیا ہے کہ انہیں قانون تاریخ اور اس کے اصول و ضوابط سے مستثنیٰ کر دیا جائے، اسی لئے ان سے اس انداز میں خطاب ہوا ہے کہ تم نے یہ بیجا امیدیں کیوں وابستہ کر رکھی ہیں کہ تمہیں تاریخی ضوابط و قوانین سے مستثنیٰ کر دیا جائے، نصرت الٰہی تمہارے شامل حال ہو اور تم جنت میں چلے جاؤ درصورتیکہ تم ان مراحل سے نہیں گذرے ہو جن مراحل سے گذشتہ قوموں کو گذرنا پڑا ہے، جو اپنی فتح و کامیابی کے بعد مصائب و آلام اور سختی حالات کی منزلوں سے ہوتی ہوئی داخل بہشت ہوئی ہیں، اور ان مصائب و شدائد کو قرآن نے "زلزال" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی سختیاں اور حالات کی کشمکش انہیں انتہائی وحشت اور تزلزل کے موڑ تک کھینچ لے جاتی تھی۔

یقیناً حالات کی یہ سختیاں، یہ مصائب و شدائد اور یہ رنج و آلام امتوں اور قوموں کے لئے ایک درسگاہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے عزم و ارادہ، شجاعت و جوانمردی، صبر و تحمل، استقلال و استقامت اور ثبات قدم کا امتحان ہوتے ہیں تاکہ تدریجی طور پر انہیں وہ قدرت تحمال اور ملکہ حاصل ہو جائے جس کی بنا پر وہ لوگوں کے درمیان "امت وسط" ہونے کا اعزاز حاصل کر سکیں۔

آیت میں نصرت الٰہی کے قریب ہونے کی بشارت دی گئی ہے لیکن اس کے حصول کی کچھ شرطیں ہیں اور اس کے کچھ اصول و قوانین معین ہیں، یعنی قرآن کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نصرت الٰہی کوئی ایسی شے نہیں ہے جو بغیر کسی اصول کے، اتفاقی طور پر، اندھا دھند طریقہ سے ہر کس و ناکس کو حاصل ہو جائے، بیشک نصرت الٰہی قریب ہے لیکن اگر تم اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے اس راستہ پر چلو جو اس کے حصول کے لئے معین ہے۔

اور اس راستہ پر چلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تم تاریخ اور اس کے اصول و قوانین سے

واقفیت حاصل کرو۔ تمہیں بہرحال فلسفۂ تاریخ سے آشنا ہونا چاہئے تاکہ نصرت الٰہی تک تمہاری رسائی ہو سکے، اس لئے کہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دوا مریض سے بہت نزدیک ہوتی ہے لیکن چونکہ وہ اس کے طبی فارمولے سے واقف نہیں ہوتا ہے اور اسے یہ بات معلوم نہیں ہوتی ہے کہ فلاں دوا فلاں مرض کے جراثیم کا خاتمہ کرنے کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتی ہے، اسی لئے وہ اسے استعمال بھی نہیں کر سکتا چاہے دوا اس سے کتنی ہی زیادہ قریب کیوں نہ ہو۔

لہٰذا یہ بات اپنی جگہ پر طے شدہ ہے کہ انسان فلسفۂ تاریخ اور تاریخی اصول وضوابط سے واقفیت اور آشنائی ہی کی بنا پر نصرت الٰہی تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور اس کا حقدار بن سکتا ہے، اسی لئے مذکورہ بالا آیت میں لوگوں کو اس امر کی جانب متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ تاریخی اصول وقوانین کی حدود سے باہر آنے اور ان سے مستثنیٰ ہونے کے قطعاً متمنی نہ رہیں۔

قرآن کریم میں ایک اور مقام پر یوں ارشاد ہوا ہے:

"وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون وقالوا نحن اکثر اموالاً واولاداً وما نحن بمعذبین ..." (سبا/۳۴ و۳۵)

یعنی، ہم نے جب بھی کسی سرزمین پر کوئی پیغمبر مبعوث کیا تو وہاں کے خوشحال اور آسائش پسند باشندوں نے اس سے یہ کہا کہ تم جو کچھ بھی لے کے آئے ہو ہم اس کے منکر ہیں، انکا کہنا یہ تھا کہ ہمارے پاس سب سے زیادہ مال و دولت اور اولاد ہے، ہم پر کبھی بھی عذاب نہیں ہوگا۔

تاریخ کے تمام ادوار میں ہمیں نظر آئے گا کہ ہمیشہ انبیائے الٰہی اور انکی امتوں کے آسائش پسند اور اسراف پیشہ طبقوں کے درمیان ایک قسم کا واسطہ رہا ہے اور یہی واسطہ ہمارے سامنے تاریخی اصول وضوابط میں سے ایک تاریخی اصول و قانون کی شکل میں آتا ہے، چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ انبیاء کا ان لوگوں سے یہ رابطہ و واسطہ کوئی اتفاقی مسئلہ نہیں ہے ورنہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک جاری و ساری قانون کی شکل میں بار بار اس کی تکرار نہ ہوتی اور وہ بھی اس حد تک کہ قرآن کو کہنا پڑا:

"وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا ..." یعنی کسی بھی سرزمین پر یہ صورتحال

پیش نہ آئی کہ ہم نے کسی پیغمبر کو مبعوث کیا ہو اور وہاں کے آسائش پسند افراد نے یہ نہ کہا ہو کہ تم جو کچھ لے کر آئے ہو ہم اس کے منکر ہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر ایک منفی رابطہ پایا جاتا ہے، جسے باہمی تناقض و تضاد کا رابطہ کہا جا سکتا ہے، یعنی صفحۂ تاریخ پر لوگوں کے درمیان، انبیائے الٰہی کی قومی شخصیت اور آسائش پرست و اسراف پیشہ افراد کی سماجی اور اجتماعی زندگی کے مابین باہمی مخالفت اور تضاد کا پہلو موجود ہے، اور یہی وہ پہلو ہے جو درحقیقت معاشرہ میں انبیائے الٰہی کی شخصیت و کردار کو اس آسائش پسند و اسراف پیشہ طبقہ کی شخصیت و کردار سے جدا کرتا ہے۔ اور اہل معاشرہ کو دونوں گروہوں کے بارے میں ایک بنیادی فکر اور نظریہ عطا کرتا ہے، جیسا کہ ہم معاشرہ میں انبیاء کے نقوش و اثرات اور انکی قومی اور سماجی شخصیت کے موضوع پر بحث کے دوران عنقریب اس کی توضیح و تشریح پیش کریں گے اور یہ بات مکمل طور پر آشکار ہو جائے گی کہ مترفین اور مسرفین کا گروہ فطری طور پر انبیائے الٰہی کا مخالف اور ان کا دشمن ہوا کرتا ہے۔

غرضکہ یہ بھی تاریخ کا ایک ضابطہ و اصول ہے کہ الٰہی نظام تبلیغ اور دنیادار زر پرستوں کے درمیان ہمیشہ کشمکش اور ٹکراؤ رہا ہے، جس کے نتیجہ میں انھیں تباہی و بربادی اور ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑا ہے، اس مفہوم کو ایک آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"... وإذا أردنا أن نهلك قرية أمرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرا وكم أهلكنا من القرون من بعد نوح وكفى بربك بذنوب عباده خبيرا بصيرا (اسراء/۱۶ و ۱۷)

یعنی، جب ہم نے کسی سرزمین کے باشندوں کو ہلاکت کا مزا چکھانا چاہا تو اس کے گروہ مترفین (زر پرست و آسائش طلب طبقہ) کو فرصت اور چھوٹ دیدی یہاں تک کہ انھوں نے اس خطہ کو فسق و فجور سے بھر دیا، جس کے نتیجہ میں ہمارے وعدہ کی سچائی سامنے آ گئی یعنی ہم نے ان کو بری طرح تہس نہس اور تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اور ہم نے (اپنے نبی) نوحؑ کے بعد بھی کتنی قوموں کو (ظلم و تشدد کے نتیجہ میں) ہلاکت کا مزا چکھایا، خدا اپنے بندوں کے گناہوں سے کہیں زیادہ باخبر

اوران کے بارے میں صاحب نظر ہے۔

یہ آیت واضح طور پر معاشرے میں موجود اور اس پر حاکم نساط جور وظلم اور تباہی وہلاکت کے درمیان پائے جانے والے گہرے ربط کو بیان کر رہی ہے، آیۂ کریمہ کا اس بات پر پورا زور ہے کہ ظلم وہلاکت کا یہ باہمی ارتباط تاریخ کے ہر دور میں رہا ہے، دونوں میں کبھی جدائی نہیں ہوئی ہے اور تاریخ کا ایک فلسفہ اور اس کا ایک قانون ہے۔

اسی تاریخی اصول وضابطہ کو اس لب ولہجہ میں بھی بیان کیا گیا ہے:

ولو انہم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیہم من ربہم لاکلوا من فوقہم ومن تحت ارجلہم .... (مائدہ/۶۶)

یعنی، اگر ان لوگوں نے توریت وانجیل اور ان احکام وقوانین کا، جو ان کے پروردگار کیجانب سے ان کے لئے نازل ہوئے تھے، اجراء کیا ہوتا اور ان کے مطابق عمل کرتے ہوتے تو سر سے پاؤں تک ہمیشہ نعمت الٰہی میں غرق رہتے۔

دوسرے الفاظ میں یوں وضاحت کی گئی ہے۔

ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیہم برکات من السماء والارض ولکن کذبوا فاخذناھم بما کانوا یکسبون (مائدہ/۶۶)

یعنی اگر ان سرزمینوں کے باشندے ایمان لائے ہوتے اور متقی و پرہیزگار بن جاتے تو ہم زمین وآسمان کی رحمت کے تمام دروازے ان کے لئے کشادہ کر دیتے، لیکن انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا جس کے نتیجہ میں ہم نے انھیں ان کے اعمال کا مزا چکھا دیا۔

اسی مفہوم کو اس آیت میں بھی بیان کیا گیا ہے:

وان لو استقاموا علی الطریقۃ لاسقیناھم ماءً اغدقاً بل قالوا انا وجدنا آباءنا علی امۃ وانا علی آثارھم مھتدون۔ (جن/۱۶)

یعنی، اگر وہ لوگ راہ راست پر استقامت و پامردی کے ساتھ باقی رہتے تو ہم انھیں وسعت رزق اور نعمتوں کی فراوانی سے مالا مال کر دیتے لیکن

انھوں نے ایسا نہ کیا، بلکہ یہ کہا کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو جس راستے پر پایا ہے اسی راستے پر ان کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے ہم بھی چلیں گے۔

ایک اور مقام پر ایک آیت میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

وکذالک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا وجدنا آباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ آثارھم مقتدون۔ (زخرف/۲۳)

یعنی، ہم نے اسی صورت، آپ سے قبل جب بھی کسی سرزمین پر کسی پیغمبر کو مبعوث کیا تو اس کے گروہ مترفین (اہل رفاہ و ثروت) نے کہا کہ ہم نے جس راستے پر اپنے آباؤ اجداد کو دیکھا ہے، اسی پر ان کے نقش قدم کی پیروی میں ہم بھی گامزن رہیں گے۔

مذکورہ بالا تینوں آیتوں میں بھی ایک خاص قسم کے ربط کو بیان کیا گیا ہے اور یہ وہ ربط ہے جو استقامت، ثابت قدمی، احکام الٰہی کی پیروی و پابندی اور خیر و برکت کی فراوانی اور پیداوار کی کثرت کے درمیان پایا جاتا ہے، اور آج کے دور کی جدید اصطلاح کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن ان آیات میں "منصفانہ تقسیم" اور "کثرت پیداوار" کے باہمی ربط کو بیان کر رہا ہے۔

اس "منصفانہ تقسیم" کو قرآن نے مختلف الفاظ سے تعبیر کیا ہے چنانچہ کہیں پر استقامت سے تعبیر کیا ہے اور کہا ہے، "لو استقاموا علی الطریقۃ لاسقیناھم ماء غدقا" یعنی اگر وہ لوگ راہ راست پر ثابت قدم رہتے تو نعمتوں کی فراوانی سے نوازے جاتے۔

دوسری جگہ ایمان و تقویٰ سے تعبیر کیا ہے، "لو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا" یعنی اگر ان سرزمینوں کے باشندے ایمان لائے ہوتے اور تقوائے الٰہی اختیار کر لیتے تو ان کے لئے رحمت کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے۔

اور اس سے قبل کی آیت میں توریت و انجیل اور احکام الٰہی کی پیروی و پابندی سے تعبیر کیا ہے، "لو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل" یعنی اگر ان لوگوں نے توریت و انجیل اور احکام الٰہی کی پابندی کی ہوتی اور اس کے مطابق عمل انجام دیا ہوتا تو وہ ہر طرف سے اللہ کی نعمتوں میں غرق رہتے۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن نے منصفانہ تقسیم کے موضوع پر بہت زور دیا ہے، کیونکہ آسمانی

شریعت لوگوں کے درمیان تقسیم کا منصفانہ نظام ہی قائم کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی اور عدل و انصاف کی بنیادوں پر توزیع و تقسیم کے آپسی معاملات کی عمارت استوار کرنا چاہتی تھی، چنانچہ قرآن نے اس مسئلہ پر بھرپور زور دیتے ہوئے ہمیں ایک ضابطہ عطا کیا ہے اور کہا ہے کہ جب کسی معاشرے میں منصفانہ تقسیم کا نظام رائج ہو جاتا ہے اور لوگ اس پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں تو پھر وہ کثرت پیداوار کی عظیم دولت سے کبھی بھی محروم نہیں رہتے ہیں اور ہرگز ہرگز فقر و فاقہ اور افلاس و تنگی کے شکار نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ان کی دولت و ثروت میں اضافہ ہی ہوتا ہے، ان کا مال و سرمایہ ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے اور خیر و برکت میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

لیکن ان کے افکار و خیالات اس کے بالکل برعکس ہیں، ان کا یہ گمان ہے کہ منصفانہ تقسیم کا مطلب فقر و تنگدستی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ چیز لوگوں میں بٹ کے ختم ہو جائے جس کا لازمہ فقر و افلاس ہے، یہ لوگوں کے نظریات و خیالات ہیں لیکن تاریخی حقائق اور قانون تاریخ بالکل اس کے برعکس ہیں، جو اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ جب بھی توزیع و تقسیم کے معاملات میں نظام عدل کی پابندی اور اس سلسلے میں شریعت الٰہیہ کی پیروی اور اس کے احکام پر عمل ہوتا ہے تو معاشرہ مستقل طور پر ہمیشہ کے لئے کثرت پیداوار اور دولت و ثروت کی فراوانی سے مالا مال ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ برکات ارضی و سماوی کے تمام دروازے لوگوں کے لئے کشادہ کر دیئے جاتے ہیں۔

غرضکہ یہ بھی تاریخ کا ایک قانون تھا جسے گذشتہ آیات کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے اور اب ہم ان آیتوں کو پیش کرنا چاہتے ہیں جنہیں اس بات کی مکمل تاکید کی گئی ہے اور ہمیں آمادہ کیا گیا ہے کہ تاریخی واقعات و حوادث کا باقاعدہ جائزہ لیں، ان کا گہرا مطالعہ کریں، ان کی تحقیق اور چھان بین کریں اور ان میں غور و خوض اور فکر و تدبر سے کام لیں تاکہ ہم تاریخ کے عالمگیر اصول و ضوابط اور قواعد و قوانین کے عمیق جائزے اور ان کی زبردست چھان بین کے ذریعہ تاریخ کے میدان میں تحقیقی افکار و نظریات کے حامل بن سکیں اور ہم پر علم تاریخ کے تمام رموز و حقائق آشکار ہو سکیں۔

چنانچہ اس سلسلے میں ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے:

افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین کانوا من قبلھم دمر اللہ علیھم و للکافرین امثالھا (محمد/۱۰)

یعنی، کیا ان لوگوں نے زمین پر سفر اور سیر و سیاحت نہیں کی تاکہ گذشتہ قوموں کا انجام دیکھ سکتے، جنھیں اللہ نے تباہ و برباد اور ہلاک کر دیا، اور وہ تمام کفار کے ساتھ ایسا ہی سلوک رکھے گا۔

ایک اور آیت میں بالکل یہی بات کہی گئی ہے:

افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم .... (یوسف/۱۰۹)

یعنی، وہ لوگ روئے زمین پر سفر و سیاحت کیوں نہیں کرتے تاکہ اپنے اسلاف کے انجام سے باخبر ہو سکیں۔

یہی مضمون دوسرے الفاظ میں اس آیہ کریمہ میں بھی بیان کیا گیا ہے:

فکاین من قریۃ اھلکناھا و ھی ظالمۃ فھی خاویۃ علی عروشھا و بئر معطلۃ و قصر مشید، افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا او آذان یسمعون بھا فانھا لا تعمی الابصار ولاکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ (حج/۴۶)

یعنی، کتنی سرزمینوں کے باشندوں کو ہم نے ان کے ظلم و جور کے نتیجہ میں ہلاک کر دیا ان کے مکانوں کی چھتیں بیٹھ گئیں، دیواریں زمین بوس ہوگئیں، کنوئیں بے مصرف ہوگئے اور ان کے عالیشان، مضبوط و مستحکم قصر خالی اور ویران ہوگئے، کیا وجہ ہے کہ لوگ روئے زمین پر سفر و سیاحت نہیں کرتے ہیں تاکہ ان کے پہلوؤں میں ایسے دل دھڑکنے لگیں جن سے وہ حقائق کو درک کر سکیں اور ایسے کان انھیں حاصل ہو جائیں جن سے وہ حق کو سن سکیں، کیونکہ انسان کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ سینوں میں دھڑکنے والے ان کے دل ہیں جو مردہ ہو جاتے ہیں۔

ی مفہوم کی عکاسی ایک اور آیت میں ان لفظوں میں نظر آتی ہے :

وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشد منھم بطشا فنقبوا فی البلاد ھل من محیص، ان فی ذالک لذکری لمن کان لہ قلب أو القی السمع وھو شھید.... (ق/۳۶ و ۳۷)

یعنی، ہم نے ان سے پہلے ایسی کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا جو ان لوگوں سے کہیں زیادہ طاقتور تھیں اور تمام شہروں میں ان کی آمد و رفت تھی، لیکن اس کے باوجود وہ نجات حاصل نہ کر سکیں، بیشک ان واقعات میں ان لوگوں کے لئے عبرت ونصیحت موجود ہے جو صاحبان قلب سلیم ہیں اور وہ گوش دل سے حق بات سننے اور حقائق کو درک کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔

ان تمام آیتوں سے قرآن کے اسی مطلب پر روشنی پڑتی ہے جس کی وضاحت ہم پہلے کر چکے ہیں یعنی قرآنی نقطۂ نظر سے تاریخ کا ایک مستقل فلسفہ ہے، اور دنیا کے دیگر تمام علوم وفنون کی مانند تاریخ کے بھی کچھ اصول وضوابط اور قواعد وقوانین ہیں۔

چنانچہ قرآن میں تاریخ کے قواعد وضوابط کا وجود اور اسی الٰہی کتاب کے ذریعہ ان کا انکشاف بذات خود قرآن کی عظیم ترین فتح وکامیابی ہے، اسلئے کہ جہاں تک ہمارے علم میں ہے، قرآن وہ اولین کتاب ہے جس نے انسان کو فلسفۂ تاریخ اور اس کے اصول وضوابط سے روشناس کیا، اس حقیقت کو آشکار کرنے میں پورا زور صرف کیا، اس مخفی مطلب کے چہرے سے نقاب اٹھائی اور اس سلسلے میں تمام حقائق ومعارف مکمل طور پر آشکار کئے اور انھیں سمجھانے اور انسانوں کو ان کے بارے میں مطمئن کرنے کے لئے اپنے تمام تر وسائل اور ساری طاقتوں کو بروئے کار لایا۔

قرآن نے اس نظریہ کی سختی سے مخالفت اور تردید کی کہ دنیا میں پیش آنے والے واقعات وحوادث بغیر کسی اصول، ضابطہ اور محرک و داعی کے خود بخود وجود میں آتے رہتے ہیں۔ اسی صورت اس نظریہ کو بھی بری طرح ٹھکرایا کہ پیش آنے والے حادثات وواقعات کا تعلق غیب اور انسان کے مقدرات سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے

کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نہیں۔

ایک عام انسان تاریخی واقعات و حوادث کو یا تو اتفاقات کی دین تصور کرتا ہے، یا انھیں قضا و قدر کا نتیجہ سمجھتا ہے یا پھر قدرت خدا کا کرشمہ خیال کرتا ہے، جس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہر حال میں ضروری سمجھتے ہوئے وہ ان کی تفسیر و تاویل میں مصروف ہو جاتا ہے۔

قرآن ان تمام افکار و نظریات کی سختی سے تردید کرتا ہے، وہ پیش آنے والے کسی بھی حادثہ یا واقعہ کو بلا سبب اور ایک امر اتفاقی تصور نہیں کرتا ہے، اسی طرح نہ اسے قدرت الٰہی کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور نہ ایسے میں تسلیم و رضا کو ضروری سمجھتے ہوئے کسی قسم کی کوئی تاویل و توجیہ کرتا ہے، بلکہ اس کے برخلاف وہ عقل انسانی کو اس حقیقت سے روشناس کرنا چاہتا ہے کہ تاریخ کی دنیا میں بھی کچھ اصول و ضوابط اور قوانین پائے جاتے ہیں۔

اب اگر انسان اپنی سرنوشت کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے تو اس کے لئے ان اصول و قوانین سے آشنائی بیحد ضروری ہے تاکہ وہ ان کا حاکم بن سکے ورنہ تاریخ کے یہ اصول و قوانین اس کے حاکم ہو جائیں گے، اس کی دونوں آنکھیں بند ہوں گی اور وہ فوراً ان کی گرفت میں آجائے گا، لہذا ضروری ہے کہ انسان اپنی بند آنکھوں کو کھولے اور تاریخ کے تمام اصول و ضوابط اور قواعد و قوانین کو ایک ایک کرکے پہچاننے کی کوشش کرے تاکہ ان کی مہار خود اس کے ہاتھ میں رہے اور وہ اس پر حکومت نہ کر سکیں اور اسے اپنی گرفت میں نہ لے سکیں۔

قرآن کریم کی یہ شاندار فتح و کامیابی اور اس کا یہ عظیم الشان انکشاف فکر انسانی کے لئے تاریخ کے دیگر مراحل سے آشنائی و واقفیت کی تمہید قرار پایا، اس کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ چند صدیوں میں تاریخ کو علمی زاویئے سے سمجھنے کی کوشش شروع ہو گئی، نزول قرآن کے آٹھ صدی بعد اس کوشش کا آغاز خود مسلمانوں ہی نے کیا، چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے ابن خلدون کا نام لیا جا سکتا ہے جس نے باقاعدہ طور پر تاریخ کے گہرے مطالعہ اور اس کے اصول و ضوابط کے انکشاف کی مہم کا آغاز کیا۔ پھر کم از کم تقریباً چار صدیاں گذر جانے کے بعد یورپی دماغ وہاں کی نشاط ثانیہ کے ابتدائی ایام میں اس مسئلے کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے اس فکر کو عملی شکل دینا چاہی کیونکہ اس عرصہ میں مسلمان اس کی طرف سے غافل ہو گئے تھے اور

اس کے مطالب و مفاہیم کی گہرائیوں میں نہیں پہنچ سکے تھے، چنانچہ مغربی ذہن نے یورپ کی نشاط ثانیہ کے ابتدائی ایام میں اس مسئلہ کو مورد بحث قرار دیا۔

اس موضوع پر مختلف عنوانات سے طرح طرح کی بحثوں کا آغاز ہوا، فلسفۂ تاریخ اور اس کے اصول و ضوابط کو سمجھنے اور درک کرنے کے سلسلے میں گوناگوں افکار و نظریات سامنے آئے، آئیڈیلسٹ (خیالی پرست) میٹریلسٹ (مادیت پرست) اور دونوں کے درمیانی مکاتب فکر اور دوسرے متعدد مدرسے معرض وجود میں آئے، ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ تاریخ کے قواعد و قوانین اور اس کے اصول و ضوابط کی تعیین و حد بندی ہو سکے۔

ان تمام مکاتب فکر میں شاید مادی مکتب فکر کو سب سے زیادہ شہرت کے حامل، سب سے زیادہ چرچے والے اور خود تاریخ میں سب سے زیادہ مؤثر مکتب فکر کی حیثیت حاصل ہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہ تمام انسانی کوششیں قرآن کریم کی اسی ابتدائی آگاہ سازی کا ایک جاری سلسلہ ہیں، چنانچہ اس کی عظمت و انفرادیت اب بھی اپنی جگہ پر محفوظ ہے اور یہ سہرا اس کے سر سے کبھی بھی علیحدہ نہیں ہو سکتا ہے کہ بشری علوم و معارف کی دنیا میں اس فکر کو سب سے پہلے قرآن نے مورد بحث قرار دیا ہے اور سب سے پہلے اسی نے ذہن انسانی کو فلسفۂ تاریخ اور اس کے اصول و ضوابط سے آشنائی کی طرف متوجہ کیا ہے، اور اس کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلایا ہے۔

آیت اللہ العظمیٰ منتظری
ترجمہ: جناب ممتاز علی

معرفتِ خدا

کلّ معروف بنفسہ مصنوع

جو چیز اپنی ذات سے پہچانی جاتی ہے وہ مصنوع ہے

ماہیتیں وجود کی حدیں ہیں :

جب کسی چیز کی ذات کی معرفت حاصل کرنا ہو تو اس کی جنس، فصل اور ماہیت کو سمجھنا چاہیئے۔ جیسے انسان کی تعریف جب بیان کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ انسان حیوانیت اور ناطقیت سے مرکب ہے اس کی جنس حیوانیت اور فصل ناطقیت ہے ـــــ یہاں انسان کی ماہیت کا تجزیہ دو حصّوں میں کیا گیا ہے۔ جنس اور فصل اور ان دونوں چیزوں سے مل کر ایک ماہیت مرکبہ معرض وجود میں آئی ہے جسے انسان کہتے ہیں ـــــ لہٰذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ " انسان ایک ماہیت ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان ایک حدِ وجودی رکھتا ہے۔ لیکن خدا ماہیت نہیں رکھتا انسان مرکب ہے اس لئے محتاج ہے اور خدا بے نیاز ہے۔

جب یہ معلوم ہو چکا کہ ماہیتیں "حد" وجود ہیں اور خدا غیر متناہی ہے تو اس کے یہاں نہ ماہیت پائی جائے گی اور نہ حدود ـــــ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ ماہیت جنس و فصل سے مرکب ہوتی ہے اور خدا ماہیت نہیں کہ جو مرکب اور محتاج ہو۔ وہ غنی علی الاطلاق اور بے نیاز ہے لہٰذا نہ تو خدا کو درک کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی کنہ حقیقت تک کوئی پہونچ سکتا ہے ـــــ ماہیتیں جو کہ مخلوقات

خدا ہیں ان میں جنس و فصل پائی جاتی ہے۔ اس لئے جنس و فصل کے ذریعہ ماہیتوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔
بنابرایں حضرت امیر المومنینؑ کے فقرہ "کل معروف بنفسہ مصنوعٌ" سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس چیز کی ذات کو انسان پہچانا چاہتا ہے اور اس کی کنہ ذات کو درک کرنا چاہتا ہے تو اس کی وہ کنہ ذات جو دماغ انسان میں موجود ہوتی ہے وہی اس کی ماہیت ہوتی ہے اور ہر شئے کی ماہیت میں جنس و فصل پائی جاتی ہے اس لئے وہ شئے مرکب ہوتی ہے اور ہر مرکب مصنوع ہے ــــ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جو چیز آپ کے ذہن میں ہے وہ آپ کے ذہن کی پیداوار ہے ـــــ لیکن حقیقت خدا وجود غیر متناہی ہے محال ہے کہ وہ ذہن میں سما سکے اس لئے کہ ذہن محدود ہے اور غیر محدود، محدود میں نہیں سما سکتا۔ ذہن مخلوق ہے خالق محدود مخلوق میں کسی بھی صورت سے نہیں سما سکتا۔

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ خدا کو صفات سلبیہ اور صفات اضافیہ کے ذریعہ پہچانا جا سکتا ہے عین ذات کو سمجھنا محال ہے۔

لہٰذا اگر کسی چیز کی کنہ ذات کو سمجھنا چاہیں تو اسمیں ماہیت ہوگی اور ہر ماہیت جنس و فصل کی حامل ہوتی ہے وہ شئے مخلوق اور خدا کی پیدا کی ہوئی ہوگی۔ جو شئے انسانی دماغ میں سمائے گی وہ انسانی دماغ کی پیداوار ہوگی اور انسان کا دماغ بھی مخلوق خدا ہے، اس میں آنے والی صورت ذہنی بھی خدائی مخلوق ہے، خدا کی ذات کبھی بھی قابل درک نہیں ہے۔

وکلّ قائمٍ فی سواہ معلولٌ

جو چیز دوسرے کے سہارے قائم ہو وہ معلول ہے۔

ظرفیّت کی قسمیں:

کلمہ "فی" ظرفیت کے معنی میں ہے یہ ظرفیت یا تو جسم کے لئے "ظرفیت مکانی" ہے جیسے آپ کہتے ہیں کہ پانی کوزہ میں ہے یعنی کوزہ، پانی کے لئے ظرف اور مکان ہے۔

یا ظرفیت "مادّہ" ہے صورت کے لئے اس مقام پر کہا جاتا ہے کہ مادّہ میں صورت "حال" ہے جیسے کرسی ـــ کرسی کی شکل وصورت، مادّہ یعنی لکڑی میں "حال" ہے یعنی لکڑی جو مادّہ ہے اس کو کرسی کی شکل میں ڈھال لیا گیا ہے۔

یا ظرفیت معروض ہوتی ہے عرض کے لیے، جیسے سفیدی جو رنگ ہے وہ جسم میں حال ہے جیسے چونا۔ چونا ایک جسم ہے جس میں سفیدی حلول کئے ہوئے ہوتی ہے یہ بھی ظرفیت کی ایک قسم ہے۔ ظرفیت کی ان میں سے کوئی بھی قسم خدا کی ذات میں نہیں پائی جاتی کیونکہ وہ جسم نہیں ہے جسکی بنا پر اسے مکان یا جگہ کی ضرورت ہو۔ وہ بعنوان مادہ وصورت بھی نہیں ہے اس لئے کہ اگر صورت کی طرح مادہ میں حلول کئے ہوئے ہوتا تو وہ مادہ کا محتاج ہوتا اور محتاج واجب الوجود نہیں ہو سکتا۔ اگر عرض کی طرح ہوتا تو معروض کا محتاج ہوتا جیسے سفیدی جو چونے میں حلول کئے ہوتی ہے۔

سفیدی قائم بالذات نہیں ہے لہٰذا جو چیز کسی دوسرے کے سہارے قائم ہو وہ معلول ہے اور معلول موجودات کی علت نہیں بن سکتا۔ اور خداوند عالم علت العلل ہے۔ تمام موجودات کی علت ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ جسم کی طرح مکان میں صورت کی طرح مادہ میں یا عرض کی طرح معروض میں حال ہو۔

فاعلٌ لا باضطراب آلۃٍ

خداوند عالم فاعل ہے لیکن وہ کسی آلہ کا محتاج نہیں۔

فاعلیت خدا :

خداوند عالم کاموں کا انجام دینے والا اور فاعل ہے اور ہم بھی فاعل ہیں لیکن ہم بغیر اوزار وآلات کی مدد کے کسی کام کو انجام نہیں دے سکتے یعنی اگر ہم کسی چیز کو پکڑنا یا چھوڑ دینا چاہیں تو ہاتھ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہاں ہمارا ہاتھ آلہ ہے اسی طرح چلنے کے لئے پیروں کا، دیکھنے کے لئے آنکھوں کا، زمین کو نرم کرنے کے لئے کدال، پھاوڑے اور آلۂ زراعت کا، ایک کرسی بنانے کے لئے آری، رندہ اور کیل وغیرہ کا سہارا لینا پڑتا ہے یہ تمام چیزیں آلہ ہیں انسان ان آلات کے سہارے کام کو انجام دے سکتا ہے۔

لیکن خدا تمام آلات کا خالق ہے۔ اس لئے اس کی فاعلیت بس "ارادہ" ہے جب وہ ارادہ کرتا ہے تو چیزیں عدم سے وجود میں آجاتی ہیں۔

اس مفہوم کو ذہن سے تھوڑا قریب کرنے کے لئے میں ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔

تجرد اور خالقیت

آپ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے قند کے ایک تیس میٹر والے ٹکڑے کو اپنے ذہن میں فرض کر سکتے ہیں یہ قند کا ٹکڑا جو آپ کے ذہن میں آیا ہے یہ آپ کے ذہن کی پیداوار ہے مخلوق ہے۔ آپ نے اس تیس میٹر کے ٹکڑے کے تصور کے لئے (جسے آپ نے اپنی قوت واہمہ میں ایجاد کر لیا ہے) کسی آلہ کا سہارا نہیں لیا چونکہ انسان ایک کمزور وجود ہے اس لئے اس کے اندر جنبۂ تجرد بہت ہی کمزور ہوتا ہے۔ لیکن جتنا اس میں جنبۂ تجرد پایا جاتا ہے اسی اعتبار سے اس میں خالقیت بھی پائی جاتی ہے

آپ کے ذہن میں جو تیس میٹر والے قند کے ٹکڑے کا خیال آیا ہے اس کی حیثیت ایک تصور سے زیادہ نہیں کیونکہ آپ صفت میں تیس میٹر کا ٹکڑا کھانے کے قابل نہیں ہے۔

انسان جب سوجاتا ہے تو خواب کی حالت میں اس کا تعلق عالم مادہ سے ایک حد تک منقطع ہو جاتا ہے اس حالت میں اس کے ذہن کی پیداوار بڑھ جاتی ہے اور اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے اثرات بھی ظاہر ہوتے ہیں خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ کسی سرسبز و شاداب باغ کی سیر کر رہا ہے، خراماں خراماں اس میں ٹہل رہا ہے اس کی صاف و شفاف نسیم سحر کا سے لطف اندوز ہو رہا ہے باغ کے میٹھے اور خوش ذائقہ پھلوں کو کھا رہا ہے ـــــ خواب کی حالت میں وہ اس پھل کی شیرینی اور لذت کا احساس بھی کرتا ہے لیکن بیدار ہونے کے بعد وہ عالم مادہ کی طرف پلٹ آتا ہے لہذا فوراً وہ ساری لذتیں ختم ہو جاتی ہیں ـــــ انسان کا باغ میں ٹہلنا، اس کے لذیذ اور میٹھے پھلوں سے لطف اندوز ہونا انسان کے ذہن کی پیداوار ہے۔

عالم برزخ چونکہ خواب سے قوی تر ہے اس میں مکمل طور پر انسان کا رابطہ عالم مادہ سے منقطع ہو جاتا ہے اس لئے وہاں حالت تجرد اور قوی ہو جاتی ہے اور احساس لذت یا احساس عذاب بڑھ جاتا ہے۔

آخرت میں جب مومن بہشت میں داخل ہوگا تو اس کی حالت تجرد بہت زیادہ قوی ہو جائے گی اسی وجہ سے وہاں جو چیز اس کے ذہن میں آئے گی فوراً اس کے سامنے حاضر ہو جائے گی اور اس سے لطف اندوز ہوگا۔

قیامت کے دن خدا اپنے مومن بندوں سے کہیگا کہ "اے میرے بندے میں نے تم کو اپنی

طرح قرار دیا ہے میں جب کسی چیز سے کہتا ہوں کہ "کن" ہوجا "فیکون" تو وہ موجود ہو جاتی ہے ـــ یعنی تم بھی جب کسی چیز کا ارادہ کروگے تو وہ تمہارے لئے فراہم ہو جائے گی۔ لہٰذا اگر اس دنیا میں خالقیت کا جذبہ ضعیف ہے تو آخرت میں یہ جذبہ قوی ہو جائے گا۔

بنا برایں انسان کے اندر بھی ایک بہت ضعیف، کمزور اور ناچیز سہی جذبہ خالقیت موجود ہے ـــ لیکن خدا کے صرف ارادہ سے تمام چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں وہ ان آلات کا محتاج نہیں ہے جن کا وہ خالق ہے۔

آیت کریمہ میں خدا کہتا ہے " اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون " تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لفظ "کن" کے ذریعہ چیزوں کو پیدا کرتا ہے بلکہ فقط اس کا ارادہ ہے جس سے چیزیں عالم وجود میں آتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ خدا کا ارادہ ازلی ہے۔ وہ ازل ہی سے ارادہ رکھتا ہے مگر دنیا میں چیزیں تدریجاً ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

بہر حال نفس انسان میں جتنا تجرد کا جذبہ پایا جائیگا اسی اعتبار سے اسمیں فاعلیت الٰہی پائی جائے گی اور تجرد آخرت میں بہت قوی ہو جائے گا جس طرح ایک مومن جنت میں اپنے ارادہ سے بہشت کی نعمتوں کو اپنے پاس حاضر کرے گا اسی طرح کافر بھی عذاب سے دوچار ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے پاس ایک ڈسنے والی روح پائی جاتی ہے جو ڈنک اس نے دنیا میں لوگوں کو لگایا تھا آخرت میں وہی ڈنک سانپ، بچھو کی شکل اختیار کرے گا اور خود اس انسان کو ڈس لے گا۔

نفس کی قوت :

یہ بھی یاد دلانا ضروری ہے کہ اولیاء خدا میں سے کچھ افراد جیسے ائمہ معصومین علیہم السلام اسی دنیا میں قوی نفس کے مالک ہوتے ہیں اسی لئے ہم کو امام رضا علیہ السلام کے تذکرے میں ملتا ہے آپ نے اپنے ارادہ سے پردہ کے شیر کو حقیقی شیر میں (خدا کے اذن سے) بدل دیا۔ ہاں کچھ ریاضت کرنے والے بھی ریاضت کی بدولت اپنے نفس کو قوت کی اس منزل تک پہونچا دیتے ہیں کہ موٹر وغیرہ کو روک دیتے ہیں لیکن یہ خدا سے رابطہ کی بنا پر نہیں ہوتا جس طرح ائمہ معصومین علیہم السلام کو خدا سے ارتباط کی وجہ سے یہ بلند مقام حاصل ہے۔ بلکہ ان کے

یہاں صرف ریاضت نفس کی وجہ سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے۔ بہت سے افراد میں حسد کی قوت اتنی شدید ہوتی ہے کہ ان کی ایک تیکھی نظر سے تن ومند گائے سوکھ جاتی ہے یا رشک آلود نگاہ سے پھول سا بچہ کملا کر بیمار پڑ جاتا ہے۔

لیکن خدا جو مجرد محض ہے وہ فقط اپنے ارادہ سے نظام وجود کو ازل سے ابد تک ایجاد کرتا ہے، اس فاعل کو فاعل الٰہی کہتے ہیں۔ ملّا ہادی سبزواری منظومہ میں تحریر فرماتے ہیں:

معطی الوجود فی الالٰهی فاعل　　　معطی التحرک الطبیعی فاعل

یعنی الٰہی فلسفی، "وجود" کے عطا کرنے والے کو فاعل سمجھتا ہے۔ لیکن طبیعی فلسفی "حرکت" عطا کرنے والے کو فاعل گردانتا ہے، ایک بڑھئی، جو "حرکت" کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کرتا وہ طبیعی فلسفی کی نگاہ میں فاعل ہے لیکن الٰہی فلسفی کی نظر میں وہ خدا فاعل ہے جو اشیاء کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔

ارادہ الٰہی ازلی ہے:

یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا نے تمام چیزوں کو اپنے ارادے سے پیدا کیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ پہلے اس چیز کا ارادہ کرتا ہے پھر پیدا کرتا ہے اس کا ارادہ تو عین ذات ہے ـــ ہمارا ارادہ ہمارے علم کا معلول ہوتا اور ہم ہر آن ایک نیا ارادہ کرتے ہیں۔ مثلاً جب آپ روٹی کا ارادہ کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں تصوّر پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو روٹی چاہئے پھر اس کے بعد آپ اپنے نفس میں یہ تصدیق کرتے ہیں کہ آپ کو روٹی کی ضرورت ہے اس وقت اشتیاق پیدا ہوتا ہے اور آپ نانبائی کی دکان کا رخ کرتے ہیں تاکہ روٹی خریدلیں۔ نانبائی کی دکان کی طرف رخ کرنا یہی ارادہ ہے۔ روٹی کا تصوّر، نفس میں اس کے فائدہ کی تصدیق، اس کا اشتیاق یہ اس کے ابتدائی مراحل ہیں، ان مرحلوں سے گذرنے کے بعد ارادہ کی منزل آتی ہے ـــ چونکہ آپ کے تصورات، تصدیقات، شوق سب حادث ہیں اور ارادہ ان حادث چیزوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے آپ کا ارادہ بھی حادث ہے ـــ لیکن خدا عیاذاً باللہ محل حوادث نہیں، اس کے وجود اقدس میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی بلکہ علم خدا

اور ارادۂ خدا ازلی ہے وہ ازل سے تمام نظام وجود کا عالم ہے اور ازل ہی سے تمام موجودات کا ارادہ رکھتا ہے۔

حادث کا قدیم سے ربط:

فلسفہ میں اس عنوان کے تحت ایک باب قائم کیا گیا ہے کہ اگر خدا کا ارادہ ازلی ہے، علم خدا ازلی ہے اور ارادۂ ازلی تمام موجودات کی علت ہے تو حادث اور قدیم میں ربط کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ جو چیزیں آجکل پیدا ہو رہی ہیں ان کو ازل سے موجود ہونا چاہئے یہ موجودات تدریجاً کیوں پیدا ہو رہی ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ فاعل کی فاعلیت کا نقص اور قصور نہیں ہے بلکہ پیدا ہونے والی چیز کی استعداد و قابلیت کا نقص ہے خدا تو ازل ہی سے ان چیزوں کا ارادہ رکھتا ہے لیکن نظام عالم مادّہ، نظام حرکت ہے اور حرکت کا لازمہ یہ ہے کہ چیزیں تدریجاً پیدا ہوں بات کو سمجھانے کے لئے ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حرکت، تدریج طلب ہے:

آپ اگر کسی عمارت کی بلندی پر جانا چاہیں تو ابتدا ہی سے آپ کا ارادہ ہوتا ہے کہ ہم تمام زینوں کو طے کر کے اوپر جائیں گے لیکن حرکت کی طبیعت یہ ہے کہ جب تک پہلے زینہ کو طے نہ کر لیں دوسرے زینہ پر نہیں چڑھ سکتے اسی طرح دوسرا زینہ طے کرنے کے بعد تیسرا زینہ طے کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ آپ کے ارادہ کا نقص نہیں ہے آپ نے تو شروع ہی سے عمارت کے بالائی حصہ پر جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس کے لئے حرکت ضروری ہے اور حرکت میں درجہ بندی ہوتی ہے یعنی ایک مرحلہ کے بعد ہی دوسرے مرحلہ میں داخل ہوا جا سکتا ہے یہاں نقص آپ کے ارادہ میں نہیں ہے بلکہ "قابل" میں نقص ہے۔ اس لئے کہ اس میں ہر مرحلہ کو اپنے بعد والے مرحلہ کا مقدمہ ہونا چاہئے۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اسی نظام وجود میں جس کا ارادہ خدا نے ازل ہی سے کیا ہے کچھ مجرد موجودات ایسے بھی ہیں جن میں دوسرا سسٹم پایا جاتا ہے وہاں نہ درجہ بندی ہے اور نہ مراحل ہیں ۔ جیسے ملائکہ ۔ عالم عقول یہ مجردات اسی ازل کے ارادہ سے وجود میں آگئے لیکن عالم مادہ چونکہ عالم حرکت ہے اور مادّہ کی حقیقت حرکت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے لہٰذا یہ مادّی عالم مراحل، درجہ بندی اور زمانہ کا محتاج ہے اس لئے ہم ہوں، ہمارے ماں باپ، ہماری اولاد یا عالم وجود کی دوسری چیزیں سب کا ارادہ خدا نے ازل سے کیا تھا لیکن چونکہ حرکت کا لازمہ یہ ہے کہ چیزیں رفتہ رفتہ تدریجی طور پر عالم وجود میں آئیں اس لئے یہ فاعل کا نقص نہیں ہے بلکہ پیدا ہونے والی چیزوں کا عیب ہے ۔

استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ترجمہ: جناب منظور محسن
جناب محمد تقی رحیمیان

انسان اور فطرت

فطری خواہشات:

فطریات کی دوسری قسم خواہشات انسانی ہیں۔ آیا انسان خواہشات کے بارے میں کچھ فطریات رکھتا ہے یا نہیں؟ اس کے تجزیہ و تحلیل کے لئے ہم انسانی خواہشات کو دو حصوں میں بانٹتے ہیں۔
۱۔ جسمانی خواہشات ۲۔ روحانی خواہشات

جسمانی خواہشات:

جسمانی خواہشات سے مراد وہ خواہشات ہیں جن کا تعلق صرف جسم سے ہوتا ہے جیسے بھوک لگنا۔ جو صرف جسم اور مادّہ سے متعلق ہے۔ یہ قوت غریزہ سے مربوط ہے یعنی اس کا تعلق انسان اور حیوان کے بدن کی بناوٹ اور ساخت سے ہوتا ہے چنانچہ جب انسان کے جسم میں کھانا ہضم ہو جاتا ہے اور اسے دوبارہ غذا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تو اس کے معدہ میں ایک قسم کا لعاب سا بنتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک مخصوص کیفیت احساس کی صورت میں انسان میں ظاہر ہوتی ہے۔ (خواہ انسان اپنے معدہ کے بارے میں ایک بچے کی طرح سے کچھ نہ جانتا ہو) انسان اپنی بھوک کے احساس کو ختم کرنے کے لئے کھانا کھاتا ہے۔ جب بھوک کا احساس ختم ہو جاتا ہے تو دوبارہ اسے غذا کی طرف رغبت نہیں ہوتی۔
شہوت اور بدن کے ہارمون میں محدود انسانی جنسی خواہشات بھی بھوک کی طرح جسمانی

خواہشات میں سے ہے اور بے شک یہ خواہش بھی غریزی اور غیر اکتسابی ہے۔ اسی طرح کی جسمانی خواہشات میں سے ایک خواہش نیند ہے۔ خواہ نیند تھکن (خلیوں کی مسمومیت) جو زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اور توانائی کے خرچ ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو۔ خواہ کچھ بھی نیند کا سبب بنے ہو۔ ہر حالت میں انسان کی جسمانی ساخت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ان تمام جسمانی خواہشات کو عام طور سے غریزی امور سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس وقت ہماری بحث جسم کے غریزی یا فطری امور سے نہیں ہے۔

انسان کی چند امتیازی خصوصیات :

فطری خواہشات میں سے کچھ خواہشات ایسی ہیں جن کو ماہرین نفسیات امور روحی کے نام سے جانتے ہیں۔ اور ان سے پیدا ہونے والی لذتوں کو روحی لذتوں کے نام سے یاد کرتے ہیں جیسے اولاد سے محبت۔ یہ محبت غریزۂ جنسی کے ماسوا ایک حقیقت ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ صاحب اولاد بنے اولاد سے لطف اٹھائے جو لطف انسان اولاد سے اٹھاتا ہے وہ جسمانی لذات کے مشابہ نہیں ہوتی ہے یعنی اس لطف کا تعلق کسی خاص عضو جسم سے نہیں ہوتا ہے۔

اسی طرح انسان میں انفرادیت اور بڑائی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اقتدار کا یہ جذبہ خواہشات روحی سے متعلق ہوتا ہے چنانچہ انسان اعلیٰ اقتدار رکھنے کے باوجود مزید اقتدار کی خواہش رکھتا ہے۔ اور لامتناہی اقتدار کا جذبہ اس کے دل میں باقی رہتا ہے۔ ایسی صورت میں خواہ پوری دنیا اس کے زیر نگیں آجائے مگر پھر بھی وہ مزید اقتدار کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ چاہتا ہے کہ اگر کسی دوسرے کرۂ ارض میں آبادی ہو تو اسے بھی اپنے قبضہ میں لے لے۔

خواہشات روحی میں حقیقت پسندی، حقیقت جوئی کشف حقائق، علم دوستی، ہنرمندی، حسن پسندی، تخلیقی صلاحیت، فنی صلاحیت اور ان سب سے بڑھ کر عشق و پرستش کی خواہش شامل ہے۔

اب غور طلب یہ ہے کہ یہ خواہشات فطری ہوتی ہیں یا نہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ فطری معلومات سے انکار کے نتیجہ میں ہم شک کی ہولناک گھاٹی میں گرفتار ہو گئے تھے۔ ایسا تک کہ

جس کا نتیجہ سوفسطائی تھا اور علم و معرفت سے انکار بھی۔
دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم انسان کے اس طرح کی خواہشات کو فطری تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ اور ان کو فطری ماننے یا نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔
فطری معلومات کے سلسلہ میں جس طرح کچھ لوگوں نے اصول تفکر کا انکار کر کے اپنے ہی فلسفہ کی جڑ کو اکھاڑ پھینکا ہے۔ کیا یہاں بھی کچھ ایسے افراد ہیں جو فطری خواہشات سے انکار کر کے انسانیت کو اس کی جڑ سے اکھاڑ پھینکیں اور اس کے باوجود انسانیت، انسانیت گاگن گاتے ہوئے انسانیت کی شاخوں کو پکڑے رہیں۔ اور انھیں اتنا بھی شعور نہ ہو کہ انھوں نے خود اپنے انکار سے انسانیت کو اس کی جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔
پہلا امتیاز : جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ وہ چیز جو انسان میں بغیر شک و شبہ ثابت ہے یہ ہے کہ انسان دیگر موجودات عالم سے کافی حد تک مختلف ہے۔
ان میں سے پہلا امتیاز یہ ہے کہ انسان ایک ایسا موجود ہے جو خارجی دنیا کا بھی شعور رکھتا ہے یعنی کائنات کے بارے میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے وہ ایک صاحب فکر و نظر مخلوق ہے۔ یا جدید دور میں اسے یوں کہہ لیجئے کہ وہ اپنے آپ اور دنیا سے واقفیت رکھتا ہے جسے ادراک کے نام سے یاد کرنا بہت مناسب ہے۔
انسان سے بیرونی دنیا کے ارتباط اور اتصال کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک انسان علم نہیں رکھتا اور جاہل رہتا ہے اس وقت تک اس کے اور بیرونی دنیا کے درمیان جہالت اور لاعلمی کا ایک پردہ پڑا رہتا ہے اور معلومات کے اضافہ کے ساتھ ساتھ بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ بڑھتا جاتا ہے۔ اس بیان کے پیش نظر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ انسان کی اس صفت اور خصوصیت میں جماد، نبات اور حیوان کوئی شریک نہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کیا جا سکتا ہے کہ حیوانات بھی بیرونی دنیا کا محدود و مبہم علم رکھتے ہیں مگر یہ بات بھی درست ہے کہ انسانوں کے مقابلہ میں اس کا علم بہت ہی کم ہے ان میں فکر کا فقدان ہے اس لئے کہ فکر کی تعریف یہ ہے کہ حاضر معلومات کے ذریعہ غائب کا علم حاصل کیا جائے۔
مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ کسی کو ہوسٹل میں کوئی پریشانی پیش آتی ہے اور راہیں مسدود

ہونے کے باوجود وہ اپنی پریشانی کو دور کرنے کا طریقہ نکال لیتا ہے۔ اسی کو فکر کرنا کہتے ہیں
جبکہ حیوان تفکر کی اس صفت سے بے بہرہ ہے۔ کیونکہ حیوان صرف حس کرتا ہے۔ جسے ہم سطحی
مشاہدہ کہتے ہیں، یعنی جس طرح رنگوں کو ہم دیکھتے ہیں وہ بھی دیکھتا ہے۔ حرارت ہم محسوس کرتے
ہیں وہ بھی محسوس کرتا ہے۔ اس طرح کے سطحی مشاہدات دونوں میں مشترک ہیں۔ مگر فکر انسان سے
مخصوص ہے اور وہ مشاہدہ سے بالا تر ہے۔

دوسرا امتیاز : انسان میں کچھ مخصوص رجحانات ہوتے ہیں، جن کو ایک طرف تو تقدس
کا درجہ دیا جاتا ہے اور دوسری طرف ان ہی کو خود غرضی و خود خواہی پر مبنی بھی کہا جا سکتا
ہے۔ یہاں خود خواہی سے مراد ایسے رجحانات ہیں جو کسی فرد کے ساتھ مخصوص ہو جائیں۔ خود
غرضی یا خود پسندی کا یہ عنصر حیوان میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ جس طرح حیوان غذا حاصل کرنا چاہتا
ہے انسان بھی غذا حاصل کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ انسان اگرچہ پہلے حیوان ہے پھر انسان
ہے۔ اس کے باوجود اس میں کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں جو خود غرضی و خود پسندی پر مبنی نہیں
ہوتیں، جنھیں خود انسان مقدس اور عظیم تصور کرتا ہے اور جنھیں یہ مذکورہ رجحان جس قدر زیادہ
ہوتا ہے اسے اسی قدر عظیم و برتر تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں حیوان میں جو رجحانات
(جیسے کھانے، پینے۔ سونے، جاگنے کے) پائے جاتے ہیں۔ وہ یا تو خود غرضی اور مقصد برآری
کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ یا غریزہ کے حدود میں پلئے جاتے ہیں۔ مثلاً بقائے نسل جو توالد
وتناسل میں محدود ہے حیوان اپنے اس عمل میں طبعاً مجبور ہوتا ہے۔ حیوان
کا یہ عمل اس کے اختیار اور شعور کی بنیاد پر نہیں ہوتا ہے
مثال کے طور پر ایک گھوڑی نومولود بچہ سے بے حد محبت کرتی ہے۔ چنانچہ جب آپ اس پہ
سوار ہو کر کہیں جانا چاہتے ہیں تو وہ اپنے بچہ سے زیادہ دور رہنا نہیں چاہتی ہے اور ہمہ وقت اپنے
بچہ کے خیال میں رہتی ہے۔ مگر جب وہی بچہ جوان ہو جاتا ہے تو اسے اپنے بچہ کی طرف ذرا بھی توجہ
نہیں رہتی۔ چنانچہ اسی گھوڑی جس کا بچہ دو سال کا ہو چکا ہو۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اپنے
جوان سال بچہ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کی طرف کوئی میلان
نہیں رکھتی بلکہ جب جب بچہ اس کے قریب آتا ہے وہ اسے مارتی ہے اور اپنے پاس سے

دور بھگا دیتی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ گھوڑی میں جو غریزہ پایا جاتا ہے۔ وہ صرف بچہ کی نگہداشت اور بقائے نسل تک محدود ہوتا ہے۔ لہٰذا جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو ماں کی نظر میں اس میں اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اسی طرح حیوانات جو مل جل کر اجتماعی زندگی گذارتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ان کے انتخاب کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ وہ قدرت کی طرف سے اپنے اس عمل کے انجام دینے کے لئے مجبور پیدا کئے گئے ہیں جیسے شہد کی مکھی، بعض چھوٹی چیونٹیاں، ہرن، وغیرہ اجتماعی زندگی گذارتے ہیں۔ ان کی یہ زندگی قوت غریزہ کی بنیاد پر اضطراری اور کسی حد تک نیم شعوری ہوتی ہے۔

مگر اس کے برخلاف انسان میں کچھ ایسے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ جنھیں ہم خود غرضی کے نام سے یاد نہیں کرسکتے۔ بالفرض اگر خود غرضی سے ان کی توجیہ کی بھی گئی ہے تو یقیناً یہ توجیہات قابل بحث و تردید ہوں گی اور دوسری بات یہ ہے کہ انسان میں یہ رجحانات انتخاب ارادہ اور آگاہی کی بنیاد پر ہوتے ہیں چنانچہ انسانیت ان ہی مقدس رجحانات سے عبارت ہے اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

روحانی اور مقدس رجحانات:

دور جدید میں مختلف مکاتب فکر کے لوگ خواہ وہ الٰہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں یا مادّی، یا مکتب شک کے ماننے والے ہوں۔ بہر نوع وہ ایسے مسائل پیش کرتے ہیں جن کا تعلق حیوانی مسائل سے بالاتر ہوتا ہے۔ ہم یہاں ان ہی مسائل کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ مسائل انسان کے لئے فطری ہیں یا نہیں۔ پھر فطری ہونے یا نہ ہونے، دونوں صورتوں میں ہم ان سے کیا نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں۔

یہ رجحانات جن کو مقدس اور برتر بتایا گیا ہے۔ یا تو یہ صرف پانچ مقولوں پر منقسم ہیں یا ہم ان کے پانچ مقولوں سے آگاہ ہو سکے ہیں۔

۱۔ مقولۂ حقیقت جوئی:

انسان میں ایسا رجحان موجود ہے جس سے وہ چاہتا ہے کہ حقائق کو جیسے کہ کما ہو ہیں

ادراک کرے۔ اس رجحان کا نام تلاش حقیقت، دانائی یا خارجی دنیا کی جستجو ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ یہ ایک ایسا رجحان ہے جس میں حقائق کے دریافت و ادراک کا شوق چھپا ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی دعاؤں میں سے ایک دعا ہے "اللّھم ارنی الاشیاء کما ھی" خدایا مجھکو اشیاء کی حقیقت دکھلا۔ چنانچہ بنیادی طور پر جس کو ہم فلسفہ اور حکمت کہتے ہیں اس کا مقصود معرفت حقیقت اشیائی ہے جیسا کہ خود بوعلی سینا، فلسفہ کے غرض و غایت کے سلسلہ میں کہتے: صیرورۃ الانسان عالماً عقلیاً شبیہہ ھیاً للعالم العینی فلسفی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فلسفی دنیائے عینی کے مانند عقل کی دنیا بن جاتا ہے۔ دنیا کا اس کی اصل حقیقت کے مطابق ادراک کرتا ہے اور سارے جہان کی تصویر عقلی بن جاتا ہے۔

فلاسفہ کی نظر میں حقیقت جوئی کمال نظری ہے۔ انسان فطرتاً چاہتا ہے کہ کمال نظری پیدا کرکے حقیقت کو پالے۔ اس وجہ سے اس میں تلاش و جستجو کا رجحان باقی رہتا ہے علم نفسیات میں اسے حس حقیقت جوئی یا حس کاوش کا نام دیا گیا ہے ماہرین نفسیات نے اس مسئلہ کو وسیع پیمانہ پر اس طرح بیان کیا ہے۔ کہ یہ رجحان وہی حقیقت جوئی ہے جو ایک بچہ میں تین سال کی عمر میں ہی پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے بچہ متجسس ہو جاتا ہے اور اطراف کی چیزوں کے بارے میں پوچھتا ہے۔ اور نادان والدین بچہ کے سوالات کو مہمل تصور کرتے ہیں ایسے والدین غلطی پر ہیں بچہ کو سوال کا حق حاصل ہے۔ بالفرض بچہ کوئی ایسی بات پوچھتا ہے جس کا جواب ماں باپ کے پاس نہیں ہے تو ایسی صورت میں انھیں جھڑکنا مناسب نہیں ہے بلکہ درست یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو بچہ کو مناسب جواب سے مطمئن کیا جائے۔

یا اسی طرح سے بہت سے کام جو بچہ کرتا ہے مثلاً ہر چیز کو چھوتا ہے گراتا ہے توڑتا ہے اس موقع پر والدین یہ خیال کرتے ہیں کہ بچہ تخریبی ہے کیا سچ مچ بچہ طبعاً برا اور توڑ پھوڑ کرنے والا ہے۔ یا یہ ایک جستجو کا جذبہ ہے جو اسے اِدھر اُدھر کی چیزیں چھونے اور توڑنے پر مجبور کرتا ہے تاکہ پتہ لگائے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے۔ اس کام کو ایک بڑا اس لئے نہیں کرتا کہ وہ جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے۔ مگر بچہ انجان ہونے کی وجہ سے جاننے کے لئے اسی کام کو کرتا ہے۔

ابوریحان البیرونی کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ اس کی موت کے وقت

ن کا فقیہ ہمسایہ اس سے ملاقات کے لئے آیا۔ ابوریحان نے فقیہ سے ایک مسئلہ پوچھا۔ فقیہ نے تعجب سے دریافت کیا کہ یہ مسئلہ پوچھنے کا کونسا وقت ہے۔ تم تو بستر مرگ پر ہو؟ ابوریحان نے کہا کہ علم کے بعد مروں، یہ بہتر ہے یا بغیر جانے مر جاؤں یہ بہتر ہے؟ فقیہ نے مسئلہ بتایا اور اپنے گھر چلا گیا۔ ابھی وہ گھر میں داخل بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ابوریحان کا انتقال ہو گیا۔

جن دانش وروں نے اس جذبہ کو اپنے اندر باقی رکھا اور جنہوں نے اس کی پرورش کی وہ ایک ایسی منزل تک پہنچ گئے کہ حقیقت اور دریافت سے جو لذت اور مزہ ان کو ملا وہ ان کے لئے تمام دوسری چیزوں سے بلند و برتر ثابت ہوا۔ چنانچہ مذکورہ واقعہ کی طرح سے ایک واقعہ جو سید محمد باقر اصفہانی سے منسوب کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ محترم موصوف اپنی شادی کے موقع پر دلہن کے پاس جانے کے بجائے مطالعہ میں اس طرح غرق ہوئے کہ صبح کر دی، دوسری طرف دلہن ان کی آمد کی منتظر رہی۔ یہ حصول علم اور کشف حقیقت کا جذبہ ہی تو ہے جس نے ان کے شب زفاف کو شب مطالعہ میں بدل دیا۔

اس طرح کا شب زفاف کا ایک واقعہ پاسٹر (PASTER) سے متعلق بتایا جاتا ہے انھیں شب زفاف اپنی دلہن کے پاس جانے سے پہلے آدھے گھنٹے کی فرصت ملی چنانچہ اسی سے فائدہ اٹھانے کے لئے وہ اپنی لیبارٹری تجربہ میں مشغول ہو گئے، اپنے کام میں وہ اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ رات گذر گئی اور انھیں احساس بھی نہ ہوا جب متوجہ ہوئے تو صبح ہو چکی تھی!

لہٰذا اس میں تو شک نہیں کیا جا سکتا کہ کم یا زیادہ تلاش و جستجو کا جذبہ ہر آدمی میں موجود ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ دوسرے جذبات کی طرح اس میں بھی کمی اور زیادتی کارفرما ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جذبات و رجحانات کے شدت وضعف کا تعلق اس کی پرورش کرنے اور پرورش نہ کرنے سے بھی رکھتا ہے چنانچہ اسٹار میل (STAR MELL) نے کیا خوب کہا ہے کہ "بدحال عقلمند خوشحال بیوقوف سے بہتر ہے" وہ کہتا ہے کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ علم کے ہمراہ محتاج، فقیر، غریب اور مسکین ہونا پسند کرو گے یا بغیر علم کے خوشحال اور دولتمند ہونا پسند کرو گے تو میں علم کے ساتھ فقر کو ترجیح دوں گا۔ مختصر یہ کہ ان تمام باتوں

سے انسان کی نظر علم و جانکاری کی قدر و قیمت کا پتہ چلتا ہے۔

۲۔ اخلاق حسنہ:

انسان میں جو دوسرا رجحان پایا جاتا ہے وہ اخلاق حسنہ کا رجحان ہوتا ہے اور یہ فضیلت کے مقولہ میں سے ہے اور یہ وہی رجحان ہے جو ہماری دنیا میں اخلاق کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے انسان بہت سی چیزوں کی طرف صرف اس وجہ سے رغبت رکھتا ہے کہ ان میں اسے صرف مادی منفعت نظر آتی ہے جیسے دولت سے دلچسپی۔ دولت انسان کے لئے مادی منفعت ہوتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ انسان اپنی مادی ضروریات پوری کرتا ہے۔ دراصل یہ رجحان اس میں خود خواہی کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے یعنی انسان ایسی چیزوں سے دلچسپی رکھتا ہے جو اس کی بقائے حیات کے لئے مفید ہوتی ہیں۔ البتہ اپنی زندگی باقی رکھنے کا جذبہ بذات خود ایک ایسا سربستہ راز ہے جس کے بارے میں یہاں کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔

لیکن انسان چند ایسی چیزوں کا بھی رجحان رکھتا ہے۔ جو اس کی زندگی کے لئے منفعت کا باعث نہیں ہیں بلکہ فضیلت و بزرگی کا سبب ہیں۔ جس کا تعلق عقل سے ہے اور اسے خیر عقلانی کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف منفعت ایک محسوس فائدہ کا نام ہے جسے خیر حسی کہتے ہیں۔ مثلاً سچائی کی طرف انسان کا جھکاؤ، سچائی اور حق گوئی کے لئے انسانی جذبات، جھوٹ سے نفرت، زہد و تقویٰ، صداقت و پاکیزگی کے لئے جذبات کا پیدا ہونا انسانی فضیلت کے لئے ہوتا ہے۔ ان کی دو نوعیتیں ہیں: (۱) فردی ۲۔ اجتماعی۔

فردی: جیسے نظم و ضبط کا پیدا کرنا نفس پر قابو حاصل کرنا۔ اسے ہم شجاعت یا بردباری کے نام سے پہچانتے ہیں۔

اجتماعی:

جیسے دوسروں کی مدد کرنا۔ مل جل کر اجتماعی کام کرنا حسن سلوک اور حسن اخلاق پیدا کرنا ایثار و قربانی کے جذبہ کے تحت دوسرے پر اپنی جان قربان کرنا۔ اپنی شدید ضرورت کے باوجود

سوں کو اپنے نفس پر ترجیح دینا۔

حسن پسندی:

انسان میں حسن کی طرف جھکاؤ پایا جاتا ہے۔ خواہ یہ رجحان حسن پسندی کے لحاظ سے ہو یا حسن آفرینی
لحاظ سے جسے ہم جدید رجحان حسن پسندی کے لحاظ سے ہو یا۔ چنانچہ کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو
جذبہ سے خالی و عاری ہو۔ انسان جو لباس پہنتا ہے اس میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ وہ
خود لے اور دوسروں کو اچھا لگے یا کم سے کم برا نہ لگے۔
انسان جاڑے اور گرمی سے حفاظت اور آسمان کے نیچے اپنا سر چھپانے کے لئے گھر بناتا
۔ مگر اس میں بھی اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ جو گھر بنائے وہ دیکھنے میں خود اسے
دوسروں کو اچھا اور دلکش لگے ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ انسان حسین مناظر کو پسند کرتا
۔ چنانچہ جب کبھی بھی وہ صاف ستھرے پانی کا چشمہ یا دریا دیکھتا ہے تو اس سے لطف
اتا ہے۔ یا مثلاً خوش نویسی جو اگرچہ ایک قدیمی فن ہے مگر اس کے باوجود انسان خوش خطی کو
کی جاذبیت کے پیش نظر بہت پسند کرتا ہے اور اہمیت دیتا ہے جیسے اگر کوئی خوبصورت
ن مجید کسی انسان کے سامنے آئے تو وہ اسے بار بار دیکھنا پسند کرتا ہے۔ خواہ اس کی تلاوت کرے
کرے۔ خود قرآن مجید کے آیت و معجزہ ہونے کی ایک جہت اس کی خوبصورتی ہے، یعنی اس کی
احت و بلاغت عوام و خواص میں اس کی پسندیدگی کی وجہ دوسری وجوہ کے علاوہ خود اس کی
رمولی فصاحت و بلاغت بھی ہے جو اس کو عالمی چیز بنانے کا سبب بنی رہی ہے۔

ولۂ خلاقیت ابتکار و ابداع:

انسان میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ اگر کوئی ضرورت کی چیز اس کے پاس موجود نہیں ہے
وہ اسے ایجاد کر لیتا ہے۔ چنانچہ یہ بات اپنی جگہ پر مسلم اور درست ہے کہ انسان نے اپنی
وریات زندگی کے پیش نظر صنعت و ایجاد سے کام لیا ہے جس طرح سے کہ علم ضروریات
دگی کے لئے ایک وسیلہ رہا ہے لیکن کبھی علم بحیثیت علم کے بھی پسند کیا گیا ہے۔ اسی طرح

صنعت و ایجاد بھی کبھی تو وسیلہ اور ضرورت کی حیثیت سے اور کبھی فنی اور تکنیکی اعتبار سے انسان کی منظور نظر رہی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے کہ ایک بچہ جب کوئی چیز بنا لیتا ہے۔ خواہ وہ چیز آپ کی نظر میں کیسی بھی بھونڈی کیوں نہ ہو۔ مگر بچہ اپنی کاریگری اور صناعی پر بے انتہا خوش ہوتا ہے۔ اور اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتا ہے اور برابر اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کوئی نئی اور انوکھی چیز بنائے۔ مجموعی طور سے اس طرح کی ایجادات خواہ انکا تعلق اجتماعی امور سے ہو یا غیر اجتماعی امور سے، مملکت داری کے نظام سے ہو یا شہر سازی کے نظام سے۔ نظم و ضبط کا نظام ہو یا طرز تعلیم و تعلم تصنیف و تالیف ہو یا جلد بندی اور جلد سازی سے بہر نوع ہر چیز میں اس کی جدت پسندی کا رجحان غالب رہتا ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ رجحان کہ انسان جدید نظریہ پیدا کرے مثلاً اگر کوئی شخص کسی ایک نظریہ کا موجد ہوا اور اس نے اس نظریہ کو ثابت کر دیا تو ایسی صورت میں دوسرے لوگ بھی اس کے نظریہ کو قبول کر لیتے ہیں اور اس کی پیروی کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کی ایجاد و تخلیق ہے جیسے فلسفہ میں نظریہ حرکت جوہری کی ایجاد۔

صناعی اور تخلیق کے فن میں اس طرف بھی ہماری توجہ مرکوز رہنی ضروری ہے کہ کبھی کبھی دو میں رجحانات ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں مثلاً شاعر کو لے لیجئے۔ وہ ایک ساتھ دو کام انجام دیتا ہے، یعنی پہلے تو اس نے اشعار نظم کئے اور اپنی تخلیقی پیاس بجھائی دوسری طرف اس نے اشعار میں حسن پیدا کر کے حسن دوستی کی پیاس کو دور کیا۔ ممکن ہے کبھی کبھی شاعر میں حقیقت پسندی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہو۔

۵۔ عشق و پرستش:

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہوا کہ دنیا میں انسان کی بہ نسبت کوئی دوسری ایسی مخلوق نہیں ہے جو پہچنوائے جانے کے قابل ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایسی خصوصیات کا حامل ہے جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں پائی جاتی ہیں پھر اسی انسان میں ایسے اسرار و رموز موجود ہیں جن کی وضاحت آسان نہیں ہے اور بہت مشکل ہے۔ اسی لئے انسان کو عالم صغیر اور اس کے

مقابلہ میں دنیا کو عالم کبیر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی انسان بذات خود ایک دنیا ہے۔ اہل
تصوف و عرفان تو اس بات کو بھی نہیں تسلیم کرتے کہ انسان عالم صغیر ہے۔ بلکہ وہ انسان کو عالم
کبیر اور اس کے مقابلہ میں دنیا کو عالم صغیر کہتے ہیں۔ مولانا روم کا شعر ہے ؎

چیست اندر خانہ کاندر شہر نیست　　چیست اندر جوی کاندر نہر نیست

کہتے ہیں گھر شہر کا جزو ہوتا ہے چنانچہ جو کچھ گھر میں ہوتا ہے وہ شہر میں ضرور موجود ہوگا
البتہ یہ بات ممکن ہے کہ جو کچھ شہر میں موجود ہو وہ گھر میں نہ پایا جائے۔ اسی طرح سے جو چیز نہر
میں ہوگی وہ دریا میں یقیناً ہوگی۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جو چیز دریا میں ہو وہ نہر میں نہ ہو۔ مولانا روم
کہتے ہیں ؎

این جہان جوئیست دل چون شہر آب　　این جہان خانہ است دل شہرا جاق

دنیا پانی کی ایک نہر کی طرح ہے اور انسان کا دل بذات خود شہر آب ہے یا دنیا ایک گھر
کے مانند ہے اور دل گرم و پر جوش شہر ہے۔

مولانا کا مقصود یہ ہے کہ انسان میں اسرار و رموز کی ایک دنیا موجود ہے جو انکشاف
کی محتاج ہے۔

بیشتر فلاسفہ اور ماہرین سماجیات کی یہ غلطی ہے کہ انہوں نے انسان کو بہت معمولی
درجہ کا تصور کیا ہے۔

ہم نے پانچویں اور آخری مقولہ کو عشق و پرستش کا مقولہ قرار دیا ہے۔ اس لئے ضروری
ہے کہ ہم اس کی ضرورت کے پیش نظر اس کی زیادہ سے زیادہ وضاحت کریں۔ اس لئے کہ
عشق و پرستش کا موضوع ایک ایسا اہم موضوع ہے جو واقعی محتاج تشریح ہے۔

انسان میں ایک ایسے جذبہ کا وجود ہے۔ جسے ہم عشق کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جو
محبت سے بالاتر ایک حقیقت ہے۔ کیونکہ عام طور سے محبت کا جذبہ تو ہر ایک میں پایا جاتا
البتہ شخصیات کے اعتبار سے اس کی نوعیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ جیسے دو دوستوں کی آپسی محبت،
مقصد اور غرض کے لئے محبت، زن و شوہر کی محبت، بچوں اور والدین کی محبت وغیرہ۔ اس کے
مقابلہ میں عشق ہے جو ایک الگ حقیقت ہے۔

لفظ عشق کی تحقیق: عربی ادب میں عشق کی لفظ عَشَق کے مادہ سے ماخوذ ہے اور خود عَشَق

دیوار میں چپکنے والی ایک بیل (CREAPER) کا نام ہے۔ جو نمو کے ساتھ آگے بڑھتی جاتی ہے اور دیوار کو اپنی جکڑ میں لیتی بڑھتی جاتی ہے۔ اسی طرح کی ایک غیر معمولی کیفیت عاشق میں پیدا ہوتی ہے۔ جو عمومی محبت سے مختلف اور الگ ہوتی ہے۔ عشق انسان سے اس کا کھانا پینا اور سونا جاگنا چھین لیتا ہے۔ اور اس کی تمام تر توجہ معشوق کی طرف کھینچ جاتی ہے۔ اور عاشق کے دل و دماغ میں عشق ایک ٹھوس وحدت پیدا کر دیتا ہے۔ جو اسے تمام چیزوں سے لاپرواہ بنا دیتا ہے اور اس کو ایک ہی جگہ پر لا کھڑا کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی شخصیت کو فراموش کر کے پوری طرح معشوق میں کھو جاتا ہے۔

یہ کیفیت جانوروں میں نہیں پائی جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ حیوانات میں وہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے جو عمومیت کے ساتھ انسانوں میں آپس کے تعلقات میں پایا جاتا ہے، یا زن و شوہر میں موجود ہوتا ہے۔

حقیقت عشق :

عشق کی حقیقت اور اس کی ماہیت کی وضاحت فلسفہ کے اہم موضوعات سے متعلق ہے۔ چنانچہ بو علی سینا کا ایک رسالہ عشق کے موضوع پر ہے۔ ملا صدرا نے بھی اپنی مشہور کتاب اسفار میں بہت کچھ عشق کے موضوع پر لکھا ہے۔

اسی طرح دور حاضر میں بھی علم نفسیات اور روان کاوی (Pesikanaliz) کے ذریعہ عشق کی ماہیت کو جاننے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ تو یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ عشق بس ایک طرح کی بیماری ہے لیکن دور جدید میں اس بات کو ماننے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عشق خدا کا ایک عطیہ ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا عشق صرف ایک طرح کا ہوتا ہے یا کئی طرح کا ؟

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عشق صرف ایک نوعیت کا ہوتا ہے اور وہ بھی جنس سے تعلق رکھنے والا۔ اور دنیا میں عشق کے نام پر جو کچھ بھی اپنی خصوصیات اور آثار کے ساتھ

پا جاتا ہے۔ سب کا تعلق جنس ہی سے ہے۔ جیسے عام طور سے پائے جانے والے رومان کے ذریعہ
ے عشق، جس نے دنیا کے رومانی ادب کو اپنی عشقیہ داستانوں سے بھر دیا ہے۔

چند فلاسفہ جیسے بوعلی سینا، ملا صدرا، خواجہ نصیر الدین طوسی عشق کو دو نوعیتوں پر تقسیم
کرتے ہیں جن میں سے ایک کو جنسی اور مجازی عشق کا نام دیتے ہیں، اسے عشق حقیقی نہیں کہتے۔ اور
دوسری نوعیت کے عشق کو روحانی سمجھتے ہیں۔

پہلی قسم یعنی جسمانی عشق میں چونکہ منشاءِ عشق ایک طرح کا ایسا جذبہ ہوتا ہے جو غریزہ
سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ جذبہ معشوق سے وصال اور تشنگی بجھانے کے بعد ٹھنڈا پڑ جاتا ہے
اور یہی اس کی انتہاء ہوتی ہے۔ ان ہی فلاسفہ کا دعویٰ ہے کہ اس جسمانی عشق کے علاوہ انسان
کبھی روحانی عشق کی ایک ایسی منزل پر پہونچتا ہے جو بقول محقق نصیر الدین طوسی ایک ایسا
عشق ہوتا ہے جو دو جان اور دو روح کے ملنے سے پیدا ہوتا ہے۔ دونوں روحیں ہم شکل
ہو جاتی ہیں۔ ان کا مقصود یہ ہے کہ یہ عشق روحانی عشق ہوتا ہے۔ انسان کا حقیقی معشوق ایک ماوراء
طبیعی حقیقت ہے جس سے انسان کی روح مل جاتی ہے اور اس کو پالیتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ حقیقی
معشوق عاشق کے باطن میں ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں۔ چنانچہ لوگ کہتے
ہیں کہ انسان عشق میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ ایک منزل پر پہونچ کر وہ صرف معشوق کے تصور
کو معشوق پر ترجیح دینا پسند کرتا ہے۔ یہ بات اس لئے پیدا ہو جاتی ہے کہ عشق کے سلسلہ میں معشوق
تو در اصل ایک محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تحریک کی وجہ سے عاشق میں ایک زبردست
عشق کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے عاشق اس کیفیت کو اپنی روح میں پنہان کر لیتا ہے۔ اور اسی کے
تصور سے خوش رہتا ہے۔ اور اپنے تصور عشق کے علاوہ اور کچھ نہیں پسند کرتا ہے۔

اس ضمن میں ایک داستان فلسفہ کی کتابوں میں بھی بیان کی جاتی ہے کہ مجنون جو لیلیٰ کے
عشق میں گرفتار تھا اس نے عشق سے مجبور ہو کر بہت سے عشقیہ اشعار لیلیٰ کے لئے کہے تھے۔
شب و روز لیلیٰ ہی کے فراق میں تڑپتا رہتا تھا۔ مگر جب ایک بار لیلیٰ اس کے پاس پہونچی
اور مجنون، کہہ کر اسے پکارنے لگی تو آواز سن کر مجنون لیلیٰ کی طرف متوجہ تو ہوا مگر اس نے کہا
کہ تم کون ہو۔ لیلیٰ نے کہا ارے تم مجھے نہیں جانتے میں ہوں تمہاری لیلیٰ۔ تمہاری فکر میں

آئی ہوں۔ لیلیٰ سوچتی ہی رہی کہ مجنون مجھے دیکھتے ہی بے چین ہو جائے گا، اپنی جگہ سے اٹھ کر میری طرف دوڑے گا اور مجھے اپنی طرف کھینچ کے گھنٹوں باتیں کرے گا اور مجھے یہاں سے جانے نہیں دے گا۔ مگر یہ سب کچھ نہ ہوا۔ مجنون نے کہا کہ چلی جاؤ یہاں سے مجھے تمہارے عشق نے تم سے بے نیاز کر دیا ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہمارے دور کے مشہور و معروف شاعر شہریار کے بارے میں مشہور ہے۔ شہریار میڈیکل کے طالب علم تھے۔ وہ جس مکان میں رہتے تھے اس کے مالک کی لڑکی پر عاشق ہو گئے۔ لڑکی کے والدین نے اس کی شادی کسی امیر گھرانے کے لڑکے سے کر دی، چنانچہ ناکامی کے نتیجہ میں شہریار اپنے تمام مشاغل کو چھوڑ چھاڑ عشق کی دیوانگی میں گرفتار آوارہ گرد ہو گئے۔

اتفاق سے چند سال کے بعد وہی لڑکی اپنے شوہر کے ہمراہ (جس کو علم تھا کہ شہریار میرا عاشق ہے) شہریار سے ملی۔ شہریار نے اس سے کہا کہ میں تم سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا خواہ تم اپنے شوہر سے طلاق ہی کیوں نہ لے لو۔ شہریار نے اپنی اس ناخوشگوار یا ناخوشگوار ملاقات کا اپنے ایک شعر میں تذکرہ بھی کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "میں نہیں جانتا کہ آخر میں کس حد تک اس کے عشق میں کھو گیا ہوں کہ خود معشوق کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہو سکتا۔ بس اس کے تصور میں کھویا ہوا ہوں اور اسی کی لذت میں جان دیتا ہوں۔

ایک گروہ نے عشق کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ جن میں سے ایک روحانی ہے اور دوسرا جسمانی۔

عشق روحانی:

روحانی عشق وہ ہے جو اپنے مبداء اور منتہیٰ دونوں اعتبارات سے عشق جسمانی سے مختلف ہے۔ اس مختصر سے بیان میں عشق روحانی کے فلسفیانہ اور استدلالی مباحث کو لانے کے بجائے صرف آسان اور سادہ پہلوؤں کو ہی پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان عشق کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور عشق کو

ایک قابل ستائش امر تصور کرتا ہے۔ حالانکہ اس کے مقابل میں وہ چیز جو نفسانی خواہشات و شہوت سے متعلق ہوتی ہے۔ وہ قابل مدح و ثنا نہیں ہوتی۔ مثلاً انسان کھانا کھانا چاہتا ہے۔ یا پانی پینے کی خواہش رکھتا ہے۔ کیا کوئی یہ سوچ سکتا ہے کہ انسان کی یہ خواہش کسی کی نظر میں مقدس سمجھی جاسکتی ہے یا کبھی کسی نے یہ دیکھا ہے کہ غذا کھانے والا اور پانی پینے والا اپنے اس عمل پر فخر بھی کرتا ہو اور اسے مقدس سمجھتا ہو۔ عشق جس کی ایک قسم شہوت اور خواہش نفسانی سے تعلق رکھتی ہے وہ بھی کم و بیش اسی طرح سے قدر و منزلت اور تقدس سے خالی ہے۔

مگر اس کے برخلاف عشق ہمیشہ قابل تعریف ہوتا ہے چنانچہ دنیا کے ادب کا ایک بہت بڑا حصہ عشق کے تقدیس پر مشتمل ہے۔ یہ بات انفرادی اور اجتماعی نفسیات اور (روان کاوی (PESIHANALIZ) کے نقطۂ نظر سے قابل توجہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر یہ عشق ہے کیا جس کی خاطر انسان معشوق کے لئے سب کچھ قربان کردیتا ہے یہاں تک کہ اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے اور ساتھ ہی اس پر فخر بھی کرتا ہے۔ گویا معشوق کی راہ میں عاشق کا فنا ہوجانا ایک ایسی فضیلت ہے جو فائدہ اور نقصان کی نظر میں نہیں سما سکتا۔ اور یہ بالکل اسی طرح سے ہے جیسا کہ اخلاقیات کے بیان میں بتایا گیا ہے کہ بلند اخلاق اور اقدار انسانی منفعت کی منطق سے بلند و برتر ہے جیسے ایثار اور قربانی کا جذبہ جن کو انسان اخلاق کے اعتبار سے مقدس جانتا ہے اور ان کو اپنے لئے فضیلت، عظمت اور بزرگی کی علامت جانتا ہے۔ یہیں سے شہوت اور غیر شہوت کے درمیان فرق پیدا ہوجاتا ہے چنانچہ انسان جب کسی کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کے جذبہ کا تعلق شہوت تک محدود ہوتا ہے۔ اس کا مقصد محبوب سے وصال اور اسے اپنانا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک عشق، عشق حقیقی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جہاں محبوب کو پالینے اور اس کے وصال کا خیال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی راہ میں اپنے کو فنا کر دینا ہی مقصود و مطلوب ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ عشق خود خواہی کی منطق سے مناسبت نہیں رکھتا۔ لہٰذا غور طلب یہ ہے کہ یہ عشق انسان کی کسی حالت کا نام ہے اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟

عاشق اپنے جذبۂ عشق کے ساتھ محبوب میں اس طرح سے فنا ہوجانا پسند کرتا ہے کہ خود اس کا

وجود تک باقی نہ رہے۔ مولانا روم کے اشعار اس مفہوم کی بہتر طریقہ سے ترجمانی کرتے ہیں چنانچہ مولانا کا ارشاد ہے ؎

عشق قہار است و من مقہور عشق　　چو قمر روشن شدم از نور عشق

عشق مجھ پر غالب ہے اور میں عشق سے مغلوب ہوں اسی وجہ سے نور عشق میں چاند کی طرح روشن ہوگیا۔ چنانچہ عشق معشوق کو اس منزل پر پہونچا دیتا ہے کہ عاشق خود یہ چاہتا ہے کہ معشوق کو خدا کا درجہ دے اور خود بندہ بن جائے۔ محبوب کو ہستی اور اپنے کو محض نیستی تصور کرنے لگتا ہے۔
آخر یہ کونسا عشق ہے اور اس کا ماخذ کیا ہے۔

عشق کے متعلق نظریات :

پہلا نظریہ : جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ ایک نظریہ ہے کہ بطور عموم ہر عشق اپنی ابتداء اور انتہا میں شہوت سے تعلق رکھتا ہے۔
فرائیڈ مشہور ماہر نفسیات جو ہر چیز کو خاص کر عشق کو جنسیات سے متعلق مانتا ہے۔ مثلاً علم دوستی خیر خواہی، بزرگواری، پرستش اور خود عشق کو جنسی امور میں شمار کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس نظریہ کا حامی کوئی نہیں ملتا۔
دوسرا نظریہ : وہ ہے جس کی حکمائے اسلام بھی تائید کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ عشق دراصل دو طرح کے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک کا تعلق جسم سے ہوتا ہے اور دوسرے کا روح سے
تیسرا نظریہ : ان دونوں نظریات کے مابین ہے جسمیں دونوں نظریوں کو جمع کیا گیا ہے۔
اس نظریہ کے بانیوں نے جب یہ دیکھا کہ عشق میں کیفیات پائی جاتی ہیں جو جنسیات سے سازگار نہیں ہیں۔ اس لئے کہ جنسی امور کی کیفیات بھوک کی کیفیت کی طرح سے ہوتی ہے۔ بھوک دراصل ایک طبیعی حالت کا نام ہے جب جسم انسانی میں اس کی ضرورت پیدا ہوتی ہے تو جسم میں لعاب بننا شروع ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انسان بھوک محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ لعاب نہ بنیں تو انسان بھوک بھی نہ محسوس کرے۔
اس نظریہ کے حامیوں نے جب یہ دیکھا کہ عشق میں اس طرح کی جنسی کیفیت نہیں پائی جاتی

تو انھوں نے اس کی تفسیر کچھ اس طرح سے کر ڈالی کہ عشق اپنے منشاء اور پیدائش کے اعتبار سے اگرچہ جنسی ہے مگر منتہا اور مقصد کے لحاظ سے غیر جنسی ہے۔ ابتداءً جنسی ہوتا ہے مگر بعد میں اس کی کیفیت اور حالت میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور روحانی بن جاتا ہے۔

مشہور فلسفی (WELL DORANT) ویل ڈورانٹ نے اپنی کتاب "لذات فلسفہ" میں جب عشق کے بارے میں بحث کی تو اس نے اسی نظریہ کا انتخاب کیا۔ اور فرائیڈ کے نظریہ کو ترک کر دیا ہے بلکہ اس کی رد کی۔ وہ کہتا ہے کہ عشق بعد میں اپنے راستہ اور خصوصیت کو بدل دیتا ہے۔ اور اپنی کیفیت میں تبدیلی لے آتا ہے۔ اور جنسی کیفیت سے بالکل دور ہو جاتا ہے۔ ویل ڈورانٹ بنیادی طور سے فرائیڈ کے نظریہ کو درست نہیں مانتا ہے۔

(WILLIAM JAMES) ولیم جیمس اپنی کتاب "دین و روان" میں کہتا ہے کہ جس طرح ہمارے وجود میں کچھ ایسے رجحانات پائے جاتے ہیں جو ہمیں طبعی اور مادی چیزوں سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے وجود میں کچھ ایسے رجحانات بھی ہیں جو مادیات سے مربوط نہیں ہوتے اور ہمیں ماوراء طبیعت سے مربوط کرتے ہیں۔

جناب سید احمد فہری
ترجمہ: جناب سید حسین مہدی حسینی

علم و تعلیم شہید ثانی و امام خمینی کی نظر میں

درس و تدریس میں خدا پر بھروسہ

اب تک درس و تدریس سے متعلق دو شرطیں یعنی اخلاص عمل اور اپنے علم کے مطابق عمل کرنے کا تذکرہ شہید نے فرمایا تھا۔ اب تیسری شرط کا تذکرہ فرمارہے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان فقط خدا سے لو لگائے رہے، اس کے علاوہ کسی ذات پر اعتماد اور بھروسہ نہ رکھے، تاکہ اس طرح فیض الٰہی مبدء فیاض سے حاصل کرسکے ۔ جیسا کہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

علم یہ نہیں ہے کہ انسان اس کی تحصیل میں بے پناہ جد و جہد کرے، بلکہ علم ایک نور ہے خدا جس کی ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کے دل میں ڈال دیتا ہے۔

طالب علم کو چاہئیے اس راہ میں خدا پر بھروسہ رکھے اور تمام امور کو اس کے سپرد کردے دنیاوی اسباب پر اعتماد و اعتبار نہ کرے، کیونکہ غیر خدا پر بھروسہ اور اسباب ظاہری پر اعتماد کرنے میں گھاٹے اور محرومی کے سوا کچھ بھی نہیں، خدا کے علاوہ اس کی مخلوق میں کسی پر تکیہ نہ کرے، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے امور کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں دیدے، پھر اس کے بعد دیکھے کہ وہ نسیم جاں فزا جو اس کے دیار سے ہو کر گذرتی ہے اور وہ لحظات انس و محبت جس سے وہ سرشار ہوتا ہے کیونکہ اس کی خامیوں کا جبران و مداوا کرتے ہیں اور دل کے مقصد و مقصود کو کیونکہ حاصل کرتا ہے۔

شہید ثانی علیہ الرحمہ اس جگہ تیسری شرط سے متعلق مرسل اعظمؐ کی حدیث نقل کرتے ہیں جس میں حضرت نے فرمایا ہے:۔

پروردگار عالم یوں تو ہر شخص کے رزق کا ضامن ہے لیکن طالب علم کے رزق کا خصوصیت سے کفیل ہے۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ان اللہ تعالیٰ قد تکفل لطالب العلم برزقہ خاصۃ عما ضمنہ لغیرہ

شہید نے حدیث کی مزید ان الفاظ میں توجیہ فرمائی ہے ـــ کہ اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ دوسروں کا فریضہ ہے کہ اپنی روزی پیدا کرنے میں سعی و کوشش کریں، کیونکہ غالباً روزی اس وقت تک نہیں ملتی جب تک اس کے لئے سعی و کوشش نہیں کی جاتی، لیکن طالب علم کے لیے اس قسم کی زحمت نہیں بلکہ اس کو چاہئے کہ خلوص نیت اور عزم محکم کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول رہے، پروردگار عالم بغیر کد و کاوش اس کی روزی اس تک پہنچاتا رہے گا۔

شہید مزید فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں میری نظر میں اس قدر حالات و واقعات ہیں کہ اگر سب کو لکھنے لگوں تو خدا جانے کہاں ختم ہوں۔ اس قسم کے سارے واقعات لطف الٰہی اور نصرت حضرت باری تعالیٰ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ معبود کے لطف کا سلسلہ میری تحصیل کے ابتدائی ایام سے شروع ہوا اور آج تک باقی ہے۔

بہر حال ـــ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" میں اس قسم کی عنایت الٰہی کا خود ہی شاہد ہوں اور جناب شیخ یعقوب کلینی علیہ الرحمہ نے بھی حسین بن علوان کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے جس کا مضمون یہ ہے:

زمانۂ طالب علمی میں ایک بار میرے پیسے ختم ہو گئے، ایک دن کلاس میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے ایک دوست نے سوال کیا ـــ پیسوں کا کچھ حل تلاش کیا، کسی سے توقع ہے کہ تمہاری ضرورت کو برطرف کرے؟ میں نے جواب دیا، فلاں سے توقع ہے۔ یہ سنتے ہی میرے ساتھی نے کہا ـــ خدا کی قسم پھر تمہاری ضرورت کبھی برطرف نہیں ہو سکتی اور نہ کبھی تمہارا مدعا پورا ہو سکتا ہے اور نہ تمہاری مراد پوری ہو گی۔ دوست کے یہ کہنے پر میں نے پوچھا ـــ خدا تمہارا بھلا کرے تم نے یہ سب کیونکر کہا۔ جس

اس نے جواب دیا کہ میں نے کتابوں میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد پڑھا ہے
کہ حضرت نے فرمایا خدا فرماتا ہے:

میں اپنی عزت و جلال اور قدرت و طاقت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس کسی نے میرے علاوہ کسی اور سے لو لگائی اس کی مرادیں بر نہ لاؤں گا بلکہ عوام میں اسے ذلیل و رسوا کر دوں گا، اپنی بارگاہ سے جھڑک دوں گا اور اپنے تقرب سے محروم کر دوں گا، اور اس سے سوال کروں گا کہ کیا تم نے سختیوں میں میرے علاوہ کسی سے مشکل کشائی کی توقع رکھی جبکہ تمام مشکلیں خود میرے اختیار میں ہیں۔ ؟ کیا میرے علاوہ کسی اور سے امیدیں لگائے ہوئے ہو، اور میرے در کے علاوہ کسی اور کے دروازہ پر دستک دے رہے ہو جبکہ بند دروازوں کی کنجیاں میرے ہاتھ میں ہیں اور میرا دروازہ ہر اس شخص کے لئے کھلا ہوا ہے جس نے مجھے پکارا۔ ؟

کیا کوئی ایسا ہے جس نے پریشانیوں میں مجھ سے لو لگائی ہو اور میں نے اس کی مشکل کشائی نہ کی ہو؟ کون ایسا ہے جس نے بڑی سے بڑی مصیبت میں مجھے پکارا ہو اور میں نے اس کی فریاد رسی نہ کی ہو؟ میں نے اپنے بندوں کی آرزوؤں کو محفوظ کر رکھا ہے تاکہ مناسب موقعوں پر اسے پورا کردں لیکن ہمارے بندوں کو یقین نہیں ہے کہ ان کی دعائیں ہمارے یہاں محفوظ ہیں میں نے اپنے تسبیح گذار فرشتوں سے جن کے وجود سے آسمان چھلک رہا ہے یہ کہلایا ہے کہ ہمارے اور ہمارے بندوں کے درمیان جو دروازے ہیں وہ ہمیشہ کھلے رہیں، لیکن ہمارے بندوں کو ہمارے کہے پر اعتبار نہیں ہے کیا انہیں خبر نہیں کہ جس وقت مصیبتیں انہیں آ گھیرتی ہیں اس وقت کسی میں جرأت نہیں کہ میری اجازت کے بغیر اسے برطرف کر سکے ؟ پھر کیا وجہ ہے کہ میں انہیں اپنے سے غافل پاتا ہوں، میں نے انھیں اپنے کرم سے وہ دیا جس کا انہوں نے مجھ سے سوال کبھی نہیں کیا تھا، اور جب میں نے ان

چیزوں کو اس سے چھین لیا تو اس کے بجائے کہ مجھ سے سوال کرتا میرے
علاوہ کسی اور سے لو لگانے لگا، کیا وہ میرے لئے خیال کرتا ہے کہ جب
مجھ سے وہ سوال کرے گا تو اسے نہ دوں گا، درآنحالیکہ میں نے اسے اس وقت
دیا جب اس نے مجھ سے سوال بھی نہ کیا تھا؟ کیا میں بخیل ہوں جو میرے
بندے مجھے بخیل تصور کرتے ہیں؟ کیا جود و کرم میری شان نہیں، اور
بخشش و رحمت میری قدرت میں نہیں؟ کیا آرزوئیں مجھ تک تمام نہیں
ہوتیں، میرے علاوہ کون ہے جو تمناؤں کو منقطع کرے؟ پھر کیا وجہ ہے
کہ میرے بدلے دوسروں سے لو لگاتے ہیں اور مجھ سے ڈرتے نہیں؟
اگر زمین و آسمان کے بھی رہنے والے مجھ سے لو لگائیں تو میں ان میں
سے ہر ایک کو ان سب کی تمناؤں کے برابر عطا کردوں گا، ان ساری بخشش
و عطا کے باوجود ذرہ برابر ہماری سلطنت و ملکیت سے کچھ گھٹے گا نہیں
اور گھٹ بھی کیسے سکتا ہے چونکہ میں خود ہی تو اس کا مدبر و قیم ہوں۔
لعنت ہو ان لوگوں پر جو ہماری رحمت سے ناامید ہیں اور قابل نفرت و
مذمت ہیں وہ افراد جو میری نافرمانی کرتے ہیں اور مجھے حاضر و ناظر نہیں
جانتے۔

حدیث معصوم کے الفاظ یہ ہیں:

قال ان اباعبد الله علیه السلام حدثنی انه قرأ فی بعض الکتب
ان الله تعالی یقول وعزتی وجلالی ومجدی وارتفاعی علی
عرشی لاقطعن امل کل مؤمل غیری بالیاس ولاکسونه ثوب
المذلة عند الناس ولانحینه من قربی ولابعدنه من
وصلی ایؤمل غیری فی الشدائد والشدائد بیدی ویرجو
غیری ویقرع بالفکر باب غیری وبیدی مفاتیح الابواب
وهی مغلقة وبابی مفتوح لمن دعانی فمن الذی املنی

لنوائبہ فقطعتہ دونہا ومن الذی رجانی لعظیمۃ فقطع رجائہ منی جعلت آمال عبادی عندی محفوظۃ فلم یرضوا بحفظی وملأت سماواتی ممن لا یمل من تسبیحی وامرتہم ان لا یغلقوا الابواب بینی وبین عبادی فلم یثقوا بقولی الم یعلم من طرقتہ نائبۃ انہ لا یملک کشفہا احد الا بعد اذنی؟ فما لی اراہ لاہیاً عنی أعطیتہ بجودی مالم یسألنی ثم انتزعتہ عنہ فلم یسألنی ردہ وسأل غیری افترانی ابدأ بالعطاء قبل المسألۃ ثم أسأل فلا أجیب سائلی؟ ابخیل انا فیبخلنی عبدی اولیس الجود والکرم لی اولیس العفو والرحمۃ بیدی؟ اولست انا محل الآمال فمن یقطعہا دونی؟ افلا یخشیٰ المؤملون ان یؤملوا غیری؟ فلو ان اھل سمواتی واھل ارضی امّلوا جمیعاً ثم اعطیت کل واحد منہم مثل ما امّل الجمیع ما انتقص من ملکی مثل عضو ذرّۃ وکیف ینقص ملک انا قیّمہ فیا بؤسا للقانطین من رحمتی ویا بؤسا لمن عصانی ولم یراقبنی۔

اس روایت کو مرحوم صاحب کافی نے حسین بن علوان کے علاوہ سعید بن عبدالرحمٰن کے حوالہ سے بھی نقل فرمایا ہے۔ حدیث کے آخر میں اتنا اضافہ ہے:۔
راوی کہتا ہے کہ میں نے امام صادقؑ سے عرض کی: اے فرزند رسولؐ مجھے یہ حدیث "املاء" فرمادیں اس کے بعد پھر کسی قسم کی فرمائش نہ کرونگا۔
(میری نظر میں یہاں املاء سے مراد لکھوانا ہے لہٰذا حضرت نے اس کی فرمائش کے بعد اسے لکھوایا اور راوی نے بھی لکھا۔ احمد فہری)

جناب شہید ثانی علیہ الرحمہ اس حدیث کے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔
طلاب عزیز و مدرسین محترم! یہ حدیث جس کی نورانیت لوح محفوظ سے مطلع نبوت تک پہونچی اور پھر افق امامت کے ذریعہ ساری دنیا میں ضوبار ہوگئی ہمیں اعتماد و توکل کی ترغیب دلاتی ہے توکل و اعتماد کے موضوع پر اس سے جامع انداز میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔
درس و تدریس کے ذیل میں ان تین اہم شرطوں یعنی ــــــــ

۱- اخلاص عمل
۲- طہارت نفس (یعنی بری باتوں سے بچنا اور اچھائیوں کو اپنانا)
۳- خدا پر اعتماد رکھنا اور غم دوراں سے ذہن کو خالی رکھنا تاکہ دلچسپی سے علم حاصل کر سکے ــــ کا تذکرہ کرتے ہوئے دوسری شرطوں مثلاً حسن خلق، پاکیزگی نفس، پامردی و حوصلہ، پابندی شریعت اور شعائر اسلامی کی عزت و توقیر کا بھی ذکر فرمایا ہے چونکہ ان شرطوں کی بھی بازگشت گذشتہ شرطوں کی طرف ہے لہٰذا کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ترک کر رہا ہوں۔

درس و تدریس کے آداب :

شہیدؒ نے اس باب میں آداب درس و تدریس کی دوسری قسم کا تذکرہ فرمایا ہے جس کی رعایت معلم و طالب علم پر ضروری ہے جو حسب ذیل ہے :-
تحصیل علم میں طالب علم کو مباحثہ کرنے، حاشیہ لکھنے، غور و فکر کرنے، اور مطالعہ کرنے کی بھی عادت ڈالنی چاہئے کیونکہ تعلیم میں ان باتوں کو خاصا دخل ہے اور جب تک شدید ضرورت نہ ہو کسی اور کام میں مشغول نہ ہو[1]

---

[1] تحصیل علم کے آداب سے متعلق گذشتہ علماء و دانشوروں کے واقعات ملتے ہیں جس میں سے صرف دو کا تذکرہ کر رہا ہوں
فاضل جلیل مرحوم تنکابنی نے اپنی کتاب "قصص العلماء" میں مرحوم آخوند ملا محمد مہدی نراقی کے حالات کا

۲۔ آداب درس و تدریس میں یہ ہے کہ اگر کسی سے سوال کرے تو سوال کا مقصد یہ نہ ہو کہ پوچھنے والا کسی زحمت میں مبتلا ہو یا سوال کے ذریعہ دوسروں کے سامنے اسے عاجز و بے خبر ثابت کرے بلکہ پوچھنے کا مقصد صرف معلوم کرنے یا رضائے خدا کے لئے ہونا چاہئے، یا اگر استاد شاگرد سے کوئی سوال کرے تو اس کا مقصد اسے راہ خیر و ثواب بتانا ہو، جب یہ انداز ہوتا ہے تب کہیں جا کر علم مفید و پر برکت ہوتا ہے۔ لیکن اگر کہیں سوال کا مقصد خود نمائی یا بحث و مباحثہ یا دل میں یہ آرزو ہو کہ مخاطب پر غلبہ پا جائیں اور وہ مجھ سے شکست کھا جائے، تو یہ انداز اس کے وجود میں حُب جاہ و ہوس جیسی رذیل عادتوں کو جنم دیتا ہے اور اندر ہی اندر ریاست طلبی کا مذموم درخت شاداب ہوتا رہتا ہے، جسکی وجہ سے وہ خدا کے غیظ و غضب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ انداز خود برا ہے لیکن اس کے نتیجہ میں اسے اور گناہ کا مرتکب ہونا پڑتا ہے مثلاً مخاطب کو اذیت پہنچانا، اسے نادان تصور کرنا، مومن کی توہین کرنا وغیرہ جیسے امور جسے اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ مثلاً اسلام کا حکم ہے کہ اپنے نفس کا تزکیہ کرو۔ لیکن جب سوال علم و آگاہی کی غرض سے نہ ہو تو اس سے خود نمائی کا اظہار ہوتا ہے جبکہ روایات میں خود نمائی سے روکا گیا ہے۔

امام صادق علیہ السلام کی حدیث ہے:

المراء داءٌ ردیٌ ولیس فی الانسان خصلة شر منه وهو خلق ابلیس ونسبته ولا یماری فی ای حال کان الا من کان جاهلاً بنفسه وبغیره محروماً من حقایق الدین .....

خود نمائی بد ترین مرض ہے انسان میں اس سے بُری کوئی عادت نہیں، خود نمائی ابلیس کے عادات و اطوار میں سے ہے، انسان خود نمائی اسی وقت کرے گا جب نہ اپنے

سے تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانہ تحصیل میں گھر سے آنے والے خطوط کو اس خوف سے کہ کہیں اسمیں کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے تعلیم پر اثر پڑے پڑھے بغیر بستر کے نیچے ڈال دیتے تھے۔ مرحوم نراقی کے والد شہر نراق میں ڈاکخانہ میں کسی معمولی پوسٹ پر ملازم تھے، ان کے والد کا قتل ہوا لوگوں نے مرحوم نراقی کو ان کے باپ کے قتل کی خبر دی کہ تمہارے باپ قتل کر دئے گئے ہیں تم فوراً وطن آؤ لیکن مرحوم نراقی نے حسب عادت خط پڑھے بغیر رکھ دیا جب اہل وطن انتظار کرتے کرتے تھک کر مایوس ہو گئے تو مرحوم نراقی کے استاد مرحوم ملا اسماعیل کو لکھا کہ آخوند

کو پہچانتا ہوگا اور نہ مخاطب کو خود نمائی کرنے والا حقیقت دین سے پوری طرح بے خبر ہے۔

۳۔ تیسری چیز جس کی رعایت درس و تدریس میں رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ انسان جب کسی بات کو نہ جانتا ہو تو اسے معلوم کرنے میں گریز نہ کرے خواہ کسی ایسے ہی سے کیوں نہ پوچھنا پڑے جو سن و سال مرتبۂ علمی، اور اجتماعی طور سے اس کے مقابلہ میں کم رتبہ ہو، جس کسی سے بھی علمی استفادہ ممکن ہو اس سے بہرہ مند ہونا چاہئے، کیونکہ اگر تحصیل علم میں ان باتوں کو مدنظر رکھا تو سوائے گھاٹے کے اور کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔

مرسل اعظمؐ نے اسی لئے فرمایا ہے:

الحکمة ضالة المومن فحیث وجدها فهو احق بها

حکمت مومن کا کھویا ہوا سرمایہ ہے جس جگہ اپنا کھویا ہوا سرمایہ پا جائے دوسروں کی بہ نسبت وہ اس کے اٹھانے کا زیادہ حقدار ہے۔

جناب زرارہ محمد بن مسلم اور برید عجلی کہتے ہیں کہ حضرت امام صادقؑ نے فرمایا:

انما یهلك الناس لانهم لا یسئلون

لوگ اس لئے ہلاک ہوتے ہیں کہ سوال نہیں کرتے۔

ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

ولیس العمی طول السوال وانما

تمام العمی طول السکوت علی الجهل

کسی بات کو نہ جانتے ہوئے سوال کرنا یہ کورچشمی نہیں ہے بلکہ کورچشمی یہ ہے کہ جہالت کے باوجود سوال نہیں کرتا۔

ملا مہدی کے والد قتل کر دئے گئے ہیں انھیں فوراً وطن روانہ کیجئے۔ ملا مہدی نراقی حسب عادت استاد کی خدمت میں درس کے لئے حاضر ہوئے تو دیکھا استاد مغموم و محزون بیٹھے ہیں ملا مہدی نراقی نے درس شروع کرنے کی خواہش کی جس کے جواب میں استاد نے فرمایا۔ تم ابھی اپنے وطن جاؤ تمہارے والد یا مریض ہیں یا زخمی۔ جس وقت ملا مہدی نے یہ سنا، کہا۔ خدا ان کی حفاظت فرمائے اور پھر استاد سے عرض کی آپ درس دیں

توحید ۸۸

امام صادق علیہ السلام کی یہ بھی حدیث ہے کہ ــــ

ان ھٰذا العلم علیہ قفلٌ و مفتاحہ المسئلۃ

علم پر قفل لگا ہوا ہے اور سوال اس کی کنجی ہے۔

۴۔ چوتھی شرط تحصیل علم کی جو اور شرطوں کی بہ نسبت اہم بھی ہے وہ یہ ہے کہ طالب علم خدا کا مطیع واطاعت گذار رہے۔ اور اگر کوئی غلطی ہو جائے اور غلطی کی طرف متوجہ بھی ہو جائے اگرچہ اسے کسی معمولی سے ہی شخص نے متوجہ کیوں نہ کیا ہو ۔ اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے خدا کے سامنے سر جھکا دے۔

خدا کی اطاعت و بندگی واجب شرعی و تکلیف الٰہی ہونے کے ساتھ ساتھ علم کے فیوض و برکات کی نشاندہی کرتی ہے اور خدا کی بندگی نہ کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نفس میں کبر و نخوت کا شجر سرسبز و شاداب ہو رہا ہے۔ کبر کے پیدا ہو جانے کے بعد انسان خدا کی رحمت اور اس کی بارگاہ سے دور ہوتا رہتا ہے جیسا کہ مرسل اعظمؐ کا ارشاد ہے :۔

لا یدخل الجنۃ من فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر

وہ شخص داخل جنت نہیں ہوگا جسمیں ذرہ برابر بھی کبر و غرور ہوگا۔

ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ اگر ایسا ہے تو ہم سبھی اہل جہنم ہیں کیونکہ ہم میں سے ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ کپڑے اور جوتے زرق برق ہوں۔ حضرت نے فرمایا یہ کبر و غرور نہیں ہے بلکہ کبر و غرور یہ ہے کہ حق کو پہچان کر اس کا اعتراف نہ کرے اور عوام کو ذلیل کرے۔

یہ حدیث اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ حق کو چھوٹے بڑے، معمولی، غیر معمولی

جب استاد نے یہ انداز دیکھا تو فرمایا ــــ تمہارے والد قتل کر دئے گئے ہیں۔ لیکن اس خبر کے سننے کے باوجود استاد سے درس کی خواہش کی، آخرکار استاد نے وطن جانے کا حکم دیا۔ استاد کے حکم سے وطن پہنچے اور صرف تین روز قیام کے بعد دوبارہ واپس ہوئے اور اسی طرح مصروف تعلیم ہو گئے۔

۲۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ اس نے ایک دن ریڈیو سے مرحوم استاد جلال ھمائی کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ انہوں نے کہا ــــ میں (جلال ھمائی) مرحوم آیۃ اللہ حاج شیخ ہاشم قزوینی استاد معروف حوزہ علمیہ مشہد کا زمانۂ شباب میں مباحث (کلاس فیلو) تھا، ایک مباحثہ کے درمیان ان کی حالت بگڑ گئی اور بے ہوش ہو گئے

جسے بھی پائے قبول کرلے، قبول نہ کرنا اس بات کی نشاندہی ہے کہ کبر و نخوت نے اس کے دل پر راہ پیدا کرلی ہے اور سعادت و کامرانی شدید خطرہ میں پڑچکی ہے۔

میں نے وحشت اور الجھن میں ایک طبیب کو بلالیا، طبیب نے دیکھنے کے بعد کہا ــــ "شربت قند پلاؤ" خدا کا کرنا شربت بہت مفید تھا جیسے ہی شربت پلایا آنکھیں کھول دیں اور اٹھ بیٹھے اور تعجب یہ ہے کہ پھر مباحثہ کے لئے آمادہ ہوگئے مجھ سے پوچھا "کہاں تک پہنچا تھا"؟ عبرت کی جگہ تو یہ ہے کہ طبیب نے کمرہ سے نکلتے وقت مجھے اشاروں سے بلایا اور آہستہ سے کہا کہ ــــ بے ہوشی کی وجہ فاقہ ہے، جس قدر جلد ہو سکے انہیں کھانا کھلاؤ، جب میں نے پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ دو تین دن سے کھانا نہیں کھایا تھا۔

طلاب عزیز بقول حافظ ؎

ناز پرورد تنعم نبرد راہ بہ دوست ∴ عاشقی شیوۂ مردان بلاکش باشد

جناب ڈاکٹر مہدی گلشنی
ترجمہ: جناب سید ولی الحسن رضوی

اسلامی معاشرہ میں علم و صنعت کے نقوش

اسلامی معاشرہ کی ترقی و استحکام میں علوم طبیعی کا کردار:

جیسا کہ قرآن مجید کی صریحی نص موجود ہے کہ دین اسلام ایک عالمی دین ہے:

قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً (الاعراف / ۱۵۸)

(اے رسولؐ!) کہہ دیجئے لوگو! میں تم سب کے لئے اللہ کا رسولؐ ہوں۔

وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیراً و نذیراً (سبا / ۲۸)

اور ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ تم تمام انسانوں کو بشارت دو اور ڈراتے رہو۔

اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اسلام کا مقصد ایک توحیدی معاشرہ قائم کرنا ہے کیونکہ قرآن کی آیت، وجعل کلمۃ الذین کفروا السفلیٰ و کلمۃ اللہ ھی العلیاء (سورہ توبہ / ۴۰) (خدا نے کافروں کی بات کو نیچی کر دکھایا ہے اور خدا ہی کا بول بالا ہے) ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ اسلامی معاشرہ کو دنیائے کفر کے خطرات سے محفوظ و مامون رکھیں۔ ظاہر ہے اس کے لئے اسلامی معاشرہ کا ایک "مستقل معاشرہ" ہونا ضروری ہے۔ قرآن کی آیت: ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلاً (سورہ نساء / ۱۴۱) یعنی خداوند عالم نے مومنین پر کافروں کی بالادستی کی کوئی راہ ہرگز کھلی نہیں چھوڑی ہے۔ نیز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول یہ حدیث: الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ[1] یعنی اسلام سب سے ارفع و اعلیٰ

---

[1] صدوق: من لا یحضرہ الفقیہ (جلد ۴ ص ۲۳۴ طابع مکتبہ الصدوق)۔ یہ حدیث صحیح بخاری (کتاب الجنائز) اور سیوطی کی الجامع الصغیر (جز اول ص ۱ طبع دمشق) میں مندرجہ ذیل الفاظ میں آئی ہے: الاسلام یعلو ولا یعلی

ہے کوئی بھی اس پر فضیلت و برتری نہیں رکھتا۔

ان دونوں سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کو کسی منزل میں بھی غیروں کا تسلط قبول نہیں کرنا چاہئے بلکہ انہیں اپنے آپ کو ہر رخ سے مستحکم اور پائیدار بنانا چاہئے، اسی بنیاد پر فقہائے اسلام کا فیصلہ ہے کہ ہر وہ کام جو مسلمانوں پر کفار کے غلبہ حاصل کر لینے کا باعث ہو حرام ہے اور ہر وہ چیز جو اسلامی معاشرہ کو استحکام عطا کرنے کے لئے لازم ہو واجب کفائی ہے۔[1] خود پروردگار عالم نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ کی حفاظت کے لئے خود کو ہر امکانی طور پر آمادہ کریں۔

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون

به عدو الله وعدوكم (الانفال/٦٠)

یعنی ان (دشمنان اسلام) کے مقابلہ میں حتی المقدور جتنی طاقت (فوج) اور تربیت یافتہ گھوڑے مہیا کر سکتے ہو آمادہ رکھو تاکہ ان کے ذریعہ خود تمہارے اور خدا کے دشمنوں پر خوف و دہشت طاری رہے۔

چونکہ آج کا دور علم وصنعت (سائنس اور ٹکنالوجی) کا دور ہے اور تمام امور ان ہی کے محور پر گھوم رہے ہیں یہ دونوں چیزیں قوموں کی برتری کا ایک اچھا پیمانہ بن چکی ہیں لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ تمام علوم وفنون، جو ان کو استحکام واستقلال عطا کرنے کے ضامن ہیں، حاصل کریں اور اس کے لئے بہترین ماہرین کی تربیت کر کے اسلامی معاشرہ کو بہتر سے بہتر فنی امکانات سے بہرہ ور کریں تاکہ دوسروں کے محتاج نہ رہیں ۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ جب سے

---

[1] فقہانے ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلاً کے ذیل میں استدلال کیا ہے کہ خداوند عالم نے ایک بھی ایسا حکم تشریع نہیں کیا ہے جو غیر مسلم فرمانرواؤں کے مسلمانوں پر تسلط حاصل کر لینے کا باعث ہو چنانچہ اس بنیاد پر بہت سے مطالب اخذ کئے گئے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ اگر کسی بچے کا باپ مسلمان ہو اور ماں غیر مسلم ہو تو ماں اس بچہ کی پرورش کا حق نہیں رکھتی۔ اسی طرح علماء کہتے ہیں کہ کسی مسلمان کو اس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ وصیت کے تحت اپنے چھوٹے (نابالغ) بچوں کو کسی غیر مسلم کی کفالت میں دے اور اگر ایسا کرتا ہے تو اس کی وصیت باطل سمجھی جائیگی سمجھی جائے گی۔ علماء کہتے ہیں کہ

مسلمانوں نے علوم طبعی سے اپنے آپ کو کنارہ کش کیا ہے دوسروں کے محتاج و دست نگر ہو کر رہ گئے ہیں، جیسے جیسے زمانہ ترقی کر رہا ہے ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ابن اخوہ جو ساتویں صدی ہجری میں شافعی مسلک کے محدثین میں سے گذرے ہیں، اپنی کتاب "معالم القربۃ فی الاحکام الحسبۃ" جس کا فارسی زبان میں "آئین شہرداری" کے نام سے ترجمہ ہو چکا ہے، فرماتے ہیں[1]:

"علم طب (ڈاکٹری) واجب کفائی ہے لیکن آج ہمارے دور میں مسلمان اس کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ کتنے شہر ایسے ہیں جہاں ذمیوں کے علاوہ کوئی ڈاکٹر نہیں ملتا جبکہ طبی معاملات میں انکی شہادت (سرٹیفکیٹ) قبول کرنا درست نہیں ہے۔ اس زمانے میں کوئی مسلمان ایسا نہیں ملتا جو علم طب میں مہارت رکھتا ہو حالانکہ علم فقہ میں خصوصاً اخلاقی اور جدلی (مناظرانہ) مسائل میں خوب غور و فکر کرتے ہیں۔ شہر ایسے فقہاء سے بھرے پڑے ہیں جو فتویٰ دینے نیز مختلف واقعات کے جواب دینے میں سرگرم رہتے ہیں۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ ایک واجب کفائی جسمیں ایک پوری جماعت لگی ہوئی ہے اس میں اس قدر سرگرمی دکھانے کی کیا وجہ ہے جبکہ ایک دوسرا کام جو واجب ہونے کے باوجود متروک پڑا ہوا ہے اس کو کس طرح نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔"

افسوس!! آج علوم دینیہ جس افتاد میں مبتلا ہیں، ہمیں خداوند عالم سے دعا کرنی چاہئے کہ وہ اس بیجا غرور و گمراہی سے نجات عطا کرے۔

اگر ابن اخوہ کو ساتویں صدی ہجری میں یہ شکایت تھی کہ ان کے زمانہ میں اسلامی معاشرہ کے اکثر ڈاکٹر یہودی اور عیسائی تھے اور مسلمانوں نے علم طب کو ترک کر رکھا تھا تو آج

ــــہ غیر مسلم باپ اپنی اولاد کا ولی بننے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "کسی غیر مسلم حاکم کا حکم اگرچہ حق ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کے حق میں قابل اجرا نہیں ہے۔ نیز اسی کے مثل اور بھی احکام ہیں (تفسیر الکاشف، محمد جواد مغنیہ جلد ۲ صفحہ ۴۶)

[1] آئین شہرداری (ترجمہ معالم القربۃ، ص ۱۷۰)

جبکہ ہم پندرہویں صدی ہجری میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مسلمانوں کے تمام اقتصادی وسائل دوسروں کے ہاتھوں استخراج کئے جا رہے ہیں، ان کے فوائد دوسروں کو حاصل ہو رہے ہیں۔ اور مسلمان ہر اعتبار سے شرق و غرب کی بڑی طاقتوں سے وابستہ نظر آتا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

دی روز مسلم از شرف علم سربلند
امروز پشت مسلم و اسلامیاں خم است

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن نے اعلان کر دیا کہ ہرگز کفار، مومنین پر تسلط و غلبہ حاصل نہیں کر سکتے تو آج مسلمانوں پر کافر قومیں کیوں مسلط ہو گئی ہیں؟!

اس کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ عصر حاضر کا مسلمان دراصل سچا مومن ہی نہیں رہ گیا ہے۔ وہ اپنی اسلامی ذمہ داریوں کو یکسر فراموش کر چکا ہے نہ تو اس کے اندر وحدت اسلامی کی کوئی قدر باقی رہ گئی ہے نہ ہی ضروری علم و آگہی کا اس کے یہاں نام و نشان ملتا ہے۔ جبکہ اسلام نے حصول علم مہد سے لحد تک واجب و لازم قرار دیا ہے۔ کیا قرآن کی اس واضح تاکید کے بعد کہ: واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ترھبون بہ عدو اللّٰہ مسلمانوں کی ذمہ داری نہیں ہے کہ خود اپنے استحکام و استقلال نیز خدا کے دشمنوں پر خوف و دہشت طاری رکھنے کے لئے اپنے کو ہر اعتبار سے مسلح و آراستہ کریں۔؟ آج دنیائے اسلام نے اپنے آپ کو کس میدان میں آمادہ کیا ہے؟ قرآن کی سخت تاکید کے باوجود ہم نے اسلامی معاشرہ کو ایک مستحکم اور پائدار معاشرہ میں بدلنے کے لئے کیا اقدامات کئے ہیں؟ جبکہ اسلام نے حتی کہ معمولی سے ارث کے مسئلہ میں بھی کفار کی محکومی پسند نہیں کی ہے۔[1] آخر کیا وجہ ہے کہ مسلمان سر سے پیر تک

---

[1] مذاہب خمسہ (جعفری، حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی) اس بات پر متفق ہیں کہ غیر مسلم کسی مسلمان کی ارث کا وارث نہیں ہو سکتا (محمد جواد مغنیہ: "الفقہ علی المذاہب الخمسہ" ص۲۹۹ طبع دار العلم للملایین بیروت) امام محمد باقر علیہ السلام نے اس حکم شرعی کے فلسفہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے: ان اللّٰہ عزوجل لم یزدنا بالاسلام العزا، فنحن نرثھم وھم لا یرثونا

←

شرق و غرب کا محتاج ہو کر رہ گیا ہے ؟!

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں دنیائے اسلام کی موجودہ صورت حال پر ایک مختصر سی نظر ڈال لی جائے۔ آج تقریباً پچاس ایسے ملک پائے جاتے ہیں جن پر "اسلامی ملک" کا ٹائٹل چسپاں ہے۔ یہ ممالک دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ اور یہ دنیا کے تقریباً پانچویں حصہ پر محیط ہیں۔ پچاس فی صد سے بھی زائد تیل کی پیداوار مسلمانوں کے اختیار میں ہے۔ دیگر قدرتی پیداوار کے لحاظ سے بھی مسلمان مالا مال ہیں پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان ممالک غذائی اعتبار سے بھی، علمی و فنی اعتبار سے بھی اور دفاعی لحاظ سے بھی غیروں کے دست نگر بنے ہوئے ہیں۔ اور اپنی اکثر ضرورتوں کو شرقی و غربی بلاک سے پورا کرتے ہیں۔ اس وقت اسلامی ممالک کی غذائی ضرورتیں ان کی پیداوار سے کہیں زیادہ ہیں۔ ادھر گذشتہ چند برسوں میں غذائی اشیاء کی پیداوار میں اسلامی ممالک نے اوسطاً ۲،۵ فی صد اضافہ کیا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں ان ممالک کی آبادی کی شرح میں تقریباً ۳ فی صد اضافہ ہوا ہے۔

تعلیمی معیار کا یہ عالم ہے کہ صنعتی ممالک میں پڑھے لکھے لوگوں کی شرح ۹۵ فی صد اور تیسری دنیا کے ممالک میں ۵۵ فی صد ہے جبکہ اسلامی دنیا میں اس کی شرح فقط ۳۴ فی صد بتائی جاتی ہے۔ امریکہ، روس اور جاپان کے بارہ میں یہ شرح ۹۹ فی صد، چین میں ۵۶ فی صد اور پاکستان میں صرف ۲۱ فی صد نظر آتی ہے۔

(صدوق، من لا یحضرہ الفقیہ جلد ۴ / ۲۴۳ — مطبوعہ: مکتبۃ الصدوق)

یعنی خداوند عالم نے اسلام میں کوئی حکم ایسا صادر نہیں فرمایا جو ہماری عزت میں اضافہ کا سبب نہ ہو پس ہم اہل کتاب سے ارث کے حقدار ہیں اور ہماری ارث سے محروم قرار دئے گئے ہیں۔

۵ سال سے ۱۹ سال تک کی عمر کے لوگوں میں اسکول یا مدرسہ جانے والے افراد کی اوسط

شرح درج ذیل ہے :-

صنعتی ممالک ۷۵ فی صد

تیسری دنیا کے ممالک ۴۸ فی صد

اسلامی ممالک ۴۰ فی صد

۲۰ سال سے ۲۴ سال تک کی عمر کے افراد میں جو کالج یا یونیورسٹی جاتے ہیں ان کی فی صد شرح

اس طرح ہے۔

صنعتی ممالک ۳۲ فی صد

تیسری دنیا کے ممالک ۹ فی صد

اسلامی ممالک ۴ فی صد

ماہ مئی ۱۹۸۳ء میں منعقدہ تنظیم فکر اسلامی کانفرنس کی اسلام آباد نشست میں پیش کی جانے والی ایک رپورٹ کے مطابق کل اسلامی ممالک میں تحقیقاتی و ترقیاتی امور میں مشغول افراد کی تعداد تقریباً ۴۵ ہزار افراد پر مشتمل بتائی گئی ہے جبکہ صرف روس میں ان کی تعداد ڈیڑھ لاکھ اور جاپان میں ۴ لاکھ کے قریب ہے۔ اسرائیل میں انکی تعداد ۱۹۷۴ء میں تقریباً ۲۵ ہزار تھی اور اسی سال ایران میں ان کی تعداد محض ۴ ہزار ۹ سو افراد پر مشتمل تھی۔

ایک اندازہ کے مطابق امریکہ میں ہر سال تقریباً پچاس ہزار طلبہ کالج اور یونیورسٹیوں سے فارغ ہوتے ہیں اور جاپان میں جس کی آبادی امریکہ کی نصف ہے اس سے بھی دوگنی تعداد میں طلبہ فارغ ہوتے ہیں جبکہ اس کے مقابلہ میں وہ اسلامی ممالک جن کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ افراد پر مشتمل ہے (اور ایسے تقریباً ۲۸ ممالک ہیں) کالج اور یونیورسٹی سے فارغ ہو کر نکلنے والے طلبہ کی تعداد ۵ ہزار سے زائد نہیں ہے۔

۱۹۷۶ء میں مجموعی طور پر تقریباً تین لاکھ ۵۲ ہزار افراد نے پوری دنیا میں علمی و تحقیقی مقالہ تحریر کئے جن میں ۹۴.۵ فی صد یعنی تین لاکھ ۳۳ ہزار مقالے صنعتی ممالک میں لکھے گئے جبکہ ان کی آبادی دنیا کی صرف ایک چوتھائی ہے۔ تیسری دنیا میں جو دنیا کی تین چوتھائی آبادی

پر مشتمل ہے کل ۱۹ ہزار مقالے سپرد قلم کئے گئے اور اس میں بھی ۷ فی صد یعنی محض تین ہزار تین سو مقالے اسلامی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں پوری دنیا کے مقابلہ میں اسلامی دنیا کا صرف نو فی صد تعاون رہا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس میں بھی دو تہائی مقالہ مصر، نائجیریا، ایران، ترکی، ملیشیا اور پاکستان میں لکھے گئے ہیں[1]

اگر سال میں ہونے والی ایجادات و اختراعات کو دیکھا جائے تو امریکہ یا روس میں انکی تعداد تقریباً ۵۰ ہزار سالانہ ہوتی ہے جبکہ تمام اسلامی ممالک میں مجموعی طور پر بھی ان کی تعداد ۵ سو تک بھی نہیں پہونچ پاتی۔ امریکہ میں ہر چھ سو افراد پر ایک ڈاکٹر اور روس میں ہر تین سو افراد کے لئے ایک ڈاکٹر ہوتا ہے جبکہ پاکستان میں تین ہزار افراد کے لئے ایک اور ایران میں ۴ ہزار افراد کے لئے ایک ڈاکٹر پایا جاتا ہے۔

ظاہر ہے اس افسوسناک صورت حال سے دوچار اسلامی ممالک کا مغربی دنیا پر انحصار کرنا اور مستقبل میں بھی ان سے وابستگی برقرار رہنا لازمی ہے مگر یہ کہ اسلامی ممالک اپنے کو غذائی میدان میں خود کفیل بنائیں علمی و فنی اعتبار سے اپنے کو مکمل طور پر مضبوط اور آمادہ کریں، اور وہ بھی معمولی طور پر نہیں بلکہ جہاد کے انداز میں۔ جبتک مجاہدانہ طرز و روش پر اقدامات نہیں کئے جاتے مغربی اقتصاد و ثقافت کے چنگل سے اسلامی دنیا کے آزاد ہونے کا بہت کم امکان پایا جاتا ہے۔

امام خمینی اپنی کتاب تحریر الوسیلہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

لو خیف علی حوزۃ الاسلام من الاستیلاء السیاسی والاقتصادی المنجر الی اسرھم السیاسی والاقتصادی ووھن الاسلام والمسلمین وضعفھم یجب الدفاع بالوسائل المشابہ[2]!

---

[1] نومبر ۱۹۸۳ء میں "علم اور سیاست اسلامی" کے موضوع پر اسلام آباد (پاکستان) میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ مذکورہ اعداد و شمار اس کانفرنس میں پیش کئے جانے والے مقالات سے اخذ کئے گئے ہیں۔

[2] امام خمینی "تحریر الوسیلہ" جلد اول ص ۴۸۵

یعنی اگر اسلامی معاشرہ پر دشمن کا سیاسی واقتصادی تسلط اس منزل کو پہونچ جائے کہ خطرہ محسوس کیا جانے لگے کہ اب دشمن اسلامی معاشرہ کو اپنا سیاسی واقتصادی قیدی اور باج گزار بنا لیگا اور اسلام نیز مسلمانوں کی تحقیر وشماتت کا سبب ہوگا اور ان کو کمزور بنا دے گا تو اس صورت میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسی طرح کے وسائل اپنا کر جن سے دشمن کام لیتا ہے اپنا دفاع کریں۔

ہم یہاں دو اہم نکتوں کی طرف متوجہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں :۔

الف: اسلام کی نظر میں وہ چیز جو علم کو صحیح راہوں پر کاربند رکھتی ہے "ایمان" ہے قرآن نے علم کے ساتھ ساتھ ایمان کو ضروری جانا ہے۔ سب سے پہلی آیت جو پیغمبر اسلامؐ نازل ہوئی اسمیں پڑھنے کا ہی حکم دیا گیا ہے (اقرأ باسم ربک الذی خلق۔ سورۃ العلق/۱) لیکن پڑھنا خدا کے نام کے ساتھ وابستہ قرار دے دیا گیا ہے یعنی علم خدا کا نام لے کر حاصل کرنا چاہیئے نہ کہ شیطان کا۔ اہل ایمان جب علم حاصل کرتے ہیں تو اس کے ذریعہ عمل صالح انجام دیتے ہیں لیکن جب یہی علم بے ایمان افراد تک پہونچتا ہے تو تخریب کاری کا ذریعہ بن جاتا ہے ایسے مذموم کاموں کی فہرست طویل ہے جو بے ایمان علماء کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ارشاد ہوتا ہے۔

الا ان شر الشر شرار العلماء وان خیر الخیر خیار العلماء[1]

بدترین برائی بدکردار علماء اور بہترین نیکی نیک سیرت علماء ہیں۔

اور بقول مولوی[2]:

بدگہر را علم وفن آموختن ÷ دادن تیغ است دست راہزن
تیغ دادن در کف زنگی مست ÷ بہ کہ باشد علم ناکس را بدست
علم ومال ومنصب وجاہ وقران ÷ فتنہ آرد در کف بدگوہران
پس غزا زین فرض شد بر مومنان ÷ تا ستانند از کف مجنون سنان

---

۱ شیخ زین الدین عاملی (شہید ثانی): منیۃ المرید فی اداب المفید والمستفید (ص ۵۲ طبع قم)
۲ مولانا روم۔

قرآن نے بھی مسلمانوں کی برتری کے لئے با ایمان ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:
ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الأعلون ان کنتم مؤمنین (آل عمران/۱۳۹)
سستی نہ کرو، غمگین نہ ہو اگر تم لوگ ایمان میں ثابت قدم رہو گے تو اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہو جاؤ گے۔
"ولو ان اھل القری امنوا و اتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض ....." (الاعراف/۹۶)
اگر ان آبادیوں میں زندگی گزارنے والے افراد ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان و زمین کی برکتوں کا دروازہ ان کے لئے کھول دیتے۔
و للہ العزۃ ولرسولہ و للمومنین ... (المنافقون/۸)
تمام عزتیں خدا کے لئے اور اس کے رسولؐ کے لئے اور مومنین کے لئے مخصوص ہیں۔
لہٰذا مسلمانوں کو اس بات پر توجہ دینی چاہئے کہ اگرچہ علوم و فنون کا حصول بہت ہی اہم چیز ہے لیکن یہ تنہا کفایت نہیں کر سکتا۔ اسلامی معاشرہ کو استحکام اور پائیداری عطا کرنے کے لئے مادّی و علمی وسائل کے ساتھ ساتھ مکتب اسلام کا وفادار ہونا بھی ضروری ہے اور اسی کو بنیاد و اساس بنا کر لائحہ عمل مرتب کرنا چاہئے۔
قرآنی آیت "ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلاً" کے ذیل میں سید قطب نے بڑی اچھی بات کہی ہے[1] وہ فرماتے ہیں: خداوند عالم نے قطعی وعدہ کرتے ہوئے ایک جامع اصول ہمارے حوالہ کر دیا ہے کہ جب بھی مومنین کے قلوب میں ایمان کی حقیقت گھر کر لیگی ان کی زندگی اسلامی روش اور حکومت اس کے آئین کے مطابق ہو گی اور ان کی ہر خواہش و اقدام خدا کے حکم کے مطابق ہو گا ہر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام میں خدا کا تصور پیش نظر ہو گا تو اس صورت میں ہرگز خداوند عالم کفار کو مومنین پر مسلط ہونے نہیں دے گا ... لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اور کامیابی کے درمیان کوئی زمان و مکان فاصلہ نہ پیدا کرے تو ہمیں اپنے ایمان کی حقیقتوں اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہئے، اور یہ ایمان کی حقیقت ہے کہ اپنے آپ کو قوی و مستحکم کریں اور یہ بھی ایمان کا تقاضا ہے

[1] فی ظلال القرآن ج ۲ ص ۵۶۰/ ۶۱

کہ ہم اپنے دشمنوں پر تکیہ نہ کریں اور خدا کے علاوہ کسی سے شرف و بزرگی کے طالب نہ ہوں۔"

ب : یہ صحیح ہے کہ اسلامی معاشرہ کے استقلال و استحکام کے لئے خود اسلام نے مسلمانوں کو تمام علوم و فنون میں دسترس پیدا کرنے کا شوق دلایا ہے لیکن یہ بھی اصل میں اسی معنویت کی حفاظت و نگہبانی کے لئے ہے۔ یہی معنویت و دیانت وہ بنیادی شئے ہے جس کے لئے خداوند عالم نے قرآن میں جہاں اسلامی معاشرہ کی تقویت کے لئے اس کی دفاعی بنیادوں کو مضبوط و طاقتور بنانے کا حکم دیا: واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله (انفال/٦٠) بلا فاصلہ خدا کے دشمنوں اور معاشرۂ اسلامی کے بدخواہوں کو کمزور بنانا اس کا اصل مقصد بتایا ہے۔ (ترهبون به عدو الله) لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ جہاں وہ مادّی طاقت کو بہتر بنانے کی فکر کرتے ہیں اس کے ضمن میں ہی اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ یہ آمادگی اپنی معنوی زندگی کو بہتر بنانے اور اسلامی مقاصد کی تکمیل پر صرف کرنے کی غرض سے ہونی چاہئے ان کو ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔ چنانچہ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیتیں اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں ارشاد ہوتا ہے :۔

انا جعلنا ما على الارض زينة لها لنبلوهم ايهم احسن عملا (الکهف/٧)

جو کچھ روئے زمین پر ہے ہم نے اسے اس کی زینت قرار دی تاکہ (اس کے ذریعہ) ہم لوگوں کا امتحان لیں کہ ان میں سے کون سب سے اچھے چلن والا ہے۔

وهو الذي خلق السماوات والارض في ستة ايام وكان عرشه على الماء ليبلوكم ايكم احسن عملا ... (هود/٧)

اور وہ تو وہی (قادر مطلق) ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور (اس وقت) اس کا عرش پانی پر تھا، (اور مقصد یہ تھا) کہ تم لوگوں کو آزمائے کہ تم میں اچھی کارگزاری والا کون ہے۔"

نتیجہ :۔

آپ نے مشاہدہ فرمایا کہ اسلام میں تمام امور اور فعالیت کا محور ذات اقدس الٰہی ہے چنانچہ علوم طبیعی (NATURAL SCIENCES) بھی معرفت پروردگار عالم میں اضافہ کا ایک

ذریعہ ہے اور چونکہ یہ توحیدی معاشرہ کو استقلال و استحکام عطا کرنے میں مؤثر ثابت ہوتے ہیں لہٰذا ان کے حصول کی تاکید کی گئی ہے۔ دور حاضر میں جبکہ تمام اسلامی معاشرے مکمل طور پر کفار و ملحدین کے تسلط میں آچکے ہیں، مسلمانوں کی ذمہ داریاں بڑی سخت مراحل میں داخل ہو چکی ہیں۔ قرآن کے اعلان: "واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل" کے بعد تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ ہر رخ سے اپنے آپ کو آمادہ و تیار کریں۔ آج چونکہ موجودہ دنیا کے تمام امور کا دار و مدار سائنس اور علوم تجربی پر ہے لہٰذا اس میدان میں فاصلہ کم کرنے کے لئے امت اسلامی کو قوی و مستحکم بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ تمام اسلامی ممالک کا فرض ہے کہ وہ تحقیقاتی مراکز قائم کریں نیز یونیورسٹی سطح پر تمام لوازمات مہیا کریں اور ہر علمی میدان میں ماہرین کی ایک جماعت تیار کریں۔ البتہ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ابتدائی طور پر بنیادی اسلامی علوم میں دسترس پیدا کریں تاکہ مستقبل قریب میں اپنی علمی وفنی ضرورتوں کا خود ہی تدارک کر سکیں محض دوسروں کی تقلید سے گریز کریں اور اپنی ایجادات و اختراعات سے کام لیں۔ اس علمی تحریک میں اسلامی معاشرہ کو علمی اعتبار سے مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے چند امور کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے:-

۱۔ ظاہر ہے کہ کم سے کم موجودہ حالات میں علوم وفنون کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کو ترقی یافتہ ممالک سے حاصل کرنا پڑے گا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ علوم وفنون کی تحصیل چاہے جس جگہ سے کی جائے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جیسا کہ پیغمبر اسلام نے خود ارشاد فرمایا ہے:

"اطلبوا العلم ولو بالصین"[1]

علم حاصل کرو چاہے چین ہی میں کیوں نہ ملے۔

الحکمۃ ضالۃ المؤمن فحیث وجدھا فھو احق بھا۔[2]

---

[1] مجلسی: بحار الانوار جلد ۲ ص ۹۹، شیخ زین الدین عاملی: منیۃ المرید فی اداب المفید والمستفید ص ۱۸ طبع قم، سیوطی: الجامع الصغیر جزء دوم ص ۲۵۵ طبع دمشق۔

[2] مجلسی: بحار الانوار جلد ۲ ص ۱۰۵

حکمت مومن کا گمشدہ خزانہ ہے پس وہ جہاں بھی مل جائے دوسروں کے مقابلہ میں وہ اس کا زیادہ مستحق ہے۔

خذوا العلم من افواہ الرجال[1]

علم لوگوں کے دہن سے حاصل کرلو۔

اور حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں:

حق علی العاقل ان یضیف الی رأیہ رأی العقلاء ویضم الی علمہ علوم الحکماء[2]

حق تو یہی ہے کہ شخص عاقل صاحبان عقل کی رائے کو اپنی رائے میں اضافہ کرکے اور اہل حکمت کے علوم سے فائدہ اٹھاکر اپنے علم میں جلا پیدا کرتا ہے۔

الحکمۃ ضالۃ المؤمن فاطلبوھا ولو عند المشرک، تکونوا احق بھا واھلھا۔

حکمت مومن کا گمشدہ خزانہ ہے پس اس کو حاصل کرو چاہے وہ مشرک کے پاس ہی کیوں نہ ہو کیونکہ تم اس کے ان سے زیادہ حقدار ہو۔

زمانۂ گذشتہ میں بھی مسلمان دانشوروں نے اسی طریقہ پر عمل کیا ہے البتہ جیسا کہ ان کا طریقۂ کار رہا ہے اور ہمیں بھی اسی نہج پر کام کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ کسب علوم کرتے وقت انتخاب اور تراش و برید کی سخت ضرورت ہے یعنی ہمارا انتخاب اسلامی تصور کائنات کے پرتو میں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ یہی وہ طریقہ ہے جس کے تحت مسلمان، غیروں کے یہاں پائے جانے والے علوم و ثقافت کے وہ عناصر جو اسلامی معاشرہ کے لئے سازگار ہوں قبول کرکے اس میں اسلامی روح پھونک سکتے ہیں۔ فقط اسلامی تصور کائنات کے پرتو میں ہی یہ ممکن ہے کہ مختلف علوم ایک واحد مقصد کے حامل ہوں اور پروردگار عالم کی طرف ہماری رہنمائی کریں۔

۲۔ دوسری چیز جس کا ذکر ضروری ہے، یہ ہے کہ اسلامی تمدن کے عروج کے زمانہ میں مسلمان دانشوروں کا مختلف علوم و فنون کے سلسلہ میں جو انداز و رویہ رہا ہے،

---

[1] مجلسی بحار الانوار جلد ۲ ص ۱۰۵ [2] آمدی غرر الحکم و درر الکلم جلد ۳ ص ۴۰۸ مطبوعہ تہران یونیورسٹی [3] بحار الانوار جلد ۲ ص ۹۷

ہم ان کو دوبارا زندہ و رائج کریں۔ انکی نظر میں کسی دینی معارف اور علوم طبیعی کے درمیان اصلاً کسی طرح کی جدائی یا فرق نہیں پایا جاتا تھا وہ دونوں کا ایک ہی مقصد تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ علوم تجربی فطرت میں پائی جانے والی ہم آہنگی اور نظم و ضبط کی نشاندہی کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں ہم خالق فطرت تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور یہ وہی چیز ہے جو دین کا اصل مقصد ہے۔

اور یہی وہ صحیح طرز فکر تھا جس کی وجہ سے اسلامی تہذیب کے روشن دور میں تمام علوم ایک ہی درسگاہ میں پڑھائے جاتے تھے چنانچہ اکثر مسلم دانشور معارف دینیہ میں بھی مجتہد ہوتے تھے اور علوم طبعیہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

ہمیں اس سنت حسنہ کو دوبارا زندہ کرنا چاہیئے ممالک اسلامی میں قائم یونیورسٹیوں اور مدرسوں میں ایسا نصاب تعلیم رائج کرنا چاہیئے جو سائنس علوم تجربی کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں پر حاوی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ علوم و معارف اسلامی سے بھی بہرہ ور ہو۔ تنہا یہی وہ ایک صورت ہے جو کفر و الحاد نیز شرق و غرب کے فاسد مادی افکار کے اثرات سے طلبہ و محصلین کو محفوظ و مامون رکھ سکتی ہے۔ اس طرح وہ خود ہر طرح کے اچھے اور برے افکار و نظریات کے درمیان تمیز پیدا کر کے اسلامی تصور کائنات کے زیر سایہ علوم و فنون کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔

۳۔ جیسا کہ قرآنی آیات کے مطابق:

واذ قال ربك للملائكة انى جاعل فى الارض خليفة .... (البقرہ/۳۰)

اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں .....

هو الذى جعلكم خلائف فى الارض فمن كفر فعليه كفره ...." (فاطر/۳۹)

اور وہ خدا کی ذات ہے جس نے تم کو زمین پر خلیفہ مقرر کیا ہے۔ پس جس نے کفر اختیار کیا اس کفر کا نقصان خود اسی کے لئے ہے ....

"ثم جعلناكم خلائف فى الارض من بعدهم لننظر كيف تعملون" (یونس/۱۴)

پس ہم نے تم کو زمین پر خلیفہ مقرر کیا تاکہ دیکھیں کہ کس طرح عمل انجام دیتے ہو۔

"ھوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا" (البقرہ/۲۹)

وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے تمہارے لئے زمین پر پائی جانے والی ساری چیزیں پیدا کی ہیں۔

ولقد مکناکم فی الارض وجعلنا لکم فیھا معایش .... (الاعراف/۱۰)

اور ہم نے یقیناً تم کو زمین میں قدرت واقتدار دیا اور اسمیں تمہارے لئے اسباب زندگی مہیا کئے...

خداوند عالم نے اپنے اس وعدہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے عالم فطرت کو ایسے تمام وسائل و امکانات سے مالامال کر دیا ہے جو انسان کے لئے ضروری ہیں، انسان اور کائنات کی دیگر تمام موجودات کی تخلیق و تکوین میں بڑی دلکش ہم آہنگی پیش نظر رکھی ہے تاکہ انسان اپنی ضرورتوں کو آسانی سے پورا کر سکے۔ لھٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے علوم و فنون سے ان اسباب و وسائل کی تلاش و فراہمی میں محض اسلام کے اعلیٰ مقاصد نیز عظیم انسانی مفادات کو پیش نظر رکھ کر استفادہ کریں تاکہ وہ قرآن کریم کے اس خطاب:

کنتم خیر امة اخرجت للناس ... (آل عمران)

تم کیا ہی اچھی امت ہو جو لوگوں کی ہدایت کے لئے پیدا کئے گئے...

کے مصداق قرار پاسکیں۔ مسلمانوں کو ظلم و فساد برپا کرنے یا زمین پر تخریب کاری سے کام لینے کی اجازت نہیں دی گئی ہے بلکہ قرآن کے اعلان کے مطابق:

"..... ھوانشاءکم من الارض واستعمرکم فیھا ..." (سورۂ ہود/۶۱)

وہ خدا وہ ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور تم کو بسا کر اس کو آباد کیا ہے۔

مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ دنیا کی آبادی اور ترقی کے لئے کام کریں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آج مغربی علوم جن کی بنیادیں غلط فلسفوں پر قائم ہیں، تخریب کے سوا کوئی ثمر بخش نتیجہ پیش نہیں کرتے۔ پورا دنیوی معاشرہ اور آج کی ساری توانائی مکمل طور پر درج ذیل آیت کی مصداق نظر آتی ہے:

وإذا تولى سعى في الارض ليفسد فيها... (البقرہ/۲۰۵)

جب وہ اپنے رخ پھیر لیتے ہیں (اور تم سے دوری اختیار کرتے ہیں) تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ زمین پر فساد برپا کریں، کھیتوں اور چوپایوں کو نیست و نابود کر دیں۔

قرآن کریم میں آدم کی داستان جہاں ایک طرف انسان کی عظمت کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کو خلیفۃ اللہ اور اسماء کا جاننے والا بتاتی ہے وہیں ساتھ ہی ساتھ ایک عظیم خطرہ یعنی قوانین الٰہی کی خلاف ورزی خبر دار بھی کرتی ہے۔ ظاہر ہے انسان کو زمین پر خلیفہ خدا اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کو آباد کرے، اللہ کی نشانیوں کو پہچانے اور قدرت و حکمت الٰہی کا مظہر بنے۔

۴۔ اسلامی معاشرہ میں قائم مدارس اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے اخلاق اور تزکیہ نفس پر خاص توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے اس طرح علمی درسگاہوں سے نکلنے والے طلبہ علم سے بھی آراستہ ہوں گے اور دولت ایمان سے بھی مالا مال ہوں گے اور اسی طرح کے علماء و دانشور دنیا کی آبادی و ترقی کے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام کا مشہور قول ہے:

وبالایمان یعمر العلم[1]

ایمان کے ذریعہ علم آباد ہوتا ہے۔

اخلاقی تزکیہ کے بغیر ایک دانشور مغربی طرز کی ایک مشین کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایمان سے عاری علماء و دانشور جاہ و اقتدار اور مال و منال کی ہوس کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتے۔ امام خمینی کے ارشاد کے مطابق:

یہ انسان کو تباہ کرنے والے وسائل اور خود ان کے اپنے خیال کے مطابق جنگی ہتھیاروں میں یہ ترقیاں اس کی اساس ان دانشوروں کے ہاتھوں رکھی گئی ہے جنھوں نے ایسی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی جہاں اخلاق نام کی کوئی شے نہیں پائی جاتی جہاں

---

[1] نہج البلاغہ: ص ۲۱۹ طبع ڈاکٹر صبحی الصالح۔

علم کو تہذیب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔"

اسلام نے اس بات کی ضمانت دینے کے لئے کہ علم مفید امور میں صرف ہو، تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفس کو ضروری قرار دیا ہے۔ انبیاء کی رسالت کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے خود قرآن علم اور تزکیۂ نفس دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کرتا ہے:

یتلوا علیکم آیاتنا و یزکیکم و یعلمکم الکتاب والحکمۃ ..."(بقرہ/۱۵۱)

... تاکہ وہ تمہارے درمیان ہماری آیات کی تلاوت کرے تمہارے نفوس کو پاکیزہ کرے اور تمہیں حکمت و شریعت کی تعلیم دے۔

و یعلمھم الکتاب والحکمۃ و یزکیھم ... (البقرہ/۱۲۹)

اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کے نفوس کو پاک کرتا ہے...

یتلوا علیھم آیاتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتاب والحکمۃ..."
(الجمعہ/۲)

ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرے ان کو پاک و پاکیزہ کرے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے...

مسلمان علماء نے بھی گذشتہ ادوار میں اپنے شاگردوں کو اخلاقی کمالات سے آراستہ ہونے کی طرف ہمیشہ شوق دلایا ہے وہ تحصیل علم کے دوران زر و جواہر یا جاہ و منصب کو مقصد قرار دینے سے منع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ محمد ذکریائے رازی علم طب کے طالب علم کی صفتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

علم طب حاصل کرنے والے ایک طالب علم پر واجب ہے کہ جمع مال کا خیال بھی ذہن میں نہ لائے بلکہ اسے اس بات کا دھیان رکھنا چاہئے کہ خدا کا مقرب ترین وہ بندہ ہے جو ان میں سب سے زیادہ عالم سب سے زیادہ انصاف پسند اور سب سے زیادہ عوام پر مہربان ہو"۔[1]

---

[1] محمد بن ذکریای رازی: رسائل فلسفیہ (ص۱۰۸) تحقیق کراوس قاہرہ ۱۹۳۹)

مختصر یہ کہ امت اسلامی کی مادی و معنوی فلاح و بہبود کے لئے علماء کا ایمان و تقویٰ کے اسلحوں سے آراستہ و پیراستہ ہونا اولین ضروریات میں سے ہے۔

۵۔ چونکہ امت اسلامی کو "امت وسط" کے نام سے پکارا گیا ہے:

وکذلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس

(البقرہ/۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط قرار دیا ہے تاکہ تم دوسرے لوگوں کے لئے نمونہ بن سکو۔

نیز یہ کہ اسلام نے مادی جذبہ اور روحانی جذبہ کے درمیان ایک توازن برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے:

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ ...."

(البقرہ/۲۰۱)

پروردگارا! ہم کو دنیا و آخرت دونوں جگہوں کی نیکیوں سے بہرہ ور فرما۔

لہٰذا ان آیات کا تقاضا ہے کہ امت اسلامی کی مغربی دنیا کی طرح زندگی کے مادی پہلوؤں میں غرق ہو کر انسانیت کے روحانی تقاضوں کو فراموش نہیں کر دینا چاہئے۔

مسلمانوں کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اسلام نے مادیات کو بھی معنوی بلندی حاصل کرنے کا ایک زینہ قرار دیا ہے لہٰذا علوم و فنون حاصل کرتے وقت انہیں اسلام کے اس بنیادی فلسفہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے یعنی خود ان ہی کو اپنا اصل مقصد و ہدف نہیں سمجھ لینا چاہئے البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی کسب علوم و فنون کو ہی بے کار و بے وقعت سمجھنے لگے بلکہ کہنے کا ماحصل یہ ہے کہ جب ہم علوم و فنون کے اعلیٰ مدارج کو حاصل کرنے کی کوشش کریں تو اس کے ضمن میں اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ ہماری ساری کوششیں خدا کو پیش نظر رکھتے ہوئے رضائے پروردگار عالم کے لئے ہونی چاہئیں۔

مختصر یہ کہ ہمارے سامنے دو حقیقتیں آئینہ کی طرح روشن و واضح ہیں۔ ایک تو یہ کہ علم و صنعت کے اعتبار سے مغرب نے بے پناہ ترقیاں حاصل کر لی ہیں اور دنیائے اسلام

اس میدان میں کافی پیچھے رہ گئی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ اپنی تمام تر علمی ترقیوں کے باوجود
اہل مغرب کسی اعلیٰ منزل تک پہونچنے سے قاصر نظر آتے ہیں بلکہ اس نے ان کو اتنا کھوکھلا بنا دیا
ہے کہ پوری انسانیت ان کو اپنے وجود کے لئے خطرہ محسوس کر رہی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا
فریضہ ہے کہ پہلے تو وہ علوم وفنون میں اپنی کمزوری اور پچھڑے پن کو ختم کریں اور زمانۂ
گذشتہ کی طرح نہ صرف یہ کہ ایجاد واختراع سے کام لیں بلکہ دنیا کی قیادت کے فرائض
بھی انجام دیں اور دوسرے یہ کہ اسلامی معارف کو دوبارہ زندگی عطا کریں اور اپنے افکار
کو "اسلامی تصور کائنات" کے سانچے میں ڈھال کر دنیائے انسانیت کو فلاح وبہبود اور
ترقی وکامرانی کی راہ پر گامزن کریں۔

جناب رسول جعفریان
ترجمہ: جناب سیّد ولی الحسن رضوی

محفلوں کا انعقاد اور جشن میلاد النبیؐ
(ایک محققانہ نظر)

۱۔ محفلوں کا انعقاد۔ ایک سیاسی مسئلہ:

اسلام کی نظر میں جشن منانا اور محفلیں منعقد کرنا جائز ہے یا نہیں؟ آج وہابیت سے وابستہ علماء کے درمیان ایک نہایت ہی دشوار مسئلہ کی صورت اختیار کر چکا ہے، چنانچہ اس نازک دور میں یہ حضرات اپنا خاص وقت اس مسئلہ کی چھان بین اور اتھل پتھل پر صرف کر رہے ہیں۔

اسلامی انقلاب کی کامیابی کے فوراً بعد سے ہی شیعوں کے خلاف استعماری پروپگنڈوں نے بڑا زور پکڑ لیا ہے ہم اور آپ، سب اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ اس تگ و دو کا اصل مقصد "بڑی طاقتوں" کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو انقلاب اسلامی ایران کو اپنی اسلام دشمنی کی بنیاد پر صفحہ ہستی سے مٹا ڈالنا چاہتے ہیں ان کی پوری کوشش ہے کہ مختلف طریقوں سے اس انقلاب کے اثرات منجملہ اس انقلاب کی فکری و ثقافتی کوششوں پر بندشیں لگا کر اس کو پھلنے پھولنے سے روک دیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سعودی عرب پر حاکم "وہابی ٹولہ" جو بارہا بین الاقوامی مجرمین کے سامنے خود سپردگی کا مظاہرہ کر چکا ہے اس وقت بھی بڑی شرم انگیز خدمت انجام دے رہا ہے اس کی کوشش ہے کہ عربوں کے درمیان اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس علاقہ میں امریکی مفادات کو تقویت پہونچائی جائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آقا و سرپرست کی خوشنودی کے لئے ایک دوسرے طریقے سے اسلامی انقلاب

پر، جو امریکہ کی آنکھوں کا سب سے بڑا کانٹا ہے، دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس دفعہ سعودی دسترخوان سے فیضیاب ہونے والے درباری علماء کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ اسلام کے نام پر، اور وہ بھی وہ اسلام جس کا آج کل سعودی عرب چیمپین بنا ہوا ہے، قلم اٹھائیں اور اسلامی انقلاب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں سعودی حکومت کی طرف سے ادھر چند برسوں میں لاکھوں سعودی ریال صرف کر کے سیکڑوں گمراہ کن کتابیں شائع کر کے بزعم خود شیعیت کی رد کی گئی ہے۔ ایسی کتابیں جن میں بیشتر موارد میں حوالوں کے اندر تحریف اور غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ مہمل عقاید کی شیعہ اثنا عشریوں کی طرف نسبت دیگران کے خلاف کیچڑ اچھالا گیا ہے۔

عین اس وقت جب "اسلامی انقلاب" کی تحریک مسلمانوں میں زور پکڑ رہی ہو اس قسم کے پروپیگنڈوں میں شدت پیدا ہو جانا صاف ظاہر کرتا ہے کہ ان لوگوں کا مقصد محض "اسلامی انقلاب" کو نقصان پہونچانا اور امریکی مفادات کو تحفظ عطا کرنا ہے، اور یہ کام بہر حال بڑی طاقتوں کی ایما پر ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت عمل میں لایا جا رہا ہے۔

جشن میلاد النبیؐ کے انعقاد کا مسئلہ بھی ان ہی موضوعات میں سے ایک ہے جس کو چند درباری نمک خوار علماء، انقلاب اسلامی ایران اور اس کی اتحاد بین المسلمین تحریک کو، زک پہونچانے کی غرض سے بہانہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ شوشہ اس وقت چھوڑا گیا ہے جب نقیب وحدت اسلامی آیۃ اللہ العظمیٰ منتظری مدظلہ نے پیغمبر اسلامؐ کے یوم ولادت کی مناسبت سے مسلمانوں کو "ہفتہ وحدت" کی تقریبات کا اہتمام کرنے کی دعوت دی تھی۔ سعودی عرب کی طرف سے اس کی مخالفت کا بازار گرم ہو گیا اور بار بار اوچھے پروپیگنڈوں کے ذریعہ پوری اسلامی دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جانے لگی کہ "ان ایام میں محفلیں منعقد کرنا اور جشن میلاد النبیؐ منانا بدعت ہے مسلمانوں کو اس طرح کے مراسم سے پرہیز کرنا چاہیئے۔"

جی ہاں یہ ان ہی لوگوں کی آواز ہے جو "فاس کانفرنس" میں اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر کے اس کے حق میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتے۔ جو امریکہ کے تسلط اور غلامی میں فخر و انبساط محسوس کرتے ہیں۔ جن کی سیاست کا محور عرب علاقوں پر استکباری شکنجے کو مضبوط بنانا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ ان کے خلاف اپنی قوت و طاقت جمع کر کے صف آرا ہوتے یہ لوگ "انقلاب اسلامی" کو نقصان

پہونچانے کے سلسلہ میں استعمار کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔

انہوں نے جشن میلاد النبیؐ کی تقریبات کو جو مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتا تھا حرام قرار دیدیا کہ کہیں مسلمانوں کا اتحاد دشمنان اسلام کے خلاف یلغار کا سبب نہ بن جائے پتہ چلتا ہے اس پورے مسئلہ کی اولین نوعیت سیاسی ہے فکری طور پر اسکو محض ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ ہم البتہ اس سلسلہ میں فکری مباحث چھیڑنے میں کوئی خوف محسوس نہیں کرتے۔ اور خود اسلامی دنیا میں موجود علوم و افکار اسلامی کے ذخائر نے ہم اسلام کے اصل ماخذوں اور تعلیمات اہلبیت کی روشنی میں جمع کئے گئے ہیں ان شبہات کا بھرپور جواب پیش کر رہے ہیں لیکن ہم تمام حریت پسند مسلمانوں کو تبا دینا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے مسائل چھیڑنے کا اصل مقصد اسلامی انقلاب کو زک پہنچا کر عالمی استکبار کو فائدہ پہنچانا ہے۔

۲۔ محفل کی لغوی و اصطلاحی تعریف:

صاحب "اقرب الموارد" لکھتے ہیں احتفل القوم ای اجتمعوا یہ محفل کے لغوی معنی ہیں۔ اصطلاح میں محفل ایسے مخصوص اجتماع کو کہتے ہیں جس کا کسی خاص مسئلہ کے تحت یادگار منانے کے لئے انعقاد ہوتا ہے، البتہ عام طور پر اس کلمہ کا ایسے اجتماعات پر اطلاق ہوتا ہے جہاں مسرت و شادمانی کا ماحول ہوتا ہے وہ ایام جو عوام میں کسی خاص احترام کے حامل ہوتے ہیں ان میں لوگ اکٹھا ہو کر اجتماعی طور سے یوم مسعود کی آمد پر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار کرتے ہیں۔

یہاں دو باتیں ہیں ہمیں ان دونوں کا الگ الگ رکھ کر جائزہ لینا چاہئے۔ ایک تو خود اجتماع کا انعقاد ہے اور دوسرے اس اجتماع میں برپا ہونے والے مراسم ہیں۔ ظاہر ہے ایک اجتماع میں ہر طرح کی (جائز و ناجائز) رسومات انجام دی جا سکتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر جشن میں ایسی ہی تقریبات و رسومات انجام پائیں جن کو فقہ اسلامی میں مذموم قرار دیا گیا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا گمان کرتا ہے تو یقیناً اشتباہ کا شکار ہے۔ اس بات کا ہم نے یہاں اس لئے ذکر کر دینا ضروری سمجھا کہ بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں جشن کا مطلب ہی ایک ایسا اجتماع ہے جہاں خلاف شرع

امور انجام پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر شراب کا دور چلنا رقص و سرود کی بزم برپا ہونا وغیرہ جبکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔

وہ افراد جنہوں نے اس قسم کے مراسم جشن کو بدعت قرار دیا ہے ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظر میں جشن کی محض ان ہی غیر اسلامی حرکات پر مرکوز رہی ہیں، جن کا تذکرہ فرما کر ان لوگوں نے محافل و جشن رسالت مآبؐ کے تئیں شدید نفرت کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ ابوعبداللہ الحفاؔ نے اس مسئلہ کے ذیل میں بحث کرتے ہوئے مثالاً خود اپنے اطراف میں ایسے موقعوں پر انجام پانے والی بیہودہ رسومات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:۔

"أن تلك الليلة فی زمنه تقام علی طریقة الفقراء و... وطريقة الفقراء فی هذه الاوقات شنیعة من تستع الدین لان عهدهم فی الاجتماع انما هو الغناء و الشطح و... وهم قوم جهلة لا یحسن احدهم احکام ما یجب علیه فی یومه و لیلته ... (الاحتفال بمولد خیر الرسل ص ۵۳-۵۴)

(الاحتفال بمولد خیر الرسلؐ ص ۵۳-۵۴)

فاکہانی نے اپنے رسالہ میں اس مسئلہ کی تشریح کرتے ہوئے مراسم جشن کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے:۔

۱۔ وہ مراسم جن میں گناہ عمل میں نہیں آتا۔ اس قسم کے جشن کو "مکروہ بدعت" قرار دیا ہے (میری نظر میں یہ اصطلاح ہی بے معنی اور لغو ہے)

۲۔ وہ مراسم جن کو شریعت نے گناہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے ذیل میں رقص و سرود نوجوان مردوں اور عورتوں کا باہم اجتماع اور لہو و لعب کا ذکر کرتے ہوئے اس قسم کے جشن کو جرم و بغاوت قرار دیتے ہوئے "حرام بدعت" سے تعبیر کیا ہے۔ (الاحتفال ... ص ۵۰-۵۱)

سید علی فکری نے بھی اس قسم کی تقریبات میں فضول مراسم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"منها انتهاك الحرمة واضاعة الاموال فی الزینات بکثرة الوجود فی المساجد والطرقات و ایقاد الشموع فی الافرحه و کل ما یرجع الی الاسراف والتبذیر..." (المحاضر العاشرة من محاضرته ص ۸۴)

شیخ علی محفوظ نے بھی ان ہی مطالب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان ہی باتوں کو رشید رضا نے بھی اپنی تحریر میں دہرایا ہے۔ (المنار جلد ۲ ص ۴۷-۶۶)

ہم بھی اعلان کرتے ہیں کہ ہر وہ تقریب جہاں وہ عمل جو عفت و آبرو کے منافی ہو اور اسراف و فضول خرچی میں داخل ہو یا جن سے محرمات الٰہی کا ارتکاب لازم آتا ہو۔ انجام پاتے ہوں یقیناً حرام ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ان کو "جشن منانے" کے اصل موضوع سے مربوط نہیں کیا جا سکتا اور کسی کو اس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ صرف اس بنیاد پر کہ بعض افراد جشن میں خلاف شرع حرکات انجام دے دیتے ہیں سرے سے جشن کے انعقاد کا ہی منکر ہو جائے۔

۳۔ محفلوں کا انعقاد — ایک فطری تقاضہ

ہم سب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ انسان جن چیزوں پر اعتقاد رکھتا ہے اس کا احترام بھی کرتا ہے اسی طرح وہ چیزیں جو اس کی نظروں میں محترم اور اہمیت کی حامل ہوتی ہیں اس کے سلسلہ میں وہ بڑی حساسیت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ معزز و مکرم موجودات اور ان کے موجد و خالق کا احترام ان چیزوں میں سے ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کے درمیان مسلم و مرسوم ہے۔ وہ ایام جو تاریخ میں کسی خاص مناسبت کے تحت اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ تمام اقوام و ملل میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ دنیا کے تقریباً سبھی افراد اپنی اپنی جگہ پر سالانہ جشن و سالگرہ کی رسمیں مناتے رہتے ہیں، لوگ ان مراسم سے فطری اور طبیعی طور پر وابستگی رکھتے ہیں۔ بار بار ان مراسم کو انجام دیکر ان مخصوص دنوں کی اہمیت و عظمت کو اپنی زندگی میں رچا بسا لیتے ہیں ان کے لئے یہ ایام عید کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے کہ ان ہی ایام میں رونما ہونے والے تاریخی واقعات و حادثات پر ان کے عقائد و افکار مرتب ہوتے ہیں اور ان کے دہرانے سے ایمان و عقائد میں جلا پیدا ہوتی ہے۔

یہ ایام فقیر و دولت مند کے درمیان فرق قائم نہیں کرتے ان کے سامنے شاہ و گدا جیسے الفاظ بے معنی ہوتے ہیں ہر شخص امیر ہو یا غریب جوان ہو یا بوڑھا۔ گورا ہو یا کالا، شہری ہو یا دیہاتی، عالم ہو یا جاہل ان باعظمت دنوں کی یاد منانے میں شریک ہوتا ہے اور اپنی اپنی

استعداد و صلاحیت کے مطابق ان تقریبات میں حصہ لیتا ہے۔ تمام اقوام و افراد کے درمیان اس مسئلہ کی عمومیت و قبولیت خود اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اپنے پُرعظمت ماضی کی یادگاریں زندہ و تابندہ رکھنا انسان کی جبلت و فطرت میں داخل ہے اور فطری تقاضوں پر کوئی بندش نہیں لگا سکتا۔ یہ یادگاریں چاہے کسی بھی اعتقاد پر مبنی ہوں معتقدین اپنی تمام تر امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ اس دن کے منتظر رہتے ہیں یہ تاریخیں چونکہ ان کے دلوں میں اپنا گھر بنائے ہوتی ہیں لہٰذا وہ ان کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ انسان اس دن خوشی سے پھولے نہیں سماتا اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اس دن کو اپنی زندگی کا ایک یادگار دن بنا ڈالے۔ مثال کے طور پر "یوم میلاد النبیؐ" تمام مسلمانوں کے لئے خوشیوں اور مسرتوں کا پیغام لے کر آتا ہے کیونکہ یہی وہ دن ہے جس دن آتشکدۂ فارس خاموش ہوگیا۔ ایوان کسریٰ کے طاقوں میں شگاف پیدا ہوگئے۔ ایک صاحب اعتقاد مسلمان کے لئے یہ دن باطل پر حق کی فتح و کامرانی کا دن ہے۔ ایک ایسا دن جب آفتاب توحید کی شعاعوں سے ظلمت کدۂ عالم روشن و منور ہوگیا۔ کیا ایک سچا مسلمان اس مبارک و مسعود دن کو اپنی زندگی سے فراموش کر سکتا ہے ؟؟

یہ روز اس کے لئے روز عید ہے اور فطری طور پر وہ اس روز خوش حال و مسرور نظر آتا ہے۔ کیا وہ اپنے فطری تقاضہ کے تحت اس بات کا حق نہیں رکھتا کہ اس دن کو لائق تعظیم و تکریم قرار دے اور اپنے ہم عقیدہ دوستوں کے ساتھ جمع ہوکر اس دن کی الٰہی عظمت و اہمیت پر روشنی ڈالے اور اپنے نیز اپنے دوستوں کے عقیدۂ و ایمان میں جلا اور زندگی پیدا کرے ؟؟

مذکورہ بالا توضیحات کی روشنی میں ایسے ایام کی یاد تازہ کرنے کے لئے جشن و تقریبات کا اہتمام کرنا ایک فطری اور طبیعی امر ہے جس کا سمجھنا کسی بھی صاحب عقل کے لئے دشوار نہیں ہے۔ اب ہم اس بات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ آیا یہ فطری تقاضہ حکم اسلام کے منافی ہے یا اس کے عین مطابق ہے؟

ہمارا اعتقاد ہے کہ اسلام کبھی بھی انسانی فطرت کے خلاف کوئی حکم نافذ نہیں کرتا اور اگر کہیں فطری تقاضوں پر بندش لگائی بھی گئی ہے تو اس کا مقصد محض فطری خواہشات کو اعتدال میں رکھنے کے لئے ہے۔ اگر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ ان لوگوں کا فریضہ ہوگا جو محفلوں کے انعقاد کو بدعت قرار دیتے ہیں، اس کی حرمت کی دلیل پیش کریں بغیر کسی دلیل و ماخذ کے اس

عمل کو بدعت نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ یہ کاملاً فطری امر ہے بلکہ عقلی معیار پر بھی اس کو قبیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے برخلاف دینی اہمیت کے حامل امور انجام دینے کی خود عقل تائید کرتی ہے، ہر عالم و جاہل اس بات کو درک کرتا ہے، نیز عقل کی نظر میں ایسے عمل مکمل طور پر ممدوح اور لائق تحسین سمجھے جاتے ہیں۔

عمومی طور پر اسلام نے ان فطری تقاضوں کو اعتدال میں رکھنے کے لئے نہی کی صورت میں بھی احکام صادر فرمائے ہیں مثال کے طور پر اپنے کسی عزیز کی موت پر گریہ کرنا جو تقریباً تمام افراد انسانی کے درمیان رائج ہے اسلام نے اعتدلال برقرار رکھنے کے لئے گریہ و بکا کے بعض طریقوں کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن محفلوں کے انعقاد کے مسئلہ میں کون سی نہی وارد ہوئی ہے؟ کسی طرح کی ممانعت نظر نہیں آتی جشن میلاد النبیؐ کے منکرین نے عدم دلیل کو عدم جواز پر محمول کیا ہے اور ظاہر ہے یہ بات ہرگز صحیح نہیں ہے۔

۴۔ مذہبی جشن قرآن کے آئینے میں

جیسا کہ ہم نے عرض کیا جشن کے جواز کے سلسلہ میں اس کا فطری ہونا اور اس کی ممانعت میں کسی دلیل کا نہ پایا جانا ہی کافی ہے پھر بھی وہ اسلامی ادلہ جو واضح طور پر جشن کے انعقاد کو جائز قرار دیتے ہیں یہاں ہم ان کی طرف ایک اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ ہم آپ کے سامنے کوئی آیت پیش کریں اس نکتہ کی طرف متوجہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہمارے استدلال کا انداز اصل موضوع کی کلی حیثیت کو ثابت کر کے ان سے جزئی موارد میں استفادہ حاصل کرنے کا ہے دوسرے لفظوں میں ہم ایک ہی طرح کے موارد کے ذیل میں بحث کریں گے جس کا کلی حکم ان آیات میں بیان کر دیا گیا ہے۔

ذلک ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب (حج/۳۲)

لغت میں شعائر، علامت و نشانی کے معنی میں آتا ہے مذکورہ آیت میں اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرنا تقوائے الٰہی کا نتیجہ بتایا گیا ہے یعنی یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے عشق الٰہی کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بندہ کی نظر میں خدا کی خوشنودی تمام چیزوں پر مقدم ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے

جس کی وجہ سے ایک شخص اللہ کی نشانیوں کو بزرگ و برتر شمار کرتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ کونسی چیز ہے جس کو "شعائرالٰہی" قرار دیا جائے؟ اس سوال کی وضاحت کیلئے ہم قرآن سے ہی استفادہ کرتے ہیں۔ قرآن میں دو چیزوں کے سلسلہ میں "شعائرالٰہی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہوتا ہے:-

"ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ" (سورہ بقرہ/۱۰۸)

دوسری آیت میں قرآن آواز دیتا ہے:

"والبدن جعلناھا لکم من شعائر اللہ لکم فیھا خیر" (سورہ حج/۳۶)

مذکورہ دونوں آیتوں میں اعمال حج کے دو نمونے شعائرالٰہی کے عنوان سے بیان کردئے گئے ہیں ورنہ بقول قرطبی یہ ایک واضح سی بات ہے کہ "شعائراللہ" سے مراد اس کی تمام دینی علامتیں ہیں خصوصاً وہ علامتیں جو حج سے مربوط ہیں۔ اگر ہم ان دونوں نمونوں کو سامنے رکھیں بلکہ حج کے اکثر اعمال کا بغور جائزہ لیں تو پتہ چلے گا یہ تمام اعمال ایک تاریخی واقعہ کی تکرار ہیں حتی کہ ان میں سے بعض اعمال تو محض ایک مخصوص تاریخی واقعہ کو یاد دلانے کے لئے ہی رکھے گئے ہیں، صفا و مروہ کے درمیان ادھر سے ادھر دوڑ لگانا اسی قسم کا ایک نمونہ ہے۔ ایک تاریخی یادگار ہے حتی کہ اونٹ یا گوسفند کی قربانی پیش کرنا بھی ایک تاریخی یادگار ہے جو جناب ابراہیم علیہ السلام کے ایک عمل کی تاسی میں پیش کیجاتی ہے اور نہ صرف یہ کہ مکہ میں موجود حاجی صاحبان یہ عمل انجام دیتے ہیں بلکہ مکہ سے دور اپنے اپنے مقام پر پوری دنیا کے مسلمان اس عمل کو بڑے فخر و انبساط کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ آخر ان تمام اعمال کے دہرانے کا مقصد جناب ابراہیمؑ کے توحیدی مشن کو زندہ رکھنے کے علاوہ اور کیا ہے؟

حج کے دنوں میں ہم جناب ابراہیم علیہ السلام کے عمل کو دہراتے ہیں اور یہ ان کی یاد کو زندہ رکھنے اور ان کے تئیں عظمت و احترام پیش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے اس لئے کہ وہ اللہ کی نشانیوں میں ایک نشانی ہیں۔ اب ہم سوال کرتے ہیں کہ کیا شعائرالٰہی کے مفہوم کا اطلاق صرف ان ہی دو چیزوں پر ہوتا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں دیا جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن نے یہ دو نمونے دو مختلف سورہوں میں بیان کردئے ہیں لیکن اصل آیت بطور مطلق پیش

کی گئی ہے اور اس کا اطلاق یا اس کی عمومیت ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو آیت الٰہی ہونے کا مصداق قرار دی جا سکتی ہوں۔

وہ اہم تاریخی دن جن میں خداوند عالم نے اپنی روشن نشانیوں کو ظاہر فرمایا ہے۔ کیا شعائر الٰہی میں ان کا شمار نہیں ہوتا؟ کیا پیغمبر کا یوم ولادت، جس کی صرف پیدائش سے ہی عالم رنگ و بو میں وہ اثرات رونما ہوئے جن سے دنیا میں ظہور حق کا پتہ چل گیا، شعائر الٰہی میں شامل نہیں ہے؟ اور کیا اس دن کا احترام شعائر اللہ کی تعظیم کے مترادف نہیں ہے؟ ہمارا عقیدہ ہے کہ جس طرح جناب ابراہیم کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی یادگاریں قائم کرنا شعائر الٰہی کا ایک جزء ہے تاریخ اسلام میں رونما ہونے والے اہم واقعات کو یادگار کی صورت میں باقی رکھنا اور مخصوص تاریخوں میں ان کی یادوں کو زندہ کرنا بھی یقیناً شعائر الٰہی میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ ان ایام کی یادگاریں قائم کرنا بھی تقوائے قلوب کی نشان دہی کرتا ہے اور ان سے دوری اختیار کرنا ایک طرح سے خداوند عالم سے دوری اختیار کرنا ہے۔

اگر مراسم ابراہیمی کے احیاء کرنے سے کچھ عظیم یادیں زندہ ہوتی ہیں تو تاریخ اسلام میں بھی رونما ہونے والے عظیم دنوں کی یادیں قلوب مسلمین میں زندگی کی حرارت پیدا کرتی ہیں۔

ب: "ولقد ارسلنا موسیٰ بآیاتنا ان اخرج قومک من الظلمات الی النور وذکرھم بایام اللہ ان فی ذالک لآیات لکل صبار شکور۔ (ابراہیم/۵)

اس آیت میں جناب موسیٰ علیہ السلام کی اہم ترین ذمہ داری لوگوں کو ظلمت کفر سے نکال کر نور ایمان تک پہونچانا بتایا گیا ہے اور یہی تمام انبیاء و مرسلین کا اہم ترین فریضہ ہے۔ جناب موسیٰ کی دوسری ذمہ داری جو یقیناً دوسرے انبیاء سے بھی متعلق رہی ہے، خداوند عالم سے منسوب دنوں کی یادیں قائم کرنا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام تین سو پینسٹھ دن خداوند عالم سے متعلق نہیں ہیں؟ اور اگر ہیں تو آیت میں "ایام اللہ" سے مراد کون سے مخصوص دن ہیں؟؟ اس آیت کے فوراً بعد ہی دوسری آیت میں نمونہ کے طور پر ان دنوں میں سے ایک دن کا قرآن نے خود ذکر کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اذ قال موسیٰ لقومہ اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ انجاکم من آل

فرعون یسومونکم سوء العذاب.... (ابراہیم/٦)
چنانچہ جناب موسیٰؑ "یوم اللہ" کی یاد آوری کے لئے اس دن کا انتخاب فرماتے ہیں جس دن جناب موسیٰؑ کو فرعون پر فتح و کامرانی عطا ہوئی یا دوسرے لفظوں میں جس دن حق کو باطل پر فتحیابی ملی، جس دن "نعمت الٰہی" جو حق کی فتح کی علامت ہے، لوگوں کو نصیب ہوئی۔ اسی طرح قرآن میں کلمہ "ایام اللہ" روز قیامت کے سلسلہ میں بھی وارد ہوا ہے:-
"قل للذین امنوا یغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ" (الجاثیہ/١٤)
دراصل روز قیامت "ایام اللہ" کا کامل ترین مصداق ہے کیونکہ اس دن باطل بالکل بے دست و پا نظر آئے گا:-
والوزن یومئذ الحق ...... (الاعراف/٨)
زمانہ جاہلیت میں "ایام عرب" کا ذکر ملتا ہے ان ایام میں عرب اکٹھا ہو کر ایک دوسرے کے اوپر فخر و مباہات کیا کرتے تھے۔ اسلام نے ان سے کہا جاہلیت کے دنوں کو فراموش کرو، "ایام اللہ" کی یادیں قائم کرو۔ وہ ایام جن میں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے سے مقابلہ آرائی اور کامیابی کا جشن منایا کرتے تھے ان کو بھول جائیں اور ان دنوں کی یادیں منائیں جن میں حق کامیاب و رستگار ہوا ہے۔
آیت میں "ایام اللہ" کی لفظ مطلق وارد ہوئی ہے اور اس کی وضاحت کے لئے نمونہ کے طور پر ان دنوں میں سے ایک دن کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آیت کے ضمن میں اس مسئلہ کو نہ صرف یہ کہ بصورت جائز پیش کیا گیا ہے بلکہ اس کو ایک امر لازم قرار دیا گیا ہے ہم پوچھتے ہیں آخر کسی دن کی "یاد منانے" کا کیا طریقہ ہوتا ہے۔ یہی نا کہ اس دن کی عظمت و اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کچھ ایسے مراسم انجام دیں جس سے اس دن کی یاد تازہ ہو جائے۔ اگر کسی روز پیشانی حق پر کامیابی و کامرانی کی واضح علامتیں مشاہدہ کی جائیں تو کیا یہ چیز مومنین کے لئے خوشی و مسرت کا سبب نہیں بنے گی؟ اگر یہ لوگ حتی الوسع اس دن کو یوم تعطیل قرار دیدیں اور ایک منزل پر اکٹھا ہو کر ایک دوسرے کے قلوب کو قوت و تازگی عطا کرنے کا سبب بنیں اور حق کی کامیابی کا جشن منائیں تو کیا کسی کو حق حاصل ہے کہ ان پر بدعت ایجاد کرنے کی

ت لگا سکے ؟!

حضرت علی علیہ السلام سے بھی روایت نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

کان النبیؐ یذکرنا بایام اللہ (مسند احمد ج ۱)

اگر شیعہ حضرات روایات تاریخی کی بنیاد پر ثابت کرتے ہیں کہ آیہ "الیوم اکملت لکم نکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" میں "الیوم" سے مراد غدیر کا ہے تو کیا وہ اس روز اجتماعی شکل میں جشن منانے کا حق نہیں رکھتے؟ اس دن کے سلسلہ میں ن کی اس توضیح کے بعد کیا کوئی اور دن بھی تاریخ میں ملتا ہے جس کی قرآن نے اس انداز میں یت واضح کی ہو؟ اور اگر اس مبارک دن کے بارے میں اس آیت کا اور اضافہ کر دیا ئے کہ "الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون"[۲] تو کیا ے کے بعد بھی ہمیں اس دن خوشی نہیں منانی چاہئے؟ البتہ ابتدائی دو تین صدیوں تک شیعوں حکومت قائم کرنے کا موقع نہ مل سکا کہ وہ یہ دن تزک و احتشام کے ساتھ مناتے لیکن ے ہی انھیں موقع ملا یہ تقریبات انجام دی جانے لگیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مراسم تقریب ام پانے سے پہلے والے معتقدین و مخلصین غدیر کے نزدیک یہ دن احترام کے قابل نہیں ھا جاتا تھا۔

قرآن کی ایک اور آیت "ایام اللہ" کے مصداق کے عنوان سے پیش کی جا سکتی ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام خداوند عالم سے خطاب فرماتے ہیں:

"ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لنا عیداً لاولنا وآخرنا وآیۃ منک وارزقنا وانت خیرالرازقین" (مائدہ/۱۱۴)

یہ ایام ظہور حق کی نشان دہی کرتے ہیں اور یہ ظہور ان کے لئے یقیناً عید کا پیغام ہے۔ داوند عالم خود قرآن کریم میں ایسے دنوں کی یاد دہانی فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئا وضاقت

---

۱ المائدۃ/۳ ۲ المائدۃ/۳

علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین. ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین وانزل جنوداً لم تروھا...

(سورہ توبہ ۲۵/ و ۲۶)

چنانچہ "ایام اللہ" کی یاد منانا جو خود جشن ومحافل کے انعقاد کا مصداق ہے قرآن کی نظر میں مورد تائید وتاکید قرار دیا گیا ہے۔

ج: "قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذلک فلیفرحوا" (یونس ۵۷/)

مذکورہ بالا آیت واضح طور پر اس نکتہ کی طرف دلالت کرتی ہے کہ فضل ورحمت پروردگار عالم سے باریاب ہونے کے بعد خوش وخرم ہونا اور خوش حالی وشادمانی کا اظہار کرنا عین منشاء الٰہی ہے۔ فرحت وشادمانی وہ چیز ہے جس کا آیت میں حکم دیا گیا ہے۔ اب ذرا اس بات کا بھی جائزہ لے لیا جائے کہ مصداق رحمت الٰہی کیا ہے؟ قرآن کی روشنی میں رحمت الٰہی کا روشن ترین مصداق خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک ہے چنانچہ قرآن، رسول اسلامؐ سے ان لفظوں میں خطاب فرماتا ہے:-

"وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین" (سورہ انبیاء ۱۰۷/)

اگر ان دونوں آیتوں کو بھی ہم اپنی سابقہ بحث کے ساتھ شامل کرلیں تو زیر بحث مسئلہ کا اس کے علاوہ اور کیا کچھ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ آیات مذکورہ جشن میلاد النبیؐ کے جواز پر واضح طور پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر پیغمبر اسلام کی ولادت باسعادت کی مناسبت سے مسرت وشادمانی کی محفل منعقد کی جاتی ہے تو کیا یہ خوشی رحمت وفضل الٰہی سے بہرہ ور ہونے کی غرض سے نہیں ہے؟

جشن میلاد النبیؐ کی رد میں جو کتاب لکھی گئی ہے اس میں اس آیت سے نکلنے والے واضح نتیجہ پر اشکال کرتے ہوئے ان لوگوں سے جو وہابی نظریات کے حامل ہیں یا ابن تیمیہ کے مریدین میں شامل ہیں یہ بات نقل کی گئی ہے کہ اس آیت سے اس طرح کا مطلب سلف صالحین نے اخذ نہیں کیا ہے۔ کتاب کے مصنف نے صاحب "اعتصام" کا قول نقل کیا ہے کہ:-

"وجزم بان عدم الوقوف فی فھم النصوص العمل بھا علی غیر مامضی علیہ السلف الصالح ھو طریق اھل البدع" (الاحتفال ص۵۷)

ہمارے خیال میں اس طرح کی بات کرنا فکری جمود کی دلیل ہے جس سے یہ حضرات دوچار رہے ہیں۔ ہم اس بات کی ہرگز تائید نہیں کرسکتے کہ جو کچھ ہمارے گذشتہ علماء نے کہہ دیا ہے ہم آنکھ بند کرکے کو مانتے چلے جائیں مگر یہ کہ قرآن و حدیث سے ہم کو ان کے اقوال و افکار کی تائید حاصل ہو جائے۔ کیا کوئی صاحب عقل اس بات کو قبول کرسکتا ہے کہ ہمارے گذشتہ علما جن باتوں کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں ہم بھی ان باتوں کو سمجھنے کا حق نہیں رکھتے ؟

قرآن کے سلسلہ میں غور و خوض اور تدبر و تفکر کا جو حکم دیا گیا ہے اور جس کی کچھ آیتوں کی طرف ہم نے اشارۃً و تصریح سے کام لیا ہے، اس کا مطلب علماء سلف کے اقوال و افکار پر غور و فکر کرنا نہیں ہے بلکہ خود قرآنی آیات پر غور و خوض کرکے اس سے صحیح استفادہ حاصل کرنا ہے۔

۵۔ جشن اور بدعت ؟!

بار بار وہابی ٹولے کی طرف سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ جشن میلاد النبیؐ اور محفلوں کا انعقاد بدعت ہے ہم یہاں خود لفظ "بدعت" کی توضیح و تشریح کرکے اس بات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ آیا جشن کے انعقاد کے سلسلہ میں اس لفظ کا استعمال صحیح بھی ہے یا نہیں۔ جیسا کہ "بدعت" سے متعلق بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کسی چیز کے بدعت قرار دئے جانے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ کسی امر کو جس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو لوگوں کے درمیان دین کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ پیغمبر اسلام کی حدیث ہے : ۔

"من احدث فی امرنا ھذا مالیس منه فھو بدعة"

(تاج العروس، ج ۵/ ص ۲۷۱)

"امرنا" کی قید ہماری بات کی تائید کرتی ہے یعنی ہر وہ چیز جو دینی حکم کے عنوان سے دین میں داخل کردی جائے جبکہ وہ حقیقتاً دین نہ ہو تو اس کو "بدعت" کہا جائے گا۔

لیکن اگر کوئی عمل اصول و فروع دین کے منافی نہ ہو نیز اس کی ترویج دینی حکم کے عنوان نہ کی گئی ہو تو اس عمل کو بدعت قرار نہیں دیا جاسکتا ورنہ اگر ہم اس طرح کے امور کو بدعت کا نام دینا شروع کردیں گے تو روزمرہ انجام دئے جانے والے تمام کام بدعت کی صف میں شامل ہو جائیں

چنانچہ اگر حدیث میں وارد ہوا ہے کہ "ایاکم ومحدثات الامور" تو اس میں ان امور سے پرہیز کا حکم ہے جو "دینی احکام" کے عنوان سے پیش کئے جاتے ہیں اور جن پر پہلی مرتبہ عمل کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اگر مثال کے طور پر ایک مستحبی نماز جس کا شارع مقدس علیہ السلام کی طرف سے فرادا پڑھنے کا حکم دیا گیا ہو کوئی شخص اس کو واجب قرار دیدے اور جماعت سے پڑھنے کا حکم نافذ کرے تو یقیناً یہ ایک بدعت ہوگی اور کسی عنوان سے بھی اس کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

اور اگر اسی بات پر بنا رکھی جائے کہ چونکہ جشن کے انعقاد کے سلسلہ میں کوئی دلیل نہیں ملتی لہذا یہ بدعت ہے تو معاف فرمائیے گا ہمارے بہت سے روزمرہ کے امور بلکہ حکومتوں کی خاص تشکیل اور اس کے رنگ برنگے ادارے جسمیں خود سعودی حکومت بھی شامل ہے بدعت قرار پا جائیگی کیونکہ ان کے لئے ہمارے پاس کوئی شرعی سند موجود نہیں ہے۔ کیا کوئی عقل سلیم رکھنے والا اس بات کو قبول کرنے کو تیار ہے؟!

دلچسپ چیز تو یہ ہے کہ محمد ابن عبدالوہاب کے لائق چشم و چراغ نے مذکورہ بالا حدیث کا سہارا لیکر جشن کو بدعت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ ہماری تحریر سے اس طرز استدلال کا باطل ہونا روشن و آشکار ہے۔ اسی طرح کی ایک دوسری آیت بھی اپنے قول کی تائید میں موصوف نے پیش فرمائی ہے جس کو آپ خود ملاحظہ فرمائیں کہ آیت ہمارے قول کی تائید کر رہی ہے یا مولانا موصوف کے۔

خداوند عالم فرماتا ہے:۔

"ام لھم شرکاء شرعوا لھم من الدین مالم یاذن بہ اللّٰہ"

(سورہ شوریٰ / ۲۱)

ظاہر آیت سے یہی مفہوم نکلتا ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو دین اور خدا کے نام پر لوگوں میں پیش کی جائیں جبکہ خدا نے اس عمل کے انجام دینے کی اجازت نہ دی ہو۔ ابن اثیر بدعت کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"البدعة بدعتان بدعة هدیٰ وبدعة ضلال فما کان فی خلاف ما امر اللّٰہ بہ ورسولہ فھو فی حیز الذم والانکار وما کان واقعا تحت ما ندب الیہ وحض علیہ او رسولہ

فھو حینئذٍ المدح" (ماخوذ از تاج العروس ج ۵ / ص ۲۷۱)

ہم اس تعریف کی توضیح و تصحیح کرتے ہوئے کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری نظر میں بدعت وہ چیز ہے جو دین کے عنوان سے پیش کی جائے اور اس کے سلسلہ میں کسی طرح کی دلیل جزئی یا کلی نہ پائی جاتی ہو۔ لیکن اگر کسی عمل کے بارہ میں دلیل کلی موجود ہو تو اس کا انجام دینا نہ صرف یہ کہ جائز ہوگا بلکہ مستحب قرار پائے گا۔ ہمیں اس کو بدعت کہنے کا قطعی حق حاصل نہیں ہے چاہے اس کا نام ایک "اچھی بدعت" ہی کیوں نہ قرار دیدیا جائے۔ اور اگر کوئی عمل، دین کے عنوان سے نہ پیش کیا گیا ہو نیز اس کی مخالفت یا تائید میں کوئی شرعی حکم بھی موجود نہ ہو (مثال کے طور پر انتظامی اداروں اور شعبوں کی تشکیل و تقسیم وغیرہ) تو یہ سب بدعت نہیں ہے بلکہ فقہ کی اصطلاح میں یہاں "اصل برأت" جاری کی جاتی ہے۔

ان کلی دلائل سے قطع نظر جو جشن و محافل کے انعقاد کے جواز پر صادق آتی ہیں ہم یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کم سے کم جشن کے سلسلہ میں شارع علیہ السلام کی طرف سے کوئی نہی نہیں پائی جاتی (اس کا خود جشن میلاد النبی کے مخالفین کو بھی اقرار ہے) اس حیثیت سے جشن اگر ایک امر دین بنا کر نہ پیش کیا جائے تو اس کو بدعت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور یہ ہم سب جانتے ہیں کہ جشن کا اعتقاد رکھنے والے ان تقریبات کو خدا و رسولؐ کا حکم سمجھ کر نہیں انجام دیتے بلکہ ان کے جشن اس محبت و عقیدت کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں جو وہ پیغمبر اسلامؐ نیز دیگر اولیاء کرام سے رکھتے ہیں۔

۶۔ اسلاف صالحین کی تاسی کا مسئلہ :-

جہاں تک مخالفین کی اس بے سروپا دلیل کا سوال ہے کہ چونکہ اس طرح کی تقریبات ہمارے سلف صالح انجام نہیں دیتے تھے لہذا اسلام میں یہ ایک طرح کی بدعت ہے تو ہم اصولی طور پر اس بنیادی بات کو ہی ماننے پر تیار نہیں کہ جو کچھ بھی سلف صالح نے انجام دیا ہے وہ سب قرآن و سنت کے مطابق ہے کیونکہ اولاً وہ افراد جو سلف صالح کو دودھ کا دھلا ہوا تصور کرتے ہیں وہ خود اس بات پر اختلاف نظر رکھتے ہیں کہ آیا سلف صالح سے مراد کس زمانے تک کے افراد کو لیا جائے اگر بعض کے کہنے کے مطابق پہلے اور دوسرے درجہ کے تابعین کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا جائے تو ہماری نظر میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں خود ان کے درمیان اتفاق نظر

پیدا کرنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ لوگ معصوم تو تھے نہیں کہ جو کچھ انہوں نے کہہ دیا ہے آنکھ بند کر کے قبول کرتے چلے جائیں اور اگر ایسا مان لیں تو پھر اس مسئلہ کا ہمارے گذشتہ اشکال یعنی خود ان کے درمیان اختلاف نظر کی صورت میں، کیا نتیجہ برآمد ہوگا واضح و روشن ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں ہمارا مبنیٰ یہ ہے کہ جو کچھ قرآن و سنت سے ثابت ہے اس کو قبول کر لیں اور جب کہیں کسی طرح کی مشکل درپیش ہو تو پیغمبر اسلام کے اہلبیت علیہم السلام جن کی عصمت و طہارت کی آیہ تطہیر میں ضمانت لی گئی ہے اور جن کو حدیث ثقلین میں قرآن کریم کے ساتھ منسلک قرار دیا گیا ہے مورد استفادہ قرار دیں۔

اس کے علاوہ ہمارے مخالفین کا دعوا موجودہ مسئلہ سے کوئی ربط بھی نہیں رکھتا اس لئے کہ وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ سلف صالحین نے جشن کے انعقاد کو بدعت قرار دیا ہے یا اس کی مخالفت کی ہے بلکہ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے اس طرح کی تقریبات انجام نہیں دی ہیں لہٰذا ہم بھی مراسم جشن انجام نہ دیں۔ نہ تو عقل اس منطق کو قبول کرتی ہے اور نہ علم اصول کے اعتبار سے یہ بات صحیح قرار دی جا سکتی ہے کیونکہ یہ بات "عدم دلیل" پر دلالت کرتی ہے خود دلیل کی حیثیت نہیں رکھتی۔ لہٰذا اس سے کوئی مسئلہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

۷۔ جشن کے انعقاد کا مسئلہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے!

اس مسئلہ میں خود اہل سنت حضرات کے یہاں اختلاف نظر پایا جاتا ہے لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں اس مسئلہ پر مختلف نوعیت سے بحث کی ہے علمائے اہل سنت کے ایک بڑے گروہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ بعض وہابی علما نے ابن تیمیہ کی پیروی کرتے ہوئے اس کو سرے سے حرام قرار دیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔ اس صورت میں وہابی حضرات کی حملہ ورانہ روش (جبکہ وہ خود بھی حتیٰ کہ موجودہ دور میں بھی اجتہاد کے قائل ہیں) بالکل بے معنی نظر آتی ہے۔ اگر ان کا یہ طریقۂ کار، جو انہوں نے اس مسئلہ میں پروپیگنڈہ

مہم کی صورت میں اختیار کر رکھا ہے اور اختلاف نظر رکھنے والے مجتہدین کے خلاف بدعت کا اتہام عاید کرنا شروع کر دیا ہے، اسی طرح جاری رہا تو پورے اسلامی معاشرہ کو درہم برہم کر سکتا ہے اس لئے کہ اس طرح کے اجتہادی اختلاف مسلمانوں کے مختلف مسالک فقہیہ میں بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

یہیں سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں نفاق و اختلاف کے بیج کون لوگ بو رہے ہیں اور وہ کون لوگ ہیں جو بے معنی مسائل کو بنیاد بنا کر وحدت مسلمین کے شیرازے کو پارہ پارہ کر دینا چاہتے ہیں۔ ان حضرات نے "جشن میلاد النبیؐ" کے خلاف بے بنیاد کتابوں اور مقالوں کے ذریعہ پروپیگنڈے کا جو بازار گرم کر رکھا ہے محض اسی لئے ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ ولادت کی مناسبت سے "ہفتہ وحدت" منانے کا جو پیغام دیا گیا ہے اس کو کمزور کیا جائے اور تمام علمائے اہل سنت کو انقلاب ایران کی طرف سے جو درحقیقت تمام مسلمانوں اور محرومین کا انقلاب ہے، بدظن و برگشتہ بنا دیا جائے۔ اور ہمیں یقین ہے اسلامی انقلاب کے خلاف کیجا نوالی استعمار کی دیگر سازشوں کی طرح یہ سازش بھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

جناب سید محمد جواد ہادی

نہج البلاغہ ــ منارۂ ہدایت

زہد و تقویٰ

زہد و تقویٰ اسلام میں تمام فضائل و کمالات کے لئے میزان ہے ۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے : انّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم تم میں سب سے محترم اور مکرم وہی ہے جو اہل تقویٰ اور متقی ہو ، جتنے بھی مثبت اوصاف اور انسانی کمالات ہیں اگر ان کو تقویٰ سے علیحدہ کیا جائے تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ جاتی علم و دانش ہو یا سیاست و قیادت صنعت و حرفت ہو یا تجارت و زراعت ہر عمل اور ہر صفت کی قدر و قیمت صرف اس وقت ہوتی ہے جب زہد و تقویٰ سے متصف و مزیّن ہو اگر عالم و دانشور یا تاجر و زارع ، زہد و تقویٰ سے بیگانہ ہو اگر قوم کے لیڈر اور سیاست داں زہد و تقویٰ نہ رکھتے ہوں تو ان کے تمام علوم و فنون اور کمالات و خدمات کی کوئی اہمیت نہیں ۔ نسلی شرافت قبائلی وابستگی ، رنگ و لسانی امتیازات وغیرہ جیسی چیزیں اسلام کی نظر میں معیار نہیں ہیں بلکہ انّ اکرمکم عند اللہ اتقٰکم کے تحت صرف اور صرف تقویٰ ہی معیار و میزان ہے ۔

اس سلسلے میں احادیث اور روایات کثرت سے موجود ہیں ۔

اب جب یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ زہد و تقویٰ ہی معیار شرافت و فضیلت ہے تو آیئے ذرا دیکھیں کہ زہد و تقویٰ ہے کیا ؟ اس کی حقیقت کیا ہے ؟ اس کا مفہوم کیا ہے اور اس کا فلسفہ اور فائدہ کیا ہے ؟ کیا زہد و تقویٰ کے معنی و مفہوم وہی ہیں جو آج ہمارے معاشرے میں رائج ہے ؟ یا زہد و تقویٰ کی حقیقت کچھ اور ہے جس سے بہت سارے

مسلمان آج بھی ناواقف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج اسلامی معارف و مفاہیم کی حقیقت اس قدر مسخ کر دی گئی ہے اور مسلمان معاشرہ معارف اسلامی کی حقیقی روح سے اس حد تک بے خبر و بیگانہ ہو چکا ہے کہ بہت سے اسلامی معارف کا جو معنیٰ اور مفہوم آج سمجھا جاتا ہے وہ اس کے حقیقی مفہوم سے کوسوں دور ہے ہم مسلمان آج اسلامی عبادات کی اصلی روح سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں اور ان عبادات اور معارف کے اجتماعی، انفرادی، سیاسی، اخلاقی فلسفے اور فائدے سے یکسر غافل و ناآگاہ ہیں آج نماز، روزہ، حج وغیرہ ہماری نظروں میں بے فائدہ اور بے روح اعمال بن کر رہ گئے ہیں ان کے عظیم فوائد اور گوناگوں مقاصد سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں قرآن کی عظمت کو درک کرنے سے قاصر ہیں۔

اسلامی معارف سے بے خبری اور بیگانگی کی وجہ سے آج ہم زھد و تقویٰ کا جو مفہوم اور معنیٰ سمجھ رہے ہیں اور جس فرد یا افراد کو زاہد و متقی سمجھ رہے ہیں ان کا زہد و تقویٰ کے اصلی معنیٰ و مفہوم سے کوئی تعلق نہیں، آج ہمارے معاشرے میں زاہد اور متقی ان افراد کو سمجھا جاتا ہے جو معاشرے کے عضو معطل بن کر تمام معاشرے سے کٹے ہوئے ہوں جو نماز روزے تو باقاعدگی سے انجام دے رہے ہوں لیکن اس کے علاوہ کسی اور چیز سے ان کو کوئی دلچسپی ہو نہ وہ اپنے اہل و عیال سے کوئی دلچسپی رکھتے ہوں اور نہ معاشرے سے کوئی تعلق نہ ان کو مسلمانوں کی حالت کا پتہ ہو اور نہ اس سے کوئی دلچسپی۔ نہ ان کو یہ پتہ ہو کہ مسلمانوں کا کیا حال زار ہے کس طرح سے استحصال کیا جا رہا ہے محروم اور مستضعف طبقات پر کیا مظالم ڈھائے جا رہے ہیں ملک میں سیاسی حالات کیا ہیں حاکمیت کس کی ہے اسلام کو کس طرح سے تدریجی طور پر محو کیا جا رہا ہے۔ ان تمام مسائل سے جو شخص لاتعلق اور بیگانہ ہو صرف نماز اور بے روح عبادت میں لگا ہوا اپنی اجتماعی، سیاسی ذمہ داری کا احساس نہ ہو ایسے افراد کو آج زاہد و متقی سمجھا جا رہا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم زہد و تقویٰ کی روح اور حقیقت سے بیگانہ ہیں اس لئے کہ تعلیمات نبی کریمؐ کو پیش نظر رکھتے ہوئے زہد و تقویٰ کا یہ معنیٰ جو آج سمجھا جا رہا ہے ہرگز نہیں، ایسے افراد نہ صرف زاہد و متقی نہیں ہو سکتے بلکہ پیغمبر اسلامؐ کے ارشاد کے مطابق ایسے افراد مسلمان بھی نہیں ہو سکتے۔ رسولؐ اسلام کا ارشاد گرامی

ہے مَنْ اَصْبَحَ وَلَمْ یَہتم بامور المسلمین فلیس بمُسلِم جو شخص اس طرح سے اپنی زندگی کے شب و روز گزارے کہ اس کو مسلمانوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زہد و تقویٰ کا یہ معنی جسے آج مسلمان سمجھ رہے ہیں نہیں ہو سکتا بلکہ زہد و تقویٰ جس کی اسلام میں اتنی اہمیت ہے اس کا فلسفہ اور مفہوم کچھ اور ہے جس کو اکثر مسلمان شعوری یا لاشعوری طور پر نظر انداز کر کے کچھ اور سمجھ رہے ہیں لہٰذا اس حقیقت کو جاننے کے لئے مناسب سمجھا کہ مجسمۂ زہد و تقویٰ مولائے متقیان امیر مؤمنانؑ کے کلمات گہربار سے زہد و تقویٰ کا معنی و مفہوم اور فلسفہ معلوم کیا جائے اور دیکھا جائے کہ مولا کی نظروں میں زہد و تقویٰ کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا فلسفہ اور فوائد کیا ہیں؟

زہد کیا ہے؟

زہد کا لغوی معنی عدم رجحان یا عدم تمایل قلبی ہے اگر کوئی شخص کسی چیز یا کسی کام میں دلچسپی نہ رکھتا ہو اور اسے پسند نہ کرتا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں چیز یا فلاں عمل کے سلسلہ میں زاہد اور بے اعتنا ہے۔ اصطلاح مسلمین اور قرآن و سنت کی زبان میں زاہد اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دنیا، مال و زر اور ریاست و شہرت جیسی چیزوں سے بے اعتنا اور ان میں دلچسپی نہ رکھتا ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مال دنیا رکھتا ہو کسی عہدہ و منصب پر فائز ہو تو کیا وہ زاہد ہو سکتا ہے؟ کیونکہ زہد کا معنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے مال دنیا اور دنیاوی امور سے بے رغبتی ہے اب اگر کوئی شخص صاحب ثروت ہے۔ جائداد کا مالک ہے یا بہت بڑے عہدہ پر فائز ہے تو کیا ایسا شخص زاہد ہو سکتا ہے؟ اس مطلب کو سمجھنے کے لئے امیر المؤمنین علیہ السلام کے کلمات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ نہج البلاغہ میں کلمات قصار ۴۳۹ میں حضرت امیر ارشاد فرماتے ہیں: الزهد كله بين كلمتين من القرآن قال الله سبحانه لكي لا تأسوا على ما فاتكم ولا تفرحوا بما آتاكم ومن لم يأس على الماضي ولا يفرح بالآتي فقد أخذ الزهد بطرفيه

زہد کی مکمل تعریف قرآن کے دو جملوں میں ہے خداوند متعال کا ارشاد ہے، جو چیز تمہارے ہاتھوں سے جاتی رہی ہے اس پر افسوس نہ کرو اور جو چیز خدا تمہیں دے اس پر اتراؤ نہیں۔ جو شخص جانے والی چیز پر افسوس نہیں کرتا اور آنے والی چیز پر اتراتا نہیں، اس نے زہد کو تمام معنی اپنایا ہے۔

حضرت نے زہد کا معنی و مفہوم قرآن کی روشنی میں دو جملوں میں بیان کیا ہے اور زاہد کی ایک جامع تعریف فرمائی ہے، فرماتے ہیں کہ قرآن کی رو سے زاہد وہ ہے جو اگر کسی وجہ سے مال و متاع دنیا سے محروم ہو جائے بالفرض اگر صاحب اولاد ہے اس کی اولاد مر جائے، صاحب دولت و ثروت ہے اس کی دولت و ثروت تباہ ہو جائے کسی دنیاوی مقام و منصب پر فائز ہے اس سے محروم ہو جائے تو ان مصائب اور اس امتحان الٰہی میں صبر و استقامت کا ثبوت دے۔ جو اس محرومیت اور نقصان سے حد سے زیادہ پریشان اور مایوس نہ ہو جائے وہ انسان صحیح معنوں میں زاہد ہے اور اگر اہل عبادت ہے نماز روزے کا پابند بھی ہے لیکن اس قسم کے امتحانات اور مشکلات میں خدا پر توکل اور بھروسہ نیز صبر و استقامت کا دامن چھوڑ دے تو ایسا شخص زاہد نہیں ہو سکتا اسی طرح سے اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ اگر اسے دنیاوی مال و متاع یا ریاست و اقتدار مل جائے یا صاحب اولاد و جائیداد ہو جائے تو پھر خدا اور رسولؐ کو بھول کر اتنا سرمست اور مغرور ہو جائے کہ تمام اخلاقی و دینی حدود سے گذر جائے اپنے زیردستوں اور کمزور طبقے پر ظلم کرے نعمت خدا کا شکر ادا کرنے اور اس سے صحیح فائدہ اٹھانے کے بجائے غرور و تکبر و فرعونیت کا شکار ہو جائے تو یہ بھی زہد کے منافی ہے لہٰذا حضرت فرماتے ہیں کہ جو شخص ان دونوں کمزوریوں سے مبرا ہو۔ نعمت سے محرومی کی صورت میں غمناک و افسردہ نہ ہو اور نعمت کے ملنے سے اس میں فرعونیت نہ آئے تو وہ اہل زہد و تقویٰ ہوتا ہے حضرت نے اہل زہد کی جو تعریف فرمائی ہے اس سے کہیں بھی زہد کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ انسان زاہد وہ ہوتا ہے جو مال و متاع دنیا سے محروم اور بے بہرہ ہو جو اجتماعی اور سیاسی مسائل سے بیگانہ اور لاتعلق ہو جو معاشرے میں اپنی تمام انفرادی، اجتماعی، اخلاقی، سیاسی ذمہ داریوں کو نظرانداز کر کے صرف عبادت الٰہی میں مشغول ہو بلکہ جو مفہوم حضرت

نے زہد کے لئے بیان فرمایا ہے اس کے مطابق زہد ایک نہایت ہی مثبت صفت ہے جو انسان کو دنیا کی قید و بند سے آزاد کر کے ایک مستقل اور باعزت و آزاد زندگی کے لئے آمادہ کر دیتی ہے زہد انسان کو دنیا اور دنیا پرستوں کی بندگی سے آزاد کر دیتا ہے۔ زہد کے نتیجے میں انسان کا دل و دماغ حبّ دنیا کی زنجیروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ زاہد انسان اسیر مال و جاہ و منصب نہیں ہوتا البتہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اہل زہد و تقویٰ دنیا سے کنارہ کش ہو جائے وہ کسب و تجارت نہ کرے، محنت و مزدوری نہ کرے بلکہ صرف مروجہ عبادت و بندگی میں مشغول رہے اسلام کی نظر میں یہ زہد نہیں ہے ایسا شخص نہ صرف زاہد نہیں ہوتا بلکہ فرمان رسول ؐ کے مطابق ایسے افراد صحیح معنوں میں مسلمان بھی نہیں ہوتے۔

زہد و تقویٰ کے نمونۂ کامل مولا امیر المؤمنین ؑ کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں کہ آنحضرت محراب عبادت و بندگی میں جب ہوتے تو ایسا لگتا کہ اس انسان کو عبادت کے علاوہ کسی چیز سے سروکار نہیں، عبادت کی یہ کیفیت تھی کہ جب بدن میں پیوست تیر نکالنا ہوتا تو نماز کی حالت میں نکال لیتے جب آپ دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر بندگی و اطاعت میں اس قدر منہمک ہو جاتے کہ کسی درد کا احساس تک نہ کرتے۔ لیکن اسی علیؑ شب زندہ دار کو میدان جنگ میں دیکھیں اس کی اجتماعی، سیاسی زندگی پر نظر ڈالیں اس کی محنت و مزدوری کا اندازہ لگائیں زندگی کے ہر شعبے میں فعال اور نہایت متحرک نظر آتا ہے اگر زہد و تقویٰ کا معنی دنیا سے کنارہ کشی و گوشہ نشینی ہوتا، اگر معاشرے سے علیحدگی ہی زہد ہوتا تو مولائے متقیان امیر مؤمنان جن پر زہد و تقویٰ کو ناز ہے۔ میدان حرب میں سپاہی، مسند حکومت و سیاست پر حکمران یہودی کے باغ میں محنت کش بنے نظر نہ آتے۔

ائمہ طاہرین ؑ کے زمانے میں بھی بعض ناآگاہ افراد معارف اسلامی کا اس قسم کا غلط مفہوم نکالا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت امام باقر علیہ السلام کو ایک شخص نے جب باغ میں کام کرتے ہوئے دیکھا تو یہ بات اس شخص کو عجیب سی لگی کہ امام علیہ السلام جیسے متقی و زاہد انسان کو تو ایسے مشاغل سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہئے بلکہ صرف عبادت میں مشغول رہنا چاہئے لہٰذا متعجب ہو کر پوچھتا ہے کہ مولا اس ضعیفی میں آپ کیسے باغ میں کام کرتے ہیں اگر

آپ کو اس حالت میں موت آجائے تو یہ کیسی موت ہوگی (گویا وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ ایک قسم کی حرص و ہوس دنیا ہے جس کی وجہ سے امامؑ اس بڑھاپے میں کھیت میں کام کر رہے ہیں) امامؑ نے جواب دیا کہ اگر اس حالت میں جبکہ اپنے بال بچوں کے لئے اپنی محنت سے حلال نفقہ پیدا کرنے میں مشغول ہوں مجھے موت آئے تو یہ شہید کی موت ہوگی۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ جو شخص حلال کمائی کے لئے پسینہ بہاتا ہے۔ اس پسینہ کا تقدس شہید کے خون کے برابر ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ: من ترك الدنيا للآخرة فليس منا ومن ترك الآخرة للدنيا فليس منا جس نے دنیا کو آخرت کے لئے ترک کیا وہ ہم سے نہیں اور جس نے آخرت کو دنیا کی حرص و ہوس میں نظر انداز کیا وہ بھی ہم سے نہیں۔

ان تمام روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ زہد بمعنی ترک دنیا اور معاشرے سے قطع تعلق نہیں ہے بلکہ دنیاوی مال و ثروت اور منصب و ریاست کا اسیر و غلام نہ بننا زہد ہے۔

مولا امیر المؤمنین علیہ السلام نہج البلاغہ کے خطبہ ۷۹ میں زہد کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: ايها الناس الزهادة قصر الامل والشكر عند النعم والورع عند المحارم اے لوگو! زہد کا مطلب دنیاوی امید و آرزو کو محدود کرنا اور نعمت الٰہی کے ملنے پر شکر خدا ادا کرنا اور حرام سے بچنا ہے۔

حضرت نے اپنے اس ارشاد میں زہد کو تین چیزوں سے مرکب سمجھا ہے ایک یہ کہ انسان دنیاوی جاہ و مقام، مال و دولت اور عہدہ و منصب کا لالچی نہ ہو ایسا نہ ہو کہ ہر وقت وہ اپنے دماغ میں یہی دنیاوی مسائل کے لمبے لمبے منصوبے تیار کرتا رہے۔ دوسرے یہ کہ جب انسان کو کوئی نعمت الٰہی نصیب ہو تو مغرور بننے کے بجائے اپنے منعم حقیقی یا خدائے تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اس کی بارگاہ میں بندگی کا اعتراف کرے تیسرے یہ کہ اگر کہیں حرام اور ناجائز طریقے سے مال و ثروت یا مقام و منصب ہاتھ آتا ہو تو اس پر جھپٹ نہ پڑے بلکہ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھ کر اس سے پرہیز کرے۔

تقویٰ:

تقویٰ کا لغوی معنی حفاظت، بچانا اور پرہیزگاری ہے تقویٰ اسم مصدر ہے تقویٰ ایک ایسی صفت ہے جو کثرت ریاضت سے حاصل ہوتی ہے آج اسلامی معاشرے میں اہل تقویٰ ان حضرات کو سمجھا جاتا ہے جو محرمات اور گناہوں سے بچنے کی خاطر پورے معاشرے سے کٹے ہوئے ہوں اسے مسلمانوں کے امور، مسائل سے کوئی دلچسپی نہ ہو حالانکہ سیرت رسول کریمؐ و ائمہ اطہارؑ سے جو زہد و تقویٰ کے پیکر اور متقین کے امام و پیشوا تھے۔ تقویٰ کے اس مفہوم کی تائید نہیں ہوتی نہج البلاغہ میں مولا نا امیرالمومنینؑ کے کلمات میں تقویٰ کے مفہوم کا جب جائزہ لیتے ہیں اس سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ تقویٰ صرف پرہیزگاری اور منفی موقف کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسی روحی و نفسیاتی صفت ہے جس کی منفی پوزیشن درحقیقت ایک مثبت مقصد کے لئے ہے اگر تقویٰ صرف اجتناب اور منفی موقف کا نام ہوتا، تو چاہیئے تھا کہ پیشوایان اسلام ہمیں معاشرے سے قطع تعلق کی تعلیم دیتے اس لئے کہ خدا کی نافرمانی کرنے اور محرمات کے ارتکاب کا خطرہ معاشرے میں رہنے ہی سے ہوتا ہے لہٰذا گناہ سے بچنے اور محرمات کو ترک کرنے کے لئے یہی بہترین راستہ ہے کہ معاشرے سے الگ تھلگ رہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے اولاً یہ فطرت بشر کے خلاف ہے کیونکہ انسان مدنی الطبع ہے ثانیاً یہ چیز روح تعلیمات اسلامی کے خلاف ہے اور خود سیرت انبیاءؑ و ائمہؑ اس طرز زندگی کی نفی کرتی ہے بلکہ اگر مولائے متقیان امیر مؤمنان علیہ السلام کے ارشادات میں غور کریں تو اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ ایک معنوی اور روحانی طاقت ہے جو صحیح تربیت اور مثبت ریاضت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے اس روحانی طاقت کے حصول کے دیگر طریقوں اور راستوں کے علاوہ ایک راستہ یہ بھی ہے کہ اسلاف اور گذشتگان کی تاریخ سے عبرت لیں اس کے نتیجے میں آدمی متقی ہو جاتا ہے اور پھر تقویٰ کے نتیجے میں وہ گناہ اور شہوت رانی سے بچ سکتا ہے۔ حضرت امیرؑ خطبہ ۱۶ میں ارشاد فرماتے ہیں: من صرحت له العبر عما بین یدیه من المثلات حجزه التقوی عن التقحم من الشبهات جس کو دیدۂ عبرت نے گذشتہ عقوبتیں واضح طور سے دکھا دی ہیں۔ تقویٰ اس کو

گناہ و شہوات میں ڈوبنے سے بچا لیگا۔ اس ارشاد کی روشنی میں تقویٰ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاشرے سے کٹ جائے بلکہ معاشرے کے حالات کا درس عبرت حاصل کرنے کی غرض سے گہرا مطالعہ کرنا ہی تقویٰ کا سبب بن جاتا ہے۔

خطبہ ۱۹۴ میں حضرت تقویٰ کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں: اوصیکم عباداللہ بتقوی اللہ فانھا الزمام والقوام فتمسکوا بوثائقھا واعتصموا بحقائقھا۔ اے بندگان خدا میں تمہیں تقویٰ اپنانے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ یہ سعادت کی باگ ڈور اور کامیاب زندگی کا مضبوط سہارا ہے لہٰذا تقویٰ کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ اور اس کے حقائق کو مضبوطی سے پکڑ لو اور پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ یہی تقویٰ ہے جو تمہیں منزل مقصود تک پہنچاتا اور مطمئن و باعزت زندگی سے آشنا کرتا ہے۔

مولاؑ کے ان ارشادات میں غور کرنے سے یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ نہ صرف یہ کہ دنیاوی زندگی سے الگ تھلگ رہنے کا نام نہیں بلکہ باسعادت و کامیاب اور باعزت معاشرے کے قیام کے لئے ہی تقویٰ پر زور دیا گیا ہے معاشرے میں عدل و قسط کا قیام فسق و فجور، ظلم و بربریت کے خاتمے ہی کے لئے تقویٰ اختیار کرنے کی سفارش کی گئی ہے پس تقویٰ کا مطلب گوشہ نشینی، منفی موقف اختیار کرنا یا کنارہ کشی کا نہیں ہو سکتا

فلسفۂ زہد و تقویٰ:

زہد و تقویٰ جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے فضائل و کمالات انسانی میں سر فہرست ہے۔ انسانی زندگی پر انفرادی، اجتماعی، اخلاقی اور سیاسی لحاظ سے اس کے کیا آثار مرتب ہو سکتے ہیں اور اس کے فوائد و نتائج کیا ہیں۔

مولا امیر المومنینؑ کے ارشادات کی روشنی میں زہد و تقویٰ کا جو مفہوم اور معنی سامنے آیا اگر زہد و تقویٰ کو اسی مفہوم کے ساتھ اپنایا جائے، فرد اور معاشرہ زہد و تقویٰ کے اس مفہوم کو درک کرتے ہوئے اپنی روزمرہ زندگی میں اس کا لحاظ رکھے تو اس سے بہت سارے اجتماعی و سیاسی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جن میں سے چند ایک کو ہم ذیل

میں بیان کرتے ہیں:

(۱) زہد اور تقویٰ کے نتیجے میں انسان مال و ثروت، جاہ و مقام، اولاد و جائداد اور دوسری دنیاوی وابستگیوں سے آزاد اور دنیا کی اسارت و بندگی سے نجات حاصل کرلیتا ہے۔ ایک زاہد و متقی انسان جس کی نظر میں اس دنیا کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی جس کے دل میں دنیا کے مال و متاع کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی وہ کسی بھی مرحلے میں اپنے مقصد کو دنیا کے مال و مقام سے محروم ہونے کے خوف سے نظر انداز نہیں کرتا جبکہ اس کے مقابلے میں وہ لوگ جو مال دنیا کے حریص اور بندے ہوتے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے دنیا کے اسیر ہو کر انسانی شرف تک کو فروخت کر دیتے ہیں وہ کہیں بھی جراتمندانہ قدم نہیں اٹھا سکتے۔ آج ہمارے مسلم معاشرے کی بڑی بدنصیبی یہی ہے کہ ہمارے قائدین اور سیاسی لیڈر اس قدر مال و متاع، جاہ و مقام، شہرت و اقتدار کے بھوکے ہیں کہ وہ کبھی بھی اہم اور حساس موقع پر اپنے مقصد کے لئے ان چیزوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کبھی بھی جابر و ظالم حکمرانوں کے خلاف جراتمندانہ اور ٹھوس موقف اختیار نہیں کرتے ہیں اس کے برخلاف تاریخ میں وہ اشخاص جو خدا کے نیک بندے اور زاہد و متقی رہے ہیں جو دنیا کی اسارت و بندگی سے آزاد تھے وہ ہمیشہ اپنا سب کچھ حتیٰ اپنی زندگی تک کو اپنے مقصد پر قربان کرتے آئے ہیں پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں ملتا ہے کہ جب کفار قریش آنحضرتؐ کی فعالیت و دعوت سے تنگ آگئے اور ان کے ڈرانے دھمکانے کے تمام حربے ناکام ثابت ہوئے تو حضرتؐ کو پیشکش کی کہ اگر آپ اپنے مشن سے ہاتھ اٹھالیں تو آپ کو سرمایہ و دولت، ریاست و اقتدار جو کچھ بھی چاہئے ہم دینے کے لئے تیار ہیں۔ حضرتؐ نے ان کی اس پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر تم لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی رکھ دو تب بھی میں اپنے مقصد کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ حریت و آزادی صرف اور صرف زہد و تقویٰ کے نتیجے میں میسر ہوئی تھی کہ آنحضرتؐ نے نہ کسی کے لالچ کا اثر لیا اور نہ کسی کی دھمکی سے گھبرائے آج ہمارے قائدین کے لئے ان عظیم پیشواؤں کی زندگی سرمشق ہونی چاہئے۔

(۲) زہد و تقویٰ کا دوسرا فائدہ اور نتیجہ اسراف و فضول خرچی سے بچنے کی صورت میں

سامنے آتا ہے زاہد اور متقی انسان دنیا سے اتنا ہی لیتا ہے جس سے اس کی بنیادی ضروریات پوری ہو جاتی ہوں وہ کبھی قدرت کے دیئے ہوئے مال و نعمت کو بے مقصد خرچ نہیں کرتا۔ ان کی زندگی بہت سادہ اور مختصر ہوتی ہے ان کی پوری جد و جہد معاشرے کی ترقی و تعمیر کے لئے ہوتی ہے وہ اپنے کو معاشرے کا خادم سمجھ کر اپنی پوری کوشش معاشرے کی سعادت و خوشبختی کے لئے وقف کر دیتے ہیں لہٰذا وہ عیش و عشرت، تجمل و اسراف سے سخت بیزار ہوتے ہیں۔

۳) تیسرا فائدہ زہد و تقویٰ کا یہ ہے کہ معاشرے میں موجود طبقاتی تفاوت ہوتا ہے اگر مال دار طبقہ زہد و تقویٰ کے زیور سے آراستہ ہو جائے تو وہ کبھی بھی معاشرے کے محروم و غریب طبقے کو نظر انداز نہیں کر سکتا وہ دوسروں کو اپنی خوشیوں میں شریک کرتا رہیگا۔ وہ دوسروں کے درد و تکلیف کو اپنا درد و تکلیف سمجھے گا وہ کبھی بھی دوسروں کو غریب و محروم سمجھ کر ذلیل نہیں کرے گا وہ قدرت کی دی ہوئی دولت کو اللہ کا احسان و کرم سمجھ کر اس کو اللہ کے محروم بندوں کی خوشی کے لئے خرچ کرتا رہے گا جس کے نتیجے میں غریب اور امیر طبقہ کا تفاوت ختم ہو سکتا ہے۔

۴) چوتھا فائدہ زہد و تقویٰ کا یہ ہے کہ معاشرے میں قانون کی حکومت عدل و قسط کی حکمرانی، مساوات کا رواج صرف زہد و تقویٰ کے نتیجے میں ممکن ہے اگر کسی مملکت کے حکمراں زاہد و متقی ہوں خدا ترس و نیک سیرت ہوں تو قانون کو سب پر مساوی اور برابر نافذ کریں گے اگر فوج کے کمانڈر زاہد و متقی ہوں تو وہ کبھی اپنے فرائض سے ترچھی اور ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کریں گے اگر عدالتوں میں قاضی او ر جج زاہد و متقی ہوں تو عدل و انصاف کے نفاذ میں وہ امیر و غریب، اپنے اور پرائے کے درمیان ہرگز امتیاز نہیں برتیں گے۔

صحافی اور اہل قلم و بیان اگر زاہد و متقی ہوں تو وہ مال دنیا یا مقام و منصب کی لالچ میں قوم و ملت سے خیانت نہیں کریں گے اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ اہل صنعت و تجارت اگر زاہد و متقی ہوں تو وہ اپنی جیب بھرنے اور

...راندوزی کی لالچ میں، ملاوٹ، خیانت اور ذخیرہ اندوزی و گراں فروشی نہیں کریں گے غرضیکہ زہد و تقویٰ معاشرے پر حاکم ہو جائے تو معاشرہ کا ہر فرد اپنا فرض دیانت و امانت سے انجام دیتا رہے گا اور یہ معاشرہ ایک مدینہ فاضلہ بن سکتا ہے۔

حضرت امیر علیہ السلام خطبہ ۱۶ میں تقویٰ کے گوناگوں فوائد و آثار کو ایک جملے میں یوں بیان فرماتے ہیں: لا یہلک علی التقوی سنخ اصل ولا یظمأ علیہا زرع قوم ۔۔۔ جس چیز کی بنیاد تقویٰ پر رکھی جائے وہ کبھی نابود نہیں ہوتی اور جو عمل تقویٰ کی سرزمین میں کاشت کیا جائے وہ کبھی پیاس اور تشنگی کا احساس نہیں کرتا حضرتؑ اس بیان میں یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جو بھی کام اور عمل تقویٰ کی بنیادوں پر انجام پائے وہ نتیجہ ضرور دیگا، چاہے وہ زندگی کے جس شعبہ سے بھی متعلق ہو۔

تقویٰ کے اخلاقی و نفسیاتی آثار:

مولا امیر المومنینؑ انسانی اخلاق و نفسیات میں تقویٰ کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: التقوی رئیس الاخلاق (کلمات قصار ۴۱۰) تقویٰ اخلاق حسنہ کا پیشوا و سربراہ ہے۔

خطبہ ۱۱۲ میں ارشاد فرماتے ہیں: عباد اللہ ان تقوی اللہ حمت اولیاء اللہ محارمہ والزمت قلوبہم مخافتہ حتی اسہرت لیالیہم و اظمأت ہواجرہم فاخذوا الراحۃ بالنصب والری بالظمأ و استقربوا الاجل فبادروا العمل وکذبوا الامل فلاحظوا الاجل۔

اے بندگان خدا تقویٰ الٰہی اللہ کے دوستوں کو محرمات و منہیات سے بچا لیتا ہے ان کے دلوں میں خوف خدا پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ انہیں رات کو (عبادت و بندگی کے لئے) بیدار کر دیتا ہے اور گرم ایام میں روزہ رکھنے پر آمادہ کرتا ہے تقویٰ کے نتیجے میں وہ راحت طلبی و سہولت پسندی کے بجائے مشقت اور سختیاں برداشت کرنے کے عادی بن جاتے ہیں، پانی سے سیراب ہونے کے بجائے پیاس اور تشنگی کو

انتخاب کرتے ہیں زندگی کو مختصر اور اجل کو قریب سمجھ لیتے ہیں لہذا زیادہ سے زیادہ نیک عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لمبی لمبی امیدوں کو جھٹلا کر اجل کو نگاہ میں رکھتے ہیں۔

تقویٰ ۔ بہترین لباس و پناہ گاہ :

انّ الجهاد باب من ابواب الجنة فتحه الله لخاصة اولیائه وهو لباس التقویٰ ودرع الله الحصینة وجنته الوثیقة (خطبہ ۲۷)
تحقیق کہ جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جس کو اللہ نے اپنے خاص دوستوں کے لئے کھول رکھا ہے جہاد تقویٰ کا لباس اور پوشش ہے اور خدا کی مضبوط زرہ اور محکم ڈھال ہے۔

فمن اشعر التقویٰ قلبه برز مهله وفاز عمله فاهتبلوا هبلها واعملوا للجنة عملها (خطبہ ۱۳۰)
جس شخص نے اپنے دل کو تقویٰ شعار بنالیا وہ بھلائیوں میں سبقت لے گیا اور اس کا کیا کرایا اعمال سوارت ہوا۔ لہذا تقویٰ کو اپنانے کے لئے فرصت کو غنیمت سمجھو اور بہشت حاصل کرنے کے لئے نیک عمل انجام دو۔

فاعتصموا بتقوی الله فانّ لها حبلاً وثیقاً عروته ومعقلاً منیعاً ذروته۔
تقویٰ کو اپناؤ جو مضبوط رسی، محکم دستگیر، مضبوط قلعہ اور پناہ گاہ ہے (خطبہ ۱۹۰)

خطبہ ۱۵۷ میں فرماتے ہیں : اعلموا عباد الله انّ التقویٰ دار حصن عزیز والفجور دار حصن ذلیل ۔ جان لو اے بندگان خدا کہ تقویٰ ایک مضبوط اور محکم قلعہ ہے جبکہ بدکاری اور گناہ کمزور، بوسیدہ اور متزلزل گھر ہے خطبہ ۱۹۱ میں فرماتے ہیں :
انّ التقوی فی الیوم حرز و الجنة وفی غدٍ الطریق الی الجنة ۔ تقویٰ آج (دنیا میں) ڈھال اور حفاظت ہے اور کل (آخرت میں) جنت کا راستہ ہے ؛ لا معقل احسن من الورع (کلمات قصار ۳۷۱) زہد و تقویٰ سے زیادہ مضبوط کوئی قلعہ نہیں۔

تقویٰ۔ سبب آزادی و نجات

خطبہ نمبر۲۳۰ میں فرماتے ہیں: فإن تقوی الله مفتاح سداد و ذخیرة معاد و عتق من کل ملکة و نجاة من کل هلکة بها ینجح الطالب و ینجو الهارب و تنال الرغائب ۔ تقویٰ الٰہی مصائب و مشکلات کی کنجی ہے، قیامت کے لیے بہترین ذخیرہ اور ہر قسم کی اسارت سے آزادی کے لیے بہترین وسیلہ ہے نیز ہلاکت سے نجات حاصل کرنے کا سبب ہے، تقویٰ کی برکت سے ہر انسان اپنے مقصد و مطلوب تک پہنچتا ہے۔

تقویٰ۔ قلبی امراض کا علاج اور اجتماعی مشکلات کا حل

(نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۸)

ان تقوی الله دواء داء قلوبکم و بصر عمی افئدتکم و شفاء مرض اجسادکم و طهور دنس انفسکم و جلاء غشاء ابصارکم و امن فزع جاشکم و ضیاء سواد ظلمتکم۔

تقویٰ الٰہی، دل کی بیماریوں کا علاج، باعث بینائی قلب اور امراض جسمانی کے لیے شفا ہے تقویٰ روح و نفس کے زخموں کے لیے مرہم ہے اور اس کو پاک و صاف کرتا ہے۔ آنکھوں کی بصارت میں اضافہ کرتا ہے، تقویٰ تمہاری نفسیاتی پریشانی و اضطراب کو برطرف اور ظلمت و تاریکی کو نور و روشنی میں تبدیل کرتا ہے۔

خطبہ ۱۹۸ میں ارشاد فرماتے ہیں:

فمن اخذ بالتقوی عزبت عنه الشدائد بعد دنوها و احلولت له الامور بعد مرارتها و انفرجت عنه الامواج بعد تراکمها و اسهلت له الصعاب بعد انصابها و هطلت علیه الکرامة بعد قحوطها و تحدبت علیه الرحمة بعد نفورها و تفجرت علیه النعم بعد نضوبها و وبلت علیه البرکة بعد ارذاذها

جو تقویٰ کو اپنا لے مشکلات و شدائد اس سے دور ہو جائیں گے تلخیاں شیریں، مصائب و آلام برطرف اور تھکا دینے والی پے در پے مشکلات

آسان ہو جائیں گی۔ کھوئی ہوئی عظمت باران رحمت کی طرح اس پر برسنے لگے گی اللہ کی قطع شدہ رحمتیں اور برکتیں دوبارہ نازل ہو جائیں گی اللہ کی نعمتیں پھر شامل ہو جائینگی۔

نمونۂ تقویٰ:

یوں تو ہر شخص تقویٰ کا مدعی ہو سکتا ہے یا لوگ اسے متقی اور اہل تقویٰ کہہ سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ حقیقی معنی میں وہ شخص متقی ہو بھی لھذا ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مولا امیر المومنینؑ، نہج البلاغہ میں اس سلسلہ میں کیا فرماتے ہیں اور مولاؑ کی نظر میں صحیح معنوں میں کس کو متقی کہا جا سکتا ہے؟ اور عملی تقویٰ کیا ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں مولاؑ کے خطبات میں سے چند جملے نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ خطبہ ۸۳ میں ارشاد فرماتے ہیں:

فاتقوا اللّٰہ تقیۃ من سمع فخشع و اقترف فاعترف و وجل فعمل وحاذر فبادر و ایقن فاحسن و عبّر فاعتبر و حذّر فحذر و زجر فازدجر و اجاب فاناب و راجع فتاب و اقتدیٰ فاحتذیٰ و اریٰ فرایٰ فاسرع طالباً و نجا ھارباً فافاد ذخیرۃ و اطاب سریرۃ و عمّر معاداً و استظھر زاداً لیوم رحیلہ و وجہ سبیلہ وحال حاجتہ و موطن فاقتہ و قدّم امامہ لدار مقامہ۔

تقویٰ اختیار کرو اس شخص کے تقویٰ کی مانند جو جب سنتا ہے تو فوراً اپنی ذمہ داری کا احساس کرتا ہے اور جب کوتاہی کرتا ہے تو فوراً اپنی کوتاہی اور کمزوری کو (درک کرکے) مان لیتا ہے اور جب اپنے فرض کا احساس کرتا ہے تو فوراً اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب خدا سے ڈرتا ہے تو اطاعت حق بجالاتا ہے جب (موت و قیامت پر) یقین کر لیتا ہے تو نیکی کرتا ہے اور جب اسے درس عبرت دیا جاتا ہے تو عبرت حاصل کر لیتا ہے اور جب اس کو منع کیا جاتا ہے تو نافرمانی نہیں کرتا اللہ کی دعوت کو سن کر اسکی

طرف پلٹتا ہے اور جب پلٹتا ہے تو توبہ کر کے پلٹتا ہے جب اولیاء اللہ کی پیروی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے اقدام کرتا ہے جب اسے (حق) دکھایا جاتا ہے تو طلب حق کے لئے سرگرم عمل ہو جاتا ہے اور نافرمانی و عصیان سے دوری اختیار کرتا ہے (اس دنیا میں) آخرت کا ذخیرہ کرتا ہے، اپنے نفس کو پاک اور آخرت کو آباد کرتا ہے سفر آخرت اور روز حاجت کے لئے زاد راہ فراہم کرتا ہے اور جانے سے پہلے اس کو اپنی ابدی اقامتگاہ اور اصلی مقصد و منزل کی طرف بھیج دیتا ہے۔

تقریباً اسی مضمون کو حضرت نے کلمات قصار میں کلمہ نمبر ۲۱ میں بھی بیان فرمایا ہے حضرت امیر نے ان کلمات میں عملی تقویٰ کے لئے کچھ اصول بتائے ہیں جن کی رعایت کرنے سے صحیح معنوں میں تقویٰ حاصل ہو جاتا ہے اور انسان متقی بن جاتا ہے۔ ان اصولوں کو اپنانے کے بعد انسان تقویٰ کا مکمل نمونہ بن جاتا ہے۔ ان اصولوں کی فہرست یہ ہے:

۱۔ احساس ذمہ داری زندگی کے تمام مسائل و مراحل میں۔
۲۔ اپنی کمزوری اور کوتاہی کو ماننا خواہ مخواہ اپنے ہر عمل کو صحیح نہ کہنا۔
۳۔ احساس فرض کے بعد فوراً اپنے فرض کو پورا کرنے کے لئے میدان عمل میں وارد ہونا۔
۴۔ خوف خدا دل میں رکھتے ہوئے اطاعت گزار بننا۔
۵۔ خدا اور آخرت پر یقین رکھتے ہوئے لوگوں کے ساتھ نیکی اور ہمدردی کرنا۔
۶۔ تاریخ گذشتگان سے درس عبرت حاصل کرنا۔
۷۔ پند و نصیحت کو سن کر اس پر عمل کرنا۔
۸۔ توبہ و انابہ کر کے عاصیوں کے گروہ سے جدا ہو کر اللہ کی طرف پلٹنا۔
۹۔ انبیاء و اولیاء اللہ کی عملی پیروی کرنا۔
۱۰۔ حق کو حاصل کرنے کی پوری قوت سے جدوجہد کرنا۔
۱۱۔ گناہ اور نافرمانی سے دوری اختیار کرنا۔
۱۲۔ تہذیب نفس کی کوشش کرنا۔

۱۳۔ آخرت، قبر اور حساب و کتاب و روز جزا کو نظر میں رکھتے ہوئے آخرت کی ابدی زندگی کے لئے توشہ حاصل کرنا۔

ان اصولوں کے ذریعے حقیقی متقی اور جھوٹے متقی کی تشخیص کی جا سکتی ہے۔ اسی خطبہ ۸۳ میں ایک اور جگہ پر حضرت امیرؑ متقین اور اہل تقویٰ کی نفسیاتی و روحانی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فاتقوا اللّٰہ عباد اللّٰہ تقیۃ ذی لبّ شغل التفکّر قلبہ و انصب الخوف بدنہ و اسھر التھجد غرار نومہ و اظمأ الرّجاء ھواجر یومہ و ظلف الزّھد شھواتہ و ارجف الذکر بلسانہ و قدم الخوف لامانہ و تنکّب المخالج عن وضح السبیل و سلک اقصد المسالک الی النّھج المطلوب و لم تفتلہ فاتلات الغرور و لم تعمّ علیہ مشتبہات الامور ظافراً بفرحۃ البشریٰ و راحۃ النّعمیٰ فی انعم نومہ و آمن یومہ و قد عبر معبر العاجلۃ حمیداً و قدّم زاد العاجلۃ سعیداً و بادر من وجل و اکمش فی مھل و رغب فی طلب و ذھب عن ھرب و راقب فی یومہ غدہ و نظر قدماً امامہ۔

اے بندگان خدا تقویٰ اختیار کرو اس شخص کے تقویٰ کے مانند جس کے (۱) دل پر ہمیشہ اس کی عقل کا قبضہ ہوتا ہے۔ (۲) خوف خدا نے اس کے جسم کو نڈھال بنا دیا ہے۔ (۳) شب بیداری کی وجہ سے آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی ہے۔ (۴) خدا کے رحم و کرم کے حصول کی امید نے اس کو گرم ایام میں روزہ رکھنے پر آمادہ کیا ہے (۵) زہد نے اس کی خواہشات نفسانی کو محدود کر دیا ہے۔ (۶) اللہ کے ذکر میں ہمیشہ رطب اللسان ہے (۷) قیامت میں عذاب الٰہی سے بچنے کے لئے دنیا ہی میں چارہ جوئی کر چکا ہے۔ (۸) صرف راہ حق پر چلتا ہے جو بہترین راہ اور اللہ کا راستہ ہے اور دوسرے گمراہ راستوں سے

چشم پوشی کر چکا ہے۔ (۹) جن چیزوں سے انسان دھوکا کھا جاتا ہے اور منحرف ہو جاتا ہے اس سے دھوکہ نہیں کھاتا ہے (۱۰) مبہم و مشکوک امور اس کو اندھا نہ بنا سکے۔ (۱۱) بہشت کی بشارت و نعمت الٰہی کے مزہ اور امن و امان کی زندگی سے خوشنود و مسرور ہے (۱۲) اس دنیائے فانی سے بہترین انداز سے گذرا ہے اور آخرت کا سامان کر چکا ہے (۱۳) قیامت کے عذاب کے خوف سے عمل صالح بجا لاتا ہے (۱۴) اور پوری زندگی اطاعت و بندگی میں گزار چکا ہے۔ (۱۵) اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا اس کا مطمح نظر ہے۔ (۱۶) جن چیزوں سے بچنا چاہیئے ان سے بچا ہوا ہے (۱۷) آج ہی آنے والے کل کی ضمانت کر چکا ہے۔ (۱۸) اور اپنے مستقبل کو مد نظر رکھے ہوئے ہے۔

اگر یہ وہ روحانی و معنوی کیفیت کسی شخص میں موجود ہو تو وہ متقی اور اہل تقویٰ ہوتا ہے۔ ان صفات سے متصف افراد ہی متقی کہے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں البتہ متقین کے اوصاف اور خصوصیات کو حضرت امیر علیہ السلام نے خطبہ ۱۹۳ میں جو خطبہ ہمام کے نام سے معروف ہے تفصیل سے ذکر فرمایا ہے یہ خطبہ مولا نے اپنے ایک زاہد و متقی صحابی کی خواہش پر بیان فرمایا ہے۔ ہمام نے حضرت سے درخواست کی کہ مولا مجھے متقین کے اوصاف اس طرح سے بیان فرمائیں کہ گویا میں اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہا ہوں۔ حضرت چونکہ ہمام کی حالت جانتے تھے کہ تحمل نہ کر سکیں گے لہذا بات کو ٹالتے ہوئے فرمایا کہ یا ہمام: اتقوا اللہ و احسن ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ہم محسنون — اے ہمام! تقویٰ اختیار کرو اور اچھا عمل انجام دو پھر آیت فوق کی تلاوت فرمائی۔ لیکن ہمام نے اصرار کیا کہ مولا تفصیلی طور پر متقین کا تعارف کرائیں اس طرح سے جیسے کہ میں آنکھوں سے ان کو دیکھ رہا ہوں امیر المؤمنین نے ہمام کی بار بار درخواست کو دیکھتے ہوئے حمد و ثناء رب بجا لائے اور مفصل خطبہ بیان فرمایا جس میں مولا نے متقین کی تفصیلی تصویر کشی کی ہے۔ ہمام نے اس قدر توجہ سے سنا کہ خطبہ کے اختتام تک ان کی روح ملکوت اعلیٰ کو پرواز کر گئی۔ چونکہ خطبہ بہت تفصیلی ہے لہذا اس کو اس مقالہ میں ذکر نہیں

کیا جا سکتا۔ اہل تقویٰ کو اسے ضرور غور سے پڑھنا چاہئے۔

جناب سید مصطفیٰ محقق داماد
ترجمہ: جناب سید احتشام عباس

مصادر فقہ (۲)

سنّت:

سنّت، فقہ اسلامی کا دوسرا مصدر ہے۔ لفظ "سنّت" جس کی جمع سنن ہے ابتدا میں سمت و حرکت کے معنی میں پھر مجازاً، اسلاف کی باقی ماندہ عادات رسوم کے معنی میں استعمال ہوا۔

فقہ و اصول کی اصطلاح میں سنّت سے، قول و فعل و تقریر معصوم مراد لئے جاتے ہیں۔ اس اصطلاح کی اصل بنیاد رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے وہ گرانقدر ارشادات ہیں جس میں آپ نے اپنی سنتوں کی پیروی کے لئے مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔

فقہائے عامہ اور علمائے شیعہ کے درمیان سنّت کے مفہوم میں فرق ہے۔ عامہ کے نزدیک سنّت، فعل و قول و تقریر رسول خداؐ ہے لیکن علماء امامیہ نے سنّت کے دامن کو وسعت دیکر قول و فعل و تقریر ائمہ علیہم السلام کو بھی سنّت کا مصداق جانا۔ لہٰذا شیعوں کے مطابق سنّت سے مراد قول و فعل و تقریر معصومؑ ہے۔ ان کے اعتقاد کے مطابق ائمہ کے قول و فعل و تقریر اس لئے حجت نہیں ہیں کہ وہ راویان یا تابعین میں سے ہیں بلکہ اس بنا پر ہے کہ ائمہؑ بھی احکام کے بیان کرنے کے لئے خدا کی طرف سے منصوب و معین کئے گئے ہیں، ان میں اور رسول خداؐ میں فرق یہ ہے کہ پیغمبرؐ سے ملنے والے احکام کا ذریعہ، وحی ہے اور ائمہؑ سے، الہام کی صورت میں۔

سنّت کی تین قسمیں ہیں: سنّتِ عملی، سنّت امضائی یا تقریری، سنّت قولی، جن کو ہم علی الترتیب اختصار سے بیان کرتے ہیں۔

سنتِ عملی :

سنتِ عملی سے مراد فعل معصوم ہے۔ معصوم وہ ہے جس کے یہاں کسی غلط عمل کے ارتکاب کا احتمال نہ ہو۔

لہٰذا عملِ معصوم فقہ کے مصادر میں سے ایک مصدر اور چشمہ شمار کیا جاتا ہے اجمالاً اس میں کوئی تردید نہیں ہے۔ نقطۂ بحث یہ ہے کہ سنتِ عملی کی اہمیت اور اس کی دلالت کی مقدار کیا ہے۔

سنتِ عملی کی دلالت کی مقدار :

جب بھی معصومینؑ کا کوئی عمل ہمارے سامنے آتا ہے تو کم سے کم اس کی دلالت یہ ہوتی ہے کہ یہ عمل جائز ہے اور عدم جواز کا کوئی پہلو نہیں رکھتا۔ جیسا کہ کسی معصوم کا کسی عمل کو ترک کرنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ وہ عمل واجب نہ تھا۔

البتہ اس سلسلہ میں موجودہ قرائن کی روشنی میں بہت سارے مقامات پر فعل معصومؑ اس سے زیادہ دلالت کرے گا مثال کے طور پر کوئی معصومؑ دوسروں کو کسی فریضۂ الٰہی کی تعلیم کے ضمن میں اس پر عمل بھی کرے تو بلاشبہ عملِ معصومؑ سے اس کا واجب ہونا یا کم از کم مستحب ہونا ظاہر ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ قرینہ نہ ہونے کی صورت میں فعلِ معصومؑ، عمل کے جائز ہونے کے علاوہ احکام کی جملہ صورتوں میں سے کس حکم سے متعلق ہوگا : واجب ؟ مستحب یا مباح ؟

اصول فقہ میں مذکورہ بالا تینوں احتمالات کا اظہار کیا گیا ہے لیکن اصول و قواعد کلی کے مطابق عمل معصوم قرینہ موجود نہ ہونے کی صورت میں کسی طرح کی ترجیح پر دلالت نہیں کرسکتا اس لئے کہ ترجیح کا سبب ظاہر نہیں ہے۔

کیا فعل معصومؑ تمام لوگوں کے لئے حجت ہے ؟

مسلم روایات اور نصوص کی روشنی میں رسول اکرمؐ بعض فریضوں کے پابند تھے جو دوسروں کے لئے فرض و واجب نہ تھے۔ مثلاً نماز نافلۂ شب آنحضرتؐ پر فرض تھی لیکن تمام لوگوں کے لئے

مستحب ہے۔ اسی طرح بعض احکام میں بھی آنحضرتؐ اور دوسروں میں بہت واضح فرق ہے۔ مثلاً آنحضرتؐ کے لئے جائز تھا کہ آپ چار سے زیادہ عقد دائمی کر سکتے تھے جبکہ سب کے لئے یہ جائز نہیں ہے۔ اس طرح کے مسائل کو خصوصیات پیغمبر کہتے ہیں۔

یہ بات صرف رسول اللہ سے مخصوص نہیں بلکہ ائمہ معصومینؑ کے سلسلہ میں بھی تصور کی جاتی ہے اس لئے کہ بلاشبہ ان سے ظاہر ہونے والے بہت سارے اعمال مسلمانوں کی ایک فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ولی عام اور زعیم مطلق ہونے کی حیثیت سے ظاہر ہوئے ہیں۔

مندرجہ بالا موضوع کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بھی کسی معصومؑ سے کوئی عمل مشاہدہ کیا جائے اور اس کے عمل مخصوص ہونے پر کوئی قرینہ بھی ظاہر نہ ہو تو یہ عمل کس چیز پر دلالت کرے گا؟ آیا عام افراد کے لئے بھی یہ عمل کی بنیاد بنے گا یا نہیں؟ امر مسلم یہ ہے کہ معصومین کے افعال و اعمال بھی اصولی طور پر تمام انسانوں کے مانند ہیں اس لئے کہ وہ بھی بشر ہیں۔ دوسروں کی طرح وہ بھی فرائض و قوانین کے پابند ہوتے ہیں، ان میں اور دوسروں میں اس حیثیت سے کوئی امتیاز نہیں ہے۔ ان میں اور عام لوگوں میں اشتراک اور برابری پر مبنی بہت ساری دلیلیں صراحت سے پائی جاتی ہیں۔

مذکورہ بالا اصل عام سے ان یقینی دلائل خاصہ کے ذریعہ جو معصومؑ کے کسی عمل کے خصوصی ہونے کی بنیاد ہیں، بعض اعمال خارج ہو گئے ہیں لہٰذا ہمیں اسی متیقن مقدار تک اکتفا کرنی چاہئے اور مشکوک موارد میں اصل اولیہ یعنی اصل عام پر عمل کرنا چاہئے۔

سنّت تقریری:

تقریر معصوم یعنی کوئی عمل معصومؑ کے سامنے انجام پائے اور معصوم نے اس کی نفی نہ کی ہو۔

تقریر معصومؑ کے مستند ہونے کے لئے دو استدلالی مقدمے ہیں:۔

الف: امر بہ معروف اور نہی از منکر ہر مسلمان پر واجب ہے، چونکہ معصومؑ (رسول اکرمؐ ہوں یا امامؑ)

لہ قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بارے میں فرماتا ہے:۔

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الیّ۔ اے رسول! کہہ دو میں تمہاری ہی طرح بشر ہوں لیکن میرا اوپر وحی نازل ہوتی ہے۔ (کہف ۱۱۰)

بھی مسلمانوں میں سے ہیں یہ بات ان پر بھی واجب ہے۔ اور خصوصیت سے ان کے فریضۂ ہدایت و ارشاد کو دیکھتے ہوئے یہ امر واجب تر ہوگا۔

ب) دوسرے یہ کہ معصومؑ کبھی کسی واجب کو ترک نہیں کرتا۔ ان دونوں مقدموں سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

۱) جب بھی معصومؑ کے سامنے کوئی شخص کوئی عمل انجام دے اور معصوم کی طرف سے اعتراض کا نشانہ نہ بنے ہر چند اس سے اس عمل کے وجوب، استحباب یا اباحت کا اظہار نہیں ہوتا لیکن کم از کم یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عمل جائز ہے منع نہیں ہے۔

۲) جب بھی کوئی واجب معصومؑ کے سامنے انجام دیا جائے اور معصومؑ اس کی انجام دہی کے طریقہ پر اعتراض نہ کریں اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کم از کم یہ عمل اپنے موجودہ شرائط کے ساتھ صحیح ہے۔
پہلے مرحلہ میں مثلاً کوئی شخص امام کے سامنے کوئی چیز کھائے اور امام اس کو منع نہ کریں اس سے کم از کم یہ سمجھا جائے گا کہ یہ غذا حرام نہیں ہے۔ اور دوسرے مرحلہ میں مثلاً کوئی شخص امامؑ کے سامنے وضو کرے اور امامؑ اس کے وضو کرنے کے طریقہ پر اعتراض نہ کریں اس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وضو صحیح کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس شخص کا وضو اگر کسی عنوان سے غلط ہوتا تو امر بہ معروف کے واجب ہونے کی وجہ سے قطعی طور پر امامؑ کے اعتراض کا نشانہ بنتا یہاں تک کہ اگر جہالت میں اس سے یہ عمل انجام پاتا تو امام بلاشبہ اسے ہدایت فرماتے۔

معصومؑ کی تقریر یا تصدیق کے لئے دو شرطیں لازم ہیں:

پہلی: یہ کہ معصومؑ کو کامل طور سے فعل کی انجام دہی کی اطلاع رہی ہو۔ یعنی وہ فعل مکمل طور سے امام کی موجودگی میں اور ان کے سامنے انجام پایا ہو۔

دوسری: یہ کہ امام کے امر بہ معروف اور نہی از منکر کے لئے کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو۔ یعنی امام فعل کے واقع ہونے کے وقت یا جگہ کے لحاظ سے خود عمل یا اس کے طریقۂ صحت میں اظہار نظر کے لئے کوئی مانع نہ رکھتے ہوں۔ اس جگہ مختصر سی وضاحت ضروری ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں ائمہ علیہم السلام اور ان کے جملہ اصحاب باوفا، ظالم حکام اور سلاطین کی طرف سے ہمیشہ جاسوسوں کے

زیر نظر رہے اور بنیادِ اسلام کی حفاظت نیز مخفی و علنی شیعوں کی بقا کے لئے اکثر اسی میں مصلحت تھی کہ خود کو ساکت و پنہاں کئے رہیں جسکے مشہور مظاہر میں سے ایک تقیہ ہے۔ چونکہ غاصب اور ستمگر خلفاء زیادہ تر شیعوں کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لئے ائمہ علیہم السلام کے ارد گرد جاسوس معین کرتے تھے اور یہ حضرات ؑ بھی اس بات سے واقف تھے، لہٰذا شیعی اقدامات کو پوشیدہ رکھنے کے خیال سے مجبوراً مختلف راہوں اور احتیاط کے گوناگوں طریقوں سے استفادہ کرتے ہوئے اکثر شرعی معیارات کے بیان کرنے کا موقع اور امکان نہ رکھتے ہوئے سکوت اور خاموشی کو ترجیح دیتے تھے لہٰذا تقریر معصوم کے مطالعہ اور اس کی وقعت و حیثیت جاننے کے لئے ہمیشہ یہ بات دھیان میں رکھنی چاہئے کہ آیا ائمہ علیہم السلام امر بہ معروف یا نہی از منکر کا فریضہ ادا کرنے کی آزادی یا امکان رکھتے تھے یا کسی وجہ سے کسی رکاوٹ یا مانع سے دوچار ہوگئے!

جناب ڈاکٹر سید جلال الدین مدنی

ترجمہ: جناب خادم حسین

اسلامی جمہوریہ کا دستور اساسی

۸۔ امام خمینی کے پیغام سے مجلس خبرگان کا افتتاح:

مجلس خبرگان کا افتتاح ۲۸ مرداد ۱۳۵۸ھ کو قائد انقلاب امام خمینی کے پیغام سے ہوا، اس پیغام کے متن کو ان ہدایتوں کے پیش نظر جو اراکین مجلس خبرگان کے لئے تھیں خاص اہمیت دی گئی اور چونکہ یہ پیغام سرنوشت ساز تھا اس لئے ہم اسے مکمل طور پر نقل کر رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خداوند متعال کے فضل و کرم اور حضرت ولی اللہ الاعظم عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کی عنایت کے ساتھ مجلس خبرگان اپنا کام شروع کر رہی ہے، لہٰذا مناسب ہوگا کہ کچھ باتیں شریف عوام، علماء کرام اور محترم اراکین کے سامنے پیش کروں۔

۱ جو لوگ ایران کے اسلامی انقلاب سے واقف ہیں ان پر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس انقلاب کا محرک اور اس کی کامیابی کا راز اسلام رہا ہے اور ہمارے عوام نے دارالحکومت سے لے کر مختلف شہروں، قصبوں اور دیہاتوں تک میں اپنا خون دیکر اور "اللہ اکبر" کے نعرے لگا کر اسلامی حکومت کی مانگ کی ہے، یہی حال ریفرنڈم کا تھا کہ عوام کی اکثریت نے اسلامی جمہوریہ کے حق میں ووٹ دیئے اور اسلامی و غیر اسلامی حکومتوں نے ایران کی حکومت کو اسلامی جمہوریہ کے عنوان سے تسلیم کیا ہے۔

۲ مذکورہ بالا باتوں کے پیش نظر دستور اساسی اور دوسرے تمام قوانین کو اس جمہوریہ میں سو فیصدی اسلامی بنیادوں پر استوار ہونا چاہئے اور اگر ایک دفعہ بھی اسلامی احکام

کے خلاف ہوئی تو جمہوریت اور عوام کی اکثریت کی آراء کے محسوب ہوگی۔ اس بنا پر ہر وہ تجویز جو نمائندوں کی طرف سے پیش کی جائے گی خلاف اسلام ہونے کی صورت میں ناقابل قبول نیز عوام اور جمہوریت کے خلاف ہوگی اور اصولی طور پر جو اراکین مذکورہ بنیادوں پر انتخاب ہوئے ہوں گے ان کی نمائندگی اسلامی جمہوریہ کے دائرہ میں محدود ہوگی لہٰذا اسلام مخالف یا جمہوری نظام کی معارض تجویزوں پر عمل درآمد کا مطلب نمائندگی کے دائرے سے خارج ہونا ہے۔

۳ اسلامی احکام سے موافقت و مخالفت کی تشخیص کا حق صرف فقہاء عظام کو ہے اور خدا کے فضل و کرم سے کچھ فقہا مجلس میں موجود ہیں اور چونکہ اس مسئلہ کا تعلق مہارت سے ہے لہٰذا کتاب و سنت کے ذریعہ اجتہاد اور شرعی احکام کی تشخیص میں دوسرے اراکین کی دخل اندازی کا مطلب صلاحیت و مہارت نہ رکھتے ہوئے دوسروں کے کام میں ٹانگ اڑانا ہے۔ البتہ اراکین مجلس کے درمیان ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو قانون کے ماہر ہیں، صاحب نظر ہیں، ان کی مہارت سے قوانین ہی کے سلسلے میں استفادہ کیا جائے گا اور ماہرین کے درمیان اختلاف آراء کی صورت میں اکثریت کی رائے قابل قبول اور معتبر ہے۔

۴ میں نہایت تاکید کے ساتھ اس بات کی درخواست کرتا ہوں کہ اگر مجلس کے بعض اراکین مغربی یا مشرقی مکتب فکر کے حامی ہیں یا انحرافی افکار سے متاثر ہیں اسلامی جمہوریہ ایران کے دستور اساسی میں دخل اندازی نہ کریں اور اپنی انحرافی روش کو اس قانون سے دور رکھیں اس لئے کہ ہمارے عوام کی فلاح و بہبودی اسی میں ہے کہ وہ اس طرح کے مکاتب فکر سے دور رہیں جو بذات خود پسماندہ اور زوال پذیر ہیں۔ بعض گروہوں کی باتوں اور تحریروں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ لوگ جن میں اسلامی احکام و معارف کی تشخیص کی صلاحیت نہیں، انحرافی مکاتب فکر کے زیر اثر قرآنی آیات و احادیث شریف کی خودساختہ تفسیریں پیش کرتے ہیں اور انہیں ان مکاتب فکر کی کسوٹی پر اس بات سے غافل رہتے ہوئے پرکھتے ہیں کہ اسلامی فقہ ایسی بنیادوں پر استوار ہے جو نہایت طویل بحث و تحقیق کا طالب ہے، ان مضحک و سطحی دلائل کی مدد سے اور متضاد دلائل پر غور کئے بغیر اسلامی معارف کے گہرے اور ہمہ جانبہ مفاہیم کا سمجھنا ناممکن ہے مجھے امید ہے کہ مجلس خبرگان اس رویہ سے دور رہے گی۔

۵ مجلس میں موجود علماء کرام اگر دستور اساسی کے مسودے میں کسی دفعہ یا تجویز کو اسلام کے خلاف پاتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ صراحت کے ساتھ اس کے بارے میں اعلان کریں اور مغربی افکار سے متاثر نامہ نگاروں و اہل قلم افراد سے نہ ڈریں اس لئے کہ یہ لوگ خود کو شکست خوردہ محسوس کرتے ہیں اور ہرگز نکتہ چینی و اعتراض آمیز باتوں سے باز نہ آئیں گے۔

۶ مجلس خبرگان کے محترم اراکین کو چاہئے کہ وہ اپنی ساری کوششیں کام میں لائیں تاکہ دستور اساسی درج ذیل صفات و خصوصیات کا حامل ہو۔

الف: ہر طرح کی نا انصافی اور نامناسب امتیازات سے پرہیز کرتے ہوئے عوام کے تمام طبقوں کے حقوق کا تحفظ۔

ب: شارع مقدس اور اسلام کے ابدی اصولوں کے مطابق آنے والی نسلوں کی ضروریات و مفادات مدنظر رہے۔

ج: قانون کے مفاہیم اس طرح واضح و صریح ہونا چاہئیں کہ زمانے کے ظالم و خود پرست افراد اس کی غلط تفسیر و تاویل پیش نہ کر سکیں۔

د: ان دوسری اسلامی تحریکوں کے لئے نمونہ و راہنما بننے کی صلاحیت ہو جو اسلامی انقلاب کے نقش قدم پر چل کر اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتی ہیں۔ آخر میں تمام اراکین کے لئے دعا کرتا ہوں کہ باری تعالیٰ انہیں توفیق و کامیابی عطا فرمائے اور آپ لوگوں کی کوششوں سے ایک ترقی یافتہ اور صحیح معنوں میں اسلامی دستور اساسی کی تدوین عمل میں آئے، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

روح اللہ الموسوی الخمینی

اس طرح سے مجلس خبرگان کا افتتاح ہوا۔ عارضی حکومت کو امام کے اس طرح کے پیغام کی توقع نہ تھی، وہ تمام امور کو اسی طرح انجام پاتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی جس طرح کا اس نے ڈھانچہ تیار کیا تھا، جو تجویز اس نے پیش کی تھی اسی کے مطابق عمل کی خواہاں تھی اسی ایک ماہ کی مدت میں جسے انقلابی کونسل نے مقرر کی تھی تحقیق ختم ہونے

کی طالب تھی، وہ چاہتی تھی کہ جلسوں کا انتظام اور مسودے کے بارے میں تحقیق کی ترتیب ان ہی ضوابط کے مطابق انجام پائے جو اس نے مقرر کئے تھے، غرض یہ کہ مجلس خبرگان کو صرف بر لسئے نام کہنے کی خواہاں تھی۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہمارا تجربہ دستور اساسی کے بارے میں کوئی زیادہ نہ تھا، اسلامی جمہوریہ ایران کے دستور اساسی سے پہلے صرف سلطنت مشروطہ کا ایک دستور اساسی تھا جسے قاجاری دور کے بیمار و بے خبر بادشاہ اور اس کے بعد قومی اسمبلی نے منظور کیا تھا، اس وقت نہ مجلس خبرگان کا نام تھا نہ مجلس مؤسس اور ریفرنڈم کا۔ مجلس مؤسسین بھی سنہ ۱۳۰۴، ۱۳۲۸ اور ۱۳۴۶ (شمسی) میں تشکیل پائی تھی گذشتہ دستور اساسی کے دفعات کو سلطنت کے مفاد اور عوام کے نقصان میں بدلنے کے لئے تھی نہ کہ نئے دستور اساسی کی تدوین و منظوری کے لئے۔ اب مجلس خبرگان کو یہ فریضہ انجام دینا تھا اور ان راہوں میں سے ایک راہ کو انتخاب کرنا تھا جو اس کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔

۹۔ مجلس خبرگان کا طریقۂ کار جس پر عمل کیا گیا:

افتتاح کے بعد مجلس خبرگان نے فوراً اپنی کاروائی کا آغاز کیا، جس تیزی کے ساتھ اسے کام شروع کرنا چاہئے تھا اس کے پیش نظر دوسرا جلسہ اسی روز سہ پہر کے وقت منعقد ہوا جس میں دائمی صدارت کا مسئلہ پیش کیا گیا، دائمی صدارت کے مسئلہ سے فارغ ہونے کے بعد لائحہ عمل کے مسئلہ کو پیش کیا گیا، اس طرح سے دو نظریے ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔

ایک نظریہ یہ تھا کہ خبرگان کے اراکین صرف اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ معینہ مدت تک دوران دستور اساسی کے مسودے کا جائزہ لیں، لیکن لائحہ عمل میں تبدیلی و اصلاح کا کام خبرگان کے دائرہ اختیار سے خارج ہے اور اگر بالفرض اصلاح کو لازمی سمجھتے ہیں تو اسے حکومت و انقلابی کونسل کے ذریعہ انجام دینا ہوگا۔

دوسرا نظریہ یہ تھا کہ اراکین مجلس عوام کے ذریعہ منتخب ہوئے ہیں، نہ کہ انقلابی کونسل و عارضی حکومت کے ذریعہ، لھذا خود انھیں مجلس کے طریقہ کار کو معین کرنا چاہئے۔ اصولی طور

پر ہر قانون ساز ادارے میں لائحہ عمل تیار کرنے کا کام خود اسی ادارے کی ذمہ داری ہوتی ہے اور مجلس خبرگان کو بھی خود اپنا طریقۂ کار مشخص کرنا چاہیے۔ خاص طور پر اس لئے کہ عوام نے ان نمائندوں پر بھروسہ کیا ہے۔ روش اور طریقۂ کار کام کو بہتر طریقے سے انجام دینے میں مؤثر ہوتا ہے، لہٰذا جب کام کو اچھے ڈھنگ سے کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی عقل و فکر کے ذریعہ طریقۂ کار بھی معین کرنا چاہیے انقلابی کونسل کے جملہ قوانین قابل احترام ہیں، لیکن جب عوام خود آزادی کے ساتھ ووٹ دے چکے ہوں اس وقت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انقلابی کونسل اس مجلس کے فرائض معین کرے۔ انقلابی کونسل اضطراری مواقع کے لئے ہے، جب نیا نیا انقلاب ہوا تھا اس وقت بھی دستور اساسی کے قانون کی تدوین اور اس سے متعلق تحقیق انقلابی کونسل کی صلاحیت سے خارج تھی۔ دوسروں کے ذریعہ مرتب کئے ہوئے منصوبوں کو آنکھ کان بند کر کے تو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مجلس کے نائب صدر نے جو انقلابی کونسل کے رکن بھی تھے لائحہ عمل کی نسبت انقلابی کونسل کے طریقۂ کار کے بارے میں یوں وضاحت پیش کی:

"یہ لائحہ عمل پہلے عارضی حکومت کے اراکین کے ذریعہ تیار ہوا ہے اس کے بعد انقلابی کونسل کے سامنے پیش کیا گیا، انقلابی کونسل کو عام جلسے میں اس کا جائزہ لینے کی فرصت نہ ملی لہٰذا اس نے حکومت اور شوریٰ کے اراکین پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کر دیا، اور چونکہ حسب معمول ہر وہ منصوبہ جو اراکین مجلس تیار کرتے ہیں پہلے کابینہ اس کا جائزہ لیتی اور اسے اسی طرح یا کچھ اصلاحات کے ساتھ منظور کرتی ہے تب کہیں انقلابی کونسل میں پیش اور اس کے بارے میں تحقیق ہوتی ہے لہٰذا وقت کی کمی کے پیش نظر یہ فیصلہ ہوا کہ اراکین حکومت اور انقلابی کونسل کے بعض ممبران پر مشتمل ایک کمیشن اس کام کو انجام دے۔ یہ طریقۂ کار سے متعلق بل جو آپ ملاحظہ کر رہے ہیں اسی کمیشن کے ذریعہ منظور ہوا ہے۔"

اس وضاحت سے پتہ چلا کہ لائحہ عمل کو عارضی حکومت نے تیار کیا ہے۔ نتیجہ میں لائحہ عمل کی نسبت اعتراضات میں اضافہ ہوا یہاں تک کہ مجلس خبرگان نے اس کی تبدیلی کا فیصلہ کر لیا۔ مجلس کی تاکید خاص طور سے اس بات پر تھی کہ مسودہ دستور اساسی کے سلسلے میں تحقیق سے متعلق طریقۂ کار و روش میں تبدیلی آنا چاہیے لیکن جلسوں کے انتظام کے بارے میں اسی لائحہ عمل کے مطابق عمل کیا جائے۔ مجلس خبرگان کو مختلف تجاویز کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ پانچ

فراد پر مشتمل کمیشن مقرر کیا جائے تاکہ وہ لائحۂ عمل کو مرتب کرے اور مجلس خبرگان کی منظوری کے بعد اسے نافذ کیا جائے۔ ۳۰ مرداد کو مذکورہ کمیشن نے اپنا تیار کردہ لائحہ عمل جلسہ میں پیش کیا اور اس کے متعلق وضاحت دی کہ جن حصوں میں تبدیلی آئی ہے وہ مسودہ دستور اساسی کے سلسلہ میں تحقیق کے طریقۂ کار سے وابستہ ہے اور اس میں تبدیلی لانے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ تمام اراکین مجلس کے لئے ان دفعات کو پرکھنے کے امکانات میسر ہوں، اس کے علاوہ کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے صرف بعض عبارتوں کی اصلاح کی گئی ہے یعنی جلسوں کے افتتاح و نظم و نسق کا طریقۂ کار وہی ہے جس پر ابھی تک عمل درآمد ہوتا رہا ہے جلسوں کا نظم و نسق نیز حضور و غیاب بھی پہلے کی طرح ہے کوئی خاص فرق نہیں آیا ہے۔ اس لائحہ عمل کے کلیات موافق و مخالف گروہوں کی گفت و شنید و مذاکرات کے بعد منظور ہوئے، اس کے بعد لائحہ عمل کے مختلف حصوں سے متعلق ووٹ ڈالے گئے اور تمام حصے کچھ اصلاحات و تبدیلی کے ساتھ منظور ہو گئے۔

مجلس شوریٰ پانچواں، چھٹا اور ساتواں جلسہ مذکورہ لائحہ عمل منظور کرنے میں گذرا، چھٹے جلسہ کے آخر میں تین افراد شوریٰ ہماہنگی کے لئے انتخاب کئے گئے۔ اراکین مجلس کے تحفظ کا مسئلہ بھی آٹھویں جلسے میں منظور ہوا۔

آٹھویں جلسے کے بعد ۳۱ مرداد سے ۱۳۵۸ ھ ۱۱ شہریور تک نویں جلسے کی کارروائی جاری رہی جس میں تحقیق کا کام کمیشنوں میں انجام پاتا رہا۔

مجلس خبرگان کا لائحہ عمل جو ۳۱ مرداد ۱۳۵۸ ھ میں منظور ہوا، حکومت اور انقلابی کونسل کے مرتب کردہ لائحہ عمل سے بالکل مختلف ہے۔ ہم پہلے تھوڑی بہت وضاحت حکومت و انقلابی کونسل کے تیار کردہ لائحہ عمل کے بارے میں پیش کر چکے ہیں ساتھ میں یہ بھی بیان کر چکے کہ مجلس خبرگان کے افتتاح اور عارضی و دائمی صدارت کے سلسلے میں اس کے کچھ حصے پر عمل بھی ہوا، لیکن مجلس خبرگان (بہاری عراد دستور اساسی پر نظر ثانی کرنے والی مجلس ہے جو شہرت کے اعتبار سے مختصر طور پر مجلس خبرگان کے نام سے یاد کی جاتی ہے) نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ پانچ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کو لائحہ عمل تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی، فی الحال جو کچھ وضاحت پیش کی جائے گی وہ مجلس خبرگان کے منظور کردہ لائحہ عمل کی بنیادوں پر استوار ہوگی جو دستور اساسی کی تدوین

کے آخری مراحل تک جاری وساری رہا اور جس کی بنیاد پر تحقیق انجام پائی۔
زیادہ تر تبدیلی مسودہ کی تحقیق کی روش اور کمیشنوں کی تشکیل کے بارے میں ہوئی ہے، دوسرے حصوں میں جزئی تبدیلی آئی ہے۔

۱۰۔ لائحہ عمل میں جزئی تبدیلیاں:

جزئی تبدیلیوں کو اس لائحہ عمل کے شروع میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مجلس میں اراکین کی جگہ الف بائی ترتیب سے مقرر کردی گئی۔ یہ اصول بن گیا کہ مجلس کا کورم تبھی پورا ہوگا جب دو تہائی اراکین حاضر ہوں گے (یعنی انچاس رکن)، یہ فیصلہ ہوگیا کہ ۳۸ نمائندوں کی موجودگی میں بھی مجلس کی کاروائی جاری رہ سکتی ہے، لیکن دستور اساسی کی کسی بھی دفعہ کو پاس کرنے کے لئے دو تہائی (۴۹ نمائندوں) کا ہونا لازمی ہے۔

اس لائحہ عمل میں مجلس کے افتتاح سے متعلق کچھ پروگراموں کو مد نظر رکھا گیا ہے جو گذشتہ لائحہ عمل میں نہ تھے، اگرچہ لائحہ عمل مجلس کے افتتاح کے تیسرے روز منظور ہوا۔

(دفعہ نمبر ۱۰۔ دائمی صدارت کمیٹی کی کرسی پر عارضی صدارتی کمیٹی کے بیٹھنے کے بعد جلسہ کی کاروائی نعرۂ تکبیر و قرآنی آیات کی تلاوت سے شروع ہوگی، اس کے بعد ایک اسلامی ترانہ پیش کیا جائے گا اس کے بعد امام امت کا پیغام پڑھا جائے گا اور پھر حلف اٹھانے کی رسم ادا ہوگی۔)

دفعہ نمبر ۱۴ میں یہ بات صراحت کے ساتھ پیش کی گئی ہے کہ مجلس کی عارضی صدارتی کمیٹی کے انتخاب کے بعد پہلا جلسہ وزرائے کابینہ کی موجودگی میں منعقد ہوگا، اس جلسہ میں دستور اساسی کا مسودہ وزیر اعظم یا انقلابی منصوبہ سازی میں ان کے سپرد کریں گے اور اس مسودہ کی تدوین و ترتیب سے متعلق رپورٹ پیش کریں گے۔ بوقت ضرورت وزراء کابینہ صدر مجلس کی اجازت سے عام جلسوں میں شرکت کرسکتے ہیں اور اگر مجلس ضرورت محسوس کرتی ہے تو انھیں دستور اساسی کی دفعات کے متعلق وضاحت دینے کے لئے دس منٹ گفتگو کرنے کی اجازت مل سکتی ہے، صدر مجلس اور مختلف کمیشنوں کے سربراہ، ضروری وضاحت کے لئے وزیر اعظم یا کسی وزیر یا ان کے نائب یا جن اشخاص کے بارے میں صلاح سمجھیں مجلس میں آنے کی دعوت دے سکتے ہیں۔

اگرچہ مجلس خبرگان سے حکومت کے ارتباط، ان کی موجودگی اور دعوت کو مدنظر رکھا گیا تھا لیکن مجلس کی کاروائی کی پوری مدت میں نہ کوئی وزیر اور نہ ہی انھیں آنے کی دعوت دی گئی۔

لائحۂ عمل میں اراکین مجلس خبرگان کے تحفظ کے مسئلہ کو یوں بیان کیا گیا ہے: نمائندگی کی پوری مدت میں کسی شخص کو کسی بھی دستاویز کے ذریعہ مجلس خبرگان کو مطلع اور اس کی منظوری حاصل کیے بغیر مجلس کے کسی رکن سے متعرض ہونے کا حق حاصل نہیں، مگر یہ کہ تحفظ کا حق مجلس کی جانب سے سلب کر لیا جائے۔ اراکین مجلس اور ان ماہرین کے خلاف جنھیں لائحۂ عمل کے مطابق تبادل نظر کے لئے دعوت دی جاتی ہے، محض ان کے افکار و خیالات کی بنا پر قانونی چارہ جوئی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اگر کوئی رکن علانیہ طور پر جرم کا مرتکب ہو اور ارتکاب جرم کے دوران گرفتار کر لیا جائے تو اس کی اطلاع مجلس کو پہنچنا چاہیئے۔

قوۂ مقننہ سے متعلق بحث میں نمائندوں کے تحفظ سے متعلق دفعہ (جو اکثر و بیشتر ملکوں کے دستور اساسی میں پائی جاتی) کے بارے میں بیان کریں گے کہ ہمارے دستور اساسی نے اسلامی قوانین و مقررات کے پیش نظر جرائم کے سلسلہ میں اراکین مجلس کے "تحفظ" کو قانون کے سامنے تمام انسانوں کی مساوات کے مطابق نہیں جانا ہے، جس کے نتیجہ میں اراکین مجلس عام لوگوں کی طرح قرار پاتے ہیں اور کسی خاص تحفظ و برتری کے مالک نہیں ہوتے۔

مجلس کے انتظام کے لئے بھی خاص قوانین وضع کئے گئے، منجملہ یہ کہ منتظمین کے علاوہ مجلس میں کسی بھی شخص کا ہتھیار سمیت داخل ہونا منع ہے اور احتجاج و مظاہرہ کرنے والے اگر مجلس کے نظم و ضبط میں خلل ڈالتے یا نمائندوں، صدارتی کمیٹی اور مجلس کے کارکنوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کرنے کے باعث ہوں صدر مجلس کے حکم سے گرفتار اور اگر سزا کے مستحق ہوئے تو متعلقہ عدالتوں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

بہر حال جلسوں کا انتظام صدر مجلس کے ذمے تھا، اخباری نمائندے، تماشائی اور مجلس کے کارکن کا مجلس کے سیکریٹریٹ سے اجازت نامہ حاصل کر کے مجلس میں مقررہ جگہوں پر بیٹھ سکتے تھے، جلسہ کی کاروائی کے دوران ہر طرح کے شور و غل سے پرہیز اور مکمل سکوت اختیار کرنا ہوتا تھا ورنہ صدر کے حکم سے نکال باہر کر دیئے جاتے۔

۱۱- لائحۂ عمل میں اہم تبدیلیاں :

تحقیق اور اس کے مراحل وطرز تحقیق نیز کمیشنوں کی تشکیل کے سلسلہ میں لائحہ عمل میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں جو اس بات کی باعث بنیں کہ اولاً تدوین کی مدت ایک ماہ سے لیکر تین ماہ تک بڑھ جائے ثانیاً افتتاحی پیغام میں امام کی فرمائش کے پیش نظر مسودہ میں گہری تبدیلی آئے اور مجموعی طور پر تمام تجاویز کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام سے استصواب رائے کے لئے مجلس خبرگان دستور اساسی کی تدوین وتنظیم کا اہتمام کرے نہ کہ صرف حکومت کے پیش کردہ مسودہ کا جائزہ لے۔

ہم ان ہی مقدمات کے دوران دستور اساسی کے تحقیقی مراحل کے ذکر کو اس طرح بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس طرح سے مجلس خبرگان نے اس کی تدوین کی اور اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ چار مرحلوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

۱۲- مجلس خبرگان کے منظور کردہ لائحۂ عمل کی بنیاد پر مراحل تحقیق :

پہلا مرحلہ ابتدائی تحقیق کا ہے، یعنی پہلے شورائے ہماہنگی، مجلس کی طرف سے تین افراد کے انتخاب کے ساتھ قائم ہوتی ہے، اس کے بعد سات کمیشن تشکیل پاتے ہیں اور ایک ہفتہ کے اندر مجلس کے سامنے پیش ہوئی تجاویز کا جائزہ لیتے ہیں اور مجلس سے باہر ماہرین سے تبادلہ خیال کرتے ہیں۔

دوسرے مرحلے میں دستور اساسی کی دفعات کمیشنوں کے ذریعہ مرتب ہو کر عام جلسے میں پیش کی جاتی ہیں۔

تیسرے مرحلے کے دوران مجلس کے عام جلسے میں کمیشنوں کی جانب سے پیش ہوئی دفعات کا جائزہ اور بحث وتمحیص کے بعد منظور کی جاتی ہیں۔

چوتھا مرحلہ آخری تحقیق کا ہے۔

لائحہ عمل کی اٹھارویں اور انیسویں شق کے مطابق جس کا تعلق پہلے مرحلے سے ہے، شورائے ہماہنگی کے تین افراد دائمی واصلی رکن کے عنوان سے اور دو افراد جانشین کے طور پر مجلس کے ذریعہ انتخاب ہوں گے۔ جنہیں لائحہ عمل منظور ہونے کے فوراً بعد انتخاب کرلیا گیا۔

دوسرے یہ کہ شورائے ہماہنگی دستور اساسی کے لئے پیش ہوئے مسودوں کا جائزہ لے گی اور ان عناوین کو جو ان مسودوں میں دستور اساسی کے لئے ہوتی ہیں علیحدہ کر کے حسب تناسب سات حصوں میں تقسیم کرے گی۔ ساتوں حصوں کی فہرست اراکین کی اطلاع کے لئے چھاپی جائے گی تاکہ اراکین میں سے ہر ایک اپنی پسند یا مہارت کے پیش نظر کم سے کم تین حصوں کا انتخاب کرے اور شورائے ہماہنگی کو اس سے مطلع کرے۔

تیسرے یہ کہ شورائے ہماہنگی کمیشن سے وابستہ افراد کو معین کرے گی اور انہیں اطلاع دے گی۔ کیونکہ ممکن ہے کہ بعض کمیشنوں میں رکنیت کے لئے افراد حد سے زیادہ ہو جائیں اور بعض میں ضرورت کے مطابق بھی موجود نہ ہوں۔ چنانچہ شورائے ہماہنگی ان میں توازن برقرار کرے گی اور فیصلہ کرے گی کہ منتخبہ تین حصوں میں سے کون سا حصہ سپرد کیا جائے۔

چوتھے یہ کہ ہر گروہ پہلے میں صدر، نائب صدر، سیکرٹری اول اور سیکرٹری دوم کو انتخاب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے جلسے سے متعلق نظم و ترتیب اور طریقہ کار کو بھی معین کریگا۔

پانچویں یہ کہ چھ روز تک کا صبح اور سہ پہر کو کمیشن کا اجلاس ہوگا اور ہر کمیشن موصولہ نظریات و تجاویز کا جائزہ لیکر دوسروں کی اطلاع کے لئے نتائج کی تلخیص کر کے چھاپ کر تقسیم کرے گا۔

لائحہ عمل کی بیس سے لیکر پچیسویں شق دوسرے مرحلے کے طریقہ عمل کو معین کرتی ہے اس مرحلہ میں:

پہلے، دستور اساسی کی دفعات و تجاویز مرتب کرنے کا کام انجام پائے گا۔

دوسرے یہ کہ ہر کمیشن کا اپنا سیکشن بنیادی طور پر اس کے دائرہ اختیار میں ہوگا لیکن آگاہی و اطلاع اور ہر طرح کی اظہار رائے کے لئے دوسرے حصوں کا بھی مطالعہ کرے گا۔

تیسرے یہ کہ اس مرحلہ میں شورائے ہماہنگی ہر روز مسودے کی کچھ دفعات معین کرکے صدارتی کمیٹی کے سامنے پیش کرے گی تاکہ صدر مجلس کے حکم سے کمیشنوں کے ایجنڈے میں شامل ہو۔

چوتھے یہ کہ ہر کمیشن دستور اساسی سے متعلق مسودے کے ہر حصے کے بارے میں بحث و گفتگو

کرے گا اور روزانہ اپنی کارکردگی کے نتائج کو شورائے ہماہنگی کے سامنے پیش کرے گا تاکہ چھپ کر اراکین
کے درمیان تقسیم ہو، اس طرح سے تمام اراکین ایک دوسرے کی رائے سے مطلع ہوں گے۔

پانچویں: یہی وہ مرحلہ ہے جس میں تیسرے ہفتے سے مجلس شوریٰ کے بھی عام جلسے آخری فیصلے کے لئے
منعقد ہوں گے، اور اس کے بعد روزانہ صبح سے دوپہر تک کمیشنوں کے جلسے منعقد ہوں گے اور ہر جلسہ
کے خاتمہ پر تجاویز شورائے ہماہنگی کے سامنے پیش ہوں گی تاکہ چھاپ کر اراکین کے درمیان تقسیم کرے اور
دوسرے دن سہ پہر کے عام جلسہ میں ان تجاویز کے سلسلے میں ووٹنگ انجام پائے۔ اس اعتبار سے
ہر دفعہ کے سلسلے میں تمام کمیشن بحث و مباحثہ کریں گے اور ان کی طرف سے تجاویز پیش ہوں گی، یہ بھی
ممکن ہے کہ کمیشن کی تعداد کے مطابق عام جلسے میں سات تجویزیں پیش ہوں۔

لائحہ عمل کی چھبیس ویں شق جو تیسرے مرحلے سے متعلق ہے تجاویز کے پیش نظر عام جلسے کے طریقہ کار
کو معین کرتی ہے۔

پہلے یہ کہ وہ دفعات جن پر کمیشن کی تحقیق عمل میں آچکی ہے صدر مجلس کے حوالے ہوں گی، پھر
تیسرے ہفتے کے دوسرے دن عام جلسے میں پیش کی جائے گی اور بحث و مباحثہ و مذاکرات کے بعد ووٹنگ ہوگی۔

دوسرے: ایک دفعہ کا متن پڑھا جائے گا، اگر تمام کمیشنوں کی جانب سے پیش ہوا متن ایک ہی
ہو تو ایک مخالف اور ایک موافق رکن تقریر کرے گا، اس کے بعد ووٹ ڈالے جائیں گے۔

تیسرے: اگر چند متن کمیشنوں کی جانب سے پیش کئے جائیں تو نمبروار انھیں پڑھا جائے گا اور ہر
کمیشن کا ایک رکن اپنی تجویز دفاع میں تقریر کرے گا۔ ایک ہی دفعہ سے متعلق تمام تجویزوں کا
جائزہ لینے کے بعد حسب ترتیب ووٹنگ ہوگی اور اگر کوئی تجویز پاس ہوجائے تو دوسری تجویزوں پر
ووٹنگ نہ ہوگی۔

لائحہ عمل کی ستائیس ویں شق کا تعلق آخری تحقیق کے چوتھے مرحلے سے ہے۔ یہ مرحلہ اس وقت
شروع ہوگا جب تمام دفعات پاس ہوچکی ہوں۔ اس مرحلہ میں مجموعی تحقیق عمل میں آئے گی۔ پہلے
منظور شدہ دفعات کا مجموعہ اراکین کے حوالے کیا جائے گا، پھر ایک دن کی مہلت دی جائے گی
تاکہ موصولہ آخری تجاویز کے پیش نظر اس مجموعہ کا جائزہ لیا جائے، اس کے بعد تین دن تک آخری
منظوری کے لئے جلسے منعقد ہوں گے تاکہ اگر نئی تجاویز پیش ہوں تو ان کے سلسلے میں بھی ووٹنگ

کی جائے۔

ترپن[۵۳] ویں شق کے مطابق مجلس خبرگان کا ایک اختتامی جلسہ منعقد ہوگا جس میں کم سے کم دو تہائی اراکین یعنی انچاس افراد کا ہونا ضروری ہے۔ دستور اساسی کے متن کی تقسیم اور صدر مجلس کی وضاحت کے بعد مجلس میں موجود اراکین دستور اساسی کی منظوری سے متعلق کاغذ پر دستخط کریں گے، پھر صدر مجلس نعرۂ تکبیر کے بعد اجلاس کے اختتام کا اعلان کریں گے۔

۱۳۔ ووٹنگ کا طریقہ:

ووٹنگ کے لئے چار صورتیں لائحہ عمل میں منظور ہوئی ہیں۔

۱۔ ہاتھ اٹھانا ۲۔ قیام و قعود ۳۔ کاغذ کے ذریعہ علانیہ طور پر ۴۔ کاغذ کے ذریعہ خفیہ طور پر۔ کمیشنوں کے تمام جلسوں میں ووٹنگ ہاتھ اٹھانے کے ذریعہ انجام پاتی تھی اور مجلس کے عام جلسوں میں قیام و قعود کا رواج تھا، مگر یہ کہ صدر مجلس کو یہ گمان ہوتا کہ ہاتھ اٹھانے یا اٹھنے بیٹھنے کے ذریعہ ووٹ ڈالنے والے کو مکمل آزادی نہیں ملتی۔ ایسی صورت میں ووٹنگ کاغذ کے ذریعہ خفیہ طور پر انجام پاتی تھی۔ خفیہ ووٹنگ ڈائس پر انجام پاتی تھی، سیکریٹری تمام نمائندوں کے نام حسب ترتیب پڑھتا تھا جس نمائندے کا نام آتا وہ اپنے پیپر کو تہہ کر کے ڈائس پر موجود بیلٹ بکس میں ڈال دیتا تھا۔ جو نمائندے ڈائس پر نہیں جاتے یا جاتے لیکن ووٹ نہیں ڈالتے تھے یا جلسہ سے خارج ہو جاتے تھے، ووٹنگ کے وقت اکثریت حاصل کرنے کے لئے ان کی حاضری ناگزیر تھی لیکن ان کا ووٹ غیر جانبدار (ممتنع) محسوب ہوتا تھا۔

ووٹوں کی شمارش کے موقعہ پر اگر بیلٹ بکس میں ووٹ رجسٹر پر مندرج ناموں سے زیادہ ہوتے تو اضافی ووٹوں کو کالعدم قرار دیا جاتا اور اس بات کو جلسہ کی روئیداد کے ضمن میں درج کیا جاتا تھا، اس کے بعد بقیہ ووٹوں کو بیلٹ بکس سے نکال کر صدر اور صدارتی کمیٹی کے سیکریٹری کی نظارت میں نائب صدر ووٹ ڈالنے والوں کے نام پڑھتے تھے اور سیکریٹری انہیں درج کرتے تھے۔ آخر میں ووٹ ڈالنے والوں کے نام اور ووٹوں کی تعداد جلسہ کی رپورٹ

میں درج کی جاتی تھی۔

علانیہ طور پر کاغذ کے ذریعہ ووٹ ڈالنے کی صورت یہ تھی کہ ہر نمائندے کے پاس تین رنگ کے کارڈ ہوتے تھے: سفید (موافق)، زرد (غیر جانبدار) اور سبز (مخالف)۔ ووٹ دیتے وقت نمائندوں میں سے ہر ایک اپنا ووٹ سیکریٹری کے حوالے کرتا اور وہ نائب صدر کو دیتا تھا، اس کے بعد ووٹوں کی گنتی شروع ہوتی تھی۔ موافق، مخالف اور غیر جانبدار ووٹوں کے اعداد و شمار کا اعلان ہوتا تھا اور ووٹنگ کے نتائج صدر کے ذریعہ حاضرین کی خدمت میں پیش ہوتے تھے۔ کاغذ کے ذریعہ علانیہ ووٹنگ میں ووٹ ڈالنے والوں کے نام (خواہ وہ موافق ہوں یا مخالف ہوں یا غیر جانبدار) مجلس جلسہ میں اعلان کئے بغیر مجلس کی روئیداد و مذاکرات لکھے جانے والے رجسٹر میں درج کر لئے جاتے تھے۔

۱۴۔ خبرگان کے تحقیقی مآخذ:

تفصیلی طور پر مجلس خبرگان کے طریقہ عمل کو بیان کرنے کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ متعدد کمیشن قائم ہوئے۔ صبح و شام تحقیق کرنے والے کمیشنوں کے سامنے مختلف مآخذ تھے جن پر بحث و مباحثہ، تفسیر و تطبیق عمل میں آئی۔ یہ صرف دستور اساسی کے مسودہ ہی کا جائزہ نہیں لیا گیا، بلکہ تقریباً چار ہزار تجاویز اور نظریات مختلف گروہوں، پارٹیوں اور اداروں کی طرف سے پیش ہوئے تھے۔ مختلف ملکوں کے دستور اساسی کے تراجم موجود تھے اور ماہرین کی وضاحت سے بھی استفادہ کیا گیا۔

مجلس میں موجود فقہاء کی اسلامی علوم میں مہارت و بصیرت نے کمیشنوں کے وزن میں مزید اضافہ کر دیا۔ اور ہر چیز سے پہلے قرآن مجید اور اس کی معتبر تفسیریں قانون مرتب کرنے والوں کے لئے مصدر اول کی حیثیت رکھتی تھیں تاکہ منظور ہونے والی دفعات اسلام کی آئینہ دار ہوں اور جہاں تک ممکن ہو سکے دستور اساسی کو الٰہی آیات یا روایات کے سہارے انسان کے فطری حقوق سے ہمکنار کریں۔

اس اعتبار سے جو قانون مرتب ہوا ہر شی سے بڑھ کر خود ہماری اپنی ہی اسلامی تہذیب کا ماحصل ہے۔ جو لوگ اس کام میں دخیل تھے ان میں سے اکثر و بیشتر اسی سرزمین و مکتب اسلام کے پروردہ تھے، وہ معاشرے کا ایک حصہ تھے، عوام کے درمیان ہی رہتے تھے وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ دین و سیاست دو الگ چیزیں نہیں۔ مغربی ڈیموکریسی کے دلدادہ افراد کی چرب زبانی

خوبصورت الفاظ اور عبارتیں انہیں اسلامی اقدار سے دور نہ کرسکیں۔ سامراجی طرز فکر براہ راست یا بالواسطہ مجلس کو متأثر نہ کرسکی۔ کوشش ہورہی کہ غیروں کے تسلط کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور گذشتہ دو تین صدیوں کی تاریخ نہ دھرائی جائے۔

مشرقی و مغربی بلاک سے گریز اور اسلامی اصولوں پر اعتماد مجلس خبرگان کی اساس تھی۔ دوسرے ممالک میں رونما ہونے والے انقلابات اور بڑی طاقتوں سے ان کی وابستگی کے نتیجے میں عبرتناک انجام پر بھرپور نظر تھی، مجلس خبرگان کی پوری مدت میں امام خمینی کی جانب سے متعین شدہ اصول جو عوام کی آرزوؤں کے آئینہ دار تھے اور افتتاحی اجلاس میں ان کی وضاحت کردی گئی تھی، مدنظر تھے۔

۱۵۔ مجلس خبرگان کا اختتام:

بروز جمعرات مورخہ ۲۴ آبان ۱۳۵۸ شمسی ۶۷ دیں اور مجلس خبرگان کے آخری جلسہ میں مجلس کے طریقہ کار سے متعلق وضاحت پیش کرنے کے بعد تیار شدہ مقدمہ پڑھا گیا، اور اس کے بعد نئے سرے سے دستور اساسی کی تمام منظور شدہ دفعات پھر سے پڑھی گئیں اور اسکے ذیل میں نمائندوں نے دستخط کئے اس طرح سے اس مجلس کا سہ ماہی اجلاس اختتام کو پہنچا۔

مجلس خبرگان کے ۷۱ رکن تھے (۳۷ رکن منتخب ہوئے تھے جن میں سے ایک نے شروع سے شرکت نہ کی اور ایک کا ابتدا ہی میں انتقال ہوگیا تھا) ہر "دفعہ" کی منظوری کے لئے تمام اراکین کی دو تہائی افراد کی موافقت لازمی تھی۔ یعنی کم سے کم ۴۸ ووٹ جو عملی طور پر ایک مشکل کام تھا، اس لئے کہ اکثر اوقات چند افراد غائب رہتے تھے، مثال کے طور پر اگر مجلس پچاس نمائندوں کے ذریعہ تشکیل پاتی تو حاضرین کے درمیان اتفاق رائے کا ہونا ضروری تھا تاکہ کام بخوبی انجام پاسکے۔

مجلس خبرگان نے اپنی کاروائی ختم کردی لیکن دستور اساسی کی منظوری کا کام ابھی ختم نہ ہوا تھا کیونکہ عوام کی منظوری بھی ضروری تھی۔

فہرست جلد سوم مجلّۂ توحید